ماہنامہ

تحریک
نئی دلی

شمارہ : ۱ جلد : ۲۴

اپریل ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر

گوپال متل ○ مخمور سعیدی
پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا :

نیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۲ ۱۱۰۰۰

پرنٹر، پبلشر، اور پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت : ۹، انصاری مارکیٹ، نئی دلی ۲ ۱۱۰۰۰

اپنے پڑھنے والوں سے

اس شمارے سے 'تحریک' کی ضخامت میں اضافہ کیا جا رہا ہے اور کچھ صوری تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ 'تحریک' کے مقبول کالم 'مانگے کا اجالا' اور 'بزمِ احباب'، جو صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے پچھلے کئی مہینوں سے کبھی کبھار ہی شامل ہو پاتے تھے اب باقاعدگی سے شامل ہوتے رہیں گے ــــــ 'بزمِ احباب' کے کالم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ 'تحریک' میں شائع ہونے والے مضامینِ نثر و نظم پر ہی اظہارِ خیال کریں بلکہ عصری ادبی صورتِ حال کے کسی پہلو پر بھی، جو مفصل مضمون کا متقاضی نہ ہو، آپ ان صفحات میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ 'خبرنامے' کے لیے اپنے شہر کی اہم ادبی سرگرمیوں کی مختصر ادبی رپورٹیں بھی بھجوایئے۔

ہماری خواہش ہے کہ ان تمام مقامات پر جہاں اردو پڑھنے لکھنے والے موجود ہیں، 'تحریک' کا ایک حلقۂ احباب قائم ہو۔ اس سلسلے میں ہم آپ سے تعاون کے طالب ہیں۔ اگر آپ اپنے قریبی لوگوں میں 'تحریک' کے کچھ مستقل خریدار پیدا کر سکیں تو اس سے 'تحریک' کی مالی بنیادوں کو استحکام حاصل ہوگا اور ہم اسے اور بہتر بنا سکیں گے۔ کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو تو اتنا ضرور کیجیے کہ اپنا شمارہ دوسرے باذوق لوگوں کو بھی پڑھنے کو دیجیے ــــــ مقصد 'تحریک' کی آواز کو تمام اردو دوستوں تک پہنچانا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس مقصد کی تکمیل میں آپ ضرور ہماری مدد کریں گے۔

ــــــ ادارہ

الامین کا سورما — منٹگمری

بڑے سے بڑا فاتح بڑے سے بڑا سورما بھی موت کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ الامین کے فاتح فیلڈ مارشل وائی کاؤنٹ منٹگمری بھی ۲۴ مارچ کو موت کے فرشتے کے ہمراہ اس جہان سے کوچ کر گئے۔ انھوں نے ۸۸ برس کی عمر پائی۔ برطانوی فوج کی صفوں سے کرام ویل کے بعد ان سے زیادہ مباحثہ انگیز شخصیت غالباً آج تک نہیں ابھری۔

برطانوی فوج میں فیلڈ مارشل ریٹائر نہیں ہوا کرتے برتے دم تک وہ فوجی عملے میں ہی شامل رہتے ہیں۔ لیکن 'مونٹی' (دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد لاکھوں فوجی اور کروڑوں سویلین انھیں اسی نام سے جاننے لگے تھے) کو ایک اور اعزاز بھی حاصل رہا۔ یورپ میں نیٹو کے ڈپٹی سپریم الائیڈ کمانڈر کا عہدہ ان کا آخری کارگزار فوجی عہدہ تھا۔ ۱۹۵۸ء میں جب وہ اس عہدے سے سبکدوش ہوئے تو کمیشنڈ افسر کے طور پر پچاس برس کا دور پورا کر چکے تھے۔ اس سے پہلے کی پوری صدی کے لیے یہ ایک ریکارڈ تھا۔

منٹگمری کے حصے میں تعریفوں کے پھول بھی آئے اور نکتہ چینیوں کے کانٹے بھی۔ صدیوں سے برطانیہ کی کوئی اور فوجی ہستی بیک وقت اتنی بلند بانگ تعریف اور اتنی تلخ نکتہ چینی کا ہدف نہیں بنی ہے۔ سر ونسٹن چرچل نے ایک بار انھیں "ایک کرام ویلی شخصیت۔ سادگی پسند، سخت گیر اور لائق دال" قرار دیا تھا لیکن ایک امریکی تبصرہ نگار نے اس طرح سرسری طور پر ان کا ذکر کر کے ٹال دیا کہ وہ محض "ایک فوجی کاریگر تھے۔ بیک وقت انانیت پرست اور درد رکھنے، خود پسند اور ہر کام مہارت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک کرنے والے"۔

منٹگمری کا جسم چھریرا، لچک دار اور دبلا کا مضبوط تھا۔ انھوں نے برسوں تک نہایت سادگی اور جفاکشی کی زندگی گزاری۔ سگریٹ سے وہ ہمیشہ دور رہے، شراب کو انھوں نے کبھی منہ نہ لگایا۔ اپنے حق میں وہ اتنے ہی سخت گیر تھے جتنے اپنے ماتحتوں کے معاملے میں انضباط پسند۔ آخری دم تک بڑی کفایت شعاری کے ساتھ جنوبی انگلینڈ کے ہیمپ شائر کے دیہی علاقے میں ایک عام سے مکان میں رہتے رہے۔ اپنی پنشن وہ مقامی ڈاک خانے میں جا کر وصول کر لیا کرتے تھے۔ منٹگمری (پیدائشی نام: برنارڈ لا منٹگمری) جنوبی لندن کے علاقے کینسنگٹن میں ایک وکر کی قیام گاہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان بہت پرانا تھا۔ انگریزی تاریخ میں اس کی جڑیں دور تک جاتی تھیں اور انگریزی روایت اس کے ہر فرد کے خون میں رچی ہوئی تھی۔ منٹگمری گھرانہ اپنا شجرۂ نسب روجر ڈی منٹگمری سے ملاتا ہے، جو فالیز سے آئے ہوئے نارمن تھے۔ ۱۰۶۶ء میں جب فاتح ولیم برطانیہ پر حملہ آور ہوا تو یہ اس کے نائب سپہ سالار تھے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال بعد مونٹی نے اپنی ایک بہت بڑی جنگ فالیز ہی کے مقام پر لڑی۔

جب مونٹی دو سال کے تھے تو ان کے باپ کو وان ڈی مینز لینڈ کا بشپ بنا دیا گیا۔ چنانچہ پورا خاندان تسمانیہ چلا گیا۔ وہاں سب بچے نہایت سخت خاندانی ڈسپلن کے تابع رہتے تھے۔ دن کے ہر گھنٹے کے لیے پڑھائی، فرائض کی بجا آوری، ورزش اور عبادت کا دستور عمل مقرر تھا۔ بعد میں جب کم سن برنارڈ لندن میں سینٹ پال کے پبلک اسکول میں تھا تو ایک دن وہ "فوجی کلاس" میں جا دھمکا۔ مونٹی کو یہ بات یاد نہیں رہی کہ ایسا انھوں نے کیوں کیا تھا۔ بہرحال، اس کلاس میں ان کی کارگزاری اچھی خاصی رہی۔ کھیلوں میں وہ خوب آگے بڑھے۔ پڑھائی میں بھی ٹھیک رہے۔ پھر وہ فوجی افسروں کے ٹریننگ کالج (سینڈہرسٹ) میں داخل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے "اعلیٰ" درجے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۵۰ لڑکوں کی کلاس میں ان کی پوزیشن تیسویں تھی۔

اکیس سال کی عمر میں مونٹی ہندستان پہنچ گئے۔ چھ برس بعد وہ فرانس میں نظر آنے لگے۔ وہاں وہ برطانوی مہماتی فورس کے ساتھ مل کر لڑتے رہے۔ مانز سے پسپائی کے موقع پر وہ بڑی طرح زخمی ہو گئے۔ ایک گولی ان کے سینے کے بالکل پار نکل گئی ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ ان کے لیے قبر بھی تیار کر دی گئی لیکن وہ موت کے چنگل سے بچ نکلے، کیوں کہ انھیں امتیازی خدمت کا اعزاز (ڈسٹنگوئشنڈ سروس آرڈر) حاصل کرنا تھا، ترقی پا کر کیپٹن اور پھر میجر بننا تھا۔ دونوں عالمی جنگوں کے درمیان وہ فلسطین، ہندوستان اور مصر میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس درمیان انھوں نے اسٹاف کالج میں بھی کچھ مدت گزاری۔

اس عرصے میں منٹگمری نے چھوٹے موٹے معرکے تو بہت سے سر کیے، لیکن شہرت کی بلندیوں کو چھونے کا سب سے بڑا موقع انھیں ۵۴ برس کی عمر میں ملا، ان دنوں وہ شمالی افریقہ میں تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کا آدھا دور ختم ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جو وہ گمنامی کے دھندلکے سے نکلے تو پھر ان کی شہرت کا آفتاب روشن سے روشن تر ہی ہوتا گیا۔ اب وہ تاریخ کی زندۂ جاوید ہستیوں کی صف میں پہنچ گئے تھے۔ فتوحات کا ایک پورا سلسلہ انھیں صحرائے مغرب کے مقام الامین سے شروع کر کے لون برگ ہیتھ تک لے گیا، جہاں تین سال بعد انھوں نے جرمن فوج کی اطاعت قبول کی۔ جرمن فوج کے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز بعد میں ان کے چھوٹے سے عجائب گھر میں نمایاں جگہ کی حق دار بنی۔ یہ عجائب گھر ایک شکستہ سی بند گاڑی میں بنا ہوا تھا جو ان کے باغ میں کھڑی رہتی تھی۔ اپنی آخری جنگ میں انھوں نے اسی گاڑی میں سفر کیا تھا جو آدمی دو فیتوں والا سیاہ بیریٹ (ٹوپی)، شکن آلود سوئیٹر اور مخمل کی ڈھیلی ڈھالی پتلون پہنے دوسرے افسروں میں ہنگامے برپا کرتا پھرتا تھا، زمانۂ امن میں بھی برابر تعریف اور لعنت ملامت کا مرکز بنا رہا۔ جنگ کے بعد بھی منٹگمری عوامی زندگی کے میدان میں دھوم مچاتے رہے۔ وہ امپیریل جنرل اسٹاف کے چیف بنے، نیٹو کے نائب سربراہ رہے اور سال بہ سال کبھی تعریف کبھی ملامت حاصل کرتے رہے۔ آنے والے کئی برسوں تک سیاسی اور فوجی مورخوں کا انداز ان کے معاملے میں یہی رہے گا۔ ان کے حصے میں جانبدارانہ رائیں آتی رہیں گی کہ کوئی ان کی موافقت میں زمین آسمان ایک کرے گا، کوئی مخالفت میں۔ لیکن فوجی امور پر جو کتابیں اور مقالے انھوں نے چھوڑے ہیں ان کی قدر و قیمت کے باب میں کسی کو کبھی اختلاف نہ ہوگا۔ یہ تصنیفات ان کے آخری برسوں کی یادگار ہیں جب وہ سکون سے اپنے گھر میں رہ رہے تھے۔ یہ سب کی سب ایک ایسے شخص کی یادگار تصنیفات ہیں جو کھرا اور بے لاگ تھا۔ عملی تھا اور ہمیشہ کسی لگی لپٹی یا گھماؤ پھراؤ کے بغیر بات کہنے کا عادی تھا۔

گوپال متل

نیا جال پرانے شکاری

۱۲ راور ۱۳ را اپریل کو دلّی میں اُردو کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ حسبِ دستور اس مرتبہ بھی اس بات کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے پیغامِ تہنیت بھیجا تھا اور اس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ اور حسبِ دستور اس مرتبہ بھی اس بات کی پردہ پوشی کی جا رہی ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور اور منشی پریم چند کی تائید اس حقیقت کو چھپا کر حاصل کی گئی تھی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کمیونسٹ پارٹی کا ایک محاذی ادارہ ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ اگر ڈاکٹر ٹیگور اور منشی پریم چند کو یہ علم ہوتا کہ یہ تنظیم کمیونسٹ پارٹی کا محاذی ادارہ ہے تو وہ اس کے قریب تک نہ پھٹکتے۔ مثال کے طور پر منشی پریم چند نے اپنی صدارتی تقریر میں صاف الفاظ میں کہا تھا: ”دوسروں پر اپنے خیالات ٹھونسنے والا راسخ العقیدہ شخص ایک آوارہ منش کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ آخر الذکر کی نجات ممکن ہے لیکن ایک رعونت کیش راسخ العقیدہ شخص کی نجات کا کوئی امکان نہیں۔“ یہ الفاظ بھی اس معاملے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں چھوڑتے کہ منشی پریم چند کے خیالات اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے حقیقی مقاصد میں کوئی تعلق نہیں لیکن منشی پریم چند نے اپنی بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اس ادب پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرنا بھی ضروری سمجھا جو ”صرف ایک مخصوص طبقے کا حاشیہ بردار ہو“۔ منشی پریم چند کے خیالات اور ادب کے کمیونسٹ نظریے میں جو بُعد ہے، اسے سمجھنے کے لیے لینن کا مندرجۂ ذیل حوالہ کافی ہوگا:

”ادب کے لیے جانبداری لازمی ہے۔ سوشلسٹ پرولتاریہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب میں جانبداری کے اصول کو حتی الوسع انتہائی مکمل اور مربوط طریقے پر عملی شکل دینے کی کوشش کرے۔“

یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی ترقی پسندان دنوں بالعموم اس لہجے میں گفتگو نہیں کرتے لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی انھوں نے محسوس کیا کہ کمیونسٹ پارٹی ہندوستان میں انقلاب برپا کرنے والی ہے،

ترقی پسندوں نے دوٹوک لہجہ اختیار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس کی کارروائی اس کا واضح ثبوت ہے۔ کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی صدر عصمت چغتائی نے اپنے خطبے میں کہا کہ "باقی دنیا کی طرح ہمارا ملک بھی دو کیمپوں میں تقسیم ہو گیا ہے ...... ہمیں صرف یہ اعلان ہی نہیں کرنا ہوگا بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرنا ہوگا کہ ہم ادیب مزدوروں کے کیمپ میں ہیں ...... میں یہ سمجھتی ہوں کہ اب صرف کہانیاں، نظمیں اور تنقیدیں لکھنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ ادیبوں کو اس طبقے سے ٹکرانا ہوگا جس نے ہماری تحریک پر حملہ کر دیا ہے" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کیمونسٹ لغت میں "مزدوروں" کا مطلب صرف کیمونسٹ پارٹی ہے۔

اگر ترقی پسند مصنفین ان دنوں اس لہجے میں گفتگو نہیں کرتے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ لینن انھیں یہ سبق بھی پڑھا گیا ہے کہ "عارضی سمجھوتوں سے خواہ وہ ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ ہی کیوں نہ کیے جائیں، صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں جو خود اعتمادی سے محروم ہوں۔"

اور ولی منزنبرگ جسے کسی وقت کیمونسٹ پارٹی کے ثقافتی فورڈ کا نام دیا گیا تھا، انھیں سکھا گیا ہے کہ "جو لوگ ہم سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتتے ہیں ہمیں انھیں بھی نئے طریقوں اور نئے راستوں سے اپنی طرف راغب کرنا پڑے گا ...... ہم کیمونسٹ حلقہ اثر کو پھیلانا چاہتے ہیں ..... ہمیں کیمونسٹ پارٹی کے لیے تنظیمی اہلیت رکھنے والے افسروں اور جنگجو عملے کی تربیت کرنی چاہیے۔"

ان دنوں ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی اور اس کے محاذی ادارے اپنے طور پر کچھ کرنے کے اہل نہیں لہٰذا وہ اپنے بین الاقوامی رہنماؤں کی ہدایت کے مطابق نفوذ کی حکمتِ عملی پر کاربند ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کانگریس کے کچھ لیڈروں کو اس خطرے کا احساس ہے۔ مثال کے طور پر سنجے گاندھی نے "نقلی اینٹی فاشسٹوں" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان دنوں وہ لوگ بھی اینٹی فاشسٹ ہونے کے مدعی ہیں جنھوں نے اس پارٹی کے ساتھ مل کر وزارتیں قائم کی تھیں جسے آج وہ فاشسٹ قرار دے رہے ہیں۔ ان کا اشارہ واضح طور پر کیمونسٹ پارٹی کی طرف تھا جس کا انجمن ترقی پسند مصنفین ایک ذیلی دستہ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس یقیناً کیمونسٹ پارٹی کی نئی حکمتِ عملی کے تحت ہی منعقد کی جا رہی ہے۔ ادیبوں اور دانشوروں کا ہمیشہ یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ سیاسیین سے کم زیرک نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو انھیں اس حکمتِ عملی کو سمجھنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آئے گی اور نام نہاد ادبی کانفرنس کے پیچھے کیمونسٹ پارٹی کا جو چہرہ چھپا ہوا ہے اُسے وہ بہ آسانی پہچان لیں گے۔

•••

سفید مونچھوں کا رکھنا

کرشن موہن

سفید مونچھوں کا رکھنا عجیب لگتا ہے
کسیلے میوے کا چکھنا عجیب لگتا ہے
مگر عجیب وقوعے بھی پیش آتے ہیں
کہ ہے عجیب حقیقت میں فطرتِ انساں
خدا کی طرح نمائش پسند ہے یہ بھی
سفید مونچھوں کو ہر آن تاؤ دے دے کر
سمجھ رہا ہے بشر
چلو مظاہرہ یہ بھی سہی بزرگی کا۔
مگر ذرا سوچو
یہ سال خوردہ بزرگی بھی کیا بزرگی ہے
بزرگ لوگ کئی سال بھوگ کر ہیں بزرگ
سفید مونچھوں کے پت جھڑ میں رس نہیں باقی
کسیلے میوے سے رکھتے ہو کیوں مٹھاس کی آس
شعور ہو تو جوانی بزرگ ہوتی ہے
گراں وقار، ستودہ سترگ ہوتی ہے
نہ ہو سلیقہ تو پیری بھی خون روتی ہے
اسی لیے یہ بزرگی کا نقرئی زیور
یہ مان کا تیور
شباب کیش ہوں مَیں، راس ہی نہیں آتا
سفید مونچھوں کا رکھنا مجھے نہیں بھاتا

●●●

کرشن موہن ـــــ 8124 پنڈارا روڈ ـــــ نئی دہلی

کمار پاشی | نظمیں : شریف زادوں کے لیے

۱

پل ہی پل میں یہ سارا تماشا ہوا
شہر کے پانو میں سنسناتی ہوئی
ایک گولی لگی
اور وہ چکرا کے
دھرتی پہ اوندھا گرا
دیکھتے دیکھتے ، اس کے چاروں طرف
خون کا ایک تالاب سا بن گیا

جھاڑیوں میں ڈری سہمی چڑیاں اڑیں
اونچے اونچے درختوں کے
گنجان پتّوں میں دبکے ہوئے
سب پرندے اُڑے
چیختے چیختے ——
اور دہشت زدہ آسمانوں
کے صحراؤں میں کھو گئے
خون کا ایک چھوٹا سا تالاب ہے
اس میں چپ چاپ اوندھا پڑا شہر ہے

کاش دے کر ذرا سا سہارا اسے
اب اٹھا لے کوئی
اس کی ایڑی کی ہڈّی میں اٹکی ہوئی
گرم، زہریلی گولی نکالے کوئی
شہر زندہ ہے اب تک
بچا لے کوئی ——

۲

جھوٹ، گوشت ہے بڑے جانور کا — خستہ
نمکین اور کھٹا ——
جب سے میرے دانت اُگے ہیں
چبا رہا ہوں
خون کی بوسیدہ نلیوں میں
سچ کتنی مقداریں باقی ہے
اندازہ لگا رہا ہوں
تم ہی بتاؤ :
کیا جھوٹا ہوں ؟

۳

پُرانے شہر سے جب لوگ لوٹیں گے
مجھے پہچان لیں گے
میری گردن میں وہی زنجیر ہو گی
جو مجھے بخشی گئی تھی وقتِ پیدائش

میں کہہ دوں گا : کہیں خاموش ہوں اب تک
دکھا دوں گا لباسِ خوں چکاں ان کو
شکستہ جسم و جاں ان کو

پُرانے شہر کے لوگو !
کبھی آؤ —
مری دھرتی کی مٹّی سے مجھے باہر نکالو
میرے ہونے کی گواہی دو ——
پُرانے شہر کے لوگو ——

●●●

کمار پاشی —— ڈاکٹرز ہوسٹل —— ارون ہاسپٹل —— نئی دلّی

تجلّی

سعادت احمد

جہاں خودغرض انسانوں کا ہجوم نہ ہو، اُس لق و دق صحرا میں جانا ہے مجھے۔ جہاں دھوپ کی تمازت سے چمکتے ہوئے ریت کے ذرّے ہی میرے دوست ہوں —— یہی میری منزل ہے میں جا رہا ہوں اُس منزل کی طرف وہی میری آخری منزل ہوگی —— میں رواں دواں ہوں اُس منزل کی طرف اور میری گود میں روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہیں جن کو میں پیٹ بھرنے کے لیے کھا لیتا ہوں ......

میں اُس منزل کی طرف جا رہا ہوں کہ آج تک کوئی بھی اس کی سرحد تک نہیں پہنچ سکا وہ سرحد جہاں ارضی اور سماوی راز پوشیدہ ہیں، جہاں کینہ و دزد اور بے درد اور تنگ ذہن، کم ظرف انسانوں کا ہجوم نہیں ہے —— جہاں ایک ہستی موجود ہے جس سے میری شناسائی اس وقت کی ہے جب کہ میں ابھی بہت چھوٹا تھا اور شعور کی سرحدوں پر قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

جب میں سنِ بلوغ کو پہنچا تو اس نفرت اور عداوت کی دُنیا میں کچھ ایسا گم ہو گیا کہ اس پرانی آشنائی کا خیال ہی ذہن سے نکل گیا۔ ایک دن میں انسانوں کی بستی سے دور اس جگہ پہنچا جہاں ٹوٹے پھوٹے سرکنڈوں کی جھونپڑیاں تھیں ان جھونپڑیوں کے آگے پیچھے گندی نالیاں بہتی تھیں جن میں بدبودار پانی بہہ رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے سکون سا ہوا۔ میں نے ہر جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا، جھونپڑیاں ویران تھیں —— مایوس ہو کر میں نے جانے سے پہلے ایک اور جھونپڑی میں جھانکا جو بہت زیادہ بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اس جھونپڑی کے کونے میں مجھے اچانک ایک متحرک سایہ سا نظر آیا میں چند قدم آگے بڑھا اور غور سے دیکھنے لگا وہ سایہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک انسانی جسم تھا۔ اس کے چہرہ کا چاند خشک اور پریشان بالوں کی لٹوں میں روشن تھا۔ مگر آخرِ شب کے چاند کی طرح۔ پھیکا، بے رونق سا، اُداس ...... جسم پر جگہ جگہ ہڈیاں ابھر آئی تھیں مجھے دیکھ کر وہ مُسکرا اٹھی کتنی معصوم اور مظلوم ہنسی تھی اُس نیم جان ہستی کی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے چاہا کہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لوں اس لیے کہ وہ الف ننگی تھی —— لیکن میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا تاکہ اس کو کھڑے ہونے میں سہارا دوں پر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور پھر میری نظریں اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی اس کے قدموں پہ جا کر رُک گئیں۔ جن کے نیچے کنول کا پھول تھا۔ سوکھا مرجھایا ہوا کنول ——

اس کو پہچاننے کی یہی ایک نشانی تھی —— ! میں نے اسے پہچان لیا۔ اور پہچان کر حیران رہ گیا۔ مجھے گم صُم دیکھ کر وہ آگے بڑھی۔ میری گردن میں اپنی سوکھی سوکھی سی بانہوں کا ہار پہنانا چاہا —— میں دفعتاً چونک گیا گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور پھر بے تحاشہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ہانپتا کانپتا حیرت اور وحشت کا مارا۔ میری حیرت، میری مایوسی۔ میرے دل کی کیفیت کا کون اندازہ کر سکتا ہے!

وہ ایک سائے کی طرح میرا تعاقب کرتی رہی۔ پہاڑیوں اور ندیوں کو پھلانگتا ہوا میں بھاگتا رہا۔ آخر ایک میدان میں جس کے ایک طرف گھنا جنگل تھا اس نے مجھے پکڑ ہی لیا۔ اور ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولی "تم مجھ سے بھاگ کر کہاں جا رہے ہو؟ دیکھو —— میں تمہاری ابدی اور ازلی تلاش ہوں۔ جس کے لیے تم صحرا نورد بنے ہیں وہی ہوں —— تمہارے صدیوں کے سفر کا حاصل۔ تمہاری تمنّا کا ساحل۔ تم مجھ سے پیچھا چھڑا کر کہاں جاؤ گے؟"

"نہیں —— تم وہ نہیں ہو؟"

"میری بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر کہتے ہو تم کہ میں وہ نہیں ہوں؟"

وہ زخمی لہجے میں بولی "میری ہیئت بدل گئی ہے۔ مگر میں وہی ہوں!"

میں تذبذب میں پڑ گیا —— کچھ سوچنے اور سمجھنے سے پہلے ہی وہ ایک طرف ہو گئی —— اور پھر میدان کے اس طرف پھیلے ہوئے گھنے

سعادت احمد —— ۲۲-۱-۴۹ —— سلطان پورہ —— حیدر آباد —— (اے پی)

جنگل کی طرف لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی بولی ـــــ" دوست کو پہچاننے میں تم غلطی کرسکتے ہو مگر میں نہیں ـــــ اس جنگل کے ایک پیڑ پر میری ایک دوست رہتی ہے جس کی مجھے تلاش ہے ۔ مجھے وہ مل جائے تو پھر تم سے شکوہ نہ رہے گا ناشناسی کا ـــــ"

اچانک بھیڑیے کے غرّانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں میں خوف سے لرزنے لگا اور سوچنے لگا وہ نیم جان نحیف و ناتواں خطرے میں ہے مجھے بہرحال اس کی مدد کو جانا چاہیئے اور میں اُس پیپل کے پیڑ کی طرف جانے لگا ـــــ تھوڑی دُور گیا تھا کہ مجھے بھیڑیا دکھائی دیا اور وہ بھیڑیے سے برسرِ پیکار تھی بھیڑیا اپنے خونخوار جبڑوں سے اس کی گردن چباڈالنے کے لیے بے تاب تھا، میں حیران و پریشان دُور ہی سے اس کو بھیڑیے سے لڑتا ہوا دیکھ رہا تھا ـــــ اس میں ایک ملکوتی قوت عود کر آئی تھی وہ بھیڑیے کی طرف جھپٹ پڑی اور اُس کے جبڑوں پر بے تحاشہ گھونسے برسانے لگی یہ منظر دیکھ کر مارے دہشت کے میرے اوسان خطا ہونے لگے اور میرا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا کچھ ہی دیر بعد بھیڑیا گھبرا کر بھاگنے لگا اور وہ اس کے تعاقب میں دوڑ رہی تھی۔
اس طرح اُسے اور بھیڑیے کو میں وہاں تک دیکھ سکا جہاں سورج افق میں اُترتا ہے اور پھر وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے ـــــ

ـــــ اور میں حیران و پریشان اپنی منزل کی طرف جا رہا ہوں جہاں افق کے پار ایک ہستی رہتی ہے ۔ جس کو دوست بنا کر مجھے ابدی سکون حاصل ہوگا ـــــ اس لیے کہ سارے فریبی انسانوں کے ہجوم میں میرے بچھڑے ہوئے ساتھی کا غم جو میری روح میں بس گیا ہے اُسے میں نکال نہیں سکتا ـــــ

اگرچہ میرا سفر نہایت صبر آزما اور کٹھن ہے پر میں ضرور منزل پر پہنچ جاؤں گا اور مجھے اُس بھیڑیے کی بھی تلاش ہے اور اُس فاختہ کی بھی، جس سے وہ ملنا چاہتی ہے.......

ـــــ میں چل رہا ہوں اپنی منزلِ مقصود کی طرف ابھی میں خود پسند انسانوں کے ہجوم میں سے گذر رہا ہوں ـــــ نہ جانے کونسی کشش ہے کہ مجھے تھکن محسوس نہیں ہوتی جبکہ میری گود میں روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں جنھیں میں وقت بے وقت چبا لیتا ہوں پیٹ بھرنے کے لیے ـــــ لوگو! سنو میری آواز تمہارے کانوں تک ضرور جا رہی ہوگی ـ لوگ کیسے مکار اور خود پسند ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ اچھی اچھی غذائیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں کھائے جاؤ یہاں تک کہ غریب انسانوں کے پیٹوں میں آتیں معمولی غذا بھی نہ ہونے کے کارن چپک جاتی ہیں، آپس میں بل کھا جاتی ہیں اور اگر یہ غریب لوگ میرے ساتھ سفر میں شریک ہونا چاہیں تو بخوشی میں انھیں اپنے ساتھ لیتا چلوں گا اور اپنے دوست سے ضرور ملاؤں گا جبکہ اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت فاختہ ہوگی ـــــ

میں گذر رہا ہوں خوفناک صحرا سے ۔ اور کہیں دور بھیڑیے کے غرّانے کی آوازیں آرہی ہیں ـــــ ہاں یہ اسی بھیڑیے کی آواز ہے جو میرے دوست کو ہلاک کرنا چاہتا تھا مجھے اپنی منزل پر پہنچنا ہے خواہ درمیانِ راہ مجھے اُس بھیڑیے سے لڑنا ہی کیوں نہ پڑے ۔ اس لیے کہ میرا ارادہ مصمم ہے اور میرا حوصلہ بلند ہے ۔ بلند ہمتی میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے ۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اس بے آب و گیاہ صحرا میں مجھے ایک پانی کا چشمہ ملا اور اس کے کنارے ایک سیب کا درخت تھا میں نے دیوانہ وار درخت سے ایک سیب توڑا اور کھا گیا ـــــ پھر شکم سیر ہو کر پانی پیا تو دوسری طرف چشمہ کے کنارے ایک کافر ادا حسینہ بیٹھی ہوئی تھی ۔ میں نے اُسے قطعی پہچانا نہیں لیکن اس نے مجھے دیکھا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور میرا نام لے کر میری جدائی کی روداد سنانے لگی اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہے میں نے اُس سے معذرت چاہی اور اس کا نام پوچھا اُس نے بڑی بے تکلفی سے اپنا نام بتایا ـــــ

" اوہ ـــــ تم ـــــ وہی ہو ! تم تو بھیڑیے کے حملے سے ہلاک ہو چکی تھیں نا ـــــ !" میں نے تعجب اور حیرت سے اُسے آزمانے کی خاطر کہا ـــــ

"ہاں ـــــ ہاں میں تمہاری تمنا ہوں جس کو تم ڈھونڈ رہے تھے ۔ اور مجھے اُس بھیڑیے کی تلاش ہے تاکہ میں اُسے اس میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا نگراں بناؤں ـــــ"

یہ سُن کر میں اور بھی حیران ہو گیا اور سوچنے لگا کہ یہ میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہے ! تاکہ میں اپنی منزل پر نہ پہنچ سکوں اور اپنے دوست سے نہ مل سکوں اور اسی صحرا میں بھٹکتا پھروں اس طرح ایک دن میرا کام تمام ہو جائے گا ۔ کیونکہ یہ حسینہ اس پانی کے چشمہ کی مالک و مختار بننا چاہتی ہے ـــــ !

میرے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر اس نے کہا آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ میں وہی ہوں تمہاری پرانی پہچان اور مجھے اس بھیڑیے کو اپنے قابو میں لانا ہے۔ اِدھر اس نے اپنے الفاظ پورے ادا کیے بھی نہ تھے کہ اُدھر بھیڑیے کے غرّانے کی آوازیں صحرا میں گونجنے لگیں اور وہ بے تحاشہ بھاگنے لگی اس کے ہونٹ مارے خوف کے خشک ہو چکے تھے میں نے اُسے پکارا رک جاؤ تم وہی ہو۔ رُک جاؤ تم واقعی میری ہو دیکھو بھیڑیا آ رہا ہے تم تو بھیڑیے کو پکڑنا چاہتی تھیں نا ـــ لیکن اُس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اس لیے کہ وہ بھیڑیے کی آواز سُن کر لرزہ براندام ہو گئی تھی ـــ اس کے فربہ بدن کا گوشت مارے وحشت کے تھرتھرا رہا تھا ـــ کیونکہ وہ میری نہیں تھی ـــ وہ تو دبلی پتلی اور نحیف ناتواں اداس ـــ جس کے چہرے پر مظلومیت کے آثار تھے ـــ اس کی مسکراہٹ بڑی ہی معصوم اور میٹھی تھی۔ اور پھر میں جنونِ شوق میں اس کو اپنانے کی آرزو لیے جانبِ منزل چلتا ہی رہا یہاں تک کہ صحرا کی تپتی ہوئی ریت سے میرے پیروں میں آبلے پڑ گئے ـــ

قرمزی سورج افق میں چھپ رہا تھا اور میری نظروں کے آگے میری منزل تھی کچھ دور مجھے ایک سایہ دکھائی دیا ـ میرے دل نے کہا یقیناً وہ وہی ہے جس کی مجھے تلاش تھی ـــ میرے زخمی پیروں سے خون رِس رہا تھا۔ آبلے پھوٹ پھوٹ کر پانی بہا رہے تھے۔ میں اور تیز تیز چلنے لگا یہاں تک کہ میں جب اس سائے کے قریب پہنچا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ سایہ وہی بے رونق سا اجڑا اجڑا اس بیابانِ ہستی کا تھا ـــ اور ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ اور وہ حسین لڑکی ـــ اس چشمے پر میں پہلے بھی آ چکا ہوں جس کی مہک اب تک میرے سانسوں میں بسی ہوئی ہے اور یہ چشمے کا بہتا ہوا میٹھا اور ٹھنڈا پانی اس کا گواہ ہے۔

ـــ وہ اور وہ بھیڑیے کا ڈھانچہ آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہی تھی اور ریت کے بے شمار ذرے اس کی ہڈیوں سے لپٹے ہوئے چمڑے سے چپکے ہوئے تھے۔ اور سورج کی قرمزی کرنوں سے چمک رہے تھے ـــ میں نے دیکھا اس کے دائیں ہاتھ پر فاختہ بیٹھی ہوئی ہے اور کچھ فاصلے پر ایک مردہ بھیڑیا سرنگوں ہے جو اپنے مردہ بدن کی سڑاند سے فضا میں بو پھیلا رہا ہے اور اس کے پیٹ سے ایک گِدھ چمٹا ہوا ہے ـــ

"تم ذرا ٹھہر جاؤ ـــ" اس نے فاختہ کے سر کو چومتے ہوئے کہا ـــ "ذرا کچھ انتظار اور ـــ پھر میرے دوست کی مسیحائی دیکھ سکو گے ـــ!"

ایک تاریک غبار سا بلند ہوا ـــ اور میرے اور اس کے درمیان حائل ہو گیا ـــ تاریکی کے پس منظر میں پھر ایک چکاچوند سی ہوئی۔ ایک لمحہ کے لیے ایک جانا پہچانا ملکوتی حسن مجسم ہو کر ابھرا ـــ اور دوسرے ہی لمحے میں بے ہوش ہو کر گر پڑا ـــ کوہ و بیاباں جلنے لگے ـــ

آگ بجھی ـــ آنکھ کھلی تو پھر ایک لق و دق لامحدود صحرا میرے آگے تھا ـــ اور میں وحشی بگولے کی طرح پھر آوارہ ہو گیا ـــ تلاشِ منزل کی پھر مجھے صحرا نورد بنائے ہوئے ہے۔

میں اب بھی گرمِ سفر ہوں۔ ڈھونڈ رہا ہوں۔ ترس رہا ہوں ایک لمحہ کے لیے ـــ لمحۂ دیدار کے لیے ـــ

●●●

قوم ترقی کی راہ پر

عدم مساوات کو کم کرنے کی طرف پیشقدمی

اب 8,000 روپے تک کی سالانہ آمدنی پر انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا (پہلے یہ سد 6,000 روپے تھی)۔ اس سے 7 لاکھ انکم ٹیکس دہندگان کو راحت ملی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پچھلے سال نوٹس کے ذریعے 1.33 لاکھ ایسے لوگوں کو انکم ٹیکس دہندگان کے دائرے میں لانے کی کارروائی کی گئی جو پہلے انکم ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔

اب آپ نجی بچتوں کے ذریعے بھی زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سالانہ 4,000 روپے تک کی بچتیں ٹیکس سے بالکل مستثنیٰ ہیں۔ البتہ سرکار کو دھوکا دینے والے افراد سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔

مضبوط ارادہ
اور کڑی محنت
ہمارے ساتھی ہیں

ش۔ک۔نظام | تازہ، نیا اور جدید — ایک تجزیہ

عام بول چال میں جب ہم لفظ "جدید" استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں تازہ یا نئی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن ہر تازہ یا نئی تخلیق جدید تخلیق کہی جانے کی مستحق نہیں۔ کیونکہ تازہ تخلیق سے مراد وہ تخلیق ہے جو حال ہی میں خلق ہوئی ہے۔ اس کی نوعیت سے کوئی بحث نہیں یعنی لفظ "تازہ" کا استعمال FRESH یا LATEST کے معنوں میں، زمانے کے ضمن میں ہوتا ہے — ہم میں سے اکثر جب لفظ جدید استعمال کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں، اگر تازہ نہیں تو، نئی تخلیق ہوتی ہے، یہ بھی درست نہیں۔ اِن تینوں اصطلاحوں میں فرق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادبی تنقید میں یہ تینوں لفظ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں لیکن جڑے ہوتے ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔ تازہ تخلیق جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے زمانۂ حال سے تعلق رکھتی ہے، جب کہ نئی تخلیق وہ تخلیق ہے جو مروجہ تمدّن صنفِ سخن کو متاثر کرے۔ مروجہ تمدّنِ صنفِ سخن کو نئی تخلیق کیسے متاثر کرتی ہے اس کی مثال میں غزل کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

غزل ہی کو اس لیے کہ اگر ہم مطلوبہ تجزیہ میدانِ نظم میں کریں گے تو کوئی کہے گا کہ نظم نے ردیف، قوافی اور بحور سے بغاوت کی ہے۔ کوئی کہے گا نظم بحر کو توڑ کر لکھی جا رہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظم بحر کو توڑ کر نہیں چھوڑ کر لکھی جا رہی ہے۔ اور بحر کی جگہ وہاں لَے نے لی ہے۔ لَے فضا تشکیل کرتی ہے۔ غزل کے ضمن میں کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ غزل کو ہیئت کے اعتبار سے تبدیل کیا گیا ہے۔ اور اگر غزل کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات نہایت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ غزل میں ہندوستانی تہذیب کی طرح جذب کرنے کی غیر معمولی قوت ہے۔

خیر نئی تخلیق مروجہ تمدّنِ صنفِ سخن کو کس طرح متاثر کرتی ہے اس کی مثال مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھیے ؎

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سَو مرتبہ لوٹا گیا

اور

دل کی بستی پرانی دلی ہے
جو بھی گزرا ہے اُس نے لوٹا ہے

دونوں اشعار میں "دل"، "لوٹا" اور "شہر" (پہلے شعر میں نگر بہ معنی شہر ہی نظم ہوا ہے) مشترک ہے۔ قافیہ کے لحاظ سے دونوں میں فرق نہیں ہے پھر بھی ان میں (بحر کے علاوہ) کچھ نہ کچھ تو فرق ہے ہی اور یہ فرق ہی نئی اور پرانی غزل (تقلیدی نہیں) کا فرق ہے۔ بہ غور پڑھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے شعر میں "کیا مذکور ہے" توجہ طلب ہے اور لفظ "کیا" خاص توجہ کا مستحق ہے۔ دوسرے شعر میں "بستی"، "پرانی دلی" اور "جو بھی گزرا ہے" قابلِ توجہ ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر نے "پرانی دلی" کے استعمال سے ہمیں ایک پورے تاریخی پس منظر کے روبرو کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ لوٹنے کا استعمال ہمارے ذہن کو تباہی اور بربادی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ پہلے شعر میں "دل" "پرانی دلی" نہیں بلکہ صرف دلی سمجھا جا سکتا ہے جب کہ دوسرے شعر میں پرانی دلی کسی نئی دلی کا پتہ دیتی ہے۔ بقابلِ روایت کے باوجود یہ شعر نیا ہے۔ کیوں کہ اس کا اسلوب نیا ہے — اسلوب کا ایک جز تمثیل نئی ہے — اس طرح ایک بات سامنے آتی ہے کہ نئی تخلیق میں اسلوب نیا ہوتا ہے خواہ قافیہ ایک یا ایک سا ہی کیوں نہ ہو — [illegible] کے برعکس

ش۔ک۔نظام — کلاّ اسٹریٹ — جودھپور — (راجستھان)

یہ دو شعر دیکھیے ؂

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

اور

غضب ہے آدمی کے واسطے مجبور رہ جانا
زمیں کا سخت ہونا آسماں کا دور ہو جانا

ما فیا تو ایک ہے ہی، اسلوب کے اعتبار سے بھی ان میں کوئی فرق نہیں۔ چند الفاظ کی ردّ و بدل ضرور ہے اور دوسرے شعر میں اس ردّ و بدل نے ایک جھول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ برجستگی کے حسن کو غارت کر دیا ہے —— اس طرح کی شاعری ہی تقلیدی شاعری ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر اس عہد میں رہ کر بھی رنگِ داغ میں شعر کہتا ہے تو وہ داغ کا ہی ہم عصر ہے۔ اس کا جسم یقیناً اسی دور میں سانس لے رہا ہے لیکن اس کا ذہن اُس معاشرے میں مصروفِ خرام ہے جس کی اہمیت اب قصۂ پارینہ سے زیادہ کچھ نہیں، اور جس کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یاد رکھیے ضرورت اور اہمیت میں فرق ہے۔ ہر اچھا شاعر روایتی ہوتا ہے لیکن روایتی اور دقیانوسی میں بہت فرق ہے۔

نئے اور ہم عصر کے ضمن میں پروفیسر احتشام حسین کے یہ اقوال بھی غور طلب ہیں :-

۱۔ "نئی شاعری سے میں تو عام طور پر وہ شاعری مراد لیتا ہوں جو گزشتہ تیس۳۰ سال میں کی گئی"

۲۔ "میں ترقی پسندوں کو نئی شاعری میں شامل سمجھوں گا"

(کتاب۔ سالنامہ، ۱۹۶۹ء ص۱۱)

خاص و عام سے قطع نظر پہلی بات نظرِ ثانی کی طلبگار ہے۔ کیوں کہ اس ابہام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بسمل الٰہ آبادی اور وسیم بریلوی بھی نئی شاعری کے زمرے میں شامل ہو جانا چاہیں گے جب کہ ان کی حیثیت تقلیدی شاعر سے زیادہ نہیں۔ ترقی پسندوں کو نئی شاعری میں شامل سمجھنا بھی بحث طلب ہے کیونکہ یہاں نیا جدید کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اگر نہ بھی ہوتا تو بھی ترقی پسند نئے شاعروں میں شامل نہیں کیے جا سکتے۔ بصورت دیگر انھیں نئے شاعروں کا ہم عصر سمجھنا ہوگا جو درست نہیں —— ترقی پسند شاعری جیسا کہ سب جانتے ہیں ایک خاص مقصد کے تحت وجود میں آئی۔ اس نے ایک بنے بنائے عقیدے کی تبلیغ کی ہے۔ بنے بنائے سکّہ بند عقیدوں کی تبلیغ کرنے والا مبلغ ہوتا ہے، شاعر نہیں۔ عقیدے کے متعلق ٹی۔ ایس ایلیٹ کہتا ہے "شاعرانہ عقیدہ محسوس کردہ عقیدہ ہے نہ کہ وہ عقیدہ جس پر ہم کاربند ہیں"۔ آپ ترقی پسند شعری سرمایہ کا مکرر مطالعہ فرمائیے، آپ پائیں گے کہ وہ جس سماج کی بات اپنی شاعری میں کرتے ہیں اُس سماج میں خود ان کی حیثیت ایک outsider سے زیادہ نہیں۔ ان میں سے اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ادب حالات کے اظہار کا نام نہیں ہے۔ ادب اظہار کا نام یقیناً ہے لیکن اُس اظہار کا جو حالات کے انسانی اذہان پر اثر انداز ہونے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اسی لیے ادب "کیا ہونا چاہیے" کی بات نہیں کرتا۔ اسے ہمارے ملک اور خاص طور پر اردو کی بدقسمتی سمجھئے کہ ہمارے یہاں جس تعداد میں شعر سنے جاتے ہیں اُس کا عشرِ عشیر بھی پڑھے نہیں جاتے۔ اس سننے سنانے کے چکّر نے ہمارے یہاں سماعی شاعری کو فروغ دیا۔ سماعی شاعری کے شور اور تبلیغی جذبہ کی شدّت سے مغلوب چند حضرات نے ایک اور نعرہ اُچھالا "ادب عوام کے لیے"۔ لیکن "کے لیے" اور "کا" میں معلوم نہیں کیوں تمیز کرنا بھول گئے۔ ادب عوام کے لیے نہیں ادب عوام کا ہوتا ہے۔ ایک بات بہت واضح ہے کہ آدمی جن مصائب سے دوچار ہے اُس حالت میں اُسے کسی طرح کی شاعری یا ادب کی ضرورت نہیں۔ اُسے آپ کی تمام باتیں مسخرا پن لگتی ہیں۔ چیخوف نے ایک جگہ لکھا ہے :

"یہ کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ اور جملے چاہے کتنے ہی خوبصورت اور معنی سے بھرپور ہوں صرف اُداسین لوگوں کو ہی متاثر کر سکتے ہیں۔ جو خوش ہیں یا مصروفِ ماتم ہیں انھیں نہیں —— قبر پر کی گئی تقریر غیر متعلق لوگوں کے دلوں کو ہی متاثر کر سکتی ہے۔ مرحوم کی بیوہ اور پس ماندگان کو وہ تصنع سے

سے بھرپور اور معمولی ہی لگتی ہے۔"
اِس ضمن میں محمد تقی میر کا یہ شعر بھی توجہ طلب ہے ؎

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر کے خاص ہی تھے، کے ادا سین لوگ ہیں۔ میر کے ثانی مصرع سے صاف ظاہر ہے کہ عوام تک ان کی بات یا تو ترسیل نہیں ہوتی یا عوام کو ان کی گفتگو میں دلچسپی نہیں ہے۔ شاعری اگر اعلیٰ طبقے کی تفریح کا سامان نہیں تو اُسے عوام کی تفریح کا سامان بھی نہیں ہونا چاہئے۔ پاٹ دار آواز اور چونکا دینے والی تراکیب کا سامع حیران و ششدر شعر خوانی سے قبل کی گئی تقریر سے مرعوب "معلوم نہیں کیا؟" کا تاثر لے کر لوٹتا ہے۔ سماعی شاعری سے اس سے زیادہ کی توقع بھی بے سود ہے ——

دوسری بات یہ کہ ترقی پسندوں کی توجہ کا مرکز صرف "کیا کہا" رہا "کیسے کہا" کو انھوں نے نظر انداز کر دیا۔ یہ "کیا کہا" کی ضد ویسی ہی ہے جیسے تقلیدی شاعری میں "کیسے کہا" ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی ادب پارہ میں "کیا" اور "کیسے" دونوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ دونوں ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں۔ لیکن ان دونوں کے مقابلے میں زبان کا تحفظ شاعر کا فرضِ اوّلین ہے۔ میں یہاں "زبان" کو ان معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں جن معنوں میں ہمارے تقلیدی شعرا کرتے رہے ہیں۔ شاعر کا زبان کے متعلق کیا فرض ہے اس کے لیے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا یہ قول دیکھیے ——

"شاعر کا فرض بحیثیت شاعر، لوگوں سے بالواسطہ ہے۔ زبان کی طرف سے اس پر فرض عائد ہوتا ہے۔ اس کا پہلا فرض زبان کو محفوظ کرنا ہے اور دوسرا زبان کو وسعت اور ترقی دینا ہے۔"

اِن دونوں باتوں کی روشنی میں ترقی پسندوں کو نئے شاعروں میں شامل سمجھنا خاکم بدہن درست نہیں۔ کیوں کہ ان کی اٹھان میں نمایاں فرق ہے اور کلنڈری تاریخوں سے ادب کے ادوار طے کرنا درست نہیں ——

خیر! تازہ اور نئی تخلیق کے اس تجزیہ کے بعد ہمارا تیسرا سوال یعنی جدید تخلیق سے کیا مراد ہے؟ تو جدید تخلیق سے مراد وہ تخلیق ہے جو مروجہ تہذیبِ صنفِ سخن پر اثر انداز ہو جس میں الفاظ کے مروجہ معنی کو وسعت دی گئی ہو، الفاظ کو نئے معنی دیے گئے ہوں۔ جدید تخلیق الفاظ کو نئے ابعاد دیتی ہے اُنھیں نئی تہذیب دیتی ہے —— لیکن نئے ابعاد، وسعت اور نئی تہذیب دینے کا مطلب الفاظ کا غلط استعمال نہیں ہے —— کیوں کہ لفظ کو بے جان سمجھنا غلط ہے۔ ہر لفظ ایک تہذیب ایک پوری تاریخ لیے ہوتا ہے۔ لفظوں کا مرنا سمجھ میں اسی لیے آتا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس معاملہ میں بھی ہمارے یہاں محقق کم مدقق زیادہ ہوتے ہیں۔ اور مدقق حضرات کی "آرام کرسی کی اصطلاح" ایک موضوع میں مستعمل لفظ کو دوسرے موضوع میں دوسرے معنوں میں سمجھنے کی توفیق نہیں دیتی۔ جغرافیہ میں "رات" لفظ صرف زمین کی گردش کے ایک پہلو کو اُجاگر کرنے کے لیے ہے لیکن شعر میں لفظ رات کبھی یاس، کبھی موت، کبھی جہالت، کبھی غم، کبھی تکلیف، وغیرہ وغیرہ کے معنوں میں نظم ہوتا ہے اس میدان میں جغرافیہ والی رات سے کام نہیں چل سکتا۔ زبان میں نئے الفاظ اظہار کی ضرورت کے تحت داخل ہوتے ہیں کسی فیشن یا دھاک جمانے کی غرض سے نہیں ٹھیک ویسے ہی متروکات کی فہرست بھی آرام کرسی پر بیٹھ کر مرتب نہیں کی جا سکتی آرام کرسی کے اصطلاح سازوں نے "تلک" لفظ کو متروک قرار دیا۔ اور "تک" کو اس کی جگہ استعمال کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اِس تلک کا کیا قصور تھا، اسے شاعری بدر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ آپ خود لفظ "تلک" کا تلفظ کیجیے دیکھیے اس میں کسی لامحدودیت کا احساس ہوتا ہے کہ نہیں؟ اب "تک" کا تلفظ کیجیے، دیکھیے خود بخود ایک محدودیت کا تصور ابھرتا ہے کہ نہیں؟ معلوم نہیں کہ آرام کرسیاں زبان کو جذباتی عناصر سے محروم رکھنا چاہتی تھیں؟ ہاں اگر ان کی انگشت نمائی اس پر ہوتی کہ دیکھیے فلاں شخص صرف وزن پورا کرنے کے لیے تلک کے بجائے تک یا تک کی جگہ تلک لکھتا ہے تو اس تخلیقی ذہن کا پتہ چلتا جس کی ہماری زبان کو ضرورت ہے۔ لفظ کے باب میں یہ تو ایک ضمنی ذکر تھا ورنہ لفظ کو لے کر ابھی ہماری زبان کو کئی تحقیقیں کرنا ہوں گی ——

تو اب یہ دیکھنا ہوگا کہ کوئی تخلیق کسی مروجہ تہذیب صنفِ سخن کو کیسے متاثر کرتی ہے۔ کیوں کہ اگر وہ اسے متاثر نہیں کرتی تو ہماری اصطلاح کے مطابق وہ تخلیق جدید کہی جانے کی مستحق نہیں ہے۔ صنفِ غزل کی مروجہ تہذیب یہ ہے کہ اس میں حسن و عشق کی باتیں کی جائیں۔ یا تصوف و فلسفہ کے نکات بیان ہوں۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہے۔ کسی شعر کا اپنے ماقبل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنے بعد کے شعر سے کوئی رشتہ ہوتا ہے۔ کیا ایسا کہنا صحیح ہے؟ ہر غزل میں ردیف، قوافی اور بحر کے علاوہ بھی تو کوئی نہ کوئی ہم آہنگی (Unity) ہوتی ہوگی۔ میرے نزدیک تو ہر غزل میں (جدید غزل میں) ایک اندرونی ہم آہنگی INNER UNITY ہوتا ہے۔ ایک درخت کی ہزار شاخوں کا ایک دوسرے سے تعلق نہیں تو نہ ہی لیکن اگر وہ ایک ہی درخت کی شاخیں کہی جاتی ہیں تو ان کے اندرونی نظام کی ذمہ داری بھی درخت کی ہی ہے کیا ایسا ممکن ہے کہ درخت اپنے اس عمل سے انکار کرے اگر ایسا کرے گا تو اپنے وجود سے انکار کرے گا۔ اس لیے غزل محض ہیئت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اندرونی ہم آہنگی سے بھی جڑی رہتی ہے جس کا تعلق موضوع سے ہے —— جدید غزل کے چند شعر دیکھیے ؎

دروازے کو پیٹ رہا ہوں پیہم چیخ رہا ہوں
اندر آکر کھل جا سم سم کہنا بھول گیا ہوں

صادق

وہ کون شخص تھا؟ کچھ دم بہ خود سا حیراں سا
جو آئینے میں کھڑا دیکھتا رہا مجھ کو

مخمور سعیدی

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی

ندا فاضلی

دن بھر میں دہکتے ہوئے سورج سے لڑا ہوں
اب رات کے دریا میں پڑا ڈوب رہا ہوں

محمد علوی

آنتوں میں بھر اسی بھیڑیے کی وہ دھنستا جائے گا
ہر برفیلی رات میں کہرا ماں بن کر گھرائے گا

ندکشور بوطو!

خشک دریا کو سمجھ لے کہ رواں ہے ہر سو
ایسا اندھا تو کوئی پچھلے بھی ساون میں نہ تھا

شمس الرحمٰن فاروقی

سڑک پہ بھیڑ لگی ہے تماش بینوں کی
میں ہوں کہ بجلی کے تاروں میں الٹا لٹکا ہوں

عتیق اللہ

چھ دنوں تک شہر میں گھوما وہ بچوں کی طرح
ساتویں دن جب وہ گھر پہنچا تو بوڑھا ہو گیا

کمار پاشی

ہماری اصطلاح کے مطابق اور بھی کئی شعر اور شاعر جدید ہیں یہ مثالیں محض ضمنی ہیں۔ جدید شعر کے کئی ابعاد ہوتے ہیں لفظ اپنا ایک الگ مفہوم بھی رکھتا ہے اور مروجہ مفہوم بھی۔ مثال کے طور پر آخری شعر دیکھیے۔ اس شعر میں 'بچوں'، 'بوڑھا' اور 'گھر' تفسیر طلب ہیں۔ ان کا تجزیہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ بچہ کی حیات میں بے فکری، لاابالی پن، شوخی۔ اشتیاق۔ غیر ذمہ داری سنا پنگا وغیرہ کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اگر کسی بچہ میں یہ باتیں نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے پتر اگیر یہ ہے ٹھیک اس کے برعکس بوڑھے میں پیرانہ مآل اندیشی۔ سنجیدگی۔ احساسِ ذمہ داری، اپنا ماضی زندگی کا تجربہ۔ حیات کا ایک اپنا معمول۔ جمود۔ موت کا خوف وغیرہ یہ تمام خصلتیں اس کے بوڑھے پن کا ثبوت ہیں۔ محفوظیت بچہ میں اور عدم محفوظیت بوڑھے میں ہوتی ہی ہے۔ گھر: ایک محفوظ مقام ہے۔ ایک فرد کی اپنی دنیا، جس کا باہر کی دنیا سے بے تعلق سا تعلق اور اسی گھر میں اس چھ دنوں تک بچہ رہنے والا کا بوڑھا ہو جانا، صرف چھ دنوں کی مدتِ مصروفیت کے بعد —— کیوں؟ آخر گھر پہنچنے پر ایسا کیا ہوا؟ یہ تمام باتیں ہمیں شعر کے باہر رہ کر بھی سوچنا ہوں گی —— جیسا کہ پہلے ہم دیکھ چکے ہیں شعر کو آسانی سے سمجھ میں آجانے والی چیز سمجھ لینا غلط ہے لیکن وہ معمہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ عوام کے لیے نہیں عوام کا ہوتا ہے۔ اس طرح

بت کھل کر سامنے آتی ہے کہ شعر کے قاری کا ذوق اور وجدان
قاری سے زیادہ تیز ہونا ضروری ہے ـــــ آدمی آج کے دور میں ایک استفہامیہ
یں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ جدید شعرا اس نئے آدمی کی ادبی دستاویز ہے جو سر شیا
ات منعکس ہونے کے بعد کلاڑ اتھرا یک زندگی جینے پر مجبور ہے۔ انتشاری اہی کی کیفیز
فیت اور مفاد پرستوں کی تفریقی فطرت نے نئے آدمی کو ایک
ی بے چہرہ کلچر میں سانس لینے کو مجبور کر دیا ہے جو آتش شان
اس لفٹ کی طرح ہے جس کی حرکت دالبعاد کے متعلق کچھ
یں کہا جاسکتا۔ یہ آدمی اس مضمحل ماحول میں رہتا ہے جہاں
فل مقاصد کے لیے سماجیت فرد کی پہلی نشانی ہے۔ مذہبی
بیت، مصنوعی تخم ریزی۔ ضبطِ تولید۔ سماجی بندش اور
لاتی کشمکش کا ایک لق و دق صحرا اس آدمی کے سامنے ہے جو
ر در بھی ہے اور زخم خوردہ بھی، جو قدم قدم پر رسمی اعتقادات
سعوبتوں سے دوچار ہے۔ ان اور ان جیسے تمام آلام کے
ہار کو فراریت کہنا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔

جدید تخلیق میں الہام جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی یہ عوام
تخلیق ہے لیکن اس کا مطلب سریع الفہم ہونا نہیں ہے۔
وں کہ شعر پڑھنا اپنے آپ میں ایک تجربہ ہے۔ اس لیے
ی ضروری نہیں کہ ہر آدمی کا مفہوم وہی ہو جو شعر کہنے والے
ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تقلیدی شاعر "خواہش" کے
یرِ اثر شعر کہتا ہے جبکہ تخلیقی فن کار کے لیے تخلیق ضرورت
ہے۔ خواہش اور ضرورت میں کیا فرق ہے یہ بہر حال ہمیں
منا ہوگا کیوں کہ اس کے بنا تقلیدی شاعری کو جدید شاعری
ے الگ کرنا ناممکن ہوگا۔

تازہ نیا اور جدید کا تجزیہ صرف غزل کی روشنی میں کیا گیا اور
بھی مختصر طور پر یہ حد بندی ادب کے لیے ضروری ہے یا نہیں
ایک الگ بحث ہے لیکن ایک باشعور قاری کے لیے ضروری
ہے۔ ہم سب کو، جو ادب کے قاری ہیں، الگ زاویوں سے
ی پہ سوچنا ہے۔

●●●

ہم اس سوال پر اپنے پڑھنے والوں کو اظہار خیال کی
دعوت دیتے ہیں ـــــ (ادارہ)

اگر کنبہ چھوٹا ہو تو والدین ہر بچّے پر زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور اسے زندگی کی زیادہ سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو بھی بحیثیت مجموعی اپنے وسائل کے بہتر استعمال کا موقع ملتا ہے۔

فیملی پلاننگ ہماری قومی ترقی کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے اور ہم نے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے کا تہیّہ کر رکھا ہے

اندرا گاندھی

davp 71/196

غزلیں

رفعت سروش

ایک تو یہ پاگل برسات
اس پر ہجر کی لمبی رات

کشتی ساحل تک آئی
پھر طوفاں نے کھائی مات

ذکر خزاں کا نکلا تھا
جا پہونچی پھولوں تک بات

کیسی بہار آئی یارو
پیڑوں پر ہیں پھول نہ پات

سب کے چہرے جھوٹے ہیں
کس سے کروں میں جی کی بات

زہر گھلا ہے دل میں مگر
ہونٹوں پہ ہے پیار کی بات

ہم تو بہت بدنام ہوئے
کر کے سروشؔ اس شوخ سے بات

•••

مظفر حنفی

تالاب سے نکل کے سمندر میں آگیا
اس بار سند باد مرے گھر میں آگیا

بے چہرہ گردنوں کی شکایت فضول ہے
معصوم ہاتھ قبضۂ خنجر میں آگیا

دیکھا ہی تھا خلا سے پلٹ کر زمین کو
ہر قطرۂ لہو مرے شہپر میں آگیا

دریا کے لاکھ ہاتھ مجھے روکتے رہے
میں نے لگام اٹھائی، بھنور میں آگیا

ایسی بلندیوں کی تمنا کبھی نہ تھی
ذرہ ہوں، گردباد کے چکر میں آگیا

سر پر گنا ہگار کے پھینکا نہیں ابھی
دھبہ کہاں سے ہاتھ کے پتھر میں آگیا

اس عہد میں جہاں بھی ہوا تیز و تند ہو
طوفان سا بیاضِ مظفرؔ میں آگیا

•••

محسن زیدی

رستے میں خاک ہو کے بکھرنا ضرور ہے
منزل تک اس عمل سے گزرنا ضرور ہے

جو سیڑھیاں لگا کے فلک پر پہنچ گئے
اک دن زمیں پہ ان کو اترنا ضرور ہے

تنکوں سے چاہے لوگ نشیمن بنا بھی لیں
تنکوں کو آندھیوں میں بکھرنا ضرور ہے

جی چاہتا تھا چلتے رہیں راستے کے ساتھ
منزل اب آگئی تو ٹھہرنا ضرور ہے

کتنا ہی سطحِ آب انھیں روکتی رہے
موجوں کو اپنی تہ سے ابھرنا ضرور ہے

محسنؔ شکست و ریخت ہے تعمیر کا رُخ
بننا جسے ہے اُس کو بکھرنا ضرور ہے

•••

[illegible]، آر۔ کے پورم، نئی دلی ○ C 156، ایم۔ ایم۔ جی۔ سی کالونی، نئی دلی ○ [illegible] محلہ بنگش، دلی

غزلیں

ڈاکٹر عنوان چشتی

یہ حادثوں کا سا سلسلہ لگے ہے مجھے
خود اپنے آپ میں کچھ ٹوٹتا لگے ہے مجھے

زمینِ دل پہ یہ اُمید کا اداس شجر
غموں کی دھوپ میں جھلسا ہوا لگے ہے مجھے

سُنا رہی ہے جو دُنیا بطرزِ بربادی
یہ واقعہ تو خود اپنا ہی سا لگے ہے مجھے

ترے سلوک سے اس درجہ ڈر گیا ہوں میں
خود اپنے آپ سے بھی خوف سا لگے ہے مجھے

ترا کرم تو مرے حال سے نُمایاں ہے
وہ کوئی اور ہے جو بے وفا لگے ہے مجھے

دکھائی دیتا ہے اپنی ہوس کا عکس اس میں
ترا بدن بھی [illegible]ئینہ سا لگے ہے مجھے

نہ جانے شہر [illegible]ا بات ہو گئی عنوآن
ہر ایک چہرہ [illegible] خوف سا لگے ہے مجھے

•••

قمر اقبال

دماغ ڈوبتے مہتاب سا لگے ہے مجھے
کروں جو یاد تو سب خواب سا لگے ہے مجھے

نہ جانے لوگ چلے جا رہے ہیں کس جانب
گذرتا وقت بھی سیلاب سا لگے ہے مجھے

ہرے ہیں جب سے مرے دل میں زخم یادوں کے
یہ دشت اور بھی شاداب سا لگے ہے مجھے

نِکل نہ آئے کسی روز توڑ کر سینہ
یہ دل بھی قطرۂ سیماب سا لگے ہے مجھے

تمام عمر لٹایا جہاں لہو میں نے
وہ شہر آج بھی بے آب سا لگے ہے مجھے

•••

راہی قریشی

یاد کیا — یاد کا سہارا کیا
اس کھِلونے سے دل بہلتا کیا

انجمن انجمن ہے تنہائی
شہر در شہر ہے تماشا کیا

ہم بھی دُنیا کو یاد آ نہ سکے
یاد آتی ہمیں بھی دُنیا کیا

میرے ہمراہ، میری منزل تک
یونہی چلتا رہے گا رستا کیا

زخم بھی زخم دیتی جائے گی
مسکرانے کی اِک تمنّا کیا

کس نے روکا گذرتے لمحوں کو
لَوٹ آئے وہ عہدِ رفتہ کیا

عکس مغموم ہے بہت راہیؔ
آئینہ اب نہیں شناسا کیا

•••

○ صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی ○ محلہ گھاٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر) ○ ۸۱، ودیا نگر کالونی، گلبرگہ

ابواللیث جاوید | شہر شہر

پریشان لمحوں کا درخت ننگا کھڑا اپنے سایہ کو ترس رہا تھا اور اُس کا سایہ دھرتی کی خوفناک آنکھوں میں سما چکا تھا۔ اس درخت کی چھاؤں میں پناہ لیتے ہوئے تمام چہرے یکایک دھوپ کی یلغار سے خوفزدہ ہوکر آسمان کی گہرائیوں میں کھو جانا چاہتے تھے مگر ہواؤں کا پردہ فضا کی چوکھٹ پر جھول رہا تھا۔ پردہ کا کوئی رنگ نہیں تھا اگر رنگ تھا بھی تو اُس کا کوئی نام نہیں تھا۔ رنگ کا نام دینا شاید اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کسی شخص کا نام دینا۔ رنگ کا مزاج اتنا عارضی ہوتا ہے کہ پل بھر میں ایک رنگ دوسرے رنگ پر غالب آکر آنکھوں کو دھوکا دے جاتا ہے اسی رنگ کی بے رنگی پر وہ دیر تک اپنے جسم کی سُرنگ میں بیٹھا سوچتا رہا مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ اور جب وہ اپنی سوچوں کے جہنم سے باہر نکلا تو شعلوں کی دیواروں کے درمیان شہر بُری طرح گھرا ہوا تھا۔ اُس نے جس طرف نگاہیں اُٹھائیں شعلوں کی زبان ہواؤں کے رُخسار چاٹ رہی تھی اور سبھی در و دیوار پگھل پگھل کر خاک میں جذب ہو رہے تھے اور تمام عمارتیں اپنی عُریانیت پر شرمندہ ہوکر سرنگوں تھیں۔ وہ عمارتوں کی لجائی آنکھوں میں جھانکتا، سڑکوں کی پسلیاں توڑتا، گلیوں کی ناک سے ٹکراتا شہر کے جسم کو ٹٹولتا رہا۔ خون میں گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب وہ شہر کے دل کے قریب پہنچا رقصِ شرر جاری تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آگ کی بارش اور پھر آتش نمرود کی پشیمانی کا نظارہ گھوم گیا۔ شہر کی اس شعلہ بار فضاؤں کے لیے طوفانِ نوح کی ضرورت تھی مگر شاید پاکباز لوگوں کے تحفظ کے لیے کسی کشتی کا انتظام نہیں ہو پایا تھا اور نہ ہی آسمانوں سے باتیں کرتا کوئی پہاڑ ہی تیار تھا۔

وہ آگے بڑھا اور گلیوں میں پہونچ کر تہہ بہ تہہ حقیقتوں کی آنکھوں میں سماتا گیا جہاں مندمل اور مسخ چہروں کا عکس اُبھر اُبھر کر گم ہوتا جا رہا تھا۔ کسی نے اندر سے سوال کیا ——

”ہریالی بانٹنے والے کہاں ہیں ان دنوں؟“

”اُن کی اپنی ہی روح شاید اُن کا بوجھ بن گئی ہے!“ باہر سے کسی نے جواب دیا۔

”ہواؤں میں گھلی مٹھاس کون چُرا لے گیا؟“ اندر کا دوسرا سوال تھا۔

”زہریلی آنکھوں والے نگہبان ——!!“

”دھرتی کی کوکھ سے اب سورج کیوں نہیں اُبھرتے!!؟“

”رتھ کے گھوڑوں کا رُخ دوسری دُنیا کی طرف موڑ دیا گیا ہے —!“

”رات کی پلکوں پر . . . . . . “ اندر کوئی خاموش ہوگیا اور اُس نے باہر اُبھرنا چاہا مگر ’کیوں‘ بوجھل ماحول کے چہرے پر مسلط تھا اور ’اس کیوں‘ کی ضرب کو مزید برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہر قدم سے اُس کی غلاظت چپٹی ہوئی تھی اور مکھیاں فضاؤں میں بھنبھنا رہی تھیں۔ یہ مکھیاں اکثر اس کے جسم پر اُبھرے ہوئے زخموں پر بیٹھی رہتیں اور اسے اذیتیں پہنچایا کرتیں مگر جب وہ اس دور کے سبھی لوگوں کو ان مکھیوں سے اُلجھا ہوا دیکھتا تو اسے اطمینان ہو جاتا۔

”مکھیاں آزاد چھوڑنے والوں کو مناسب سزا کے لیے بڑے سردار کے حوالے کریں“ منادی کی ننگی آواز ناچی اور لمحہ بھر کے لیے اُسے خوش کر گئی۔ وہ ان مکھیوں کی ایذارسانی سے بالکل تنگ آچکا تھا اور اُسے آخری دن کی تلاش کی طرح بڑے سردار کی بھی تلاش شروع ہوگئی۔

وہ تاریک گلیوں سے نکل کر بازار کے نکڑ پر کھڑا چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چاروں طرف جسم کی شرمندگی شرما رہی تھی اور اُس کے بدن پر لرزہ سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔ ننگے لوگوں سے اس نے بہت کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ سب کے سب اپنی دونوں مٹھیوں سے مکھیاں چھوڑنے میں منہمک تھے۔ وہ

ابواللیث جاوید —— بندیشوری کمپاؤنڈ —— جیل روڈ —— مظفرپور —— (بہار)

آگے بڑھا اور ان لوگوں کے قریب سے گزرتا رہا مگر اس کی آہٹ پر کوئی نہ چونکا۔ سارے لوگ بڑی دلیری سے اپنے کام میں مگن رہے۔

"بڑے سردار ــــــ ......؟" وہ پتہ پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بڑھا۔ جیسے جیسے شہر کا ہاتھ پاؤں پھیلتا رہا مکھیوں کی بھنبھناہٹ بڑھتی رہی۔ کوئی تھا بھی تو نہیں جس سے بڑے سردار کا ٹھکانہ دریافت کرتا۔ اس شہر میں سب ہی تو ننگے اور مکھیوں کے تاجر تھے۔

وہ جیسے جیسے بڑھتا جا رہا تھا مکھیاں اس کا پیچھا کر رہی تھیں اور سارے جسم میں چرچلتی جا رہی تھیں۔ وہ تنگ آکر دیوانوں کی طرح سڑکوں پر دوڑتا رہا۔ عمارتوں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے بڑے سردار کا پتہ پوچھتا رہا مگر اُن کے چہروں پر تکان کی لکیریں اس کے اپنے چہرے سے کہیں زیادہ نمایاں ہو چکی تھیں۔

پتھروں کی رگوں میں خون بے رنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ریت کا جسم شبنم کے قطروں سے نہ جانے کب تک بھیگتا کہ آسمان کی چھت ننگی ہو کر چلی گئی۔ مرغزاروں کا آنچل سمٹ کر سوکھی ندی کے مردہ کناروں سے اُلجھ چکا تھا اور کتا اپنی لمبی زبان باہر نکالے ہانپ رہا تھا جس کی رال ٹپک ٹپک کر زمین کے فرش کو ناپاک کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور ویرانوں سے نکل کر ہنگاموں کی گود میں آگرا۔ کانٹوں کی زبان پر زہر کی تلخی پھیلی اور اُس کے تلوؤں کے راستے نسوں کی گلیوں میں گشت کرتی رہی۔ سارے ماحول پر انتشار کا رنگ چڑھا رہا اور جب اُس کے دماغ کی رگیں تن گئیں تو اُس نے اپنی کن پٹیوں میں جلن سی محسوس کی اور ٹھنڈے پانی کی خواہش ہوئی۔ وہ دوڑتا رہا، دوڑتا رہا۔

اُس نے تو ہے جھیل کے کنارے کے جہاں سرد ہوا چل رہی تھی۔ کچھ اور لوگ شہر کے جلتے ماحول سے اُکتا کر اپنے جھلسے ہوئے چہرے لیے یہاں کھڑے تھے۔ اُنہیں اس ٹھنڈی ہوا نے راحت پہنچائی تھی۔ وہ بھی اُن لوگوں کے قریب چلا گیا اور اپنی پھولتی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کے بعد بڑی دھیمی آواز میں دریافت کیا ــــــ

"بڑے سردار کا پتہ آپ لوگ بتا سکتے ہیں؟"

"بڑے سردار ــــــ ؟!" سبھی لوگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا اُس نے نہایت ہی غیر متوقع سوال کر دیا ہو۔ سب کی نگاہیں اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی تھیں پھر سرگوشی کے سے انداز میں ایک ہلکی سی آواز اُبھری ــــــ "بڑے سردار کا پتہ اس طرح سب سے مت پوچھو۔ ہوائیں بھی تمہیں قید کر سکتی ہیں ــــ"

"ہوائیں ــــــ ؟؟ میں تو ساری کائنات کا قیدی ہوں!"

اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

"ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ اگر چاہو تو ساتھ چل سکتے ہو!"

وہ ان چہروں میں جا ملا جن کا جسم نیم عریاں تھا جھیل کی دوسری جانب سے وہ پانیوں کی تہہ میں سما گیا۔ اندر بڑا ہی خوشگوار موسم تھا۔ اُسے نیند سی آنے لگی۔ جب وہ باغ سے نکل کر ایک محل نما عمارت میں داخل ہوا تو کچھ لوگوں کو وہاں سے نکلتے دیکھا۔ نئے چہرے نے دھیرے سے اس کے کان میں "بڑے سردار" کہا۔ وہ سہم گیا۔ ایک سوالیہ نگاہ فضا میں جھول گئی ــ نئے چہروں نے ایک ساتھ کہنا شروع کیا ــــــ "مکھیاں چھوڑنے والوں کو کوئی سزا نہیں ملی یہاں سے آزاد ہو کر وہ پہلے سے زیادہ مکھیاں چھوڑ رہے ہیں۔ اب کیا حکم ہے؟ منادی تو روز ہی اپنے جال پھینکتی ہے"

"میرے حکم کی تعمیل کرنا تمہارا فرض ہے۔ سزا مجھ پر چھوڑ دو!"

"اب اور سکت نہیں رہ گئی ہمارے بازوؤں میں!"

"تمہاری جیسی مرضی"

سوالیہ نگاہیں اُس پر مرکوز تھیں۔

"جی ــــــ !؟ میں اپنے من کی جلن دور کرنے کے لیے آیا ہوں۔ شعلے والے ہاتھوں کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں"

"کر دو میرے حوالے ــــ" اُس نے اپنے توانا ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ وہ متحیر تھا کہ اُس کے مضبوط ہاتھوں میں انگلیاں نہیں تھیں۔ اُس کی گرفت ایک دھوکا تھی۔ وہ مایوس ہو کر وہاں سے بغیر کچھ کہے لوٹ آیا۔ گیلے ہاتھوں کی گرفت سے صابون پھسلتا رہا اور بار بار فرش پر گرتا رہا۔ جب وہ جھیل کے کنارے آیا تو اُسے جھلسا دینے والی گرمی کا پھر احساس ہوا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور ذہن کی کیلیں کسمائی ہوئی۔

اُس نے پھر شہر کا رُخ کیا جہاں سے شور میں بتدریج اضافہ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ بیچ بازار میں پہنچا تو وہاں سارے کے سارے

(باقی صفحہ پر)

آئینہ

عظیم اقبال

پورٹیکو میں گاڑی رُکی تو شوبھنا نے ہارن بجا دیا۔ اندر سے ایک ایل لیشئین دوڑتا ہوا آیا اُس نے شوبھنا کی بغل میں ایک اجنبی کو دیکھ کر تھنے اوپر اٹھائے اور زور سے بھونکا۔ شوبھنا نے پچکارا ——— ٹامی! شٹ! اُس کے قدموں میں لوٹ گیا۔ شوبھنا اجنبی کی طرف اشارہ کر کے بولی ———

"ٹامی! شیک ہینڈ!"

ٹامی نے اگلا پنجہ اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ اجنبی سہم کر پیچھے ہٹا۔ اُس نے شوبھنا کی آڑ لے لی۔

"مجھے کتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اِسے ہٹاؤ۔"

اُس کی آواز میں تھوڑی کپکپاہٹ تھی۔

"مہندر!" شوبھنا اونچے لہجے میں بولی ——— "مجھے کتوں سے محبت ہے۔ ٹامی! ٹامی ڈارلنگ!"

ٹامی اُچھل کر پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ شوبھنا نے اُس کے اگلے پنجوں کو تھام کر اُس کا جسم تھپتھپایا۔ ٹامی نے زبان نکال لی تھی ——— دم ہلا رہا تھا۔ پاس کھڑے ہوتے رانا کی جانب اشارہ کر کے شوبھنا ٹامی سے بولی۔ ——— "گو! گو بیک!" رانا نے اُس کے گلے میں پڑے ہوئے پٹّے کو تھاما۔ مہندر نے در و دیوار پر سرسری نگاہ ڈالی۔ شوبھنا اُسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ رانا نے ایرکولر آن کر دیا۔ پھر کافی کے لیے پوچھا ——— شوبھنا نے سر ہلایا۔

——— "ہاں!"

دونوں صوفے پر روبرو بیٹھ گئے۔ نیچے فرش پر کارپیٹ بچھی تھی۔ کھڑکیوں پر پردے سرسرا رہے تھے۔ سامنے ایک نیوڈ پینٹنگ تھی۔ پاس ہی مرمریں وینس کی مورتی رکھی تھی۔ میز پہ گلدانوں میں خوش رنگ پھول سجے تھے۔ اندر کی جانب کھلنے والے دروازے کے قریب ہی ایک تپائی پر فیروزی رنگ کا ٹیلیفون سیٹ پڑا تھا۔

مہندر کی نظر ایک ایک چیز سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھی۔

شوبھنا نے وینٹی بیگ کھول کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ سگریٹ جلاتے ہوئے مہندر کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں استعجاب کی جھلک تھی۔ دھواں چھوڑتے ہوئے اُس نے صوفے پر پیر پھیلا دیئے۔ سر پیچھے ٹکا کر مہندر کی طرف چھچھلتی ہوئی نظر ڈالی۔ مہندر نے غور کیا کہ اُس کے بال اب اتنے لمبے نہیں رہے کہ اُس کے شانوں پر بکھر جائیں، بلکہ بوب کیے ہوئے ہیں۔ اُن گھنی ہائل چمک بھی ہے۔ اُن کی سیاہی معدوم ہو چلی ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر نارنجی لپ اسٹک کی ہلکی تہہ ہے۔ اُس کے رخساروں پر جھریاں تو نہیں پڑیں، ہاں اُن میں پہلی سی شادابی نہیں رہی ———

کافی آ گئی تھی۔ مہندر نے چسکی لی۔ شوبھنا کی سیدھی مانگ میں سیندور کی سُرخ لکیر وہ ڈھونڈ رہا تھا جسے دیکھے ہوئے [illegible] تھا۔ اُسے تھوڑی مایوسی ہوئی۔ یکایک اُسے ارون اور کویتا کا خیال آیا۔ ریڈیوگرام کے اوپر فریم میں لگی ہوئی تصویر میں کچھ غیر معمولی کشش تھی۔ اُس نے شوبھنا سے پوچھا کہ کیا یہ ارون اور کویتا ہی ہیں۔ شوبھنا نے اثبات میں جواب دیا۔ اُسے تھوڑا اطمینان ہوا۔ اُس کے مزید استفسار پر شوبھنا نے بتایا کہ ارون میڈیکل کے تیسرے سال میں ہے۔ کویتا سینئر کیمبرج کی تیاری کر رہی ہے۔

کافی ختم کر کے شوبھنا نے پیالی میز پر رکھ دی۔ ایک انگڑائی لی۔ اپنے نم آلود ہونٹوں کو ہاتھ کی پشت پر قدرے دبایا۔ مہندر کو یاد آیا یہ اُس کی پرانی عادت ہے۔ شوبھنا اپنے ہونٹوں پر کھلی ہتھیلیاں نہیں رکھتی۔ یونہی بند مٹھی یا ہاتھ کی پشت سے انھیں مس کرتی ہے۔

شوبھنا نے آئی لائنر سے آنکھوں کے حاشیے درست کیے تھے ہمیشہ کی طرح اُن میں اب بھی بڑی جاذبیت تھی۔ اُس کی پلکیں جب جھکی ہوں یا اُٹھی ہوں تو اور بھی غضب ڈھاتی ہیں ———

شوبھنا اپنے انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں تلے دبائے ہوئی تھی
مہندر نے سوچا ——— "اس کی یہ عادت کبھی نہیں بدلی، شوبھنا نے
دیکھا مہندر کے سر کے بالوں کا اچھا خاصہ حصہ سفید ہو گیا تھا۔ وہ اکھڑے
اور بے ترتیب تھے۔ کنپٹیوں اور گردن پر بڑھے ہوئے بال مڑے
ہوئے لگ رہے تھے۔ سامنے کے بالوں کے جھڑنے سے پیشانی کا
حصہ بھی پھیل گیا تھا۔

پیپر سیٹ کر پہلو بدلتے ہوئے شوبھنا نے خاموشی توڑی۔
"کیسے ہو؟"
"ہنہہ!"
"مہندر کے ہونٹ پھیلے اور ایک تیکھی مسکراہٹ ابھری۔
"کیوں؟ میں سمجھتی تھی تم خوش ہو گے"
شوبھنا کی آواز دبی ہوئی تھی
"ہاں! خوش تو ہوں!"
مہندر نے اپنے ماتھے پر آئی ہوئی شکن کو مسلتے ہوئے کہا۔
"تمہیں زندگی راس نہیں آئی؟"
مہندر نے کہنیوں کے بیچ اپنا چہرہ دھنسا لیا
پردہ ہلا تو شوبھنا نے دیکھا یوسف کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔
اس نے دست بستہ عرض کیا ——
"مادام! آج سہ پہر آپ کو گورنر کی پارٹی میں شرکت کرنی ہے
شام میں مسٹر کھوسلے ان کے انڈسٹریل اسٹیٹ پر آپ ان سے ملیں
گی۔ رات آٹھ بجے ہوم سیکرٹری کے ساتھ آپ کا اپوائنٹ منٹ
ہے۔ دس بجکر پچپن منٹ پر آپ کرنل زیدی کو ایروڈروم پر ریسیو
کریں گی"
"آل رائٹ!"
"تھینک یو!"
جھک کر ایڑیوں کے بل گھوم کر یوسف کمرے سے چلا گیا۔
شوبھنا نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انھیں گیلا کیا بیگ کھول
کر ملک چاکلیٹ نکالا۔
مہندر نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ شوبھنا کی مصروفیات کے
متعلق سن کر اسے تعجب ہو رہا تھا۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ
شوبھنا اس قدر مصروف اور اہم شخصیت بن چکی ہے۔ اس کے دل میں کتنے
سارے سوالات پیدا ہو رہے تھے لیکن انھیں پوچھ سکنے کی اس میں
ہمت نہیں تھی۔ لگتا تھا ان بارہ سالوں میں اس کے اور شوبھنا کے بیچ
بارہ صدیوں کی دوری پیدا ہو چکی ہے۔ ایسے میں اس کے لیے یہی
بہت تھا کہ شوبھنا نے اسے پہچان لیا۔ ابھی اس کے اتنے نزدیک بیٹھی
ہے۔ وہ چاہے تو اسے چھو بھی سکتا ہے۔ مگر شوبھنا نے اسے جھڑک
دیا تو!

تھوڑی پر ہتھیلیاں ٹکائے ہوئے اس نے پوچھا ———
"تم کیسی ہو؟"
مدھم سُروں میں وہ ہنسی —
"دیکھ ہی رہے ہو۔"
اس نے اپنے ہونٹ چبائے۔ اس کی پلکیں جھپک گئیں۔
شوبھنا نے جماہی لی۔ پوچھا —
"کچھ پیو گے — وہسکی، جن، بیئر؟"
مہندر نے نفی میں سر ہلایا —
"تو کیا توبہ کر لی ہے؟"
"ایسا ہی سمجھو۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ لیور کو خطرہ ہے۔"
شوبھنا نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی —
"انشورنس میں کہاں تک پہنچے؟"
مہندر نے اپنے الجھے بالوں پر ہاتھ پھیرا —
"ڈیولپمنٹ افسر ہوں۔"
شوبھنا مسکرائی —
"مبارک ہو!"
شوبھنا اٹھی۔ اندر جاتے جاتے بولی —
"ابھی آئی۔"
مہندر نے اس کی پشت پر نگاہیں جما دیں۔ یہ اب بھی پرکشش
تھی۔ کمر کے نیچے کولھے پڑ گئے تھے، لیکن جاذب نظر تھے۔
ذرا دیر بعد شوبھنا واپس آئی تو اس کے پیچھے پیچھے راما ایک
ٹرے اٹھائے آیا۔ شوبھنا نے مہندر کی طرف دیکھا۔
"اگر بھولے نہیں ہو تو میرے لیے ایک کاک ٹیل بنا دو۔"
گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے شوبھنا ایک لمحے کے لیے رکی۔
"کیا سچ مچ نہیں پیو گے؟"

"نہیں !"

جام سے شراب کی سرخی منتقل ہو کر آہستہ آہستہ شوبھنا کے رخساروں پر پھیلنے لگی۔ اس کے چہرہ پر پسینے کی بوندیں جھلملا اٹھیں۔ اس نے صوفے کے تکیے پر سر رکھ دیا۔ بوجھل آواز میں بولی ——

"مجھے چھوڑ کر کبھی پچھتائے ہو ؟"

مہندر کے لیے یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ اس سے کچھ بھی کہا نہیں گیا —— شوبھنا نے ایک آہ بھری۔

"میں ستی ساوتری نہ تھی۔ اگر ہوتی تو تمہارے قفس میں گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔ زندگی کی آسائشیں ملتیں نہ جینے کا لطف حاصل ہوتا۔ پرواز میری فطرت ہے اور تم میرے پر کتر ڈالنا چاہتے تھے ہیں نے تو کبھی تمہاری اڑان پر پابندیاں نہیں لگائی تھیں۔ یہ تو صرف تمہارا احساسِ برتری تھا جو مجھے زیر کرنا چاہتا تھا۔ میں جھکی نہیں ۔ ٹوٹی بھی نہیں ۔ تم اگر سوچو کہ بکھر گئی ہوں تو یہ بھی غلط۔ آج کیسے کیسے مرد میرے قدموں کی خاک اپنے سروں پر ڈالتے ہیں اور اپنی قسمت پر نازاں ہوتے ہیں۔ میرا ایک رتبہ ہے ......"

دم بھر وہ رکی۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی۔

مہندر کے چہرہ پر مردنی چھانے لگی تھی۔ کمتری کا احساس اسے دبوچنے لگا تھا۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بولا ——

"اپنی شان دکھانے کے لیے مجھے لائی ہو کیا ؟ دیکھ چکا اب جانے دو۔ دیر ہوئی تو اگلی ایکسپریس بھی چھوٹ جائے گی ۔"

"ہاں ! میں تمہیں دکھلانا چاہتی تھی کہ اپنے لیے میں نے کتنی شاندار دنیا بنائی ہے۔ تم تو اب بھی صحرا صحرا بھٹک رہے ہو۔ قرار کو ترس رہے ہو...... لیکن سنو، زندگی بھر تڑپتے رہو گے ۔"

دفعتاً شوبھنا کی ہچکیاں بندھ گئیں ——

"تم گیتا کو ہاتھ میں لو اور قسم کھا کر بتاؤ کیا تم خود رام تھے جو مجھے سیتا دیکھنا چاہتے تھے ! بولو، بولو !!"

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یوسف لپک کر آیا ——

"ہیلو ! میں پی۔ اے۔ اسپیکنگ۔ ہولڈ آن پلیز !"

یوسف نے ریسیور شوبھنا کی طرف بڑھایا

"مادام! ایجنٹ منظر ہے"

شوبھنا نے صوفے پر پہلو بدلا۔ ریسیور تھامنے سے پہلے مہندر سے پوچھا۔

"تمہاری ٹرین کتنے بجے ہے ؟"

●●●

تحریک کی فخریہ پیش کش

نئی شاعری نمبر

جس میں اردو کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کی دوسری سب زبانوں کے جدید شعری رجحانات پر سیر حاصل تعارفی مضامین اور منتخب جدید تخلیقات شامل ہوں گی۔

اردو رسائل کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا خاص نمبر ہوگا

تفصیلات کا انتظار کیجیے

غزلیں

حکیم منظور

وہ تو جب تھا جب میں خود سے بھی حریفانہ رہا
میری وحشت کا سمندر ایک پیمانہ رہا

دل سے مانگا ہے سکوں آنکھوں سے مانگے ہم نے خواب
آپ خود سے بھی تعلق کچھ گدایانہ رہا

مدتوں میری ہتھیلی پر رہا ہے آسماں
اپنے دل سے مدتوں میرا بھی یارانہ رہا

کچھ مجھے بھی اپنے قد کا اک غلط احساس تھا
کچھ رویّہ اُس کا بھی مجھ سے خدایانہ رہا

ہاتھ سے جب تک نکل کے رہ گیا ہر ایک نقش
خوشبوؤں ہی کے تعاقب میں وہ دیوانہ رہا

سب ہی اے منظور صرف الفاظ کو جوڑا کیے
آج تک خالی معانی کا ہر اک خانہ رہا

●●●

قمر سنبھلی

کھُلا یہ اُس سے بچھڑ کر کہ پیار تھا کتنا
وہ شخص میرے لیے بیقرار تھا کتنا

ہر ایک سمت ہے سورج کے قتل کا چرچا
فضائے شام پہ خوں کا نکھار تھا کتنا

تمام عمر جلا دھوپ دھوپ میرے لیے
تری وفا کا شجر سایہ دار تھا کتنا

حقیقتوں کے نگر میں یہ ٹوٹتے ہوئے خواب
نہ جانے ان پہ مجھے اعتبار تھا کتنا

تمہارے سامنے آیا تو بن گیا پتھر
دل و نظر پہ مجھے اختیار تھا کتنا

ہم اپنے آپ ہی گم ہو گئے تجھے پا کر!
نگارِ صبح ترا انتظار تھا کتنا

بکھر کے رہ گیا شیرازۂ خیال قمر
شعورِ فکر و نظر خاکسار تھا کتنا

●●●

خالد رحیم

معنی ہر ایک لفظ کے ایسے نکالیے
ہر درد کو خلوص کے پیکر میں ڈھالیے

خاموش پیڑ دیکھ رہے ہیں سوئے فلک
مدت سے تیرے شہر میں دستِ دعا لیے

پرچھائیوں کے شہر میں اب سوچنا ہی کیا
خود کو بدن کے خول سے باہر نکالیے

دیتا ہے کون دیکھ لو اہلِ وفا کا ساتھ
جاؤ گے کتنی دور چراغِ وفا لیے

خالد انھیں بھی وقت کی بھٹی میں ڈال دو
کچھ لوگ آج آئے ہیں سنگِ صدا لیے

●●●

تم خدا نہیں ہو

حمید سہروردی

نہیں
اب مجھے صدا نہ دو
کہ شام ڈھلنے لگی ہے
ابھی کچھ دیر میں سبھی راستے گم ہو جائیں گے
مجھ میں وہی شخص بولے گا
"شام سے میں بجھا بجھا سا رہتا ہوں"
تمھیں کیا کہوں
تم کسی حسین خواب کے پروں پر سوار
بے نام سمتوں میں
خود کو پانے کے لیے چلے جاؤ گے
میں اکیلا ہی سہی
اور سنو!
کسی بے نام سمت میں
کوئی ملے تو اتنا ہی کہو
کہ میں صدیوں سے آبِ حیات کے ایک جرعے کی لرزش
حلقوم میں اتارے تمھارا منتظر ہوں
اور یہ بھی سنو
کہیں راستے میں
رات مل جائے تو اُس سے کہو
کہ میں اندھیلا نہیں ہوں
میں برسہا برس سے
چاندنی کو پانے کے لیے
دھوپ کی باگ کو تھامے ہوئے
کانچ کے ٹکڑوں کا سفوف چبانے لگا ہوں
جب میرے سارے حواس
فضاؤں میں تحلیل ہو جائیں
تو تم میرے جسم میں
بس ایک ہی بار صور پھونکو
اور پھر
تم مجھ سے کہو کہ اب بھی تم خدا نہیں ہو۔

●●●

حمید سہروردی ——— نوگن کالج ——— بھیڑ (مہاراشٹر)

جگدیش مہانتی
یوسف جمال

چھلانگ

(اڑیا) نئی نسل کے لکھنے والوں میں جگدیش مہانتی کا قد سب سے اونچا ہے وہ البرٹ کاموا ور فرانسکفیکا سے متاثر ہیں۔ اب تک تقریباً سو کہانیاں لکھ چکے ہیں ماہنامہ "سوربھو" سے عرصہ تک منسلک رہے "ماتربھومی" میں تقریباً ایک سال تک فرضی نام سے مستقل کالم لکھا کئے۔ مہانتی گردھی سائی (ضلع میسور بھنج اڑیسہ) میں ۴۹ اور ۵۰ء کے درمیان پیدا ہوئے، فی الحال راج گانگ پور میں ای، ایس آئی میں فارماسسٹ ہیں ـــــ یوسف جمال

آج سے برسوں پہلے کی بات ہے کہ پلاٹو نام کا ایک شہرت یافتہ فلسفی نہ جانے کس لیے جبرالٹر کو روندتا پھلانگتا ہوا اٹلانٹک کے ساگر میں کود جانے کو چاہ رہا تھا، کیا ایک خوش آئند طرز کے ماحول کو ہاتھ کی مٹھی میں پانے کے لیے؟ میری کہانی کے ہیرو انسومان کی سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آرہا تھا۔ چھبیس ۲۶ جنوری اور اٹھارہ ۱۸ دنوں کے پہاڑ پر چڑھ کر پانچ فٹ چھ انچ کا قد، تینتیس انچ کا سینہ، کٹک کے کسی آفس میں کلرک کی ملازمت کرتا ہوا اور گھٹن آلود اندھیرے کی گپھا کی مانند پینتیس ۳۵ روپے کے کرایہ کے مکان میں رہتا ہوا انسومان موٹر ایکسیڈنٹ کے بچاؤ کے قانون کو سامنے رکھ کر چلتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن چار آدمی کے کاندھے پر سوار ہو کر اسے ایک مخصوص منزل کی جانب چل دینا ہے۔ امید کے بادلوں کر سکتے بچوں یا مجذوب کی طرح دونوں ہاتھوں کی گرفت میں رکھ کر میری کہانی کا ہیرو تمام راحتوں کی کیفیات کو جانچنے کے لیے گھڑی کی سوئی کی رفتار کے ساتھ چاق و چوبند ہو کر ایک کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے یہ لکھتا ہے کہ ـــــ "پلاٹو! میں بھی تمہارے فلاسفی کے فارم پر چلنا چاہتا ہوں" کہنا یہ ہے کہ میری اس کہانی میں کچھ نہیں ہے صرف انسومان کے شب و روز کے سچ و لمحن کی ڈائری کے حسابات درج ہیں۔

پیدائش وقت ۱ـ صبح

صبح آنکھ کھلی تو ایسا لگا، جیسے پوری رات ٹرین کے سفر میں صبح ہو جاتی ہے اور اسٹیشن سے اسٹیشن پر رعب تمازت ڈالتا ہوا سورج سر و سلام کر دن کے بارہ بجے کا احساس دلاتا ہے۔ پانی، ٹوتھ پیسٹ یا داتون وغیرہ نہ ہوتے اور دانتوں کو صاف نہ کرنے پر منہ سے ایک عجیب سی بو آتی ہے اور بدمزگی کا احساس ہوتا ہے، ٹھیک ایسا ہی احساس! صحن میں نکلتے ہی دھوپ کے رومال میں پھول کاڑھتا ہوا اکتوا، اور تار پر گھر کی مالکن کے پلٹے ہوئے کپڑے دیکھتا ہوں۔ ایک لمبی جماہی لے کر منہ میں رات بھر کی غلاظت اور چپ چپاہٹ محسوس کر کے پیٹ کی بدبودار ہوائیں باہر کر دیتا ہوں اور دونوں بازو کو رنگ میل کی مانند ساکت کر کے دونوں ہاتھوں کو اوپر کی طرف عین کمان کی طرح موڑ کر مزید ایک اور جماہی لیتے ہوئے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ بے خواب نیند اور لمبی سانس، دونوں وقت کے درمیانی لمحوں کو چھوڑ کر میں ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہوں، لیکن ستم یہ ہے کہ کچھ ہی لمحے کے بعد وہ تمام سوچیں معاً دل کے اندھیرے کمرے میں روپوش ہو جاتی ہیں؛ لہٰذا اس حادثے سے بچنے کے لیے میں نے ساری سوچوں کو ازبر کر لیا کہ مبادا سوچوں کے کاغذ کی روشنائی دھل ہی نہ جائے۔

پہلی سوچ :- دھان نما چاول کو سوپ میں پچھاڑتی ہوئی صبح گندم دھوپ لے کر مسکرا رہی ہے، ایسی دلفریب اور ہیجان برپا کرنے والی صبح میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے مصنوعی اندھیرا بنا کر پلنگ پر لیٹے ہوئے سائے کے کچے گوشت کا ذائقہ لیا جا سکتا ہے (میرے ہاتھوں کی مٹھیوں میں ایسے ہی کچے گوشت کی فرحت کا احساس)

بچپن میں ہم لوگ اسی طرح صبح کے وقت رسوئی گھر میں چولھے کو گھیر کر بیٹھ جاتے تھے، اور ہاں گرما گرم چائے اور مڑھی ہمیں ملتی تھی کہ

اس وقت ایک کپ چائے مل جاتی، ایک سگریٹ بھی رہتی تو شاید نیند کا خمار ختم ہو جاتا، لیکن رات میں سب تنہائی حصے دھوئیں بن کر ہوا میں معلق ہو گئے اور جو تنہائی حصہ اپنی زندگی کھو کر ایش ٹرے میں دفن ہو چکا تھا۔

دوسری سوچ: آج اس مارواڑی کو منہ کھول کر کہنا ہو گا کہ اتنے دن ہوئے فائل کیوں بند کر کے رکھے ہوئے ہوں، کیا وہ سمجھ نہیں سکتا ہے؟ سالا سب سمجھ رہا ہے۔ بہت ہی گہرے پانی کی مچھلی ہے لیکن میں بھی کیا کم ہوں؟ پانچ سو روپے کے بل میں پچیس روپے نہ ملنے سے کام کرکے فائدہ؟

تیسری سوچ: سپرنا کو چٹھی لکھنی ہو گی۔ اسے لکھتے وقت نہ جانے کہاں سے کاہلی چھلانگ مار کر مجھے گرفت میں لے لیتی ہے اور میرے ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے لیکن کیا لکھوں؟ "تم میرے برسات کے ابتدائی موسم کا پہلا کدم پھول ہو"، لکھوں گا۔ "تم میری کھلی ہوئی وتیا کی حدوں کی رانی ہو، میرے دل کے آکاش میں جو رنگوں کی لیپ تم نے لگائی ہے وہ نہیں ڈھلے گی" یا .... نہیں، رہنے دو۔ لکھتے وقت اچھا سا لکھوں گا۔

چوتھی سوچ: ایک سال سے سپرنا سے جان پہچان ہے۔ یہ کیسا پیار ہے؟ ایک بار بھی اس کا بوسہ نہیں لے سکا، آنے والی پہلی تاریخ کو ملاقات ہوتے ہی اس سے لپٹ جاؤں گا اور بوسہ لوں گا، کیا میری اس حرکت سے وہ ناراض ہو جائے گی؟ شرمائے گی؟؟ دیکھا جائے گا، تجربہ کروں گا۔ اس بار یا اس بار۔

پانچویں سوچ: تعجب اور حیرت ہے کہ صبح کے وقت میں ایسی باتیں کیوں سوچ رہا ہوں؟ اسی لیے میرے ملک کی ترقی نہیں ہو پا رہی ہے۔

چھٹویں سوچ: اوہ .... بہت وقت ہو گیا ہے، اٹھنا ہو گا۔

میں اٹھا، ٹوتھ پیسٹ اور برش لیا، لنگی ٹھیک سے لپیٹ کر غسل خانے میں گیا۔

نہاتے وقت حساب کر کے دیکھا صبح سے اب تک کچھ بھی راحت نہیں ملی۔

پیمائش وقت ملے دوپہر۔

آفس میں بیٹھے ہوئے اخبار پڑھتے پڑھتے سکھ کی راہ پا گیا، اس وقت دوست سب بیٹھے ہوئے اس قسم کی لغویات میں پڑے ہوئے تھے۔

"طوائف کے گھر میں ایک رات"۔

"تعجب ہے، تم اتنے بے وقوف ہو، سنگ ڈکلیر ہونے سے پہلے ہی ہیرس دکھا آئے؟"

"یار! ہمارے گھر کے قریب وہ جو بادھب بابو ہیں نا، دیکھو گے ایک نہ ایک دن اس کی لڑکی کو اڑا لوں گا"

"سنسار فلم اچھی لگی یا گھر سنسار؟"

"سیاست کا رخ کیسا ہے، آنے والے الکشن میں کس کے جیتنے کا امکان ہے؟"

لیکن ان کے ہر روز کے گھسے پٹے ڈائیلاگ سے اوب کر اخبار کی سرخیوں میں گھومتے ہوئے اچانک میں نے سکھ کی راہ پالی، اس وقت دن کے دو بج کر پینتیس منٹ ہوتے ہیں۔

ایک اشتہار دیکھا، آکاش وانی کے لیے نیوز ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ اشتہار میرے دل کی گہرائیوں تک اتر گیا اور سر سے پیر تک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دل ہی دل میں تصور کیا کہ مجھے ملازمت مل گئی اور میں تخیل کی اڑان سے اسٹوڈیو کے بند کمرے میں خبریں پڑھ رہا ہوں اور میری آواز سب سن رہے ہیں۔

تصور: آکاش وانی سے انسومان کی آواز میں آج کی خاص خاص خبریں ......

"کیونجھر ضلع میں بھوک سے پانچ آدمی مر گئے"۔ نہیں نہیں یہ نہیں چلے گا۔

"بے کار نوجوانوں کی خودکشی" نہیں نہیں .... یہ بھی نہیں چلے گا۔

"اڈیسہ بہت جلد ہمالیہ کے اوپر پہنچ جائے گا"۔ یہ چل سکتا ہے۔

"وزیر اعلیٰ آج ہوائی جہاز سے سیلاب میں گھرے ہوئے لوگوں کا معائنہ کر کے بے حد دکھی ہیں"۔

اسی طرح تصور کے اسٹوڈیو میں خود کو مقید کر کے راحت کی کیفیات سے حظ اٹھاتے ہوئے اچانک خیال آیا کہ یہ خود فریبی ہے۔ میرے پاس نہ کسی منسٹر کا سرٹیفکیٹ ہے نہ ریڈیو اسٹیشن میں کوئی رشتہ دار ہے۔ گویا میر سکھ کی ہی ہے میرے پیٹ کی آگ بجھتی رہے گی۔

سوچا اور ساتھ ہی گم ہو گیا راحت کا پرسکون احساس، اس وقت دن بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔

اس کے بعد کچھ کام نہ کر سکا۔ پانچ بجے تک چپراسیوں کو گالیاں دیں، کینٹین کے ادھاری کھانے سے چائے پر چائے پی، ساتھیوں پر چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ کیا اور اونچے عہدے کے افسروں کی ہاں میں ہاں سے ہمبستری کے ساتھ سوچا کہ جب تک چاند ہے اس ملک کی ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔

بعد میں حساب کر کے دیکھا تو راحت کا وقت پانچ منٹ اور کربناک لمحوں کا گھیراؤ دو گھنٹے بیس منٹ۔ لیکن پانچ بجے آفس سے نکل کر تمام سکھ دکھ کی گٹھری کا بوجھ ذہن سے اتار کر پھینک دیا۔

پیمائش وقت ۵ بجے شام

دراصل بات یہ ہے کہ ہم سب ایک بڑے جہاز میں چڑھ گئے ہیں اسی شہر کی شاہراہیں، شاہی بازار، بس اسٹینڈ، سینما ہال اور آفس وغیرہ کو لے کر یہ جہاز جیسے گہرے نیلگوں سمندر کے بیچ ساکت و صامت ہو کر ٹھہر گیا ہے، لیکن حیرت کی بات ہے اس جہاز کی بات اکثر و بیشتر میری یادداشت سے اتر جایا کرتی ہے (سمندری جیون کی تنہائی کے کرب کی بائیلم اس شہر کے زیادہ تر لوگ نہیں جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسے جہاز میں رہتے ہیں کہ نیلے سمندر کے درمیان جو اکیلا ہے، روشنی، ہوا، راحت و آلام کے سچ واپس ہو جانا تقریباً ان کے لیے ناممکن ہے۔

آفس سے لوٹتے وقت گہری سوچ کے ساتھ جہاز کی بات یاد آ ہی گئی۔ جہاز کی یاد کے معنی ہیں، خود کو ناامیدی کے بھنور میں ہلاک کرنا، اور اس ناامیدی کے احساس سے بچنے اور اسے دھوکا دینے کے لیے غسل خانہ جا کر اندر سے میں نے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ غسل خانے میں خود کو دیکھنے کے لیے اس کے اندر ایک قد آدم شیشہ لگا دیا تھا، اس شیشے کے سامنے خود کو دیکھ کر ایک عجیب راحت پائی، دل میں خیال ابھرا کہ آئینہ میں میری صورت میری اپنی نہیں لگ رہی ہے، پچیس برس سے جس چہرے کو میں اٹھائے ہوئے چل رہا ہوں اور میرے وجود کو ایک فٹ سے پانچ فٹ چھ انچ تک لمبا کر پایا ہوں۔ جسم کے ساتھ وہ چہرہ میرے لیے اتنا اجنبی اور انجان ہوا کیونکر؟ اس صورت کو میں نے اتنی محبت سے پروان چڑھایا، لیکن کوئی اس صورت کی طرح دوسری شکل کے ساتھ مجھ کو پچیس سال تک جبراً رہنے کے لیے کہتا تو میں اوب کر کوئی ایسا ویسا کام نہیں کر ڈالتا؟

نہ جانے کیوں، میرے دل کے اندر عجیب سوگ، دکھ اور ہیجان کا جذبہ جاگ اٹھا، اوب اور گھٹن سے بچنے کے لیے شاور کے نیچے خود کو ڈال دیا اور تمام دکھوں کو دھو کر باہر نکل آیا۔ اور جب لباس تبدیل کرنا چاہا تو پہننے کے لیے ایک بھی کپڑا صاف نہیں تھا، ایسی حالت میں کسی لڑکی کے ساتھ اپائنمنٹ مناسب نہیں، اس لیے آج کسی بھی لڑکی سے ملنے کے پروگرام کا معاملہ التوا میں پڑ گیا اور رامو ناتا کی چائے کی دکان پر جا کر اسپیشل ہاف چائے کا آرڈر دے کر میں بھی بحث کرنے والوں کے غول میں شامل ہو گیا

"جنگ شاید چھڑ جائے گی، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ روس امریکہ کو، چین روس کو گویا ہر بڑی قوت ایک بڑی قوت کو دھمکیاں دے رہی ہے۔"

"آپ امن تلاش کر رہے ہیں؟ امرت ڈھونڈنے سے پا لیں گے۔ لیکن بے بی فوڈ میں ...."

"وہ کیا زمانہ آ گیا، امن کہاں چلا گیا؟ کہہ سکتے ہو؟؟"

اس کے بعد: اسرائیل امریکہ، مصر روس، چین، مونز مبک، مہاتما گاندھی، اندرا گاندھی، فولاد کا کارخانہ، آئی ایس افیسرز اور کرپشن، ریفوجی، بجیب، بھٹو، بے نظیر، نرگس، بالو بھٹہ چاریہ، صوفیہ لارین اور لیپ پلڈ، مینال سین، ستیہ جیت رائے، سن فلور، برج اون۔ دی پیور کوالٹی، راجیش کھنہ، ڈمپل کپاڈیہ، انجو مہندرو، سکس مرڈر، سکس اڈونچر مرڈر، سکس، سکس — اسپیشل ہاف چائے میں اور زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گیا:

کیچڑ، سانڈوں کی لڑائی، فوٹو اسٹوڈیو کے فریم میں بند خوبصورت عورتوں کی دوا نیچ کی مسکراہٹ، رکشا، کار، بس، مجھے لگا کہ میرے دماغ کے اندر انگنت کووں کی کریہہ چیخ ہے، راستے پر کھڑے ہوتے آسمان کو دیکھا، بالکل صاف ہے۔ بس اتنی ہی تبدیلی ہے۔ باقی دنیا جیسے گھر گھالی۔ سانڈ کی لڑائی، عورتوں کا جوڑا سب کچھ مصنوعی ہے۔ UNCONCIOUSLY کی طرح نیچرل احساس، جس طرح درخشنگ بہت دنوں سے مان لیا گیا ہے۔ گھر واپس آ کر حساب کیا تو راحت کے خانے میں صفر آیا۔

پیمائش وقت ۸ بجے رات

اچانک آنکھ کھل گئی، اس وقت تک خواب دیکھ ڈالے تھے، پہلا خواب کچھ اس طرح ہے۔

والد کے چہرے کا کلوز اپ: چہرے پر جھریاں بڑھ گئی ہیں، آنکھیں

اور اس طرح دھنس چکی ہیں جیسے دو بھیانک غار بن چکی ہوں۔ ناامیدی میں کھوئی ہوئی صورت، دکھوں کا احساس، کرب۔ اچانک والد کے چہرے کا کلوز اپ ختم ہو گیا۔ معاً مجھے لگا کہ کچھ لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں، میں نے ان کی حد سے نکل بھاگنے کے لیے دوڑنے کی بے حد کوشش کی، لیکن حیرت کی بات ہے کہ پاؤں آگے نہیں بڑھ رہے تھے، جیسے زمین سے چپک کر رہ گئے ہوں، ناامیدی، شکست و بیم اور اپنے انجام کے خوف سے رو پڑا وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ آخرکار ان لوگوں نے مجھے پکڑ ہی لیا میں گرگڑایا۔

"دیکھو، مجھے چھوڑ دو۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، آدمیوں کی طرح۔ میرے باپ کو تم لوگ پہچانتے ہو؟ وہ زندگی بھر خوابوں کی خوبصورت ریل بنا کر بھی چڑھ نہیں سکے، زندگی کی آخر سانس تو آرام سے جینے دو، میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، اس لیے کہ وہ میرے بغیر جی نہیں پائیں گے۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہ ہو، میں بہت دکھی ہوں۔ ٹھیک والد کی طرح میں بھی خوابوں کی ریل بنا کر اس پر سوار نہ ہو سکا اور ہو سکتا ہے میری آنے والی نسل بھی خوابوں کی ریل کی ملکیت کے باوجود اسے چھو تک نہ سکے۔ جانتے ہو؟ خوابوں کی ریل میں ہم جیسے خستہ حال، دکھوں سے نڈھال لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، نہیں تو......"

"تم جیسس ہو؟" ان لوگوں نے میری بات مکمل ہونے سے قبل ہی پوچھ لیا۔

"نہیں! میں انسویان ہوں"۔

"نہیں، تم کل آنسو تھے، آج تم جیسس ہو، جگن ناتھ ہو اور عیسٰی ہو"!

"کبھی نہیں، میں کل کتا تھا، آج انسویان ہوں، آنے والے دنوں میں موزی تنگ ہوں گا"!

"بکتے ہو، تمہارے سینے میں دل ہے"۔

"سینے کے اندر ایک مشین ہے جو ہاتھوں کی مٹھیوں میں بند ہو سکتی ہے اور جو جسم کا خون چاٹ چاٹ کر کھاتی ہے" میں نے کہا۔

"بے وقوف، وہی تو دل ہے، وہی بربھا ہے، وہی وارڈ ہے"

"وارد؟ دیسی یا بدیسی؟؟"

"سالا ناستک، گمراہ، تجھے سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا" وہ چیخ اٹھے اس کے بعد انھوں نے مجھے گھیر لیا۔ "سالا بے دین، سی آئی اے ایجنٹ، ریکشنری، نہیں سالا نکسلائٹ، بہاری مسلمان، اصل پاکستانی"۔

لفظ لفظ انگنت لفظوں کا اژدہام، لفظوں نے مجھے گھیر لیا اور بائبل کا یہ قول میرے اوپر صادق آنے لگا۔

"پہلے لفظ سے، اور لفظ میں بر بھور ہنے سے وہ لفظ کالی ہوتا ہے اور کالی ہوتا ہے"

کچھ لمحہ انٹرول۔ کچھ دیر سانسیں درست کرنا چاہتا ہوں رفتہ گی کا عالم، اور دوسرا خواب

دوسرے خواب کے مکالمے کچھ ایسے ہیں۔

"شخص اے شخص! تمہارے ہاتھوں اور پیروں میں کن لوگوں نے کیلیں ٹھونک دی ہیں؟ تمہیں صلیب پہ کن بدبختوں نے لٹکا دیا ہے؟ تمہیں بہت تکلیف ہے نا؟؟؟"

"اے شخص، تم تو ازل سے ہاتھ پیر لمبے کر کے سب دیکھ رہے ہو، تمہاری آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوگی، کہو، اس مہابھارت کی جنگ میں کون لڑ رہا ہے؟ کون جیت رہا ہے؟ کون ہار رہا ہے؟؟"

اس نے آنکھیں کھولیں، بند کر لیں، آنکھیں کھلنے اور بند ہونے کے وقفے کے درمیان وہ مسکرایا!

"ہنس کیوں رہے ہو؟ تم اتنے دکھی ہو پھر بھی ہنس رہے ہو؟ تمہارے سب مینڈھے کانجی ہاؤس میں ہیں، کون انھیں چھڑائے گا؟ تمہاری محبوبہ کا نام کیا ہے؟ مگڈلین! وہ بھی ہوٹلوں میں گھوم رہی ہے۔ یا نرسنگ ٹریننگ پا رہی ہے"۔

وہ شخص پھر مسکرایا۔ پوچھا "HOMOSEXUALITY کے کیا معنی ہیں، جانتے ہو؟ OUDIPOUS COMPLEX!"

"توبہ توبہ، تم اسی لیے روحانیت کی راہ پر چلنے کی بات کر رہے تھے، اسی لیے مرنے کے بعد قبر کے چوکیدار کو دھوکا دیا تھا؟"

صلیب پر لٹکے شخص نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے تمام دکھوں کے بوجھ کو آکاش کی طرف اچھال کر کہا۔

"ہزارہا سال سے میں اسی طرح زندہ ہوں، تم کہتے ہو جینا ایک عذاب ہے، لیکن اس عذاب سے نجات پانے کے لیے کون خودکشی کرتا ہے؟ تمہارے اوپر چودہ پونڈ کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ کیا تم احساس کر سکتے ہو؟ دکھ تو انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوا ہے، اس لیے دکھ کا رونا کیسا، دکھ سے زندگی ہے، اور زندگی، زندگی ہے"!

نیند ٹوٹی تو دیکھا میں پسینے سے شرابور ہو گیا ہوں، سر بھاری ہو گیا

[illegible]

تبصرے

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ماہانہ ترجمان ۔ اڈیٹر: مصطفےٰ کمال
قیمت فی پرچہ: ۳ روپے ۔ سالانہ: ۱۵ روپے، ۲۷ ۔ بحر دگاہ ۔ معظم جاہی مارکیٹ ۔ حیدرآباد ۔ ۱

طنز و مزاح، شروع ہی سے اردو ادب و صحافت کی اہم روایت رہی ہے خاص طور پر اودھ پنچ، زمیندار جیسے جرائد اسے فروغ دینے اور مقبول بنانے میں پیش پیش رہے ۔ حالیہ زمانے تک پہنچتے پہنچتے طنز و مزاح اردو ادب کی ایک مالا مال اور متنوع صنف بن کر ایسی اہمیت اور ایسا مقام حاصل کر گئی کہ آج نہ صرف اردو ادب کا تذکرہ اور تاریخ اس کے خصوصی ذکر کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے بلکہ یہ صنف اب اردو صحافت کا بھی ایک جزو بن کر اُبھری ہے ۔ آج اردو دنیا کا شاید ہی کوئی اہم اخبار ایسا ہو جو طنز و مزاح کے مستقل کالم کا سلسلہ نہ رکھتا ہو ۔

پچھلے ۲۰، ۲۵ برسوں میں حیدرآباد اور اس کے گرد و نواح میں اس صنفِ ادب کی جس قدر آبیاری ہوئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی ۔ خاص طور پر زندہ دلان حیدرآباد نے جو حیدرآباد کے مزاح نگاروں کی انجمن ہے طنز و مزاح کے فن کو فروغ دینے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے ۔ اور اس کے حوصلے آج بھی بلند ہیں ۔
ماہنامہ شگوفہ، زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان ہے، جو تمام تر طنزیہ اور مزاحیہ نگارشات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ کاغذ، طباعت کی شدید دشواریوں کے باوجود شگوفہ برسوں سے نہایت پابندی کے ساتھ نکلتا ہے ۔ یہ بات یقیناً لائق تحسین ہے ۔
شگوفہ کا تازہ سالنامہ میرے پیش نظر ہے ۔ اولاً یہ رسالہ ڈیڑھ ماہی تھا ۔ اب اسے ماہنامہ کیا گیا ہے "اس تھیلی کے چٹے بٹے" کے عنوان سے فہرست مضامین شائع ہوتی ہے اور سر آخر میں ہوتا ہے اداریہ "پھر ملیں گے اگر خدا لایا" ۔ درمیان میں "مال مفت" کی سرخی کے تحت انشائیے "الیسی کی تیسی" کے زیر عنوان تنقیدی مضامین "اڑیں گے پرزے" کی ذیل میں خاکے "چورن" کے زمرے میں شعری تخلیقات اور تبصرے "بال کی کھال" کے نام سے شائع ہوتے ہیں ۔ جو بذات خود مزاح کے مظہر اور ظرافت کے موجب ہیں
زیرِ نظر سالنامہ کے قلم کاروں میں، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، یوسف ناظم، نریندر لوتھر، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر خواجہ عبدالغفور، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، عاتق شاہ شیفتہ فرحت، برق آشیانوی، راہی قریشی، طیب انصاری اور نرگس حیدرآبادی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کی پرمذاق اور پرمزاح نگارشات نے شگوفہ میں ایک رنگا رنگ لالہ زار کھلا رکھا ہے ۔

——— ابوالفیض سحر

بحث وتکرار

مصنف: تصدیق سہاوری، ناشر: عطیہ بک ڈپو ۔
۲۷ ڈی، ڈاکٹر میشوری روڈ ممبئی ۔ ۹، قیمت: چھ روپے ۔

بحث وتکرار اُن مباحثوں پر مبنی ہے جن میں حصہ لینے والوں نے آپسی نوک جھونک، باہمی چپقلش اور طعن وتشنیع سے گزرتے ہوئے ہمیں اُردو ادب کی کئی اہم شخصیتوں کے درمیان لا بٹھایا ہے تصدیق سہاوری نے اِن ادبی مباحثوں کو مستاویز کی شکل دے کر اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے کتابی شکل میں آ کر یہ مباحثے ہماری آنکھوں کے سامنے اُن ہنگامہ آرائیوں کی تصویر کھینچ رہے ہیں جو ممبئی میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ہوئیں ۔ ساری کتاب میں ایک خاص رنگ ہے ۔ ہر بات خلوص، سنجیدگی، متانت کی حامل ہوتے ہوئے

بھی اپنے اندر سمیر اتے طنز و مزاح کی عکاسی ہے۔ قاری ایک بار پڑھنا شروع کرکے کتاب کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ اُسے لگتا ہے وہ ایک ڈرامہ دیکھ رہا ہے اور رفتہ رفتہ اُس کا ایک کردار بنتا جا رہا ہے۔ اس میں اُسے اچھوتی لذت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ خود کبھی میراجی، کبھی اخترالایمان، کبھی راجندر سنگھ بیدی، کبھی احتشام حسین کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ اس لذیذ عمل کا تاثر اُسے اپنی گرفت میں کہاں تک جکڑ لیتا ہے یہ اُسے اُس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ کتاب کے آخری صفحے پر چھپی آخری سطر کو پڑھنے کے بعد بھی تشنہ کام رہتا ہے۔ بلاشبہ تصدیق سہاوری نے مختلف اوقات پر ہوئی بحثوں کو ذہن میں رکھ کر انھیں یکجا کرنے میں خاصی محنت سے کام لیا ہوگا۔ ہر مباحثہ ہمارے ذہن کو نئی انگڑائی لینے پر آمادہ کرتا ہے ——— 'میراجی کے ساتھ ایک شام' ——— راشد نے میراجی کو اس زمانہ کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر، سب سے زیادہ جدت پرست، سب سے زیادہ زرخیز ذہن کا مالک اور منفرد شاعر کہا ہے ——— جدید شاعری میں میراجی کو شہیر دکی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کے کینوس کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ (اخترالایمان)

'احتشام حسین کے ساتھ ایک شام' ——— جو لوگ اپنے کو بے سمت، کسی دھارے سے الگ اور ALIENATED کہتے ہیں میں اُن کی آواز کو ڈھونگ کہتا ہوں۔ (احتشام حسین)

'ظ انصاری کے ساتھ ایک شام' ——— روسی ادب فن اور تکنیک کے معاملے میں پیچھے ہے۔ (ظ انصاری)

'اخترالایمان کے ساتھ ایک شام' ——— کہ نظم سننے کی چیز ہے' بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم بزعمِ خود یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم بڑے ذہین اور قابل یا عقلِ کُل ہیں اور نظم سنتے ہی ایک حکم لگا دیں گے۔ (اخترالایمان)

——— باتیں سننے کے بعد معلوم ہوا کہ جدت کوئی چیز نہیں۔ تجدد بھی کوئی چیز نہیں، پرانی چیزیں ہیں جنھیں دہرایا جا رہا ہے۔ (شہاب مالیر کوٹلوی)

'آئینہ در آئینہ' ——— حال میں ایک خاص قسم کی شاعری کے جراثیم ایجاد ہوئے ہیں۔ جو شریف آدمیوں کی ہلاکت کے لیے سب سے زیادہ مفید اور سریع الاثر مانے گئے ہیں۔ (یوسف ناظم)

——— کیا وہ شاعری جو آج کے لمحہ کو گرفت میں لیتی ہے اور اسی لمحہ میں ڈوب جاتی ہے کل کے لمحہ میں یاد کی جائے گی یا نہیں۔ اگر کی جائے گی تو اس کے معنی ہیں کہ شاعری پائیدار ہے۔ اگر پائیدار ہے تو کیا آج کی جدید شاعری کلاسیکی نہیں کہی جائے گی۔ (باقر مہدی)

'ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں' ——— انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنی روح کے اندھیرے کو نہیں (تخیل جعفری)

'بحث و تکرار' ایک دسترخوان کی طرح ہے جس پر طرح طرح کے لوازمات سجے ہوئے ہیں مگر باقر مہدی کو منتخب اور خاص لوازمہ بنا کر ضرورت سے زیادہ نمایاں کرنے کا مقصد تصدیق سہاروی ہی بتا سکتے تھے مگر اب تو ———

——— کنور سین

ادبی اقدار

مصنف : دوّر آفریدی، ملنے کا پتہ : اُردو ریسرچ اکاڈمی رام پور، قیمت : تین روپے

'ادبی اقدار' دوّر آفریدی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ تمام مضامین بے تکلف انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مضمون نگار نے بلاوجہ تکلف اور الجھاؤ میں پڑنے سے گریز کیا ہے۔ اپنی بات کو سہل انداز میں مگر استدلال کے ساتھ کہنے پر وہ قدرت رکھتے ہیں۔ اِن مضامین کو اسی روانی کے ساتھ پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے دوّر آفریدی جس کا خواہاں ہے۔ جدیدیت اور اُردو شاعری، جدید ادب کے ارتقا پر ایک رواں دواں کمنٹری ہے 'اُردو شعرا اور جنگ آزادی' میں دوّر نے مختلف ادوار کے شاعروں کے کرب، و قلق کی بابت بتاتا ہے جو وہ ملک و قوم پر مسلط غلامی کی وجہ سے محسوس کرتے تھے ———

نظام رام پوری، مجروح اور راجہ مہدی علی خاں پر مضامین شعرا کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں واقفیت بہم پہنچاتے ہیں۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ قابل مصنف نے عہادر سوامی اور مہاتما بدھ کی فلاسفی کو عین الیقین نہ ہونے کا سرٹیفکیٹ کیسے دے دیا اور ثبوت میں مجروح کا یہ شعر کیا سوچ کر پیش کر دیا۔

گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروح
مسجدوں میں کی ہیں نے جا کے داد خواہی بھی

کتاب اچھی چھپی ہے اور قیمت بھی زیادہ نہیں۔

——— کنور سین

دھند اور کرن

مصنف: شمس صابری، ناشر: رائٹرز ایسوسی ایشن اہیم گھوش لین، شب پور ہوڑہ-۲، قیمت: چار روپے۔

'دھند اور کرن' شمس صابری مرحوم کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شمس صابری کے افسانے اقتصادی طور سے تباہ حال آدمی کی پریشانی، مایوسی، بے بسی کے آئینہ دار ہیں۔ وہ خود جس کس مپرسی اور غریبی کا شکار رہے اُسی کو بنیاد بنا کر انھوں نے سیدھی سادھی زبان میں سادھارن انداز سے کہانیاں لکھی ہیں۔ 'انار کلی ہو' یا 'زندگی کے لیے' 'قہقہہ گونج رہا ہے' ہو یا 'ہماری بستی کی سیر' تھیم ایک ہی ہے ——— غریبی سب سے بڑی لعنت ہے۔ غریب کو محبت سے کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ اُسے اُس کی اقتصادی بدحالی سے آگے سوچنے کا حق نہیں ——— ہر افسانہ اسی سُر سے شروع ہوتا ہے اور اسی تال پر ٹوٹتا ہے اس لیے بیچ کی سرگم کی یکسانیت قاری کو اُکتا دیتی ہے۔ اگر شمس صابری عباس نہیں آیا' جیسے افسانے کو فن اور اسلوب کی جلا بخشنے کی تھوڑی کوشش کرتے تو یقیناً افسانے کے ارتقا میں اُن کا احساس اور تیکھا ذہن مددگار ثابت ہوتا۔ تاہم انھوں نے جو کچھ کہا ہے اُسے برتا ہے اور سمجھا ہے اس لیے ہم اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلی کراہ کو سن ہی لیتے ہیں۔ کتاب اچھی چھپی ہے۔ قیمت بھی واجبی ہے مرحوم کی بیوہ اور بچے کی مدد کی سبیل کتاب کو خریدنے کے لیے مزید سفارش کرتی ہے۔

——— کنور سین

بولتی ویرانیاں

مصنفہ: تاج النسا تاج، قیمت: ۳ روپے، ملنے کا پتہ رحمت اسٹورس۔ گاندھی بازار بنگلور۔

تاج النسا تاج، جنوبی ہند کی ابھرتی ہوئی افسانہ نگار ہیں 'بولتی ویرانیاں' ان کی تخلیقی کوششوں کا پہلا نقش ہے جو افسانوی رنگ روپ کے ساتھ ایک حقیقی کہانی کا عنوان ہے۔ دراصل تاج نے اپنی آپ بیتی کو اپنے انداز سے اپنے ڈھنگ میں قلمبند کیا ہے۔ یہ کوئی بھرپور ناول نہیں اور نہ ہی کوئی مختصر افسانہ ہے۔ یہ ادھوری ہی سہی مگر ایک کہانی ہے جیسے کوئی نامکمل نظم یا ادھورا گیت۔ ہم اسے ناولٹ کا نام دیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ بولتی ویرانیاں میں کسی سوچے سمجھے پلاٹ کا تانا بانا نہیں ملتا اور نہ ہی من گھڑت واقعات کی غیر ضروری ٹھونس ٹھانس۔ درحقیقت یہ ایک عام زندگی کے سانس لیتے راستوں کے نشیب و فراز، واردات، حادثات اور تجربات کا بیان ہے۔ کہیں کہیں زبان کی کچھ ناہمواری اور لب و لہجہ کی مسلسل یکسانیت محسوس ہوتی ہے۔ مگر اثر انگیز روداد قاری کے احساس پر کچھ اس طرح طاری ہو جاتی ہے کہ وہ کہانی کے کرداروں کے ساتھ خود ہی نفسیات اور جذبات کی رو میں بہنے لگتا ہے۔ تاج کے احساس اور شعور کے دھارے میں شدت سے رواں ہے۔ لگتا ہے، کسی بڑے تالاب کا باندھ ٹوٹ گیا ہے اور شدت سے بند پانی بہنے کے لیے راستہ بناتا کبھی ادھر کبھی ادھر سے بہتا نئے رقبے اور نئے علاقے ڈھونڈھ رہا ہے۔ اگر تاج صاحبہ قدرے سنبھل کر، فنی قرینے اور تخلیقی وقار کے ساتھ لکھتی رہیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کے فن کا بہتا ہوا یہ جھرنا ان دیکھے اور انجانے صحراؤں کی ریت میں جذب ہو کر نہیں رہ جائے گا بلکہ نئی وسعتوں اور نئی منزلوں سے ہمکنار ہوگا۔

——— ابوالفیض سحر

ارمغانِ اختر

مصنف: اختر فاروقی، ناشر: غالب ریڈنگ روم گجری بازار پربھنی (مہاراشٹر)، قیمت: چار روپے۔

ارمغانِ اختر پڑھنے کے بعد اختر فاروقی صاحب کی روایت کے ساتھ کامل وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس ہم آہنگی کی وجہ وہ زاد ہے جس میں اختر صاحب نے شعر پڑھنے، سمجھنے

اور سمجھنے کی پہلی بار کوشش کی۔ مگر اُن کے اشعار اُن کی اپنی شخصیت کے بھی آئینہ دار ہیں۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے گذرنے والے انسان کے دل کا دکھ درد شعری شکل اختیار کرے گا تو جو بھی اسلوبِ شاعری اُس وقت مروج ہوگا وہ اُسے اپنائے گا۔ تاہم اپنی بات کو اپنی بنائے رکھنا بھی ہنر ہے اور اختر صاحب کی غزل اُن کی اس صلاحیت کا ثبوت ہے اُن کی غزلوں میں اُن کے منفرد طرزِ بیان کی جھلک ملتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ شعر کو معنویت کا حامل کیسے بنایا جاتا ہے ارمغانِ اختر کے بہت سارے اشعار فن اور احساس کے معیار پر پورے اترتے ہیں،

اک بے جہت کو ڈھونڈتے گذری تمام عمر
اب تک اُسی جگہ ہیں چلے تھے جہاں سے ہم

عمر بھر جس نے رکھا محوِ تماشا مجھ کو
اب وہی چشمِ کرم میری تماشائی ہے

زمانہ ساز جتنے تھے وہ اُن کے آشنا ٹھہرے
ہمارا پوچھنا کیا ہم زمانے سے جُدا ٹھہرے

دیکھیے ہوتے ہیں کب عام مرے افسانے
کب مرا عشق حدیثِ دگراں ہوتا ہے

عبدالرشید صاحب انجینئر برکھنی نے اختر فاروقی کو گمنامی کے گوشے سے نکال کر اُردو داں طبقے سے متعارف کرانے کا نیک کام کرکے اردو ادب کی خدمت کی ہے جس کے لیے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

——— کنور سین

شاخِ گُل

مصنف: کالیداس گپتا رضا، ملنے کا پتہ: صبح اُمید بلاسِس روڈ بمبئی۔۸، قیمت: چھ روپے،

شاخِ گُل کالیداس گپتا رضا کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں نظمیں، گیت، غزلیں اور رُباعیاں ہیں جنھیں پڑھ کر قاری اُردو شاعری کے آہنگ، اسلوب اور زبان کی بازگشت سنتا ہوا روایت کے ساتھ ہمکنار ہو جاتا ہے۔ رضا صاحب نے اساطیری خزانے سے جو موتی نکالے ہیں اُنھیں اساطیری طلسم سے الگ کرکے موضوعاتی بنا دیا ہے۔ 'فتح و شکست'، 'ترک دنیا کیوں'، 'بھگوان بدھ کا تیاگ' وغیرہ نظمیں اپنے اندر وہ عرفانی کیف نہیں رکھتیں جن کی وہ متقاضی ہیں اور جن کے بغیر ہوشمند اور صاحبِ نظر قاری اُن سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ نظمیں سپاٹ اور اکہری ہیں تہہ در تہہ معنویت اور اشاریت کا فقدان انھیں معمولی بنا دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے موضوع اور فن کے اختلاط کی اہمیت کو مدِ نظر نہیں رکھا ———

لمبے ستھرے بال اپنے خنجر سے اُس نے کاٹ دیے
پھاڑ دیا شاہی کپڑوں کو، سادے کپڑے پہن لیے
(بھگوان بدھ کا تیاگ)

لاکھ قیامت خیز سہی اجگر کا حملہ
اندر کی گھن گرج کے آگے ماند ہوا
(فتح و شکست)

البتہ دیوار، خیالوں کے بُت جیسی نظمیں اور 'سوکھا پتہ'، جیسا گیت شاعرانہ اوصاف سے مملو ہیں ان میں خیال اور اسلوب یکجان ہو کر شاعر کی شدّتِ احساس کی آنچ کو محسوس کراتے ہیں:

کبھی تو اُبھرے گا اِن کا شعورِ گویائی
ہمیشہ چُپ نہ رہیں گے یہ بُت خیالوں کے
(خیالوں کے بُت)

غزل میں بھی رضا صاحب نے کوئی نئی جہت، نئی منزل کی نشاندہی نہیں کی۔ طرزِ بیان اور انتخابِ موضوعات میں نُدرت خال خال ہی نظر آتی ہے؛

جلوۂ عام کے دھوکے میں چلے آئے تھے
بند ہوگا درِ جاناں یہ خبر کس کو تھی

چپکے سے دماغ میں در آئے
یادوں کے سفیر بن بُلائے

لے اُڑی ہے ترے ہاتھوں کی حنا پچھلے پہر
میرے اُلجھے ہوئے افکار کی آندھی ہوگی

ہمارے در سے طلبگار اور کیا پائے
دہکتے ڈھیر سے مٹھی بھر آگ لے جائے

(باقی صفحہ پر)

مانگے کا اُجالا

شعوبیہ، ایک عرب مخالف رجحان

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جن تحریکات و رجحانات کے باعث عرب اقتدار رفتہ رفتہ کمزور ہوا اور عجمی اقوام و تہذیبوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع ملا ان میں ایک شعوبیہ بھی ہے، اگر ہم اس عہد کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ عباسی خلافت کی بنا اور استحکام میں غیر عربوں خصوصاً ایرانیوں کی جد و جہد کو زیادہ دخل تھا اور اسی بنا پر انھیں شروع ہی سے حکومت کے نظم و نسق میں ترجیحی حیثیت حاصل ہو گئی۔ البتہ شعوبیہ کو تحریک قرار دینا زیادہ صحیح نہیں ہوگا اس لیے کہ نہ تو یہ کوئی انقلاب پسند جماعت تھی اور نہ صحیح معنوں میں عوام سے اس کا کوئی تعلق تھا اس کے بجائے یہ ایک ایسا رجحان تھا جو عرب اقتدار و بالادستی کے خلاف علمی اور تہذیبی سطح پر ابھرا تھا اور زیادہ تر مفتوحہ اقوام کے علماء، شعراء اور انشا پردازوں تک محدود رہا۔

شعوبیہ کا لفظ شعوب سے ماخوذ ہے جو شعب کی جمع ہے جس کے معنی لوگوں کے گروہ اور عوام کے ہیں، اہل لغت کے نزدیک شعب قبیلہ سے بڑا ہوتا ہے، اس کے بعد فصیلہ، پھر عمارہ، پھر بطن اور پھر فخذ، البتہ شعوب کا استعمال بصیغۂ جمع عام طور پر اہل عجم کے لیے ہوتا ہے یہاں تک کہ عربوں کو حقیر سمجھنے والے کو شعوبی کہتے ہیں، اسی لیے لسان العرب میں ہے کہ شعوب وہ فرقہ ہے جو عربوں کو اہل عجم پر فضیلت نہیں دیتا اور شعوبی وہ ہے جو عربوں کی شان گھٹاتا ہے اور انھیں دوسروں پر کوئی فضیلت نہیں دیتا، صحاح میں ہے کہ شعوبیہ وہ فرقہ ہے جو عربوں کو عجمیوں پر فضیلت نہیں دیتا۔

بعض مورخین نے شعوبیہ کی وجہ تسمیہ "وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم" کو بتلایا ہے ان کا کہنا ہے کہ شعوب سے غیر عرب یعنی اہل عجم مراد ہیں اور قبائل سے اہل عرب اس لیے کہ وہ مختلف قبیلوں میں منقسم تھے نیز چونکہ شعوب کا لفظ پہلے ہے اور قبائل کا بعد میں، اس لیے اہل عجم کو عربوں پر فضیلت حاصل ہے مگر یہ استدلال زیادہ وقیع نہیں اس لیے کہ اول تو اہل لغت اس کی تائید نہیں کرتے دوسرے اگر لفظ کی تقدیم ہی فضیلت کی دلیل ہو تو "یا معشر الجن والانس" سے جن کی انسان پر فضیلت ثابت ہو گی جسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔

درحقیقت اسلام سے قبل قبائلی عصبیت ہی عربوں کی پوری زندگی کا محور تھی، اسلام نے اگرچہ اس عصبیت کو ساری عرب نسل کی ملکیت بنا دیا تھا پھر بھی اسلام کی بنیادی تعلیم مساوات کے باوجود عربوں کے دل و دماغ سے اپنی برتری کا خیال پوری طرح نہ نکل سکا تھا عہد رسالت میں یہ جذبہ بڑی حد تک دبا رہا مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب غیر عرب نومسلموں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا تو انھوں نے چند مصالح کی بنا پر ہر غیر عرب نومسلم کو کسی نہ کسی عرب سے متعلق کر دیا البتہ اس میں بالعموم اس کا خیال رکھا کہ وہ غیر عرب نومسلم اسی عرب کے ساتھ متعلق کیا جائے جس کے ہاتھ پر وہ اسلام لایا ہو یا جس نے اسے جنگ میں قیدی بنایا ہو۔ بسا اوقات غیر عرب نومسلموں کے بڑے گروہوں کو من حیث الجماعت کسی قبیلہ کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا، ایک عرب اور غیر عرب نومسلم کے اس تعلق کو ولاء اور غیر عرب نومسلموں کو ان عربوں کا موالی (مولی کی جمع) کہا جاتا تھا۔ خلافت راشدہ میں موالی کے ساتھ تقریباً مسلسل سلوک ہوتا رہا اور اسی لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہے البتہ جب بنو امیہ برسر اقتدار آئے جنھوں نے عرب عصبیت کے سہارے حکومت حاصل کی تھی، تو عربوں اور موالی کے درمیان من بعد خلیج بڑھتی چلی گئی اور بالآخر عہد اموی کے آخری دور میں موالی بالخصوص ایرانیوں کا عربوں کے خلاف حقارت و نفرت کا جذبہ بھی امویوں

کے زوال کا سبب بنا۔

اس پس منظر میں اگر ہم عہد عباسی کی ابتدائی علمی اور تہذیبی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں تین قسم کے رجحانات نظر آئیں گے۔

۱۔ تمام قوموں میں عرب سب سے افضل اور بہتر ہیں، اس رجحان کے حاملین اپنے موقف کی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے تھے:

ا۔ عربوں کی شجاعت و بہادری اور حریت پسندی جس کی بنا پر اسلام سے پہلے بھی روم و ایران جیسی طاقتور بڑی سلطنتوں کو ان کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی اور اسلام کے بعد انھیں بڑی قوموں کی سیادت و قیادت حاصل ہوئی۔

ب۔ عربوں کی خلقی سخاوت و شرافت، مہمان نوازی، بہادری، پابندی عہد اور وفاداری جیسی خوبیاں جن میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

ج۔ عربوں کی قوت بیان و شاعری، حسن تعبیر و بدیہہ گوئی جیسی خوبیاں جن میں وہ دوسری قوموں سے بہت آگے تھے۔

د۔ عربوں کا اپنے حسب و نسب کی حفاظت کرنا اور اپنے نسب ناموں پر ہی اپنے حسب کی بنیاد رکھنا۔

ھ۔ اسلام عربوں کے درمیان ظہور میں آیا اور انھیں کے درمیان پروان چڑھا، آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی عرب تھے۔

و۔ اقوام عالم کو اسلام کی دعوت دینے والے اور دنیا کے دور دراز خطوں میں پہونچ کر اسلام کی اشاعت کرنے والے عرب ہی تھے اور عجمیوں پر عربوں کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔

عبداللہ بن المقفع، عبدالملک الاصمعی (۷۴۰ - ۸۲۸ء)، ابو عثمان الجاحظ (۷۷۵ - ۸۶۹ء) اور ابن قتیبۃ الدینوری (۸۲۸ - ۸۸۹ء) وغیرہ اسی رجحان کے علمبردار تھے۔

۲۔ عربوں کو دوسری قوموں پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی قوم کسی قوم سے افضل ہوسکتی ہے اس لیے کہ ایک ہی مٹی اور قوام سے سب کی تخلیق ہوئی ہے۔ افراد کو ایک دوسرے پر فضیلت ہوسکتی ہے اقوام کو نہیں، فضل و شرف، حسب و نسب سے نہیں بلکہ صرف اخلاق و اعمال اور علم و تقویٰ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ ہر قوم میں کچھ اچھے اور کچھ برے لوگ ہوتے ہیں اور ہر قوم میں کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اس لیے ایک شخص دوسرے شخص سے محض اپنے دین و اخلاق اور علم و فضل کے لحاظ ہی سے بہتر ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ اپنے نظریہ کی تائید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حجۃ الوداع کی تقریر پیش کرتے ہیں جس میں باختلاف الفاظ ادا یا معاً تقویٰ ہی کو وجہ فضیلت قرار دیا گیا ہے ایک روایت ہے کہ

"لیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقویٰ"

"کسی عربی کو کسی عجمی پر برتری حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کی بنا پر"

"الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ"

"ہاں، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔"

یہ رجحان رکھنے والے عام طور پر اہل التسویہ کہلاتے تھے۔

۳۔ عجمی اقوام عربوں سے برتر اور بہتر ہیں، اس رجحان کی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کیے جاتے تھے:

ا۔ قابل فخر چیزیں تہذیب و تمدن، علم و حکمت اور صنعت و حرفت وغیرہ ہیں جن سے عرب بالکل تہی دامن و نا آشنا تھے جبکہ غیر عرب اقوام میں یہ بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

ب۔ اگر حکومت و سلطنت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو عرب میں نہ کوئی سکندر اعظم یا سلیمان ذی جاہ پیدا ہوا ہے اور نہ کبھی فراعنہ مصر، قیاصرۂ روم اکاسرۂ ایران کی سلطنتوں کی ہمسری کرسکے۔

ج۔ اگر نبوت و رسالت ہی پر فخر کیا جاسکتا ہے تو سارے انبیاء و رسول سوائے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت اسماعیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر عرب تھے۔

د۔ اگر شعر و شاعری اور بلاغت و خطابت ہی باعث فخر ہو تو یہ تنہا عربوں کا طرۂ امتیاز نہیں ہے یونانیوں اور ہندوستانیوں نے بھی شعر و ادب میں اپنے جوہر دکھائے ہیں اسی طرح سحر انگیز و پر اثر خطابت کا فن یونانیوں و ایرانیوں میں بھی موجود تھا۔

ھ۔ حسب و نسب کا فخر درست نہیں ہے اس لیے کہ اسلام سے قبل عربوں میں نکاح کی پابندیاں نہ تھیں بلکہ بسا اوقات ایک ہی عورت کئی مردوں میں مشترک ہوتی تھی نیز قبائلی جنگوں میں پکڑی ہوئی عورتوں کو باندیاں بنا کر ان سے استمتاع کرتے تھے ایسی صورت میں نسب کی حفاظت کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔

و۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو وہ بنی نوع انسان کا دین ہے تنہا عربوں کا نہیں نیز خود اس نے عربوں کے خود پرستانہ رجحان کو کچل کر اور عصبیت جاہلیہ کو مٹا کر تقویٰ ہی کو تفوق و برتری کا معیار قرار دیا ہے۔

اگرچہ شعوبیہ کا اطلاق مؤخر الذکر دونوں ہی رجحانات پر ہوتا تھا مگر ابتداءً یہ صرف دوسرے رجحان والوں ہی کے لیے مخصوص تھا یعنی وہ لوگ جو عجمیوں کی برتری کا انکار کرتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم سے افضل نہیں ہے اور من حیث القوم عربی اور عجمی سب برابر ہیں، اسی عوامی و مساواتی رجحان کی بنا پر ان لوگوں کو شعوبی کہا جانے لگا ہوگا جیسا کہ لسان العرب صحاح کی مذکورہ بالا تعریفوں سے معلوم ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ شعوبیہ کا استعمال تیسرا رجحان رکھنے والے گروہ پر ہونے لگا ہوگا اور یہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ عہد اموی میں پہلا رجحان پوری شدت کے ساتھ چھایا ہوا تھا اس لیے ابتداءً موالی نے اسی پہ اکتفا کرنا غنیمت سمجھا ہوگا کہ وہ مساوات کا رجحان پیدا کریں لیکن جب اس میں کامیابی حاصل کر کے انھوں نے عہد عباسی میں اپنا تسلط قائم کر لیا اور تیسرے رجحان نے فروغ پایا تو شعوبیہ کا لفظ اس پر بھی بولا جانے لگا ہوگا جو بالآخر انھیں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہوگا۔

تاریخ اسلام میں سب سے پہلی جماعت جس پر معنوی اعتبار سے شعوبیہ کا اطلاق ممکن ہے وہ خوارج کا فرقہ ہے، ان کا سیاسی مسلک وہی تھا جو علمی مناقشوں کی شکل میں شعوبیوں کا یعنی تمام اقوام کی مساوات۔ خوارج مذہب و سیاست میں تنہا قریش کی سیادت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے ان کی جنگ حقیقتاً عربوں کے خلاف نہیں تھی بلکہ اس قبائلی عصبیت کے خلاف تھی جو تفوق و برتری کا سرچشمہ تھی لیکن خوارج و شعوبیوں کی یہ مشابہت یہیں پر ختم ہو جاتی ہے ورنہ اصطلاحی معنی میں نہ خوارج کبھی اس لفظ کے مصداق بنے تھے اور نہ ہی شعوبیوں کی طرح عرب بیزاری ان میں پائی جاتی تھی۔

موالی کی جانب سے مساوات کا مطالبہ اور تہذیبی و سیاسی سطح پر عربوں کے برابر آنے کی ان کی خواہش درحقیقت اس بے چینی کا نتیجہ تھی جو ایک صدی سے زائد عرب برتری و بالادستی کے زیر سایہ رہنے سے پیدا ہوئی تھی مساوات کا یہ مطالبہ شعوبیت کا سب سے ہلکا رنگ تھا جو بہت تیزی سے ہلکا ہوتا گیا، ایرانیوں نے اس حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ایک طرف عرب باہر سے آ کر ان پر مسلط ہو گئے ہیں اور دوسری طرف ان کے یہ سیاسی مقتدا، تہذیبی، علمی اور انتظامی معاملات میں خود انھیں کی خوشہ چینی پر مجبور ہیں یہ احساس جتنا بڑھتا گیا اتنا ہی عربوں کے خلاف جذبہ بھی گہرا ہوتا گیا۔

اموی حکومت کے خاتمہ اور عباسی دور کے آغاز نے شعوبیت کے لیے وہ سازگار حالات فراہم کر دیے جو اس جذبہ کے اظہار کے لیے ضروری تھے۔ ایک حد تک یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اموی حکومت کی رگوں میں خالص عرب خون موجزن تھا جبکہ عباسی خلافت کی نشو و نما میں عجمی خون کا حصہ زیادہ تھا اور ۳۷ خلفاء میں سے صرف تین، ابو العباس سفاح، المہدی اور الامین، آزاد ماؤں کی اولاد تھے جو علی الترتیب پہلے، تیسرے اور چھٹے خلیفہ تھے۔ ان حالات میں ایرانی عنصر کی سیاسی قوت میں روز افزوں اضافہ عین فطری تھا، عباسی دربار میں ایرانی تہذیب کو دوبارہ پھلنے پھولنے کے مواقع ہاتھ آ گئے اور اب موالی مساوی حقوق پر قناعت کرنے کی بجائے عربیت کی تذلیل و تحقیر اور ایرانی تہذیب و ثقافت کے تفوق کا مظاہرہ برملا کرنے لگے۔ خلیفہ ابو جعفر المنصور (خ ۷۵۴ — ۷۷۵ء) کے محل کے پھاٹک پر ایک عرب کو گھنٹوں انتظار کے بعد بھی داخلہ کا پروانہ ملتا تھا جبکہ موالی آزادانہ طور پر آتے جاتے تھے اور پوری بے باکی کے ساتھ عربوں کی بدویت کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ عباسی دربار میں وزراء بھی عام طور پر موالی ہی تھے کوئی عرب اتفاق ہی سے آتا تھا۔ عربوں کی عظمت کا تذکرہ کیا جانا بھی انتہائی ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا مشہور عرب شاعر ابو تمام (۷۸۸ - ۸۴۵) نے جب خلیفہ

کی غلامت وحقارت ظاہر کرنے کے لیے اس کا مقابلہ حاتم طائی، احنف اور ایاس سے کیا جن کی شخصیتیں عربوں کے لیے باعث افتخار تھیں تو ایک وزیر نے حقارت آمیز تبسم کے ساتھ کہا کہ "تم امیر المومنین کا مقابلہ عرب کے ان وحشیوں سے کر رہے ہو!"

اگرچہ شعوبیت کی اس رزم آرائی میں ایرانی سب سے آگے تھے اس لیے کہ حلقہ بگوش اسلام ہونے والی اقوام میں وہی نمایاں علمی و تہذیبی روایات کے حامل تھے لیکن ان کے علاوہ دیگر غیر عرب اقوام بھی برابر کی شریک وسہیم تھیں اگرچہ مقامی حالات کی بنا پر ان کی شعوبی عصبیت کے رنگ الگ الگ اور کسی قدر مختلف تھے۔

شعوبی رجحانات کے اظہار میں جس غلو و بیباکی سے کام لیا گیا وہ بھی خاصا حیرتناک ہے، مثلاً سہیل بن ہارون نے، جو المامون (خ ۸۴۷ — ۸۶۱) کے عہد میں بیت الحکمۃ کا اعلیٰ ذمہ دار تھا، عربوں سے اپنی نفرت و عداوت کے اظہار کے لیے کلیلہ و دمنہ کے طرز پر شعلہ دمقری کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں محض عرب اقدار کی تنقیص کی خاطر اس نے سخاوت وفیاضی کی برائیاں بیان کیں اور بخیلی کی تعریف و توصیف تحریر کی؛ اس کتاب کے علاوہ بھی اُس نے اپنی انتہا پسندانہ شعوبیت کے اظہار کے لیے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو اس کی عربوں سے عداوت کے اظہار اور اُن کا مذاق اڑانے کی کوشش کا بین ثبوت ہیں۔ عربی کے ایرانی نثر اد شاعروں نے بھی اس شعوبیت کو ہوا دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور عرب اقدار کی برائیاں عوام تک پہونچانے میں ان کا خاص حصہ ہے، اس لیے کہ ایک طرف عربی شاعری میں ہجو گوئی ایک خاص صنف تھی اور دوسری طرف عرب وایران کے عوام کو شعر و شاعری سے بے حد دلچسپی تھی چنانچہ ان لوگوں کو اپنے عرب مخالف جذبات پھیلانے کا بہترین میدان مل گیا۔

ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (جامعہ، نئی دہلی)

ساٹھ برس قبل کی دِلّی

ساٹھ پینسٹھ برس قبل تک دلّی میں رات رات ہی ہوتی تھی رات آئی اور لوگ باگ گھروں کو چلے۔ دن کام کے لیے تھا، رات آرام کے لیے۔ زیادہ سے زیادہ دکانیں بند ہونے تک باہر چلت پھرت اور رونق رہتی تھی۔ پھر رونق گھروں کی بڑھ جاتی تھی۔ رات کے وقت باہر نکلنے کو یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی افتاد پڑی ہے۔ آج کل تجربوں کے بعد پھر آٹھ بجے اور نو بجے دُکانیں بند کر دینے کے احکام جاری ہونے لگے ہیں۔ ساٹھ پینسٹھ برس قبل احکام کی ضرورت نہیں تھی گلیوں میں اور سڑکوں پر اندھیرا ہوتا تھا تاکہ فضول سیر گشت نہ کی جائے۔ گھر کے اندر بیٹھا جائے۔ پولس کا پہرہ دار کانسٹبل پوچھتا تھا: "ہوکمس ویئر"

۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں ہم دو چار ہم عمر رات کے تین بجے تھیٹر سے لوٹتے تھے تو دلّی کی بڑی سڑکوں پر بہت دور دور مٹی کے تیل کی لالٹینیں ٹمٹماتی ملتی تھیں۔ گلیوں میں اللہ کا نام تھا۔ آہٹ سن کر کتے بھونکتے تھے۔

مٹی کے تیل کی لالٹینیں بھی انگریزوں کے زمانے میں نصب کی گئی تھیں۔ اول اول چاندنی چوک میں نصب ہوئیں پھر دوسرے اہم بازاروں میں پھر چھوٹے چھوٹے بازاروں میں جب اسی ترتیب سے سڑکوں پر بجلی کی بتیاں لگنے لگیں تو مٹی کے تیل کی لالٹینیں گلیوں میں پہنچ گئیں۔

بجلی کی روشنی کی ابتداء ۱۹۰۵ء میں ٹاؤن ہال کے اردگرد کے تھوڑے سے حصّے سے ہوئی تھی جس نوع کے بلب پہلے پہل وہاں لگائے گئے تھے، وہ اب دلّی کے علاوہ بھی کہیں نہیں دکھائی دیتے۔ ان کی روشنی اتنی تیز تھی کہ آنکھیں اسے برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ بڑی ناگوار تیزی تھی۔ اس لیے انھیں جلد ہٹا دیا گیا تھا۔

دلّی میونسپلٹی کے قیام، یعنی ۱۸۶۳ء سے قبل دلّی کے بازاروں میں تو روشنی نہیں تھی۔ لیکن دلّی دروازے اور بستی نظام الدینؒ کے درمیان جگہ جگہ گز گز بھر اونچے منارے بنے ہوئے تھے ان میں دیئے جلائے جاتے تھے درگاہ شریف کے قریب دلّی آنے والے مسافروں کا آخری پڑاؤ تھا۔ وہاں سے مسافر اگر ایسے وقت چلتا تھا کہ فصیل کے دروازے بند ہوتے ہوتے دلّی پہنچ جائے تو دیولوں کی روشنی اس کی رہنمائی کرتی تھی۔ فصیل چاروں طرف سے ثابت تھی اور فصیل کے دروازے روز رات کو بند کر دیے جاتے تھے۔

دلّی میونسپلٹی نے شہر میں بھی دیولوں اور کڑوے تیل سے ہی روشنی کا آغاز کیا تھا۔ گھروں میں بھی کڑوا تیل استعمال ہوتا تھا۔

جھاڑ، فانوس مشرق کی قدیم چیزیں ہیں ان میں موم بتیاں جلتی تھیں
میرے بزرگ عزیز اور دوست خواجہ فضل احمد رشید ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"آج سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل تک مالدار ہندو زوال کے مارے مسلمان شرفا کا احترام کرتے تھے۔ میرے والد کے انتقال کو تہتر برس ہونے کو آئے۔ ان کے نانا کا ذاتی مکان روشن پورہ میں نئی سڑک (دلی کی مشہور سڑک ہے) کے پاس تھا۔ جب میں نے والد کے انتقال کے بعد دلی پہنچ کر وہ مکان دیکھا تو اس وقت محلہ روشن پورہ میں ہندو ہی ہندو تھے مسلمانوں کا فقط ہمارا گھر رہ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے وہاں بہت مسلمان آباد تھے۔ ذوق کے استاد شاہ نصیر اسی محلے کے باشندے تھے۔ ایک شعر یاد آگیا ؎

بعد ان سب کے میر صاحب نے
خوب روشن کیا روشن پورہ

کہنے کی بات یہ ہے کہ تہتر برس قبل گرد و پیش، آمنے سامنے ہندوؤں کے بلند اور مرتفع مکان تھے، لیکن کیا مجال جو دن میں کوئی مرد چھت پر چڑھ جائے۔ وہ یوں کہ میاں صاحب کے ہاں کا سامنا ہوگا۔ نو وارد چڑھ جاتا تو میاں صاحب کے ہاں سے آواز پڑتی کہ سامنا ہو رہا ہے۔ اتر جاؤ، ادھر آواز پڑی، ادھر وہ نیچے اترا: اور مالک مکان معافی مانگنے آئے کہ مہمان تھا، اسے خبر نہیں تھی"۔

انگلش میڈ ہندوؤں اور انگلش میڈ مسلمانوں سے پہلے ان دونوں میں کیسے اچھے تعلقات تھے۔ اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ کیجیے:

۱۸۵۷ء میں سونی پت کے ایک مسلمان میر فیض الحسن دلی کے کوتوال تھے جس بنیے کے ہاں میر صاحب کے ہاں سے آٹا دال آتا تھا اس کا نام چھنامل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانوں کی جائدادیں نیلام ہوئیں تو میر صاحب نے بے شمار جائدادیں کوڑیوں کے مول چھنامل کو دلوادیں اور چھنامل امیر کبیر بن گیا۔

چھنامل کا خاندان آج دلی کا سب سے بڑا خاندان ہے میں نے چھنامل کے بیٹے رائے بہادر لالہ رام کشن داس اور چھنامل کے پوتے رائے بہادر شیو پرشاد سی، آئی۔ ای کی شان دیکھی ہے۔ دلی کا کوئی محلہ ایسا نہیں ہے جہاں چھنامل کی جائداد نہ ہو۔ جس دکان یا مکان پر سی۔ ایس (C.S) یعنی چھنامل سالگ رام لکھا دیکھو تو کہ چھنامل سالگ رام والوں کی ملکیت ہے۔ سالگ رام چھنامل کا باپ تھا۔

میر فیض الحسن کوتوال نہیں رہے۔ تب بھی چھنامل نے میر صاحب کا احسان یاد رکھا اور مرتے وقت وہ وصیت کر گیا کہ میری اولاد میر صاحب کی اولاد سے اس طرح ملے جس طرح اپنے کنبے سے ملتے ہیں۔ چنانچہ میر فیض الحسن کے خاندان میں بچہ پیدا ہوتا تو سونی پت سے دلی خبر آتی اور چھنامل والوں کی کوٹھی سے مقررہ رقم بھیجی جاتی۔ اور رقم کے ساتھ کوٹھی کی طرف سے نام بھی بھیجا جاتا۔ جسے وہ لوگ عرف کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے لیے بھی چھنامل کا فی رقم مقرر کر گیا تھا۔ میر فیض الحسن کے پوتے میر سراج الحسن ہمارے خاندان میں بیاہے ہوئے تھے۔ ان کا چھنامل عرف منی تھا اور ان کے چھوٹے بھائی میر شمس الحسن کا عرف پنا تھا۔

میں سنی ہوں۔ میر سراج الحسن شیعہ تھے جس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ نہیں تھا، اس زمانے میں سنیوں اور شیعوں کی رشتہ داری کون سی عجیب بات ہے میری ننھیال اور ددھیال دونوں میں پچاس فی صد شیعہ تھے۔ کیا کہوں لمبی کہانی ہے۔ کیا تھا کیا ہو گیا۔

ملا واحدی		(منادی نئی دہلی)

●●●

بزمِ احباب

فرید احمد برکاتی، جے پور

تحریک رجنوری ۷۶ء میں مختار شمیم صاحب (اندور) کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے راقم کے مضمون مطبوعہ تحریک اکتوبر ۷۵ء پر تبصرہ کرتے ہوئے چند اعتراض کیے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں چند وضاحتیں اپنی جانب سے پیش کروں۔ اس مکتوب میں مختار شمیم صاحب نے چند اصولی قسم کی باتیں بھی لکھی ہیں اور کچھ الزامات بھی عاید کیے ہیں مثلاً وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ میرے "بعض اعتراضات سے اختلاف کی گنجائش کم ہے"۔

(۱) "لیکن اگر مزید غور و خوض سے کام لیا جاتا تو غلط فہمیاں راہ نہ پاتیں"۔ (۲) "اعتراضات کی رو میں غیر محتاط روتیہ سے کام لیا گیا ہے"۔ (۳) "....... لیکن اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا کہ فرہنگ میں اشعار کو مدِ نظر رکھ کر ہی معنی لکھے گئے ہیں"۔

گویا اگر اشعار کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا تو فرہنگ میں دیے ہوئے مطالب کی صحت سے انکار ممکن نہیں تھا۔

(۴) اور "بعض اغلاط کی وجہ شمیم صاحب نے یہ بتائی ہے کہ مسودہ کی تیاری سے کتابت و طباعت کی منزل تک بھول چوک کے کئی مرحلے آتے ہیں"۔

سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین ہونا چاہیے کہ مصنف کی فرو گذاشتوں یا تصنیفی و تالیفی خامیوں کی نشان دہی سے تنقیص مراد ہوتی ہے نہ مصنف کی کاوشوں سے انکار مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ بحث و تمحیص ایک اعلیٰ معیار کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔ زیرِ بحث مضمون میں پروفیسر ابو محمد سحر صاحب کی کاوشوں کا اعتراف موجود ہے اور اُن کی مؤلفات کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ نیز اُن کے منصب و مرتبے کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ لہٰذا میرا مطالبہ یہ ہے کہ اس مضمون کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جانا بھی چاہیے۔

شمیم صاحب نے اعتراضات پر جو محاکمہ کیا ہے اس میں انھوں نے اکثر تاویل ہی سے کام لیا ہے۔ استدلال ندارد۔ چنانچہ صوفیا کے مشہور مقولے کے متن کے سلسلے میں انھوں نے شاہ سلیمان کے مرتبہ متن اور دیگر مطبوعہ قصائد میں اس مقولے کو اُسی طرح 'ہونا' لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سحر صاحب اصل متن میں بھلا تصحیح کیوں کر کر سکتے ہیں"۔

اس سلسلے میں میرے اعتراض کی نوعیت دوہری تھی۔ اوّل یہ کہ مقولے کا متن "انتخاب قصائد اردو" میں بلا تصحیح مکرر استعمال ہوا ہے۔ متن کی تصحیح مرتب کے فرائض میں داخل ہے۔ شمیم صاحب نے جن مطبوعہ دواوین کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ "اُن میں بھی یہی صورت ہے"۔ تو اس امکان کی طرف راقم الحروف نے اپنے مضمون میں پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلے مطبوعہ نسخے میں جو غلطی رہ گئی تھی، بعد کے ناشرین یا اسی ناشر نے بعد کی طباعتوں میں بھی اُسی لکیر کو پیٹا ہوگا۔

دوم: یہ کہ پروفیسر صاحب نے اس غلط متن کو اپنی عبارت میں استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ آں محترم بھی اسی متن کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ غلط ہے۔ اور جب شمیم صاحب نے اُسے غلط تسلیم کر لیا تو پھر اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں تھی۔ جہاں تک شمیم صاحب کی بات کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ مقولے کا متن ذوق کا نہیں بلکہ تصوف کا ایک معروف مقولہ ہے اور اس کی تصحیح نہ صرف یہ کہ ہو سکتی تھی بلکہ ضروری تھی۔ متن کی تصحیح اور چیز ہے اور اس میں ردّ و بدل چیزے دیگر۔

شمیم صاحب لکھتے ہیں کہ "ہفت قلزم" کے اقتباس کو متن میں شامل نہ کرتے ہوئے "حاشیے میں درج کر کے یہ

ظاہر کیا ہے کہ ابھی اس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔"

اوّل تو متن یا حاشیے میں اس قسم کا کوئی اظہار لفظاً و معناً موجود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ شمیم صاحب کی اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ جیسے وہ تحقیق کا کوئی مسلمہ اصول بیان کر رہے ہوں اگر انھوں نے یہی سمجھ کر یہ بات لکھی ہے تو عرض ہے کہ یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ اور اگر اُن کا مفہوم یہ نہیں تو یہ ان کی اپنی تاویل و تفہیم ہے۔ پھر بھی رفع شک کے لیے اُن کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اگر صفت قلزم کی تعریف تشنۂ تحقیق متصور تھی تو اُسے متن یا حاشیے میں شامل کر لینے کی کوئی افادیت اور ضرورت نہیں تھی حاشیہ میں مندرج عبارت کا مقصد اپنی بات کے ثبوت میں حوالہ و استناد ہوتا ہے یا متن کی توضیح وغیرہ۔ جب ان میں سے کوئی مقصد نہیں تھا تو پھر اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اب شمیم صاحب کا یہ اعتراض باقی رہ جاتا ہے کہ "بحث و تمحیص کے بعد وہ خود بھی (یعنی راقم السطور) کوئی مناسب حل پیش نہیں کر سکے ہیں"۔ مضمون میں "تبرا" "مشتبب و غیر مشتبب" کی معروف اصطلاحات کے علاوہ "مجدوع" "مقطوع" وغیرہ الفاظ اور تصحیف کی بات پر بہ غالباً شمیم صاحب نے توجہ نہیں دی ورنہ وہ یہ تحریر نہ فرماتے

"بدل ما یتحلل" پر تبصرہ کرتے ہوئے شمیم صاحب نے لکھا ہے کہ رشید حسن خاں صاحب نے بھی اپنی فرہنگ مشمولہ انتخاب سودا میں یہی معنی ما یتحلل کے لکھے ہیں ——— "وہ غذا جو ہضم ہو چکی ہو" مزید لکھتے ہیں "عین ممکن ہے کہ سحر صاحب سے اندراج میں غلطی ہوئی ہو لیکن مرادی مفہوم تک تو وہ بھی پہنچ گئے ہیں ———" اُن کا یہ جملہ اوّل تو پروفیسر صاحب کے شایانِ شان نہیں ہے۔ دوسرے سحر صاحب نے اپنی فرہنگ میں ما یتحلل کے معنی "وہ چیز جو حل ہو جائے۔ روزی، خوراک" لکھے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب اور ابو محمد سحر صاحب کے معانی میں بیّن فرق ہے جس کو شمیم صاحب محسوس نہیں کر سکے۔ اس کے علاوہ کیا شمیم صاحب کے نزدیک سودا کے اس مصرعے میں [اپنی سرکار سے وان ما یتحل کا بدل] بدل کا لفظ محض ایک مہمل قافیہ اور حشو ہے۔؟ میں اپنے مضمون میں وضاحت کر چکا ہوں کہ بدل ما یتحلل ایک مکمل ترکیب اور ایک علمی اصطلاح ہے۔ علمی اصطلاحوں میں قطعیت اور جامعیت و مانعیت ہوتی ہے۔ متقدمین میں متداولہ علوم کی اصطلاحات کو نظم کرنے میں بڑی کاوش کی جاتی تھی۔ یہ رجحان ایک مسلمہ امر ہے۔ اس لیے ایسی کسی بھی اصطلاح کے مفہوم تک پہنچنے کے لیے نہ محض سرسری لغوی تشریح کافی ہوگی نہ محض تاویلات اور قیاسات ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اگر شمیم صاحب کو اصطلاح میں بدل کو علیحدہ رکھنے پر ہی اصرار ہے تب بھی "ما" کا صلہ ہمیں ایک محذوف مرجع کی یاد دلائے گا۔ اور یہ مرجع خود سودا کے مذکورۂ بالا مصرع میں موجود ہے۔ رشید حسن خاں صاحب کی فرہنگ سے شمیم صاحب کا استشہاد غلط تو نہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ اُس سے میری ہی بات کی تائید ہوتی ہے نہ کہ شمیم صاحب کی تاویل کی۔ کیا شمیم صاحب صرف مرادی معنی تک پہنچ جانے ہی کو سحر صاحب یا کسی اور کے مرتبۂ علمی اور سخن فہمی کی معراج سمجھتے ہیں؟

شعر میں نہیب کے صحیح مدلول کے سلسلے میں مختار شمیم صاحب نے بغیر کسی لغوی حوالے کے یہ فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ ——— "خوف و دہشت کے معنی بھی لغات میں موجود ہیں"۔ اور یہ کہ "کم از کم سودا کے شعر میں تو صاف طور پر اس کا موقع معلوم ہوتا ہے"۔ لیکن ذوق کے شعر میں اس لفظ کے محل استعمال اور مدلول پر انھوں نے کوئی رائے نہیں دی!

یوں تو کسی بھی لغت میں ایک لفظ کے مختلف اور متعدد معانی شمیم صاحب کو مل جائیں گے۔ لیکن نہیب کے جو معنیٰ انھوں نے لکھے ہیں وہ لغت سے رجوع کیے بغیر لکھے گئے ہیں اور یہ انھیں کہیں نہیں ملیں گے یا اگر ملے بھی تو کسی غیر مستند اور غیر صحیح اردو لغت میں۔ کیونکہ نہیب عربی لفظ ہے اور اردو میں اس کا استعمال غریب و شاذ کے درجے میں ہے۔ لہٰذا انھیں کسی مستند عربی لغت ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور پھر یہ دیکھنا ہوگا فحوائے کلام سے کون سے معنی انسب اور ارجح ہیں شمیم صاحب نے اس سلسلے میں رشید حسن خاں صاحب کی فرہنگ کا بھی حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھا حالانکہ وہ تو اُن کے پیش نظر تھی ——؟!

ان الفاظ و اصطلاحات کے علاوہ شمیم صاحب نے دوسرے جن الفاظ پر مطلق الحکمی کے ساتھ محاکمہ کیا ہے۔ اُن کی حیثیت اس سے بھی زیادہ کمزور ہے اور اُسے محض تاویل ہی کہا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ لفظ حُسّود پر محاکمہ کرتے وقت انھوں نے کہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ شمیم صاحب راقم کے مضمون میں اس لفظ پر تفصیلی بحث کو پھر ملاحظہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ لفظ نہ تو جمع کا وزن ہے۔ نہ حاسد کی جمع حسود ہی آتی ہے۔ تو پھر یہاں اس کا "موقع ہونے" نہ ہونے یا "مناسب وغیر مناسب" کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ لہٰذا شمیم صاحب یا تو اعتراض کو تسلیم کرتے یا اُسے غلط ثابت کرتے۔ لیکن انھوں نے تو بڑی عجیب سی بات لکھی ہے کہ ——— "بہت ممکن ہے سحر صاحب کو معنی لکھنے میں یہ خیال نہ رہا ہو کہ یہاں حسود یعنی حاسد کی جمع کے طور پر لینا مناسب نہیں"۔ اس پر اگر میں یہ کہوں کہ مختار شمیم صاحب محاکمہ کرنے کے بعد بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ حُسّود سرے سے نہ جمع کا وزن ہے نہ جمع کا صیغہ تو انھیں یقیناً ناگواری ہوگی۔

مختار شمیم صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ "مسودہ سے طباعت کی منزل تک بھول چوک کے بہت سے مرحلے آتے ہیں"۔ لیکن ہر غلطی کو کتابت و طباعت کے سر تو نہیں منڈھا جاسکتا۔! پھر بھی اسی بات کے پیشِ نظر میں نے متعدد الفاظ کو نظر انداز کردیا تھا اور مضمون میں شامل نہیں کیا تھا۔ چنانچہ شمیم صاحب کے عائد کردہ الزامات سے بری ہونے کے لیے رجن کو میں نے شروع ہی میں نمبر وار درج کردیا ہے) پروفیسر ابو محمد سحر صاحب کی فرہنگ سے چند اور الفاظ پیش کرتا ہوں جن کو قصداً نظر انداز کردیا گیا تھا۔

[ص ۴۴۰ (۱۳۸)] اطہر = پاک۔ حالانکہ ہونا چاہیے تھا بہت پاک کیونکہ صرف 'پاک' تو 'طاہر' کے معنی ہوتے ہیں۔

فلزّات = فلز کی جمع۔ معدنی دھاتیں [ص ۴۱۸ (۱۰۵)] جب کہ فلزّات کا واحد فلزّہ ہے۔ مگر امکان یہ تھا کہ کتابت و طباعت میں تائے مختفی کا ننھا سا دائرہ کہیں کھو گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس پر یہ اعتراض بھی ہوسکتا تھا کہ یہ اصلی نہیں مرادی معنی ہیں لیکن چونکہ شاعر نے مرادی معنی ہی لیے ہیں، پروفیسر صاحب نے اپنی فرہنگ میں یہ طریقہ رکھا ہے کہ جہاں مرادی معنی لکھنے ہوتے ہیں وہاں اصلی اور لغوی معنی کے بعد "مراد" لکھ کر مجازی یا مرادی معنی لکھتے ہیں یہاں یہ طریقہ بھی نہیں برتا گیا ———

زیرِ بحث فرہنگ میں اس قسم کی مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔

شمیم صاحب کو مجھ سے یہ شکایت بھی ہے کہ میں نے فرہنگ کے الفاظ و معانی کو اشعار سے الگ کرکے دیکھا ہے اور گویا انھیں کے الفاظ میں "غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں"۔ اُن کا یہ اعتراض بہت گمبھیر قسم کا ہے اور یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ مضمون نگار نے یکطرفہ فیصلہ اور یکطرفہ اعتراضات کیے ہیں۔ حالانکہ ایسا قطعاً نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ "بدل ما یتحلل" اور "نہیب" کے سلسلے میں اشعار کو پیشِ نظر رکھ کر ہی بحث کی گئی ہے البتہ اشعار کا حوالہ صرف وہیں دیا ہے جہاں استدلال کے نقطۂ نظر سے ضروری تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر شمیم صاحب نے بھی (میری ہی طرح) شعر کا حوالہ دیے بغیر محاکمہ شروع کردیا جیسا کہ انھوں نے "حسود" وغیرہ کے سلسلے میں کیا ہے۔ اور کوئی دلیل بھی نہیں دی ہے۔

شمیم صاحب کے اعتراض محولہ بالا نمبر (۳) کے پیشِ نظر مختصراً اس فرہنگ سے صرف تین اشعار اور فرہنگ میں اُن کے معنی سے اور بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ اُن کے یا سحر صاحب یا دوسرے اہلِ نظر کے ہاتھ ہے۔

"انتخاب قصائدِ اردو" میں عزیز لکھنوی کا شعر ہے:

وہ شہزادی کہ جس کے موکبِ اجلال کے آگے
ملائک سے سنیں گے اہلِ محشر نعرۂ غضّوا

فرہنگ میں اس شعر کے دو لفظوں کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

موکبِ اجلال = بزرگی یا شکوہ کا لشکر۔ غضّوا = تم آنکھیں بند کرلو۔ [ص ۴۴۰ (۷۳)]

ہم ان معنوں پر لفظ جلوس کا اطلاق کریں گے۔ (یعنی ——— PROCESSION)۔ اپنے انھیں لغوی معنوں کی بنیاد پر آج بھی جدید عربی زبان میں یہ لفظ ان معنوں میں مستعمل ہے۔ اب ان کو شعر پر منطبق کرکے دیکھیے اور سیاق و سباق کے اشعار بھی ذہن میں

رکھیے تو یہی کہنا پڑے گا کہ یہاں لشکر کے معنی شاعر نے بھی مراد نہیں لیے ہیں۔ پھر اسی شعر کے قافیے کا لفظ غضوا ہے۔ آنکھیں بند کرنے یا نیچی رکھنے کے معنی جب اس لفظ سے مراد ہوتے ہیں تو عبارت میں "بصر" یا "عین" کا لفظ بھی لایا جاتا ہے۔ شعر میں اگرچہ آنکھیں لفظاً مذکور نہیں لیکن مقدر ضرور ہیں۔ شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت بی بی فاطمہؓ محشر میں تشریف لائیں گی (رفعِ شان کے لیے موکبِ اجلال کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ یعنی تنہا نہ ہوں گی بلکہ جلو میں خدام بھی ہوں گے۔ گویا شاہی آمد کا انداز ہوگا) تو فرشتوں کی زبانی اہلِ محشر یہ سنیں گے کہ نظر نیچی رکھو "اغضوا"۔ لفظ شہزادی میں یہ قرینہ پایا جاتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں دربار میں بادشاہ کی آمد اور تخت پر جلوس کی تصویر ہے۔ اور اس منظر کے تمام لوازم بھی۔ مثلاً جلو میں خدم و حشم کا ہونا، نقیب کا آواز لگانا وغیرہ۔ یہاں نقیب ملائک متصور ہیں۔ لغت کی رو سے غضوا کے معنی نیچی نظریں رکھنے کے بھی ہوتے ہیں اور آنکھیں بند کر رکھنے کے بھی۔ شعر میں اس کا محل یہ ہے کہ ہم نظریں نیچی کرنے کے معنی ہی مراد لیں۔ کیوں کہ موکبِ اجلال ایک پردہ دار خاتونِ جنت کا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں احکام پردہ کی ایک آیت کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے۔ سورۃ النور کی آیت قُل للمؤمنین یغضوا من ابصارہم .....
اور قُل للمؤمنات یغضضن من ابصارہن .....
میں غضِ بصر کے معنی علما نیچی نظریں رکھنا ہی لیتے ہیں۔ بند کر لینا نہیں لیتے۔

صفیؔ لکھنوی کے اس شعر میں ؎

ہے تغیرؔ کا اثر مادہ و صورت تک
کیونکہ اک حال ہے اور ایک ہے اس میں سے محل

محل کے معنی فرہنگ یہ بتاتی ہے۔ محل = جس پر حال قائم ہو [ص ۴۳۱ (۴)] ظاہر ہے کہ یہ معنی نہ صرف غلط ہیں بلکہ مہمل بھی قرار دیے جائیں گے کیونکہ شعر کے مفہوم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ محل عام لفظ ہے۔ اردو میں اس کا دوسرا اہم معنی لفظ مقر استعمال ہوتا ہے۔ محل کے لغوی معنی اترنے کی جگہ۔ قیام کی جگہ وغیرہ آتے ہیں حلول اس کا مصدر ہے۔ اور اس شعر میں اس سے "جائے وقوع" مراد ہے۔ اور یہی معنی میرے خیال میں مناسب اور قابلِ ترجیح ہیں۔ کیونکہ شعر میں تغیر کا اثر مادہ و صورت پر واقع ہونے کی بات کی جا رہی ہے۔ شاعر نے دوسرے مصرعے میں اول الذکر (تغیر) کو حال اور ثانی الذکر (مادہ و صورت) کو محل قرار دیا ہے لغوی اعتبار سے اس شعر میں حال کا تعلق محل سے نہ شاعر نے مراد لیا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ "حلول" کی طرف شاعر کا انتقالِ ذہنی ہے۔ کیونکہ یہاں عقیدۂ تناسخ کی بات ہو رہی ہے جو حلول کا عقیدہ ہے۔

آخری مثال۔ [ص ۴۳۰ (۱۲۲)] شقی = سنگ دل۔
شقی کے معنی بدبخت ہیں جس کی نقیض یا ضد "سعید" آتی ہے۔ مصدر شقا ہے۔ عربی لغت میں سنگ دل کے معنی کہیں ملیں گے نہ شاعر نے سنگ دل مراد لیے ہیں۔ سنگ دلی پر بدبختی کا اطلاق تو ضرور ہو سکتا ہے لیکن بدبختی پر لازمی طور سے سنگ دلی کا اطلاق غلط ہوگا۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ شقی کے معنی "بدبخت، سنگ دل" اگر لکھے جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن تنہا "سنگ دل" لکھنا میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ اردو میں ایک ہی مفہوم کے لیے ترادفات و توابع کے استعمال سے معنی کی غلط تفہیم راہ پا گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض قریب الصوت الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی لکھتے وقت تسامح ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ میرے خیال میں نہیب اور مہیب کی صوتی مشابہت کی بنا پر ہوا) "شقی" سے ملتا جلتا ایک اور لفظ ہے "قسی" جس سے قساوتِ قلبی، یا قسی القلب کی تراکیب استعمال کی جاتی ہیں۔ اتفاق سے "قساوت" کے وہی معنی ہیں جو "شقاوت" کے سر تھوپ دیے جاتے ہیں..... اور یہی اس غلطی کی بنا ہے۔

خط کافی طویل ہو گیا جس کا مجھے بھی احساس ہے۔ لیکن کسی قدر تفصیل سے کام لینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ البتہ اس تفصیل سے فائدہ ضرور ہوگا کہ میرا نقطۂ نظر نہ صرف واضح ہو جائے گا بلکہ شمیم صاحب کے بعض شبہات (جن کا تعلق میری نیت یا "خواہ مخواہ اپنی قابلیت جتانے" سے بھی ہو سکتا ہے) دور ہو جائیں گے۔

تنہا تماپوری، تماپور

"پرانا شہر، نئے لوگ" (تحریک جنوری ۷۶ء) کی اشاعت اس لیے قابلِ تعریف ہے کہ ایک معیاری پرچہ میں غالباً پہلا مضمون ہے جس میں گلبرگہ کا ادبی جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس مختصر سے مضمون میں جبار جمیل نے بہت سے قلمکاروں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کچھ قابلِ ذکر نام اُن سے چھوٹ گئے ہیں اور چند غیر ضروری نام شامل کیئے گئے ہیں ——— سلیمان خطیب اور حمید الماس کا وطن گلبرگہ بتانا غلط ہے۔ دیرینہ قیامی کی وجہ سے راہی قریشی کی طرح گلبرگہ ان کا بھی وطنِ ثانی کہا جا سکتا ہے۔ اور جب وطنِ ثانی کی بات مذکور ہوگی تو مبارز الدین رفعت یا عاقل علی خاں اور سلام نورس جیسے قلمکاروں کو فراموش کرنا ادبی ناانصافی کہلائے گی۔ گلبرگہ کا قدیم نام "کل برگی" نہیں تھا "کلم برگے" تھا، چالوکیہ کے دور کا کتبہ اس بات کا ثبوت ہے۔ بیدر ضلع کے ایک قدیم کتبہ میں بھی یہی نام شامل ہے اور فصیح کنڑا میں یہی نام صحیح مانا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ نام بگڑ کر "کلّ برگے" ——— "کلبرگی" اور پھر "کل برگی" ہو گیا جس کے معنی "پتھروں کا ڈھیر" نہیں "دھان کا ڈھیر" ہیں، یا ایک قسم کا اناج۔ نونیج نامی ایک مغربی سیاح کی تحریر میں "کلبرگور" بھی درج ہے۔

حمید الماس کے سلسلہ میں مضمون نگار نے ایک ہی جملے میں دو متضاد باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں "مجموعہ میں شامل نظموں اور غزلوں سے شاعر کے درد کی پہچان تو ہو جاتی ہے مگر خود شاعر کی پہچان ذرا کھٹائی میں پڑ جاتی ہے"۔ یعنی درد تو پہچانا گیا مگر شاعر کو نہیں پہچانا گیا ——— شاعر کے درد اور شاعر میں فرق کیوں کر پیدا ہوتا ہے؟ شاعر کے درد کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو پہچانا گیا۔ کسی شاعر کے درد کی پہچان اُس کی تخلیقات سے ظاہر ہو جائے تو یہ اُس کے فن کا کمال ہے۔

عبد القدیر، گلبرگہ

جنوری کے تحریک میں جبار جمیل کا مضمون "پرانا شہر نئے لوگ" پسند آیا لیکن ہفت گنبد کو ناول پڑھنے اور رجوا کھیلنے کی جگہ کہہ کر مضمون نگار نے زیادتی کی ہے۔ مضمون نگار کو شاید معلوم نہیں کہ یہی وہ پُرسکون مقام ہے جہاں گلبرگہ کے کئی شعراء و ادبا کا بچپن کھیل کود میں اور جوانی مطالعے میں گذری ہے۔ ایک جگہ مضمون نگار نے ان گنبدوں کے سیاہ رنگ اور حضرت خواجہ بندہ نواز کے گنبد کی سفیدی کے تقابل میں اُن کے مکینوں کی صفات و کردار کو واضح کیا ہے جو مناسب نہیں۔ ابراہیم جلیس نے اپنے ایک ناول میں گلبرگہ کے غفوریہ ہوٹل کا ذکر کیا ہے۔ شاید اُس کی وجہ یہ ہو کہ آج سے پچیس برس پہلے غفوریہ ہوٹل کو، ہوٹل سے زیادہ گلبرگہ کے ادیبوں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان دنوں گلبرگہ کی "چاچا ہوٹل" بھی ہوٹل سے زیادہ ادیبوں کا مرکز ہے۔ پتہ نہیں مضمون نگار نے چاچا ہوٹل کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ مضمون میں ایک کمی جو بہت کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ مضمون نگار نے گلبرگہ کی ادبی شخصیتوں کا تعارف کروانے میں گلبرگہ کی چند شخصیتوں کو جو اُستاد کی حیثیت رکھتی ہیں نظر انداز کر کے اُن کے شاگردوں کا تعارف کروایا ہے۔ بہر حال مضمون ہمارے شہر کی ایک غیر واضح سہی لیکن اچھی ادبی تصویر پیش کرتا ہے۔ جبار جمیل مبارکباد کے مستحق ہیں۔

رفیق احمد رفیق، رتن گیری

"بسمل سعیدی نمبر" کی تحسین و ستائش کر بھی نہ پایا تھا کہ ماہ فروری کا رسالہ باصرہ نواز ہوا۔ آپ نے بسمل سعیدی نمبر نکال کر نہ صرف اس کہنہ مشق شاعر کی قدر شناسی کی ہے، اُردو کی بھی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ یہ نمبر توقعات سے زیادہ خوبصورت، جامع اور مکمل ہے۔ آپ نے چوٹی کے قلمکاروں اور اربابِ علم کو یکجا کر کے اس نمبر کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ "بسمل سعیدی نمبر" کتابی شکل میں ہم قارئین و شائقین کے سامنے جلد آ جائے۔ میری طرف سے جرأت مندانہ اقدام پر دلی مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ نے مردہ پرستی کی روایت کو زندہ درگور کر دیا ہے۔

ماہ فروری کے رسالے میں جناب حبیب کیفی کی کہانی "باجی"

(باقی صـــ پر)

خبر نامہ

۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو میسرز پی کے پبلیکیشنز کی طرف سے جناب کرشن مراری کے مجموعۂ کلام "سازِ رگِ جاں" کے اجرا کا جلسہ جنابِ کرشن موہن کے زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ یہ کتاب پی کے پبلیکیشنز کے زیرِ اہتمام ہی شائع ہوئی ہے۔

کتاب کا اجرا جناب شہباز حسین صاحب نے فرمایا انھوں نے "سازِ رگِ جاں" کی اشاعت پر جو کرشن مراری صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، انھیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں جب اردو کے زوال کے چرچے ہر طرف عام ہیں۔ اردو کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو قدرتی طور سے دل میں ایک مسرت کا احساس جاگتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کتابوں کی رفتارِ اشاعت اطمینان بخش ہے لیکن ایک مسئلہ ان کی فروخت کا بھی ہے۔ ملکی آبادی میں اردو بولنے والوں کے تناسب کو دیکھا جائے تو اردو کتابوں کی فروخت خاطر خواہ ہونی چاہیے لیکن ایسا ہے نہیں۔ ملک میں ہزاروں ایسے سرکاری اسکول اور کالج ہیں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے، اس کے علاوہ سینکڑوں نجی ادارے اور دینی مدارس ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان اسکولوں کالجوں اور مدرسوں سے اردو کو کوئی فیض نہ پہنچے؟ کیا اردو اساتذہ کا یہ فرض نہیں کہ وہ خود کو اردو ادب کی رفتارِ ترقی سے باخبر رکھنے کے لیے اردو کے رسالے اور کتابیں خود خریدیں اور اپنے اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں بھی ان کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جہاں تک مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا تعلق ہے، انھوں نے پچھلے کچھ مدت میں ایسے کئی اقدامات کیے ہیں جن سے اردو کو فروغ حاصل ہو لیکن ان اقدامات سے پورا فائدہ تبھی اٹھایا جا سکتا ہے جب اردو والے صرف باتیں بناتے رہنے کی بجائے اپنی زبان کی عملی خدمت انجام دیں اور اس راہ میں تھوڑے بہت ایثار سے بھی کام لیں۔

شہباز حسین صاحب کی تقریر کے بعد جو اردو کا تحفظ اور فروغ چاہنے والوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کرتی ہے، بآنی صاحب نے کرشن مراری کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں ایک مضمون پڑھا جو مختصر ہونے کے باوجود جامعیت کا حامل تھا۔ حضرات گوپال متل، رام کرشن مضطر، نیر آفاقی اور صدرِ جلسہ کرشن موہن نے بھی کرشن مراری کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کے کلام کی خوبیوں کو سراہا۔ صدرِ جلسہ کی تقریر سے پہلے کرشن مراری نے اپنا تازہ کلام سنایا اور سامعین سے خوب خوب داد حاصل کی۔ جلسے میں دلی کے بہت سے ممتاز ادیب، شاعر اور ارباب ذوق حضرات شریک تھے۔

●

۵ مارچ کی شام کو ایوانِ غالب، نئی دلی میں مخمور سعیدی کے نئے شعری مجموعے "سب رنگ" کے اجرا کا جلسہ روبی کلچرل سوسائٹی نئی دلی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا۔ "سب رنگ" انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور اس میں مخمور سعیدی کی منتخب نظمیں، غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں۔ جلسے کے داعیان میں روبی کلچرل سوسائٹی کے صدر جنابِ رحمٰن نیر کے علاوہ راج نرائن راز، کمار پاشی، ڈاکٹر عنوان چشتی، ابوالفیض سحر، امیر قزلباش، کنور سین، خلش دہلوی، حیات لکھنوی، ایم۔ ایل۔ وششٹ اور پریم گوپال متل کے نام شامل تھے۔ صدارت جناب پنڈت آنند نرائن ملّا نے فرمائی۔

جلسے کا آغاز اظہار اثر کے تعارفی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے کہا: اس جلسے میں جو حضرات شریک ہیں، ان کے لیے مخمور سعیدی کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کا ایک اور انتخابِ کلام منظرِ عام پر آیا۔ میں کرشن موہن صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ "سب رنگ" کی پہلی جلد مصنف کو پیش کر کے اس کے اجرا کی رسم ادا کریں۔

کرشن موہن نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا: مخمور ان شاعروں میں ہیں جن کے ہاں کلاسیکیت اور رومانویت کے عناصر گھل مل گئے

ہیں۔ ان کے اسلوب میں کلاسیکی رکھ رکھاؤ ہے لیکن ان کے احساس میں رومانی شاعروں کا سا البیلاپن اور چنچلتا ملتی ہے۔

شاعر اور نقاد اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا: مخمور نظم اور غزل دونوں اصنافِ شاعری میں یکساں کامیاب ہیں۔ میں نے ان کی نظموں کا خصوصی مطالعہ کیا ہے ان کی نظموں میں تین تصورات نمایاں ہیں۔ اولاً ماضی کا شعور اور اس کی مثبت اقدار کی بازیافت کی خواہش، دوسرے موجودہ صنعتی معاشرے میں انفرادی انسانی روح کی بے کسی اور بے چارگی کا کرب انگیز احساس اور تیسرے دل کی گہرائیوں میں چٹکیاں لیتا ہوا موت کا تصور جو قدم قدم پر شاعر کو تنبیہ کرتا نظر آتا ہے۔ تفصیلات میں جاتے ہوئے انھوں نے مخمور کی بہت سی نظموں اور بعض غزلوں کے اشعار کے حوالے دیے اور ان کی وضاحتیں پیش کیں۔

مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے "مخمور سعیدی —— بہ حیثیت مجموعی آدمی" کے عنوان سے بہت ہی دلچسپ خاکہ پڑھا اور شائستہ مزاح کے حامل فقروں اور شوخی اور شگفتگی سے مملو جملوں سے کچھ دیر تک محفل کو زعفران زار بنائے رکھا۔

نئی غزل کے معتبر شاعر بانی نے اپنے تاثرات ایک نظم کی صورت میں پیش کیے جس میں مخمور کے ساتھ اپنی ذہنی رفاقتوں کا ذکر انھوں نے بڑے دلکش اور اثر انگیز پیرائے میں کیا ہے۔

صدر جلسہ جناب پنڈت آنند نرائن ملا کو چونکہ ایک اور مصروفیت بھی درپیش تھی، اس لیے اس مرحلے پر اظہار اثر نے جو جلسے کی کارروائی چلا رہے تھے، ان سے درخواست کی کہ وہ تشریف لے جانے سے پہلے اپنے خیالات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔

ملا صاحب نے کہا: "سب رنگ" کی اشاعت پر میں نہ صرف مخمور صاحب کو بلکہ انجمن کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے یہ کتاب شائع کرکے ایک ایسا کام کیا جس کی طرف اسے بہت پہلے توجہ کرنی چاہیے تھی۔ میں مخمور کو پچھلے کئی برس سے جانتا ہوں۔ ان کا کلام سنتا اور پڑھتا رہا ہوں۔ وہ ایک پختہ کار شاعر ہیں اور جو اوصاف ان کے کلام میں نظر آتے ہیں وہ انھیں اپنے دور کا اہم شاعر بنا دیتے ہیں، ایسا شاعر جس سے مستقبل بھی توقعات قائم کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک شاعروں کی تین قسمیں ہیں۔ اول وہ جن کا کلام صرف ماضی کی صدائے بازگشت ہوا کرتا ہے۔ دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جو اپنے دور کے پسندیدہ رجحانات سے اپنا رشتہ قائم کرتے ہیں اور ہنگامی مقبولیت ان کا مطمحِ نظر رہتی ہے۔ لیکن ایک بالغ نظر شاعر ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے باہمی رشتے پر نظر رکھتا ہے۔ وہ ماضی سے اکتسابِ فیض کرتا ہے، عصری زندگی کا شعور رکھتا ہے اور مستقبل سے بھی بے خبر یا بے نیاز نہیں رہتا۔ میں شعر و ادب کی کچھ قدروں کو عزیز رکھتا ہوں اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہے کہ مخمور صاحب کا کلام ان قدروں کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ ملا صاحب نے "سب رنگ" میں شامل بعض نظموں اور غزلوں کے بعض اشعار پر خصوصیت سے اپنی پسندیدگی ظاہر کی اور کتاب سے انھیں پڑھ کر سنایا۔

ملا صاحب کے چلے جانے کے بعد اظہار اثر نے گوپال متل صاحب سے درخواست کی کہ وہ کرسیِ صدارت کو رونق بخشیں۔ یہ گویا جلسے کا دورِ دوم تھا۔ اس کا آغاز میرٹھ سے آئے ہوئے مہمان مشہور شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کی تقریر سے ہوا۔ انھوں نے کہا: میں ایک کالج میں استاد ہوں۔ ہزاروں شعر ہوں گے جن کے مطالب کی تشریح میں نے طالب علموں کے سامنے کی ہوگی۔ تنقید کا مصرف بھی مجھے یہی نظر آتا ہے کہ جو لوگ شعر کو محسوس نہ کر سکتے ہوں انھیں درسی انداز میں اشعار کے مطالب سمجھائے جائیں۔ خود شاعروں کو تنقید نے ہمیشہ نقصان ہی پہنچایا ہے۔ مختلف ادوار کی شاعری پر تنقیدی مضامین اور کتابوں کے انبار موجود ہیں لیکن ان کی مدد سے شاعری کی روح تک رسائی ممکن نہیں۔ مجھے پوری اردو شاعری میں پچاس ساٹھ شعر ایسے ملے جو مجھے یاد رہ سکیں ان میں چار یا پانچ شعر مخمور کے بھی ہیں مخمور اپنے رنگ کے تنہا شاعر ہیں اور ان کے انفرادی اسلوب کی بدولت انھیں شاعروں کی بھیڑ میں الگ پہچانا جا سکتا ہے۔

اب انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم آئے۔ انھوں نے کہا: میں ملا صاحب کے اس خیال میں شریک ہوں کہ "سب رنگ" کی اشاعت پر مخمور صاحب کے ساتھ ساتھ انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جس نے یہ کتاب شائع کی ہے، خود میں بھی مبارکباد کا مستحق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مخمور کی شاعری میری کمزوری رہی ہے اور میں ان کا کلام ہمیشہ بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے "سب رنگ" کے پیش لفظ

ہیں بھی کہا ہے، مخمور کے ہمعصر شاعروں میں کم ہوں گے جو اردو زبان کے مزاج اور اس کی شعری روایت کا ایسا عرفان رکھتے ہوں جیسا مخمور کو ہے۔ ان کی شاعری جو ان کے اپنے تاثرات و تجربات کی عکاس ہے، ہماری اعلیٰ شعری روایات کی توسیع بھی کرتی نظر آتی ہے۔

اب گوپال متل صاحب کی باری تھی۔ انھوں نے فرمایا "آج سے بیس سال پہلے میں نے "تحریک" میں یہ پیشگوئی کی تھی کہ مخمور اپنے دور کا اہم شاعر بن کر سامنے آئے گا اور مجھے خوشی ہے کہ میری یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

مخمور سعیدی نے، جب اُن سے کلام سنانے کی فرمائش ہوئی تو کہا، پہلے میں ان تمام کرم فرماؤں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس جلسے کا اہتمام کیا، اس کی کارروائی میں حصہ لیا اور میری حقیر شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال فرمایا اپنی شرکت سے جلسے کو اہمیت بخشی اور میری قدر افزائی فرمائی۔ میں اور میری شاعری اس التفات کے مستحق نہیں، جو عزت آپ نے مجھے بخشی ہیں اسے آپ کے خلوص اور آپ کی محبت پر محمول کرتا ہوں۔ ایک کمی مجھے ضرور محسوس ہوتی رہی، یعنی اس جلسے میں حضرت بسمل سعیدی کی غیر موجودگی جو ان دنوں ٹونک میں قیام فرما ہیں لیکن گوپال متل صاحب کی موجودگی نے اس کمی کی تلافی کر دی، میری صلاحیتوں کے نشوونما میں، یہ بزرگ پہلی جیسی کچھ ہیں، متل صاحب کی شفقتوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ آخر میں انھوں نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی جو حمدیہ تھی۔

جلسہ میں دلّی کے ممتاز شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، دانش گاہوں اور کالجوں کے اساتذہ، اور دیگر ادب دوست خواتین و حضرات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ بیرونی مہمانوں میں ڈاکٹر بشیر بدر کے علاوہ ندا فاضلی اور طارق بدایونی بھی تھے۔

جلسہ ختم ہو جانے کے بعد کمار پاشی کی رہائش گاہ پر ایک غیر رسمی محفل سخن ہوئی۔ اس محفل میں کمار پاشی نے بھی مخمور سعیدی کی شخصیت پر ایک نظم سنائی جسے بہت پسند کیا گیا۔

——— رزاق ارشد

●●●

شہر شہر (بقیہ صــ)

لوگ ننگے ہو کر ناچ رہے تھے۔ وہ ان ننگوں کی بھیڑ میں تنہا ملبوس تھا۔ اسے اپنے لباس سے شرم آنے لگی۔ وہ اپنے آپ کو ناچتے گاتے لوگوں سے الگ تھلگ محسوس کرتا رہا۔ یکایک اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اس ناچ میں شامل ہو کر زندگی کا کچھ انوکھا لطف حاصل کرے۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ناچنے والوں کے غول میں سما جائے اس نے اپنے وجود کا بغور جائزہ لیا۔ اس کا لباس ناچ میں شامل ہونے سے روک رہا تھا۔ یکایک اس نے اپنے تمام کپڑے اتار پھینکے اور ناچ میں شامل ہو گیا ——

●●●

چھلانگ (بقیہ صــ)

ہے اور ایک ایسی تشنگی عود کر آئی ہے کہ جس قدر بھی پی رہا ہوں پیاس بڑھتی ہے اس کے بعد احساس ہوا کہ میرے پیٹ کے نیچے کا حصّہ کافی بھاری ہو گیا ہے، اسی وقت اسے ہلکا کرنا چاہیے۔

اٹھ کر لنگی درست کی، اور دروازہ کھولنے پر دیکھا باہر زوردار بارش ہو رہی ہے، بارش میں تر بہ تر کھڑا بجلی کا کھمبا جس کی چاروں طرف خوبصورت ہالہ بنا ہوا ہے دلفریب منظر کی دعوت دے رہا ہے۔

اور پھر اچانک احساس ہوا کہ مجھے اس وقت فوری طور پر گھڑی کی ضرورت ہے، کیونکہ ابھی میں راحت کے لمحوں میں ہوں، راحت کے سمندر میں تیر رہا ہوں، لیکن گھڑی تو تکیہ کے نیچے ہے۔ لاؤں کیسے؟ کہیں ایسا نہ ہو گھڑی لاتے لاتے یہ پر سکون لمحہ زائل ہو جائے، دوسرا سانحہ یہ ہے کہ پیٹ کے بھاری ہونے کے سبب ایک قدم چلنا بھی دشوار ہے۔

اور اگر یہ راحت برباد ہو جائے تو؟ اس لیے راحت کے وقت کی پیمائش نہ کرنے کا بے پناہ کرب کاغذ کی ناؤ کی طرح بارش کے پانی میں بہا کر دل کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ راحت کا احساس کر رہا تھا۔

(اڑیا کہانی)

---

[1] پوری کا جگن ناتھ نیم کی لکڑی سے بنا ہوا ہے، جسے اس کے عقیدتمند دارو برہما کہتے ہیں۔ ی ع۔

[2] بائبل کا کہنا ہے کہ جیسس مرنے کے بعد قبر سے زندہ اٹھ آئے تھے۔ ی ع۔

[3] سائنس کے نظریہ کے مطابق ATMOSPHERE کے پریشر سے ہر شخص کے اوپر چودہ پونڈ بوجھ لدا ہوا ہے۔ ی ع۔

●●●

تبصرے (بقیہ صــ)

اونچا اور اونچا کی لذّت، کب تک
نیچا کہلانے سے نفرت کب تک
اے انسان اے فقیر اے سنیاسی
اورنگِ فضیلت سے محبّت کب تک

(رُباعی)

شاعری ملنگی عمل ہے۔ یہ قلندروں کی محبوبہ ہے اور بے نیاز دل و دماغ والوں ہی کو اپنی آغوش کے پالنے میں کشف و عرفان کے ہلکوروں سے فیض یاب ہونے کی سعادت بخشتی ہے "شاخِ گُل" کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

—— کنور سین

بزمِ احباب (بقیہ صــ)

حُسنیٰ سرور کا افسانہ "گمشدہ منزل کے مسافر" اور اجیت کور کا لکھا نعیمہ کوثر کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ "گل بانو" اور منظومات میں جناب عظیم اختر کی نظم "فریب"، شاہدہ مجبوب کی "پتھر دل کے شہر سے" اور جناب مشتاق علی شاہد کی غزل کافی پسند آئی۔

اعجاز اعظمی، ملائشیا

اس ماہ افسانوں میں "گل بانو"، "گمشدہ منزل کے مسافر" "بانو جی" بہت پسند آئے اور شعری تخلیقات میں عظیم اختر۔ احمد رئیس۔ ظفر غوری۔ تابش اعظمی کی [illegible] اور [illegible] کی چیزیں پر کشش ہیں۔ بزمِ احباب میں [illegible] کی [illegible] پر کاش فکری۔ محمد خان شہاب کے مکاتیب مستقل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں

The
TAHREEK

مضامین

افسانے

منظومات

—o—

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

شمارہ ۲ جلد ۲۴

مئی ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس، دہلی

مقام اشاعت: ۹- انصاری مارکیٹ، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی

گوپال متل

۱۸ اپریل کے "حیات" کے شمارے میں کیفی اعظمی نے میرے مضمون "نیا جال پرانے شکاری" کا جواب شائع کرایا ہے۔ دشنام طرازی کے علاوہ، جو ترقی پسندوں کا محبوب مشغلہ ہے، کیفی اعظمی نے جو باتیں کہی ہیں ان میں پہلی بات یہ ہے کہ ہم یہ بات کئی برس سے کہہ رہے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کمیونسٹ پارٹی کا محاذی ادارہ ہے۔ مقصد غالباً یہ ہے کہ جو بات کئی برس سے کہی جا رہی ہو وہ صحیح نہیں ہوتی حالانکہ بنیادی حقیقتیں بار بار کے اعادے کے باوجود صحیح ہی رہتی ہیں۔

ترقی پسند مصنفین کی انجمن کمیونسٹ پارٹی کا محاذی ادارہ ہے یا نہیں یہ صرف ہم نہیں کہہ رہے، اس حقیقت کو تو وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو کسی وقت ترقی پسند مصنفین کی تنظیموں کے سرگرم رکن تھے۔ مثال کے طور پر راجندر سنگھ بیدی کا مندرجۂ ذیل بیان پیش کیا جا سکتا ہے جو نیم ترقی پسند جریدے "شاعر" میں شائع ہوا تھا۔ اس بیان میں راجندر سنگھ بیدی نے لکھا تھا:

"... پھر ہم آہستہ آہستہ دیکھنے لگے کہ اس میں کچھ جانبداریاں ہونے لگی ہیں۔ یعنی جانب داری میں جانب داری۔ ہم اپنے آپ کو جانب دار تو سمجھتے تھے۔ لیکن جانب داروں میں جانبدار پیدا ہو گئے۔ ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے دو ممتاز ادیب اٹھ کر جاتے ہیں، کانوں میں کھسر پھسر کرتے ہیں اور اگلے دن ایک نیا ریزولیشن ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اور ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس پر دستخط کیجیے۔ ہم جس حد تک مانتے تھے اس حد تک دستخط کر دیتے تھے لیکن بیچ میں سوچتے تھے کہ آخر ہم سے کیوں نہیں پوچھا جاتا؟ ہم ان کے ساتھی ہیں، ہم مشرب ہیں اور اسی عقیدے کے حامل ہیں جس کے یہ ہیں۔ پھر ہم سے کیوں نہیں پوچھا جاتا؟ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس تحریک کا تعلق سیاسی جماعت سے ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ہم سے کہا گیا کہ سیل میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ آپ کو پارٹی کا ٹکٹ دیا جائے۔"

کیفی اعظمی ان دنوں دماغی طور پر علیل ہیں لیکن اتنا تو وہ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس سیاسی جماعت کا ذکر راجندر سنگھ بیدی نے کیا ہے وہ آر ایس ایس نہیں، اور جس سیل کا ذکر انھوں نے کیا ہے وہ بھی کمیونسٹ پارٹی کا سیل ہے جماعتِ اسلامی کا نہیں۔

صرف راجندر سنگھ بیدی ہی نہیں، ایسے کئی مشہور ادیب جو کمیونسٹ پارٹی کے بہکاوے میں آکر انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو گئے تھے۔ بعد میں اس سے بدظن ہی نہیں ہو گئے بلکہ اس کے مخالف بھی ہو گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر محمد دین تاثیر تھے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے پانچ بنیادی داعیوں میں تھے۔ یہ شعر انھیں کے ہیں:

عجیب بات ہے، جنتا کا یار کہتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتو لوہار کہتا ہے
کریں گے وہ، جو نہ کوئی شریف کرتا ہو
کہیں گے وہ، جو میاں افتخار کہتا ہے

یہ وہی میاں افتخار تھے جنھیں چراغ حسن حسرت نے، جو کسی زمانے میں خود بھی غالی ترقی پسند رہ چکے تھے، "دولت کا حادثہ" قرار دیا تھا، اور جنھوں نے عوام میں سیاسی شعور پھیلانے کے تمام دعاوی کے باوجود ڈسٹرکٹ بورڈ کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا کہ ان کی زمینداری میں پرائمری اسکول قائم کر دے۔ بہر حال ترقی پسندوں نے اس دولت کے حادثے سے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کے خوان نعمت کی پوری طرح ریزہ چینی کی۔

اب رہی یہ بات کہ منشی پریم چند اور ڈاکٹر ٹیگور نے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی تائید کی تھی تو اس تنظیم کے محاذی خط و خال ان کی نظر میں نہیں تھے۔ اس کے ثبوت میں منشی پریم چند کے خطبۂ صدارت کے اقتباسات پہلے مضمون "نیا جال پرانے شکاری" میں میں نے نقل کر دیے تھے ان کا موازنہ لینن کے اقوال سے کیا جائے تو اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی کہ اگر انجمن ترقی پسند مصنفین کے محاذی خط و خال ان کی نظر میں ہوتے تو وہ صدارت پر آمادہ نہ ہوتے۔ اب رہے ڈاکٹر ٹیگور، انھوں نے بھی کمیونزم سے بیزاری کا اعلان دو ٹوک لفظوں میں کیا ہے۔

وشو بھارتی نے چٹھی پتر کے نام سے ٹیگور کے جو خطوط شائع کیے ہیں ان کی چوتھی جلد میں ٹیگور کا مندرجۂ ذیل خط بھی شامل ہے جو انھوں نے اپنے پوتے نتندرا کو، جو ان دنوں جرمنی میں تعلیم پا رہا تھا، تحریر کیا تھا۔ اس خط میں انھوں نے بالشوزم اور فاشزم دونوں سے اپنی بیزاری کا برملا اظہار کیا ہے اور اپنے پوتے کو ان دونوں وباؤں سے بچ کر رہنے کی تلقین کی ہے۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

"جہاں کہیں افلاس انسانوں کو کمزور کر دیتا ہے وہاں وبائیں پھیل جاتی ہیں۔ اسی طرح یورپ میں مصائب کے ساتھ ساتھ وہاں فاشزم اور بالشوزم کی قوت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ دونوں گمرہی اور ضلالت کے مظہر ہیں۔ کوئی ذی شعور آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انسانوں کے ذہنوں کو مکدر کرنے سے انھیں کچھ فائدہ پہنچ جائے گا۔ جب بھوک کی کسک بڑھتی ہے تو آدمی کے خیالات میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان میں بھی بالشوزم پھیل جائے گا کیونکہ یہاں لوگوں میں بھوک بڑھ رہی ہے۔ جب زندگی کی لہر مدھم ہوتی ہے تو بالشویک موت کے پیامی بن کر آ دھمکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر لرز جاتا ہوں کہ آدمی آدمی سے کتنا خوفناک سلوک کر سکتے ہیں ... تم خواہ کچھ بھی کرنا لیکن آدمی کو کھانے والی ان تنظیموں میں کبھی نہ الجھنا۔"

یہ کمیونزم پر ڈاکٹر ٹیگور کی سوچی سمجھی رائے ہے۔ اگر کسی کمیونسٹ محاذی ادارے کے حق میں انھوں نے کسی وقت کم واقفیت کی بنا پر کوئی بات کہہ دی تو اس کی چنداں اہمیت نہیں۔ ایک بار انھوں نے مسولینی کی تعریف میں بھی کچھ باتیں کہہ دی تھیں لیکن جب رومن رولاں اور دوسرے دوستوں نے انھیں بتایا کہ ان کی رائے ٹھیک نہیں تو ٹیگور نے فوراً اپنے الفاظ واپس لے لیے تھے۔ اس کے بعد فاشی اخباروں نے انھیں جو گالیاں دیں ان کی انھوں نے چنداں پروا نہیں کی۔

کیفی اعظمی کی یہ بات صحیح نہیں کہ ترقی پسندوں کی تحریک آج بھی طاقتور ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ کچھ ترقی پسند مصنفین جلبِ منفعت کی غرض سے اور کچھ نفوذ کی حکمتِ عملی کے تحت سرکاری اداروں کی داد و دہش سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ طبقاتی جنگ کے تمام تر دعاوی کے باوجود کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کو امرا اور وزیروں کی قصیدہ خوانی کا فن خوب آتا ہے اور اس سے ان کے ضمیر میں جو خلش پیدا ہوتی ہے اس کا ازالہ آپس کی صحبتوں میں اس قسم کے فقروں سے کر لیتے ہیں کہ انقلاب آنے کے بعد وہ اپنی زیر دستی کو بالادستی میں بدل لیں گے۔

کیفی اعظمی نے مجھ پر ڈالر شاہی کی غلامی کا الزام بھی لگایا ہے۔ میں ان سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ تقریباً چھ ماہ تک ماسکو میں زیرِ علاج رہے کیا اس کا معاوضہ انھوں نے ادا کیا تھا۔ اگر نہیں تو ماسکو کی سرپرستی کن خدمات کا صلہ تھی؟

●●

ستیہ پرکاش | دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

جب سے اٹلی اور فرانس کی کمیونسٹ پارٹیوں نے ماسکو کی تابعیت سے آزادی کا اعلان کیا ہے، امریکہ اور یورپ کے مبصر اور اخبار نویس جو دانشوری کے بھی مدعی ہیں، پھر سے نوین کمیونزم کا راگ الاپنے لگے ہیں۔ دانشوری کے مدعی بالعموم کوتاہ نظر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کی دنیا میں اتنے مگن رہتے ہیں کہ ماضی کے مسلّمہ حقائق بھی ان سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ آزادروی، قومی کمیونزم اور جمہوری انقلاب کے نعرے یورپ کے کمیونسٹوں نے پہلی بار بلند نہیں کیے۔ یہ نعرے چیکوسلواکیہ، پولینڈ، اور ہنگری کے کمیونسٹ لیڈروں نے اس صدی کے چوتھے دہے میں اتنی بلند آہنگی سے لگائے تھے کہ صرف دانشور ہی نہیں بلکہ مدبر رز ویلٹ بھی دھوکا کھا گئے تھے جس کے نتیجے میں مشرقی یورپ کے ملک اپنی آزادی سے محروم ہو گئے۔

چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر کلیمنٹ گوٹ والڈ نے مئی ۱۹۴۵ء میں کہا تھا: "کمیونسٹ پارٹی کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم ایک قومی اور جمہوری انقلاب کی راہ پر گامزن ہیں" اور پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری ولاڈی سلاو گومولکا نے ۱۹۴۶ء میں کہا تھا "پولینڈ میں پاپولر جمہوریت، پرولتاریا کی ڈکٹیٹرشپ نہیں۔ ہماری جمہوریت سوویٹ جمہوریت سے مختلف ہے" اور اسی برس ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری متیاس راکوسی نے کہا تھا "گزشتہ ۲۵ برس میں دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں نے یہ سبق سیکھ لیا ہے کہ سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کی مختلف راہیں ہیں۔ اگر ہم خود اپنی راہ اختیار نہیں کریں گے تو سوشلزم کی تکمیل نہیں کر سکیں گے۔ اپنی راہ ہمیں اپنے ملک کے مخصوص ماحول کو پیش نظر رکھ کر متعین کرنی چاہیے۔ اپنا سبق ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ اگر ہم ہنگری میں جمہوریت کو تقویت پہنچا رہے ہیں تو یہ کسی خفیہ مقصد یا کسی خاص حکمتِ عملی کے تحت نہیں بلکہ ایسا ہم کمیونزم میں اپنے گہرے وشواس کی بنا پر کر رہے ہیں۔"

چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور ہنگری کے کمیونسٹ لیڈروں کے اس قسم کے بیانات کا کیا نتیجہ نکلا، یہ اب ہمیں معلوم ہے لیکن امریکہ اور برطانیہ کے دانشور فرانس اور اٹلی کی کمیونسٹ پارٹیوں کے نئے دعووں پر رائے زنی کرتے وقت مشرقی یورپ کے کمیونسٹ لیڈروں کے سابقہ بیانات اور ان کے حشر کو پیش نظر نہیں رکھتے اور جب ترقی یافتہ ملکوں کے دانشور اتنے کوتاہ بیں ہیں تو ترقی پذیر ملکوں کے دانشوروں سے بہتر آگاہی کی امید رکھنا اور بھی مشکل ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ یورپ کے وہ جمہوری اور سوشلسٹ حلقے جنھیں سیاست کا براہِ راست تجربہ ہے، گمراہ ہونے کے لیے تیار نہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی فیبین پارٹی نے جس نے سوشلسٹ تصورات کے فروغ میں اہم حصہ لیا ہے حال ہی میں "یورپ میں سوشلسٹ ڈیموکریسی" کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کے مصنف انتھونی کراسلینڈ ہیں۔ وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں " یہ باور کرنا انتہائی غلط ہے کہ اٹلی کے کمیونسٹ باقی ملکوں کے کمیونسٹوں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ اٹلی کے جمہوری چاہے وہ بیساری ہوں، چاہے یمینی، ایک تباہ کن غلطی کے مرتکب ہوں گے اگر انھوں نے یہ باور کر لیا کہ کمیونسٹ جس تاریخی مفاہمت کی تجویز پیش کر رہے ہیں اسے وہ عملی جامہ بھی پہنائیں گے۔ یہ تصور کرنا غلط ہے کہ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی تو وہ جمہوری اصولوں کا تحفظ کرے گی۔ اٹلی میں ایسے کمیونسٹ دورِ حکومت کا تصور ناممکن ہے جس میں شہری آزادیاں اور پریس کی آزادی بتدریج ختم نہ ہو جائے۔ میں یہ تصور نہیں

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

بسمل سعیدی

غزل

ہوئی ہے بیخودی جب سے مری دمسازِ تنہائی
تصور بھی نہیں کوئی خلل اندازِ تنہائی

خدا ہی جانے کیا ہوگا حریم نازِ تنہائی
فضائے لامکاں بھی کیا ہے پا اندازِ تنہائی

مری تنہائی رکھتی ہے مجھے بھی بے خبر مجھ سے
نہیں ہوں میں بھی خود اپنا شریکِ رازِ تنہائی

ہزاروں بار ساتھ اپنا بھی مجھ سے چھوٹ جاتا ہے
خدا جانے کہاں تک ہے مری پروازِ تنہائی

ستارے کیوں ہنسے مجھ پر وہاں تک بات کیوں پہنچی
سکوتِ شب کا سناٹا ہوا غمّازِ تنہائی

مری اِس ابتدا کی انتہا کوئی نہ تھی شاید
ازل سے تا ابد چلتا رہا آغازِ تنہائی

نفس کی آمد و شد کا یہ کب انداز تھا پہلے
سمجھتا ہوں میں اندازِ شکستِ سازِ تنہائی

اگر کوئی نہ تھا تو ہم تو اپنے ساتھ رہتے تھے
ملے جس روز تم اُس دن ہوا آغازِ تنہائی

خدائی کے یہ ہنگامے تو کس بیکس کی سنتے ہیں
خدا رہتا ہے تنہا گوش بر آوازِ تنہائی

تم اپنی بزمِ عشرت میں ہم اپنی خلوتِ غم میں
تمھیں نخوت ہے شرکت پر ہمیں ہے نازِ تنہائی

کوئی عشرت کدہ رہ جائے جیسے غم کدہ ہوکر
تمھاری بزم نے دیکھا مرا اعجازِ تنہائی

فریبِ ترکِ دُنیا میں طلبِ دُنیا کی مضمر ہے
یہ کیا خلوت نشیں ہوں گے بہانہ سازِ تنہائی

سمجھتا ہوں کہ اک عالم شریکِ حال ہے میرا
جُدا ہے سارے عالم سے مرا اندازِ تنہائی

ہمارا عالمِ تنہائی وہ عالم ہے اب جس میں
نفس کی آمد و شد بھی ہو در اندازِ تنہائی

خدا کے بھید تو بسملؔ خدا ہی جان سکتا ہے
سمجھ سکتا ہے کوئی کیا کسی کا رازِ تنہائی

مالپورہ دروازہ — ٹونک — راجستھان

کرشن موہن

پچاس اور پچپن

دانت ٹوٹے ہیں مگر
پھر بھی وہ عمرِ گریزاں سے لڑا کرتا ہے
ہاتھ ہر روز کھڑا کرتا ہے

اُس کے دو بیٹے ہیں اور دونوں ہی امریکہ میں
اور اک شادی شدہ بیٹی ہے

گھر میں اب کوئی نہیں اور فقط ایک میاں اور بیوی
اُن کی تنہائی بڑھاتی ہے ہوس کا کس بل
روز ہو جاتا ہے موسم چنچل
لذّتِ جسم اٹھاتے ہیں پچاس اور پچپن
مرمریں رانوں کی محراب ہے ہر رات اُن کی
جیسے لوٹ آیا ہو مچلا بچپن
جیسے لہرائے نشیلا جوبن
وہ شرارت، وہ حرارت وہ تپش
اُن کے چہروں پہ ابھی
'کام' مسکاتا ہے
آج بھی شدّت سے
اُن کے جسموں کی اگن بھڑکی ہے
ایک لڑکا ہے تو اک لڑکی ہے

∞

سیدھی راہ پر بھٹکے ہوئے

جوگندر پال

کون مرا ہے ؟

میری بیوی میرے سامنے بدستور بیٹھی ہوئی ہے مگر اُس کے کان اس قدر تندی سے ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے ہیں کہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے وہ اکھڑ کر باہر کی جانب نہ بھاگ نکلیں۔

ہمیں بخشوا یا شفیع الوریٰ ———

ہمارے گھر کے سامنے کی سڑک پر سے محلے کے لوگ ایک جنازہ لیے جا رہے ہیں۔

ہمیں بخشوا ———

میں نے اپنے آپ سے پوچھا ہے : یہ لوگ تو ابھی زندہ ہیں۔ خدا نے انھیں ابھی سے بخش دیا تو ان گناہوں کا کیا ہوگا جنھیں ان سے کل یا کل کے بعد سرزد ہونا ہے ——— میں مسکرا دیا ہوں اور میری مسکراہٹ چوپٹ کھل گئی ہے گویا چوروں کو خواہ مخواہ اندر گھس آنے کی ترغیب دے رہی ہو۔ میری بیوی نے لپک کر دروازے کو بھیڑنا چاہا ہے ——— کسی بے چارے کا جنازہ نکلا ہوا ہے اور تم مزے سے مسکرا رہے ہو ——— ؟

اپنی اپنی عادت ہے، اب میں اس کا کیا کروں کہ مسکرائے بغیر سنجیدہ ہو ہی نہیں پاتا ؟ میں نے اپنی بیوی کو بتایا ہے، کوئی مرتا ہے تو صرف اس لیے کہ خدا زندوں کو بخش دے۔

لیکن ہمارے محلے میں یہ جو آئے دن موتیں ہو رہی ہیں کیا ——— ؟

ہاں میں نے اُسے ٹوک دیا ہے تاکہ اُس کا سوال کہیں میرے جواب سے لوٹ نہ ہو جائے۔ خدا بڑا رحیم ہے نیلو۔ یہ بھی نہ ہو تو آجکل لوگ جہنم کے دروازے کو لانگ کر جیتے جی وہیں جاگزیں ہو جائیں۔

اچھا، زیادہ باتیں نہ بناؤ ——— جاؤ تم بھی جنازے کی نماز ادا کر آؤ۔

ہاں، جس نیک بندے نے میرے گناہوں کو بخشوانے کے لیے اپنی جان دے دی میں اُس کی خاطر جنازے کی نماز بھی ادا نہ کروں گا ؟

ہمیں بخشوا ———

پتہ نہیں، مرا کون ہے بے چارہ ؟

ظاہر ہے جس کے پاس مرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا ہو، وہی بے چارہ مرا ہوگا ——— میں باہری دروازے کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ جنازے کے ساتھ کوئی اور ہو، نہ ہو، ہمارے چھوٹے حکیم صاحب ضرور ہوں گے۔ چھوٹے حکیم صاحب عمر رسیدہ ہیں اور انھیں حکمت سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ سُنا ہے کسی زمانے میں ان کے والد اس محلے میں حکمت کیا کرتے تھے ——— چھوٹے حکیم صاحب کو جب دیکھیے اپنے ساکن جسم کے اوپر ترکی ٹوپی کے پھندنے کو ہلاتے ہوئے ہر جنازے میں چلے جا رہے ہیں۔ باپ کوئی زندگی بچانے کی خاطر خدا سے جھگڑا مول لینے سے بھی باز نہ آتا تھا پر بیٹا اُس کی مقدس رضا کے آگے سر جھکائے ہر جنازے کے پیچھے یوں ہو لیتا جیسے مرنے والے کو اپنے گھر تک پہنچائے بغیر اُس کی جان میں جان نہ آئے گی۔

ابا ـــ میرے چھوٹے سے بیٹے نے ایک بار ہنس کر مجھ سے پوچھا تھا۔ چھوٹے حکیم صاحب سبھی جنازوں میں بہر صورت شریک ہوتے ہیں لیکن ایک جنازے میں یقیناً شریک نہ ہوں گے۔

نہیں پُوشو، چھوٹے حکیم صاحب تو دشمن کے جنازے میں بھی یوں ہی شریک ہوتے ہیں جیسے اپنی ہی میت اُٹھا کے چل رہے ہوں۔

یہی تو میں کہہ رہا ہوں ابا ——— شریک نہیں ہوں گے

پارک ویو ـــــ مقبرہ روڈ ـــــ اورنگ آباد دکن ـــــ (مہاراشٹر)

ایک اپنے جنازے میں۔

ہاں، بیٹا، ہر نیک آدمی سب کا دوست ہوتا ہے، پر کسی کا دشمن بھی ہو تو صرف اپنا۔

ہمارے چھوٹے حکیم صاحب سے کبھی آپ کی ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے آپ میرے اس بیان کو مبالغے سے تعبیر کریں گے کہ وہ انسان نہیں، فرشتہ ہیں، پانچ وقت کے نمازی، روزے کے پابند اور عید کے تصور سے صرف اس لیے خوش، کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے ہی سہی، ساری دنیا موج اڑاتی ہوئی نظر آئے گی۔ اُن کی ترکی ٹوپی کا پھندنا کیا ہے، ملت کا پرچم ہے۔ خدا ہماری ملت کو ہدایت دے کم سے کم ایسے دس پانچ تو اور ہوتے ——

میں سڑک پر آپہنچا ہوں اور جنازے کے جلوس میں شامل ہوگیا ہوں اور چلتے چلتے ایک لمبے سا کن جسم کی چوٹی سے ترکی ٹوپی کے ہراتے ہوئے پھندنے کے نیچے آکر دم لیا ہے۔

السلام علیکم!

وعلیکم السلام!

میری اور چھوٹے حکیم صاحب کی نگاہیں جنازے پر جمی ہوئی ہیں۔ اتنا شریف آدمی تھا چشتی میاں، کہ اُس کے بغیر شرافت کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے۔

جی ہاں، زوال کے اِس عالم میں ایسے ہی لوگوں کی بدولت قیامت رکی ہوئی ہے —— میں نے چھوٹے حکیم صاحب کی ہاں میں ہاں ملا کر یہ پوچھنے کا موقع کھو دیا ہے کہ آخر مرا کون ہے۔

—— یا شفیع الوریٰ

اوروں کے ساتھ ساتھ میں نے بھی بڑی رقت سے آخری الفاظ کو ادا کیا ہے۔

مرحوم بیمار تھے ——؟

بیمار؟! —— اب تمھیں کیسے بتاؤں چشتی میاں، کہ انھوں نے دنیا بھر کی بیماریاں مول لے رکھی تھیں۔ تپ دق کا شکار کوئی اور ہے اور کھانس وہ رہے ہیں۔ دمہ پڑوسی کو ہے اور سانس اُن کی پھولی ہوئی ہے۔ فالج تم پر گرا ہے —— معاف کرنا بھئی —— اور شل وہ ہو کر رہ گئے ہیں —— سارے جہان کی بیماریوں کو آپ اِس طرح اپناتے چلے جائیں تو اللہ تعالیٰ کو بالآخر آپ کی جنت کی راہ سجھانی ہی پڑ جاتی ہے —— ذرا سوچو چشتی میاں، اللہ والے ایک ایک کی بیماری کو اپنے اوپر ڈالتے چلے جائیں تو اللہ کو بھی انہی کی نجات کے اسباب کرنا ہی ہوتے ہیں سو وہ اُسے پیارے ہو جاتے ہیں۔ تم اب اپنے شکھوں کو یاد کر کر کے روتے دھوتے رہو، جانے والوں کی تو جان چھوٹ گئی۔

چھوٹے حکیم صاحب کی آواز بھرّا گئی ہے۔

ہمیں بخشوا یا شفیع الوریٰ۔

خدا گواہ ہے چشتی میاں، مرحوم کی موت سے میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔

مجھے پشیمانی ہونے لگی ہے کہ مرنے والے کا ذکر چھیڑ کر میں نے ناحق چھوٹے حکیم صاحب کا دل دکھایا ہے۔ دیکھنے میں درویش بڑے پُرسکون ہوتے ہیں، ہرے بھرے پہاڑ، پر اُن کے اندر ہی اندر گرم چشمے ابلتے رہتے ہیں اور چشموں کا اُبلتا ہوا پانی ان کے باطن کی مٹی میں جذب ہو ہو کر باہر کی طرف امنڈتے ہوئے ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو اس سے محض اپنے باہر باہر سیراب ہو کر وہ سرسبز نکل آتے ہیں۔

چشتی میاں، نہ معلوم کتنے بیش بہا گوہر دن کو مٹی میں گاڑ چکا ہوں۔ صاحبِ ایمان ہوں اس لیے انھیں گاڑتے ہی خدا کو سونپ دیتا ہوں ورنہ اپنے اِس بے حساب سرمائے کے حساب کتاب کے لیے سارا قبرستان کھود کر رکھ دیتا اور —— اور وہاں کچھ بھی نہ پا کر لُٹ پٹ جانے کے احساس سے میری جان نکل جاتی —— خدا کا شکر ہے چشتی میاں کہ ہم مسلمان ہیں ——

ہاں بھائی، ہماری قوم اپنی اصلیت کو بھولتی جا رہی ہے پر سدا یوں تو نہ تھا —— مسلمان کا غم تو اُس کے اندر ہی بہہ بہہ کر یہیں کہیں کسی سمندر میں غرق ہو جاتا ہے —— خدا کا شکر ہے!

بزرگوں کی دبی دبی آواز میں بے کراں رقت محسوس کر کے اُن کے چہرے کی طرف نظر اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ میں اپنی آنکھیں نیچے لٹکائے ہوئے ہوں اور میرے کان چھوٹے حکیم صاحب کی آواز پر ہیں۔

میں اِسے محض اتفاق پر محمول نہیں کرتا چشتی میاں، کہ یہ سڑک ہمارے محلے سے سیدھی قبرستان پہنچ کر ہی دم لیتی ہے حالانکہ

میں کہیں کھو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— اور تو اور کوئی بچہ بھی آنکھیں میچ کر وہیں جا پہنچتا ہے ——— لیکن وہاں پہنچ کر نہ جانے سبھی کہاں کھو جاتے ہیں ——— ہائے، اس راہ پر میں نے کس کس کو نہ کھویا؟ ——— اور جس جس کو کھویا اُس کے ساتھ ساتھ میرا اپنا آپ بھی مجھ سے تھوڑا سا چھن گیا۔ میرے سارے نیک ساتھی ایک ایک کر کے مر گئے ہیں چشتی میاں، اور ——— اور ہر جنازے کے ساتھ جاتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ میرا بھی جنازہ اٹھا ہوا ہے ——— نہیں، ٹوکو نہیں، میاں، پہلے میری پوری بات ہو لینے دو ——— چند ہی روز ہوئے شام کے وقت میں اور میرا ایک مرحوم دوست اِسی سڑک پر ——— ہم ہمیشہ اِسی ماتمی سڑک پر قبرستان تک جا نکلتے۔ (میں نے اچانک چونک کر اپنے آپ کو بتایا ہے ——— یہ تو ——— یہ تو اپنے مولوی وحیدالدین صاحب ہی چل بسے ہیں) ——— ہماری یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سبھی لوگ ٹھکانے جا لگے ہیں۔ ہم دونوں بھی اُن کے ساتھ تھوڑا تھوڑا مر کے اب تقریباً مر چکے ہیں، ہماری رہی سہی جانیں بھی کیوں جواب نہیں دے جاتیں؟ ——— ارے بھائی۔ مرحوم نے مجھ سے کہا۔ جو کچھ بھی رہ گئے ہو، کچھ تو رہ گئے ہو ——— اور یہ سڑک تو جوں کی توں ہے ——— لڑکھڑا کر ہی سہی، چلتے آؤ ——— یہ شام تو ویسی کی ویسی ہے، اپنی بجھی بجھی آنکھوں میں اس کا دھندلکا ہی سمیٹ لو۔ جب تک ہم قبرستان تک پہنچیں گے اندھیرا چھا جائے گا ——— گھُپ اندھیرا ——— اور پھر ہم دونوں بوڑھے بھوت اِس گھُپ اندھیرے میں... گھر کو لوٹ رہے ہوں گے ——— میری اِس انجان سی سوچ پر غور کرو چشتی میاں، جنھیں ہم اپنی دانست میں دفنا آتے ہیں وہ بھی قبرستان سے ہمارے مانند گھر لوٹ آتے ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتے کیونکہ اُجالے کے اندر کہیں اندھیرے ہی اندھیرے میں گھرے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں ہی ہوتے ہیں، لیکن جہاں وہ ہوتے ہیں اُس مقام پر لیل و نہار کی پرچھائیں بھی نہیں ہوتی۔ جس مقام پر وقت کا وجود ہی نہ ہو، وہاں اُس کے پہلو بدلنے کا احساس بھی کیونکر ہو ——— مستقل جدائی کے کرب کی یہ کیفیت دیکھو چشتی میاں، کہ ہمارے سارے مرحوم احباب واقعتاً ہمارے ساتھ ہی جیتے ہیں ——— لیکن میں تو تمھیں اپنے مرحوم دوست کی اس شام کی باتیں سُنا رہا تھا ——— ہائے، میں اُس کی آواز کبھی نہ سُن پاؤں گا۔ اُس نے مجھ سے کہا، دیکھو بھائی، اب ہم دونوں کا بھی چل چلاؤ ہے۔ تھوڑا تھوڑا مر کے اب ہم بھی باقی کیا رہ گئے ہیں، سو ہم میں سے کوئی بھی مرے دوسرے کی باقی ماندہ موت اپنے آپ واقع ہو جائے گی ———

چشتی میاں، اس سے پیشتر بدھو میاں کے جنازے پر بھی میں تھوڑا سا مر گیا تھا پر چند ایک سانس تو بچی رہ گئی تھیں، آج میں پورے کا پورا مر چکا ہوں۔ یقین نہ آئے تو میری نبض دیکھ کر اطمینان کر لو۔ میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لو، مجھ میں ایک سانس بھی نہیں رہا اور ——— اور ——— اوروں کے ساتھ میں اپنے ہی جنازے کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوں اور ———

چھوٹے حکیم صاحب نے بولنا بند کر دیا ہے لیکن اُن کے ہونٹ بدستور ہل رہے ہیں اور اُن کے چہرے پر ——— ہاں، میں نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا ہے ——— موت کا گہرا سکون طاری ہے اور ——— اور ——— آپ کو شاید یقین نہ آئے لمحہ بھر کے لیے چھوٹے حکیم صاحب کے چہرے میں مجھے مولوی وحیدالدین مرحوم کی جھلک سی دکھائی دی ہے اور میں جھرجھری لے کر چھوٹے حکیم صاحب کے پہلو سے آگے سرک آیا ہوں۔

مولوی صاحب ٹھیکیدار بشیر احمد ریلوے کے ایک افسر نعیم الدین کی داڑھی سے کھسر پھسر کر رہا ہے ——— مرحوم اُس وقت میری اسکیم پر عمل کرتے تو آج لاکھوں میں کھیلتے۔

ہاں بھئی۔ نعیم الدین نے ہنسی دبا کر کہا ہے۔ مر کر بھی کوئی لاکھوں میں کھیل سکتا تو ضرور کھیلتے۔

ارے ہاں، دیکھیے نا، میرے ذہن نے ابھی تک قبول ہی نہیں کیا کہ مرحوم جنت میں بھی جا پہنچے ہیں۔

معاملہ تو ہم لوگوں کا ٹیڑھا ہوتا ہے بشیر بھائی، ایسے نیک آدمی تو اِدھر دم توڑتے ہیں اُدھر جنت میں جا قدم دھرتے ہیں۔

ہاں مولوی صاحب، اللہ میاں کا حساب ٹھیک ٹھیک ہوتا ہے میں بھی یہی سوچا کرتا ہوں کہ یہاں تو ہم سبھی کو آسانی سے گولی ماری ہیں، وہاں کیا کریں گے؟

کرنا کیا ہے؟ یہ دنیا تو تم لوگوں کی جنت ہے ہی، وہاں بھی

ہم جیسے بے وقوف فرشتے گھلے جائیں گے ——— یہ یاد رکھو بشیر بھائی، اب مجھے فرشتہ بنے رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپنے بل کی رقم منظور کروانا ہے تو پہلے ہمارا دس فیصد کا حصہ ادا کرو۔ اب کے پانچ فیصد سے کام نہیں چلے گا۔

اطمینان رکھیے مولوی صاحب، دس فیصدی ادا کروں گا۔ آپ بل کو فوری طور پر نکلوا دیجیے۔ اتنی موٹی رقم رکی رہی تو میری جان نکل جائے گی۔

تو کیا ہوا بشیر بھائی، بیوی کو ہدایت کر جانا کہ ڈاکٹر کو ڈبل فیس ادا کرے۔ وہ کسی اور کی جان تمہارے وجود میں ڈال دے گا۔

ہہ ہاہہ ——— ! اپنی ہنسی شروع کرتے ہی اچانک جنازے کی طرف دھیان جانے پر بشیر احمد ہنسنے کو کھانسنے کی آواز میں تبدیل کرنے لگا ہے ——— کھ —— ہہ —— ہہ —— کھا ———

کھوں! ——— السلام علیکم چشتی صاحب!

وعلیکم السلام!

مجھے جنازے کو کندھا دینے کی خواہش ہونے لگی ہے۔

مولوی وحیدالدین صاحب مرحوم مجھے بڑی چاہ سے شیخ سعدی پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کی علم و ادب کی فراوانی میں غوطہ لگا کر میں نے وہ لعل و گہر پائے ہیں جن کے بغیر مجھے پتہ ہی نہ چلتا کہ میں کتنا مفلس ہوں۔

——— یا شفیع الوریٰ

اپنے استادِ محترم کے جنازے کے قریب آکر میں نے بائیں پشت کا سرا اپنے دائیں کندھے پر ڈال لیا ہے۔

میری پشت پر چند لوگ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

ہاں، ملت کے یہی دو بوڑھے نشان باقی رہ گئے تھے، مولوی وحیدالدین صاحب اور چھوٹے حکیم صاحب، سو ان میں سے بھی ایک چل بسا۔

ہاں، دوسرا بھی کب تک زندہ رہے گا؟

میں نے اپنے آپ سے کہا ہے کہ ان بے چاروں کو کیا پتہ کہ ایک کے جانے سے دوسرا بھی جاں بحق ہو چکا ہے۔ وہ لوگ بدستور باتیں کیے جا رہے ہیں اور میں بظاہر ان کی باتوں پر کان دھرے اپنی سوچ میں کھو گیا ہوں ——— وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ آبادی اس قدر کم تھی مگر ملت کا میلہ لگا رہتا تھا۔ آج آبادی کی کثرت سے سانس لینا بھی دشوار ہے لیکن ملت بے اولاد ہے اور بوڑھی ہو کر اسی حسرت سے چپ سادھے ہے کہ ایک بھی نام لیوا نہیں۔ ایک بھی ہوتا تو پھر ہوتے ہوتے میلوں کا سماں بندھ جاتا ——— اتفاق دیکھیے کہ مولوی وحیدالدین صاحب کے کوئی اولاد ہے نہ چھوٹے حکیم صاحب کے، ایک بار مولوی صاحب مرحوم نے مجھ سے کہا تھا، چشتی میاں، یہ تمہاری چچی ہے نا، خواہ مخواہ پریشان رہتی ہے۔ اوپر والے کی مرضی ہوئی تو ایک کیا، جڑواں جنے گی ——— ایک اپنے چھوٹے حکیم بے چارے کو دے دوں گا۔ بچے تو ہماری ملت کے ساجھے ہوتے ہیں ——— ہے نا چشتی میاں؟ ——— ٹھہریے! ———

میں نے بوکھلائی ہوئی عجلت سے کان کھڑے کر لیے ہیں:

ہاں بھائی، خدا چھوٹے حکیم صاحب مرحوم کو ———

تو کیا چھوٹے حکیم صاحب ——؟ —کیا —ک ——؟

میرے پیچھے سے کسی نے جنازے کا سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

طبیعت تو ٹھیک ہے چشتی صاحب؟

یونہی ذرا چکر سا آ گیا تھا۔

ہاں، اس اچانک موت سے کون نہ چکرائے گا؟ ———

چھوٹے حکیم صاحب اپنی آخری سانسوں میں آپ کو بڑی محبت سے یاد کر رہے تھے۔

تو پھر میں ابھی ابھی کس سے ہمکلام تھا؟ ——— مولوی وحیدالدین صاحب سے؟! ——— آپ کو پورا اختیار ہے کہ میری بات کو آپ کہانی سمجھ کر ٹال جائیں ——— میں نے اپنی خوفزدہ آنکھیں بے اختیار پیچھے موڑ لی ہیں ——— مولوی وحیدالدین صاحب اب بھی وہاں نظر آ جاتے تو سارا معاملہ واضح ہو جاتا لیکن اس میں میرا کیا دوش کہ انہی لوگوں میں گھرے ہوئے وہ ——— وہ ——— وہ ——— چھوٹے حکیم صاحب ہی چلے آ رہے ہیں، اپنی ترکی ٹوپی کے پھندنے کے نیچے ساکن وجود کو کسی بھوت کے مانند اٹھائے ——— پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر! ——— ؟

ہمیں بخشوا یا شفیع الوریٰ

خوف کی شدت سے ایک بار پھر میں نے اپنا سر پیچھے موڑ لیا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

ایم، مظہر الزماں خاں

جلے ہوئے چہروں کی تلاش

اُس نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو یکجا کیا۔ چہرے پر جمع شدہ زہریلے لمحے کھرچ ڈالے، جسم پر گڑے ہوئے پتھر اکھاڑ کر پھینک دیے، اور اپنی شکستہ انا کو بیساکھیوں کے سہارے کھڑا کیا تو اُس کے اندر بہت اندر بیشمار سورج سُلگ اُٹھے، آنتیں چیخ چیخ کر جلنے لگیں اور لبوں سے میں جل رہا ہوں، رضیہ جل رہی ہے، گلشن جل رہا ہے نعیم جل چکا ہے اور فرحت آدھی سے زیادہ جل چکی ہے کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ان صداؤں کو پتھریلے جسم پی پی کر قہقہے اگلنے لگے تو وہ چند لمحوں تک کھڑا انھیں حقارت سے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی خشک آنتیں نکال کر ان کے آگے ڈال دیں۔ اور وہ سب بیساختہ ان پر ٹوٹ پڑے اور پھر اس کے پورے جسم کو چبا چبا کر کھانے لگے اور جب پوری طرح سیر ہو چکے تب انھوں نے زمین پر استفراغ کر ڈالا اور وہاں سے پھُر پھُر اُڑ گئے تو اس مقام پر ایک جسم اُگ آیا، جو سر تا پا سوالیہ نشان تھا —— اس کے چہرے پر وقت کے کڑوے کڑوے لمحے اٹے ہوئے تھے، آنکھوں میں ہزاروں خواہشات موجزن تھیں اور پیروں میں ان گنت سنگ میل، جو جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور ذہن پر منوں وزنی چٹان رکھی ہوئی تھی۔ لیکن آواز اس کے اندر کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی۔ میں ٹوٹ کر بکھر چکا ہوں۔ اور تم سب میرے بکھرے ہوئے وجود کو یکجا کر دو تاکہ میں جلی ہوئی راکھ کے اندر سے چھپے ہوئے چہرے نکال سکوں جو مجھ سے پہلے جل چکے ہیں۔ لیکن اس کی زندہ آواز اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی اور تمام خواہشات شعلے بن کر سلگنے لگیں تو اس نے اپنے گڑے ہوئے پیروں کو زمین سے باہر نکالا۔ کڑوے کسیلے لمحوں کو چہرے پر سے نوچ دیا اور سہمی ہوئی سُرخ زمین پر آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ لیکن ایک ایک فرلانگ پر ترک کردہ اپنے قدموں میں پھنسے ہوئے سنگِ میل ضرور نصب کرتا رہا اور جب بے شمار سنگِ میل نصب کر چکا تو تھک کر چور چور ہو گیا اور سستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور صدیوں تک لیٹا رہا لیکن جب دوبارہ آنکھ کھُلی تو سب کچھ ویسا ہی تھا بلکہ اُس سے کہیں زیادہ ہی تھا —— جگہ جگہ خون کی علامتیں، کٹی پھٹی کھوپڑیاں، بکھرے ہوئے لاغر جسم، کھنچتی ہوئی آنتیں، پٹرول کی آگ میں جلتے ہوئے جسم، خون چوستے ہوئے زاغ اور گوشت کھاتے ہوئے گدھ —— کیا سنگیں سورج کبھی نہیں نکلے گا؟ دفعتاً پھر اُس کے اندر سے آواز آئی تو وہ تڑپ اُٹھا اور پوری قوت سے جسم کو زمین پر پٹخ کر بڑی سُرعت سے دوڑنے لگا اس دفعہ اس کی چال ہوا سے تیز تھی اور وہ میلوں کا سفر لمحوں میں طے کر رہا تھا کہ اچانک ایک دوسری آواز اُس کے پیروں میں لپٹ گئی اور قدم خود بخود نیچے اتر گئے تو وہ رُکا اور بڑے غور سے آواز کی طرف متوجہ ہو گیا جواب اُس کے گھٹنوں سے ہوتی ہوئی سماعت تک پہنچ چکی تھی۔

"تمھیں کس شے کی تلاش ہے؟ —— وہ کون ہے جو تمھارے اندر سے چیخ رہا ہے؟"

"میرا وجود!" وہ بولا! "میں صدیوں پہلے بکھر چکا ہوں لیکن کسی نے آج تک مجھے یکجا نہیں کیا اور نہ میرے اندر سلگتے ہوئے سورجوں پر ہی برف رکھا!"

"کیا تم اب بھی جل رہے ہو؟"

"نہ صرف میں جل رہا ہوں بلکہ میرے ساتھ بہت کچھ جل رہا ہے اب میں بھی جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں جلی ہوئی راکھ میں چھپے ہوئے چہرے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ مگر آج تک میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔"

ہاؤس نمبر ۲۵۹ - C، SPL - ای-آئی-ڈی، کاچی گوڑا - حیدرآباد - ۵۰۰۰۲۷ - اے - پی

"راکھ کریدنے سے کیا ملے گا؟" آواز نے آواز دی۔

"میری خواہش ہے کہ یہ سب میرے اور آنے والی نسلوں کے لیے شکستہ آئینے ہوں گی۔ جن میں دیکھ کر وہ گزری ہوئی صدی کے مسخ شدہ چہرے پر تھوک دیں گے۔"

"آنے والی صدیوں کے تعلق سے مت سوچو کہ وہ آپ اپنا آئینہ ہوں گی۔" وہ بولا۔ "یہ سوچو کہ اب کیا ہو رہا ہے۔؟"

"جو کچھ ہو رہا ہے وہ تم بھی دیکھ رہے ہو، میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ بھی دیکھ رہے ہیں جن کی کھوپڑیوں میں بارود بھری ہوئی ہے۔"

"دیکھ تو رہا ہوں۔ لیکن میں تم سے سُننا چاہتا ہوں کیونکہ تم ٹوٹے ہوئے ہو۔"

"تو پھر سُنو!" وہ بولا۔ "رستخیز کا عالم ہے اور ہم سب پل صراط پر چل رہے ہیں۔ سینکڑوں مارِ ضحاک ہماری گردنیں کاٹ کاٹ کر زہریلے سانپوں کو کھلا رہے ہیں اور سفید چمگادڑوں کی چیخوں سے موی بدن پگھل پگھل کر عزرائیل کی غلیظ ڈکاروں میں تبدیل ہو رہے ہیں اور ہماری خواہشات سیاہ و سرخ بھیڑیوں کا لقمہ بنتی جا رہی ہیں ——— کاش کوئی درفش کاویانی مارِ ضحاک کے خون سے خود کو سرخ کرتا تاکہ جلی ہوئی راکھ کے اندر سے دبے ہوئے چہروں کی کراہیں نہ اٹھتیں جو لمحہ لمحہ ہمیں رشتوں کا احساس دلاتی ہیں ——— ٹوٹے ہوئے رشتوں کا!"

"سُنو!" آواز تڑپ کر اس کے وجود میں پیوست ہو گئی!

"اس کڑوے دھوئیں کو مت سونگھو ورنہ حیات کا زہریلا نزا تمہیں چین لینے نہیں دے گا اور تم سفید فاختہ کی بجائے سُرخ خنجر بن جاؤ گے۔"

"شاید تم بچے ہوئے ہو ———" وہ بولا۔ "! اس لیے اپنی مفلوج ڈکاریں ہمارے زخمی بطن میں منتقل کر رہے ہو ——— آؤ! ادھر عنائی ملبے پر چپکا کر دیکھو ——— دہلیز جل رہی ہے، دروازے جل رہے ہیں، صحن جل رہا ہے، گھر جل رہا ہے ——— سارا شہر بھٹی بنا ہوا ہے اور اس جلے ہوئے شہر میں ہم اپنے اپنے چہرے تلاش کر رہے ہیں جو راکھ کی گھڑیوں میں دبے ہوئے ہیں کم از کم ہماری ان کٹی ہوئی آوازوں کو نہ قید کرو اور راکھ میں سے ہمیں اپنے اپنے چہرے تلاش کر لینے دو۔ پتہ نہیں وہ نیلے سانپ کب کاٹ لیں جو ہماری گردنوں میں لپٹے ہوئے ہیں! اور ایک ہلکی سی جنبش کے منتظر ہیں۔"

"اپنے اپنے چہروں کو منہ نوچے پال لیا کرو۔ سانپ خود بھی بھاگ جائیں گے، یا پھر ان سانپوں کو پنجروں میں داخل نہ ہونے دو کیونکہ وہ بھی سفید جلد سے تمہیں دھوکا دے رہے ہیں اور تم سے تمہارے آزاد رنگوں سے کھیل رہے ہیں تاکہ تم ایک دوسرے کو رگیدڑ رگیدڑ کر لہولہان ہو جاؤ تو پھر وہ تاریخ کے شکستہ اوراق اُلٹ دیں۔ اس لیے جاگتے رہا کرو۔" یہ کہہ کر آواز عنقا ہو گئی۔ اور وہ کھڑا قدموں کی آنکھوں سے لمحوں کے زخم کریدتا رہا تو ان میں اُسے رضیہ کا جلا ہوا جسم نظر آیا، عصمت کے مہندی لگے ہوئے ہاتھ نظر آئے، ماتھے کا ٹیکہ دکھائی دیا اور وہ تڑپ کر رادھا کو پکار اُٹھا تو اُسے جواب کی بجائے منگل سوتر کے بکھرے ہوئے موتی اور فرحت کے جلے ہوئے جسم پر پڑی ہوئی خراشیں نظر آئیں جن میں ننھا اظہار اور معصوم کشن کھیل رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ چیخ اٹھا اور پھر قدموں میں گری ہوئی بینائی کو بغلوں میں چھپا کر بے تحاشہ دوڑنے لگا ——— دوڑتے دوڑتے ایک اندھے غار میں اتر گیا ——— پورا غار جل رہا تھا۔ چاروں طرف شعلے ہی شعلے بھڑک رہے تھے اور اس شعلے اُگلتے ہوئے غار میں سے سینکڑوں آوازیں بلند ہو رہی تھیں، جو جلی ہوئی راکھ میں اپنے اپنے چہرے تلاش کر رہی تھیں۔

OO

غـــزلیں

مصور سبزواری

پرانے گھر کو نئی رت میں چھوڑ دیتا ہوں
میں عکس دیکھ کے آئینہ توڑ دیتا ہوں

خدا کرے کہ ترے ساتھ یہ مذاق نہ ہو
دِیا جلا کے میں لہروں میں چھوڑ دیتا ہوں

نہ بننے پاؤں گا مہماں کبھی تیرے خوابوں کا
میں عہدِ شب کو سرِ شام توڑ دیتا ہوں

سبھی فریبِ شکستِ طلب میں ہیں مرے شغل
میں جسم ٹوٹے کھلونوں کے جوڑ دیتا ہوں

کچھ ایسا ماتمِ رنگ و نور رہوں اب تو
کہ کھلتے پھولوں کی آنکھوں کو پھوڑ دیتا ہوں

●●

پرکاش فکری

رت بدلتی جائے گی، منظر بدلتے جائیں گے
دن مہینے سال یوں ہی، بس نکلتے جائیں گے

سختیاں گرچہ رہیں گی لمحۂ موجود کی
خواب رنگوں کے بنیں گے اور بہلتے جائیں گے

رفتہ رفتہ دھوپ ہوگی قہر ساماں اور بھی
تج کے اپنی بے رحی پتھر پگھلتے جائیں گے

سر اٹھائے پربتوں کی آرزو کرتے ہوئے
ہم اندھیرے کی ڈھلانوں پر پھسلتے جائیں گے

پیش قدمی کے صلے میں کھائیں گے ہم ٹھوکریں
اور پیچھے جو رہیں گے وہ سنبھلتے جائیں گے

بستیاں یوں ہی رہیں گی شاد بھی آباد بھی
درد کے طوفاں اٹھیں گے اور ٹلتے جائیں گے

ماتمِ تیرہ شبی کی رسم فکری ہو چکی
اب چراغوں کی طرح چپ چاپ جلتے جائیں گے

●●

ممتاز راشد

شدتِ گرمیِ احساس سے ڈھل جاؤں گا
برف ہوں ہاتھ لگایا تو پگھل جاؤں گا

وہی نظروں کا بھٹکنا وہی آوارہ شبی
میں یہ سمجھا تھا۔ تجھے پا کے سنبھل جاؤں گا

میں نے مانا تو گھٹا ہے مگر اتنا نہ برس
میں بھی دریا ہوں کناروں سے ابل جاؤں گا

میں ترے ہاتھ کی ریکھا ہوں مجھے غور سے پڑھ
کم ہوا تیرا تجسس تو بدل جاؤں گا

روز آیا نہ کرو اُس نے کہا ہے راشد
آج سڑکوں پہ بھٹک لوں دہل کل جاؤں گا

●●

○ ڈاکخانہ [illegible]، ضلع گورداسپور ○ گودر ٹنڈا، درزی محلہ، رانچی ○ درگاہ اسٹریٹ، ماہم، بمبئی

غزلیں

عروج زیدی

ہر قدم پر، ہر نظر پر احتسابِ زندگی
مجھ پہ آئینہ ہے ہر عیب و صوابِ زندگی

پوچھنا کیا ہے ـــــ یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے
میں کسے کہتا ہوں درجِ انتخابِ زندگی

اک معمہ بن گیا ہے میرے حق میں یہ سوال
کس خطا پر میں نے پایا ہے عذابِ زندگی

مجھ سے یہ طرزِ تغافل معنیٔ بے لفظ ہے
لے کے تیرے نام سے ہے انتسابِ زندگی

زندگی کی کروٹوں سے دردِ سر کیوں مول لوں
زندگی خود ہے مآلِ انقلابِ زندگی

سامنے کی بات ہے الیاں تہی داماں نہ ہو
وہ بھری محفل میں جب مانگیں حسابِ زندگی

جس کو ہو عرفانِ غم، احساسِ غم کے ساتھ ساتھ
کیوں سمجھے نہ آنسوؤں کو وہ شرابِ زندگی

ہوتے ہوتے بے نیازِ زندگی ہو جاؤں گا
رفتہ رفتہ اٹھ رہا ہے ہر حجابِ زندگی

اس کو سینے سے لگا کر دل میں رکھا ہے، عروج!
کس قدر پیارا ہے ہم کو اضطرابِ زندگی

●●

کرشن مراری

تصویر اک سراسر دل میں ہے بولتی سی
اِک شوخ سیم تن کی پُر کیف دلبری کی

جھانکے ہے پیرہن سے دِلکش بدن تمہارا
جیسے شعاعِ رخشاں کوئی ہو پھوٹتی سی

للکار بن گئی تھی یہ چندرما کی گھاٹی
اُس کو بھی سر کیا ہے ہمت ہے آدمی کی

ایک تیز و تُند خواہش دِل کو دبوچتی ہے
حاصِل ہے زندگی کا اِک سوچ نوچتی سی

وہ بات اب نہیں ہے اِس دِل کے وَلولوں میں
اِک برف سی لگے ہے شُعلوں کی روشنی بھی

وہ رات جِس کو ہم نے کو سا تھا دل لگی میں
محسوس ہو رہی اُس رات کی کمی بھی

●●

ڈاکٹر نریش

اپنے سائے سے بھاگتا ہوگا
کیا خبر تھی یہ حادثہ ہوگا

خامشی کو زباں نہ دے اے دوست
گھر میں ہر وقت شور سا ہوگا

فصل دہوں کی پک چکی ہوگی
اب نہ وہ شعلے بچھڑتا ہوگا

خودکشی اُس کی بے بسی ہوگی
وہ بھی کب مرنا چاہتا ہوگا

میری پہچان کے لیے تم کو
اپنا ماضی کریدنا ہوگا

یوں تو تم بھی زبان رکھتے تھے
کچھ بھی کہتے نہ بن پڑا ہوگا

وہ جو خوش تھا نریش میلے میں
گھر پہنچتے ہی رو دیا ہوگا

●●

○ محمد سیف الدین خاں، رامپور ○ C-4- ارون روڈ، نئی دلی ○ پنجاب یونیورسٹی، ایوننگ کالج، چنڈی گڑھ

نظمیں

نازش پرتاپ گڑھی

بے چارگی

یہ نوعروس ستارے کہ جن میں سوز نہ ساز
اداس لے میں سسکتا ہے نغمۂ مہتاب
یہ چند لمحوں کی دیوانگی ـــــ یہ سناٹا
نہ انتظار، نہ انگڑائیاں، نہ درد، نہ خواب
نہ جانے کتنے خیالوں نے اک سوال کیا
وہ اک سوال نہ ہو جس کو آرزو سے جواب

ابھی نہ چھوڑو مجھے اے مری تمناؤ
ابھی نہ ختم ہو بستر کی سلوٹوں کی چبھن
مجھے شکست کا احساس ڈس نہ جائے کہیں
مری ہنسی نہ اڑائے مرا اکیلا پن

کچھ اور گہری ہوئی ظلمتِ شبِ مہتاب
کچھ اور گھٹ گئی بجھتے ہوئے چراغ کی لَو
یہ تیرگی، یہ خموشی ـــــ نہیں، یہ موت نہیں
وہ ڈوبتے ہیں ستارے، وہ پھٹنے والی ہے پَو

●●

اقبال کرشن

آخری نظم

مرے ہاتھ میں
نہ ایاغ ہے نہ چراغ ہے
مرے آس پاس
مری مفلسی مری ظلمتوں کا سراغ ہے
مرے ساتھ ساتھ
مری بے کسی کی وہ لاش ہے
کہ سڑاند جس کی ہے بے مشام
جسے کوئی قبر ملی نہیں
نہ کوئی دعا کہ ہو مغفرت
نہیں کوئی جلسۂ تعزیت
مرے یار صیدِ شکوک ہیں
مجھے دیکھتے ہیں بچشمِ خوف
مرے زیرِ پا کی زمین بھی
مجھے ڈس رہی ہے گھڑی گھڑی

مجھے راستے سے ہٹا دے آج
مجھے راستے سے ہٹا دے آج۔

(ن۔م راشد کی یاد میں)

●●

○ بلرام پور ہاسپٹل، لکھنؤ ○

نظمیں

عادل منصوری

وحی* آسمانوں میں عنقا

وحی مشعلِ راہ موقع بہ موقع
وحی سارے عقدوں کا حل حرفِ آخر
وحی الجھنوں سے نکلنے کا رستہ
وحی حرفِ خالق
وحی زندگی کرنے کا حوصلہ بھی
وحی سلسلہ گفتگو کا
وحی لم یلد کی زباں
وحی اس کے سینے کی گہرائیوں میں
تڑپتی لبوں پر تھرکتی ہوئی بات۔ رازِ نہاں
وحی جو اسے بولنے اپنے لب کھولنے کا
بہانہ ابھی تک
مگر اب وحی آسمانوں میں عنقا
مگر اس کے ہونٹوں پہ اب کوئی
حرکت نہیں
اس نے چپ سادھ لی ہے
وہ سب دیکھتا ہے
وہ سنتا ہے سب کچھ
ہمارے دلوں میں نہاں سارے رازوں سے
واقف ہے وہ
ہمارے ارادے خیالات خوابوں کو وہ جانتا ہے
اسے علم ہے ذرے ذرے کا
ہماری زباں پر تھرکتا ہر اک لفظ وہ سن رہا ہے
وہ خاموش ہے
ہمیں ہم کلامی سے محروم کرکے وہ خاموش
کیوں ہے
اگر روزِ محشر بہت دور ہو تو
اسے بولنا چاہیے
مگر حشر کی صبح کے درمیاں
رات حائل ہے شاید

* اس لفظ کا تلفظ اختیاری ہے۔

رشید افروز

نظم

سبھی میری فطرت سے واقف ہیں
مجھ میں نیا ظلم
چپ چاپ سہنے کی عادت نہیں!
میں نئے ظلم پر چیخ اٹھوں گا
چلاؤں گا
بدکلامی کروں گا
ذرا دیر کچی زمیں پر
لرزتے ہوئے
پانْو ماروں گا
خالی ہواؤں میں
نیزے اچھالوں گا
پھر — خود ہی رونے لگوں گا.........
سبھی میری فطرت سے واقف ہیں
مجھ میں نیا ظلم
چپ چاپ سہنے کی عادت نہیں!

شاعی سدن، ۵ مرزاپور روڈ، احمد آباد ○ ۷۶۹۔ زکریا اسٹریٹ

کینچلی سے باہر

احمد تنویر

میں لڑھکتے لڑھکتے اس گلی میں گر پڑا جیسے شیشے کی گولی گچّی میں پڑ جاتی ہے۔

پچھلے سمئے جب درختوں کی چھالیں اترنے لگیں تو میرے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے کہ دوسروں کی پہچان بتاتے بتاتے میں تھک سا گیا تھا پھر جب سمتوں کے پر جھڑنے لگے تو میں نے اپنی پہچان کی ساری لکیریں کھرچ کھرچ کر صاف کر ڈالیں اور سچ تو یہ ہے کہ کئی سالوں تک اجنبی ہواؤں کی بو سونگھتے سونگھتے میں سب کچھ بھول چکا تھا ——— پھر بھولنے کی مشق میں نہ جان بوجھ کر تو کی نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو اپنے نزدیک سے گزر جانے پر بھی اپنی پہچان بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔

تو میں ابھی گلی میں گرا ہی تھا کہ چہرے کی ساری لکیریں دوبارہ نمودار ہونے لگیں اور تب ہی ایک بوڑھا ہانپتا کانپتا گرتا پڑتا میرے نزدیک آیا اور زبان کی گرد جھاڑ کر ہکلانے لگا۔

"چلو، اپنی امانت سنبھال لو! میں جنموں سے تمھاری تلاش میں تھا۔ تمھارے نام کی تختی اب مجھ سے سنبھالی نہیں جاتی۔ وہ مکان بھی اب زیادہ دنوں تک ٹکنے والا نہیں۔ سارے کے سارے شہتیر کھوکھلے ہو چکے ہیں اور دیواریں بے جان۔"

بڈھا میری آنکھوں میں بوند بوند گرنے لگا۔ بوڑھی آنکھوں پر لٹکی اس کی سفید سفید بھنوئیں مجھے کھینچ کر اس گرتے مکان کے دروازے تک لے گئیں ——— قدموں کی بو سونگھتے ہی دیواروں کے پلاسٹر جھڑنے لگے ——— کال بیل کا لائن تو پہلے ہی ڈس کنیکٹ ہو چکا تھا۔ بائیں جانب کمرے میں صرف چوکھٹ ہانپ رہا تھا جس پر ہاتھ پڑتے ہی جھنجھنا کا محسوس ہوا سانپ کی ڈسن کی طرح۔

"پرانی ہڈیاں کو چھوؤ گے تو یونہی جھنجھنا محسوس ہوگا۔" بڈھا گردن ہلانے لگا۔

پلنگ کی پٹیاں بھی اب گرنے لگی ہیں۔ رسیوں کے جالے تو کب کے اجڑ گئے۔

زور دینے پر ماں کا چہرہ دھم سے ذہن پر گر پڑا۔ چیختی چلّاتی پاگل ماں۔ اور جب زنجیروں کی یاد آئی تو پھپھک پھپھک کر رونے کو جی چاہا۔ ——— ٹھیک اس رات کی طرح جس رات . . .

میں اپنی ہی آواز کے دائرے میں محصور تھا منجمد احساس کی پرتیں جلد سے چپکی ہوئی تھیں ——— بارش کے چھینٹے جسم سے پھسل پھسل کر فرش کو چوم رہے تھے ——— ماں زنجیروں میں جکڑی چیخ رہی تھی۔ بابا کہا کرتا تھا ——— "میرا منّا گریٹ ہے، یہ آسمان چھوئے گا۔"

مگر کیکٹس کا جسم اپنے ہی کانٹے سے لہولہان ہوتا جا رہا تھا۔ چھت ٹپک رہی تھی۔ ماں چیخ رہی تھی۔ بابا کو گالیاں دے رہی تھی ——— بابا جب زندہ تھا تو ماں کے پیروں میں زنجیریں وہی ڈالا کرتا تھا ——— موٹی موٹی آہنی زنجیریں اور بندشوں کے دائرے میں گھری میری ماں مجھے عجیب نظروں سے گھورا کرتی۔ اور تب ہی مجھے احساس ہونے لگتا کہ میں جنت سے بہت دور ہوتا جا رہا ہوں۔ اور تب میرے اندر کوئی پھپھک پھپھک کر رونے لگتا۔

ایک روز بارش خوب ہوئی . . . خوب ہوئی . . . ماں کا چہرہ ایکا ایک ذہن سے دھل گیا۔ آنکھوں میں آنسو لبالب بھرے تھے۔ پھر دھڑام سے ایک کڑی سامنے گر پڑی ——— بڈھا میری جانب پرسی نگاہوں سے گھورنے لگا۔

مخدوش دیواروں پر آویزاں تصویروں کے صرف دھڑ بچے تھے۔ چہرے کی لکیروں کو تو چڑیاں کب کی چگ چکی تھیں۔ پہچان کے

جالے آنکھوں کے سامنے پھیل گئے۔

یہ تصویر تمھارے دادا کی ہے ——
مگر میں تمھیں پہچانتا ——
اور . . . یہ تمھارے ابّو کی . . . ——
میں انھیں بھی نہیں جانتا . . . ——
اور . . . یہ . . . تمھاری ——

میں اسے . . . کچھ . . . کچھ . . . نہیں . . . نہیں . . . میرا اس سے بھی کوئی رشتہ نہیں۔ مجھے باہر جانے کا راستہ بتاؤ . . . میں . . . میں . . .

پھر پھڑا کر تصویروں کے نیچے ہوئے اعضا فضا میں پرواز کرنے لگے اور ان کی کٹی ہوئی گردنوں سے خون کے قطرے ٹپ ٹپ میری آنکھوں میں گرنے لگے اور تب میں گرد آلود فرش پر چت لیٹ گیا اور میرے ارد گرد دھڑام دھڑام کڑیاں اور شہتیر گرنے لگے ——
بوڑھا میرے نام کی تختی اُٹھائے میری جانب بڑھا آرہا تھا۔
چھت کا آنچل کڑیوں کے بنا بکھر ہونے لگا۔ آسمان کی آنکھیں مجھ پر گڑی تھیں۔ تب ہی میرے چہرے سے کئی اوراق آکر چپک گئے۔

"میں لوکس ہوں۔ میری موت پر تم نے 'نیوٹرل' کی فکر کی تھی مگر آنسو بہائے تھے۔ مگر اب میری قبر پہ کتے پیشاب کیا کرتے ہیں۔ میری مکتی کا سامان کرو۔"

"میں بڑے میاں کی بیوی ہوں۔ تم مجھے چچی کہا کرتے تھے اور میری بیٹی زیبی کو بہن۔ تمھارے جانے کے بعد بڑے میاں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر گئے اور زیبی رنڈی بنا دی گئی۔"

"میں چندر کانت چچا ہوں۔ مندر کا پجاری۔ تم نے میری شادی شیودھرا سے کروائی تھی۔ وہ حرامزادی میرا سارا روپیہ لے کر پچھو بنیے کے ساتھ بھاگ گئی۔"

"میں . . . میں تمھاری وہ . . . میری کوکھ میں تمھاری غلاظت پڑی پڑی مہینوں تک میرا خون چوستی رہی تھی۔ میں بھی جب کنگال بچی نظر آئی تو اسے نالی میں انڈیل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے رشتہ توڑ بیٹھی۔ جب تم اس کے نہیں تو میں کیوں اور اب دیکھو وہ نالی کے کیڑے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔"

میں کالو ہوں . . .
میں کفایت ہوں . . .
میں للّن چائے والا ہوں . . .
میں . . .
میں . . .
—— شہتیر ایک ایک کر کے گرتے رہے . . .

اور بوڑھا تھا کہ نام کی تختی برابر میرے شانے پر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جسے میں جھٹک کر بھاگ نکلا تھا —— مکان کی دیواریں مجھے جکڑنے چلی آرہی تھیں۔ چھتیں تو کب کی گر چکی تھیں۔ قریب تھا کہ میں دیواروں کے بیچ میں رہ جاتا لیکن بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر میں اس مکان سے باہر چلا آیا —— بابا ایسا کرو کہ اپنے نام کی تختی تم بھی اپنے شانے سے اتار پھینکو کہ نام کا زہر ہماری رگوں میں داخل ہو کر ہماری رنگت تک تبدیل کر دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی اپنی پہچان اس کھنڈر میں دفن کر دیں کہ . . .

میں، میں کی صورت میں نہیں
تم، تم کی صورت میں نہیں
سب 'وہ' کی صورت میں تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

OO

جلیل تنویر

تیسری آنکھ کا المیہ

سرد ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

نشی جو دیر سے باز دکے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی، میرے قریب کرسی پر آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ وہ پریشان ہے۔ کانپتے ہوئے لہجے میں کہتی ہے۔ "وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کوئی بھوت ہے اور..." وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی۔ میں مسکرا کر اس کی بات کو ٹال دیتا ہوں۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ نشی ہمیشہ اس کے متعلق عجیب عجیب باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس سے قطع تعلق کر لینے کو کہتی ہے۔ اس کی نظر میں اس کی شخصیت اور اس کا چہرہ بڑا گھناؤنا اور کریہہ ہے۔ اس کی وجہ شاید اس کی زائد تیسری آنکھ ہے۔ جو اُس کو اس دُنیا کی مخلوق سے جدا کرتی ہے۔ اسی لیے میں نے اس کو بارہا یہ مشورہ دیا ہے کہ تم اپنی تیسری آنکھ نکال دو۔ بہت ممکن ہے تم اس کے بعد کچھ شہرت اور عزّت حاصل کر سکو۔ ورنہ زندگی میں محرومیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتا ہے۔

دوسری صبح نشی باہر ایک اونٹ کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے۔ "وہ اکثر اس اونٹ کے ساتھ باتیں کرتا رہتا ہے۔ اونٹ بھی گردن ہلا ہلا کر اُس کی باتوں کا جواب دیا کرتا ہے۔ خوب باتیں ہوتی ہیں دونوں میں۔ یہاں تک کہ وہ اونٹ کی گردن سے لگ کر سو جاتا ہے۔ مگر اس کی تیسری آنکھ کھلی رہتی ہے۔ جو نہایت خطرناک لگتی ہے۔ میں تو مارے خوف کے بستر میں دھنس جاتی ہوں۔"

میں نشی سے کہتا ہوں کہ وہ شخص اپنے بچپن میں نہایت خوب رو تھا لیکن جب وہ جوان ہونے لگا تو اس کے چہرے پر ایک تیسری آنکھ نمودار ہونے لگی اور اسی تیسری آنکھ کی موجودگی نے بالآخر اسے شہر بدر کرا دیا۔ کئی مصائب و آلام سے وہ دوچار ہوتا رہا ہے۔ ہر جگہ اُسے مختلف ناموں سے نوازا جاتا رہا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ برداشت کرتا رہا ہے۔ اس کی تحقیر اور رسوائی کا اصل سبب وہ مناظر ہیں جو اس کی تیسری آنکھ اسے دکھاتی ہے اور جو دوسرے لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ وہ انھیں دیکھنا پسند بھی نہیں کرتے۔

جب وہ اپنی تیسری آنکھ کے ہولناک مناظر کا تذکرہ کسی چوراہے پر کھڑے ہو کر کرنے لگتا ہے تو لوگ اسے جھوٹا سمجھ کر پتھر مارتے ہیں اور اسے لہولہان کر دیتے ہیں۔ میں نشی کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ وہ بُرا آدمی نہیں ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں نے آج پھر اسے چائے پر مدعو کیا ہے اور اس نے یہاں آنا منظور کر لیا ہے۔

تھوڑے سے وقفہ کے بعد کہیں دور سے شور و غل کی آوازیں آتی ہیں ہم گھبرا کر کھڑکی میں آکھڑے ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ایک غضب ناک ہجوم اپنے ہاتھوں میں نیزے، بھالے اور چاقو لیے ہمارے مکان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ ہماری گلی میں داخل ہوتے ہیں، اور ہمارے گھر میں گھس آتے ہیں۔ "کہاں ہے وہ بدمعاش تیسری آنکھ والا۔ ہم اُسے آج ہرگز زندہ نہ چھوڑیں گے۔" کئی آوازیں ایک ساتھ چیختی ہیں۔ میں جواب میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ "وہ تو ادھر آیا نہیں ہے۔ البتہ باہر اس کا اونٹ بیٹھا ہوا ہے۔" پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اونٹ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر بکھیر دیا گیا ہے تازہ گرم خون کے چھینٹوں سے سبھی چہرے داغدار ہو گئے ہیں نشی یہ منظر دیکھتی ہے تو اور خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

رات اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ ہوائیں بند ہیں اور فضا پر المناک سکوت طاری ہے۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک

ہوتی ہے۔ میں بستر سے اٹھ کر آہستہ سے دروازہ کھولتا ہوں تو نشی چیخ مار کر اُچھل پڑتی ہے۔ سامنے وہی کھڑا تھا مگر اس کے چہرے سے تیسری آنکھ غائب تھی۔ وہ لپینے میں شرابور تھا۔ کانپتے ہوئے کہتا ہے۔ "یہ لو میں نے اپنی تیسری آنکھ نکال دی ہے۔ اب تو مجھے معاف کر دیا جائے گا نا؟" اس سے قبل کہ میں اُس سے کچھ کہتا وہ اپنی بات پوری کر کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے میری ہتھیلی پر اس کی مُردہ آنکھ ہے اور باہر دُور تک تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔

OO

چند قابلِ مطالعہ کتابیں

اردو شاعری میں ہئیت کے تجربے ڈاکٹر عنوان چشتی کا تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ۔ قیمت: چودہ روپے

آواز کا جسم مخمور سعیدی کا تیسرا مجموعۂ کلام جدید شاعری کے وزن و وقار کا روشن نشان۔ قیمت: دس روپے

سیہ بر سفید مخمور سعیدی کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نیا اڈیشن، ترمیم اور اضافے کے ساتھ۔ قیمت چھ روپے۔

لینن لینن کی شخصیت اور اس کے افکار و خیالات کا تفصیلی جائزہ۔ قیمت: دو روپے

قوموں کے قاتل ان قومی اقلیتوں کی لرزہ خیز سرگزشت جو سوویٹ روس کے کلیتی نظام کا شکار ہوئیں۔ قیمت: تین روپے

خرابہ من موہن تلخ کا منتخب کلام جو ایک جداگانہ رنگ و آہنگ رکھتا ہے۔ قیمت دس روپے

تکون کا کرب آزاد گلاٹی کی نظمیں اور سانیٹ حقیقت اور رومان کا سنگم۔ قیمت: پانچ روپے۔

اِنتظار کی رات کمار پاشی کا چوتھا شعری مجموعہ۔ اردو شاعری کے نئے امکانات کی دریافت۔ قیمت: آٹھ روپے۔

سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ تمام مروجہ سیاسی اصطلاحات اور ان سے وابستہ تصورات کی وضاحت چودہ ممتاز علمائے سیاست کے علم کا نچوڑ۔ قیمت ایک روپیا

میں گواہی دیتا ہوں روسی ادیب اور دانشور اناطلی مارچینکو کی انکشاف انگیز آپ بیتی، روس کے جبری مشقت کے کیمپوں کے چشم دید حالات قیمت چار روپے۔

انسانی حقوق کیا ہیں؟ ان بنیادی انسانی حقوق کا تعارف اور تشریح جن پر مہذب زندگی کی عمارت قائم ہے۔ قیمت: مجلد ۲ روپے غیر مجلد ۱ روپے

میرا وطن ہندوستان بدیع الزماں خاور کی وطنیہ شاعری حبِ وطن کے جذبے سے سرشار نظمیں۔ قیمت: چار روپے۔

صریرِ خامہ مظفر حنفی کی غزلیں جن میں ان کے اسلوب کا تیکھا پن عروج پر ہے۔ قیمت چھ روپے

دیپک راگ مظفر حنفی کی تازہ غزلیں اور رباعیاں قیمت چھ روپے

صحرا کی پیاس شباب للت کی غزلیں نظمیں اور گیت جن میں روایت کا حسن بھی ہے اور فکر کی تازگی بھی۔ قیمت: چھ روپے۔

شہپر عزت الاکرام کا منتخب کلام۔ قیمت: آٹھ روپے۔

کتب فروشوں اور لائبریریوں کو مناسب کمیشن دیا جائے گا۔

غزلیں

امیر قزلباش

اب اس کا تغافل گوارا کرو
مسیحا مسیحا پکارا کرو

امیدوں کے دیپک جلا کر کبھی
سیہ پانیوں میں اتارا کرو

گزر جاؤ بچ کر ہر اک یاد سے
کوئی شام یوں بھی گزارا کرو

یہ ویراں کھنڈر اب بھی گونجا نہیں
مرا نام لے کر پکارا کرو

یہ ڈھلتے ہوئے چاند کی بے بسی
تمہارے لیے ہے نظارا کرو

نگاہیں چرالو اسے دیکھ کر
کبھی خود سے یوں بھی کنارا کرو

تمہاری ضرورت ہے پھر دوستو
مجھے پھر ذرا بے سہارا کرو

●●

منظور ہاشمی

راستہ سمندر کا جب رکا ہوا پایا
اور بھی کناروں کو کاٹتا ہوا پایا

دیر تک ہنسا تھا میں دوستوں کی محفل میں
لوٹ کر نجانے کیوں، دل دکھا ہوا پایا

دھوپ نے ٹٹولا جب منجمد چٹانوں کو
برف کے تلے لاوا کھولتا ہوا پایا

سوچیے کہیں گے کیا، لوگ ایسے موسم کو
جس میں سبز شاخوں کو سوکھتا ہوا پایا

میرے واسطے شاید خط میں تھا وہی جملہ
تیز روشنائی سے، جو کٹا ہوا پایا

نیند کی پری آخر ہو گئی خفا ہم سے
اور کوئی آنکھوں میں جب چھپا ہوا پایا

●●

عقیل شاداب

زندگی مجھ کو مری نظروں میں شرمندہ نہ کر
مر چکا ہے جو بہت پہلے اسے زندہ نہ کر

حال کا یہ دکھ ترے ماضی کی تجھ کو دین ہے
آج تک جو کچھ کیا تو نے وہ آئندہ نہ کر

تو بھی اس طوفان میں اک ریت کی دیوار ہے
اپنی ہستی بھول کر ہر ایک کی نندہ نہ کر

سو گنا ہو کے ہوئے بھی جس نے بازی ہار دی
ایسی بزدل بھیڑ کا مجھ کو نمائندہ نہ کر

جسم کیا شے ہے کہ میری روح تک جل جائے گی
آگ میں اپنی جلا کر مجھ کو تابندہ نہ کر

●●

○ A-8 نظام الدین ایسٹ نئی دہلی ○ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ○ برج راج پورہ، کوٹہ

غزلیں

حیات لکھنوی

یہی اچھا ہو نظر آتے رہیں خواب مجھے
مسلکِ ہوش و خرد کر گیا غرقاب مجھے

اب پرکھنے سے نظر آیا ہے وہ سنگِ حقیر
میں سمجھتا تھا ملا گوہرِ نایاب مجھے

وحشتِ تنہائی کے کس غار میں پہنچائے گا
اپنے گھیرے میں لیے حلقۂ احباب مجھے

اور بے چین ہوا ہوں، یہ مقدر میرا
اپنے نزدیک تو وہ کر گئے سیراب مجھے

بعد مدت کے جو دل سے گیا ہوں میں حیاتؔ
کچھ پہلے سے لگے لکھنوی آداب مجھے

●●

ندرت نواز

ترے قریب ہوا ہوں تو خود سے دور ہوں میں
عبور ہو کے بھی دریائے بے عبور ہوں میں

ہر اک نے سمجھا مجھے جلتی لکڑیوں کا دھواں
نہ سمجھا کوئی کہ بھڑکوں اگر تو نور ہوں میں

مرے بغیر تری جیت ہو نہیں سکتی
ترے محاذ پہ ہارا ہوا ضرور ہوں میں

کسی بھی راہ سے گزروں کسی جگہ ٹھہروں
یہی لگے مجھے جیسے ترے حضور ہوں میں

●●

ساجد اثر

آج کا انسان ہوں
ایک ریگستان ہوں

فرش پر گرنے نہ دو
کانچ کا گلدان ہوں

شبد ہوں ادنیٰ، مگر
ارتھ کا طوفان ہوں

فاصلوں کی بھیڑ میں
قُرب کا اعلان ہوں

وقت کے مفتوح کی
فتح کا امکان ہوں

آب دیدہ ہے اثرؔ
میں بہت حیران ہوں

●●

نظمیں

زرینہ ثانی

ایک نظم

جنگلوں میں کہیں .....
اک غزالِ حسیں

چھا گئی دیدہ و دل پہ اک بے خودی
اس کے پیچھے چلی میں تو چلتی گئی
رقص کرتی ہوئی

محوِ حیرت ہوئی
دیکھ کر ایک قصرِ دل آرا کی رعنائیاں
خوشنما پتھروں کے ستوں
رنگ و نکہت کے طوفان کے سامنے زندگی سرنگوں
مہ جبینوں کا رقصِ جنوں
مطربِ نغمہ زن
موجِ مے گلفشاں
سارا ماحول کیف و سرور آشنا
برق رفتار لمحوں کو
چاہا گرفتار کر لوں مگر
ہاتھ سے وہ پھسلتے گئے
اک خلا رہ گیا
خالی خالی نگاہوں سے
میں دیکھتی رہ گئی !

●●

رونق زیدی

یاد

یاد کی لہریں
من کا آنچل بھگو گئیں
سوچ کی لکیروں نے
تصویر کے نقوش دھندلا دیے
درد کے دھاگے
ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتے رہے
مگر ——— خیال کے تار
کانچ کے ریزے تھے
آہ نے چپ کا کفن پہنا
سناٹے کا چھور
اور ——— آکاش کا کنارا
مل جل کر ایک ہو گئے
میں ———
روتی ہوئی رات میں
چاروں اور بکھر گئی

●●

۱۳۳ مظفر نگر، ناگپور

اسمٰعیل نگر، میرٹھ

نظمیں

شاہد کلیم

بے وجود قاتل

ازل سے
بھاگتا میں ہر ار سہتا چلا آرہا ہوں
اسے اور آزاد
اب میں نہ چھوڑوں
کہ پھر میرے نازک بدن پر
کچوکے لگائے

O

اسے ڈال دیتا
کسی قید خانہ میں ——— میں
بھاگتا مگر
کچھ نشان، کچھ پتہ بھی
ملے تو کہیں ———

O

••

ظفر اوناوی

اور پھر یوں ہوا

اور پھر یوں ہوا
میں بہت دیر تک
اپنے احساس کے بند کمرے میں دبکا رہا
کچھ ادھوری صداؤں کے
بے ربط جملوں کو
ترتیب دینے میں الجھا رہا

اور پھر یوں ہوا
ایک آواز نے مجھ کو چونکا دیا
مجھ کو لرزا دیا

یہ جہاں ———
رنج و غم سے بھرا یہ جہاں
ہر قدم پر کھڑے ہیں مسائل یہاں
نت نئی الجھنوں کا ہے سیلِ رواں
پھر بھلا ذہن کو اتنی فرصت کہاں
جو فقط
کچھ ادھوری صداؤں کے
بے ربط جملوں کو
ترتیب دینے میں الجھا رہے

••

منور امروہوی

آواز

غموں کا عکس
چہرے پر
لبوں پر
زندگانی کے تبسم کی
نہایت تلخ تحریریں
نگاہوں میں اُداسی
اور دل میں
پیار کی حسرت
میں سب جان کر پہچان کر
میں نے تمہیں
اپنا کہا تھا
مگر یہ سب
مری آنکھوں کا دھوکا تھا
وہ کوئی اور تھا
جس نے تمہیں
آواز دی تھی
میں نہیں تھا

••

عبداللہ
یوسف جمال

دروازہ اور ہتھکڑی

یہ ڈھیلا دروازہ ہی تھا جس کے تئیں اس کے دل و دماغ میں شدید طور پر یہی اور بس یہی احساس ابھرا تھا کہ اسی ڈھیلے دروازے کے سبب اس کا گھر جلنے سے بچ گیا۔ یوسف اس ڈھیلے دروازے کو کبھی معاف نہیں کر سکا کیونکہ اسی کی وجہ سے اسے سلاخوں کے پیچھے مجرم بن کر کربناک لمحوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یوسف ایک کمپونڈر تھا، اس کی کافی عزت تھی اور اس نے باقی ماندہ زندگی کے لیے اتنا سرمایہ جمع کر لیا تھا جس سے وہ سکون سے زندگی گزار سکتا تھا۔ وہ ایک سرکاری ہسپتال میں بیس سال تک خدمت انجام دینے کے بعد ریٹائر ہو گیا تھا۔ اس کا مکان نہ تو پرانا تھا نہ نیا۔ وہ بلاک کے ان تین مکانوں میں سے تھا جنھیں مالک، مکانوں نے بود و باش کی صورت نہیں دی تھی۔ یوسف اپنے مکان کا آٹھ ہزار ڈالر کا بیمہ بھی کرا چکا تھا۔ اس لیے یوسف کو بیمہ کی رقم کے متعلق سوچنا ضروری ہو گیا تھا اور اس نے اپنے گھر کی پشت پر ایک دروازہ لگانے کا ارادہ کر لیا۔

اس نے ایک عجیب اسکیم تیار کی۔ وہ ہر بات سائنٹیفک نظریے سے سوچا کرتا تھا۔ پلان پختہ اور ٹھوس تھا۔ اس پلان کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ جب گھر میں آگ لگی رہے گی تو وہ گھر سے میلوں دور رہے گا۔

شفاخانے میں جب وہ پرچے کی دوا بنا چکا تو سیٹی بجائی اور اس موٹی سی عورت کو آنکھ ماری جو کبھی کبھی اس کے پاس نزلہ و زکام کی دوا لینے آ جایا کرتی تھی۔

"آج بہت خوش ہو ـــــ"، موٹی سی عورت نے اپنے زرد دانتوں کی نمائش کے ساتھ کہا

"ہاں، میں کچھ دن چھٹیاں منانے جا رہا ہوں۔"

"شاید بارہ سال کے طویل عرصے میں یہ تمہاری پہلی چھٹی ہے، کب جا رہے ہو؟"

"صبح"۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے یوسف گھر کے لیے چل پڑا تاکہ صبح کے سفر کی تیاری کی جا سکے، اس کے ساتھ ایک بنڈل تھا، بادامی کاغذ سے لپٹی ایک بوتل بھی تھی، یہی جار اس کی تجویز کو عملی طور پر کامیاب بنانے والا تھا۔ اس میں پیلے فاسفورس کے تئیں مخصوص ہدایت تھی کہ اسے ننگی انگلیوں سے نہ چھوا جائے۔ یہ پینتالیس ڈگری سینٹی گریڈ کی حدت سے ہوا میں بھی جل اٹھتا ہے، اس لیے اسے پانی میں رکھا جاتا ہے اور مٹی کے تیل میں جمع کیا جاتا ہے۔ اس وقت بھی وہ مٹی کے تیل میں ڈوبا ہوا تھا۔

دوسری تجاویز کی طرح اس کی یہ تجویز بھی سیدھی سادی تھی، وہ جار کو ایک موٹی رسی سے کھونٹی پر لٹکا دے گا۔ جار کے نیچے کتابوں کی شیلف ہو گی اور زمین پر کاغذ کے ٹکڑے پڑے ہوں گے۔ رسی کے نیچے میز پر ایک موم بتی ہو گی اور یوسف کے مرتب شدہ پروگرام کے مطابق رسی جلنے میں دو گھنٹے لگیں گے اس نے ان دونوں کے بارے میں بھی سوچا جو پانچ ہزار ڈالر میں اس کا مکان خریدنا چاہتے تھے، لیکن پانچ ہزار اور آٹھ ہزار کے فرق سے وہ واقف تھا۔ وہ بیمہ کی رقم حاصل کرنے کے بعد زمین ہی دو ہزار میں فروخت کر سکتا تھا۔

دروازے کی چرچراہٹ نے اسے جگا دیا، اسی وقت گھڑی کا الارم بھی چیخ اٹھا، وہ مسکرایا، آج اس منحوس ڈھیلے دروازے کا آخری دن ہے۔ وہ اٹھا، غسل کیا، کپڑے بدلے ٹیکسی کے لیے فون کیا، پھر اس نے حساب لگایا کہ گھنٹے میں جب وہ پورٹ لینڈ ٹکٹ میں ہو گا، مکان آگ کے نرغے

میں ہوگا۔ ٹیکسی آگئی وہ اپنے سامان کے ساتھ تیار تھا۔ وہ ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوا اور اپنی کارگزاری پر مطمئن ہو کر لوٹ آیا۔ تبھی اسے وہ دونوں مل گئے۔

"یوسف، تم نے کیا سوچا؟"

"نہیں، میں نہیں بچوں گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ان دونوں نے اسے دیکھا اور نا امیدی سے سر ہلا دیا۔ انھوں نے گھر کے اندر جھانکا۔ دروازے نے بند ہو کر اپنا کام کر دیا۔ موم بتی بجھ گئی، دونوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور تیجے کی طرف سے رسوئی گھر میں داخل ہو گئے۔

دوسرے دن پورٹ ڈکسن میں یوسف نے اخبار کے ذریعہ آگ کی خبر پڑھی اور خوش ہو گیا۔ اب اسے گھر لوٹنے کی عجلت نہیں تھی۔ پھر بھی گھر تو جانا ہی تھا۔ اور

جب وہ گھر واپس آیا تو حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا مکان ویسا ہی تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ آگ اس کے منصوبہ والی جگہ میں نہ لگ کر صرف رسوئی گھر میں لگی تھی جس کو فائر بریگیڈ نے فوراً ہی قابو کر لیا تھا۔ دروازے کے قریب پولیس کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یوسف ابھی استعجاب کی دنیا سے باہر بھی نہ آسکا تھا کہ ایک سپاہی نے اس کے کاندھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور وہ چونک گیا۔

ڈھیلا دروازہ ایک بار پھر چڑچڑ کی آواز کے ساتھ چلا اُٹھا ——

(ملیشیائی کہانی)

●●

پیڑ پودوں
کی
حفاظت کیجئے
پیپڑ زمینی کٹاؤ روکتے ہیں اور سیلاب سے حفاظت کرتے ہیں،
بارش کراتے اور خشک سالی کو روکتے ہیں،
فصل کی حفاظت کرتے ہیں،
جنگلی جانوروں کو پناہ دیتے ہیں،
آکسیجن اور تازی ہوا مہیا کرتے ہیں اور ہوا کو صاف رکھتے ہیں،
سیر و تفریح کا ذریعہ ہیں،
لکڑی کی صنعت کے لئے کچا مال دیتے ہیں اور
ایندھن، چارہ اور غذا مہیا کرتے ہیں۔
آج آپ بھی ایک پیڑ لگائیے
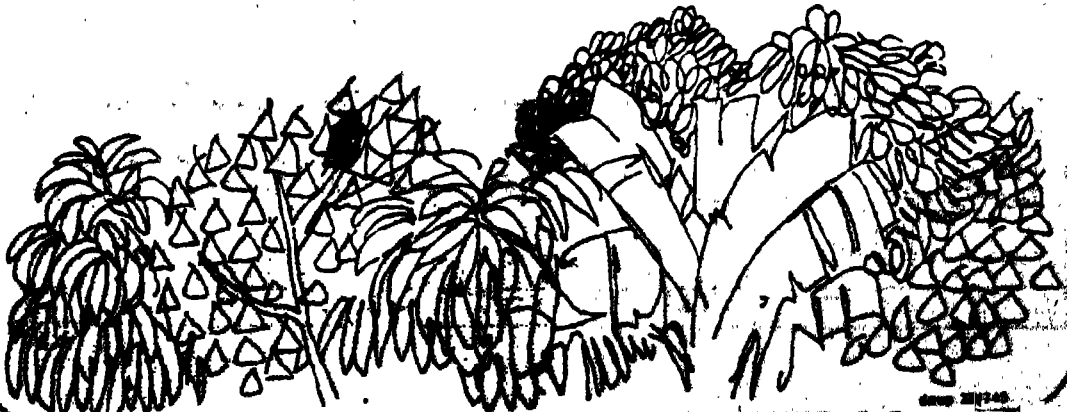
تحریک کا

نئی شاعری نمبر

جس میں اُردو کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کی دوسری سب زبانوں کے جدید شعری رجحانات پر سیر حاصل تعارفی مضامین اور منتخب جدید تخلیقات شامل ہوں گی۔

اُردو رسائل کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا خاص نمبر ہوگا

ابتدائی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں ـــــ

غزلیں

شید اردمانی

بے گانہ شہر ہے کوئی اپنا تلاش کر
جسموں کی آب وتاب میں چہرا تلاش کر

بے کار گھومنے سے کوئی فائدہ نہیں
منزل کی آرزو ہے تو رستہ تلاش کر

جس موڑ پر لٹا تھا کبھی دل کا قافلہ
جاکر وہیں پہ خوابِ تمنّا تلاش کر

گہرائی ناپنا ترے بس کا نہیں ہے کام
اے موجِ سطحِ بحر کنارا تلاش کر

کاندھے پہ چڑھ کے غیر کے شیدؔ ابصد غرور
ہرگز نہ یوں ترقی کا زینہ تلاش کر

●●

اِسلام پرویز

کہیں کہیں تو یہ منظر بدل گیا ہوگا
پہاڑ کٹ کے سمندر سے جاملا ہوگا

کسی کی پلکوں پہ جب بھی دیا جلا ہوگا
تمام شہر اجالوں سے بھر گیا ہوگا

سُلگتی یادو! کریدو نہ میرے ماضی کو
جراحتوں کا کوئی وہ بھی سلسلہ ہوگا

وہ اپنے خواب کے ہیبت زدہ اندھیرے میں
خود اپنی چیخ پہ یک لخت ڈر گیا ہوگا

تمام راستے ویران ہو چکے ہوں گے!
اب اس کا شہر بھی صحرا سے جاملا ہوگا

جدھر کا عزم سفر کر رہے ہو تم پرویزؔ
اُدھر تو اور بھی تاریک راستہ ہوگا

●●

شام رضوی

باتوں کے زخم طنز کے پتھر نہ دیکھیے
سر اُٹھ چکا تو جھک کے زمیں پر نہ دیکھیے

منظر تو دیکھیے پسِ منظر نہ دیکھیے
اُجڑے ہوئے مکان کے اندر نہ دیکھیے

یونہی اُڑاتے رہیے تہی دامنی کی خاک
مفلس سہی پہ وسعتِ تونگر نہ دیکھیے

خوش رنگ زندگی کا تو موسم گذر چکا
اب اتنی حسرتوں سے کلنڈر نہ دیکھیے

گُم راہیوں کی خاک سے روشن ہو راہِ دل
ہر لمحہ اپنے آپ کو مُڑ کر نہ دیکھیے

●●

○ ادیب پرنٹرز، رائچور، کرناٹک ○ ڈاکخانہ ہسول، سیتامڑھی، بہار ○ صابرہ منزل، درگاہ، پٹنہ

غزلیں

اعجاز اعظمی

زہرِ خاموشی کا پی کر یوں نہ گھٹ گھٹ کر مرو
غم کی بھاری رات کٹ سکتی ہے کچھ کہتے رہو

ایک پردہ کی طرح میرا پڑا رہنا ہے ٹھیک
اُٹھ گیا تو بے حجابی تم نہ شاید سہہ سکو

جو تمہیں تاریک لمحوں میں اکیلا چھوڑ دے
ایسے سائے کی رفاقت پر بھروسا مت کرو

حسرتِ دیوانگی کو کر نہ پابندِ خرد
کون جانے کل یہ سامانِ جنوں بھی ہو نہ ہو

زندگی پیاسی ہے اپنی ایک صحرا کی طرح
آس کی اُمڈی گھٹاؤ تم ہی کچھ برکھا کرو

کالی آندھی بڑھ رہی ہے تیز رفتاری کے ساتھ
اپنے گھر کی چار دیواری کو کچھ اونچا کرو

جلوۂ صبحِ فروزاں کی تمنا ہے اگر
رات کی دہلیز پر اپنے خون کا بلیدان دو

●●

سید حبیب

فغاں تھی آہ تھی نالہ تھا لب پر شکوۂ غم تھا
یہی اک سازِ دل کے واسطے مخصوص سرگم تھا

نسیمِ صبح سے سرگوشیاں پھولوں نے کچھ کی تھیں
عنادل سہمے سہمے تھے نظامِ باغ برہم تھا

اُمڈ آئی تھی بھیگی شام دنیائے محبت پر
حسیں آنچل فضائے زندگی کا اشک سے نم تھا

جلائی شمع جب بھی حسن کی بزمِ تصور میں
ڈھلی اُس دم شبِ تاریک فرحت کا وہ عالم تھا

مچل جائے فضائے صبح تیرہ شب مہک جائے
وہ تھا زلفوں کا موسم وہ رُخِ رنگیں کا عالم تھا

غمِ ہستی غمِ جاناں غمِ دنیا غمِ عقبیٰ
بتائیں کیا حبیب اب ہم عجب اس دل کا عالم تھا

●●

عارف جے پوری

لذتِ رنج و الم اور سوا مانگے ہے
زندگی کاوشِ پیہم کا صلہ مانگے ہے

اپنے ہی خون سے رنگین قبا مانگے ہے
آج دیوانہ سرِ دار یہ کیا مانگے ہے

پھر سے تاریخ کو ہے اک نئے عنواں کی تلاش
ہر ورق تذکرۂ اہلِ وفا مانگے ہے

ہوش کہتا ہے کسی راہ میں بہکیں نہ قدم
بے خودی اور ابھی لغزشِ پا مانگے ہے

کس کو اس دور میں جینے کی ہے حسرت عارفؔ
کون اس دور میں جینے کی دعا مانگے ہے

●●

○ جالال جہانی، پورٹ ڈکسن، ملائشیا ○ احمد پیر بونا ہیسر لاٹ، پونا ○ شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی، جے پور

سونو | تین نظمیں

چیخ

اکثر کچھ لوگ
جبراً مجھے تاش کی میز پر بٹھا کر
پتّے لگا کر
مجھ سے میری ایک ایک پائی
چھین لیتے ہیں

اکثر کچھ لوگ
میرے بدن سے
گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر چکھتے
اور پھر مجھے زمین پر پٹک کر
ہاتھ میں لمبا چھرا لیے
کلام پاک پڑھنے لگتے ہیں

اکثر کچھ لوگ
باہم کچھ روپیوں کی شرط بد کر
شہر کے چوک کا اونچا گھنٹا گھر
میرے سینے پر رکھ دیتے ہیں

اکثر نصف شب میرے کمرے سے
ایک دُکھ بھری چیخ ابھرتی ہے
مگر حادثاتِ حیات کے ناخونی پنجوں سے
میری راتوں کو بھی مفر نہیں ہے

●●

نو وارد سے

فریبوں کے اس شہر میں بے سود
کہاں بھٹکو گے
تم اپنے سارے سلگتے سوالات
میرے دامانِ چاک میں ڈال دو
اور کچھ شرر
تمہارے دامن میں اچھال دوں میں
اور پھر جواب سے بے نیاز تم
اپنی راہ ہو لو
میں
اپنی راہ ہو لوں

●●

خس

اگر کسی زلف کی ایک آوارہ لٹ
بار بار میری آنکھ کے آگے لہراتی ہے
تو کیا ہے
بہت سارے لوگ
پھسلتی کاروں اور ساڑان بھرتے
ہوائی جہاز کو دیکھتے ہیں
پھر بھی جیتے ہیں

●●

شیتل بھون — پیر مہانی — پٹنہ

بزمِ احباب

○ اپریل ۷۶ء کے تحریک میں 'نیا جال پرانے شکاری' کے زیرِ عنوان گوپال متل صاحب نے ایک بار پھر ادب میں ترقی پسندی کے نام لیواؤں کی اصلیت سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا ہے۔ انھیں ترقی پسندوں کے بار بار دہرائے ہوئے اس دعوے کی صحت پر شک ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور اور پریم چند نے ترقی پسندی کی حمایت میں کسی ذہنی تحفظ سے کام نہیں لیا تھا۔ ترقی پسندوں کے اس دعوے کو صحیح مان بھی لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ٹیگور اور پریم چند نے ایسا سمجھ بوجھ کر کیا تھا۔ تو ٹیگور اور پریم چند کے بعد آنے والے عہد اور اُن کے بعد جنم لینے والی نسلوں پر یہ حکم کہاں صادر ہو گیا کہ وہ بے چون و چرا اُن کے عقائد کے آگے سرِ تسلیم خم رکھیں۔ ٹیگور اور پریم چند کوئی فوق البشر نہیں تھے اور نہ ان کا کہا ہوا فرمودات پیغمبر کا درجہ رکھتا ہے کہ جس سے اختلاف، کفر قرار پائے۔

ٹیگور اور پریم چند کی یہ حمایت آج سے چار دہائی پہلے کی بات ہے۔ اس عرصے میں دنیا بڑے بڑے ذہنی اور سیاسی انقلابات سے دوچار ہو چکی ہے۔ آج کا عہد اپنے راستے کا انتخاب اور اپنی وفاداریوں کا اعلان اپنے گرد و پیش پر نظر رکھتے ہوئے کرے گا۔ اور اس سلسلے میں اسے اپنے رویے کی خودمختاری سے دستبردار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ترقی پسند تحریک نے نوآبادیاتی ہندوستان میں جنم لیا تھا۔ اور اس ہندوستان کو اپنے تمام اندرونی اور باہمی نظریاتی اختلافات سے اوپر اٹھ کر اپنی آزادی کی لڑائی میں فتح یاب ہونا تھا۔ غریبی اور معاشی استحصال کے مسئلوں کا حل بھی اسی آزادی سے وابستہ تھا۔ لہٰذا اس زمانے میں جس نے بھی آزادی کی بات کی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف اپنی آواز اٹھائی اسے ہندوستانی عوام کی حمایت حاصل ہوئی۔ ترقی پسندوں نے بھی اپنے منشور میں ایسے ہی نکات پر زور دیا تھا جو مجموعی طور پر اس زمانے میں قابلِ قبول سمجھے گئے۔ ایک بڑی جنگ ... میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا کہ چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ ٹیگور جلیانوالا باغ کے قتلِ عام کے بعد انگریزوں سے پایا ہوا خطاب واپس کر کے مجاہدانِ آزادی کی صفوں میں شامل ہو چکے تھے۔ پریم چند بھی اپنی تحریروں سے ان شعلوں کو ہوا دے رہے تھے جس سے انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال اور سماجی نابرابری کے خلاف پلنے والے جذبات کو آنچ مل رہی تھی۔ ہندوستان ایک کھولتے ابلتے لاوے کا سمندر تھا۔ بین الاقوامی سطح پر روس کے انقلاب نے سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی امیدیں پیدا کر رکھی تھیں۔ خصوصاً غلام ممالک روسی انقلاب سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ روسی کمیونزم کا اصل کردار پراسرار رومانیت کے دبیز پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ آج دنیا روس اور کمیونزم سے جتنی واقفیت رکھتی ہے، اس وقت اتنی واقف نہیں تھی۔ ان مبہم، غیر واضح اور الجھے ہوئے حالات میں اگر ٹیگور اور پریم چند نے ترقی پسندوں کی سمت اپنا جھکاؤ ظاہر کیا تو یہ ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اور یہ بات ایسی بھی نہیں کہ ہم اسے سدا کے لیے نشانِ راہ مان لیں۔ ترقی پسند تحریک غلام ہندوستان میں ادیبوں کی پہلی تنظیم تھی اور جس کا اپنا ایک منشور بھی تھا۔ آزادیِ تحریر و تقریر اور آزادیِ عمل کے فقدان کے دور میں کسی ایسی تنظیم کا ملک کے فنکاروں کی ہمدردی حاصل کر لینا بڑے کمال کی بات کیوں سمجھی جائے۔ چاہے ان ہمدردوں میں ٹیگور اور پریم چند کے نام ہی کیوں نہ ٹکے رہے ہوں اور ٹیگور اور پریم چند کی فنی عظمتوں کے باوجود یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان کا فہم و ادراک اور ان کی بصیرت اور ان کی شخصیتیں INFALLIBLE تھیں۔

اب ترقی پسندی کوئی ڈھکی چھپی چیز تو رہی نہیں۔ اور نہ یہ عہد پریم چند اور ٹیگور کا عہد ہے۔ یہ ترقی پسندوں کا ذہنی دیوالیہ پن ہے کہ وہ آج تک ان ہی ناموں کے سکے بھنا رہے ہیں۔ جب کہ خود ان کے کیمپ میں بغاوت کی لہر تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور جس کا [illegible]

اٹلی کے کمیونسٹ قائد کا وہ بیان ہے جو سوویت کمیونسٹ پارٹی کی ۲۵ ویں کانگریس کے موقع پر دیا گیا۔ اور جس میں ان تمام دعووں کو جھٹلایا گیا ہے جو آج تک ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اور اس کے آلۂ کار ترقی پسند ادیب طوطے کی رٹ کی طرح وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہیں۔ اور جن جھوٹے اور گمراہ کن دعووں کو قابلِ احترام شکل دینے کے لیے ٹیگور اور پریم چند کے ناموں کا اتنی بار استعمال ہوا ہے کہ ان ناموں کی روشنی اب مدھم سی لگنے لگی ہے۔

——— پرکاش فکری، رانچی

○ 'پٹریاٹ' نے ترقی پسندوں کی کانفرنس کی جو خبر شائع کی ہے اس میں عصمت چغتائی کا ذکر ایک شاعرہ کی حیثیت سے کیا ہے اس سے آپ کے اس نظریے کی ایک بار اور تصدیق ہوتی ہے کہ ترقی پسندوں کے سیاسی سرپرستوں کے پیشِ نظر ان کی تخلیقی سرگرمیاں نہیں بلکہ ان کی سیاسی سرگرمیاں ہیں۔ ورنہ 'پٹریاٹ' کو یہ علم ضرور ہوتا کہ عصمت چغتائی شعر نہیں کہتیں بلکہ افسانہ لکھتی ہیں۔

——— شمیم احمد، دہلی

○ آپ نے اپنے مضمون میں الامین کے سورما منٹگمری کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔ یہ ذکر ضروری تھا کہ الامین کا معرکہ دوسری عالمگیر جنگ کا اہم ترین معرکہ تھا۔ اس معرکے میں فیصلہ کن فتح کے بعد اتحادیوں کو چھوٹی موٹی پسپائیوں کا سامنا تو کرنا پڑا لیکن کوئی اہم شکست نہیں ہوئی اور ان کے قدم آگے ہی بڑھتے گئے۔ بلاشبہ شخصیت متنازعہ فیہ ہوتی ہے لیکن منٹگمری کی موافقت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ وزنی ہے جس میں ان پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اتحادیوں کی پیش قدمی کا جو نقشہ انھوں نے تیار کیا تھا اگر اس پر عمل کیا جاتا تو مشرقی یورپ آہنی پردے کے پیچھے نہ جاتا۔

——— سبھاش اگروال، کانپور

○ تحریک کے تازہ شمارے میں جناب ش۔ک۔ نظام کا مضمون (تازہ، نیا اور جدید ایک تجزیہ) خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے یہاں کئی نقاد نیا اور جدید کو اس طرح ملا دیتے ہیں کہ قاری کے لیے ان میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں نیا کے لیے NEW اور جدید کے لیے MODERN لفظ کا استعمال ہوتا ہے اور ہندی میں جدید کے لیے [illegible] لفظ مستعمل ہے۔ ہر ادب پارہ جو آدھونک ہوتا ہے وہ نیا ضرور ہوتا ہے لیکن ہر نیا ادب پارہ آدھونک نہیں ہوتا۔

——— بشیر احمد، دہلی

○ حسن رہبر کا افسانہ "ایک پل کا فاصلہ" (تحریک ما دلچسپ چیز ہے۔ اب میری ایک نظم ملاحظہ فرمائیے:

پریشانی کی ادائیگی

تھرڈ کے ڈبے میں،
بیٹھا ہے جو دروازے کے پاس،
پچھلے اسٹیشن پہ تھا بے حد اداس۔
تین گھنٹوں سے مسلسل،
بیٹھنے کے واسطے اس کو جگہ ملتی نہ تھی۔
اس نے پہلے ریل کے قانون بتلائے...
نتیجے میں صفر۔
بعد ازاں ڈبے کو جلسہ جان کر اخلاق پر تقریر کی،
بے کار ہی۔
آخرش وہ اپنی بیماری کا حیلہ کر کے،
ہر اک مرد و زن سے گڑگڑانے پہ اتر آیا...
بہرصورت وہ اب بیٹھا ہوا ہے۔
ہر مسافر کو جو دروازے کی جانب آئے،
فوراً کاٹنے کو دوڑتا ہے،
اب یہ ڈبہ بھر چکا ہے!

———

مندرجہ بالا نظم میرے مجموعۂ کلام "پانی کی زبان" (شبخون کتاب گھر ۱۹۶۷ء) میں صفحہ ۸۲ پر شائع ہو چکی ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ رہبر صاحب کی کہانی اور اس نظم میں پلاٹ مشترک ہے۔ اسے کیا کہنا چاہیے؟

——— مظفر حنفی، نئی دہلی

○ 'تحریک' کے تازہ شمارہ میں حسن رہبر صاحب کی کہانی "ایک پل کا فاصلہ" شریکِ اشاعت ہے۔ بالکل اسی موضوع اور اسی پلاٹ پر لکھی ہوئی میری کہانی "پتھر" ماہنامہ تخلیق دہلی کے خاص نمبر

مارچ ۱۹۶۳ء میں شامل ہے۔ اب میں یہ عرض نہیں کرسکتا کہ رہبر صاحب کی کہانی میری کہانی سے استفادہ ہے یا توارد کی کوئی شکل ہے۔ اگر میری کہانی سے استفادہ ہے تو پھر انھیں اخلاقی طور پر اس کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔

——— وصی اقبال، رامپور

○ محترم محمود صاحب! 'تحریک' کے تازہ شمارہ میں سفینۂ زرگل پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے یہ شکایت کی ہے کہ بعض ناقدین فضا ابن فیضی کو ان کے دو ہم عمر نازش پرتاپ گڑھی اور حرمت الاکرام کے ساتھ BRACKET کرتے رہے ہیں جو مطلقاً درست نہیں کیونکہ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں پائی جاتی۔ اس کے بعد آپ نے مزید ارشاد کیا ہے کہ فضا ابن فیضی کی شاعری کا نازش کے خطیبانہ آہنگ اور حرمت الاکرام کے وضاحتی اسلوب سے کوئی علاقہ نہیں۔

میں آپ کا ممنون ہوں کہ مجھ فردمایہ کو اپنے مبصرانہ اظہار خیال سے نوازا مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آپ نے مجھ کو فضا صاحب کے ساتھ BRACKET کیے جانے پر خفگی ظاہر کی ہے، اسی طرح کوئی اور ادیب شہیر آپ سے باہر نہ ہو جائے کہ حرمت الاکرام کا ذکر کیا ہی کیوں گیا؟ بہرحال سفینۂ زرگل سے متعلق (جو غزلیات کا مجموعہ ہے) طلب بات یہ ہے کہ اس کا موازنہ خطیبانہ آہنگ اور وضاحتی اسلوب کی حامل شاعری سے کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ یہ ظاہر ہے کہ نہ نازش کی غزلوں میں خطیبانہ آہنگ پایا جاتا ہے نہ میری غزلوں میں وضاحتی اسلوب کے عناصر دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ دراصل ان دونوں امور کا تعلق نظمیہ شاعری سے ہوتا ہے (غزل کو خطیبانہ آہنگ —— اور وضاحتی اسلوب وغیرہ بخشنے والوں کی بات جداگانہ ہے جن پر آپ بھی قربان جاتے ہیں) لہٰذا فضا صاحب کی غزلوں میں خودکلامی جیسی کوئی خوبی ہے تو اس کو اجاگر کرنے کے لیے کسی کی نظموں کو نشانہ بنانا کون سی مبصرانہ خوش ادائی ہے؟ (ایسا تو نہیں کہ آپ کو فضا صاحب کی نظموں میں بھی خودکلامی جیسی صفات نظر آگئی ہوں!) یوں آپ نے فضا صاحب کی نظموں کے آہنگ و اسلوب کے متعلق بھی اظہار خیال فرمایا ہوتا تو بہتر تھا۔

علاوہ ازیں یہ کہنے کی جسارت کہاں سے لاؤں کہ خود اپنی نظموں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو خطیبانہ آہنگ اور وضاحتی اسلوب سے آگے بڑھ کر خالص پروپیگنڈے کا ایسا انداز رکھتی ہیں جسے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں۔ بندہ نواز! میری جن چند نظموں میں وضاحتی اسلوب پایا جاتا ہے وہ اس دور کی تخلیق ہیں جب غالباً خودکلامی کی بیڑی آپ کے ہاتھ بھی نہیں لگی تھی۔ میری نظر میں نہ وضاحتی اسلوب معیوب ہے نہ صرف خودکلامی کوئی ایسی شعری صفت ہے جو کسی تخلیق کو پُروقار بنا سکے۔ (موجودہ ادبی فیشن کا یہ عطیہ اپنے ہی مویدین کے ہاتھوں کسی وقت مردود قرار دیا جاسکتا ہے) بات یہ ہے کہ وضاحتی اسلوب کو جدیدیت پرستی کی رو نے ایک ادبی گالی کی حیثیت دے دی ہے اور تبصرہ کے تیور بتاتے ہیں کہ آپ نے بھی اسے انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے، ورنہ مجھے تضیع اوقات کی ضرورت نہ پڑتی۔

یہ ضروری نہیں کہ فضا ابن فیضی کے ساتھ نازش پرتاپ گڑھی اور حرمت الاکرام کا ذکر آجائے تو ان میں کوئی قدر مشترک بھی ہو (آپ کو جن شاعروں کے ساتھ BRACKET کیا جاتا ہے، ان میں اور آپ میں کون سی قدر مشترک ہے؟) اور یہ واقعی نامناسب ہے تو آپ اس جرم کے مرتکب ناقدوں سے سختی کے ساتھ بازپرس کیجیے۔ (بلکہ جی چاہے تو ان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیجیے) تاکہ آئندہ وہ محض انھیں شاعروں کا ذکر کریں جن سے آپ خوش ہوں۔

تکلف اور انکسار برطرف، میری شاعری میں خودکلامی یا اس نوع کی فیشن ایبل صفات ہوں یا نہ ہوں لیکن دوسری شعری خصوصیات اتنی اور ایسی ہیں جن کی تحسین ہرکس و ناکس سے ممکن بھی نہیں۔ اسے امداد باہمی کی دوستانہ نوازش کی نہیں، شعر فہمی اور جوہر شناسی کی ضرورت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اردو کو ایسے ایسے ادیب و شاعر ملے ہیں جو اپنے مناصب و اختیارات، زوال پذیر شعری معیار نیز نام نہاد ناقدوں کی کرم فرمائی کے بل پر پتہ نہیں کیا کیا بنے پھرتے ہیں۔ مگر کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ ان کی غلط بخشیوں اور غلط کوشیوں کا جائزہ لے بلکہ اس کے بجائے ان شاعروں اور ادیبوں کو ہدف تضحیک بنایا جاتا ہے جن کو کسی گروہ کی فوجی امداد میسر ہے نہ ناقدوں اور تبصرہ نگاروں کی کمک کا آسرا ہے۔ اس سے بڑی ادبی دشمنی اور کیا ہوسکتی ہے!

آخر میں یہ التماس ہے کہ اس عریضہ کا حشر 'شہپر' جیسا نہ ہونے پائے جسے آپ کتابت و طباعت سے لے کر بعض دوسرے طریقوں سے بھی غارت کرنے کی سعی فرما چکے ہیں۔ آنا ہی نہیں بلکہ تبصرہ کے لیے کتابیں تک نہیں بھیجیں، البتہ دہلی کے ایک پرچے میں جسے میں نے 'شہپر' نہیں بھیج

تھی ایسا جاہلانہ تبصرہ نظر آیا جو کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں‘ کی انوکھی مثال تھا۔ خط یونہی طویل ہو چکا ہے لہٰذا تفصیل میں جانا عبث ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان سطور کو بغیر کسی ترمیم و تخفیف کے شائع فرما دیں، خواہ بعد میں اسے کسی دوسرے طریقے سے رد ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ آج کل یہ معمولی بات ہے، خصوصاً آپ جیسے صاحبانِ رسالہ کے لیے جنھیں دوسروں پر وار کرنے کی تمام تر سہولتیں میسّر ہیں۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ محترم متّل صاحبان کو میرا سلام کہہ دیں۔

——— حرمت الاکرام، مرزا پور

○ تحریک اکثر ملتا رہتا ہے اور میں اسے پڑھتا رہتا ہوں۔ اب کی بار کا شمارہ پہلے والوں سے کچھ بھاری لگا۔ کھول کر دیکھا تو ضخامت بڑھی پائی۔ کتابت، طباعت تو اچھی ہوتی ہی ہے ترتیب اور مواد بھی خوب تر ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تحریک ہی ایک ایسا ماہنامہ ہے جسے ایک معیاری ادبی رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ نظریاتی اختلاف کو ایک طرف کر کے یہ پرچہ ایک روشنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے پڑھنے کے لیے ہمیشہ درست رہوں۔

——— تاجور سامری، دہلی

○ اپریل ۷۶ء کا شمارہ نئی آب و تاب کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ کئی خوش آئند تبدیلیوں سے اس میں اور نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ معیاری ادبی پرچے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو آج کل ہندوستان سے نکل رہے ہیں۔ تحریک ان سب میں سر فہرست ہے سنجیدہ۔ اور معیاری ادب پیش کر کے یقیناً یہ ایک اہم ادبی خدمت انجام دے رہا ہے۔

کیا اچھا ہو کہ شروع میں فہرست مضامین کا سلسلہ جاری رکھیں۔

زیرِ نظر شمارہ میں ش۔ک۔ نظام کا مضمون ”تازہ، نیا، اور جدید۔ ایک تجزیہ“ لائقِ غور و فکر ہے۔ حصۂ نظم میں مظفر حنفی، کمار پاشی، قمر سنبھلی، خالد رحیم کی تخلیقات نے متاثر کیا۔ بالخصوص:

سر پر گناہگار کے پھینکا نہیں ابھی
دھبّہ کہاں ملے ہاتھ کے پتھر میں آ گیا

——— مظفر حنفی

تمام عمر جلا دھوپ دھوپ میرے لیے
تری وفا کا شجر سایہ دار تھا کتنا

——— قمر سنبھلی

پرچھائیوں کے شہر میں اب سوچنا ہی کیا؟
خود کو بدن کے خول سے باہر نکالیے

——— خالد رحیم

کہانیوں میں تجلّی (سعادت احمد) اور آئینہ (عظیم اقبال) ایک تاثر لیے ہوئے ہیں۔

——— اختر حسین اختر، رامپور

تبصرے

● **سلوٹیں** (افسانچے - ۱۹۶) مصنف : جوگندر پال -
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ، صفحات : ۱۵۲ - قیمت : سات روپے ۵۰ پیسے
ناشر : لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز ، اردو بازار ، دہلی -

اُردو انشائیے کو اُردو نثر کی غزل کہا جاتا ہے - جوگندر پال کے ان ۱۹۶ افسانچوں کو ، جنھیں وہ خود " افسانوی فکر کے ننھے مُنّے پیمانے " قرار دیتے ہیں ، غزل کے اشعار کہا جا سکتا ہے - کیونکہ ان افسانچوں میں بھی شعر کے دو مصرعوں کا سا اختصار ہے لیکن ساتھ ہی خیال کی مکمل اکائی بھی موجود ہے - اس کے علاوہ ان میں شعر کی سی رمزیت ، ایمائیت اشاریت اور لطافت بھی پائی جاتی ہے - افسانوی فکر کے ان ننھے مُنّے پیمانوں میں افسانہ نگار کے جذبات کی آنچ ، احساسات کی گرمی ، تجربات کی روشنی اور مشاہدات کی رنگا رنگی بھی ڈھل گئی ہے -

افسانچہ اور شعر کی مماثلت ذیل کی دو مثالوں سے واضح ہو جائے گی : -

افسانچے کا عنوان ہے —— فن اور حقیقت

" کہانی اس وقت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے جب وہ سچا واقعہ معلوم ہو اور سچا واقعہ اس وقت جب وہ کہانی سی لگے "

اس افسانچے کے ساتھ اب یہ شعر پڑھیے :

خواب حقیقت کا اظہار
اور حقیقت خواب کی بات

ایک چہیتے استاد نے ایک لڑکی کے لیے یہ ہجویہ شعر کہا تھا کہ :

لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

اس شعر کے ساتھ یہ افسانچہ (جنس) پڑھیے :

" ارے بھئی ! یہ کیا ؟ لڑکی ہو کر لڑکی کے ہی عشق میں گرفتار ہو گئیں "

" ہاں ! اپنی جان پہچان کے سب لڑکے مجھے معشوق لگتے ہیں ، مگر یہ لڑکی ، بڑا بھرپور مرد "

بعض افسانچے افسانہ نگار کے فن اور نظریۂ فن پر روشنی ڈالتے ہیں مثلاً : -

آنکھ مچولی —— " جب میرے ذہن میں کوئی کہانی داخل ہوتی ہے تو وہ بے شکل ہوتی ہے اور میں کسی اندھے کے مانند اپنے ذہن میں ہاتھ پھیلا پھیلا کر اسے چھو لینے کے لیے بے چین سا ہو جاتا ہوں اور جوں ہی اسے چھو لیتا ہوں وہ اپنا روپ دھار کر مسکرانے لگتی ہے اور مجھے صاف نظر آتی ہے "

ناموس —— " اپنی کسی کہانی کی بُرائی کی شکایت پا کر میں نے اس کی گوشمالی کرنا چاہی - کہانی نے جواب دیا —— " تمھاری ہی وجہ سے میں بُری بنی ، بدنام ہوئی ، پر تمھارے نام کی بندیا ماتھے پر لگائے رکھی مگر ایک تم ہو کہ نیک نامی کی فکر میں مرے جاتے ہو ، محبت خاک کرو گے "

خلائی تسخیر پر کئی افسانچے ہیں ، ان میں سے ایک :

" جب آپ کا راکٹ کرۂ زمین سے باہر خلا میں پہنچا تو آپ کو کیسا محسوس ہوا ؟ "

" مجھے محسوس ہوا ، خدا نے ایک بار پھر مجھے جنت سے باہر پھینکا ہے "

غرض یہ افسانچے گاگر میں ساگر اور کوزے میں دریا ہیں ان میں کائنات کی سی وسعت ہے ، زندگی کی سی رنگا رنگی ہے - البتہ مجھے کتاب کا نام —— سلوٹیں —— کچھ پسند نہیں آیا ، کچھ کھردرا کھردرا سا معلوم ہوتا ہے -

کتاب خوبصورت چھپی ہے - کاغذ سفید ہے اور لکھائی بھی اچھی ہے -

—————— جاوید وشسشٹ

● بدنام کتاب (طنز و مزاح)

مصنف : فکر تونسوی - سائز : $\frac{20 \times 30}{16}$ -
صفحات : ۱۹۲ - قیمت : نو روپے -
پبلشرز : لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز، اُردو بازار، دہلی -

"سرڈاروِن نے آدمی کا ارتقا بندر سے بتایا تھا، مگر مجتبیٰ حسین نے "بدنام کتاب" کے آخر میں فکر صاحب کا ارتقا بھیڑ اور گوسفند سے کیسے ثابت کر دیا ؟" یہ کہہ کر ایک طالبہ نے 'بدنام کتاب' میرے سامنے کھول کر رکھ دی، اور پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولی —— "سرا ہو سکتا ہے اُردو کے طنز و مزاح نگار کا ارتقاء واقعی بھیڑ سے ہُوا ہو"
طلبہ و طالبات کے قہقہوں سے کلاس روم گونج اُٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ 'بدنام کتاب' کے مطالعہ کا نشہ پوری طرح ان کے دل و دماغ پر چھا گیا ہے اور ان کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی ہے۔

ایک طالب علم نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا "مجتبیٰ حسین نے صحیح لکھا ہے کہ سیاسی طنز میں فکر صاحب کا جواب نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی لوگوں پر ان کے طنز کا اتنا بھی اثر نہیں ہوتا جتنا اُڑد پر سفیدی - اس لیے کہ وہ ان کے طنز کو بھیڑ کی لات سمجھتے ہیں جو گھٹنے سے نیچے ہی رہ جاتی ہے۔ کاش! فکر صاحب ایک بار بھی گدھے کی سی لات لگا دیتے تو مزہ آ جاتا"

یہ تھی 'بدنام کتاب' کی پہلی رسوائی جو میرے سامنے بھرے کلاس میں ہوئی۔

'بدنام کتاب' کا پہلا ورق اُلٹتے ہی مصنف کے شوخ و شنگ قلم کی طراری کا آغاز ہوتا ہے مثلاً اس صفحے کو ہی دیکھیے جس پر قاری کبھی توجہ نہیں دیتا :-

- پہلی اور آخری اشاعت (کیونکہ اُردو زبان میں شائع ہوئی ہے)
- تعدادِ اشاعت (ناقابلِ بیان)
- قیمت —— بطور مہنگائی الاؤنس نو روپے (امرادی [illegible] ایڈیشن کا انتظار کریں)
- سالِ اشاعت —— اُردو کا آخری دور ۱۹۷۵ء
- کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں صرف [illegible] چھپا۔

اگلے صفحے پر انتساب بھی ملاحظہ کیجیے :-
خدا کے نام —— جو مجھے دُنیا میں بھیج کر شرمندہ ہے۔

ذیل میں 'بدنام کتاب' کے کچھ جملے، بانگی کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ انھیں پڑھ کر آپ کا دل مچل اٹھے اور آپ 'بدنام کتاب' کو خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔ مثلاً :

مشاعرے میں صدارتی خطبہ —— "میں اسٹیج سیکریٹری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مشاعرے کا آغاز کریں اور مشاعرے کی حسین روایت کے مطابق پہلے گھٹیا شاعروں کو، اس کے بعد کم گھٹیا اور پھر ان سے کم گھٹیا شاعروں کو!"

قبر سے واپسی —— "صدرِ جلسہ نے پھول مالا پہناتے وقت گلوگیر لہجے میں ایک شعر پڑھا :

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حاضرین میں سے ایک ینگ ٹرک قسم کا ادیب بے اختیار پکار اُٹھا —— "ہائے! ظالم نے کتنا صحیح شعر کتنے غلط موقع پر پڑھا ہے۔"

بیویوں کی ٹریڈ یونین —— "مگر بیگم مصر تھی —— ہر دور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لیے میرا یہ مطالبہ مان لو ورنہ جنرل اسٹرائک کے لیے تیار ہو جاؤ!"

بچے کتنے ہونے چاہئیں —— "ادھر گورنمنٹ اپنی ٹکسال میں سے ایک نوٹ چھاپ کر مارکیٹ میں بھیجتی ہے اور ادھر والدین بھی اپنی ٹکسال میں سے ایک بچہ چھاپ کر مارکیٹ میں ارسال کر دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کو اس بچے پر بڑا غصہ آتا ہے کہ یہ کم بخت اب کھائے گا کہاں سے ؟ چنانچہ وہ اشتعال میں آ کر ایک اور نوٹ چھاپ دیتی ہے اور ادھر جب ایک نوٹ چھپ جانے کی خبر پہنچتی ہے تو ایک اور بچہ جھانک کر کہتا ہے، آداب عرض ہے۔

اور یوں کرنسی اور بچوں میں یہ ریس جاری ہے اور ان دونوں کے درمیان بے چارے والدین سینڈوچ بنے جا رہے ہیں۔"

میری وصیت —— "بہرکیف یہی ممکن ہے، صرف اخبار میں خبر چھپوانے کی خاطر مجھے بھی ایک سو اڑتالیس سال تک زندہ رہنے

کی حماقت کرنی پڑے۔ حماقت انسان کی مجبوری ہے، خواہش نہیں ہے۔"

کتاب کا گیٹ اپ خوبصورت ہے۔ کاغذ سفید اور کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ —— جاوید وششٹ

طبِ قدیم میں دوسرے علوم کی آمیزش

مصنف: کوثر چاند پوری۔ ناشر: ہمدرد طبیہ کالج، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی۔ قیمت: دو روپے۔

علمائے طب کے ایک بڑے گروہ کا یہ خیال رہا ہے کہ علمِ طب کے نصابات میں بعض دوسرے علوم مثلاً، فلسفہ، منطق، طبعیات اور کیمیا وغیرہ کو بھی شامل رہنا چاہیے۔ جالینوس ان کا سرگروہ ہے لیکن دوسری طرف حکیم بوعلی سینا اور ان کے متبعین کی جماعت ہے جو اس خیال کی مخالف رہی ہے۔ کوثر چاندپوری صاحب نے جو صاحبِ قلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز طبیب بھی ہیں اس کتابچے میں دونوں فریقوں کے دعاوی کا جائزہ لیا ہے اور حالاتِ زمانہ کی رعایت برتتے ہوئے آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بوعلی سینا اور ان کے متبعین کا موقف ہی درست ہے۔ تشریحِ ابدان اور تشخیصِ امراض کے بعض پرانے تصورات جو جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں غلط ثابت ہو گئے ہیں، کوثر صاحب بجا طور پر ان سے دستبرداری کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے اساسی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اطبا کو ان جدید معلومات کا کھلے دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے اور ان سے مستفید ہونا چاہیے جو ہمیں عصرِ حاضر کی میڈیکل ریسرچ کی دین ہیں۔ طب کے طلبا کے لیے اس کتابچے کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا اور ان میں وہ وسیع النظری پیدا کرے گا جو تحصیلِ علم کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے۔

—— مخمور سعیدی

شہیدِ آزادی شیخ احمد دھونڈاجی واگ

مولف: شفیع احمد شریف۔ ملنے کا پتا: ۲۴ انڈسٹریل اسٹیٹ، یادگری اسٹیشن میسور۔ قیمت: چار روپے ۵۰ پیسے

یہ ایک دلیر اور بہادر شخص دھونڈاجی واگ کی سرگزشت ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ لوٹ مار اور قزاقی میں بھی گزارا۔ سلطان ٹیپو سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا اور شیخ احمد کا نام اختیار کیا۔ سلطان ٹیپو کی وفات کے بعد اس نے ایک بڑے فوجی سردار کی حیثیت حاصل کر لی۔ بہت سی معرکہ آرائیاں کیں اور ان میں سے اکثر میں کامیاب رہا۔ آخر میں اس کا مقابلہ انگریزی افواج سے ہوا، یہاں بھی اس نے پامردی دکھائی لیکن آخر میں اسے شکست ہوئی اور وہ جان سے مارا گیا۔ شفیع احمد شریف صاحب نے نہ صرف اس کی معرکہ آرائیوں کا حال تفصیل سے قلمبند کیا ہے بلکہ اس کے عروج و زوال کے اسباب سے بھی تاریخی حقائق کی روشنی میں بحث کی ہے۔ اس بحث کے نتیجے میں اس عہد کی تاریخ کے کئی مخفی گوشے سامنے آئے ہیں لیکن جہاں تک دھونڈاجی واگ کا تعلق ہے وہ ایک بہادر مہم جو سردار کی حیثیت سے تو ابھرتا ہے لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنے یا منتشر ملکی طاقتوں کو متحد کرنے کا کوئی واضح منصوبہ اس کے ذہن میں موجود تھا۔

—— مخمور سعیدی

خیالوں کے محل

مصنف: خالد بدایونی۔ ناشر: نورجہاں نور، آشیانہ منزل، محلہ کنندگراں، بدایوں
قیمت: تین روپے

جناب خالد بدایونی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو پاکٹ بک سائز میں شائع کیا گیا ہے۔ غزلوں میں اچھی شاعری کے امکانات صاف نظر آتے ہیں۔ ان میں تجربے کی تازگی بھی ہے اور اظہار کا سلیقہ بھی۔

—— رزاق ارشد

رباعیاتِ ادب

مصنف اور ناشر: ادیب فیضی
محلہ کٹرہ، رامپور۔

یہ رامپور کے بزرگ شاعر جنابِ ادب فیضی کی رباعیوں کا مجموعہ ہے، آخر میں ایک مثنوی بھی شامل کر دی گئی ہے۔ کتابت اتنی خراب ہے کہ کتاب کھول کر فوراً ہی بند کر دینے کو جی چاہتا ہے ورنہ ادب صاحب کا کلام کشش رکھتا ہے۔

——— رزاق ارشد

سچے الفاظ

مصنف: ہمراہ بارہمولوی۔ قیمت: تین روپے۔ ملنے کا پتہ: مکان نمبر ۳۰۔ محلہ سید کریم صاحب بارہمولہ، کشمیر۔

یہ جناب ہمراہ بارہمولوی کی نثری نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ ہمراہ صاحب ایک سوچنے والا ذہن رکھتے ہیں اور اپنے نتائج فکر کو مناسب الفاظ میں پیش کر دینے کا سلیقہ بھی انھیں حاصل ہے۔ بعض نظموں میں الجھاؤ ضرور نظر آتا ہے جو عجز بیاں کا مظہر ہے۔

——— رزاق ارشد

زلف و زنجیر کی کہانیاں

مولف: ارشد القادری
ناشر: دار الاشاعت اہلِ سنت ۱/۱۰۱ بلیلیس روڈ، ہوڑہ ۱،

اس مختصر سے کتابچے میں ارشد القادری صاحب نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے چند سبق آموز واقعات جو معتبر راویوں سے منقول ہیں، جمع کر دیے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان میں خطیبانہ جوش و خروش پایا جاتا ہے جو قاری کے ذہن پر دیر پا نقوش چاہے نہ چھوڑے وقتی طور پر اسے اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے
قیمت درج نہیں۔

——— رزاق ارشد

خسرو و شیریں

مصنف ڈاکٹر سمیع الحق۔
ناشر: مظہر پبلشرز، کریم منزل، پتھل کدوا ارانچی۔ قیمت: ساڑھے چار روپے۔

یہ ایک ڈراما ہے جو حضرت امیر خسرو کی مثنوی خسرو شیریں پر مبنی ہے مصنف اس مشہور ایرانی قصے میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں لیکن افراد قصہ کی زیادہ تعداد اور مختلف مناظر کی غیر ہم آہنگی کی وجہ سے اسے اسٹیج پر پیش کرنا بہت مشکل ہوگا

——— رزاق ارشد

تپشِ شوق

مصنف: بال کرشن مضطر،
تقسیم کار: سنگم کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔
قیمت: تین روپے

جناب بال کرشن مضطر کی غزلیات کا مجموعہ ہے غزلیں ایک مانوس فضا کی حامل ہیں اور قاری کو نشاطِ مطالعہ سے ہمکنار کرتی ہیں۔

——— رزاق ارشد

نئے پھول

مولف: مجیب بستوی۔ ناشر: انجمن افکار ادب، سمریانواں بازار، ضلع بستی۔ قیمت: دو روپے۔

یہ چند شعرا کا جو زیادہ معروف نہیں مختصر سا تذکرہ ہے جس میں منتخب کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس قسم کے تذکروں کی دستاویزی اہمیت مسلمہ ہے۔

——— رزاق ارشد

مانگے کا اُجالا

اُردو کا رواج ٹیپو سلطان کی فوج میں

کتب خانہ دفترِ ہند (INDIA OFFICE LIBRARY) میں ۲۷۳۸ء تا ۲۷۵۹ء ایک کتاب کے اکتیس نسخے مکمل اور نامکمل دونوں قسم کے ہیں جس کا نام "فتح المجاہدین" ہے۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ حیدرآباد میں بھی دستیاب ہوا جس کے تفصیلی معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فوجی اصول و قواعد پر مشتمل ہے۔ فوجی احکام فارسی میں اور جنگی اشعار "اردو" میں مندرج ہیں۔

مولفِ کتاب کا نام زین العابدین ہے۔ دفترِ ہند کے نسخے میں "موسوی" کا لفظ بھی شامل ہے۔ وہ بہت عرصے تک مدراس اور بالاگھاٹ میں قیام کرنے کے بعد ٹیپو سلطان کا مصاحب بنا۔ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ ۱۱۷۰ء میں تیموری سلطنت بعض نوکروں کی 'نمک حرامی' کے باعث اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ اہلِ مغرب نے جو سواحلِ ہند کے کوٹھی دار اور تجارت کے بہانے سے ہمیشہ کمین میں رہتے تھے بعض غداروں کو وسیلہ بنا کر 'ملک گیری' اور 'ملک ستانی' شروع کی اور تمام مملکت بنگالہ اور کرناٹک کا کچھ حصہ اور بندرگاہ سورت اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور حالت یہاں تک ناگفتہ بہ ہو گئی کہ رعایا لوٹی جانے لگی اور مسلمان قیدی چین و افریقہ میں غلام بنا کر فروخت کیے جانے لگے۔

اس کے بعد وہ ٹیپو سلطان کی تخت نشینی کو اس ظلم و ستم اور خرابی کا علاج بتا کر بیان کرتا ہے کہ یورپیوں کی جنگ میں برتری اور غلبہ کا اصلی راز ان کے توپ و تفنگ میں ہے اس لیے بادشاہ نے توپ خانہ اور طریقہ حملہ اور 'سپہ آرائی' میں نظام قائم کیا جن کی وجہ سے انھیں فتحیابی حاصل ہوتی رہی۔ پہلے یورپی فوج کی تعریف اور پھر اپنے بادشاہ کے انتظام کی تعریف سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی قواعد ہی کو مناسب ترمیم کے بعد رائج کر لیا گیا تھا۔

دیباچے کے آخر میں لکھتا ہے کہ ۱۱۹۷ء میں راست شاہی حکم پہنچا کہ وہ سلطنت کے فوجی قواعد کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرے تاکہ یہ "علم شریف و ہنر لطیف" جو ہندوستان میں نایاب و مفقود ہے رواج پا کر اسلامی فوجوں کی فتح کا باعث ہو۔

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے مگر انڈیا آفس کے مکمل نسخے ۲۷۳۸ء کی فہرست سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کتاب مختصر اور خلاصہ ہے چنانچہ لندن کے نسخے میں پہلا باب "در میان مسائل (مسائل READ) عقائد و نماز وغیرہ و شامل (مسائل) منع تمباکو و نمک حرامی و ترک جہاد وغیرہ" ہے۔ "گمپیشِ نظر نسخے میں تمباکو کی ممانعت کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ اس کے سوا انڈیا آفس کا نسخہ ۲۷۵۹ء جو صرف اقتباس ہے اس میں پہلے دو صفحے ایک حساب میں ہیں جسے گو شرعی کہتے ہیں اور آخری بارہ ورق حسابی جدولوں پر مشتمل ہیں۔ اس باب میں اولاً اسلام و ایمان کی تعریف احادیث کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اس کے بعد اسلامی معتقدات یعنی خدا رسول، فرشتے، قیامت، پیغمبر، قضا و قدر وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ مسائلِ جہاد اس باب کا آخری عنوان ہے۔ اس میں قرآنی آیتیں، احادیثِ نبوی ؐ اور (غالباً) ذاتی خیالات مقدس جنگ یعنی جہاد کے متعلق نقل کرتا ہے ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی اسلامی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جب کہ ان کے پاس حکومت تھی اور ان پر ایسا بادشاہ حکمرانی کرتا تھا جو توسیع مملکت کا شائق اور جنگ کا دھنی تھا۔ قرآن و حدیث شریف کو جیسا کہ ہر بلیغ عبارت میں ہوتا ہے، مولفِ کتاب بھی تاویل و توضیح کے ذریعہ اپنے دعوے کے ثبوت میں

پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد چند سیاسی جرائم کا تذکرہ کرتا ہے کہ سازش اور خیانت وغیرہ وغیرہ کی کیا سزا ہے۔ پھر شرعی جرائم اور گناہوں کا اور آخر میں کسی بادشاہ کی نااہلیت اور وفاداری سلطنت کے مسائل پر اس باب کو ختم کرتا ہے۔

باب سوم تدابیر حرب کے بیان میں ہے۔ اور باب اول کے بمقابل بہت مختصر ہے مگر اس سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے اصول جنگ کیا تھے فوج کو کس طرح آراستہ کرنا چاہیے، جنگل یا میدان یا پہاڑ یا چشمہ مقام جنگ ہوں تو آراستگی میں کیا تفاوت ہوتا ہے۔ توپ و بندوق سے کس طرح مناسب کام لیا جا سکتا ہے "جنگ صعب" اور "جنگ قزاقی" کب اور کس طرح شروع کرنی چاہیے۔ شب خون دشمن کی فوج کے میدان میں خیمہ زن ہونے کے وقت کرنا کیوں مفید ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے۔ دشمن کی فوج زیادہ ہو تو کس طرح مقابلہ کرنا چاہیے اور کم ہو تو کن باتوں سے خبردار رہنا ضروری ہے، سوار فوج کہاں رہے اور فوج کی کس طرح تقسیم ہو۔ کوچ کا طریقہ اور اس کی ضروریات اور قابل لحاظ باتیں، افسر اعلیٰ موقع و محل کا خود معائنہ کرکے اس علم سے جنگ میں کس طرح فوج کی رہنمائی کرے۔ ہوا کے رخ کا جنگ کے وقت لحاظ، افسر اعلیٰ کے قتل پر اس کی فوری جانشینی اور بلا تاثر جنگ کا جاری رکھنا، قلعہ بند ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیے، پسپائی اور واپسی، سپاہ کی تعداد میں کمی و زیادتی اور دشمن کی تعداد کے لحاظ سے جنگ شروع کرنے کا وقت، جاسوسی یا جنگ کی ابتدا خود نہ کرنی چاہیے، قلعہ شکنی میں اولاً کن حصوں پر گولہ باری ہو وغیرہ۔

باب چہارم "حکم نامہ بنام سربخشی و متصدیان تعلقہ کچہری حضور" میں ہے۔ انڈیا آفس کے پہلے نسخے میں "وغیرہا" رہ گیا ہے اور علٰحدہ۲۷ میں "بنام سپہ دار وغیرہا" ہے۔ اس باب میں اولاً نمک حرامی کے اقسام بتا کر ممانعت کی گئی ہے کہ حکام ان سے باز رہیں اور اپنے ماتحتوں پر بھی نگرانی رکھیں۔ چنانچہ سپاہیوں کا "چہرا" یعنے حلیہ لکھنے اور ماہ بماہ تنخواہ تقسیم کرنے، پریڈ اور قواعد کے ذریعے سپاہ کو مستعد رکھنے اور سامان حرب کی نگہداشت اور اس کے مہیا رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ سامان حرب و ضرب توپ اور گولہ بارود کے علاوہ "بندوق اور قرابین طرنک وغیرہ" کی نگرانی ہو اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مرمت سرکارخانے میں فوراً کرائیں۔

فوجی اصطلاحات میں فارسی الفاظ کے رواج کا حکم اور امر و نہی ایزدی و احکام حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ کا جو ترجمہ عربی سے کرایا گیا ہے اس پر عمل و رواج کا خیال رکھیں اور خلاف ورزی پر فوراً سزا دیں۔

اس کے بعد سام ریرپلے یا قواعد کا ذکر ہے۔ استادہ کہ صفیں یک یک، راست پشت گرد، چپ پشت گرد، دو پنج گام رو، جلد قدم، آہستہ قدم، قدم بزن، باش، برابر راست بین اور اسی قسم کی چند اصطلاحات ہیں جو غالباً فرانسیسی یا انگریزی کا ترجمہ ہیں۔

ہر قسم کی فوج کے لیے علیحدہ علیحدہ قواعد تھے، قواعد چلیپا رنگروٹوں کے لیے ہے قواعد غیر اوقات مقرری گردش، گشت، جنگ دو بازو اور جن کی تین قسمیں ہیں / جنگ دو طرف، قواعد توپ، قواعد چہار توپ، قواعد نیزہ، قواعد شمشیر اور باب قدم میں پورے احکام پریڈ موجود ہیں۔

اس کے آگے یزک دار، وقعدار، جمعدار، سرخیل، جوقدار، رسالدار، سپہ دار، بخشی، متصدی لکھے گئے ہیں جن میں ان کے فرائض کی تشریح کرکے قصور اور سزا کی مقدار کا بھی تذکرہ ہوا ہے سب سے چھوٹا عہدہ یزک دار اور سب سے بڑا اسپہدار ہے اور درجہ بدرجہ ترقی مل سکتی ہے۔ اور قاعدۂ تبدیل یزک (پہرہ) اور قاعدۂ کیوان اول اور قاعدۂ تبدیل منقلا (گارڈ) اور قاعدۂ چاشت و شان (یعنی صبح و شام) کی پوری تفصیل ہے۔ پھر ایک دلچسپ عنوان ہے جو پورا نقل کیا جاتا ہے یہ محافظ اور رہگیروں کے متعلق ہے:

"قاعدۂ سوال و جواب یزک دار و مردم رہگذر"

سوال: کیست؟ جواب: سرکار! — سوال: کے سرکار؟ جواب حیدری سرکار — سوال: کے جوق،

جواب: فلاں جوق (فلاں کی جگہ نام لینا چاہیے)

تعطیل اور جنگ کے وقت حفاظت و نگرانی، اور رخصت کے احکام اور سزا کے بعد یہ باب ختم ہوتا ہے۔

پانچواں باب تفویضِ خدمات میں ہے یعنی ترقی دفعہ وار اس سلسلے میں بیان ہوا ہے کہ یکایک ترقی ایک دم نہ دینی چاہیے بلکہ پہلے کو دفعدار، پھر جمعدار، پھر سرخیل، پھر جوق دار، پھر رسالدار، پھر سالار یعنی درمیان کے عہدہ داروں کا علم ہونا چاہیے۔ لائق سرخیلوں کو لیاقت اور شایستگی کے بعد ترقی دینا مناسب ہے اور کوئی شخص خواہ کتنا ہی عمدہ مزاج کیوں نہ ہو اس کو یکدم بڑے عہدے پر ترقی نہ دینی چاہیے بلکہ درجہ بدرجہ لیکن جلد جلد ترقی دی جاسکتی ہے۔

رخصت (یعنی نام، سلام، رخصت (اختتام پریڈ) کے بعد "سرکردن توپ ہائے خوشی" کا بیان ہے کہ عید رمضان ذی الحجہ اور اپنی جماعت کی فتح پر گیارہ توپ، شاہی فتح پر ایک سو دفعہ غروبِ آفتاب اور دروازے بند ہونے کے وقت کی اور طلوعِ آفتاب اور دروازے کھولنے کی اطلاع میں ایک ایک توپ چلائی جاتی تھی۔ ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ اپنے سے صرف ایک درجہ کم یا زائد کے عہدہ دار کے ساتھ مل کر کھانا کھا سکتا تھا۔ اس سے زیادہ پر تنبیہہ کی جاتی تھی۔

اردو اشعار کی زبان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ٹیپو سلطانی عہد سے زیادہ بعد کی نہیں جیسا کہ ناظرین پر بھی جب اسی عہد کے اُردو اشعار کا مطالعہ کریں گے تو واضح ہو جائے گا۔ غزلوں کے آخر میں "نام ہائی دوازدہ ماہے" کی سرخی سے یہ بارہ مہینے ہیں "احمدی، بہاری، جعفری، درانی، ہاشمی، واصلی، زبرجدی، حیدری، طلوعی، یوسفی، ایزدی، بیانی۔ اسی عہد کی بعض کتابوں کے آخر میں جن کا تذکرہ فہرستِ کتب خانہ انڈیا آفس میں نظر سے گذرا ٹیپو سلطان کا نام اور اس کے بعد حکم کی تاریخ میں یہی مہینے لکھے ہوئے ہیں اقتصادی ضروریات سے شمسی مہینوں کے رواج کی ضرورت تھی۔ اور قمری مہینوں کی بجائے یہ مہینے منظور کیے گئے (اسی سلسلے میں حیدر آباد کے فصلی مہینوں کے متعلق اشارہ کرنا ناموزوں نہ ہوگا کہ حیدر آباد میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔)

فوجی گانوں میں جو بیتیں سب سے زیادہ مستعمل تھیں ان میں سے چند یہ ہیں:

غزل۔ وقت آہستہ قدم پشتو

ملک ہندوستان میں دیں کا وہی سلطان ہے
غرق جس کے آبِ خنجر میں فرنگستان ہے
کیا ہے نسبت جاہ و حشمت میں سکندر سیں مجھے
بارہ گاہِ قدر کا دالا ترا دربان ہے
ہے وہی انسانِ کامل جس میں ہو معنی کی بو
نقشِ دیبائی وگرنہ صورتِ انسان ہے

مذکورہ بالا غزل غالباً آہستہ روی کے وقت بجائی جاتی تھی اور مندرجہ ذیل تیز روی کے وقت:

غزل۔ وقت جلد قدم ہندول

بجا ہے کہیے اسی کو شہِ خواص و عام
کہ جس کے رعب سیں لرزاں ہے آفتاب مدام
لقب ہوا اُسے سلطانِ دیں اسی خاطر
کہ ہے مروّجِ شرع اور حامیٔ اسلام
جہاد یاں تئیں رائج کہ عہد میں جس کے
نہ دیکھی تیغ کبھو خواب میں بھی روئی نیام

غالباً نیزوں سے لڑائی کے وقت بجائی جاتی تھی:

غزل۔ وقتِ ضرب سناں جنگلہ

یا الٰہی رہے تا حشر وہ سلطان جہاں
جس کے ہے عدل سیں سرسبز گلستانِ جہاں
سرنوشت آیۂ فتح است عَلَم کے جس کے
کیوں نہ دیں باج اُسے جملہ شاہانِ جہاں
حیدری رسم کو احیا کرے عالم میں کوئی
ہے بجا کہیے اگر اس کے تئیں جانِ جہاں

غزل وقتِ توپ شب کہ یک پاس گذشتہ می زنند۔

کلیان

ازل سے ہو جو مستقلے بظلِ الٰہی
اُسی سے سیکھے فریدون رسم جمجاہی
رہے نہ یوں بر خورشید میں قبائے فلک
جو چُست ہے تیرے جامہ پہ خلعت شاہی
الاہی جب تیئں قائم ہے آسمان زمین
مطیع حکم ہو اس کا زماہ تا ماہی

منتشر سپاہیوں کو جمع کرنے پر :-

غزل۔ جہت اجتماع مردم متفرق کھماج

لئے آفتاب ! جلوہ دہِ آسمانِ عدل
شاداب ہے ترے سے سدا گلستانِ عدل
بے لکنتِ دروغ کہے ہے یہ حرفِ راست
بہتر ترے سیں کون ہو شاہِ جہانِ عدل
جز وصف تیری ذات کا ہرگز سنے نہ کوئی
گویا بیانِ قال سیں گر ہو زبانِ عدل

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (سب رس، حیدر آباد)

ریاض خیر آبادی

سن میں مجھ سے سالہا سال بڑے اور میرے والد کے ملنے والوں میں تھے، لیکن اپنی شفقت و کرم سے مجھے اپنے برابر کا بنا لیا تھا۔ بے تکلف ہر قسم کی گفتگو کرتے اور زبان کے مسائل میں میری ہمت افزائی بھی کرتے رہتے۔

ریاض الاخبار ہفتہ میں دو بار میرے بچپن میں گورکھپور سے نکلتا تھا۔ اور اس کم سنی میں زبان کا تھوڑا بہت مذاق جو درست ہوا اس کی درستی میں خاصہ بڑا دخل اسی اخبار کو تھا۔ اگرچہ مدتوں اپنی بے شعوری میں اس کا شعور ہی نہ کر سکا۔ اس وقت ریاض کی عین جوانی تھی اور اپنی خوشنما بل کھائی مونچھوں کے ساتھ مجسم و مکمل جوان رعنا بنے ہوئے تھے۔ رہنے والے قصبۂ خیر آباد (ضلع سیتاپور) کے تھے لیکن اب گورکھپور میں رہ پڑے تھے اور عام طور سے گورکھپور ہی کے سمجھے جاتے تھے۔

شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اور ریاض کا شمار اُستادوں میں تھا۔ اپنے میں سمجھ اس وقت کیا تھی۔ بس اتنی سمجھ آ گئی تھی کہ یہ شراب کا مضمون باندھنے میں طاق ہیں۔ انگریزی سے ریاض کا اپنایا ہوا اردو ناول دو ضخیم جلدوں میں حرم سرا کے نام سے پڑھ ڈالا۔ اور ان کے جیبی اخبار فتنہ عطر فتنہ بھی نظر سے گزرے اور مزہ دینے لگے۔ بی اے کر کے تو ذاتی پینگ بڑھے اور اب ان کی شاعری بھی دل میں گھر کرنے لگی۔ مراسلت شروع ہو گئی۔ کبھی کبھی میرا دل اور میری عزت بڑھانے کو مجھ سے اس طرح کے سوالات کر دیتے کہ "اگر دو عربی لفظ فارسی ترکیب کے ساتھ آپ اردو میں استعمال کی اجازت دیتے ہیں" ـــــــ ایک مرتبہ داغ کی ایک غزل کے اس مطلع پر لے دے شروع ہوئی :

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا
میں سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

اعتراض دوسرے مصرعے پر ہوا کہ محض "کیا کرنا" خلاف محاورہ ہے "ہے" کا اضافہ ضروری تھا۔ ریاض نے بہ کمال تہذیب و شائستگی اخبار میں بتایا کہ دوسرا مصرعہ میں صحیح نہ پڑھ سکا۔ داغ کا نجی خط ریاض کے نام آیا کہ اخباری بحث میں تو میں پڑتا نہیں ہاں آپ کے علم کے لیے لکھتا ہوں کہ دوسرا مصرعہ میرا ہی ہے اور میں نے محاورہ کو صحیح باندھا ہے۔

ریاض اپنا جواب مجھ سے نقل کرتے تھے کہ "آپ کی زبان پر مجھے مجال اعتراض کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہی ہے کہ وہ آپ کی زبان ہے بھی۔ اگر وہ آپ کی زبان ہے تو آپ اپنے ہی کلام سے اس کی سند پیش کریں مجھے کسی دوسرے کی سند کی حاجت نہیں میرا خیال یہ ہے کہ آپ حیدر آباد میں اتنے دن رہتے رہتے محض بے خیالی میں اس طرح نظم کر گئے۔ اگر آپ کی زبان یہی ہوتی تو اسے کہیں اور بھی تو لاتے"۔

ریاض کے بڑے قدردان گورکھپور کے [illegible] مولوی

سبحان خاں تھے۔ ایک مرتبہ ایک مطلع پر خوش ہو کر ایک ہزار کی رقم انعام دے دی (آج کے حساب سے یہ رقم دس ہزار کی ہوگی) مطلع جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ تھا ؂

اتری جو آسمان سے تھی کل اٹھا تو لا
طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

ریاض آخر عمر میں خیر آباد میں خانہ نشین ہو گئے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں سے ماہوار پنشن مقرر ہو گئی تھی۔ آخر وقت تک باغ و بہار سے بنے رہے۔ ان کے ایک بڑے معتقد اور فاضل وقت قاضی تلمذ حسین گورکھپوری بھی تھے۔ انھوں نے ان کی وفات کے بعد ان کا مجموعہ کلام ریاض رضواں کے نام سے بڑی تلاش و اہتمام سے شائع کیا۔ عام پڑھنے والوں کا خیال ہوگا کہ وہ بڑے شرابی ہوں گے۔ حالانکہ واقعتہً شراب کے قریب بھی کبھی نہیں گئے تھے۔ آخر میں سفید داڑھی خوب بڑھا لی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں وفات ہوئی۔

عبد الماجد دریا آبادی (صدق جدید، لکھنؤ)

بقیہ: سیدھی راہ پر بھٹکے ہوئے

—— ہاں، وہ چھوٹے حکیم صاحب ہی ہیں۔ آپ باور نہ کیجیے۔ یہ چھوٹے حکیم صاحب نے ابھی ابھی مجھے غلط نہیں بتایا کہ اوروں کے ساتھ وہ اپنے ہی جنازے کے جلوس میں شریک ہیں! —— نہیں، مجھے ٹوکیے مت —— میں —— میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا لیکن میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں —— کیسے سمجھاؤں؟ دیکھیے، ہم سب پر نظر دوڑائیے۔ ہماری ترکی ٹوپیوں کے پھندنے ضرور ہل رہے ہیں لیکن جنازے کے سارے جلوس میں کسی ایک کو بھی سانس لینے پر قدرت نہیں رہی اور —— اور ہم سب مُردے اپنی ساکن اور پاک زندگی کو کفن میں لپیٹ کر قبرستان لیے جا رہے ہیں!

بقیہ: دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

کرسکتا کہ ایک بار کمیونسٹ پارٹی جمہوری طریقوں سے برسرِ اقتدار آجائے تو وہ اپنی طاقت کو پھر سے آزمانے کے لیے دوبارہ کبھی انتخاب کرائے گی۔ اس قسم کا اقدام پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے مارکسی فلسفے کے منافی ہی نہ ہوگا بلکہ خالص احمقانہ اقدام بھی ہوگا اور کمیونسٹوں کو آپ جو چاہیں کہہ لیں وہ احمق ہرگز نہیں ہیں"

یہ سمجھنا بھی کوتاہ اندیشی کے مترادف ہوگا کہ فرانس اور اٹلی کی کمیونسٹ پارٹیاں آزادروی کے جو مطالبے کر رہی ہیں اس میں ماسکو کی تائید شامل نہیں۔ زبانی طور پر ماسکو چاہے کچھ بھی کہتا رہے۔ جنگ کے بعد مشرقی یورپ میں جو کچھ ہوا وہ ماسکو کی طے شدہ پالیسی کا نتیجہ تھا۔ ماسکو کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ کمیونسٹ حکومت پر اس طرح قبضہ کریں کہ ان ملکوں کے شہریوں اور مغربی طاقتوں کو یہ احساس ہی نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔ ماسکو اس انداز سے انقلاب لانا چاہتا تھا کہ انقلاب انقلاب ہی نظر نہ آئے اس مقصد کے لیے شروع شروع مشترکہ حکومتیں بنائی گئیں۔ ان میں امرا، پادریوں، فوجی افسروں اور پروفیسروں جیسے معززین کو شامل کیا گیا۔ رومانیہ میں کنگ مائیکل مقبول تھا۔ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کو کچھ دن اسی کو برقرار رکھا گیا۔ چیکوسلواکیہ میں ڈاکٹر وینز کو بدستور صدر رہنے دیا گیا اور جان مسارک کو وزیر خارجہ کا عہدہ سونپا گیا۔ کمیونسٹوں کے ان سابق حلیفوں کا انجام سبھی کو معلوم ہے۔ اٹلی اور فرانس میں بھی کمیونسٹوں کے حلیفوں کا حشر، اگر وہ چوکنا نہیں رہے، اس سے مختلف نہیں ہوگا۔

خبرنامہ

● "لیکھک منچ، جودھپور" کی جانب سے ایک افسانوی مقابلے کا اہتمام کیا گیا اور سوجنا کیندر میں ایک مخصوص نشست میں نقد انعام تقسیم کیے گئے۔

نشست کا آغاز کرتے ہوئے "لیکھک منچ" کے کنوینر اکشے گوجا نے کہا کہ یہ ایک کھلا منچ ہے۔ اردو، ہندی اور راجستھانی زبانوں کی مختلف اصنافِ ادب پر بحث و مباحثہ کرنا، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور پرانے لکھنے والوں کی جانچ پرکھ کرنا بھی اس کا مقصد ہے۔

ہندی کوی لکشمی کانت جوشی نے کہا کہ اس انعامی مقابلے کا مقصد مقامی افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی تھا۔ انھوں نے بتایا کہ انعام کی رقم ایک سو دس روپے ہے جو لاچو میموریل کالج کے لکچرر رتن لعل ماتھر صاحب نے تین سال تک دیتے رہنے کا اعلان کیا ہے۔

پہلا انعام مبلغ پچاس روپے یوگیندر کمار دوے کی کہانی (پربندھ) پر دیا گیا۔ دوسرا انعام تیس روپے کماری کملا کو ان کی کہانی "ایک نئی راہ" پر اور تیسرا انعام بیس روپے جتندر جالوری کو "بلبلیں" کہانی پر دیا گیا۔ حوصلہ افزائی کے انعام (دس روپے) کے لیے پروین ماتھر کی بلا عنوان کہانی کو چُنا گیا۔

اس انعامی مقابلے کے جج کی حیثیت سے حبیب کیفی نے نئے لکھنے والوں کو دوستانہ مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ انھیں کوما، فُل اسٹاپ وغیرہ کا دھیان رکھنا چاہیے۔ جملوں کی ساخت کو سمجھنا چاہیے۔ زبان کے معاملے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لکھنے والوں کو اپنی تخلیقات کو ایک قاری کی حیثیت سے بھی پڑھنا چاہیے۔ اس کے لیے انھیں خود اپنی تنقید سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔

جناب کیفی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں کو اس انعامی مقابلے میں کوئی انعام نہیں ملا، انھیں مایوس یا ناامید نہیں ہونا چاہیے بلکہ انھیں اپنے فن کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

مسندِ صدارت سے بولتے ہوئے مقامی پی۔ آر۔ او۔ اور ہندی ادیب جناب مدن موہن شرما نے کہا کہ اس قسم کے ادبی پروگراموں کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

● ۱۷ر اور ۲۵ر مارچ کو راجستھان میں دو بڑے مشاعرے ہوئے۔ پہلا مشاعرہ ۱۷ر مارچ کی شب میں نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی سوائی مادھوپور کی طرف سے ایک مقامی ہائر سکنڈری اسکول کے وسیع احاطے میں ہوا۔ اس مشاعرے کے کنوینر سید اختر علی صاحب تھے۔ صدارت راجستھان کے اسٹیٹ منسٹر فار ایجوکیشن جناب فاروق حسن صاحب نے فرمائی۔ موصوف مشاعرے کے آغاز سے اختتام تک مسندِ صدارت پر موجود رہے اور تمام شعرا کا کلام پوری دلچسپی اور توجہ سے سُنا۔ میر مشاعرہ کے فرائض جنابِ راہی شہابی نے انجام دیے۔ چالیس سے زیادہ شعرا اور شاعرات نے اپنا کلام سنایا اور مشاعرہ صبح چار بجے تک جاری رہا۔ سامعین کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ اس سلسلے کو مزید طول دینا چاہتے تھے اور جب مشاعرے کے اختتام کا اعلان ہوا تو وہ بادلِ ناخواستہ ہی اپنی نشستوں سے اٹھے۔

دوسرا مشاعرہ ۲۵ر مارچ کی صبح کو کلکٹری ٹونک کے کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ ۲۴ر مارچ کی شب میں ہونا تھا لیکن اچانک بادو باراں کا طوفان آجانے کی وجہ سے عین وقت پر پروگرام بدلنا پڑا۔ مشاعرے کے کنوینر ہری شنکر شرما صاحب تھے جو ایک ادب دوست افسر ہیں۔ ان کے علاوہ ضلع کلکٹر صاحب جو خود بھی ہندی زبان کے اچھے شاعر ہیں، بسمل سعیدی صاحب، جگن ناتھ

یں مقیم ہیں۔ دل اَلوِبی صاحب اور صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب کی کوششوں کا بھی اس مشاعرے کی کامیابی میں بڑا دخل رہا۔ صدارت راجستھان کے اسٹیٹ منسٹر فار سوشل ویلفیئر جناب بنواری لال صاحب نے فرمائی اور راجستھان کے اسٹیٹ منسٹر فار ایجوکیشن جناب فاروق حسن صاحب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ دونوں حضرات مشاعرے میں شروع سے آخر تک تشریف فرما رہے اور آخر میں دونوں نے سامعین کو خطاب کیا۔ فاروق حسن صاحب نے دلپذیر پیرائے میں شعرا کو یہ یاد دلایا کہ انھیں ملک اور قوم کا ضمیر سمجھا جاتا ہے اور اپنے تاثرات و محسوسات کا بے لاگ اور سچا اظہار ہی ان کا اصل منصب ہے۔ بنواری لال صاحب کی تقریر مشاعرے پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی تھی اور اردو شاعری کے حسن اور دلکشی کی ایک بالغ نظرانہ توضیح بھی۔

مشاعرے میں راجستھان اور بیرونِ راجستھان کے منتخب اور ممتاز شعرا شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض محمود سعیدی نے ادا کیے۔ سکلکٹری کا کشادہ میدان باذوق سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ مشاعرہ سہ پہر تک جاری رہا۔

مولانا شہاب مالیر کوٹلوی

مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی بمبئی میں ۲۵ فروری ۱۹۷۶ء کی شب کو وفات پا گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۳ سال تھی۔

شہاب صاحب مرحوم بڑے وضعدار بزرگوں میں تھے۔ وہ ۱۸۹۳ء میں پنجاب کی ریاست مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوئے اور اس زمانے کے دستور کے مطابق نجی طور پر شہر کے ممتاز اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان کا تعلق ریاست کے حکمراں خاندان سے تھا لیکن علم و ادب کی لگن انھیں مالیر کوٹلہ سے لاہور کھینچ لے گئی جہاں وہ کئی اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ بمبئی چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ بمبئی پہنچ کر انھوں نے معلمی کو اپنا وسیلۂ معاش بنایا اور یہ شغل مرتے دم تک جاری رہا۔

شہاب صاحب اُردو کے علاوہ فارسی، عربی اور ہندی زبانوں پر اچھا عبور رکھتے تھے۔ انگریزی اور گجراتی سے بھی واقف تھے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ بالخصوص اسلامی علوم کے دلدادہ تھے۔ دوسرے مذہبوں کے لٹریچر سے بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے اور ان مذہبوں میں جو خوبیاں انھیں نظر آتی تھیں، کھلے دل سے ان کا اعتراف کرتے تھے۔ قرآن مجید سے ان کے شغف کا یہ عالم تھا کہ بقول جنابِ معین الدین حارث "کلام پاک کا ایک جیبی نسخہ ہر وقت ساتھ رہتا تھا، جہاں یہ سوال سامنے آیا کہ فلاں مسئلے پر قرآن مجید نے کیا کہا ہے، وہ نسخہ جیب سے نکال کر اور اس کے اول و آخر جو سادہ صفحات لگے ہوئے تھے، ان پر اپنے نوٹ دیکھ کر اس موضوع کی آیتیں پیش کر دیتے تھے۔"

شہاب صاحب نے ایک صاف ستھری اور سادہ زندگی گزاری۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہ پہنچی۔ وہ پختہ خیالات و عقائد کے مالک تھے لیکن مختلف خیالات و عقائد رکھنے والوں سے بڑی رواداری سے پیش آتے تھے۔ عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے لیکن وہ ایک سچے قوم پرور مسلمان تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی پیشوائی کے قائل۔

شہاب صاحب کو تحریک سے خاص تعلق تھا اور وہ اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے کبھی مہینے کا شمارہ ڈاک میں گم ہو جاتا یا کسی وجہ سے بروقت نہ ملتا تو بے چین ہو جاتے اور فوراً تقاضے کا خط لکھتے۔ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے ـــــ ان کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ بڑے بیٹے حبیب احمد صاحب اور بیٹی منیرہ بمبئی ہی میں مقیم ہیں چھوٹے بیٹے احمد مصطفےٰ صاحب اپنے خاندان کے ساتھ مالیر کوٹلہ میں رہتے ہیں۔ ہم ان سب کے غم میں شریک ہیں۔

●●

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیے۔

سیاسی معلومات میں اضافہ کرنے والی بہترین کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
تین انقلاب	فریڈرک جینئر	۰،۶۵ روپے
چین میں اسلام کا ماضی اور حال	——	۰،۴۰ ״
ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول	وکٹر فیمہ	۱،۰۰ ״
جمہوری انقلاب	براڈن ماگی	۱،۰۰ ״
روس کے انقلاب	ڈیوڈ فلیمین	۱،۰۰ ״
جمہوری سوشلزم	گائلس ریڈس	۱،۰۰ ״
ٹریڈ یونینیں — ان کا جائز اور ناجائز استعمال	آرتھر باٹرلی	۰،۵۰ ״
ببول کے پیڑ	(ایک آپ بیتی)	۰،۵۰ ״
دو انقلاب	آر۔ ایچ بروس لاک ہارٹ	۱،۰۰ ״
سوویت سفارت خانے میں	ایلگزینڈر کوناچیت	۲،۰۰ ״
آج کا مارکسزم	رابرٹ کنکوئسٹ	۰،۷۵ ״
آج کا چین	ڈاکٹر ایس چندر شیکھر	۱،۰۰ ״
روسی انقلاب کی کامیابیاں	ڈاکٹر جان کیپ	۰،۵۰ ״
ایک روسی سائنسداں کے تجربات سرخ چین میں	مائیکل کو یچکو	۱،۰۰ ״
ادیب اور کمیسار	پامدتہ چارمی پلوکوی	۱،۰۰ ״
چین کا بدلتا سماج	یوچائی اسٹان برگ چائی	۱،۰۰ ״
کمیونزم اور نوآبادیت	وکٹر کرانز	۱،۰۰ ״
کمیونزم اور زراعت	لارڈ واسشن	۰،۷۵ ״
پُر امن حملہ	ڈوگلس ہائڈ	۱،۰۰ ״
خوش حالی کی تلاش	براؤن کروزیر	۰،۵۰ ״
پتھر کے دیوتا (چھ آپ بیتیاں)	مترجم۔ گوپال متل	۱،۰۰ ״
اتحاد — ہماری ہار	ڈوگلس ہائڈ	۱،۰۰ ״
تعلیم کی کھوج	——	۰،۷۵ ״

قارئین سے

○ "تحریک" کے نئے خریدار بنائیے، آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ تحریک اب پہلے سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت ہوگیا ہے۔

○ اپنے شہر کے باذوق حضرات اور لائبریریوں کے پتے ہمیں بھجوائیے تاکہ ہم انھیں "تحریک" نمونتہً بھجوا سکیں۔

○ نیشنل اکاڈمی کی مطبوعات اور اپنی پسند کی دوسری کتابیں ہم سے طلب کیجیے، اس سے "تحریک" کو تقویت حاصل ہوگی۔

—— ادارہ

Regd No D (D) 118 Phone : 271649 MAY 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 648/57

TAHREEK

نائیل مطبوعہ فائن پرنٹ جامع مسجد دہلی

تحریک

24(3)

جون ۷۴ء

پورن کمار گھوش — ایں ماتمِ سخت است کہ گویند جواں مُرد

پورن کمار گھوش — رفیقۂ حیات کے ساتھ

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ نئی دہلی

تحریک

شمارہ : ۳ جلد : ۲۴

جون سنہ ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر :

گوپال متّل ـــــــ مخمور سعیدی

پریم گوپال متّل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے

فی کاپی : ایک روپیہ پچیس پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلّی ۲-۱۱۰۰۰

پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر

گوپال متّل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت

۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلّی ۲-۱۱۰۰۰

گوپال متل　|　غیر ادعائی انداز نظر کی ضرورت

سردار سورن سنگھ کمیٹی نے آئین پر نظر ثانی کے سلسلے میں جو سفارشات پیش کی ہیں ان میں ایک سفارش یہ بھی ہے کہ جمہوریۂ ہند کے نام میں سیکولر اور سوشلسٹ کے لفظ بڑھا دیے جائیں۔

جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے اس کے پیچھے جو روحانی امنگیں ہیں ان سے کسی ذی ہوش کو اختلاف نہیں ہوسکتا لیکن ایک نظام کی حیثیت سے سوشلزم ایک ایسا لفظ ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ روس اور چین تک میں اس کے معنی میں اختلاف ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے پر رجعت پسندی، سرمایہ داری کے احیا، فاشزم اور سامراجیت کے الزام لگا رہے ہیں۔ بہرحال جہاں تک ہندوستان کے مسلم لیڈروں کا تعلق ہے انھوں نے سوشلزم سے مراد کوئی طے شدہ نظام کبھی نہیں لی اور زیادہ زور اس کے روحانی مفہوم پر ہی دیا ہے۔

جہاں تک سیکولر ہونے کا تعلق ہے، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی ہمارا موقف یہی رہا ہے کہ ہمارے ملک کے نظام حکومت کو سیکولر ہونا چاہیے لیکن سیکولرازم کو بھی ہم نے ایک نئے مذہب کا درجہ کبھی نہیں دیا کیونکہ نئے مذہب کی حیثیت سے یہ ایک متحارب عقیدہ بن جاتا ہے۔ سیکولر کا لفظ ہمارے یہاں بے تعصبی کے مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے اور سیکولر حکومت سے ہماری مراد ایک ایسی حکومت رہی ہے جو مختلف فرقوں میں مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتے اور سبھی مذاہب کے ماننے والوں کو ہندوستانی شہریوں کی حیثیت سے مساوی حقوق کا مستحق سمجھے۔ قومیت کی بنیاد ہمارے نزدیک مذہب نہیں بلکہ وطن ہے۔

ہمارا یہ موقف کتنا صحیح تھا اس کا ثبوت اس وقت ملا جب قیام پاکستان کے فوراً بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ آج سے پاکستان کے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں۔ ہمارے موقف کی دوسری تائید اس وقت ہوئی جب مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ ہوگیا۔ یہ کھلا اعتراف تھا کہ صرف مذہب قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

ماضی کے خلاف جنگ ممکن نہیں اس لیے ان لوگوں سے ہر قسم کی دلیل بے کار ہے جنھوں نے کسی مخصوص ماحول میں ہماری بات نہیں مانی تھی لیکن اگر ہم اپنے موقف کی صحت پر یقین رکھتے ہیں تو ہمیں یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ کیا ہم نے اپنے موقف پر عمل بھی کیا ہے؟

اگر ہم اپنے موقف کو واقعی عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ موقف کوئی غیر معمولی موقف نہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، ہندوستان جیسے ملک میں کسی ایسی حکومت کا قیام ممکن ہی نہیں جو سیکولر نہ ہو لہٰذا ہم نے اگر سیکولر نظامِ حکومت قائم کیا تو وہی کیا جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمارا یہ فیصلہ غیر مشروط ہے اور اس پر کسی دوسرے کے رویّے کا اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، بے تعصبی مبادیاتِ شرافت میں شامل ہے اور اس پر ناز کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اس بات پر ناز کرے کہ وہ سڑک پر کوڑا کرکٹ نہیں پھینکتا۔

تعصب اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کے سلسلے میں بھی ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دوسروں کو متہم کرنے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ ہم خود اچھی مثال قائم کریں۔ اگر ہم کسی ایسے شخص کو جسے ہم متعصب یا فرقہ پرست سمجھتے ہیں، حقارت کی نظر سے دیکھیں گے یا اسے برا بھلا کہیں گے تو اس کے تعصب میں شدت پیدا ہوگی لیکن اگر ہم اس کے ساتھ مروّت سے پیش آئیں گے تو اس کے مزاج میں اعتدال پیدا ہوگا۔

ایک اور بات یہ ہے کہ کسی ایسے طبقے کی خصوصی مدد کرنا جو پسماندہ رہو، خواہ یہ طبقہ مذہبی فرقہ ہی کیوں نہ ہو، سیکولرزم کے منافی نہیں۔ اقلیتوں کی مدد سرکاری سطح پر بھی قابلِ جواز ہے لیکن اس میں اہم ترین فریضہ نجی کاروباری ادارے انجام دے سکتے ہیں۔ انھیں اقلیتی فرقوں کے افراد کو ملازمتیں دینے کی خاص کوشش کرنی چاہیے۔ فرقہ پرستی کا باعث اجنبیت کی دیوار ہے، اس طرح یہ دیوار از خود منہدم ہو جائے گی۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

کانگرس اور کمیونسٹ

گوپال متّل

مغربی بنگال کا دورہ کرتے ہوئے مسٹر سنجے گاندھی نے کرشن نگر کے مقام پر اپنی تقریر میں کہا کہ کانگرس کی صفوں کو ایسے لوگوں سے پاک کیا جانا چاہیئے جو یساریت اور ریمنیت کے نام پر پارٹی کے ممبروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ برہان پور میں انھوں نے یساریوں کا خصوصیت سے ذکر کیا۔

کانگرس ہائی کمان مسٹر سنجے گاندھی کے مشوروں کو کہاں تک عملی جامہ پہناتی ہے، یہ دیکھنا باقی ہے لیکن اگر کانگرس کو آئڈیالوجی کے نام پر گمراہی پھیلانے والوں سے پاک کرنا واقعی مقصود ہے تو یہ بات ذہن میں رکھنا پڑے گی کہ جہاں تک کمیونسٹ پارٹی اور اس کے محاذی اداروں کا تعلق ہے انھیں برف کے پہاڑ سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ یہ پہاڑ سطح آب پر جتنا نظر آتا ہے اس سے کئی گنا سطح آب کے نیچے ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اگرچہ کمیونسٹ پارٹی سے متعلق نہیں ہوتے لیکن کمیونسٹ پارٹی اور سوویٹ یونین کی پالیسیوں کو فروغ دینے میں کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبروں سے کہیں زیادہ سرگرم حصّہ لیتے ہیں۔ یہ کوئی الزام نہیں۔ اس کا اعتراف خود کمیونسٹ نظریے کے ماہروں نے کیا ہے۔ جارجی ڈیمٹروف جو کسی زمانے میں کامنٹرن کے اعلیٰ سطح کے کارکن تھے، ان کا کہنا ہے:

> "ہمیں یہ بات بھولنا نہیں چاہیئے کہ جو شخص ہماری طرف عمومی ہمدردانہ رویّہ رکھتا ہے اس کی قدر و قیمت ایک درجن جنگجو کمیونسٹوں سے زیادہ ہے۔ یونی ورسٹی کا ایک پروفیسر جو پارٹی کا ممبر بنے بغیر سوویٹ یونین کے مفادات کے لیے لڑتا ہے، وہ قدر و قیمت میں ایسے سو آدمیوں سے زیادہ ہے جو پارٹی کے باقاعدہ ممبر ہوں۔ ایک ادیب جو پارٹی کا ممبر بنے بغیر سوویٹ یونین کا دفاع کرتا ہے، ایک ٹریڈ یونین لیڈر جو ہماری صفوں سے باہر ہے لیکن اس کے باوجود سوویٹ یونین کی بین الاقوامی پالیسی کا دفاع کرتا ہے، قدر و قیمت میں پارٹی کے ہزار ممبروں سے زیادہ ہے۔"

یہ بات ڈیمٹروف نے ایسے ملکوں کے بارے میں کہی تھی جہاں کمیونسٹ پارٹیاں کافی فعّال ہیں لیکن ہندوستان میں تو جہاں کمیونسٹ پارٹی کی اپنی کوئی حیثیت نہیں، اس قسم کے لوگوں کی جو پارٹی سے براہِ راست تعلق نہ رکھتے ہوئے، پارٹی کی اور سوویٹ یونین کی پالیسیوں کو تقویت پہنچاتے ہیں، اور بھی زیادہ اہمیت ہے اور ایسے لوگ صرف حکمراں پارٹی ہی نہیں بلکہ سرکاری اداروں میں بھی ایک منظم اسکیم کے تحت نفوذ کی کوشش کر رہے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

ایسے لوگوں کے مؤثر ہونے کی ایک مثال حال ہی میں سامنے آئی۔ ایک شاعر کے مجموعۂ کلام میں کچھ ایسی نظمیں شامل تھیں جن سے جملہ مذاہب کی توہین ہوتی تھی اور ایک نظم تو خاص طور پر ایسی تھی جس میں معراج کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی تھی اور اس پر مسلمانوں کو بجا طور پر اعتراض تھا۔ کتاب کے ناشر مکتبۂ جامعہ نے اہلِ مذہب کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس کتاب کی فروخت بھی روک دی تھی اور اپنی مطبوعہ فہرستوں تک میں اس کا نام قلم زد کر دیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ساہتیہ اکاڈمی نے اسے انعام دے دیا۔

ظاہر ہے کہ حکومت اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو جو انعامات دیتی ہے اور اُردو کے فروغ کے لیے جو روپیہ صرف کرتی ہے، اس سے اُردو والوں کی جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، "تالیفِ قلب" مقصود ہوتی ہے۔ اس صورت میں ایک ایسی کتاب کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کا مستحق قرار دیا جانا جس سے ان لوگوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں، کسی طے شدہ حکومتی پالیسی کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں یا تو کسی کوتاہی کو دخل ہے یا یہ نفوذیوں کا کارنامہ ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیا ظاہر کرتا ہے کہ ان سرکاری اداروں میں جن کا ادب سے تعلق ہے، نفوذ کی کوششیں اب اور بھی وسیع پیمانے پر کی جائیں گی اور اس کے لیے زیادہ تر ایسے لوگوں کو استعمال کیا جائے گا جن کی کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت ثابت شدہ نہیں کیونکہ جیسا کہ "ڈیمٹروف" نے کہا ہے، یہ لوگ کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں کو آگے بڑھانے میں پارٹی کے باضابطہ ممبروں سے کئی گنا زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کے ترقی پسندوں کا تعلق ہے ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ اپنے تعلق کو چھپانا چنداں ضروری نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر راجے بھون نئی دہلی کے ایک استقبالیہ میں جس کا اہتمام کمیونسٹ پارٹی نے کیا تھا، تقریر کرتے ہوئے بھیشم ساہنی نے کہا: "پارٹی میری ماں کی طرح ہے۔ بیٹا اپنی ماں سے خیر مقدم کروانے کے لیے نہیں، آشیرواد حاصل کرنے آتا ہے۔ آج میں بھی یہاں اپنی ماں سے آشیرواد حاصل کرنے آیا ہوں اور اس آشیرواد کو اس کا حکم مان کر زندگی بھر اس پر عمل کروں گا۔"

بہرحال اگر کانگرس کی صفوں میں اور سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں کمیونسٹوں کے نفوذ کو روکنا ضروری ہے تو صرف انہی لوگوں پر نظر رکھنا کافی نہیں ہوگا جو کمیونسٹ پارٹی سے برملا وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی چنداں اہم نہیں کہ کمیونسٹ اور ان کے ہمسفر کسی مخصوص وقت میں کیا کہتے ہیں کیونکہ وقت پڑنے پر وہ زیادہ سے زیادہ مفاہمانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کا استاد لینن انھیں سکھا گیا ہے کہ "عارضی سمجھوتوں سے، خواہ وہ ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ ہی کیوں نہ کیے جائیں، صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں جو خود اعتمادی سے محروم ہوں۔"

اور جب کٹھن وقت ٹل جائے تو یہی لوگ جو کبھی حلیف ہونے کا بہروپ بھر کر مدِ مقابل کے آگے پیٹ کے بل رینگنے سے بھی انکار نہیں کرتے ان کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کرشن چندر ان دنوں بڑا ہی مفاہمانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ لیکن انہی کرشن چندر نے ۱۹۴۹ء میں جب وہ اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ ہندوستان میں انقلاب آیا ہی چاہتا ہے، ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کے سرکاری آرگن "نیا ادب" کے مارچ ۱۹۴۹ء کے شمارے میں اعلان کیا تھا:

> "وہ زمانہ گیا جب ترقی پسند تحریک مسلم لیگی، کانگرسی، سوشلسٹ، کمیونسٹ، دیانتدار ہندو، دیانتدار مسلمان، دیانتدار سکھ، انفرادی دہشت پسند، اجتماعی ریڈیکل لبرل، آدھا لبرل، آدھا سوشلسٹ، آریا سماجی، قادیانی، غیر قادیانی، مذہبی جنونی لیکن انگریز دشمن، ہر قسم اور ہر قماش کے لوگوں کو اپنے دامن میں پناہ دیتی تھی اور آج بھی دے رہی ہے۔ آپ کی یہ اصلاح پسندی اُس دور میں جائز ہو تو ہو لیکن آج آپ کی اصلاح پسندی نے آپ کو اس منزل پر پہنچا دیا ہے کہ آپ انقلابی قوتوں سے کٹ کر الگ کھڑے ہیں۔"

کرشن چندر اتنے ہی بیباک تھے، جتنی اُس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی تھی۔ انھوں نے یہ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ترقی پسند مصنفوں کے گزشتہ فرائض کا نئی صورتِ حال کے تقاضوں سے موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

کرشن موہن

کایا محل میں آگ لگی ہے

سادھو

کایا محل میں آگ لگی ہے
داتا کوئی بجھائے
صبح سویرے بستی بھر میں
تج کر اپنے تیاگ کی ستی
اک سادھو چِلّائے، گاتا جائے
کوئی نرمل پران دانی آئے
آگ بجھائے

برھن

کایا محل میں آگ لگی ہے
اک برہن راتوں کو تڑپے
نینن نیر بہائے
پردیسی رسیا، من بسیا
ساجن کب گھر آئے، گلے لگائے
آگ بجھائے

ویشیا

کایا محل میں آگ لگی ہے
حرص و ہوس تڑپائے
کایا ہے مایا کا سایا
جس میں [illegible]
پیار سے اپنا جوبن بیچوں
آج کوئی البیلا شوقین آئے
آگ بجھائے

سیٹھ

کایا محل میں آگ لگی ہے
مایا موہ ستائے
بھوگ ولاس کا ساتھ ہو نِس دن
روپ کی دھوپ ہمیشہ چمکے
جیون کو چمکائے
من چاہے دھن آتا جائے
اور آتا ہی جائے
آگ بجھائے

ڈاکو

کایا محل میں آگ لگی ہے
مایا اسے بجھائے
دھنوانوں کا دھن لوٹوں میں
بھوک اور چنتا سے چھوٹوں میں
لُوٹ مجھے راس آئے اور لبھائے
دھن ہی سے جیون جیون ہے
دھن ہی تن من بہلائے
آگ بجھائے

●●

نظمیں

عظیم اختر

دعا

نکہت و نور کی ڈھالی ہوئی اس دنیا میں
بوجھ محرومی کا شانوں پہ لیے
لمبی پرپیچ سی راہوں پہ
بھٹکتی ہے حیات ——!
جانے کب سے یونہی آوارہ، فضول
اُداس اور ملول ——!

اے خدا! میرے خدا
مالکِ ارض و سما
خالقِ کون و مکاں
چھین لے مجھ سے بس اب
میرے احساس کی واماندہ مگر تند تپش
بخش دے مجھ کو سکوں
کر عطا چند خوشی کے لمحے
کوئی پل میں بھی جیوں ——!!
نکہت و نور کے سانچے میں ڈھلی
تیری اس دُنیا میں ——!!

حامد اکمل

رات کے نام

اے رات سُن!
وہ رات تو کبھی نہ بن
کہ جب قدم بھول جائیں راستہ
گلی گلی کمین گاہِ سگ
مکاں مکاں ہے سنگ گر، یہ دہلیزیں
آب آب کا ہشیں
وہ مرگِ ناگہاں کی منتظر
پریدہ رنگ ریزہ ریزہ خواہشیں
وہ سایہ
جس کی منزلِ سکوں: تھکن
وہ پاؤں
جن کی پیاس: بے نیام
وہ سینہ، جس میں اک خلا بجائے دل
وہ جسم، سایہ سایہ پیکرِ الم
رسائی کا شعور جس کے حق میں نارسائی ہے
مگر جسے اپنی گمرہی کا علم

تلاش کے نئے نئے جزیروں میں
ساتھ رے کے گھومتا ہے مثلِ باد
شب بہ شب
—— ول تک
کھوجتے ہیں اس کا لمس نقش پا
(دو چشم تر)
جو آنگنوں کی پیاس بن گیا
جو روزنوں کی آنکھ بن گیا
—— جو اپنی ریزہ ریزہ سی انا
کے ساتھ
راستہ بھٹک گیا ——!

●●

رنگ محل خورد —— پھاٹک حبش خاں —— دہلی ● بی بی مسجد —— مومن پورہ —— گلبرگہ —— کرناٹک

شوکت مجدّدی، اوّلین شارحِ کلامِ غالب

شارق میرٹھی

میرٹھ کے لیے یہ شرف کم نہیں کہ اُس کی خاک میں ایک ایسی ہستی مدفون ہے جسے اوّلین شارحِ کلامِ غالب ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ ہستی شوکت مجدّدی کی ہے۔ شوکت مجدّدی کا نام احمد حسین اور تخلّص شوکت تھا۔ اُن کی تاریخِ پیدائش جون ۱۸۳۹ء ہے۔

شوکت مجدّدی کی جائے پیدائش رام پور منہیاران ضلع سہارنپور ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے مولوی عبدالحق سہارنپوری سے فارسی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی سے عربی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ مولانا کو عربی و فارسی میں کمال حاصل تھا اس لیے وہ مجددِ السنۂ مشرقیہ کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے۔ مولانا نے بعدِ فراغتِ تعلیم میرٹھ کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ وہ عمر بھر خیر نگر میرٹھ میں کرائے کے مکان میں مقیم رہے۔

شوکت مجدّدی کی ذات بہت سے اوصاف کا مجموعہ تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، صحافی بھی تھے اور محقق بھی۔ جب ان کی علمیت کا شہرہ ملک گیر ہوا تو فیلن نے اپنی ڈکشنری کی ترتیب میں امداد لینے کے لیے معقول مشاہرہ پر انھیں طلب کیا۔ مولانا نے کئی سال تک فیلن کے ساتھ معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد وہ لاہور میں 'کوہِ نور' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اودھ اخبار لکھنؤ میں بھی انھوں نے کچھ دن کام کیا۔ آخر میں انھوں نے مستقلاً میرٹھ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ یہاں سے انھوں نے اخبار 'شحنۂ ہند' اور ایک ماہوار پرچہ 'پیدا' کے نام سے جاری کیا۔ مخزن اور ملک کے دوسرے مقتدر رسائل میں انھوں نے سینکڑوں علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے۔ کلیاتِ خسرو کی تصحیح اُن کا ایک اور بڑا کارنامہ ہے۔

شوکت مجدّدی عربی اور فارسی کے منتہی تھے۔ وہ اپنے پرچوں میں مستقل طور پر عربی فارسی کے مشکل اشعار کی شرح چھاپتے تھے۔ انھوں نے متنبّی، حماسہ، خاقانی، بیدل، فرخی اور کلامِ غالب کی شرحیں لکھیں۔ اسے اچھا کہیے یا بُرا مولانا میں یہ عیب تھا کہ وہ اپنے معاصرین میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر معاصرین سے اُن کی تلخ جھڑپیں ہوئیں۔ بالآخر سب کو ان کی قابلیت کا لوہا ماننا پڑا۔ جب تک وہ زندہ رہے، برابر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ آخر ۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء کو بہ عمر ۸۳ سال انھوں نے انتقال فرمایا۔

مولانا کے صاحبزادگان میں مولانا شعیب احمد ندرت میرٹھی کا شمار اساتذۂ وقت میں ہوتا تھا۔ مولانا کے دوسرے صاحبزادے جدّت میرٹھی بھی اچھا شعر کہتے تھے۔

بہ حیثیت شاعر، شوکت مجدّدی کا شمار اساتذۂ وقت میں کیا جاتا تھا۔ ملک میں اُن کے کافی تعداد میں شاگرد تھے۔ رگھو دیندر راؤ جذب[1] (حیدرآباد) اور شاکر میرٹھی اُن کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔

شوکت مجدّدی اپنے پرچوں میں بے لاگ تنقیدیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نہ اساتذۂ متقدمین کو بخشا نہ معاصرین کو۔ ان کی تنقیدیں نہ صرف قارئین کی معلومات میں اضافے کا سبب بنتی تھیں بلکہ ان کے معاصرین کو بھی چوکنا رکھتی تھیں۔ اُن کی اصلاحوں کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

ذوق کا شعر ہے:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: حیدرآباد کے شاعروں کا انتخاب کلام ص ۸۵

جانور جو ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے
اے شہِ حسن وہ اڑتے ہی ہما ہوتا ہے

مولانا نے تحریر فرمایا۔ یہ غلط ہے۔ جانور کے عموم میں تو گائے بیل، کتا اور بلی بھی آتے ہیں لیکن اُن کو ہما سے کچھ نسبت نہیں۔ یقیناً انھوں نے یوں فرمایا ہوگا:

زاغ بھی گر ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے
اے شہِ حسن وہ اڑتے ہی ہما ہوتا ہے

امیر احمد امیر مینائی کا شعر تھا:

غضب داغ تو نے دیئے اے فلک
کلیجہ گلِ نیلوفر ہوگیا

مولانا نے فرمایا پہلے مصرع کو یوں بدل دیجیے

غضب چٹکیاں ہیں تری اے فلک
کلیجہ گلِ نیلوفر ہوگیا

داغ کا شعر ہے:

لگا ہے سنگِ مقناطیس گویا
جبیں اٹھتی نہیں اُس آستاں سے

مولانا نے فرمایا۔ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے نہ کہ سر کی کھال کو۔

مشاطۂ سخن (مرتبہ: صفدر مرزاپوری مطبوعہ ۱۹۲۸ء صہ ۱۳۱) میں، مولانا کی ایک اصلاح درج ہے۔ یہ اصلاح انھوں نے اپنے شاگرد شاکر میرٹھی ایڈیٹر "العصر" کے شعر پر دی تھی۔

شعر شاکر:

یہ رُت مدار ہے جس پر نظامِ ہستی کا
یہ رُت کہ کیف ہے جس پہ فروغِ مستی کا

اصلاح:

یہ رُت مدار ہے جس پر نظامِ ہستی کا
یہ رُت خمار ہے جس میں مدامِ مستی کا

یہ شعر ایک نظم کا تھا جس کے دوسرے مصرعے کو شوکت مجددی نے ترمیم فرما کر یہ نوٹ لکھا:

"مدام" شراب کو بھی کہتے ہیں۔ مدار اور خمار، نظام اور مدام کا تقابل ہوگیا۔

مندرجہ بالا اصلاحوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شعر کا مطالعہ کتنی گہری نظر سے کرتے تھے۔ معمولی سے معمولی نقص پر بھی اُن کی نگاہ ٹھہر جاتی تھی۔ اور وہ معمولی رد و بدل سے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے۔

شوکت مجددی کی معرکہ آرا تصنیف اُن کی شرح کلام غالب ہے۔ اوّل اوّل غالب کے اشعار کا حل بالاقساط "پروانہ" میں چھپا۔ پھر عام اہلِ ذوق کی فرمائش پر اُسے ۱۳۳۱ھ میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ مولانا کے ایک شاگرد گھنشیام سنگھ خار نے "حل دقائق الغالب" سے تاریخ نکالی:

سال تاریخ خار نکتہ شناس
گفتہ۔ حلِ دقائق الغالب

(غالب فکر و فن از شوکت سبزواری، نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم صہ ۹۲۵)

غالب کو سمجھنے کے لیے شوکت کی شرح بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے بڑی صاف اور سادہ شرح لکھی ہے۔ ابتدا میں مشکل الفاظ و تراکیب کے معنی دیے ہیں۔ پھر وضاحت کے ساتھ شعر کی شرح کی ہے۔ مطالب میں کہیں الجھاؤ نہیں ہے۔ بقول حسرت موہانی بعض اشعار کے انھوں نے کئی کئی معنی بیان کیے ہیں۔ افسوس ہے یہ گراں قدر شرح اب نایاب ہے۔ میرے خیال میں یہ شرح اُن کتابوں میں سے ہے، جنھیں ایک بار پھر چھپا یا جانا چاہیے۔ بعض اشعار کی شرح درج ذیل ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(شرح) ہر شے میں خدا تعالیٰ جلوہ گر ہے مگر تو بھیدوں کی آواز کا محرم نہیں۔ یہاں پردہ گویا باجوں، ستار وغیرہ کا پردہ ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ ساز بغیر پردے کے نہیں بجتا۔ انسانی جسم کی تمام حرکات نبضیہ گویا حقیقت کے پردے ہیں جن سے صدائے یاہو پیدا ہوتی

---

۱ تفصیل کے لیے دیکھیے مکاتیب جگر۔ مرتبہ تسکین قریشی خط ۱۳ صہ ۲۲۔

بلند ہے مگر گوش شنوا کی ضرورت ہے۔ یہ شعر مذہب وحدت الوجود میں ڈوبا ہوا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہر قطرے کا دل اک ساز بنا ہوا ہے جس سے انا البحر کی آواز نکلتی ہے۔ یعنی قطرہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں دریا ہوں۔ پھر جب ہم وحدت الوجود کے عین ذات بن گئے تو اب کیا پوچھنا ہے کیونکہ قطرہ دریا کا عین ذات ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(۱) جب گھر میں وحشت نے بوکھلایا تو خیال پیدا ہوا کہ دشت کو چلیے وہاں دل بہلے گا کیونکہ وحشی کا دل تو جنگل ہی میں بہلتا ہے مگر جب جنگل میں پہنچے تو پھر گھر یاد آیا۔ اس لیے کہ گھر تو جنگل سے بھی زیادہ ویران ہے۔ اس ویرانی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

(۲) یا خدا کوئی ویرانی سی ویرانی (مصیبت سی مصیبت) ہے نہ گھر میں دل لگتا ہے نہ جنگل میں گویا کھوٹا سکہ بنا پھرتا ہوں۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

طور پر برقِ تجلی گری۔ جل کر خاک ہو گیا۔ ہم پر بجلی گرتی تو معلوم ہوتا ظرف اسے کہتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ شراب خوار کے ظرف کے مطابق شراب دی جاتی ہے۔ غالب نے اپنے کو موسیٰ فرض نہیں کیا کیونکہ موسیٰ بھی تو طور کے ساتھ غش کھا کر گر پڑے تھے۔

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

تیرے آتشیں حسن کے جلوے نے آئینہ خانے کا وہ نقشہ کر دیا جو آفتاب کا عکس شبنمستاں کا عالم کر دیتا ہے۔ یعنی آئینے کا پانی خشک ہو کر اُڑ گیا اور صرف غاد باقی رہ گیا۔ جس طرح آفتاب کے طلوع ہونے پر شبنم خشک ہو جاتی ہے اور سبزہ زار جیسا کا تیسا رہ جاتا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں
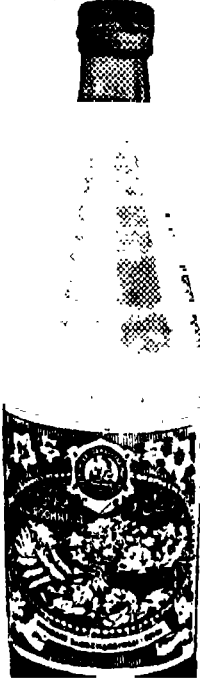
ہمارا قطرہ بھی درحقیقت دریا ہی ہے یعنی ہم بھی عین ذات ہیں لیکن منصور کی طرح تنک ظرف نہیں کہ انا الحق پکار اٹھیں۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

دریا جب جوش مارتا ہے تو کناروں سے باہر نکل جاتا ہے ساحل کی خودداری اسے روک نہیں سکتی۔ اسی طرح اے محبوب جس بزم میں تو ساقی ہوگا وہاں ہوشیاری کا دعویٰ باطل ہے۔

شرح میں الفاظ کے معانی بھی دیے ہوئے ہیں۔ میں نے بخیال اختصار الفاظ کے معانی نہیں لکھے۔ صرف مطلب لکھ دیا ہے۔

کنور سین

ریگستان کا پاپ

یہ کیسی رات ہے۔ صرف میں ہی کیوں جاگ رہا ہوں ——— اپنے آپ پر جھنجھلاتے ہوئے قافلہ سالار نے درختوں کے نیچے نصب خیموں میں گہری نیند سوئے ہوئے مسافروں کی طرف دیکھا ——— آسمان تو ہر روز آج کی مانند ہی آگ برساتا ہے۔ بادِ سموم بھی کئی بار وقت سے پہلے ہی چلنا شروع ہو جاتی ہے مگر آج یہ سب ——— وہ ایک طرف بیٹھے جگالی کرتے اونٹوں کو دوبارہ دیکھنے لگا اور اُن کے پاس پڑے مال و اسباب کی قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں ——— بھروسے سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔ اِس کی اوٹ ہی ——— اس نے ایک بار پھر کمر سے لٹکتے خنجر کو چھوا۔ شعلہ زن صحرا کی اڑتی ہوئی ریت میں بدحواس اور بے حال ہوئے دم توڑتے مسافروں کا خیال کر کے دوبارہ غیر معمولی خیالات کی اُدھیڑ بُن میں لگ گیا ——— یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر کوئی بھی قافلہ سالار ——— وہ چونکا

اسی وقت اُونٹوں کے اونگھتے سر اونچے اٹھنے لگے اور وہ گردنیں لمبی کر کے نتھنے پھیلائے فضا میں دفعتاً آبسی اجنبی بُو کو سونگھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ اُن کو پچکارے اونٹ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اس سے پہلے کہ وہ ان تک پہنچے بدکنے لگے۔ وہ سکتے میں آ کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے چاہا کہ چیخ کر لوگوں کو جگائے مگر آواز حلق سے نہیں نکلی۔ ہمت سمیٹ کر جست لگانے کو ہوا تو اونٹ رسّیاں تڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے ——— ان کے گلے میں بندھی گھنٹیاں کیوں گُنگ ہو گئی ہیں۔ ایک بھی آواز نہیں جو ریگستان کے سنّاٹے کو توڑ سکے۔ اُس کے اوسان خطا ہونے لگے ——— کہیں وہ لمحہ تو نہیں آگیا ——— ایک وسوسہ اس کے دل و جان کو جکڑنے لگا ——— وہ اٹل لمحہ، فیصلہ کُن گھڑی ——— وہ بڑبڑایا۔

ہنوز کھڑا وہ اونٹوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ کسی کے کراہنے کی دلخراش چیخ اس کے کانوں میں پڑی۔ اُس نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو دور سے ایک دھبہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ دھبہ جیسے جیسے نزدیک آتا گیا آواز واضح ہوتی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے بھاگ جانے کا فیصلہ کرے ایک ادھیڑ عمر آدمی کمر کے گرد چیتھڑا لپیٹے اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اُس نے دیکھا اُس کا ننگا جسم آبلوں سے بھرا پڑا ہے اور ان میں سے پیپ رس رہی ہے۔ آبلوں میں ہونے والی خارش کو مٹانے کے لیے اُنھیں ناخنوں سے کریدتے ہوئے اجنبی نے اور بھی زور سے کراہنا شروع کیا اور اُس کی جانب شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چیخا ——— بیٹھ جاؤ ——— کس لیے؟ قافلہ سالار ممیایا ——— مجھے ایک کہانی سنانی ہے ——— تم کون ہو ——— مجھے نہیں پہچانتے۔ ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے تم مجھے یاد کر رہے تھے ——— کیا کہا، میں تمھیں یاد کر رہا تھا ——— جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں کھڑے ہو وہیں بیٹھ جاؤ ——— لیکن تم ہو کون؟ قافلہ سالار نے بیٹھتے ہی پھر پوچھا۔ زخم زدہ نے جواب دینے کی بجائے چشمے سے چُلّو بھر شفاف پانی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پانی اپنی سطح سے ایک فٹ نیچے ہو کر اُس کی پہنچ سے باہر ہو گیا۔ یہ دیکھ کر قافلہ سالار کی روح فنا ہونے لگی مگر وہ اجنبی کے خون آلود چہرے اور پیپ بھرے جسم سے اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ آنے والا اپنے جسم کو بُری طرح کھجاتے ہوئے کہنے لگا ———

کسی وقت صحرا اس قدر بنجر اور ویران نہیں تھا۔ اس میں نخلستان اتنے کم نہیں تھے۔ لوگ اسے پار کرتے ہوئے اتنے وحشت زدہ نہیں ہوتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے اپنے باپ کی

موت کے بعد قافلوں کو ریگستان کی مسافتیں طے کرانے کا کام سنبھالا تھا۔ لوگ مجھ پر بھروسہ کرتے تھے کیونکہ میں صحرا کے چپے چپے سے واقف تھا۔ کسی بھی جگہ سے ریت اُٹھا کر سونگھتے ہی بتا دیتا تھا کہ نخلستان وہاں سے کتنی دُوری پر ہے۔ علاقے کے تمام اونٹ مجھے پہچانتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے بسا پیار میری ایمانداری کا ثبوت تھا۔ میرے ساتھ ہونے پر کارواں کے بھٹکنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا اس لیے قافلے میری قیادت میں سفر کرنے کے لیے ہفتوں میرا انتظار کیا کرتے تھے۔ یہ سب کہتے ہوئے زخم خوردہ نے ایک بار بھی جسم کو نہیں کھجلایا۔ معلوم ہوتا تھا اُس کے آبلوں میں اُبلتی پیپ ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ آگے سنانا شروع کرے اس نے قافلہ سالار کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا تو اُس کا خون منجمد ہونے لگا۔ اس نے چاہا کہ نظریں جھکا لے لیکن اس کے ایسا سوچتے ہی آبلہ بردار نے وحشت ناک قہقہہ لگایا —— تم مجھے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے —— کیا کہانی سُننے کے ساتھ ساتھ تمہارے گھناؤنے جسم کو دیکھنا لازمی ہے؟ —— بالکل، ورنہ تم اپنا عکس کس شیشے میں دیکھو گے —— تو سُنو!

ایک دن دس سوداگر میرے پاس آئے۔ ان کے ایک سو اونٹ مال سے لدے کھڑے تھے۔ انھیں ریگستان جلد پار کرنا تھا۔ میں سفر سے لوٹا ہی تھا۔ تھکان سے نڈھال تھا لیکن انھوں نے اصرار کیا —— تمہارے سوا ہمیں کسی پر اعتماد نہیں۔ ہمارے بیوی بچے بھی تم پر یقین رکھتے ہیں۔ تمھیں ہمارے ساتھ جانا ہی ہو گا —— دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ہی ہم چل پڑے۔ جیسے جیسے سورج سر پر آنے لگا میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا ہونے لگا۔ ایک سو اونٹوں کی لمبی قطار دیکھ کر میں سنہری سپنے بُننے لگا۔ اُن پر لدا مال مجھے بے قابو کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا —— ایک دن میں پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ جلتے ہوئے صحرا کی آتشیں کوکھ سے نکل کر کہیں بھی جا کر زندگی بھر چین سے رہ سکتا ہوں۔ مسافتوں کی مشقت سہتے برسوں بیت گئے ہیں۔ ایسا موقع پھر نہیں آئے گا۔ بیوی بچے دعائیں دیں گے۔ زندگی بھر بھٹی میں پڑے کباب ہوتے رہنے سے بچ جائیں گے۔ آسودہ حالی کسے نہیں چاہیے۔ ایک سو اونٹوں کی مال و زر سمیت ملکیت —— اتنا کہہ کر اس نے فلک شگاف نعرہ لگایا اور اپنے بدن کو بُری طرح کھجانے لگا۔ اُس کی آہ و بکا ریگستان کے طول و عرض میں گونجنے لگی۔ قافلہ سالار نے دیکھا چشمے کا پانی اور بھی نیچا ہو گیا ہے۔ ہوا کے ساکن ہوتے ہوئے پتے کھڑکھڑانے لگے ہیں۔ پتے اتنی جلدی کیسے سوکھ گئے۔ فلک شگاف نعرہ اور صحرا گیر آہ و بکا سُن کر بھی خیمے میں سوئے ہوئے لوگ کیوں نہیں جاگے۔ فرطِ حیرت سے اُس کا دماغ ماؤف ہونے لگا —— تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو۔ میری طرف دیکھو —— زخم زدہ چلّایا۔

جب دوپہر ہوئی میں نے لُو کی شدّت کا ذکر کرتے ہوئے سب آدمیوں کو اپنے چہروں پر گیلا کپڑا لپیٹنے کے لیے کہا۔ انھوں نے اونگھنا شروع کیا تو اونٹ سے اُتر کر میں نے خنجر نکالا اور دوسرے اونٹوں پر لدی پانی سے بھری مشکوں کو چیرنے لگا۔ میری حیرانی کی حد نہ رہی جب دسویں مشک کے پیٹ میں چھُرا گھونپتے ہی تمام اونٹ اپنے مالکوں اور مال سمیت بے تحاشہ بھاگ نکلے۔ صرف میرا اونٹ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میں اُس کے پاس پہنچا تو اُس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بڑبڑایا اور اپنی گردن لمبی کر کے مجھے چبا ڈالنے کے لیے جبڑے کھولنے لگا۔ میں اس وار کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ سرپٹ بھاگا۔ اونٹ نے میرا پیچھا کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک گڑھا ہے وہاں پہنچ کر اس میں کود گیا۔ گڑھے کی تہہ میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھا اونٹ منڈیر پر گردن رکھے اندر جھانک رہا تھا۔ وہ سارا دن وہیں بیٹھا مجھے دیکھتا رہا اور میں تھک ہار کر سو گیا جب میری آنکھ کھلی رات کافی بیت چُکی تھی۔ یونہی کروٹ بدلی تو میرا پاؤں کسی نرم چیز سے چھو گیا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دیکھا ایک مہیب سانپ کنڈلی مارے سویا پڑا ہے۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ لگتا تھا دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو سمیٹ کر کنوئیں کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کھڑا ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ چیخ سُن کر سانپ جاگا اور مسحور کن نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا —— آبلہ بردار خاموش ہُوا تو قافلہ سالار کانپ رہا تھا۔ گرد و پیش میں عجیب و غریب آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ گھاس کو چھُو کر دیکھا وہ پژمردہ ہو چکی تھی۔ چشمے کا پانی اور بھی نیچا ہو گیا تھا لیکن جلد ہی وہ مری ہوئی آواز میں بولا —— آگے کہو۔ آگے کہو تم خاموش کیوں ہو گئے —— آبلہ بردار نے ایک دہشت ناک چیخ ماری

اور کہنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد سانپ نے اپنا پھن میرے ہاتھ پر رکھا۔ اور ایک دُودھیا منکا اُگل دیا۔ پھر اُس نے مرے ہاتھ کو پھن کے سہارے اُٹھایا اور میرے مُنہ کے قریب کر دیا۔ مجھے لگا وہ مجھے منکا مُنہ میں ڈالنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ منکا مُنہ میں رکھا تو اس میں سے شہد جیسا میٹھا دودھ رسنے لگا۔ اُسے چوستا ہوا میں پروردگار کا شکر یہ ادا کرنے لگا اور سانپ کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر اُس کے سامنے سجدہ میں جُھک گیا ——— ذرا دیر تک رکنے کے بعد آبلہ بردار آگے بڑھا۔

دوسری صبح سانپ کنوئیں کی دیوار پر چڑھنے لگا۔ جب اُس کا پھن کنوئیں کی منڈیر سے جا لگا تو دُم ہلا کر اس نے مجھے اشارہ کیا۔ پتہ نہیں کس طرح میں اُس کی دُم پکڑ کر کنوئیں سے باہر نکل آیا۔ منکے سے چوسے ہوئے دودھ نے مجھے بے مثال طاقت اور پھرتی بخش دی تھی۔ قافلہ سالار نے دیکھا کہانی کا یہ حصہ ختم ہوتے ہوتے چشمے کا پانی اوپر اُٹھنے لگا تھا۔

کنوئیں سے باہر آ کر دیکھا اُونٹ مر گیا تھا۔ اب سانپ میرے آگے آگے چلنے لگا اور میں کسی انجانی کشش کے تحت اس کے پیچھے کھنچا چلا گیا۔ چلتے چلتے میرے دل و دماغ پر سانپ کے پھن میں چُھپا منکا چھانے لگا۔ یہ سانپ مجھے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا کر غائب ہو جائے گا اور منکا اس کے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ زندگی بھر کی کمائی یہ منکا ہو سکتا ہے۔ ایک سو مال بردار اونٹوں کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ ایسی نادر اور نایاب چیز کا مالک ہونا کتنی بڑی بات ہے۔ قارون کا خزانہ بھی اِسے نہیں خرید سکتا ——— چشمے کا پانی اب بہت نیچا ہو گیا تھا۔ درختوں کے بچے کھچے پتے اب کھڑکھڑا کر نیچے زمین پر گرنے لگے تھے۔ گھاس تو جیسے جل کر راکھ ہو گئی تھی ——— منکے کو پانے کے لیے میں بے قرار ہونے لگا۔ مجھے محسوس ہوا اسے حاصل کیے بغیر میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا گروہ پیش سائیں سائیں کرنے لگا اور ———

چلتے چلتے ہم درختوں کے جُھنڈ کے نیچے پہنچے۔ سانپ ہری گھاس پر رُک کر آرام کرنے لگا۔ میں نے بھی چشمے سے شیریں پانی پی کر تسکین حاصل کی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی ایک موٹا سا ڈنڈا پڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے بازو پھڑکنے لگے۔ ایک نظر سانپ کی طرف دیکھ کر میں نے ڈنڈا اُٹھا لیا اور سانپ ——— سانپ تلملا کر اُٹھا اور شعلہ بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ... دہشت سے تھر تھر کانپتا ہوا میں زمین میں گڑا کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنا مُنہ کھولا اور میرے جسم پر تھوک دیا۔ زہر کے چھینٹے اوپر پڑتے ہی میرا وجود جلنے لگا۔ سانپ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا مگر چشمہ اُسی دم سوکھ گیا۔ اور پیڑ مرجھانے لگے۔ میں پیاس سے پاگل ہوا مارا مارا پھرنے لگا۔ اب نخلستان مجھے دیکھتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ تم جیسا قافلہ سالار جب بھی مجھے بلاتا ہے میں پہنچ جاتا ہوں۔ اپنی کہانی سُنانے کے بعد چل دیتا ہوں۔ قافلہ سالار مجبوراً میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔

اپنی کہانی ختم کر کے آبلہ بردار اُٹھ کر چل دیا۔ لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی قافلہ سالار کو اُس کے پیچھے چلنا پڑا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس کے کانوں میں آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ اُسے لگا جیسے بھاگے ہوئے اونٹ واپس لوٹ رہے تھے اور خیموں میں سوئے ہوئے لوگ جاگنے لگے تھے۔

●●

بقیہ : مارکس اور مارکسزم

دانشور ہیں۔ جدید سوشلزم کی ابتدا انہی لوگوں کے ذہن میں ہوئی تھی"

سوویٹ یونین میں جو کچھ ہوا اس کے لیے لینن اور اس کے بعد اسٹالن کی بدسرشتی کو کتنا ہی ذمہ دار ٹھہرایا جائے لیکن مارکس پر بیکونن کی تنقیدوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان سارے عوارض کے جراثیم خود مارکس کے نظریے میں موجود تھے۔ لہٰذا کلیت کیشی اور نظام جبر کا بانی مارکس ہی کو سمجھنا چاہیے لینن اور اسٹالن تو اس کے صرف شاگرد تھے۔

●●

بقیہ : غیر ادعائی انداز نظر کی ضرورت

ان دنوں یہ بڑی شکایت ہے کہ حکومت کا دائرہ کار بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر ہم اس دائرۂ کار کو محدود کرنا چاہتے ہیں تو بیشتر ذمہ داریاں ہمیں خود قبول کرنی چاہیئے۔ صرف حکومت کی طرف دیکھتے رہنے کی روش مستحسن نہیں۔

●●

غزلیں

فضا ابن فیضی

سب کو خوابوں کے نہ ایوان میں رکھ
میں حقیقت ہوں مجھے دھیان میں رکھ

راہزن پھرتے ہیں بستی بستی
گھر کا سرمایہ، بیابان میں رکھ

شب پرستوں کی ہے دنیا پیارے
اپنے سورج کو گریبان میں رکھ

کیا کرے گا تو یہ مٹھی بھر دھوپ
آگ سینے کے خیابان میں رکھ

بے صدا قریۂ احساس ہوا
انگلیاں اب نہ یہاں کان میں رکھ

کسی دستک کا اجالا نہ سہی
شمع یادوں کی تو دالان میں رکھ

فرحت انگیز ہے باہر کی ہوا
کھڑکیاں ذہن کے ایوان میں رکھ

ہے دروبستِ معانی ان سے
کلک، لفظوں کی پہچان میں رکھ

شہر تا شہر ہے زخموں کا پڑاؤ
اپنا خیمہ ابھی میدان میں رکھ

اے فضاؔ لَے کا یہ شعلہ نہ بجھے
اتنا آہنگ تو اوزان میں رکھ

مئو ناتھ بھنجن، یوپی

قیصر قلندر

اس تیرہ سرزمیں سے مثالِ قمر چلو
دیکھو فراز نور نہ نشیب سفر چلو

باہیں اٹھائے یاد کوئی دلنواز یاد
تم کو پکارتی ہے سرِ رہگذر چلو

دیکھو وہ کربلائے تمنا ہے اس طرف
صحرا لہو لہو ہے چلو بے خطر چلو

آنکھوں میں آرزو کے جلا کر ہو چراغ
تاریکیوں سے نور اگاؤ، مگر چلو

کہرام خواہشوں کا بپا ہے قدم قدم
اپنی متاعِ درد لیے سوچ کر چلو

ہر منظرِ حیات یہاں ہے شفق شفق
رنگِ حنا سے تم نہ بچا کر نظر چلو

شائستۂ بہار ہے ہر منظرِ خزاں
نغموں کے شامیانے سجے نغمہ گر چلو

میں شوقِ ناتمام ہوں اک حسنِ ناتمام
میرے لیے کرو نہ کبھی آنکھ تر چلو

آل انڈیا ریڈیو، نئی دلی

کیف احمد صدیقی

سوچتا ہوں رات جو سورج تھا دائیں ہاتھ میں
صبح کیسے ڈھل گیا وہ میرے بائیں ہاتھ میں

ہم اگر کچھ اور اپنے ذہن و دل روشن کریں
دوستو یہ ماہ و انجم جگمگائیں ہاتھ میں

حل نہ ہو پایا اگر قحطِ زمیں کا مسئلہ
یہ بھی ممکن ہے کہ ہم فصلیں اگائیں ہاتھ میں

دشتِ چشم و قلب میں بھی جو نظر آتا نہیں
آؤ ہم تم کو وہی منظر دکھائیں ہاتھ میں

جب حصارِ خوف سے آزاد ہو جاتا ہے دل
قید ہو جاتی ہیں تب ساری بلائیں ہاتھ میں

جب مری سانسوں سے یہ ماحول یخ بستہ ہوا
منجمد ہونے لگیں جلتی ہوائیں ہاتھ میں

شاعری کی یہ شبِ تاریک ڈھلتی ہی نہیں
کیف کب تک ہم چراغِ فن جلائیں ہاتھ میں

گورنمنٹ انٹر کالج، سیتاپور، یوپی

سرشار بلند شہری

تو بھی دریا ہے جنوں خیز گزر بھی
وادیِ سنگ کے سینے میں اتر بھی

قید کرلیں چلو سورج کی شعاعیں
ہاتھ آجائیں گے خوشرنگ ثمر بھی

اک ترا خواب ہی آنکھوں میں نہیں ہے
جگمگاتے ہیں کئی اور سفر بھی

وہ جزیرہ ہوں جہاں دھوپ نہیں ہے
کوئی سورج کی کرن پھینک ادھر بھی

ذہن تو پہلے ہی مفلوج تھا اپنا
دھند میں لپٹی رہی برقِ نظر بھی

نیل گوں آگ سے تشکیل ہوئی ہے
اپنے سائے سے لرزتا ہے بشر بھی

لطف الرحمٰن

ردائے ابر نہیں، خیمۂ غبار نہیں
مرا سفر کسی پہلو سے سازگار نہیں

تنی ہوئی ہے دھنک کی طرح لہو کی کماں
لگا وہ تیر جو منظر کے آر پار نہیں

ہماری راہ سے لشکر غموں کے گزرے ہیں
ہمارے جسم پہ زخموں کا کچھ شمار نہیں

کھلی ہوئی ہے زمستاں کی دھوپ آنگن میں
چلے بھی آؤ کہ موسم کا اعتبار نہیں

کچھ اور دیر جلائے رکھو لہو کے چراغ
خلیجِ شب ہے یہ صحرائے بےکنار نہیں

ہماری خاک کو رکھ کر ہوا کے رستے میں
دیا ہے غم بھی اک ایسا جو پائدار نہیں

ظفر غوری

ہمکتی کونپلوں کو خشک گھاس کردے گی
ہوا درختوں کو پھر بے لباس کردے گی

شگفتہ پھول ہیں، محفوظ رکھو موسم سے
یہ سخت دھوپ تو پھولوں کا ناس کردے گی

سلگتے چاند سا میں تیرے ساتھ ساتھ رہا
سفر کی شام تجھے بھی اُداس کردے گی

اسی سبب تو میں دشتِ بلا میں چُپ چُپ تھا
یہ آپ بیتی تمہیں بدحواس کردے گی

نظر میں اُڑتی رہی یوں ہی گردِ گمرہی!
تو جسم و جاں کو بہم ناشناس کردے گی

اُتر ہی آؤں گا اک دن خلا کے مسکن سے
ہوا کو قید یہ مٹی کی باس کردے گی

جیو چیپر کی چال، احمد آباد ● ٹی۔ این۔ بی کالج، بھاگلپور، بہار ● برج راج پورہ، کوٹہ

تیسری دنیا اور سوویٹ یونین

گوپال متل

نیروبی میں تجارت اور ترقی کے موضوع پر اقوام متحدہ کی جو کانفرنس ہو رہی ہے اس میں سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ کے ممالک نے جو رویہ اختیار کیا اس سے تیسری دنیا کو کافی مایوسی ہوئی۔ روس کے اس رویے کو برملا طور پر غیر تسلی بخش قرار دیا جا رہا ہے۔

منیلا میں جو اعلان جاری ہوا تھا اس میں ترقی یافتہ ممالک سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی قومی پیداوار کا ایک فیصدی حصہ ترقی پذیر ممالک کو بطور امداد دیں۔ کمیونسٹ ممالک نے یہ کہہ کر اسے ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ وہ کبھی نوآبادکار نہیں رہے اور مغرب کی دولت مندی اور ترقی پذیر ممالک کا افلاس نوآبادکارانہ لوٹ کھسوٹ ہی کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ "ٹائمز آف انڈیا" کے نامہ نگار سوامی ناتھن ایس۔ آئر نے نیروبی سے اپنے مکتوب میں لکھا ہے "یہ نظریہ کہ یورپ کی دولت مندی اور تیسری دنیا کے افلاس کا باعث نوآبادکارانہ لوٹ کھسوٹ ہے حقائق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ تمام یورپی ممالک میں صرف چھ ممالک کو نوآبادکار کہا جا سکتا ہے اور ان میں سے دو اسپین اور پرتگال نوآبادکاری کے بل پر دولت مند بننے میں بری طرح ناکام رہے۔ مغرب کے امیر ترین ممالک سویڈن، سوئٹزرلینڈ، مغربی جرمنی، ناروے اور ڈنمارک ہیں اور ان میں سے کوئی بھی سامراجی طاقت نہیں تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب برطانیہ ہندوستان سے گیا تو ہندوستان دیوالیہ ملک نہیں تھا اور اسٹرلنگ میں اس کا اندوختہ اتنا تھا جو پہلے کبھی نہیں رہا تھا۔"

سوویٹ یونین کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ نوآبادکاری کے خاتمے کے بعد بھی یورپ تجارتی ہیر پھیر سے تیسری دنیا کو لوٹتا رہا ہے کیونکہ سوویٹ روس نے تیسری دنیا کو کسی وقت بھی یہ پیش کش نہیں کی کہ وہ اسے مغرب کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے ممالک کے مقابلے میں کم قیمت پر مال سپلائی کرے گا یا ان کی چیزیں اونچے نرخوں پر خریدے گا۔

قرضوں کی واپسی کے معاملے میں بھی سوویٹ یونین کا رویہ کافی سخت گیرانہ ہے۔ شری سوامی ناتھن کے الفاظ میں "حقیقت یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں ہندوستان جیسے روس کے بہترین دوستوں کو بھی قرضوں کی واپسی کے سلسلے میں جو ادائیگیاں کرنا پڑیں وہ نئی امداد کے مقابلے میں زیادہ تھیں قرضوں کی واپسی کے سلسلے میں کسی قسم کی سہولت دینے سے روس کے انکار سے بہت سے ترقی پذیر ممالک کو مایوسی ہوئی ہے۔ متعدد لاطینی امریکی اور افریقی ممالک نے روس کے اس رویے پر نکتہ چینی کی ہے لیکن یہ نکتہ چینی بے نتیجہ رہی ہے۔"

درحقیقت نوآبادکاری کے سلسلے میں روس کے دعاوی کا ساتھ خود اس کا سابقہ رویہ بھی نہیں دیتا۔ ۳۶ برس پہلے جون کے مہینے میں سوویٹ یونین کی فوجوں نے خفیہ سوویٹ نازی پیکٹ کی دفعات کے مطابق بسرابیا اور شمالی بیوکووینا پر قبضہ کیا تھا۔ اگست ۱۹۳۹ء میں جو خفیہ سوویٹ نازی معاہدہ ہوا اس میں حلقہ ہائے اثر قائم کرنے کی خفیہ دفعات موجود تھیں۔ پولینڈ کی دو حصوں میں تقسیم اسی خفیہ معاہدے کا نتیجہ تھی۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہٹلر کی فوجوں نے پولینڈ کو پامال کیا تو سرخ فوج نے پولینڈ پر مشرقی سمت سے حملہ کر دیا اور مغربی بیلو رشیا اور مغربی یوکرین پر قبضہ جما لیا۔ اس کے ایک ماہ بعد سوویٹ یونین نے لیتھوانیا لٹویا اور اسٹونیا کی بالٹک ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔

سوویٹ یونین کو جو محکوم مسلم علاقے زار کی حکومت سے ورثے میں ملے تھے ان پر بھی اس نے تسلط برقرار رکھا ہے جس میں نظریاتی مقاصد کو نہیں بلکہ اس کے قومی مفادات کو دخل تھا۔ مثال کے طور پر تاشقند رسوویٹ کے ہاتھوں خوقند حکومت کی جو تباہی ہوئی اس کا ذکر لینن کے ایک قریبی ساتھی سفاروف کی زبانی سنیے۔ یہ شخص جو ۱۹۱۹ء میں قائم کیے جانے والے ترکستانی کمیشن کا ممبر تھا اپنی کتاب مطبوعہ ۱۹۲۱ء میں لکھتا ہے:

"جب ترکستان سوویٹ کی طاقت ایک غیر مقامی اور جارح قوت کی حیثیت سے مسلمانوں کی مخالفت کر رہی تھی تو اسے ایسے حلیف ملے جن کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ حلیف اسے

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

یادوں کی صلیب

م۔ق۔خان

"روپا! روپا! ابھی ندی جاکر نہا آ۔ پو پھٹنے سے پہلے چلی آنا... چودھری کے گھر پوجا ہے نا۔" روپا کی موسی نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے جگایا۔

"ابھی تو اندھیرا ہوگا موسی۔" روپا نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"اندھیرا؟" دیکھتی نہیں کیسی چاندنی کھلی ہے؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے موسی۔" روپا سہمی ہوئی بولی۔

"ڈر؟ بیوقوف! کہیں غریب کو بھی ڈر جیسے چوچلے اچھے لگتے ہیں؟ ڈر کس بات کا؟"

"وہ پیپل ہے نا موسی، وہ پیپل... وہاں شاید..."

"اُفوہ! جا قریب جانا تو تالی بجا دینا۔" اتنا کہتی ہوئی موسی گھر سے نکل گئی۔

روپا ندی جائے نہ جائے کی کشمکش میں دیر تک کروٹ بدلتی رہی ——— لیکن ڈھیر ساری مٹھائیوں کی یاد نے اُس کے بدن میں ایک عجیب سی پھرتی بھر دی اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کمر پہ گاگر رکھی، آنچل کے کونے میں راکھ باندھی اور چل پڑی۔

زرد چاند اُفق پر اُگے درختوں کے جھرمٹ کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ اُجلی چاندنی پھیلی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ سڑک پار کر کے وہ پگڈنڈی پر سنبھل سنبھل کر چلنے لگی۔ وہ اس پیپل کے قریب آئی جس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سنتی آئی تھی۔ اُسے موسی کی بات یاد آئی۔ جیسے ہی تالی بجانے کا ارادہ کیا پیپل کے پتوں سے آنکھ مچولی کھیلتی چاندنی میں اس نے ایک سفید پوش مرد دیکھا۔ روپا کی گھگھی بندھ گئی۔ گاگر ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہی اور اس کے پاؤں بید لرزاں کی طرح کانپنے لگے۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب تھا کہ روپا چکرا کر زمین پر گر جاتی کہ اُس نے بڑھ کر روپا کو اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔

خوف سے روپا کی آنکھیں بند تھیں، ہونٹ کانپ رہے تھے اور کچھ مبہم الفاظ اُن سے باہر آ رہے تھے۔ اُس نے روپا کی پیٹھ سہلائی اور نہایت شیریں لہجہ میں کہا "ڈرو نہیں۔ میں کوئی آسیب اور جن بھوت نہیں ہوں نہ چور اُچکا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم اس قدر خوفزدہ ہوگئیں"

اس اجنبی کے طرزِ گفتگو، لہجے کی شرافت اور انسانی آواز سے روپا کو ذرا سکون ملا۔ دو میٹھے بول، اس کے لیے احترام کے جذبات... روپا کے کان ان سے ناآشنا ہو چکے تھے۔ "پگلی، چڑیل، ڈائن" جیسے الفاظ ہی تو اس کا مقدر تھے! گاؤں کے نوجوانوں کے لیے تو وہ مذاق کا ذریعہ بن گئی تھی۔

اُس نے روپا کی ڈھارس بندھائی۔ روپا مطمئن ہوگئی "تم آدھی رات رہتے کہاں جا رہی ہو؟"

"ندی... ! کیوں؟ ابھی رات بہت زیادہ ہے؟" موسی نے کہا..."

روپا اب بھی اُس اجنبی کے بازوؤں کی گرفت میں تھی پر گرفت اسے گراں نہیں گزر رہی تھی۔ روپا اس کے ریشمی کرتے سے کھیل رہی تھی۔ وہ کبھی اس کے شانوں پہ ہاتھ پھیرتی کبھی ہاتھ میں لے کر اس کی انگلیوں کو غور سے دیکھتی جن میں انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ انگوٹھی کے نگینوں کو بالکل آنکھوں کے قریب لے جاکر دیکھتی۔

"چلو میں تمھیں ندی تک چھوڑ آؤں۔" اجنبی نے پیش کش کی۔ روپا فوراً چل پڑی۔ پگڈنڈی کی ناہمواری اور پیچ و خم کا خیال کیے

معروف گنج ——— مسجد لین ——— گیا ——— (بہار)

بغیر وہ اجنبی کے شانہ بشانہ چلنا چاہتی۔ اس کوشش میں وہ کئی بار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچی۔ جب سطح راستہ ملا تو وہ اُس سے پوچھ بیٹھی" تم کون ہو؟ وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے؟"

" میں کرپال چودھری کے گھر آیا ہوں۔ ان کے یہاں پوجا ہے نا؟"

" ٹھیک، ٹھیک! موسی انھیں کے گھر گئی ہے۔ مجھے بھی ندی سے لوٹ کر جانا ہے" بات کرتی ہوئی، رویا استعجاب و تجسس کے ملے جلے جذبات سے مسحور اس اجنبی کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی جیسے وہ اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

اجنبی بھی اُس کا حسین چہرہ، سیاہ اُلجھے بال، دبلے پتلے بازو اور کلی کی گردن جیسی کمر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے رویا کی کمر سے گاگر الگ کر کے زمین پر رکھ دی۔ اس نے رویا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ انھیں آنکھوں سے لگایا، انھیں بوسے دیے اور رویا کو سینے سے لگا لیا۔ یہ ساری باتیں اتنی اچانک اور غیر متوقع پیش آئیں کہ رویا تذبذب میں پڑ گئی۔ وہ احتجاج بھی نہ کر پائی۔ حقیقت یہ تھی کہ اُس اجنبی کے لیے اس کے دل میں بھی چاہت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ اُس کے سینے سے لگی، اس کی باہوں کی گرفت میں بندھی وہ محظوظ ہوتی رہی۔ وہ بوسے لیتا رہا اور رویا لذت محسوس کرتی ہوئی چمٹتی گئی۔

گھٹا ٹوپ اندھیرے آسمان پر جیسے بجلی کی روپہلی لہر لمحہ بھر کے لیے فضا میں رنگ و نور بکھیر جاتی ہے اُسی طرح رویا کے شل اور جامد اعضا میں برقی لہر سی دوڑ گئی۔

اجنبی نے رویا کا چہرہ اوپر کی جانب اٹھایا۔ رویا کا پورا چہرہ روشنی میں آیا تو اس نے کہنا شروع کیا" میرے خوابوں کی تعبیر، میری آرزوؤں کی چاندنی! تم آج تک کہاں تھیں؟"

رویا ابھی ان جملوں کا مفہوم بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ اجنبی پھر اُسے سینے سے لگا کر بوس و کنار میں مشغول ہو گیا۔ رویا موم کی طرح اس کی گرفت میں پگھلتی جا رہی تھی۔

لیکن چند ثانیوں کے بعد اس نے جس غیر متوقع طور پر رویا کو اپنی باہنوں میں کس لیا تھا اسی طرح اچانک وہ رویا سے الگ ہو گیا۔

اُسی وقت شہاب ثاقب کے گرنے سے سکوتِ شب پر روشنی کا ایک تازیانہ سا برسا اور دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس اجنبی کے چہرے پر ایک عجیب خوف ایک اضمحلال پھیکی چاندنی میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ اُس نے اکتائے ہوئے سے لہجے میں رویا کو کہا" چلی جاؤ! بھگوان کے لیے میرے پاس سے دور ہٹ جاؤ۔۔۔"

رویا متوحش ہو کر بولی" کیا ہوا؟ تم مجھے ندی تک۔۔۔"

" نہیں، نہیں!۔۔۔ تم معصوم دیوی ہو، بے گناہ۔۔۔۔ اُف!" اور وہ گرتا پڑتا واپس دوڑتا ہوا بھاگنے لگا۔

رویا بے حس و حرکت اُسے بھاگتا دیکھتی رہی۔ اس کی فہم نارسا اس تغیر کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ بہت دیر تک اُسی جانب دیکھتی رہی۔ مشرقی اُفق پر شفق کا سرخ آنچل لہرانے لگا۔ پاس کے درختوں کی شاخوں پر چڑیوں کی چاؤں چاؤں سے اس کا دھیان ٹوٹا۔ اب بھی اس کے کانوں میں اجنبی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ انگ انگ میں آگ بھڑک اُٹھی تھی ——— ایک ناقابلِ اظہار تشنگی!

وہ تھکے تھکے قدموں سے ندی پر آئی۔ اس نے گاگر پانی میں ڈالا تو گاگر میں داخل ہوتے ہوئے پانی کی گڑگڑاہٹ نے اس اجنبی کے قہقہے کی یاد تازہ کر دی۔ وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر پانی سے کھیلنے لگی۔ کچھ ہی دیر پہلے گزرے نشاط انگیز لمحات اب بھی اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ لوحِ احساس پر اُن کیف آور تجربات کے نقش اب بھی تابندہ و پائندہ تھے۔ ایک لازوال ٹیس، غیر فانی کسک سے اس کا دلِ مجروح چیخ رہا تھا۔

چٹان پر بیٹھے بیٹھے اُسے تنہائی کا احساس ڈسنے لگا۔ وہ مغموم ہو گئی۔ اپنی بے رنگ و بے نور زندگی، بے معنی وجود سے اُسے گھن سی آنے لگی۔ اپنے ہونٹوں پر الٹی ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر اس نے ایک کوشش موہوم کی کہ شاید اسی کیف آگیں مسرت، اسی نشہ آور لذت کا احساس ہو جو اس اجنبی کے ہونٹوں نے بخشی تھی۔ اس نے اپنے بھیگے پاؤں پانی سے باہر نکالے اور اپنے ٹخنوں کو سختی سے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا لیکن لا حاصل! آخر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ پانی کے دباؤ سے اُس نے محسوس کیا جیسے

پھر کوئی ایک بار اُسے باہنوں میں لینے کی کوشش کر رہا ہے لیکن فوراً ہی یہ کیفیت ختم ہو گئی۔

بے چین و مضطرب وہ واپس چل پڑی۔ پیپل کے قریب آ کر اس نے ہر طرف دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی نظر آیا۔ گھر آ کر وہ اَوندھے منہ لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اُسے خیال آیا کہ وہ چودھری کے یہاں ہوگا اور وہ چل پڑی۔ پوجا کی بھیڑ بھاڑ شروع ہو چکی تھی اور وہ اس اجنبی کو وہاں نہ تلاش کر پائی۔

ایک بار پھر اُسے دیکھنے کی خواہش وہ سینے سے لگائے بیٹھی رہی۔ شب و روز ہفتوں اور مہینوں کے قالب میں ڈھل گئے لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ چند لمحوں کی یاد اس کی تاریک زندگی میں کرن بن کر چمکتی اور پھر اس کی ویران زندگی کے تاریک سائے اس کرن کو نگل جاتے۔ برسوں کی بھولی بسری یادوں کی راکھ کے نیچے سے دبی، دم توڑتی چنگاری پھر سے روشن ہو اٹھی تھی۔ روپا کے غبی ذہن میں ماضی کے ہیولے کھال اُتار کر لوٹ رہے تھے۔ اس کی یادوں کی ڈور سلجھنے لگی تھی۔ اُسے رہ رہ کر اپنا گھر یاد آتا لیکن کوئی واضح تصویر نہ اُبھرتی۔ پھر اُسے اپنا شوہر یاد آیا پھر وہ بچہ جس کی چیخ سے اُس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ ذہن پر زور ڈالتی کہ شوہر کے خد و خال یا نام یاد آئے لیکن ناکام رہتی۔ بے بس ہو کر اس نے ایک شب موسی سے پوچھا "موسی تمھیں کچھ یاد ہے اُن کا کیا نام تھا؟ وہ کیسے لگتے تھے؟"

روپا کے سوال نے موسی پر جیسے بجلی گرا دی "روپا کیا کرو گی یہ سب جان کر؟"

"کیوں، کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے؟" روپا نے تیکھے لہجے میں احتجاج کیا۔

موسی نے کچھ جواب نہیں دیا تو روپا نے پھر دریافت کیا "موسی ایک بچہ بھی تھا نا؟"

"ہاں، ہاں! شوہر تھا، بچہ بھی تھا لیکن یہ سب تو بہت پہلے کی بات ہے اب... !"

"تو بتاؤ نا وہ کہاں ہیں؟ مجھے ان کے پاس کیوں نہیں پہنچا دیتیں؟"

"وہ کلکتہ میں رہتے ہیں۔ وہیں تمھارا بچہ بھی رہتا ہے۔ میں خط لکھوا دوں گی اُن کے پاس۔ اب چپ چاپ سو رہو" موسی نے رُندھے گلے سے تسلی دی اور کسی طرح طوفان کو ٹال دیا۔ اس کے بعد موسی دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی "بھگوان روپا کو پہلے کی جیسی غبی، پاگل، بیوقوف رہنے دے۔ اس کی یادداشت نہ لوٹنا۔ اس کے دل میں آرزوؤں کے دیے نہ جلا۔ ماں باپ اسی کے غم میں گھُل گھُل کر مر گئے۔ شوہر اس کی مجنونانہ حرکتوں سے تنگ آ کر سدا کے لیے چھوڑ گیا۔ اب میں اکیلی کیا کروں گی؟"

ساری رات دفن شدہ ماضی کے واقعات چلتے پھرتے پیکر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے لہراتے رہے۔ روپا عہدِ شباب میں داخل ہو رہی ہے۔ روپا جیسا کہ نام تھا حُسن و جمال کا مرقع لاثانی تھی —— شباب نے اس کے حُسن کو دو آتشہ بنا دیا۔ وہ مکان کے عقب سے مہندی کے پتے توڑ کر آئی ہے۔ ماں سے مہندی لگانے کی ضد کر رہی ہے... شادیانے بج رہے ہیں۔ روپا دلہن بنی ہے شہنائی سے گھر آنگن گونج اُٹھے ہیں... وہ رخصت ہو رہی ہے.... اور روپا ماں بن گئی...

خلا میں یہ سوانگ رچتے رہے اور موسی کی آنکھوں کے کٹورے چھلکتے رہے۔

روپا پر بچے کی پیدائش کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ بہت زیادہ متلون مزاج ہو گئی۔ بچہ روتا تو روپا کو پاگل پن کے دورے پڑنے لگتے۔ شوہر نے لاکھ جتن کیے لیکن اس کی حالت میں کوئی سُدھار نہ آیا۔ ماں باپ نے ڈاکٹروں، ویدوں اور حکیموں سے علاج کروایا۔ مولوی، پنڈت اور اوجھا تک کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن بے سود!

ماں باپ کی موت کے بعد موسی روپا کے ساتھ زندگی کی دار پر مصلوب ہوتی رہی تھی۔ نہایت مشکل سے اُس نے روپا کو کام کاج کرنے پر راضی کیا تھا اور وہ چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی تھی کہ روپا کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا جس نے اس کی یادداشت کی [illegible] کو ہوا دے دی۔ موسی کا سکونِ قلب پارہ پارہ ہو گیا۔

موسی اسی اُدھیڑ بُن میں اُلجھی رہتی۔ ادھر وقت نے یوں انگڑائی لی کہ روپا کے جذبات نے اور شدت اختیار کی۔ سادہ لوح معصوم سی اپنے دلی جذبات کا اظہار بغیر کسی مصلحت اندیشی [illegible] پیش کر دیتی۔ وہ برملا کہتی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے تجربات [illegible] لگ جاتی

عورتوں سے کرتی تو وہ اور کرید کر رو پا کے خفتہ جذبات کو ابھار دیتیں۔ جب رو پا انھیں خط لکھنے کو کہتی تو وہ خوب رومان انگیز مضامین اُسے سنایا کرتیں۔ پھر کیا تھا رو پا لفافہ منگا کر ان کی خوب خوشامدیں کرتی اور خط ڈاکیہ کو لیٹر بکس میں ڈالنے کی تاکید کر کے دے دیتی۔ پھر ڈاکیے کے انتظار میں سائبان کے ستون سے لگی دن بھر کھڑی رہتی۔ وہ ڈاکیہ کو دیکھتے ہی بے تحاشہ اس کے پاس دوڑ جاتی "میرا خط آیا۔۔ کلکتے سے میرا خط۔۔۔؟" جواب میں ڈاکیہ سر ہلا دیتا تو وہ غمگین ہو جاتی لیکن پھر اس کے پیچھے دوڑ کر کہتی "کل ضرور آئے گا۔ اور کھو کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ دینا۔ میں یہاں انتظار کروں گی۔ مجھے ہی دینا"

پھر دوسرے دن صبح سے ہی وہ سنگار کرتی۔ دوسری لڑکیوں کی نقالی کرتی ہوئی دیواروں کی سفیدی ہاتھوں سے رگڑ کر چہرے پر ملتی۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی اور ستون سے لگ کر کھڑی رہتی۔ حالات روز بہ روز بگڑتے ہی گئے۔ اس کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ راتوں کی نیند اُچاٹ ہو چکی تھی۔ وہ خود سے گفتگو کرتی "وہ خود نہیں آتے۔۔۔ شاید فرصت نہ ہو۔۔۔ لیکن خط۔۔؟ وہ کیوں نہیں آتا؟۔۔۔ کیا وہ مجھ سے روٹھے ہیں۔۔۔ غصہ ہیں۔۔ نہیں وہ غصہ نہیں ہو سکتے۔ میں ایسی گرم گرم چائے پلاؤں گی کہ وہ مجھے چھوڑ کر اب کبھی نہیں جائیں گے۔ وہ اس بار آ جاتے، میں ان کے ساتھ کلکتہ جاتی!!"

پھر وہ کسی دن اُٹھتی تو سارا گھر صاف کرتی اور نہا دھو کر موسی سے نئے کپڑوں کے لیے ضد کرتی اور موسی سے کہتی "اگر وہ ابھی آجائیں تو مجھے دیکھ کر کیا کہیں گے موسی؟"

اس جاں سوز گھٹن نے اس کی صحت کو کھوکھلا بنا ڈالا۔ وہ بالکل مجبور و معذور اپاہج جیسی ہو گئی تھی۔ دروازے کے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے وہ سامنے راستے پر نظریں جمائے رہتی۔ کوئی مسافر ادھر سے گزرتا تو وہ گردن لمبی کر کے آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرتی۔ راہ گیر اپنی راہ لیتا اور وہ آہ و سرد بھر کر بے سُدھ لیٹ جاتی۔

ایک شام جب شہر میں اندھیرا در و بام پر منڈلانے لگا تھا وہ کسی طرح گھسٹتی رینگتی اس پیپل کے پاس پہنچ گئی۔ موسی گھر آئی اور اس نے روپا کو نہیں دیکھا تو گھبرا کر پڑوس میں دریافت کرنے گئی۔ ایک نے بتایا کہ وہ پیپل کی جانب جا رہی تھی۔ وہ دوڑ پڑی۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ روپا ایک اجنبی سے لپٹی ہے۔

بات یہ تھی کہ روپا پیپل کے پاس بیٹھی تھی کہ وہ اجنبی اس کے پاس سے گزرا۔ روپا نے آواز دی اور جب وہ قریب آیا تو "میرے دیوتا میرے دیوتا!" کہہ کر لپٹ گئی۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ روپا کو سمجھائے لیکن وہ کہتی رہی "نہیں اب میں نہیں جانے دوں گی" وہ اجنبی خوف سے کانپ رہا تھا۔ اُسے یہ خیال ہوا کہ ضرور پیپل کے آسیب نے اس پر حملہ کر دیا ہے۔ جب موسی نے دریافت کیا تو اس اجنبی کے بولنے کے پہلے ہی روپا نے کہنا شروع کیا۔ "میں کہتی تھی نا موسی، وہ آئیں گے، ضرور آئیں گے"

موسی نے لڑکے سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے۔ لڑکے نے بتایا کہ وہ کلکتے سے اپنی ماں روپا سے ملنے آیا ہے

روپا نے اُسے جھنجھوڑ کر پوچھا "تو میرا بیٹا ہے؟ اور وہ نہیں آئے؟ مجھے بلایا نہیں؟"

"ہاں، ہاں میں اپنی ماں کو کلکتہ لے جانے کو آیا ہوں"

"سچ مچ!" اور اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔۔۔

تارِ نفس قہقہے کی مضراب کے متحمل نہ ہو سکے۔ ہچکیوں کی جھنکار نے فضا میں لمحہ بھر ارتعاش پیدا کیا۔۔۔ اور ساز سے آواز جدا ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

●●

شاہد عزیز

دن کی آنکھ میں کنکر

جانے کتنی صدیوں سے
چل رہی ہے یہ دنیا
منزلیں نہیں ہوتیں
صرف نام ہوتے ہیں
آدمی نہیں چلتے
صرف سائے چلتے ہیں
سرد سوکھے کمروں میں
چیونٹیوں کی صورت سے
رینگتے ہوئے سائے
گھٹ رہے ہیں برسوں سے
کاش ایسا ہو جائے
صاف ستھرا سا کوئی
آسمان مل جائے
کیسے پیڑ تھے جن کی
ٹھنڈی چھاؤں میں ہم نے
وقت کچھ گزارا تھا
یہ زمین اپنی ہے
آسماں ہمارا ہے
کتنی جھوٹی باتوں کا
بوجھ سر پہ لادا تھا

پیاس اک سمندر ہے
خواہشوں کے جنگل میں
برف جم رہی تھی اب
دھوپ پھر نکل آئی
زندگی تو دھوکا ہے
وقت ہے نہ موقع ہے
دن کی آنکھ میں کنکر
سورجوں کی دھرتی پر
جا رہے ہیں زور آور
کون جیت پائے گا
کون ہار جائے گا
کس دشا سے آتے ہیں
یہ صداؤں کے پتھر

تیری رہگزاروں میں
کھو گئے ہیں جو لمحے
یاد تک نہیں آتے
بھاگ دوڑ کتنی ہے
وقت ہی نہیں ملتا
رات دن کے پیچھے ہے

ٹوٹے پھوٹے رستوں پر
کتنی دور تک چلتے
تھک کے سو گئے ہوں گے
لوگ کھو گئے ہوں گے
کون آئے گا چھوڑ دو
بند کر لو دروازہ
سو گئیں ہیں سڑکیں بھی
کس طرح سمائے گی
میرے گھر میں تنہائی

میں نے جیب میں بھر لی
روشنی سمندر کی
میری کھوج میں دھرتی
ہر دشا میں جائے گی

نیند کے دھندلکوں میں
آنکھ کھلنے تک یوں ہی
انتظار کرنا ہے

●●

بھیکو گھاٹی ——— اودے پور ——— راجستھان

نظمیں

تنہا تماپوری

(۱)

میری نیند ابھی تک مجھ میں جاگ رہی ہے
میں خوابوں کے پیڑ سے
ٹوٹا
اک پتّا ہوں

(۲)

مجھ سے پہلے ہی
لیٹ جاتا ہے
میرے بستر پہ
سارے دن کا حساب

(۳)

پہیہ کب سے گھوم رہا ہے
تم بھی شاید دیکھ چکے ہو
پھر بھی کیوں تم ساکت نقطے ڈھونڈ رہے ہو

(۴)

لفظ : معنیٰ کی زمیں سے
اُگنے والے
پیڑ کی
خواہش کا بیج

(۵)

زمیں پہ ہی رہو اپنے قد کی سرحد میں
بلندیوں پہ تو مرقد ہے
ہر کسی قد کا !!

رنگم پیٹ ——— ضلع گلبرگہ ——— کرناٹک

گوپال متل | مارکس اور مارکسزم ایک ہمعصر کی نظر میں

باکونن مارکس کا ہمعصر تھا، اس کا حلیف بھی اور حریف بھی۔ اس کے اپنے نظریات کی قدر و قیمت مشتبہ ہے لیکن مارکس کے نظریات پر اس نے جو نکتہ چینی کی ہے وہ بڑی اہم ہے کیونکہ اس سے بہت سے تسامحات کا ازالہ ہوتا ہے۔ کچھ دن پہلے تک یہ کہا جاتا رہا کہ سوویٹ یونین میں جو غیر معمولی ظلم اور تشدد ہوا وہ اسٹالن کی ذاتی خباثت کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد محققین نے پتہ چلایا کہ اسٹالن لینن کا حقیقی جانشین تھا اور روس میں جابرانہ نظام حکومت کے تسلط کی ذمہ داری لینن پر ہی عائد ہوتی ہے۔ باکونن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خرابی خود مارکس کے نظریات میں تھی اور وہ چیز جسے لینن ازم اسٹالن ازم کہا جاتا ہے، مارکس کے نظام فکر میں مضمر طور پر ہی نہیں بلکہ واضح طور پر موجود تھی۔

مارکس پر باکونن کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ مارکسزم کو واحد سائنٹیفک سوشلزم سمجھتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر مارکسزم سائنٹیفک نظریے کی بجائے ایک مذہب اور مابعدالطبیعاتی نظریہ بن جاتا ہے۔ باکونن کے نزدیک مارکس مکمل حاکمیت اور ارتکاز پر مبنی حکومت کا حامی تھا وہ بھی باکونن ہی کی طرح اقتصادی اور سماجی مساوات چاہتا تھا لیکن وہ اس کا حصول ریاستی اقتدار کے ذریعے چاہتا تھا، ایک مطلق العنان اور انتہائی طاقتور ڈکٹیٹرشپ کے ذریعہ جو آزادی کی ضد ہے۔

باکونن کے نزدیک سیاسی آزادی محنت کش عوام کی اقتصادی آزادی کی لازمی اولین شرط تھی اور یہ مقصد اس کے نزدیک نام نہاد انقلابوں کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا خواہ بظاہر وہ پرولتاری انقلاب ہی نظر آئیں۔ باکونن کا خیال تھا کہ جو لوگ انقلاب کے بعد کاروبار حکومت سنبھالیں گے ان کا رتبہ عام مزدوروں سے بلند ہوگا ایسا ہوتے ہی وہ پرولتاری کی بجائے بورژوا اور پرولتاری طبقے کے دشمن بن جائیں گے۔

جہاں تک مارکس کے نظریات کی بنیاد پر قائم شدہ حکومت کے کلیت کیش اور جابر ہونے کا تعلق ہے اس کی تصدیق ٹراٹسکی کے مندرجہ ذیل بیان سے ہو جاتی ہے۔ اس نے ۱۹۰۶ء میں ہی پیشگوئی کر دی تھی:

"لینن کے طریق کار کا نتیجہ یہ ہوگا۔ پہلے پارٹی کی تنظیم پارٹی کی جگہ لے لے گی۔ پھر مرکزی کمیٹی پارٹی کی تنظیم کی جگہ لے لے گی اور بالآخر ایک واحد ڈکٹیٹر مرکزی کمیٹی کی جگہ سنبھال لے گا۔"

باکونن کا خیال تھا کہ انقلاب کے بعد جو پرولتاری کاروبار حکومت سنبھالیں گے وہ فوراً ہی پرولتاری طبقے کی سطح سے اوپر اٹھ کر بورژوا بن جائیں گے۔ لینن کے نزدیک یہ ناگزیر تھا کہ انقلاب کے بعد جو لوگ کاروبار حکومت سنبھالیں وہ محنت کش عوام سے کچھ اوپر کی سطح کے ہوں۔ اس کا کہنا تھا:

"ابھی ہم اس منزل تک نہیں پہنچے کہ محنت کش عوام حکومت میں حصہ لے سکیں۔ کاغذی کارروائی کی بات اور ہے۔ قانون سازی تہذیبی سطح کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مزدوروں کی پست تہذیبی سطح کا نتیجہ یہ ہے کہ سوویٹیں جنہیں پروگرام کے مطابق حکومت کے ایسے آرگن ہونا چاہیے، جنہیں محنت کش عوام چلائیں، درحقیقت حکومت کے ایسے آرگن ہیں جنہیں پرولتاری طبقے کے ترقی یافتہ افراد چلائیں خود محنت کش عوام نہیں"

ایک جگہ تو وہ پرولتاری طبقے پر بورژوا دانشوروں کو بھی ترجیح دیتا ہے۔ اس کے الفاظ میں:

"محنت کش طبقہ اپنی کوششوں سے صرف ٹریڈ یونینوں کا شعور ہی پیدا کر سکتا ہے۔ جدید سوشلسٹ شعور باہر سے آئے گا۔ یہ شعور گہرے سائنسی علم کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ سائنس کے شمع بردار پرولتاری نہیں بلکہ بورژوا

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

شکستِ شیشہ کا ایسا منظر

عطیہ پروین

اور چچا آبا کلیجہ تھام کر رہ گئے۔

کلیجہ تھام لینے کی بات ہی تھی۔ اب تک جس جائداد اور دولت پر ناگ دیوتا کے مانند کنڈلی مارے بیٹھے تھے وہ ہاتھ سے نکل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیسے بند مٹھی کو ذرا سا ڈھیلا پا کر چڑیا پھُر سے اُڑ جائے۔! نواب میاں نے کشوری کی ڈھلی عمر کے باوجود ان کو قبول کر لیا تھا نہ صرف ہاں کہا تھا بلکہ ایک جمعہ کو بات کرنے آئے دوسرے جمعہ کو بارات لے آئے اور جھٹ نکاح پڑھا پٹ سے راج محل اور کشوری کے مالک و مختار بن بیٹھے۔ وہ مالک و مختار بنے تو چچا آبا کو اپنا بوریا بستر گول ہوتا نظر آیا۔

جس دولت کو اب تک سنبھال کر رکھا تھا جس کے اوپر کشوری کی جوانی ان کے جذبات ان کے ارمان اور ان کے خواب قربان کر دینے کی ٹھانی تھی وہی اب بے وفا معشوق کی طرح نواب میاں کی آغوش میں جا گری تھی۔ ابا حضور نے مرتے وقت چچا آبا کو اپنی کل جائداد کا مختار بنانے کے ساتھ یتیم و اسیر بھتیجی کا ہاتھ پکڑا دیا تھا۔ روتے بلکتے چچا آبا نے بھتیجی کو چھاتی سے لگا لیا آنکھیں بند کرتے ہوئے بھائی کو یقین دلایا۔

" بھیا جان! کشور کو میں اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا اپنی آنکھوں کی پُتلی بنا لوں گا . . . "

اور یہی کیا انھوں نے!

دنیا نے دیکھا اور واہ واہ کی!

چچا آبا نے یتیم بھتیجی کے لیے اپنے بال بچّوں کو چھوڑ دیا بس ہر ماہ ایک وزنی رقم ضرور بھیج دیا کرتے تھے اب کیا اتنا بھی نہ کرتے نگوڑے نے تین سو کی نوکری پہ لات مار دی تھی کیا بال بچّوں کے پیٹ پر بھی لات مار دیتے! یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ سال میں دو بار جب کشوری کے لیے بیش قیمت ملبوسات بنتے تو چچا آبا بھی اپنے بچّوں کے لیے ہر ماہ کے ایک جوڑے کے حساب سے بارہ بارہ جوڑے بنوا دیتے۔ فصل کی چیزیں اصلی گھی اور مکھن: ارے یہ تو گھر کی ہی چیزیں تھیں بندھ بندھ کر چلی جاتیں تو کون سا غضب تھا ——! بے چارے چچا آبا نے کشوری کو سچ مچ سینے سے لگا کر رکھا آنکھوں کی پتلی بنا لیا کوئی اپنی آنکھ خود تو نہیں پھوڑ ڈالتا۔! اسی لیے جب کشوری کے لیے اونڈھے سیدھے رشتے آتے تو چچا آبا کو سخت غیظ آتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی اپنی اس قدر پیاری بھتیجی کو وہ ٹٹ پونجیے قسم کے کسی لڑکے سے ساتھ باندھ دیتے مرحوم بھائی کو کیا منہ دکھاتے!

لوگ کہتے " ہاں بھئی یہ تو ہے! پرائی ذمّہ داری بہت بڑی چیز ہے۔ اپنی لڑکی ہو تو کسی کا ڈر نہیں اپنے لیے آپ ہی جواب دہ ہونا پڑتا ہے پر دوسرے کی امانت وہ بھی مرے ہوئے کی . . . نا بھئی بہت ٹھونک بجا کر شادی بیاہ کرنا ہوتا ہے "

ٹھونکتے بجاتے چچا آبا نے برسیں بتا دیں۔ بے چارے پلوں میں لٹیا باندھے کشوری کے رشتے تلاش کرتے رہے۔ کوئی بھی کشوری کے قابل نہ ملا۔ رہیں ان کی لڑکیاں تو بے چاری معمولی قسم کی ہستیاں! بقول شخصے کشوری کی جوتی کی نوک کا ٹھکرایا چچا آبا کی انورا اور اختر کے سامنے جا گرا: ایک معمولی سا انجینیر اور دوسرا حقیر سا ڈاکٹر! کشوری کے بھاؤ بِن تلے کیا تھا چچا آبا نے لوگوں کو گواہ بنایا۔

" بھئی شہر کا رہنا اور آج کل کا ماحول! گھر میں رہنے والی گرہستن ماں ہر دم لڑکیوں کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھر سکتی! میں اپنی کشور کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں اختر اور انور کا باپ زندہ ہے لیکن کشور بن باپ ماں کی لڑکی ہے " یہ کہتے کہتے چچا آبا رو پڑے

تھے: اس لیے میں نے سوچا کسی طرح ان دونوں لڑکیوں کا بوجھ سر سے اتار پھینکوں پھر ہلکے پھلکے ہو کر اپنی کشور کے شایانِ شان رشتے کے لیے ہاتھ پاؤں ماروں!"

چچا ابا نے اپنی دونوں لڑکیوں کو سمجھ بوجھ کر جلدی جلدی انجینیر اور ڈاکٹر کی موٹروں میں ٹھونس دیا الٹا سیدھا جہیز بھی بڑی سے دو دو ٹرکوں میں بھروا کر دامادوں کے گھروں میں جھونک دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اپنی کشور کی دیکھ بھال اب وہ اطمینان سے کر سکیں گے۔ لوگوں نے کہا۔

"کوئی ایسا بھی تو ہو اپنے بچوں کو بچے نہ سمجھیں گھر کو گھر نہ سمجھیں سب کچھ بھتیجی کے لیے تج دیں یہ چچا ابا ہی کا جگرا ہے!"

چچا ابا سے جب یہ کہا گیا۔

"میاں گھر کی رونق گھر میں ہی رکھیے ارشاد میاں کے ساتھ کشور بی کی شادی کر دیجیے آپ کا ایسا مہربان خسر کہاں ملے گا۔ جو چچا بھی ہے باپ بھی ہے اتالیق بھی ہے..."

تو چچا ابا نے حقارت سے فرمایا تھا۔

"وہ ارشاد... میرا نالائق لڑکا... ارے میرا لڑکا ہے تو کیا ہوا! بیسا جو ہو گا کہا جائے گا: نہیں صاحب! میں ارشاد کو کشور کے لائق نہیں سمجھتا۔ چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک... اپنی کشور کے لیے میں اس کے شان شایان رشتہ تلاش کروں گا!"

اور اپنے نالائق بیٹے سے تنگ آ کر اس کو کسی لائق بنانے کے لیے انھوں نے فارن بھیج دیا تاکہ اور بھی ہلکے پھلکے ہو کر کشور کے لیے لڑکا تلاش کر سکیں: اب بیوی اکیلی رہ گئیں کتنی ناانصافی ہوتی۔ بقول چچا ابا! "غریب خانہ" کرائے پر اٹھا دیا گیا جو ۲۰۰ روپے کی معمولی سی رقم کے کرائے پر اٹھا اور بیوی کشور بی کی خدمت کے لیے راج محل میں چلی آئیں۔ خرچ ہی غریب کا کتنا تھا مہینے میں ۲ کلو چھالیا سفید کتھا، تھوڑی سی مہین سونف، کچھ چھوٹی الائچی، لونگ، پیپر منٹ ہاں دو تین گڑی کے گولے اور روز ہی کوئی ڈھولی بھر پان۔

رہی کپڑے لتے کی بات کشور بی کے پہنے ہوئے کپڑوں میں کام چلا لیتیں جو کپڑے نئے ہوتے وہ۔

"اے ہے یہ میرے اوپر اچھے نہیں لگیں گے!" کہہ کر بکسوں میں ڈال دیتیں۔ کھانے پینے کی گنتی کیسی اپرے غیرے نتھو خیرے تو دھ اور ہوائی چپاتیوں سے شکم سیر ہوتے تب وہ تو بچی ہی تھیں اگر دسترخوان پر دو تین رنگ کے سالن پلاؤ کے چاول، میٹھا، چکا دہی اور گھر کے دودھ کی اتری دو انگل موٹی پرت کی ملائی رکھ دی جاتی تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ کیا ہوا اگر یہ جائداد صرف کشور کے ابا کے زورِ بازو کا نتیجہ تھی۔ چچا ابا نے تنکے کا سہارا بھی نہ دیا تھا اپنے حصے کی جائداد کوڑی بڑی کر کے ۳۰۰ روپلی کی نوکری پر قناعت کر لی تھی بہر حال تھے وہ بھائی! اپنا خون! حقدار تر رستے تو انگارہ برسنے لگتے! اور پھر چچا ابا جیسا جان دینے والا چچا!

رشتے آتے اور واپس جاتے: ایک — دو — تین ... کتنے سال گزر گئے! یہ کشور بی کو یاد بھی نہ رہا۔

ڈھلتی عمر کا احساس اس روز ہوا جب قدِ آدم سنگھار میز کے سامنے گھٹنوں سے نیچے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کئی روپہلے بال انھوں نے چمکتے دیکھے تھے پھر غور کیا تو سرخ گداز لبوں کے دائیں بائیں دو گہری گہری شکنیں بھی نظر آئیں... بازوؤں کا کساؤ بھی ڈھیلا ڈھیلا لگا۔ گالوں کے گلاب باسی ٹماٹروں کے روپ میں دیکھ کر وہ کانپ اٹھیں۔

اور شاید اتنے برسوں میں پہلی بار ان کو احساس ہوا چچا ابا ان کی جائداد پہ یوں قابض ہیں جیسے ناگ دیوتا! اور یہ بھی کہ وہ ایک ایسی مجبور و بے بس شہزادی ہیں جو سونے کا نوالہ کھاتی ہے۔ چاند کی کرنیں پہنتی ہے اور ہیروں جڑے قفس میں رہتی ہے... اس قفس کے دروازے کی چابی ایک دیو کے قبضے میں ہے اور وہ دیو...!

وہ اپنے ریشمیں بستر پہ پڑی پڑی بہت دیر تک کچھ سوچتی رہیں جب اٹھیں تو ان کے چہرے پہ ایک ایسی بے زار کن کیفیت تھی جو اس سے پہلے کبھی نہ ابھری تھی۔

کچھ روز کے بعد ہی تین مشہور روزناموں میں ایک لڑکی کے لیے ضرورتِ رشتہ کا اشتہار نکلا:

> ضرورت ہے! ایک خوبصورت، خوب سیرت باسلیقہ اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے ایک لڑکے کی! جو نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو نہ برسرِ روزگار ہو (کیونکہ لڑکی صاحبِ جائداد ہے) نہ بہت زیادہ خوبصورت ہو، بس خوش مزاج ہو اور ۴۰ سال کے اندر ایک مضبوط مرد ہو!

لڑکی شادی کے بعد ہی اپنے باپ کے بے پناہ ورثے
کی مالک بن سکتی ہے اور ایک محل نما مکان کی بھی۔
پوسٹ بکس نمبر... پر خط و کتابت کریں۔

چچا آبا دیر تک سر مارا کیے پر اس اشتہار کی تہ تک نہ پہنچ سکے! البتہ چوکنّے ضرور ہو گئے! کشور بی کی نسبتیں کبھی یوں آتی تھیں جیسے بارش! پھر کم ہوئیں! اور کم! اور کم! خوب سے خوب تر کی جستجو ہوئی تو رفتہ رفتہ رشتوں کا سلسلہ ہی کٹ گیا! اب سال میں ایک آدھ وہ بھی ایسا اللہ سنوارا کہ چچا آبا دور سے لاحول بھیجتے! مگر ادھر تو، پھر تانتا بندھ گیا!

"حد ہو گئی! ایک سے ایک جاہل... ایک سے ایک لفنگا... یہ معمّہ کیا ہے؟" چچا آبا نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ نہ صرف خط آنے شروع ہوئے لوگ آنے لگے۔ باپ، چچا، بھائی، بہنوئی اور یہی نہیں لڑکے بھی!!

پہلے جو ذرا قرینے کے لوگ آتے تھے تو چچا آبا خوب خوب خاطریں کرتے۔ بڑی بڑی دعوتیں ہوتیں، چچا آبا مخصوص برتن نکلواتے تھے نفیس چینی کے برتن اور بلّوریں لیمن سیٹ۔ بڑے چاؤ اور جوش سے وہ سامان نکلواتے اور بڑی ہی مایوسی اور رنج کے ساتھ رکھواتے۔ کیونکہ بات بنتی نہیں تھی۔

لیکن ان ٹٹ پونجیوں کے لیے بلّوریں لیمن سیٹ اور نفیس چینی کا ڈنر سیٹ وہ کیا نکلواتے، پانی بھی نہ وہ پینے دیتے۔

ان ٹٹ پونجیوں (بقول ان کے) میں نواب میاں بھی آئے تھے۔ لمبے اونچے! بارعب نواب میاں! چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ شیروانی میں ملبوس کشمیری ٹوپی سے اپنے گھنگریالے کھچڑی بال ڈھکے۔ چہرے اور رکھ رکھاؤ سے ہی معلوم ہو رہا تھا خاندانی آدمی ہیں! اگرچہ اب، شیروانی میں کئی جگہ رفو تھا اور ایک جگہ ننھا سا پیوند۔ پاجامہ بھی دھوبی کے یہاں کا نہیں گھر کا دھلا ہوا تھا جوتا بھی شاید اچھے وقتوں کی یادگار تھا۔ بہر حال تھے وہ اس اشتہار کے بالکل مناسب جو چچا آبا کی نیندیں اڑائے ہوئے تھا!

چچا آبا نے کچھ طنزیہ کچھ تحقیر آمیز انداز میں نواب میاں کی خاطریں کیں۔ طوعاً کرہاً ان کے لیے برتن بھی نکلوائے ان کے بغیر کہے ہوئے ہی اندرون خانہ سے کھانے اور چائے میں بہت زیادہ اہتمام کیا گیا تھا بڑا پُر تکلّف ناشتہ اور چائے تھی اور بڑا ہی لذیذ کھانا!!
اُن کو یہ اندازہ لگاتے دیر نہ لگی کھانے اور ناشتے کی تیاری میں کشور بی کا ہاتھ زیادہ رہا تھا۔

کھانے پر ہی چچا آبا نے نواب میاں کا شجرہ کھود ڈالا—!
کوئی چیز تو ایسی نکلتی کہ وہ اعتراض کرتے!

"مگر آپ نوکر چاکر تو ہیں نہیں میرا مطلب ہے برسر روزگار..."
"اشتہار میں تو یہی تھا جناب کہ برسر روزگار نہیں چاہیے..."

نواب میاں نے گویا ڈرائنگ روم کی چھت چچا آبا پر گرا دی۔

"کیا بکتے ہیں آپ... وہ اشتہار..." چچا آبا نے دھاڑ کر کھڑا ہونا چاہا پر دھم سے دوبارہ کرسی پر گر پڑے۔

"جی ہاں... میں صاحب زادی کی مرضی ہی پر یہاں آیا ہوں"
چچا آبا پھٹی پھٹی آنکھوں سے نواب میاں کو دیکھنے لگے جو بڑے قاتلانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

"بات اب پکّی ہی کر دیجیے محترم بزرگ... کیونکہ دو دل راضی والا معاملہ ہے..."

تب چچا آبا نے ایکدم پلٹا کھایا۔ سارا غیظ، ساری وحشت، ساری حیرت اور ساری عقلمندی دور پھینک دی—!

ایک عیّارانہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر ابھری ایک حقارت آمیز چمک ان کی آنکھوں میں لہرائی وہ آگے کو جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولے: "میاں بہتر ہے دو دل راضی تو میں بے چارا کس گنتی شمار میں۔ لیکن اتنی بات تو گوش گزار کر ہی دوں میں اپنی لائق و فائق بھتیجی کو اتنی عمر گزر جانے پر بھی کیوں نہ گھر بار کا کر سکا جبکہ میری دونوں لڑکیاں کمسنی ہی میں بیاہ دی گئیں..."

"وہ میں خوب سمجھتا ہوں..." نواب میاں نے کہنا چاہا لیکن چچا آبا نے ہاتھ اٹھا کر ان کو روک دیا۔

ایک طرف سب سے الگ اسٹول پر رکھا ہوا نازک خوبصورت بلّوریں گلاس اُٹھایا اور رازدارانہ مسکراہٹ کے ساتھ نواب میاں کے سامنے نچاتے ہوئے بولے۔

"یہ گلاس آپ دیکھ رہے ہیں، خوبصورت ہے، نفیس ہے، جگمگا رہا ہے لیکن... یہ دیکھیے!"
انھوں نے گلاس پر ایک جگہ انگلی رکھ دی۔

نازک شیشے پر پڑا ہوا بال، بجلی کی روشنی میں نمایاں طور پر چمک رہا تھا۔

"مطلب؟" نواب میاں نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ . . ." چچا آبا ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے "شیشہ نازک ہے، نفیس ہے، قیمتی ہے لیکن . . . اس میں بال ہے!" چچا آبا! مشفق و شفیق چچا آبا کی نور برساتی آنکھیں بلی کی آنکھوں کے مانند چمک رہی تھیں۔

نواب میاں نتھنے پھلا کر مسکرائے اور ہاتھ بڑھا کر گلاس چچا آبا سے لے لیا پھر!

ایک زوردار سا چھناکا ہوا اور گلاس دیوار سے ٹکرا کر ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ نواب میاں بڑے اطمینان سے بولے۔

"جناب سارا قصور اس گلاس کا ہے جو آپ کے مشاق اور تجربہ کار ہاتھوں میں ناچتا رہا ہے جس قدر اس کے ٹکڑے بکھرے ہیں اسی قدر لوگوں کو اس کا بال نظر آیا ہوگا آج میں نے وہ قصہ ختم کر دیا . . . دوسرے الفاظ میں خس کم جہاں پاک!"

یہ کہہ کر نواب میاں نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ ایک دروازے کی آڑ میں کھڑی دراز سے جھانکتی ہوئی کشور بی اچھل پڑیں اور شرما کر اندر بھاگ گئیں۔

چچا آبا دونوں ہاتھ کھولے یوں بیٹھے تھے جیسے چڑیا پھر سے اڑ گئی ہو۔

●●

بقیہ: بزمِ احباب

اعظم گڑھ سے بھولے بسرے تعلق کی بنا پر لفظ "اعظمی" کے سہارے ان کا شمار پڑھے لکھوں میں ہونے لگا ہے ورنہ ان کا ادبی جغرافیہ نوٹنکی، اسٹیج اور فلموں سے آگے نہیں بڑھتا یہی وجہ ہے کہ پچیس سال کے وقفہ کے بعد شائع ہونے والا مجموعۂ کلام بھی انھیں کی زبان میں "فرنٹ" نہیں۔

دوئم یہ کہ کیفی اعظمی اور ان کے جتھے کے اکثر لوگوں کی وطن سے وفاداری مشکوک رہی ہے کیفی صاحب ہی کے خیالات اُن کی انعام یافتہ "ماغر کتاب" سے بطور سند پیش کیے جاتے ہیں۔ روس اور چین کا اختلاف شاعر کے لیے ایک زبردست المیہ ہے۔ اس دکھ کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

"اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کمیونسٹ

ٹوٹ گئی میرے سجدے آوارہ ہو گئے" (دوچار باتیں ص۹)

اب کیفی کے خوابوں میں بسے ہوئے وطن کا نظارہ بھی کیجیے:

ساتھیو! قافلۂ شوق کو روکو تو ذرا

زندگی چار طرف زمزمہ خواں ہے دیکھو

اپنے خوابوں میں جسے ہم نے بسا رکھا تھا

یہ وہی شہر حسیں شہر جواں ہے دیکھو　　(نظم "ماسکو")

اور اپنے اس خوابوں کے وطن سے شاعر کی والہانہ محبت بھی ملاحظہ فرمائیے:

پھول تو پھول ہیں کانٹوں پہ ترے

اپنے ہونٹوں کے نشاں پاتا ہوں

مرے خوابوں کے وطن

رنگ میں تیرے ملانے کے لیے

قطرۂ خونِ جگر لایا ہوں

اے گلابوں کے وطن

(نظم فرغانہ)

ایسی صاف اور واضح وفاداری کے بعد ماسکو کے ہسپتال میں چھ ماہ کے لیے ایک "سیل" مل جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یو۔پی کی اردو اکیڈمی اور دہلی کی ساہتیہ اکیڈمی نے "آوارہ سجدے" کو انعام کا مستحق قرار دیا اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ روس کا "نہرو انعام" پانے والے نہرو سے اتنی عقیدت بھی نہیں رکھتے جتنی انھیں لینن سے ہے۔ کیفی صاحب کی نگاہ میں ہمارے لیڈر "بے سر کی لاشوں" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ انھوں نے روسی انعام حاصل کرنے کے لیے اسی بھونڈے پن کا مظاہرہ کیا ہے جو جاگیردارانہ نظام میں بھانڈوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ پڑھے لکھے آدمی اپنوں کا مذاق اڑا کر غیروں سے انعام نہیں لیتے۔

تھا جو ناخوب تھا زمانے میں وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ابو محمد شبلی، لکھنؤ

●●

غزلیں

عبدالمتین نیاز

سبز راتوں کا نہ چمکیلے دنوں کا رنگ ہے
سامنے آنکھوں کے نکھرا اک جیا رنگ ہے

رنگ کی بنیاد پر تفریق ہے گہرا فریب!
جسم کے اندر تو سب میں ایک جیسا رنگ ہے

ترش احساسات میں اب گھلتی جاتی ہے مٹھاس
تم جو آئے ہو تو ہر شئے پر سنہرا رنگ ہے

میں کبھی تصویر کہہ دوں تو بُرا مت ماننا
کتنے دلکش خال و خط ہیں کتنا اچھا رنگ ہے

جسم کی دھرتی پہ ہر جذبہ کھِلا ہے پھول سا
لذتوں کی آنکھ میں ہر رنگ ہنستا رنگ ہے

دھند کے اس پار ہم ہیں اور سیاہی وقت کی
دھند کے اس پار سورج ہے سنہرا رنگ ہے

جب وفا کی دھوپ چمکے گی تو خود اُڑ جائے گا
پیار کے رنگیں لباسوں پر جو کچّا رنگ ہے

طلعت عرفانی

ٹپکتا ہے مرے اندر لہو جن آسمانوں سے
کوئی تو ربط ہے اُن کا زمیں کی داستانوں سے

دھواں اٹھنے لگا جب سنگِ مرمر کی چٹانوں سے
ستاروں نے ہمیں آواز دی کچّے مکانوں سے

سمندر کے پرندو! ساحلوں کو لوٹ بھی جاؤ!
بہت ٹکرا لیے ہو تم ہمارے بادبانوں سے

وہ اندر کا سفر تھا یا سراب آرزو یارو!
ہمارا فاصلہ بڑھتا گیا دونوں جہانوں سے

لچکتے بازوؤں کا لمس تو پُر کیف تھا طلعت!
مگر واقف نہ تھے ہم پتھروں کی داستانوں سے

نازش انصاری

دیس راون کا ہے سینے میں چھپا لو نہ مجھے
میں کوئی رام نہیں گھر سے نکالو نہ مجھے

دربدر کر کے صبا جانے کہاں لے جائے
سونی گلیوں کی وراثت ہوں اچھالو نہ مجھے

اس کے خنجر کی ہمک بھی بڑی جاں لیوا ہے
میں کہ کچھ بھی نہ سہی سامنے ڈالو نہ مجھے

میں تماشہ نہیں اپنے لیے اتنا سمجھو
پھر کبھی دیکھنا اے دیکھنے والو نہ مجھے

خود کو محسوس کیے جانا عبادت ہے سوا
بہتا دریا ہوں سمندر میں تو ڈالو نہ مجھے

غزلیں

اسعد بدایونی

شعلۂ تنہائی سے سب بام و در جل جائیں گے
چند دن کی بات ہے بوڑھے کھنڈر جل جائیں گے

ایک دن اس دشت پر سورج کا دل آ جائے گا
ایک دن اس دشت کے سارے شجر جل جائیں گے

جائے گا عزمِ سفر منزل پہ تنہا دوستو
راہ کی گرمی سے سب اہلِ سفر جل جائیں گے

سن رہا ہوں جلد ہی برسیں گے سنگِ آفتاب
اور میرے شہر میں جتنے ہیں گھر جل جائیں گے

خاک رہ جائے گی اک منھ کی حقیقت کی فقط
سارے افسانے طویل و مختصر جل جائیں گے

مجھ کو کیوں دیتا ہے تو اونچی اڑانوں کی سزا
دھوپ کا موسم ہے ظالم میرے پر جل جائیں گے

آگ ہر لمحہ تعاقب کر رہی ہے آپ کا
آپ اسعدؔ لاکھ رہیے باخبر جل جائیں گے

مہندر پرتاپ چاند

سیاہ خانۂ دل میں یہ کون آیا ہے؟
اندھیری رات میں تارا سا جھلملایا ہے

جمودِ ذہن کی دیوار اب تو ٹوٹے گی
خیال و فکر کا پنچھی جو پھڑپھڑایا ہے

تعلقات کی ڈوری نہ ٹوٹ جائے کہیں
اسی غرض سے اُسے میں نے پھر منایا ہے

ہزار اور خیال اُٹھ کے چھا گئے دل پر
جو اک خیال کو بھولے کبھی بھلایا ہے

اسے بھی چاندؔ کوئی کاش آ کے ڈھا جائے
جو آج میں نے گھروندا نیا بنایا ہے

نجم عثمانی

مرا وجود ہے کیا، ذرّۂ فضول ہوں میں
یہ کم نہیں ہے کہ اس راستے کی دھول ہوں میں

وہ دن بھی تھے کہ میں اک سایہ دار برگد تھا
یہ رُت بھی آئی کہ اک خشک سا ببول ہوں میں

بدل رہی ہیں ہر اک پل حیات کی قدریں
اور ایسے دَور میں اک مردِ با اصول ہوں میں

میں کیا بتاؤں کہ خود مجھ کو بھی نہیں معلوم
یہ کیسا غم ہے مجھے کس لیے ملول ہوں میں

نہ پا سکے گا کوئی نجمؔ رنگ و بو مجھ میں
ہزار بار جو مسلا گیا وہ پھول ہوں میں

احمد بلڈنگ، سرائے چودھری، بدایوں ● لائبریری کوروکشیتر یونیورسٹی، کوروکشیتر، ہریانہ ● کیر آف سید ابوالقاسم سی ایم پی ایف آفس دھنباد

وشنو سکھارام کھانڈیکر
بدیع الزّماں خاور

سچّائی

۱۹۷۴ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ، مراٹھی کے معمّر ادیب، وشنو سکھارام کھانڈیکر (پیدائش: ۱۸۹۸ء) کو اُن کے ۱۹۵۹ء میں طبع شدہ ناول "ییاتی" کے لیے دیا گیا۔ اسی ناول پر اُن کو ۱۹۶۰ء میں ساہتیہ اکاڈمی کا انعام بھی ملا تھا۔ ان کے ۱۵ ناول، کہانیوں کے ۲۹ مجموعے، تنقیدی مضامین کے ۱۰ مجموعے اور انشائیوں کے ۱۱ مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ بہت سی مُلکی اور غیر ملکی زبانوں میں بھی اُن کی تخلیقات کے تراجم ہوئے ہیں۔ اُن کا مستقل قیام مہاراشٹر کے شہر کولہاپور میں ہے۔ (مترجم)

میں نے گاؤں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں گاؤں چھوڑ کر جاؤں گا! —— اپنا وہ گاؤں چھوڑ کر جس گاؤں کے جھروکے میں سے میں نے سورج کی سب سے پہلی سنہری کرن کا رقص دیکھا ہے، جس گاؤں کی مٹی میں سَنے ہاتھوں سے میں نے آسمان کے تارے توڑ لینے کی کوشش کی، وہ گاؤں —— وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر جاؤں گا میں ؟؟

... مگر نہیں! ——

یہ کٹھور فیصلہ کرتے ہوئے میرا دل بھیرویں کے سُر الاپ رہا تھا اور میرے سینے کی گنگا جمنا میری آنکھوں میں سمٹتی چلی آ رہی تھیں۔

یہ میرا گاؤں تھا —— میرا اپنا گاؤں! یہیں میں بچے سے جوان ہوا تھا۔ یہیں میں نے ساون کی اودی گھٹاؤں اور چاند کی آنکھ مچولی کا کھیل جی بھر کر دیکھا تھا۔ یہیں میں نے سردی میں، بدن کو دھوپ کی سنہری چادر میں لپیٹ لینے کا سُکھ پایا تھا، اور یہیں مجھے گرمی میں اونچے درختوں کے سائے تلے فرحت اور تازگی کا احساس ہوا تھا۔

لیکن ... لیکن یہاں کے لوگ —— ؟؟

یہاں جو بھی تھا وہ آٹھوں پہر بس اپنے آپ میں گُم تھا۔ کوئی آئینے کے اندر اپنا عکس دیکھ کر اُس کی آرتی اُتار رہا تھا تو کوئی چھت کے چھجّے پر چڑھ کر، آسمان کے چاند کو اپنی جیب میں ڈال لینے کا اعلان کر رہا تھا ہر طرف —— ہر دِشا میں، جدھر دیکھیے اُدھر لوگ بالکل اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ کوئی زر کے تعاقب میں، تو کوئی زن کے پیچھے۔ کوئی شراب کے نشے میں تو کوئی اقتدار کی مستی میں۔ کوئی بات کے اندھیرے میں چُھپ کر چوریاں کر رہا تھا تو کوئی دن کے اُجالے میں ڈاکے ڈال رہا تھا۔ کوئی سادھو بنا بیٹھا تھا تو کوئی کلاکار۔ کسی کا نام دیش بھگت پڑ گیا تھا تو کسی کا صنعت کار۔ یہاں جو بھی تھا وہ کوئی نہ کوئی نقلی چہرہ لگائے ہوئے اِترا تا پھر رہا تھا۔

میرے لیے نقلی چہروں کی اس دُنیا میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔

ایک دن میں نے آدھی رات کے وقت اپنے گاؤں کو الوداع کہا۔

میں غیر آباد علاقے اور بے آب و گیاہ صحرا کے بھیانک اندھیرے

میں کانٹوں کو روندتا، کرمکانِ شب کی صدائیں سنتا اور سانپوں کی پھنکار سے ڈرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ آخر ایک رات میں ایک اجنبی بستی میں پہنچ گیا۔ آشا سے میرا دل اوپر کے ستاروں بھرے آسمان جیسا کھل اٹھا۔

رنگ برنگے قمقموں کی روشنی سے بستی کی شہر پناہ، دھرتی پر اُتری ہوئی دھنک کی مانند خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

چلتے چلتے میرے پاؤں چھلنی ہوگئے تھے۔ اور رات کا وقت ہونے کے باوجود مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

ایک قدیم مگر وسیع حویلی کا پھاٹک کھلا نظر آیا۔ میں نے پھاٹک میں جاکر، دو تین بار اونچی آواز میں پوچھا: "یہاں کوئی ہے؟"

غصے میں بھرا ہوا ایک بوڑھا شخص باہر آیا۔ شکنوں کے جال کے سبب اُس کی پیشانی تازہ جوتی ہوئی زمین کی طرح نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھینی تھی جسے اس نے کسی ہتھیار کی صورت سنبھال رکھا تھا۔

ایک مصروف سنگتراش کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے احساس سے مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ اُس شخص سے معافی مانگنے کے ارادے سے میں دل ہی دل میں مناسب الفاظ تلاش کررہا تھا کہ اتنے میں وہ بوڑھا کسی غرّاتے ہوئے کتے کے سے انداز میں ایک دم مجھ پر برس پڑا: "کیا چاہیئے تم کو؟"

"میں ایک مسافر ہوں۔"

"مسافر کے لیے دسوں دشائیں کھلی رہتی ہیں۔"

"میں بھوک کی شدت سے بے چین ہوں۔"

"یہ کوئی لنگر خانہ نہیں ہے۔"

"کیا اس بستی میں کسی دوسری جگہ میرا بندوبست ——"

جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی نادانی پر مسکرا اٹھتا ہے ویسے ہی میرے اس ادھورے سوال پر ہنستے ہوئے وہ بوڑھا سنگتراش بولا: "یہاں کسی بھی جگہ تمھارا انتظام نہیں ہوسکتا۔"

"کیا اس گاؤں میں کسی بھوکے مسافر کو چار لقمے کھلانے والا کوئی بھی نیک آدمی نہیں رہتا؟"

اپنے ہاتھ کی چھینی کو کسی کٹار کی مانند حرکت دیتے ہوئے اُس بوڑھے نے کہا: "اس گاؤں کے سب لوگ ہمیشہ ہی آدھا پیٹ رہ کر گزارا کرتے آئے ہیں۔ وہ دوسروں کو کھلانے کے لیے کہاں سے لائیں گے؟"

میں نے تعجب سے پوچھا: "تو کیا یہاں کے لوگ اتنا اناج بھی نہیں اُگاتے جس سے اُن کا پیٹ بھر سکے؟ —— پھر وہ کرتے کیا ہیں آخر؟"

وہ بوڑھا آگ بگولا ہوکر بولا: "کرتے کیا ہیں؟ اس بستی کے کسی بھی گھر میں جاکر دیکھو —— تم کو مجسّمے ہی مجسّمے نظر آئیں گے۔ اس گاؤں کا ہر فرد سنگتراش ہے۔ یہاں کسی بھی شخص کو اناج پیدا کرنے کی مہلت نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو چاہے ایک وقت کا فاقہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے مگر وہ مجسّمے تراشے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"یہ سب لوگ آخر اتنے سارے مجسّمے کس کے بناتے ہیں؟"

"اپنے آبا و اجداد کے اور کس کے؟ —— چاہے کوئی بھی آدمی ہو، اس کے ماں باپ تو ہوتے ہی ہیں۔ ان کے سوا دادا ہوتے ہیں، دادی ہوتی ہے۔ پردادا ہوتے ہیں، پردادی ہوتی ہے۔ پردادا کے دادا ہوتے ہیں —— پردادی کی دادی ہوتی ہے —— ان سب بزرگوں کے مجسّمے بنا کر ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا ہر انسان کا مقدس فرض ہے۔ اس بستی کا ہر آدمی اسی فرض کی تکمیل کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتا ہے۔ اس حویلی کے اندر پچھلی بیالیس نسلوں کے مجسّمے موجود ہیں۔ دیکھنا چاہتے ہو تو چلو میرے ساتھ ——"

میں یہ سوچتا ہوا کہ یہ شاید کوئی پاگلوں کی بستی ہے، سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گاؤں سے باہر آیا تب کہیں میرے گھٹتے ہوئے دل نے اطمینان کا سانس لیا۔

میرا سفر پھر شروع ہوگیا۔

آخر ایک شام میں ایک اور بستی میں پہنچا۔ مجھے امید تھی کہ میں اس گاؤں میں سچائی کے درشن کرسکوں گا۔

گاؤں کی سرحد پر ہی ایک کٹیا تھی۔ کٹیا کے دروازے میں ایک دوشیزہ کوئی گیت گنگناتی کھڑی نظر آئی۔ قریب پہنچ کر میں نے تین چار بار آواز دی: "اجی —— اجی ——"

پھر بڑھ کے تالی بھی بجائی، لیکن اُس کی محویت کا طلسم ٹوٹ نہ سکا۔

میں نے ذرا اور آگے بڑھ کر پکارا "اے سندری! ——"

اور یک بہ یک اُس کا گانا رُک گیا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر مسکراتے ہوئے پوچھا: "کون ہیں آپ؟"

"میں ایک مسافر ہوں"

"کیا چاہیئے آپ کو؟"

"کھانے کے چار لقمے"

"معاف کیجیے، وہ آپ کو یہاں نہیں مل سکتے"

"کیوں —— ؟"

"اس لیے کہ اس گاؤں کے ہم سب لوگ فنکار ہیں۔ اناج اگانے کے لیے ہم کو وقت ہی نہیں ملتا جب ہم لوگوں کو ہی فاقہ کرنا پڑتا ہے تو بھلا ہم کسی اجنبی ——"

"آخر اس بستی کے لوگ کیا کام کرتے ہیں؟"

"ہم لوگ آٹھوں پہر، تصویریں بناتے رہتے ہیں؟"

"تصویریں؟ —— کس کی تصویریں؟"

"انسان کی زندگی میں لمحہ لمحہ جو خواب چٹختے رہتے ہیں، ہم اُن خوابوں کی تصویریں بنایا کرتے ہیں۔ میری اس کٹیا ہی کو دیکھ لیجیے تصویروں سے کیسی بھر گئی ہے!! اس کے اندر میرے سونے کے لیے بھی ذرا سی جگہ خالی نہیں بچی ہے۔ میں اپنے محبوب کے خواب دیکھتی ہوں۔ اپنی شادی کے خواب دیکھتی ہوں۔ اپنے بچوں کے خواب دیکھتی ہوں۔ اپنے پوتوں کے خواب دیکھتی ہوں۔ اپنے پرپوتوں کے خواب دیکھتی ہوں۔ اپنے پرپوتوں کے پوتوں کے خواب دیکھتی ہوں —— اور ان سب حسین خوابوں کی تصویریں بنا کر بیٹھی ان میں رنگ بھرا کرتی ہوں"!

اپنے پردادا کے جس دادا کو خواب میں بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا ہوگا، اُس کا مجسمہ تراشنے میں مشغول وہ معمر سنگتراش اور اپنے پرپوتے کے جس پوتے کے چہرے بشرے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا، اس کی تصویر بنانے میں مصروف یہ بوڑھی دوشیزہ —— !!

مجھے اپنی بگڑی ہوئی نقلی چہروں کی وہ دُنیا ہی سچائی سے کوسوں دُور بھاگتی ہوئی اِن دونوں دُنیاؤں سے زیادہ قریب معلوم ہونے لگی۔

میرے قدم خود بہ خود اپنے گاؤں کی طرف مڑ گئے۔ البتہ گاؤں جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، میرے پاؤں ویسے ویسے بوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ گاؤں بالکل نزدیک آیا تو مجھے لگا کہ نقلی چہروں کی وہ دُنیا کسی راکھشس کی طرح دانت نکالے ہوئے مجھے گھور رہی ہے۔

میں نے بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سچے دل سے پرارتھنا کی:

"اے پربھو! —— مجھے اپنے ہی گاؤں میں رہنا چاہیئے تمھاری یہ اِچھا مجھے منظور ہے۔ البتہ تم کرپا کر کے مجھے اتنی بدھی دو کہ نقلی چہروں کی اس دنیا میں رہتے ہوئے میرے دل میں اپنے چہرے پر بھی کوئی نقلی چہرہ چڑھا لینے کا، خیال تک نہ آنے پائے"!

—— میں تھکے ہوئے جسم اور پُرسکون دل سے اپنے گاؤں میں یوں داخل ہوا جیسے چار گھڑی پہلے میں سیر کے لیے گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا اور اب تفریح ختم کر کے گاؤں میں واپس آ رہا تھا!!

(مراٹھی کہانی)

بقیہ: تیسری دنیا اور سوویٹ یونین

یورپی قومیتوں میں ملے ان میں آرمینیائی بورژوا تھے، سیبیر کے مالدار کسان تھے، زارشاہی کے افسر تھے اور پادری تھے۔ ایک استحصال پسند معاشرے کی یہ تمام شاخیں ترکستان میں زارشاہی نوآبادیت کے نمائندوں کی حیثیت سے اشتراکیت کے پرچم تلے اکٹھا ہو گئیں اور یہ قدرتی بھی تھا۔ بائیں بازو کی اشتراکیت ایک بڑے پیمانے پر مقامی آبادی کے غارت گرانہ جاگیردارانہ استحصال کی صورت میں نمودار ہوئی جس میں سُرخ محافظوں، آبادکاروں اور افسروں سبھی نے حصّہ لیا۔"

اس قسم کے حلیفوں کو کسی نظریے سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ تو صرف اس لیے سوویٹ یونین کا ساتھ دے رہے تھے کہ وہ رُوسی سلطنت کو تقویت پہنچانے اور مقامی مسلم آبادی کو مطیع کرنے میں مصروف تھی۔

پورن کمار ہوشؔ

ولادت : یکم جنوری ۱۹۲۳ء

وفات : ۱۰ جنوری ۱۹۷۶ء

نوحہ

ابھی آئے گا، ابھی شعر سُنا جائے گا
یونہی سوچو گے تو یہ حادثہ کھا جائے گا
ابھی دروازے پہ اک ہلکی سی دستک ہوگی
اور وہ کل کی طرح لوٹ کے آ جائے گا
اتنے گم سُم نہ رہو کچھ تو کہو ہم عصرو!
ورنہ وہ کل کی طرح اُٹھ کے چلا جائے گا
سب وفا کیش ہیں، چھپ جائے گا پردے میں کوئی
کوئی با جو کی گلی ہو کے چلا جائے گا
ہم نے پہلے بھی کہا تھا پہ جیسے جاتے ہیں
پھر کہے دیتے ہیں ہم سے نہ جیا جائے گا
اشکؔ سو جاؤ سرکتی ہوئی چادر لے کر
آنکھ کھولی تو سِرا کھینچ لیا جائے گا

بسمل کرشن اشکؔ

گوپال متل | خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

پورن کمار ہوش کی ایک غزل کے، جو انھوں نے اپنی موت سے کچھ ہی دن قبل لکھی تھی، شعر ہیں:

کھو گیا بھی تو خبریں کے پلٹ آؤں گا
کل کے اخبار میں ممکن ہے کہ پالو مجھ کو

کل تو میں ایک بدن تھا مرا اک روپ بھی تھا
آج اک نام ہوں بازو پہ لکھا لو مجھ کو

عمر بھر رہتا نہیں ہوش کوئی ہمسایہ
ایک دو روز کی الجھن ہوں نبھا لو مجھ کو

تو کیا انھیں اپنے انجام کی پہلے سے خبر تھی؟ ان کی بے وقت موت ان کے برادرِ بزرگ جناب کرشن کمار ملہوترہ، ان کی بیوہ بچوں اور دوسرے پسماندگان کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے اور وہ ہر صاحبِ دل کی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ان کے دوستوں کے لیے بھی یقیناً یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ لیکن ملٹن کا قول ہے: "بھرپور زندگی جیو، یہ لمبی ہے یا مختصر اس کا فیصلہ آسمان والے پر چھوڑ دو۔" ہوش کا عقیدہ بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہی تھا۔ وہ بھرپور اور بے محابا زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اور بے محابا طور پر ہی موت سے ہمکنار ہو گئے۔

پیروی ہوش کا شیوہ نہیں تھی۔ نہ زندگی میں نہ شاعری میں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری ان کی اپنی مخصوص آواز ہو اور اس میں کسی دوسری آواز کی آمیزش نہ ہو۔ ان کا قول تھا کہ "اگر کوئی شاعر اپنی اوریجنلٹی کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو اسے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے" ان کی شاعری کا بے تکلف لہجہ اور آورد کی بجائے آمد کا انداز ان کے فطری شاعر ہونے کا غماز ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسے شاعر کی آواز ہے جس کے لیے شعر کہنا اتنا ہی قدرتی ہے جتنا پرندوں کے لیے چہچہانا۔

کچھ برس پہلے ہوش کے کلام کا ایک مجموعہ "آواز میں" شائع ہوا تھا ان کے دو مجموعے "بانسری بدن کی" اور "پیارے بچے نیار سنگیت" زیرِ طبع ہیں لیکن ان کا بہت سا کلام ان کے ساتھ ہی ایکسیڈنٹ میں ضائع ہو گیا۔

ان کی شاعری پر میں تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا لیکن بل کرشن اشک کا مضمون اتنا بھرپور ہے کہ میرے لیے کچھ زیادہ گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ایک بات البتہ ضرور کہنا چاہتا ہوں۔ بل کرشن اشک نے ان کی شاعری میں جسمانیت پر بہت زور دیا ہے لیکن میں نے جن شعروں کا اوپر حوالہ دیا ہے ان سے تو ماورائیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے بل کرشن اشک کی تردید مقصود نہیں۔ شاعر بہر حال شاعر ہوتا ہے، مفکر نہیں، اس کے مزاج میں مختلف اوقات میں مختلف کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں اور اگر وہ سچا شاعر ہے تو ان کے اظہار میں دریغ نہ کرے گا۔

پورن کمار ہوش کو اپنے فن کی تکمیل کے لیے زیادہ وقت نہ مل سکا۔ ان کی تاریخِ پیدائش یکم جنوری ۱۹۴۳ء تھی اور اس برس دس جنوری کو وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر وہ کل وقتی شاعر بھی نہیں تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجینیر تھے اور ایک کامیاب انجینیر کی حیثیت سے اپنے پیشے کے تقاضوں کو ذمہ داری سے پورا کرتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ادبی حلقوں میں امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ وہ ہم میں نہیں رہے لیکن ان کی جادو بھری آواز دیر تک دلوں میں گونجتی رہے گی۔

ہوش ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے سبھی افراد نے اپنے شعبوں میں امتیاز پیدا کیا اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ ان کی موت پر ان کے برادرِ بزرگ کرشن کمار ملہوترہ صاحب کے مکان پر جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا اس میں پانچ سو سے زیادہ لوگ شریک تھے اور سب سوگوار نظر آتے تھے۔

بمل کرشن اشک

ہوش کی شاعری

کسی زمانے میں میرا ایک ہمزاد تھا، رگھونندن کا نرم جوم۔ اس میں بس ایک ہی عادت تھی، اچھی کہ بُری، کہ اسے جو کچھ کہنا ہوتا جسم کے کسیے سے کہتا۔ اسے کچھ اور سوجھتا ہی نہ تھا بدن اُس کے لیے حقیقت بھی تھا علامت بھی۔ کمبخت نے دن بھی بہت اچھے دیکھے تھے۔ بچپن کے دنوں سے چاہا گیا تھا اور بچپن سے ہی اس نے چاہنا شروع کیا تھا۔ کبھی خود کو کبھی دوسروں کو اور جو یہ دوسرے تھے کبھی اُسے اپنا لیتے اور کبھی وہ انھیں اپنا لیتا۔ بہت دنوں تک تو اسے ایسا لگا کہ : اُسے اوپر والے نے ایک ازلی شباب بخشا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ پیٹ میں داڑھی اُگنے لگی۔ پہلے جسم میں بھگوان دکھائی دیے تھے پھر بھگوان میں جسم دکھائی دینے لگا۔ ان کا ایک شعر تھا :

عمر کٹی کہ کھرا کھوٹا پہچانتے

کبھی بدن میں خدا کبھی خدا میں بدن

کافی طویل عمر پائی اس نے۔ ایک دن یوں ہوا کہ وہ مجھے بازوؤں میں جکڑے زندگی اور موت کی سرحد پہ لے آیا۔ سرحد پر اس نے مجھے گود سے آتارا ہی تھا کہ میں نے لنگڑی مار کر اسے سرحد کی دوسری جانب دھکیل دیا۔ اور خود واپس لوٹ آیا۔ اس کی موت یا اس کے قتل کا گہرا گھاؤ میرے دل پہ لگا یہاں تک کہ میں نے اس گھاؤ میں نمک لگا لگا کے اسے ایسا بھرا کہ نشان تک باقی نہیں رہا۔ پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ اس سرحد کو پھلانگ کر لوٹ آیا ہے۔ اس کی داڑھی بھی کافی بڑھ چکی تھی۔ چہرے پر جھرّیوں کے نشان بھر چکے تھے میرے زخم کی طرح۔ وہ کوئی تیس پینتیس سال کا لگتا تھا مجھ سے کوئی پندرہ بیس سال چھوٹا۔ میں نے ایک دن اس سے دریافت کیا تمھارا نام کیا ہے اور تمھاری عمر کتنی ہے۔ اُس نے مسکرا کر جواب دیا مجھے پورن کمار ہوشؔ کہتے ہیں۔ اور میں صرف انیس سال کا ہوں۔ میں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگانے کی سوچی ہی تھی کہ اس نے میرے بائیں ہاتھ میں کاغذ پکڑا دیے۔ میں نے انھیں اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کا نام چاہے کچھ بھی ہو اس کی عمر یقینی طور پر انیس سال ہی ہے۔ لیکن یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنی عمر کے سولہ سال یا اپنے باغ کی کسی روش میں دفن کر رکھے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان سولہ سالوں کی قبر سے ایک آدھ پودا پھوٹ نکلے اور کہے "بولو اب کیا ارادہ ہے" اور وہ سولہ سال رگھونندن کا فر کی طرح منہ چڑانے لگیں۔ لیکن جب تک ایسا نہیں ہوگا تب تک وہ انیس سال ہی کا رہے گا چاہے اُس کا نام کچھ بھی ہو۔

اس عمر میں بھی وہی داستاں کلس ہی رہا

میں اپنی عمر کا اُنیسواں برس ہی رہا

دھوم ہے روپ کی رانی تیرے جنم دوس کی

عمر بڑی البیلی ہے اُنیس برس کی

ان دو اشعار کو پڑھ کر یہ بھی احساس ہو سکتا ہے کہ نہ ہوش اور نہ اس کی محبوبہ ۱۹ کا ہندسہ پھلانگ سکے لیکن یہ سراسر وہم ہوگا۔ پیدائش سے موت تک جو مقامات آتے ہیں اُن سے کنارہ کشی ممکن ہی کب ہے ایک تو بچپن جو جوانی کے دنوں میں بھی یاد آتا رہتا ہے ایک بڑھاپا جو جوانی کی سرحد کے پار منہ چڑاتا رہتا ہے دونوں ہی عجیب منزلیں ہیں پہلے سفر کا آنچل ڈھلکا اُس عمر میں بھی، ایک خنجر کی طرح سینے پر لگتا ہے اور خراشیں اُبھرنے لگتی ہیں، زخم ہرا ہونے لگتا ہے اس عمر میں بھی اس پر قابو نہ پا سکے انسان تو کرے بھی کیا۔ اس کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ انگریزی رومانی شاعر کی طرح آدمی چلّا اٹھتا ہے۔ جب میں جوان تھا۔ آہ یہ دکھ دائی جہت ہوس تو صرف جسم کی اشتہا ہے جس میں عمر کے پہلو کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ اس قسم کی اشتہا برابر بنی رہے تو بنی رہے لیکن ہوس کا ایک اور انداز ہے ایک ایسی ہوس بھی ہوتی ہے جو صرف دماغ تک محدود رہتی ہے اور جس کا تعلق خصوصی طور پر یا بچپن سے ہوتا ہے یا بڑھاپے سے۔ اُنیس سال کی عمر کو جتنی ہوئی عمر ہے :

پانچ ہوئی عمروں کی طرف سوچ کے لے جائیں خواہش کو بڑھا دیں ذرا عمر گھٹائیں

سو جب ہوش نے کہا تھا "میری عمر انیس برس ہے" تو غلط کہا تھا۔ یہ تھا تو صرف نفسیاتی شعری، حقیقی نہیں اور شعری صداقت ماہی سچائی سے کہیں زیادہ بلند ہوتی ہے۔ اتنی ہی بلند اور ہمہ گیر جتنا بازو پہ کھدوایا ہوا نام جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔

کل تو میں ایک بدن تھا مرا اک روپ بھی تھا
آج اک نام ہوں بازو پہ لکھا لو مجھ کو

اور یہ گزرا کل، بچپن بھی ہو سکتا ہے اور جوانی بھی۔ آنے والا کل تو صرف پیری ہے جس میں سوائے بگولوں کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ نخلستان ہے تو صرف یادوں کا۔

پیچھے مدھم مدھم مدھم کتنے ہی قدموں کے نشاں
سامنے ایک اسیم بیاباں ریت اڑاتی آندھی دھوپ

جسم کے وسیلے سے عمر کی ہر منزل کو سمجھنا غالباً بہت مشکل کام نہیں لیکن اردگرد بکھرے ہوئے ندی نالے ننھی منی پہاڑیاں چٹانیں جسم کے وسیلے سے سمجھنا جبھی ممکن ہے جب انسان ذہنی طور پر جسم کو شرفِ قبولیت بخش سکے جسم میں سخت چٹانیں اور پھسلتے ہوئے ڈھلوان دیکھنا آسان سہی لیکن سخت چٹانوں اور پھسلتے ہوئے ڈھلوان میں جسم دیکھنا بہت مشکل کام ہے یہ مشکل کام اسی وقت ممکن ہے جب دنیا ایک جسم ہو کر رہ جائے اور دنیا کو جسم بنانا اتنا ہی غیر ممکن کام ہے جتنا اس شعر کا لکھنا:

یہ سخت چٹانیں یہ پھسلتے ہوئے ڈھلوان
پربت پہ ترے جسم کی تصویر کھنچی ہے

ایسے میں موسم بھی جسم کا پہلو لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کالیداس کے رِتو سنگھار کو سمجھنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ مختلف موسموں کے تاثرات جسم پر کیا ہوں گے۔ اسی طرح کا احساس ہوش کے یہاں بھی ہے۔ مگر اس کی فضا قدرے مختلف ہے۔ پہلی برسات کسی ایسی برسات کو یاد کرا سکتی ہے جس میں اردگرد ایک جسم کی مہک اڑ رہی ہو۔ اور پھر برسات ہی جسم ہو کر رہ جاتی ہے۔

برسات پہلی پہلی پڑی ہے جو گاؤں میں
خوشبو ترے بدن کی اڑی ہے فضاؤں میں

لیکن یہ خوشبو اس عطر کی خوشبو نہیں جو بڑے بڑے شہروں میں ہر دکان پہ خریدا جا سکتا ہے یہ خوشبو تو اس اگربتی کی مہک ہے جو دیوتا کے سامنے جلائی جائے۔ وہ اگربتی جس کا دھواں وقت اور فضا پر محیط ہو کر رہ جائے جس میں صرف ہوس کی تکمیل کا سادھن نہیں جس میں ایک مندر بھی ہے جس کی طہارت بھلائی نہیں جا سکتی۔

روپ کا مندر یا دن برندابن گوکل یا کاشی
جسم کے جنگل میں خواہش کا رام پھرے بن باسی

انجیلِ مقدس میں بھی جسم کو یہی مقام دیا گیا ہے۔ جسم بذاتِ خود بھگوان کا مندر ہے اور بقول ملٹن جذبے یا روح کی پاکیزگی ایک انسان کو شاعر بنا سکتی ہے۔ جسم کی پاکیزگی ہوس کے شعلوں کو بجھا نہیں سکتی۔ لیکن جسم کا ایک وہ مقام بھی ہے جہاں اس میں ایک تیرتھ استھان کے قریب بہتے ہوئے دریا کی شیتلتا ہو۔

شیتل بھی ہے پوتر بھی پوجا کے یوگ بھی
تیرا یہ روپ ہے کہ بنارس کا گھاٹ ہے

جسم دور سے دیکھنے کی چیز بھی ہے اور قریب سے پرکھنے کی بھی جب وہ دیکھنے کی چیز ہوتی ہے تب وہ دانتے کی محبوبہ BEA TREE بن جاتی ہے جب وہ پرکھنے کی چیز ہو تو شیکسپیئر کی CLEOPETRA دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ دونوں ہی رنگ ہوش کی شاعری میں ملتے ہیں۔ اسی لیے اس کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جہاں عورت کرشن کا مندر ہے اور ایسے بھی جہاں وہ صرف جسم ہے۔ یہ دو شعر دیکھیے:

بولے تو بانسری کہیں بجتی سنائی دے
ایسا بدن کہ کرشن کا مندر دکھائی دے

ہوس کا ہاتھ انوٹھے کواڑ کھولے ہے
بکٹ گپھاؤں میں پھر راستہ ٹٹولے ہے

یہ دونوں شعر پڑھ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں تضاد ضرور ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ شعری حقیقتیں تضاد کی وساطت سے ظاہر ہوتی ہیں یہ ایک ہی عورت کے دو روپ ہیں۔ جس نے دیکھا ہو وہی سمجھ پاتا ہے۔ انسان دونوں مقامات سے گزرتا ہے اس سے بھی جہاں محبوبہ مندر میں مورتی کے روپ میں بٹھائی جاتی ہے اور اس سے بھی جہاں وہ بستر کی زینت ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں ہی منزلیں ایک دوسرے میں گڈمڈ رہتی ہیں یہ بھی تو ہوش ہی کا شعر ہے:

پیار کو پوجا کہنے والو جھوٹ نہ بولو
پیار میں کچھ تو ہوتی ہے پرچھائیں ہوس کی

یہ مسئلہ وقت کا مسئلہ ہے اور کبھی کبھی تو ایک خاص لمحے کا بھی کیٹس میں یہ خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے وہ ایک لمحے کو دوام عطا کرتا ہے اور یہ مقام اُس وقت نصیب ہوتا ہے جب لمحے کی اہمیت سمجھ میں آ جائے۔

سمے کے گھور اندھیرے میں کھو گئے برسوں
بس ایک رات رہی اک وہی دو گھڑی رہا

اور پھر ایک فن کار ایک ایسی عورت ہیں جس کے بال سپید ہو رہے ہوں جس کے چہرے پر جھریوں کی لکیریں دھیرے دھیرے پڑتی جا رہی ہوں اُس لڑکی کو دیکھیے جو سراپا ایک غزل تھی تو اس میں وفا کا جو پہلو ہے وہ پوجا کہاں کم ہے۔ لمحے کو مٹھی میں پکڑ کر اگر کسی بٹوے میں مقید کر لیا جائے تو جب جی چاہے انسان اُسے نکال کر سامنے کرسی پر بٹھا سکتا ہے اور یہی ہوش کہتے ہیں :

اک عمر سے آگے نہ بڑھی موم کی گڑیا
ہر عمر میں گڑیا سی لگی موم کی گڑیا

میں یہ کہنے کے قابل نہیں ہوں کہ ایک مقید لمحہ موم کی گڑیا ہے یا موم کی گڑیا ایک مقید لمحہ ہے دونوں میں تفریق ہے ہی کہاں۔ لیکن یہ حقیقت تو صرف ایک لمحے کو ابد عطا کرنے والے پر کھلتی ہے۔

جسم کے اور بھی پہلو ہیں۔ ہجر کا پہلو۔ جسم کے وسیلے سے خود کو سمجھنے کی سعی کا پہلو۔ خواہش اور خطرے کا پہلو۔ یہ تینوں الگ ان تین اشعار میں دیکھیے۔

رہے جو گھر میں تو اک پل نہ کٹ سکی تنہا
بڑی سفر میں تو مجبور ہو کے جھیلی رات (ہجر)

اک روح تو اک جسم ہے اور دل میں ہر اک پل
اک روح کے اک جسم کے بٹ جانے کا ڈر سا
(خود کا تجزیہ)

گھیرے جو کبھی چاہنے والے تو وہ گھبرائے
دل میں ہے مگر بھیڑ کے چھٹ جانے کا ڈر سا
(خوف اور خواہش)

جس جسم کے اتنے پہلو ہوں وہ اگر عالم گیر ہو جائے تو متعجب ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جسم، مندر، بستر، پربت اور لمحہ سب کچھ ہے اُس ایک تصویر کی طرح جس کا ذکر ہوش ایسے کرتے ہیں :

سو اجنبی ہے مگر کچھ تو بات ہے
ہر زاویے سے میری طرف دیکھتی لگے

یہ عالم گیریت شاعر کو ایک اور فن سکھا جاتی ہے۔ اور یہ اکیلا فن ہی ایک شاعر کی پہچان ہوتی ہے۔ وہ جسے ہمہ گیر سمجھے اُسے ہر غیر متعلق چیز سے متعلق کر دکھلائے۔ اس فن کو اُردو میں تشبیہ کہہ لیجیے اور ڈن (DONNE) کی زبان میں CONCEI۔ جب ہوش کی شاعری کے خصوصی پہلو پرکھے جائیں گے تو دو زاویوں پر نگاہ ہر صورت میں ٹکے گی۔ پہلا پہلو ہوگا اُس زبان کا جوڑ ڈھونڈنے سے اُردو شعرا میں نہیں ملتی —— گو اُس کی ہلکی سی پرچھائیں فراق کے ہاں میسر ہے۔ ہوش فارسی اور عربی دونوں کو طاق پر رکھتے ہیں۔ اُن کی زبان وہ ہے جسے غیر ادبی طور پر ہندوستانی کہا جا سکتا ہے اور ادبی طور پر وہ اُردو جس میں ہندی کی شیریں آمیزش ہے۔ ہوش یہ احساس بالکل نہیں ہونے دیتے کہ وہ BLAKE کی طرح ایک ذاتی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ ہر شاعر اپنے لیے ایک خاص لہجہ وضع کرتا ہے، ایک خاص زبان تراشتا ہے جو اس کے پیش رووں اور ہم عصروں سے مختلف ہوتی ہے۔

ہوش کی شاعری کا دوسرا پہلو اُس کی تشبیہیں ہیں جن میں ایک تازگی اور ایک نیا پن پایا جاتا ہے۔ اُس کے قطعات سے لے کر اُس کی غزلوں تک یہ خصوصیت مولسری کے ننھے منے خوشبو دار پھول کی طرح بکھری پڑی ہے میں اس مجموعہ میں سے صرف دو اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا :

پہنوں کوئی قمیص تو اک یاد کی دلہن
نازک سی انگلیوں سے بٹن ٹانکنے لگے

تیرے ہے یوں نگاہ میں پرچھائیں آپ کی
پانی میں جیسے برف کا ٹکڑا دکھائی دے

مجھے یہ احساس ہے کہ ہوش پر اپنے ماحول سے بے گانگی کا الزام لگایا جائے گا یہ کہا جا سکے گا کہ اُسے سوائے جسم کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ آج جب ہر جانب قیمتوں کی گرانی افلاس، بھوک اور جنگ پھیلے ہوئے ہیں اس قسم کی شاعری کا کیا جواز ہے۔ ٹی، ایس، ایلیٹ نے اپنی طویل نظم WESTELAND میں ان سب کا ذمے دار اُس سیکس کو ٹھہرایا ہے جس کا تعلق تخلیق سے ہے نہ لذت سے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں آج بھی جسم لذت مہیا کرتا ہے اور تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ اور یہی جواز ہوش کی شاعری کا ہے۔ کیونکہ اس شاعری میں عورت صرف لذت ہی نہیں بخشتی ماں بھی بنتی ہے اور دلیل کے طور پر میں یہاں ہوش کی نظم جس کا عنوان خوبصورت موڑ ہے کا حوالہ دوں گا

غزل

پورن کمار ہوشؔ

مجھ کو ہر لو کوئی پل انگ لگا لو مجھ کو
اپنے ہی روپ کا اک انش بنا لو مجھ کو

تازگی ہوں تو ملا لو مجھے اس یوون میں
مسکراہٹ ہوں تو ہونٹوں پہ سجا لو مجھ کو

اب تو اک خواب ہوں، اک یاد ہوں بیتا پل ہوں
اب دھڑک جاؤں تو ہلکا سا دبا لو مجھ کو

لاج کا رنگ نہیں اب کہ چھلک جاؤں میں
صرف خوشبو ہوں بدن ہی میں بسا لو مجھ کو

جاگتے نین کھلے پتر ہیں پڑھ لے نہ کوئی
نیند بن جاؤں گا پلکوں میں چھپا لو مجھ کو

میں کہانی نہیں، قصہ نہیں، افواہ نہیں
بات بے بات نہ محفل میں اچھالو مجھ کو

رس بھرے کنٹھ میں بس جاؤں مدھر بول بنوں
کسی لے میں کسی سنگیت میں ڈھالو مجھ کو

پھرتے رہتے ہیں سدا جس پہ تمہارے سائے
اپنے کمرے کی وہ دیوار بنا لو مجھ کو

سو برس بعد کی بھاشا میں لکھا کاغذ ہوں
کیا سمجھ پاؤ گے یوں دیکھنے والو مجھ کو

کھو گیا بھی تو خبر بن کے پلٹ آؤں گا
کل کے اخبار میں ممکن ہے کہ پا لو مجھ کو

کل تو میں ایک بدن تھا مرا اک روپ بھی تھا
آج اک نام ہوں بازو پہ لکھا لو مجھ کو

کوئی بے فکر ہوا ان کے مجھے اڑنے دو
سوچ کے ریشمی گنجل سے چھڑا لو مجھ کو

درد کی رات کا سویا ہوا سناٹا ہوں
ایک سرگوشی بہت ہے کہ جگا لو مجھ کو

عمر بھر رہتا نہیں ہوشؔ کوئی ہمسایہ
ایک دور دز کی الجھن ہوں نبھا لو مجھ کو

غزلیں

پورن کمار ہوش

چُھپا کے رکھیے ذرا پریم پتر سا یہ بدن
ہر اک نگاہ کنکھیوں سے پڑھ رہی ہے اسے

پیا کے انگ سا لاگے یہ سرمئی آنچل
اُڑے تو پکڑے، گرے تو سنبھالتی ہے اسے

یہ مایا جال بدن جوگ ہے کہ بھوگ ولاس
بھٹکتی آتما صدیوں سے کھوجتی ہے اسے

یہ دل شوالہ نہیں جوگیوں کی کُٹیا ہے
سگندھ سے وہ بدن کی بسا گئی ہے اسے

یہ لوک گیت سا اشلیل رس بھرا یوون
ہر ایک تان جو اُٹھتی ہے چھیڑتی ہے اسے

یہ کوئی اندھی گپھا ہے کہ جسم کا بن ہے
نگاہ اُنگلیاں بن کر ٹٹولتی ہے اسے

روپہلی رات، یہ ٹھنڈی ہوا، یہ اٹھر نیند
ملن کی آس ہنڈولے جھُلا رہی ہے اسے

وہ چاپ، پھر وہی سیٹی، کواڑ پر تھپ تھپ
اُٹھے تو کھاٹ کی آواز روکتی ہے اسے

کہے تو کیسے کہے، ماں سے جھوٹ کہنا ہے
کہ بچپنے کی سہیلی بُلا رہی ہے اسے

پھرے ہے پریم پجاری سا ہوش بن بن میں
انوپ روپ کی دیوی کی لَو لگی ہے اسے

سانسوں کی لپٹ پا کے پگھل جائے گی چُنری
اوڑھو نہ بدن آگ ہے جل جائے گی چُنری

چنری پہ اُبھر آئیں گے مندر کے کلش بھی
مسجد کی بھی محراب میں ڈھل جائے گی چُنری

تم بھور بھئے بھول سہیلی سے نہ ملنا
راتوں کی مہک پا کے بدل جائے گی چُنری

ململ بھی ضروری نہیں وائل بھی نہ اوڑھو
اس عمر میں سنبھلے کی بھی چل جائے گی چُنری

بچ بچ کے چلو گے تو لپٹ جائے گی اے ہوش
پکڑو گے تو ہاتھوں سے نکل جائے گی چُنری

بزمِ احباب

تحریک اپریل ۱۹۷۰ء میں فرید احمد برکاتی صاحب (جے پور) کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ "انتخاب قصائد اُردو" کے حواشی بالغ نظر قارئین کو مدّنظر رکھ کر اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ معانی لکھنے میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جا بجا لفظی معنی کو آسان سمجھ کر مرادی معنی لکھنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ خال خال یہ صورت بھی ہے کہ لفظ لکھ کر یا شعر کا نمبر ڈال کر کوئی اشارہ کر دیا گیا ہے جس سے شعر کی معنویت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دو سو صفحات سے زائد کے اس طرح کے کام میں کچھ فرو گزاشتوں کا رہ جانا جن میں کتابت کی غلطیاں بھی شامل ہیں، یا کچھ اندراجات کا مختلف فیہ ہونا کوئی خاص بات نہیں کہی جاسکتی۔ ہر تبصرہ نگار کو ان کی نشان دہی کا حق پہنچتا ہے لیکن فرید احمد برکاتی صاحب نے اکثر موقعوں پر خردہ گیری کی دھن میں مؤلف کے کسی دعوے کے بغیر خواہ مخواہ مرتبۂ علمی کو بیچ میں لانے کے علاوہ یہ لکھنے میں بھی تامل نہیں کیا کہ "اگر یہ فرہنگ شاملِ انتخاب نہ بھی ہوتی تو اس منتخب مجموعے کی خصوصیات میں کوئی خاص کمی نہ آتی۔"

برکاتی صاحب کی جو بھی رائے ہو لیکن اس انتخاب کی سب سے زیادہ اہمیت و افادیت اسی فرہنگ کی وجہ سے ہے۔

• برکاتی صاحب عربی قواعد اور لغات کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ فارسی اور اُردو کے لیے عربی سے واقفیت مفید ہے لیکن عربی الفاظ کے سلسلے میں فارسی یا اُردو کے تصرّفات و اختلافات کو عربی قواعد یا عربی لغات کی مدد سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حسب ضرورت فارسی یا اُردو لغات سے رجوع کرنا پڑے گا۔ برکاتی صاحب نے جن الفاظ کی تشریح پر اعتراض کیا ہے ان میں سے بعض اس اعتبار سے بھی غور طلب ہیں۔ طوالت کے خوف سے میں یہاں صرف چند الفاظ کو لینا چاہتا ہوں۔

(۱) مایتحلل: برکاتی صاحب دوسروں کے الفاظ نقل کرنے میں فرق کر دیتے ہیں۔ مضمون میں بھی انھوں نے چین پیشانی کی جگہ چینِ جبیں اور مور و سنگ ہونا کی جگہ مور دسنگ درج کیا تھا۔ بدل مایتحلل کے سلسلے میں، میں نے لکھا تھا کہ "عین ممکن ہے ڈاکٹر سحر صاحب سے اندراج میں بھول ہوئی ہوگی۔" برکاتی صاحب نے "بھول" کو بدل کر "غلطی" کر دیا ہے اور اس پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ "ان کا یہ جملہ پروفیسر صاحب کے شایانِ شان نہیں۔۔" انھوں نے میرے الفاظ کا غلط مطلب بھی نکالا ہے۔ میری مراد صرف یہ تھی کہ انھوں نے سہواً بدل مایتحلل درج نہیں کیا۔ سحر صاحب نے مایتحلل کے معنی "وہ چیز جو تحلیل ہو جائے، خوراک، روزی" لکھے ہیں۔ برکاتی صاحب نے اس اندراج میں "تحلیل" کی جگہ "حل" کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ رشید حسن خاں صاحب کے لکھے ہوئے معنی (" وہ غذا جو ہضم ہو چکی ہو") اور سحر صاحب کے لکھے ہوئے معنی میں بین فرق ہے۔ جس کو میں محسوس نہیں کر سکا۔ میرے نزدیک یہ غلط فہمی "تحلیل" کی جگہ "حل" پڑھنے اور "خوراک" کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے ورنہ رشید حسن خاں اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کے اندراج کا مفہوم ایک ہی ہے، فرق صرف "ہو چکی ہو" اور "ہو جائے" کا ہے۔ برکاتی صاحب کا یہ دعویٰ سمجھ میں نہیں آیا کہ مایتحلل کے جو معنی رشید حسن خاں نے لکھے ہیں۔ ان سے انھیں کی بات کی تائید ہوتی ہے کیونکہ بدل مایتحلل کے معنی تو رشید حسن خاں نے بھی نہیں لکھے۔ برکاتی صاحب نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ "کیا سودا کے اس مصرعے میں بدل کا لفظ ایک مہمل قافیہ اور حشو ہے؟" لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ سحر صاحب نے مایتحلل کے لغوی معنی لکھ کر مرادی معنی "خوراک، روزی" لکھ دیے ہیں اور بدل کو عام فہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ اس سے بدل کا لفظ نہ مہمل قافیہ رہتا ہے اور نہ حشو۔ مایتحلل کے معنی لغت نگاروں نے "وہ چیز جو تحلیل ہو جائے" لکھے ہیں۔ اس پر مرادی مفہوم یعنی خوراک اور غذا کا اضافہ بالترتیب سحر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب نے کیا ہے کسی لغت میں

یہ موجود نہیں۔ بدل ماتحلل کے معنی لغات میں عوضِ چیزی کہ تحلیل می شود از بدن" اور "عوض اس چیز کا جو تحلیل ہو جائے" ملتے ہیں (غیاث اللغات، فرہنگ آنندراج جلد اوّل اور نور اللغات جلد اوّل) خوراک یا غذا کا یہاں بھی ذکر نہیں۔ سبب یہ ہے کہ خوراک سے دونوں کا تعلق براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ ہضم کے مختلف مراحل اور تولید اخلاط کے بعد روح حیوانی اور حرارۂ غریزیہ کے مدارج ہیں۔ موخر الذکر سے جو اجزا تحلیل ہو جاتے ہیں وہ ماتحلل اور ان کے بدلے میں روح حیوانی جو اجزا فراہم کرتی ہے وہ بدل ماتحلل کہلاتے ہیں۔ سحر صاحب نے ان تفصیلات کو حذف کر کے بالواسطہ تعلق کی بنا پر ماتحلل کے مرادی معنی وہ خوراک جو تحلیل ہو جائے لے لیے ہیں۔ اس طرح بدل ماتحلل وہ خوراک ہوئی جو اس کا بدل بنے۔ برکاتی صاحب کا یہ فرمانا کہ "کیا شمیم صاحب حرفِ مرادی معنی تک پہنچ جانے ہی کو سحر صاحب یا کسی اور کے مرتبۂ علمی اور شعر فہمی کی معراج سمجھتے ہیں" ——— تو بندہ پرور! محض لغوی معنی میں الجھے رہنا بھی مرتبۂ علمی اور شعر فہمی کی معراج نہیں ہے۔ سودا نے بدل کے لفظ (بمعنی عوض و معاوضہ) سے فائدہ اٹھا کر ممدوح سے یہی گزارش کی ہے کہ نجف میں ان کی "قسمت کے موافق" ذریعۂ معاش مقرر ہو جائے تاکہ وہ وہاں چین سے زندگی بسر کر سکیں۔

(۲) نہیب : برکاتی صاحب لکھتے ہیں کہ "محترم شمیم صاحب نے بغیر کسی لغوی حوالے کے یہ فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ خوف و دہشت کے معنی بھی لغات میں موجود ہیں اور یہ کہ کم از کم سودا کے شعر میں تو صاف طور پر اسی کا موقع معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذوق کے شعر میں اس لفظ کے محلِ استعمال اور مدلول پر انھوں نے کوئی رائے نہیں دی ..... نہیب کے جو معنی انھوں نے لکھے ہیں وہ لغت سے رجوع کیے بغیر لکھے گئے ہیں اور انھیں کہیں نہیں ملیں گے یا اگر ملے بھی تو کسی غیر مستند اور غیر صحیح اردو لغت میں کیونکہ نہیب عربی لفظ ہے اور اردو میں اس کا استعمال غریب و شاذ کے درجے میں ہے ... شمیم صاحب نے اس سلسلے میں رشید حسن خاں صاحب کی فرہنگ کا بھی حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھا حالانکہ وہ تو ان کے پیش نظر تھی۔"

قطع نظر اس کے کہ میں نے سحر صاحب کی تائید میں "ڈراؤنی آواز اور نعرہ" کے لیے یہ لکھا تھا کہ کم از کم سودا کے شعر میں صاف طور پر اسی کا موقع معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر لکھا تھا کہ خوف و دہشت کے معنی بھی لغات میں موجود ہیں۔ برکاتی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ وہ کتنی لاعلمی میں بھٹک رہے ہیں اور کیسی تاویلات کر رہے ہیں۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں جن سے صحیح نتائج اخذ کرنا غالباً زیادہ دشوار نہ ہوگا۔

(الف) "نہیب بکسر تین و یائے مجہول اماله نہاب است که لفظ عربی باشد بمعنی ہیبت و ترس و بیم و عظمت و آواز تہیب و غارت و بفتح اوّل بر وزن نقیب بمعنی غارتگر..!"

(غیاث اللغات، ص ۴۸۰)

(ب) "نہیب و نہیو : بر وزن فریب۔ ف۔ ترس و بیم و علامه احرار گوید نہیب اماله نہاب است بمعنی غارت کردن، دریں صورت عربی الاصل باشد پس بمعنی اوّل مجاز بود، غایتش ایں تصرف فارسیان است لیکن نہیو که مبدل آنست یا بالعکس دلالت دارد که فارسی الاصل است بہر تقدیر بالفظ آمدن و خوردن و دادن و داشتن مستعمل۔

عرفی :

اگر بصحنِ چمن فی المثل شجاعت او

دہد نہیب که ہیں یاسمین دہاں نرگس

چو عکس لاله زند یاسمیں در آب آتش

چو شاخ بید کشد خنجر از میان نرگس

(فرہنگ آنندراج، جلد سوم ص ۶۵۱)

(ج) نہیب (ع بکسر اوّل و دوم صحیح و بفتح اوّل و کسر دوم غلط) مذکر۔ خوف، ڈر، دہشت۔ ذوق

قریب و دور تھا یکساں نہیب جاہ و جلال

دکانوں پر تھے سراسیمہ کوفہ کے بقال

(نور اللغات جلد چہارم، ص ۸۸۱)

رشید حسن خاں صاحب نے انتخاب سودا (صفحہ ۱۵۴) میں نہیب کے معنی "خوف۔ ڈر۔ دہشت" لکھے ہیں جس سے برکاتی صاحب کی تائید نہیں ہوتی۔ سودا نے یہ لفظ عرفی سے لیا ہے اور ذوق کے پیش نظر عرفی اور سودا دونوں کے شعر رہے ہوں گے۔ قصیدے کے مبالغہ آرائی کے انداز کا بھی تقاضا ہے کہ نعرے اور للکار (یا خوف و دہشت) سے وہ کام ہو جائے جو حقیقی غارت گری سے بھی نہیں ہو سکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں سودا اور ذوق کے ان شعروں میں نہیب کے "محل استعمال اور مدلول" پر غور کیا جا سکتا ہے!

کھینچ اسے گر تو عدو پر کرے میداں میں نہیب
استقامت کا زمانے کے قدم جائے نکل
(سودا)

ترے نہیب سے ہوں شکل فلسِ ماہی الگ
کریں نہ حلقۂ جوہر رفاقتِ شمشیر
(ذوق)

(۳) حسود: میں نے لکھا تھا کہ "بہت ممکن ہے کہ سحر صاحب کو معنی لکھنے میں یہ خیال نہ رہا ہو کہ یہاں حُسُود یعنی حاسد کی جمع کے طور پہ لینا مناسب نہیں" برکاتی صاحب لکھتے ہیں کہ "اس پر اگر میں یہ کہوں کہ مختار شمیم صاحب محاکمہ کرنے کے بعد بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ حسود سرے سے نہ جمع کا وزن ہے نہ جمع کا صیغہ تو انھیں یقیناً ناگواری ہوگی" ناگواری کی کوئی بات نہیں۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حُسُود جس سے التباس ممکن ہے حاسد کی جمع ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

(الف) حسود۔ بفتح اوّل وضم ثانی بدخواہ و بسیار حسد کنندہ ... بضمتین جمع حاسد ہم مصدر سنت و بمعنی بدخواستن و بضم اوّل و ثانی بمعنی حاسد شہرت دارد غلط است"
(غیاث اللغات ص ۱۴۲، فرہنگ آنندراج جلد اوّل ص ۹۳۴)

(ب) حسود (بضم اوّل و دوم) مذکر۔ حاسد کی جمع۔
۲۔ (بفتح اوّل وضم ثانی) بدخواہ، بڑا حسد کرنے والا۔
(نوراللغات جلد دوم، ص ۴۵۸)

(۴) فلزات: اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ کتابت کی غلطی کے خیال سے برکاتی صاحب نے متعدد الفاظ کو نظر انداز کر دیا تھا انھوں نے ابو محمد سحر صاحب کے اس اندراج کا ذکر کیا ہے کہ فلزات، فلز کی جمع ہے اور لکھا ہے کہ فلزات کا واحد فلز نہیں بلکہ فلزہ ہے لیکن غیاث اللغات (ص ۳۲۸) اور دیگر لغات میں فلزات کا واحد فلز ہی کو بتایا گیا ہے۔ فلزہ سرے سے مفقود ہے شاید ان لغات میں بھی "کتابت و طباعت میں بائے محتفی کا ننھا سا دائرہ کہیں کھو گیا ہوگا" جیسا کہ برکاتی صاحب نے انتخاب قصائد اردو کے اس اندراج پر قیاس کیا ہے۔

(۵) وہ شہزادی کہ جس کے موکب اجلال کے آگے
ملائک سے سنیں گے اہل محشر نعرۂ غُضّوا

برکاتی صاحب اوّل الذکر کے معنی جلوس اور موخرالذکر کے معنی نظریں نیچی رکھ لینا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیاق و سباق کے مطابق "شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت بی بی فاطمہؓ محشر میں تشریف لائیں گی، رفع شان کے لیے موکب اجلال کی ترکیب استعمال کی گئی ہے یعنی تنہا نہ ہوں گی بلکہ جُلو (بضم اوّل صحیح نہیں۔ م، ش) میں غلام بھی ہوں گے، گویا شاہی سواری کا انداز ہوگا، تو فرشتوں کی زبانی اہل محشر یہ سنیں گے کہ نظریں نیچی رکھو" میری گزارش ہے کہ معمولی شہزادیوں کے قیاس پر شاعر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ حضرت فاطمہؓ جب میدانِ حشر میں تشریف لائیں گی تو شاہی سواری کا انداز ہوگا بلکہ ان کی تشریف آوری میں جو بزرگی اور شکوہ ہمرکاب ہوگا اسی کو موکب قرار دیا گیا ہے۔ برکاتی صاحب اس ترکیب کو سمجھ نہیں سکے۔ موکب کے معنی لغات میں سپاہ و لشکر کے علاوہ "گروہ سواران کہ در سواری امیر خود باشند" ملتے ہیں۔ سحر صاحب نے اجلال کی کثرت کے پیش نظر سپاہ و لشکر کے معنی لیے ہیں۔ دوسرے معنی اس ترکیب اضافت میں مناسب طور پر بیان نہیں کیے جا سکتے تھے۔ واضح رہے کہ اردو میں لشکر کا لفظ بھیڑ، ہجوم، اژدہام کے معنی میں مستعمل ہے اور یہاں اجلال کا وہ اژدہام مراد ہے جو حضرت فاطمہؓ کی جلو میں ہوگا۔ اسی طرح حضرت فاطمہؓ کے لیے نظریں نیچی رکھو کے بجائے آنکھیں بند کر لو کہنا ہی شایانِ شان ہوگا۔ "غض" کے لغوی معنی ہیں آنکھوں کا بھینچ کر بند کرنا جس کی مناسبت یہاں ظاہر ہے۔

——— مختار شمیم، اندور

● "نیا جال پرانے شکاری" تو نہ دیکھ سکا لیکن "حیات" مورخہ ۱۸ اپریل پڑھنے کا موقع ملا۔ حیرت ہے کہ ترقی پسندوں کے جرگے میں کوئی ایسا پڑھا لکھا آدمی نہیں جو بھکڑ بازی سے پرہیز کرتے ہوئے کم از کم جواب برائے جواب ہی کا حق ادا کر سکے۔

"تحریک" مئی ۷۶ء میں شائع شدہ آپ کے اداریے "ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی" کے آخری پیراگراف سے متعلق دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ کو کیفی صاحب کی تحریروں سے زیادہ متاثر نہ ہونا چاہیے۔

(بقیہ ص ۳۴ پر)

مانگے کا اُجالا

شاعری میں ہیئت شکنی

نئی شاعری میں ہیئت شکنی کا رویہ بتدریج فروغ پا رہا ہے اور یقینی طور پر عصری شاعری میں اظہار و بیان کے تعلق سے ایک نئی اور قابلِ قدر جہت کا اضافہ ہو رہا ہے، انگریزی شاعری میں اس نوع کی مثالیں انیسویں صدی میں بلیک، کولرج، اور کیٹس اور فرانسیسی شاعری میں علامت نگاروں کے یہاں ملتی ھیں۔ بیسویں صدی کے طلوع ہونے پر ایلیٹ کے "ویسٹ لینڈ" اور پاؤنڈ کے "کنٹیوز" سے یہ ایک قومی رجحان کی شکل اختیار کر گیا۔ اُردو میں موجودہ صدی میں ۱۹۳۰ء کے بعد میراجی اور ن۔ م۔ راشد نے ہیئت کے مروّجہ اصولوں سے انحراف کیا، اور نئی ہیئت کے چند نادر تجربے کر کے روایتی ذہن کو چونکا دیا۔

ہیئت شکنی کے حالیہ تجربوں سے یہ بات ذہن نشین ہوتی جا رہی ہے کہ منطقی ربط و تسلسل کی موجودگی سے شعر کا تخلیقی کردار بری طرح مجروح ہوتا ہے، اور ابہام و ایمائیت کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں، نئی شعری ہیئت کی ایک نمایاں شکل کرداروں کی آوازوں کو گڈمڈ کرنے، اسطور سازی، بغیر واوین کے اقتباسات دخیل کرنے، متضاد پیکروں کے اجتماع کے علاوہ ربط و تسلسل کے اخراج پر دال ہے، نظم یا شعر میں ربط و تسلسل کے اخراج سے شعری تجربے کی تکمیلیت اور ارتقا پذیری بظاہر مشتبہ ہو جاتی ہے اور شعر فہمی اور شعر سنجی کے روایتی معیاروں کی پاسداری کرنے والے حضرات نئی شاعری میں ابلاغ کا مسئلہ کھڑا کرتے ہیں۔ اور اسے مہمل ٹھہرانے میں بھی تامل نہیں کرتے، واقعہ یہ ہے کہ اُردو شاعری (جس میں غزل بھی شامل ہے) کا اکثر و بیشتر حصہ منطقی ربط و ترتیب سے گریز نہیں کر سکا ہے، یہاں تک کہ غالب جیسے تخلیقی فنکار کے یہاں بھی غزلوں کے کئی اشعار تمثیل نگاری کی نذر ہو چکے ہیں۔ اور وہ منطقی ربط کی زنجیروں کو پوری طرح توڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں، اقبال کے یہاں شعر کو منطقی ربط کا پابند بنانے کا شعوری عمل تخلیق کی پُراسراریت سے عدم واقفیت کی حد تک کارفرما ہے۔ عام طور پر اُردو شعرا کے یہاں شعر کہنے کا ایک معقول طریقہ یہ رہا ہے کہ کسی خارجی شے یا واقعے کی تصویر کشی کر کے خاتمے پر داخلی ردِ عمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اقبال یا جوش کی نظمیں اس طریقۂ کار کی ٹھوس مثالیں فراہم کرتی ہیں، غزلیہ شاعری میں اجمال اور ایمائیت کے باوصف منطقی ربط و تعلق کو روا رکھا گیا ہے۔ لیکن حالیہ برسوں کی شاعری کے ایک حصّے میں تکمیلیت اور منطقی ربط سے انحراف کا تخلیقی رجحان سامنے آیا ہے۔ چنانچہ افتخار جالب (نفیس لامرکزیت اظہار) یا عادل منصوری (منفعل جسم پہ لمحات قدم افسردہ) کی کئی نظموں میں اس رجحان کا اظہار ملتا ہے، ان نمونوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا میں لفظ شناسی کا شعور تیز ہو رہا ہے، اور وہ لفظ کی تلازماتی قوت سے آشنا ہوئے ہیں، یہ احساس اب گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ شعری تجربہ توضیحی الفاظ یا ربط آفریں جملوں کا محتاج نہیں ہے، بلکہ یہ وحشی، نادر اور طاقتور پیکروں اور علامتوں میں خوابیدہ یا بیدار رہتا ہے، شاعر متضاد پیکروں کی غیر منطقی ترتیب سے نادیدہ جہانوں کے اسرار اور طلسمات کو جگاتا ہے۔ یہاں شعر کا ہر لفظ حسیاتی پیکر کا کام کرتا ہے اور قاری داستانوں کے ہیرو کی طرح ایک کے بعد دوسرا جادوئی دروازہ کھولتا چلا جاتا ہے۔

ہیئت شکنی کے اس رجحان کے دو اسباب سمجھ میں آسکتے ہیں، اوّل معاصر شاعر گرد و پیش کی زندگی میں واقع ہونے

والے فردعی نوعیت کے سیاسی یا سماجی واقعات کو صرفِ نظر کرکے اپنے تخلیقی لاشعور کا سفر کرتا ہے، اور نادیدہ اندروحشی حسّی پیکروں کو دریافت کرتا ہے۔ ... ل یونگ نسلی تجربوں کا جوہر لطیف ہے۔ دوم عصری زندگی میں سائنسی اور صنعتی ترقی کے نتیجے میں، ہوش ربا تبدیلیوں نے فنکار کے ذہن کو فقید المثال COMPLEXITY سے آشنا کیا ہے میکانکی اثرات نے فنکار کی مختلف حسیات اور جمالیاتی شعور میں بھی اتھل پتھل پیدا کی ہے۔ علاوہ ازیں، سائنسی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ مادّے کی کوئی شکل یہاں تک کہ انسانی مغز (جس کا تجریدی اظہار شعور ہے) بھی ٹھوس اور متعین ہونے کے بجائے برقی ارتعاشات کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لیے شعری تجربہ کا (جو ذہنی قوتوں کا حاصل ہے) منتشر، بے جوڑ اور سیّال ہونا ناگزیر ہے۔

حامدی کاشمیری (شیرازہ، سری نگر)

دو پٹھان

یہ اُس زمانے کا قصّہ ہے جب میں پُونا میں تھا۔

میری فلمی زندگی کا آغاز پونا سے ہوتا ہے۔ جب شالیمار پکچرز پُونا کے مالک ڈبلیو زیڈ احمد صاحب نے مجھے لکھنؤ ریڈیو سے بلاکر اپنے اسکرین پلے ڈپارٹمنٹ میں شامل کرلیا۔ مجھ سے پہلے حضرت جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی دونوں اسکرین ڈپارٹمنٹ میں شامل ہو چکے تھے۔

دو تین روز سے میں دیکھ رہا تھا کہ جوش صاحب بے حد تندہی اور شہ زوری سے ایک نظم میں مصرعہ پہ مصرعہ ٹانکنے میں مصروف ہیں اور نظم بھی شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جا رہی تھی، ٹیپ کا مصرعہ کچھ اس طرح کا تھا:

اے جانِ من جانانِ من یا رشکِ چمن رشکِ چمن

یا اس طرح کا کوئی اور مصرع ...

میں نے ساغر سے اس حد درجہ انہماک کی وجہ پوچھی تو ساغر نے سرگوشی میں مجھ سے کہا: پرسوں ان کی محبوبہ آرہی ہیں۔

کسی نے جوش صاحب کی محبوبہ کو نہیں دیکھا تھا گو ان کے بارے میں جوش صاحب کی کئی ایک نظمیں سُن رکھی تھیں جن سے اس تمثالِ عالم کی دلکشی اور دلربائی یوں چھن کر آتی تھی جس طرح کسی چلمن کی اوٹ سے کسی حسینہ کا رنگِ پیرہن۔ جوش صاحب تو کیا ہم میں سے ہر ایک "ان کی جاناں" کا تصوّر کیے بیٹھا تھا اور چشمِ تخیل میں اس کی نازک بدنی کی ہزار تصویریں اُبھرتی اور بکھرتی تھیں آخر "پرسوں" آ گیا۔ اور شریفے کے چھدرے چھدرے پیڑوں کے درمیان محفل جمی۔ محفلِ نادنوش مگر محبوبہ ابھی تک اس محفل میں تشریف نہ لاسکی تھیں، ہوٹل میں کئی بار ٹیلیفون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ غسل کر رہی ہیں، کپڑے بدل رہی ہیں، سج رہی ہیں۔ اب چل پڑی ہیں۔

پھر وہ سچ مچ آ گئیں۔ ہم سب نے ڈبلیو زیڈ احمد سمیت اُٹھ کر انھیں اور اُن کی والدہ کو تعظیم دی وہ خوشبوؤں کے بھبکے اُڑاتی آئیں اور آکر جوش صاحب کی بغل میں بیٹھ گئیں۔ اُن کی آماں زرِ شہوار ہاتھوں سے چھالیا کترنے لگیں اور جوش صاحب اپنی نظم کے گل کترنے لگے۔ ہم سب لوگ بڑھ چڑھ کر داد دینے لگے۔ محبوبہ اور اُن کی آماں نہال ہوئی جاتی تھیں، مگر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آماں تو خیر بھونس تھیں ہی مگر اُن کی بیٹی بھی خاصی مُسن معلوم ہوتی تھیں۔ رنگت تو صاف تھی مگر بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے گرد جھرّیوں کا جال تھا اور پان کھاتے وقت مُنہ کا پوپلا پن اور نمایاں سا ہو جاتا تھا گہرے میک اپ نے شکل اور بگاڑ دی تھی۔

خدا خدا کرکے نظم کسی طرح پوری ہوئی اور اسکرین پلے پر بحث وتمحیص کی باری آئی تو وہ رشکِ چمن معذرت کرتی ہوئی اپنی آماں کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اُنھیں کسی کے ہاں کھانے پر جانا تھا ادھر بھی کوئی انھیں روکنے پر مصر نہ ہوا۔ میں اور جوش صاحب انھیں شریفوں کے جھنڈ سے ذرا آگے چند قدم تک چھوڑنے گئے، جب لوٹنے لگے تو راستہ میں ایک طرح سے تخلیہ ہو گیا تھا۔ میں غصّہ میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ آپ نے بھی غضب کر دیا۔ اتنی خوبصورت اور حسین نظم کو اُس بڈھی پوپلے مُنہ والی پر قربان کر دیا کیا آپ کو کوئی اور نہیں ملی تھی۔ جوش صاحب نے قطعاً بُرا نہ مانا۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولے، "عزیزم! اس عمر میں اس سے بہتر کہاں ملے گی؟"

جوش صاحب اور ساغر صاحب میں چلتی رہتی تھی اور یہ تو ضروری ہے اور ہر زبان اور ہر ملک میں ضروری ہے کہ دو چار ادیب مل کے بیٹھیں گے، معاصرانہ چشمک خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ جوش صاحب میرا تلفظ ٹھیک کرنے میں لگے رہتے یا ساغر کی شاعری میں اسقام ڈھونڈتے رہتے۔ میں انھیں اسکرین پلے کے میدان میں رگیدنے کی کوشش کرتا کہ جوش صاحب اس شعبے میں بالکل کورے تھے۔ ساغر کبھی تو جوش صاحب کے غلط مشوروں پر آمنّا وصدّقنا کہہ دیتے اور کبھی اُن کے کسی بالکل صحیح مشورے کی مخالفت پر اُتر جاتے۔ عجیب تعلق رہتا۔ مگر اُنہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا۔ جس نے ساغر اور جوش کے درمیان غیریت اور منافرت کی خلیج بڑھادی۔

ہوا یہ کہ ایک دن ڈبلیو زیڈ احمد صاحب نے اپنی محبوبہ اور فلم "من کی جیت" کی ہیروئن نینا کو خوش کرنے کے لیے انھیں اسکرین پلے ڈیپارٹمنٹ کا صدر بنادیا۔ فلم کمپنی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا جوش، ساغر اور کرشن چندر کے اسکرین پلے، کہانی اور مکالمے اور گیتوں کا محاسبہ نینا کر سکتی تھیں؟

جس وقت یہ فیصلہ ہوا تھا میں اسٹوڈیو میں نہیں تھا۔ یہ فیصلہ صبح میں گیارہ بجے کے قریب ہوا تھا اور میں اسٹوڈیو میں اکثر شام کو آتا تھا۔ احمد صاحب کا حکم نامہ انگریزی میں لکھا جوش اور ساغر کو دکھا دیا گیا۔ جو اس وقت اسٹوڈیو میں موجود تھے۔

جوش نے ساغر سے کہا "دیکھی آپ نے یہ بے ہودگی"

"میرا تو خون کھول گیا" ساغر غصے سے بولے "وہ کل کی چھوکری اسکرین پلے کیا جانے، اُسے ہمارا ہیڈ بنا دیا گیا ہے۔ یعنی وہ ہم پہ راج کرے گی، جوش نے ساغر کو بھڑکاتے ہوئے کہا۔

اب وہ اگر احمد کے دل پہ راج کر رہی ہے تو اس شعبے میں بھی راج ہی کرے گی میاں۔"

ساغر "لاحول ولا ... میں تو ہرگز ہرگز ایک عورت کے نیچے کام کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

جوش "واقعی ہے تو ذلت۔"

ساغر: "ابھی اس بے عزتی کی نوکری سے بھوکا مر جانا بہتر ہے۔ میں آج ہی استعفیٰ دے دیتا ہوں۔"

جوش: "آج کیا ابھی دے دیجیے۔ میں بھی استعفیٰ داغ دیتا ہوں۔ احمد صاحب کو ہوش آ جائے گا۔"

ساغر نے بھڑک کر اُسی دم اپنا استعفیٰ لکھا۔ استعفیٰ کی زبان اور عبارت کو جوش صاحب نے ٹھیک کیا، پھر ایک چپراسی کے ہمراہ اس استعفیٰ کو روانہ کر دیا گیا۔

ساغر: "اب آپ بھی اپنا استعفیٰ لکھیے۔"

جوش: "ابھی لکھتا ہوں" (گھڑی دیکھ کر) "ذرا گھر ہو آؤں ایک ضروری کام یاد آگیا۔"

جوش صاحب گھر چلے گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد واپس آئے تو ساغر نے یاد دلایا۔

جوش صاحب نے کہا۔ "دیکھیے اب کھانا آچکا ہے، کھانا کھالیں تو لکھتا ہوں۔"

کھانا کھا کے پھر ساغر نے یاد دلایا تو بولے "کھانا کھا کے ذرا قیلولہ کر لیں تو لکھ کر بھجوا دیں گے۔"

چھ بجے شام میں جب میں اسٹوڈیو آیا تو ابھی تک جوش صاحب نے استعفیٰ نہیں لکھا تھا۔ اور ساغر صاحب کا استعفیٰ احمد صاحب نے منظور کر لیا تھا۔ مجھے جب اس صورت حال کا پتہ چلا تو میں نے جوش صاحب سے شکایت کی۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور ساغر سے کہا استعفیٰ دینے سے پہلے کم سے کم میرا انتظار تو کر لیا ہوتا۔

ساغر جوش کی طرف اشارہ کر کے بولے "انھوں نے مشورہ دیا۔ ہم نے استعفیٰ بھیج دیا۔ اب یہ خود نہیں بھیج رہے ہیں، ٹال مٹول کر رہے ہیں۔"

میں نے جوش صاحب کی طرف دیکھا۔ جوش میری طرف دیکھ کر اُدھر سے ہنسے۔ بولے "بھئی ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ یہ اُسے سچ سمجھ بیٹھے اور اپنا استعفیٰ داغ دیا۔"

"اب کیا ہوگا؟" ساغر نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہوگا کیا؟" میں نے کہا "احمد صاحب جوش صاحب کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ اب جوش صاحب کو احمد صاحب سے کہہ کر اس استعفیٰ کی منظوری رکوانی ہوگی۔"

"ہاں ہاں! صبح ضرور کہیں گے۔" جوش اپنے کلّے میں پان

(باقی ص ۵ پر)

خبرنامہ

● ۹ مئی کی شام کو سنٹرل کورٹ ہوٹل نئی دلی میں جناب کرشن موہن کی نئی کتاب "ہرجائی تیری خوشبو" کے اجرا کا جلسہ منعقد ہوا۔ یہ کتاب جس میں کرشن موہن صاحب کا تازہ کلام شامل ہے، سمن پاکٹ بکس کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ جلسے کا اہتمام دلی رائٹرز ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔

جلسے کی صدارت گوپال متل صاحب نے فرمائی اور کتاب کا اجرا دیوندر ستیارتھی صاحب نے کیا۔ انھوں نے کرشن موہن صاحب کی پُرگوئی اور ان کی شاعری کی دوسری خصوصیات پر اپنے مخصوص افسانوی انداز میں روشنی ڈالی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم اور بمبئی سے آئے ہوئے مہمان سریندر پرکاش نے کرشن موہن صاحب کی شخصیت اور ان کی شاعری کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کیا اور جناب کرشن سروپ دت نادان نے ایک نظم سُنائی۔ گوپال متل صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کرشن موہن بہت کہتے ہیں لیکن خود کو دہراتے کبھی نہیں۔ اس سے ان کی خلّاقی اور ریاضت پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ آخر میں کرشن موہن صاحب نے کتاب سے اپنی کچھ چیزیں پڑھ کر سنائیں اور نریندر کمار صاحب کی طرف سے حاضرین کے شکریے کے بعد جن میں دلی کے ممتاز اور منتخب ادیب اور شاعر شریک تھے، یہ محفل برخاست ہوئی۔

● ۱۸ مئی کی شام کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر نئی دلی میں، جشنِ ممتاز کمیٹی کے زیرِ اہتمام ایک محفل منعقد ہوئی جس میں حکومتِ ہند کی طرف سے بیگم ممتاز میرزا صاحبہ کو پدم شری کا اعزاز دیے جانے پر انھیں مبارکباد پیش کی گئی اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جسٹس جی۔ ڈی۔ کھوسلا اور ڈاکٹر قمر رئیس نے تقریریں کیں۔ حکومتِ ہند کے وزیر مواصلات ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے بھی جو اس محفل کے مہمانِ خصوصی تھے، حاضرین کو خطاب کیا۔ انھوں نے اُردو زبان و ادب کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بعض لوگ اُردو رسم الخط کو ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر کہ اس کے نتیجے میں اُردو زبان اپنی انفرادیت کھو بیٹھے گی ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے وہ یہ کہ اُردو زبان کا موجودہ رسم الخط ہمارے بہت سے پڑوسی ملکوں کے ساتھ جن میں پاکستان، افغانستان اور ایران کے علاوہ عرب ممالک بھی شامل ہیں، رابطے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس رسم الخط کو خیرباد کہہ کر ہم اس ذریعے کو کھو دیں گے جو کسی طرح مناسب نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے اس کے فروغ اور ترقی کی کوشش ہمارا فرض ہے لیکن ہندوستان کی دوسری سب زبانیں بھی ہماری اپنی زبانیں ہیں اور انھیں اپنی جداخصوصیات کے ساتھ پھولنے پھلنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔

بیگم ممتاز میرزا صاحبہ نے اپنے تازہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا اور آخر میں کچھ ریڈیو آرٹسٹوں نے بھی ان کی غزلیں اپنی آواز میں پیش کیں۔

● ۳۰ مئی کی رات کو بزم کوثر میرٹھ کی طرف سے کوثر قریشی مرحوم کی یاد میں، مقامی ٹاؤن ہال کے کھلے میدان میں کل ہند مشاعرہ ہوا جس میں مقامی اور بیرونی شعرا کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مشاعرہ صبح چار بجے تک جاری رہا۔ ٹاؤن ہال کا وسیع میدان سامعین سے بھرا ہوا تھا جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔

اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایسے کئی شعرا نے شرکت کی جو مشاعروں سے باہر بھی ادب میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ مشاعرے کے کنوینر ڈاکٹر انجم جمالی تھے اور ان کے شریک کار شفیق احمد خاں۔

● اڑیسہ اُردو شعر و ادب کے مراکز سے دوری پر واقع ہے لیکن اس کے متعدد شہروں میں اُردو کے قلم کار بھی موجود ہیں اور شعر و ادب کے دلدادگان بھی۔ مئی کے پہلے ہفتے میں اڑیسہ کے دو مقامات کٹک اور بھدرک میں بڑی کامیاب ادبی محفلیں منعقد ہوئیں

پہلی محفل ٹونک میں خالد رحیم صاحب کی اقامت گاہ پر ہوئی، صدارت کہنہ مشق شاعر جناب قادر بخش بسمل نے فرمائی اور نظامت کے فرائض پروفیسر حفیظ اللہ نولپوری نے انجام دیے۔ منتخب مقامی شاعر شریک ہوئے ——— دوسرا مشاعرہ مولانا ساہی، بجبرک میں ہوا۔ اس کی صدارت حفیظ اللہ نولپوری صاحب نے فرمائی۔ مشاعرہ رات ڈیڑھ بجے تک جاری رہا۔

دو اندوہناک حادثے

● پچھلے دنوں جے پور میں مولانا محمد یوسف صدیقی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنی زوجۂ حیات کے ڈاکٹری معائنے کے لیے ٹونک سے جے پور آئے تھے کہ خود ان کی طبیعت خراب ہوئی اور چند گھنٹے بعد انتقال ہوگیا۔

محمد یوسف صدیقی صاحب ٹونک کے ایک باعزت اور خوشحال گھرانے کے فرد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرانے گریجویٹ تھے۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ ملی اور قومی خدمات میں گزرا۔ گزشتہ کئی برس سے ان کا دلی میں قیام تھا اور انگریزی اخبار "ریڈینس" ان کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا۔ وہ مجلسِ مشاورت کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ صدیقی صاحب نظر بند تھے لیکن پچھلے دنوں غالباً ان کی خرابیِ صحت کی وجہ سے انھیں رہا کر دیا گیا تھا اور وہ ٹونک چلے گئے تھے۔

صدیقی صاحب مرحوم کی ملی خدمات کی وجہ سے ہندوستان سے باہر کے مسلم حلقوں میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ عرب ممالک بالخصوص سعودی عرب میں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ ان جیسے مخلص، ایماندار اور باعمل انسان کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ملک و ملت دونوں کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

● سید حبیب صاحب کے نام سے قارئینِ تحریک واقف بھی ہیں اور مانوس بھی۔ گزشتہ کئی سال سے ان کا کلام تحریک میں شائع ہو رہا تھا۔ بہت رنج اور افسوس کے ساتھ ہم یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ اپریل کی ۶ تاریخ کو وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ مرحوم کو السر کی شکایت تھی جس کے علاج کے لیے وہ اسپتال میں داخل ہوئے تھے جہاں ان کا آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کامیاب رہا لیکن ابھی وہ اسپتال ہی میں تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور جان لیوا ثابت ہوا۔

سید حبیب ابھی جوان العمر تھے لیکن اردو کے ایک خوش فکر شاعر اور انگریزی کے باصلاحیت صحافی کی حیثیت سے ادبی اور صحافتی حلقوں میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ عمر نے ان سے وفا کی ہوتی تو ان کی لگن انھیں ترقی کے راستے پر بہت آگے لے جاتی۔ ان کی وفات سے اردو زبان اپنے ایک ہونہار شاعر اور انگریزی صحافت ایک اچھے صحافی سے محروم ہوگئی۔ ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوہ اور تین کم عمر بچے شامل ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور سوگواروں کو ان کی دائمی جدائی کا غم برداشت کرنے کا حوصلہ اور ہمت بخشے۔

●●

بقیہ: کانگرس اور کمیونسٹ

"آج ہمارے مخالف محاذ پر ہمارے ہم وطن ہیں، اپنے ماں باپ ہیں، اپنے بہن بھائی ہیں، اپنے جگر گوشے ہیں۔ ان لوگوں سے لڑنا بہت مشکل ہے لیکن یا تو ہمیں ان سے لڑنا ہوگا اور یا پھر اپنے آپ کو مٹا دینا ہوگا۔ آج کہیں کوئی متحدہ ادبی محاذ نہیں ہے، آج لڑنے والا، آگے بڑھنے والا محاذ ہے جو مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے"

●●

بقیہ: مانگے کا اُجالا

دباتے ہوئے بولے۔

مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جوش صاحب نے کہا میں! میں نے بھی۔ مگر جوش صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ساغر نے اپنے استعفے میں وہ زہر بھر دیا تھا جسے احمد صاحب کسی طرح پی نہ سکے، کیونکہ اس میں زینا کی دل شکنی کا پہلو بھی نکلتا تھا۔ اس لیے ساغر صاحب کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایک شاطر پٹھان نے ایک سادہ لوح پٹھان کو مات دے دی تھی۔

●●

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

شمارہ: ۴ جلد: ۳۴

جولائی ۱۹۷۶ء

— ادارۂ تحریر —

گوپال متل — مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: — پندرہ روپے

فی کاپی: — ایک روپیہ پچیس پیسے

— بیرونی ممالک سے —

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ 'تحریک' ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

— پرنٹر، پبلشر، چیف ایڈیٹر —

گوپال متل

مطبع — نعمانی پریس دہلی

مقام اشاعت

۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شذرات و مضامین

گوپال متل | محاذی اداروں کا کردار — کمیونسٹ پارٹی کی نظر میں

کچھ ترقی پسند سادہ لوحی کی بنا پر اور کچھ فریب دہی کی غرض سے ہر اس شخص کے خلاف خفگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کو کمیونسٹ پارٹی کا محاذی ادارہ قرار دے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس حقیقت کا اعتراف اب خود موہت سین نے بھی کر لیا ہے جو کمیونسٹ پارٹی کی نیشنل اگزیکٹیو کمیٹی کے ممبر ہیں۔

اپنے ایک مضمون "کمیونسٹ پارٹی اور ثقافتی محاذ" میں جو "انڈین لیفٹ ریویو" کی چوتھی جلد کے ساتویں شمارے میں شائع ہوا ہے، موہت سین نے برملا اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن اور ۱۹۴۰ء کے بعد انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کا قیام کمیونسٹ پارٹی کے ایما پر ہی ہوا تھا۔

موہت سین کے مضمون سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی اور اس کے محاذی ثقافتی اداروں کی پالیسی میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جو لوگ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گزشتہ انتہا پسندانہ پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں، انھیں مخاطب کرتے ہوئے موہت سین نے کہا ہے کہ "ہمارے جو کامریڈ ثقافتی محاذ پر کام کرتے ہیں، ان سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی ایسا وقت بتائیں جب پارٹی کا سیاسی رویہ صحیح ہو اور ثقافتی محاذ پر اس کا رویہ غلط ہو۔ ایسا وقت کبھی نہیں آیا۔"

موجودہ وقت میں کمیونسٹ محاذی اداروں کے فرائض کیا ہیں، اس بارے میں بھی موہت سین نے کھل کر بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ثقافتی محاذ لڑائی کا محاذ ہے، یہ طبقاتی جنگ کا ایک پہلو اور مرحلہ ہے . . . اس محاذ پر پارٹی کے جو لوگ کام کرتے ہیں ان کی صفات عالیاں بعینہٖ وہی ہیں جو دوسرے محاذوں پر کام کرنے والے کامریڈوں کی . . . اس طرح وہ پارٹی کے پروگراموں اور پالیسیوں ہی کو عملی جامہ پہنائیں گے لیکن اس ڈھنگ سے جو جد و جہد کے اس مخصوص دائرے کے لیے موزوں ہو، جس میں وہ سرگرم عمل ہیں۔ اس دائرے میں پارٹی کی راہ نمائی اور قیادت کے فرائض بڑے ضبط اور دانش مندی کے متقاضی ہیں۔ زیادہ زور نظریاتی تلقین پر ہونا چاہیے اور تنظیمی طریق کار کو صرف اسی وقت بروئے عمل لانا چاہیے جب ایسا ناگزیر ہو جائے۔"

یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کہ کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی کے محاذی اداروں میں کسی قسم کی ہم آہنگی موجود ہے۔ کانگریس کے قائدین گاندھی جی کو اپنا رہنما مانتے ہیں لیکن موہت سین کے نزدیک کمیونسٹ پارٹی کے محاذی ادارے گاندھیائی نظریات کے خلاف بغاوت کے مظہر ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور انڈین پیپلز تھیٹر کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

"ان دونوں تنظیموں نے ان جہاد پیشہ اور باغی ادیبوں اور آرٹسٹوں کو ایک مرکز مہیا کیا جو سامراج دشمنی پر مبنی قوم پرستی سے، جو جد و جہد آزادی کا اہم ترین محرک تھی، آگے جانا چاہتے تھے؟ جو گاندھیائی اندازِ نظر کی محدودیتوں اور اس کے توہمات سے دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ ان دونوں تنظیموں نے باغی آرٹ کا رخ بدل کر اسے انقلابی سمت دے دی۔ انھوں نے آرٹسٹوں کو سوشلزم اور اس کے سائنٹیفک اندازِ نظر سے آگاہ کیا جو محنت کش طبقے کے کردار پر زور دیتا ہے اور محنت کش طبقے کی مخصوص فتح کے نظریے یعنی سوویت یونین کا حامی ہے۔"

فارقلیط صاحب

۱۳ر جون کو صبح چار بجے دلّی میں مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اسّی سال سے اوپر تھی۔

مولانا فارقلیط کا آبائی وطن پلکھوہ تھا جو دلّی سے چالیس پینتالیس کیلو میٹر کی دوری پر واقع اتر پردیش کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ان کی آخری آرام گاہ بھی یہی قصبہ بنا۔ دلّی میں ان کی نماز جنازہ جامع مسجد میں پڑھی گئی جہاں سے ان کا جنازہ پلکھوہ لے جایا گیا۔ وہاں دوبارہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور عصر مغرب کے درمیان ان کے خاندانی قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

مولانا فارقلیط کی وفات کے ساتھ اُردو صحافت کی تاریخ کا ایک باب بند ہوگیا۔ صحافت کی جن قدروں کو مولانا نے زندگی بھر عزیز رکھا اور مشکل سے مشکل حالات میں وہ جن اصولوں پر کاربند رہے، افسوس ہے کہ وہ قدریں اور وہ اصول اب داستانِ پارینہ بنتے جارہے ہیں۔

فارقلیط صاحب کی صحافتی زندگی کا آغاز جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان سہ روزہ اخبار "الجمعیۃ" سے ہوا۔ بعد میں وہ "مدینہ" بجنور اور "زمزم" لاہور کے ایڈیٹر بھی رہے۔ تقسیم ملک سے ذرا پہلے فارقلیط صاحب نے لاہور کو خیرباد کہا اور دوبارہ دلّی آگئے۔ یہاں سے ۴۷ء۱۹ میں جب "الجمعیۃ" کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا تو وہ اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے اور مارچ ۱۹۷۳ء تک، جب انھوں نے خرابیِ صحت کی وجہ سے اس ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کی، ایک مخلص اور بے باک صحافی کی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت انجام دیتے رہے۔

فارقلیط صاحب جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی رہے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد بھی ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی اور ان مقاصد کے لیے سینہ سپر رہے جن کا حصول ملک میں سچی جمہوری زندگی کے فروغ کے لیے ضروری تھا۔ اس راہ میں انھیں مشکلات کا سامنا بھی ہوا لیکن انھوں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا اور نہ ان کے مزاج میں کسی طرح کی تلخی یا جھنجلاہٹ پیدا ہوئی۔

فارقلیط صاحب کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے واقف تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریریں بڑی مدلل اور پُرمغز ہوتی تھیں۔ تقسیمِ ملک کے فوراً بعد رونما ہونے والے ناسازگار حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک طبقے میں شکست خوردگی اور مایوسی کا جو احساس پیدا ہوگیا تھا اسے دور کرنے میں فارقلیط صاحب کے اداریوں کا بڑا کردار رہا ہے اور یہ ان کا ایسے موقع پر پوری قوم پر ایک ایسا احسان ہے، جسے بھلایا نہیں جاسکتا۔

راقم الحروف کے ساتھ فارقلیط صاحب کے بڑے قریبی مراسم تھے اور وہ مجھ سے ہمیشہ بڑی شفقت سے ملتے تھے۔ ان کی بے نیازی اور قناعت پسندی کا مجھے ایک بار ایسا تجربہ ہوا جس کی دوسری مثال اس دور میں ملنی مشکل ہے۔ میں نے ان سے ایک کتاب کا ترجمہ کردینے کی خواہش ظاہر کی جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ کتاب قدرے ضخیم تھی، تین چار مہینے میں فارقلیط صاحب نے ترجمہ مکمل کرکے مجھے پہنچا دیا۔ جب میں نے انھیں ترجمے کا معاوضہ دینا چاہا تو وہ اسے قبول نہیں کرتے تھے۔ بہت مشکل سے مانے لیکن جب میں نے رقم پیش کی تو کہنے لگے یہ تو زیادہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کررہا، ترجمے کا معاوضہ جس شرح سے دوسروں کو دیتا ہوں، اسی شرح سے آپ کو دے رہا ہوں، تاہم وہ یہی فرماتے رہے کہ نہیں شمس صاحب! یہ زیادہ ہے اور میرے بےحد اصرار کے بعد ہی انھوں نے وہ رقم قبول کی۔ ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔

وطن دوستی فارقلیط صاحب کے مزاج کا خاصہ تھی اس میں ستائش یا صلے کی کسی تمنا کو دخل نہیں تھا اور نہ پاداش کا

(بقیہ صفحہ پر)

سید حبیب

ادارہ

سید حبیب جن کے بارے میں ایک مختصر نوٹ تحریک کے گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے، ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اُردو کے ایک خوش فکر شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے قارئینِ تحریک ان سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا کلام کافی مدّت سے باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا تھا اور ان کے کئی اچھے افسانے بھی تحریک میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی سرگرمیوں کا دائرہ اس سے کہیں وسیع تھا۔

سید حبیب جن کا پورا نام سید حبیب عنایت صدیقی تھا انگریزی کے کامیاب صحافی بھی تھے اور "پونا ہیرلڈ" کے سینیئر سب ایڈیٹر تھے۔ حال ہی میں ان کی توجہ فلم کی طرف مبذول ہوئی تھی اور انھوں نے کئی فلموں کے لیے گیت لکھے تھے۔

وفات کے وقت سید حبیب کی عمر ۳۵ برس تھی۔ انھوں نے ایم اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان پاس کیے تھے۔ کئی برس تک وہ شیخ صلاح الدین درگاہ قصبہ پیٹھ کے سجادہ نشین رہے۔ پونا کی شہری اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھی انھوں نے بھرپور حصّہ لیا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک وہ پونا میونسپل کارپوریشن کے ممبر رہے اور ایک سال وہ کارپوریشن کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیرمین بھی رہے۔ وہ استا پیٹھ ایجوکیشن سوسائٹی کے ٹرسٹی تھے اور کے۔ ای۔ ایم۔ ہاسپٹل کی انتظامیہ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔

۶ر جون کو پونا میونسپل کارپوریشن نے ماتمی جلسہ کیا جس کی صدارت ڈپٹی میئر نرائن ویدیا صاحب نے کی۔ کارپوریشن کے میئر مسٹر وسنت تھوراٹ نے بھی ان کی ناگہانی موت پر گہرے غم کا اظہار کیا۔ جونیر ریڈ کراس کے چیرمین اور لائنز انٹرنیشنل کی ڈسٹرکٹ شاخ کے گورنر نے ان کی موت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ سید حبیب سبھی کے دوست تھے۔ لائنز کلب، روٹری کلب اور انڈین ریڈ کراس سوسائٹی پونا جس کے وہ آنریری سیکریٹری بھی تھے۔ وہ ہر اچھے سماجی کام میں پیش پیش رہتے تھے۔

مرحوم کی بیوہ جہاں آرا صاحبہ اور ان کے بچوں سے ہم ایک بار اور اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں۔

ذیل میں سید حبیب صاحب کی دو غزلیں دی جا رہی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔

ہارے نہ کوئی ہمتِ مردانہ وار کو
آجائے گا قرار دلِ بے قرار کو
مانا کہ بال بال ترا ہے گناہ گار
لیکن نہ بھول رحمتِ پروردگار کو
مایوس اس قدر ہے خزاں میں تو کس لیے
دیکھے گا پھر چمن میں کسی دن بہار کو
گر آرزو حیاتِ بقا کی ہے کچھ تجھے
کر پاش پاش ہستیِ ناپائیدار کو
احساسِ درد جس میں ذرا بھی نہیں حبیب
پہلو میں رکھو نہ ایسے دلِ بے قرار کو

—o—

مری کشتی کنارا ڈھونڈتی ہے
محبت اب سہارا ڈھونڈتی ہے
بہت روتا ہے دل تجھ سے بچھڑ کر
نظر تجھ کو دوبارا ڈھونڈتی ہے
تری آنکھوں میں پھر اُمید میری
محبت کا اشارا ڈھونڈتی ہے
پروکر آنسوؤں کے ہارِ الفت
نظر چہرہ تمھارا ڈھونڈتی ہے
حبیب آ جا کہ مُرجھایا ہے گلشن
گھٹا تیرا اشارا ڈھونڈتی ہے

دو نظمیں

کرشن موہن

استعارے

فرانسیسی حسینائیں
کبھی پیتل کی انگیائیں پہنتی تھیں
اتاری جاتی تھیں سونے سے پہلے جب یہ انگیائیں
تو ان کو سرخ جلتے کوئلوں سے بھر کے اپنی چارپائی کے سرہانے
کھونٹیوں سے باندھ دیتی تھیں
وہ ایسے اپنے بستر گرم رکھتی تھیں
اسی کارن کہا کرتے تھے لوگ انگیاؤں کو ہیٹر
اسی باعث کہا کرتے تھے پستانوں کو انگارے

●●

مشغلے

ہل چلائیں سوکھے کھیتوں میں جو ننگی عورتیں
اندر ہو جاتے ہیں خوش یہ شوخ منظر دیکھ کر
اور کھا دیتی ہے پھر ورشا تو دھرتی کی پیاس
کتنے بے بنیاد ہیں وہم و قیاس
جھوٹی ہے مانو کی آس اور من اداس
اس لیے
ڈھونڈ ہی لیتا ہے وہ
جھوٹ آگیں مشغلے
دل لگانے کے لیے
دکھ بھرا جیون بتانے کے لیے

●●

شملہ

بانی

اے کپاسی ابر میں لپٹے دیار
مہرباں یاروں کے شہر
میں تری راہوں سے اُترا ہوں
لرزتے پاؤں سے
صبحِ رخصت کا سلام
ارماں، نظر، آزاد، طلعت، طور کے نام
اور وادی میں برستے
نم، غلافی نور کے نام!
جانے کتنے موڑ تھے! . . .
ہر موڑ پر میں رُک گئے اور آنکھیں پلٹ کر
نیم بارشں دُھند میں سے
دیکھتا تھا دُور ہوتے دوستوں کے اُجلے چہرے، بار بار
اے کپاسی ابر میں لپٹے دیار
تیرے پیارے پربتوں کے درمیاں
میری دعائے خیر پھیلے
میرے یاروں کے
حسیں چہرے
کبھی میلے نہ ہوں!
جاتے جاتے مُڑ کے تجھ کو دیکھ لوں کہرے کی صف کے آر پار
مُڑ کے تجھ کو دیکھ لوں پھر ایک بار!
دیکھ لوں پھر ایک بار!!
اے کپاسی ابر میں لپٹے دیار!!!

ارمان شہابی، پریم کمار نظر، آزاد گلاٹی، طلعت عرفانی، کرشن کمار طور

۲/۴۵ ——— راجندر نگر ——— نئی دلی

معلق

شوکت حیات

صدیوں کی طویل بحث کے بعد بھی ان کی مٹھیوں میں صفر کے بچھو ڈنک مارتے رہے ———

غصہ میں انھوں نے اپنی اپنی مٹھیاں کھولنی چاہیں ——— ساری زورآزمائی کے باوجود بند مٹھی نہیں کھلی تو ایک بڑا سا پتھر اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنی مٹھیوں کو کچل کر رکھ دیا۔ سرخ انگاروں سے صفر مٹھیوں سے پھسلا اور ابابیل کی طرح اڑتے ہوئے آسمان میں پناہ گزیں ہو گئے۔

تب سے آسمان سائیں سائیں انھیں چاروں طرف سے نوچتے ہوئے کچلی ہوئی مٹھیوں کی یاد دلاتا ہے اور ٹوٹی ہوئی انگلیوں کے برش سے جو تصویر بنی اس کی ایک آنکھ روتی ہے اور ایک آنکھ ہنستی ہے۔

انھوں نے کھلے آسمان کے نیچے زوال آمادہ دیوار پر آویزاں تصویر دیکھی۔ ایک انسانی چہرہ ——— جس کے سارے نقوش صرف دو آنکھوں میں سمٹ آئے تھے۔ دیوار پر صرف دو آنکھیں تھیں۔ ایک روتی ہوئی دوسری ہنستی ہوئی۔

——— یہ ہم تمام لوگوں کی تصویر ہے ... دیکھو ... ہماری ایک آنکھ روتی ہے اور ایک آنکھ ...

——— یہ کیسے ممکن ہے ... ہم روتے ہیں تو دونوں آنکھیں روتی ہیں اور ہنستے ہیں تو دونوں آنکھیں ...

——— تم غلط سوچ رہے ہو ...

——— تم غلط کہہ رہے ہو ...

——— پھر وہی بحث ... مٹھیوں میں کوئی ڈنک مار رہا ہے ... ہم بحث کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے کیا؟

——— ہم اس تصویر کی طرح زندہ ہیں جس کی ایک آنکھ ...

——— آئینہ اٹھاؤ ... ہم تمام لوگ اپنی آنکھیں دیکھ جائیں

کیا سچ مچ ہم ایک ساتھ روتے بھی ہیں اور ہنستے بھی ہیں ...

ان لوگوں نے ایک ایک آئینہ اٹھایا اور بغور اپنے چہروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بار بار وہ دیوار پر آویزاں دو آنکھوں کی طرف دیکھتے اور اپنی آنکھوں سے ان کا موازنہ کرتے ——— ایک نے کہا۔

——— بات تو صحیح ہے۔

دوسرے نے کہا۔

——— بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔

تیسرے نے کہا۔

——— بات یہ ہے کہ ایک آنکھ ہماری حالتِ زار کی ہنسی اڑاتی ہے اور دوسری اس پر آنسو بہاتی ہے۔

——— نہیں ... ایک آنکھ اس غم میں روتی ہے کہ اسے ہنسنا تھا اور دوسری اس لیے ہنستی ہے کہ وہ رونے سے بال بال بچ گئی۔

——— بھائی میری بات مانو کہ ہماری دونوں ہی آنکھیں روتی ہیں ... ہماری کسی بھی آنکھ کو ہنسنے کا موقع نہیں ملا۔

——— یہ کیسے ہو سکتا ہے ...؟

ایک نے کہا۔

——— کیوں نہیں ہو سکتا ہے ...؟

دوسرا بولا

——— نہیں ...!

تیسرا بولا۔

——— ہاں ...!

چوتھے نے کہا۔

پھر وہ سب کے سب الجھ گئے اور ان کی کھلی ہوئی ہتھیلیوں میں

گئی۔ اٹھنے لگی۔ سب کے سب بحث کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گئے۔ کسی کے رونے، چیخنے اور سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہتھیلیوں کی ٹیس جھیلتے ہوئے تمام لوگوں کو جیسے سکتہ لگ گیا۔

——— میرا بچہ... بھوکا رہتا ہے تو یوں ہی روتا ہے...!

——— میری ماں... اس کے دل میں آگ لگتی ہے تو ایسے ہی نقاہت کے عالم میں گھٹی گھٹی آواز میں چیختی ہے... اللہ میں اس کی چیخوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے زور زور سے بحث کرتا ہوں۔

——— میرا بھائی... اسے آج پھر آدھا پیٹ آنکھوں میں خواب سجائے بستر پر کانٹا بننا پڑا ہوگا...!

وہ سب کے سب بہت دیر تک آسمان میں گھورتے رہے۔ خالی خالی آنکھوں سے گھورتے گھورتے اچانک ان کے سارے جسم میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔ مٹھیوں میں تناؤ آیا تو ٹوٹی ہوئی انگلیوں میں ٹیس پیدا ہونے لگی۔ ان کی آنکھوں سے گرد آلود پانی کی دھار پھوٹ نکلنے کے لیے موجزن تھی۔ رونے، سسکنے اور چیخنے کی آوازیں تیز ہونے لگیں تو انھوں نے اپنے اپنے کانوں میں مضبوطی سے انگلیاں ٹھونس لیں۔

——— چلو... کہیں اور چلیں...!

وہ سب اُٹھے۔ انھوں نے اپنے اپنے سرخ رنگ کھردرے پینٹ کی پشت کو زور زور سے جھاڑا۔

——— کہاں چلیں؟

——— کہیں بھی!

گھومتے گھومتے وہ کئی سڑکوں سے دُور نکل آئے۔ لیکن راستہ تھا کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ آوازیں تھیں جو مسلسل تعاقب کر رہی تھیں۔

——— ہم بھی چیخیں کیا...؟

——— نہیں... اتنا شور ہے کہ چیخنے کی ضرورت نہیں۔

——— یہ سڑک کبھی ختم نہیں ہوگی...؟

——— سفاک سڑک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی... ہم گاؤں کیوں نہ... رہے؟

گاؤں تو بہت پیچھے چھوٹ گیا... بہت پہلے سے ہم اسے مسلسل پیچھے چھوڑتے آئے ہیں۔ لوٹنے کا مطلب ہے گاؤں پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں یہ سفاک سڑک ہمیں نگل لے گی... ہم آگے ہی بڑھیں... متواتر سڑکوں سے ہوتے ہوئے شاید کوئی میدان مل جائے...!

——— لیکن وہ آوازیں تو...

——— ہم ان سے دُور نہیں جا سکتے... ہم ہیا چاہتے بھی نہیں... ہم تو اپنے آپ سے آگے بڑھ رہے ہیں... ان آوازوں کی تڑپ کو شانت کرنے...! اس کے لیے ہم اپنے ہی الٹے قدموں پر وار کر رہے ہیں... اور ہم اپنے آپ سے دُور بہت دُور...

——— اب شاید ہم اس تصویر سے بھی دُور آگئے ہیں...!

کھُلے آسمان کے نیچے انھوں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ ہوا کے دھندلے حصار پر وہ تصویر ویسے ہی آویزاں تھی۔ ان کے چہروں پر ایسی لکیریں ابھریں جیسے کسی مضبوط آہنی پنجے نے ان کے سر کے بالوں کو پکڑ کر انھیں ہوا میں معلق کر دیا ہو——— انھوں نے دھیان نہیں دیا۔

——— شاید ہم اس تصویر سے دُور چلے بھی جائیں لیکن وہ آوازیں، رونے، چیخنے اور سسکنے کی...

——— ہماری ہتھیلیاں تو شکستہ ہو چکی ہیں...

——— لیکن ہمارے بازو... ہمارے پاؤں...

وہ رک گئے۔ غور سے انھوں نے سڑک کو دیکھا۔

——— اس سفاک سڑک سے ہمیں مقابلہ کرنا ہوگا۔

——— جوتے کو زور زور سے پٹکو... کم از کم سناٹا تو ٹوٹے گا... اور وہ آوازیں تو شانت ہوں گی جن سے...

انھوں نے اپنے اپنے پاؤں سے پوری قوت کے ساتھ سڑک کے سر کو کچلنے کی کوشش کی۔

——— ہمارے پھٹے ہوئے جوتوں کے تلے کمزور ہو گئے ہیں... اور ہمارے تلوے بھی...

——— سفاک سڑک سے مقابلے کے لیے جوتے اتار کر تلووں کو پتھر بنانا ہوگا اور ہم تو پہلے ہی پتھروں سے اپنی مٹھیوں کو...

——— مجھے تو شک ہوتا ہے کہ ہمارے پاؤں کے نیچے

سڑک ٹھہری نہیں . . . کچھ سرک رہا ہے . . . [illegible] . . .
ایک چیخی۔ سب نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا [illegible] اس کی تردید کی ———

وہ پھر آگے بڑھ گئے۔ مسلسل [illegible] بھاری ہو گئے۔
ایک ایک قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ [illegible] تھی کہ وہ صدیوں کے پا پیادہ بنجارے معلوم ہوتے تھے۔

——— ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے . . . صرف یوں ہی بڑھتے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔

——— ہم رک کر سوچیں!

——— وہ آوازیں . . . ؟

چونک کر انھوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔
سب کے کان آوازوں کی آہٹ کو گرفت میں لینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ لیکن چاروں طرف سناٹا تھا ——— آسمان سا سناٹا ——— جوان کے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچ رہا تھا۔

——— کیسا بھیانک سناٹا ہے!

——— ہمارے پاؤں کے نیچے سے سڑک کھینچی جا رہی ہے . . .!
مجھے بھی لگ رہا ہے کہ پاؤں بے سڑک ہو رہے ہیں . . .!
کچھ سرک رہا ہے یا ہم بے وزن ہو گئے ہیں . . .!

آسمان سے سناٹے کے غیر مرئی سخت پنجوں میں ان کے سر کے بال کھنچے ہوئے تھے اور وہ معلق تھے۔

——— کیا سچ مچ ہم معلق ہیں . . . ؟

——— اب تو بازوؤں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ پرندے اڑ گئے یا . . .

——— ہم یوں ہی معلق رہیں گے . . . ؟

——— ہمیں نجات نہیں ملے گی . . . ؟

بڑی بے بسی کے عالم میں وہ تھکی ہوئی خالی خالی آنکھوں سے پتھر پتھر سے ہو گئے۔

——— سچ مچ ہماری دونوں آنکھیں صدیوں سے روتی آئی ہیں۔ ہنسنے کا انھیں موقع ہی نہیں ملا۔

——— میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ سمجھ نہیں پاتے . . . جب زمین سرک رہی تھی تم لوگ ہنس رہے تھے . . .

لیکن اب . . .

پتھر پتھر ساکت آنکھوں میں کئی روشن لہروں نے دم توڑتے توڑتے جھپکی لی ———

کھلے آسمان کے نیچے ہواؤں کی شکستہ دیواروں پہ آویزاں تصویر کی ایک [illegible] میں معلق دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور ایک آنکھ زار و قطار رو رہی تھی۔

بقیہ: سوویٹ یونین کے بیوروکریٹ

حاصل کر سکے۔

ایم، سارکیسیان بہترین اچھی کارکن تھی اور کئی بچوں کی ماں ہے۔ مقامی آبادی کے لوگ اسے کتنا پسند کرتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسے چوتھی بار مقامی سوویٹ کے لیے منتخب کیا گیا۔

بدترین بات یہ ہے کہ مختلف اداروں اور کارخانوں کے افسران اعلیٰ عدالتی فیصلوں میں بھی مزاحم ہوتے ہیں اور ان کارکنوں کو جنھیں غیر قانونی طور پر برطرف کیا گیا ہو۔ عدالتی فیصلوں کے باوجود کافی مدت تک بحال نہیں کرتے۔ الیہ وردی قصبے کے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں اشیا فروخت کرنے والی ایک خاتون وی ذ صنکیان کی برطرفی کو عدالت نے ناجائز ٹھہرایا لیکن اسے اپنی ملازمت سنبھالنے کے لیے گیارہ مہینے انتظار کرنا پڑا۔ قصبہ اُرکشتالا کے کوآپریٹیو کے کلرک ایس۔ منشکیان کو اپنی بحالی کے باوجود اپنے عہدے پر واپس آنے کے لیے پورے ایک برس انتظار کرنا پڑا۔

ٹریڈ یونینوں کا فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کریں لیکن یہ فرض وہ سرمایہ دار ممالک ہی میں ادا کر سکتی ہیں، مزدوروں کی دھرتی پر نہیں۔ مثال کے طور پر ٹیلیفون آپریٹر آئی۔ ٹرنذنیانین کے معاملے میں ٹریڈ یونین کمیٹی نے انتظامیہ کے فیصلے کی وجوہات کی چھان بین کیے بغیر ہی برطرفی کے فیصلے پر صاد کر دیا۔"
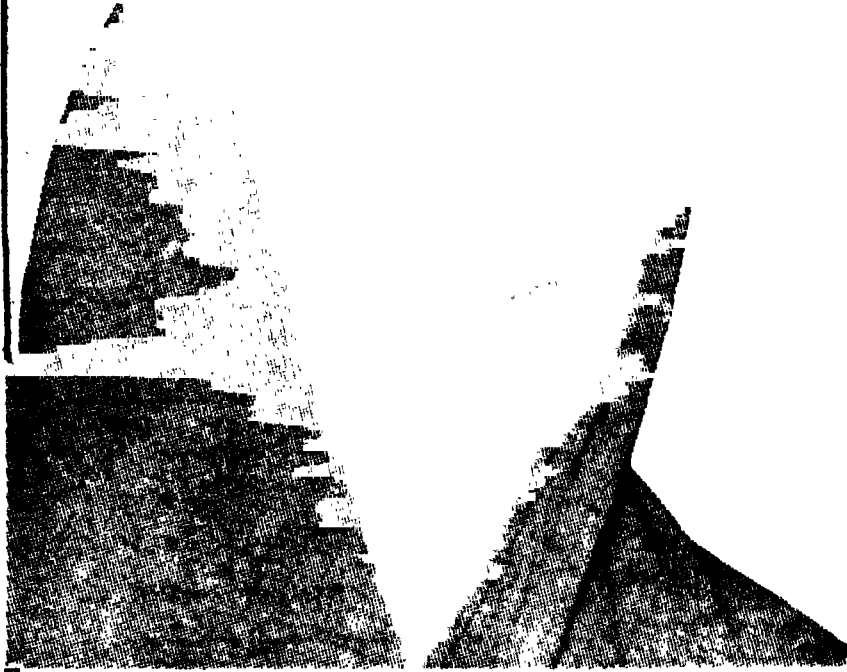
سوویٹ یونین کے بیوروکریٹ

گوپال مِتّل

مارکسی دانشوروں کا یہ نظریہ کہ لینن نے روس میں جو انتہائی مرکز بیوروکریٹک حکومت قائم کی تھی اس کی سختیاں وقت کے ساتھ ساتھ نرم پڑ جائیں گی غلط ثابت ہو چکا ہے۔ تقریباً ساٹھ برس کے بعد بھی صورتِ حال وہی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سوویٹ روس کے بیوروکریٹ زیادہ سے زیادہ خودسر اور غیر ذمہ دار ہوتے جا رہے ہیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء کے "پراودا" میں ان کی خودسری اور غیر ذمہ داری کی چند دلچسپ مثالیں شائع ہوئی ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق:

صوبہ کرودوگراڈ کا چیرمین آئی۔ اے۔ اوو ڈینکو گاڑی چلاتے وقت ٹریفک کے تمام ضابطوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ اگر اس کی گاڑی کسی چھوٹی گاڑی سے ٹکرا جاتی اور اس گاڑی یا اس میں بیٹھنے والوں کو اس تصادم سے نقصان بھی پہنچ جاتا تو بھی وہ اپنی گاڑی روکنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ ایک بار جب اس سے باز پرس کی گئی تو اس نے کہا "میں تمہارے منہ پر تھوکتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟" ٹریفک انسپکٹر لاکھ سر کھپاتا لیکن وہ اپنا جواز پیش کرنے کی کوئی کوشش نہ کرتا۔

دی۔ پی۔ جرمالوو کے گھر اور اس کے دفتر میں چند سو گز کا فاصلہ تھا۔ وہ ہمیشہ گاڑی پر سفر کرتا حالانکہ نہ تو اس نے گاڑی چلانا سیکھا تھا نہ اس کے پاس گاڑی کا لائسنس تھا۔ وہ مقامی اکزیکیٹو کمیٹی کا سکریٹری تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا عہدیدار بغیر لائسنس کے گاڑی چلا سکتا تھا خواہ گاڑی چلاتے وقت وہ کبھی کبھی پیدل چلنے والوں کو کچل ہی کیوں نہ دے۔

ان میں سے کسی کو عدالت میں لے جانا بیکار ہوتا کیونکہ جج اے۔ جی۔ بیو کو جب ایک دن سرکاری گاڑی چلاتے ہوئے روکا گیا تو وہ بھی بری طرح نشے میں دھت تھا۔ جن لوگوں نے اسے گرفتار کیا تھا وہ انھیں متواتر گالیاں دیتا رہا اور کہتا رہا کہ وہ یہ نہ بھولیں کہ وہ کون ہے۔

رپورٹ کے آخر میں اعداد و شمار بھی دیے گئے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ۸۲۰ حادثے ہوئے اور ٹریفک پولس نے سات ہزار لوگوں کو نشے کی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے پکڑا۔ سو سے زیادہ ممتاز افسروں کو نشے کی حالت میں گاڑی چلانے کے الزام میں عدالت میں پیش کیا گیا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افسر ایسے تھے جو صاف بچ نکلے۔

۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء کے "پراودا" میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عام مزدوروں کے ساتھ ان بیوروکریٹوں کا طرزِ عمل کیا ہے:

ازوان ڈسٹرکٹ پاور اسٹیشن کے شعبۂ تعمیرات کے افسرِ اعلیٰ کے۔ گابییان نے ٹیلی فون اپریٹر آئی۔ آر۔ زیا بینی کو ڈیوٹی سے غیر حاضری کے الزام میں برطرف کر دیا حالانکہ وہ اس وقت اسپتال میں تھی۔ جمہوریہ آرمینیکس ٹملوورگ کے شعبۂ تجارت کے ڈائرکٹر این۔ وٹوالیان نے جملہ ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر شعبے کے اسٹور کیپر آر۔ سرخوشیان کو اس کی رضامندی کے بغیر منتقل کر دیا۔

چھانیان کارخانے کے ڈائرکٹر کے۔ این۔ سادکیسیان کی برطرفی کا حکم صادر کر دیا۔ یہ پتہ چلانا بہت مشکل ہے کہ اس فیصلے کا حقیقی باعث کیا تھا۔ برطرفی نامے میں وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ اسٹاف میں تخفیف کی جا رہی ہے لیکن جیسا کہ اب سب کو معلوم ہو چکا ہے یہ وجہ فرضی تھی اور ان لوگوں کو ڈائرکٹر نے صرف اس بنا پر برطرف کر دیا تھا کہ جنھیں وہ ناپسند کرتا ہے ان سے نجات

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

پیغام آفاقی

تلاش

پوری یونیورسٹی کتنی خالی خولی سی لگ رہی ہے، بے جان سڑکیں، لان جن کی رومانیت خشک ہو گئی ہے، مکان جو گرد کا دھندلا سا لباس پہنے کھڑے ہیں، ہاسٹل کے اوپر ایک اداس آسمان ابھر آیا ہے ——— روشنی کے قطرے، ستارے، دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن یہ کتنے دور ہیں، پھر ——— یہ اپنے آپ میں کھوئے ہوں گے ان کو کسی سے کیا مطلب؟ اور پھر وہ بے جان ہیں۔ اینٹ ——— پتھر ——— کنکر اور درخت کی سوکھی پتیوں کی طرح۔ وہ لان کی گھاس ——— ہری بھری گھاس پر چل رہا ہے ——— گھاس کی پتیاں جو اُگتی ہیں، بے فکری سے اُگتی ہیں اور چند دنوں بعد سُوکھ جاتی ہیں کوئی ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اور یہ لوگ ——— یہ لوگ بھی انھیں کی طرح ہیں، اپنے آپ میں مرکوز کسی کو کسی سے ہمدردی کیوں ہو؟ ہمدردی ——— کتنا پُر فریب لفظ ہے۔ اس زمانے میں اس لفظ کا راز کس طرح فاش ہوا ہے! شاید اس وقت سے جب انسان نے ابھی شعور کی آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں، یہ ہمدردی کے رومانی تصوّر میں کھویا ہوا تھا، لیکن اب تمام آنکھیں کھل گئی ہیں، جاگ اٹھی ہیں، یہ آنکھیں جانتی ہیں کہ ہمدردی اور محبت کے کیا معنی ہیں ——— یہ تمام رشتے اپنے آپ پر شرمندہ ہیں وہ کٹ گئے ہیں، ٹوٹ رہے ہیں اتری ہوئی رسیوں کی طرح ...

بوڑھی سوسائٹی نے اپنے اخلاقی نظام اور مضبوط قدروں کی چادر سے انسان کی ننگی فطرت، اس کے ننگے احساسات کو کس خوش اسلوبی سے چھپا رکھا تھا۔ اور جب یہ چادر پھٹ کر تار تار ہو گئی ہے تو انسان کس طرح کھل کر سامنے آ گیا ہے،

کون جانتا تھا، کس نے محسوس کیا تھا، کہ ماں اپنے بچے کو اس لیے دودھ پلاتی ہے کہ اسے دودھ پلانے میں مزا آتا ہے، کون جانتا تھا کہ باپ اپنے بیٹوں سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ اس کے بیٹے اس کی مضبوط شخصیت کا ایک حصہ ہوتے ہیں، کون جانتا تھا کہ ہم پڑوس کی مدد اور اس سے ہمدردی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہماری اپنی زندگی کی حفاظت کرتے ہیں۔ کس کو معلوم تھا کہ قانون کوئی مقدس آسمانی صحیفہ نہیں بلکہ سماج کے مختلف افراد کی خود غرضیوں کو ایک سلسلے میں پرونے والے دھاگے کا نام ہے، لیکن آج آج سب کچھ کھل چکا ہے۔

وہ یہاں پڑھنے کیوں آیا تھا؟ اس نے سائنس چھوڑ کر آرٹ کیوں لیا تھا؟ اس نے ڈاکٹر بننے کے خواب کو کیوں ٹھوکر مار دی تھی؟ ——— اس لیے کہ اس نے سڑکوں پر لیٹے جسموں والے انسانوں کو ——— بوڑھوں کو ——— بچوں کو ——— مرتے دیکھا تھا، جن کا کوئی نہیں تھا، ——— یہ کتنے دنوں پہلے کی بات ہے؟ صرف تین سال ——— جب وہ اپنے ارادے دوسروں کے سامنے پیش کرتا تو لوگوں کی آنکھیں اس کے سامنے عقیدت سے جھک جاتی تھیں، لیکن اس روز جب وہ کینٹین میں تقریر کر رہا تھا، تو اسے لوگ کتنی حیرت، اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، جیسے وہ آج کا تیز نگاہوں والا انسان نہ ہو، بلکہ پرانے زمانے کا بیوقوف ہو، جو بیسویں صدی کے ایک جدید کینٹین میں آ بیٹھا ہو، اور جب وہ کینٹین سے باہر نکلا تھا تو بالکل خالی ہو چکا تھا،

پھر حمید نے اس کو چائے کی دعوت دی، وہ حمید کے کمرے پر گیا، چائے اتنی ہی میٹھی جتنی پہلے ہوا کرتی تھی، لیکن چائے میں حلاوت نہیں تھی، اب یہ چائے ویسی ہی ہو گئی تھی جیسی وہ اپنے کمرے میں بنا کر پی لیتا تھا، یا ایسی ہو گئی تھی جیسی وہ چائے جو ایک دن اس نے ٹرین میں

۴۳، ایس ہاسٹل ——— ایم، ایم، ہال ——— مسلم یونیورسٹی ——— علی گڑھ

پی لی تھی، اور گاڑی چل پڑی تھی، اور بیچانے والے کو پیسہ نہیں دے سکا تھا — وہ حمید کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، وہ اپنی محبوبہ کا قصہ لے کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ آج پہلی بار خشک اور خالی دل لے کر حمید کے کمرے سے آیا تھا، اسے سارے لوگ — ساری دنیا — ساری کائنات گرتی ہوئی عمارتوں کی طرح معلوم ہوئی، اور پھر ایک ایک کر کے تمام عمارتیں گرتی گئیں اور اب اس کے ارد گرد ایک کھنڈر تھا، وہ ایک مردہ پتھر کی طرح چل رہا تھا، تنہا — اپنے آپ کو بھوت محسوس کرتا ہوا جس سے سبھی ڈرتے ہیں، جس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔

اس کا جسم ایک بیکاری جسم بن گیا، جو اگر اندھا ہو تو اس کی چادر پر پڑا ہوا پیسہ لوگ اٹھا کر چل دیں اور جا کر فلم دیکھ آئیں اور وہ بھوکا رہ جائے۔

وہ رسیاں کیا ہوئیں جن کے سہارے وہ کائنات کی راہوں پر خود بخود آگے بڑھ رہا تھا، وہ رسیاں سڑ گئیں، ٹوٹ گئیں اور اب اس کا چلنا کتنا دشوار تھا، اس کا جی چاہا۔ کہیں گر جائے اور آنکھیں بند کر کے مر جائے۔ کئی بار اس نے کوشش کی — وہ کئی بار تھکا ہارا سگریٹ پیتا ہوا آ کر بستر پر گرا تھا، لیکن وہ زندہ رہنے پر مجبور تھا، جاگنے پر مجبور تھا، وہ جاگرن جس میں تھکن ہوتی ہے، بدن کا ٹوٹنا ہوتا ہے، خالی پن کا احساس ہوتا ہے، رات سرکتی جاتی ہے، اور آدمی وہیں کا وہیں رہتا ہے، جیسے دریا بہا جائے اور کسی کا پیالہ پیاسا کا پیاسا رہ جائے۔

وہ گھر جاتا ہے — لیکن گھر، بستی، شہر، ہر چیز کتنی عجیب ہو گئی ہے، جیسے سب کے اوپر سے ایک پرت اتر گئی ہو، وہ رنگ — وہ سہانا رنگ جس کی اسے ضرورت ہے وہ جل گیا ہے، خود اس کی نگاہوں کی تیز دھوپ سے۔ وہ رنگ اڑ گیا ہے — اب ہر چیز کتنی خوفناک، کتنی عجیب — کتنی بے رنگ ہو گئی ہے — گھر کے لوگ بھی، دوست!

یہ سب کے چہروں کو کیا ہو گیا ہے، ان کا وہ خوبصورت چہرا کہاں گیا — اب وہ اس کی طرف دیکھتے کیوں نہیں؟ وہ سب اپنی راہ پہ چل رہے ہیں۔ نہیں وہ تو پہلے ہی سے اپنی راہ چلتے تھے، لیکن اس کو پہلے غلط فہمی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ سب اس کے لیے چل رہے ہیں، اب اُن کا وہ خوبصورت چہرہ بجھ گیا ہے، ان کا بھید کھل گیا ہے — ماں کھانا لاتی ہے لیکن اس کھانے میں وہ بات نہیں ہے، ماں اسی طرح اس سے پیار سے باتیں کرتی ہے لیکن اس میں پیار کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے، وہی جملے، وہی TONE، وہی حرکتیں، وہی ادائیں — لیکن ان سب کو کیا ہو گیا ہے، لیکن اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے، اس کا پیالہ خالی ہے، اس میں پیاس ہے لیکن پیاس بجھے کیسے کہاں؟

وہ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا، وہ پیچھے کی طرف لوٹ نہیں سکتا، وہ کیا کرے؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ہو سکتا — چیزوں کا، چہروں کا رنگ نہیں اُڑا ہے، ان کی کھال نہیں جڑی ہے، صرف اس پر ایک گرد جم گئی ہے، ایک نئی گرد — جو بیسویں صدی کی ہواؤں میں اڑی ہے۔ وہ گرد ایک پرت بن کر ہر چیز پہ چھا گئی ہے، یہ نگاہوں کی تیز دھوپ — یہ گرد — یہ عجیب چیز ہیں۔ لیکن اس کو یہ بات معلوم نہیں ہے ورنہ وہ یہ گرد صاف کرنے کی کوشش کرتا۔

وہ پریشان ہے — وہ پھر گھر سے یونی ورسٹی لوٹ آیا ہے، اس نے ابھی ابھی کتاب میز پہ زور سے پٹک دی ہے، اور اپنے وقت کو جسے وہ پہلے قیمتی سمجھتا تھا اور اب بھی قیمتی سمجھتا ہے اپنے ہاتھوں میں لے کر نکل پڑا ہے، لان میں بکھیر دینے کے لیے، ٹی۔ ہاؤس میں بکھیر دینے کے لیے — خوبصورت اور خوشبودار پھولوں کی چاندنی میں لچکتی ہوئی شاخیں، اور ان کے پاس جا کر کھڑا ہونا، لمحوں کا بہترین استعمال۔

لان میں اندھیروں کی چادر، پر یہاں وہاں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں باتوں میں مشغول ہیں، لیکن وہ اس کے لیے اتنے ہی اجنبی ہیں، جیسے بے جان درخت — اور پیڑ پودے اور یہ پھولوں کا جھرمٹ — سبھی اپنی اپنی باتوں میں مشغول ہیں، کس لیے؟ اپنے لمحوں کو خوبصورت بنانے کے لیے۔ پھر وہ اپنے وطن کو چلے جائیں گے، پھر ان کے درمیان کبھی کبھار خطوط کا تبادلہ ہو جائے گا، ورنہ وہ جس وادی میں جائیں گے کھو جائیں گے — اور پھر اپنی اپنی قبروں میں جا چھپیں گے۔ کوئی کسی انجانے ہسپتال میں جا مرے گا۔ کوئی روڈ پہ ٹھوکر لگ جانے سے مرے گا۔ اور نالیوں میں پھینک دیا جائے گا، اور کوئی کہیں دور جا بسے گا۔ کسی اجنبی ملک میں جہاں کے باسی مختلف ہوں گے، پھر کچھ

دنوں میں وہیں کھو جائے گا۔

اسے اپنی کتاب کا دھیان آتا ہے جسے اس نے محنت سے پڑھنے کی بجائے میز پر پھینک دیا تھا، وہ کیوں پڑھے؟ اس کے لیے کہ اس کے والدین پیسے دیتے ہیں؟ اور بھائی اس سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں؟ لیکن ——— لیکن یہ رشتے بھی تو خود غرضی پر مبنی ہیں ——— ان کی خوشی سے اسے کون سی خوشی مل سکتی ہے، وہ کیوں اپنے آپ کو گزند پہنچائے، تکلیف دے؟ کیوں؟ ماں، باپ، بھائی، بہن، جائیں جہنم میں — اس کو ان سے کیا مطلب؟

وہ لان پر پھیلے ہوئے پھولوں کے ملائم سایوں کو کچلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے، اور ٹی ہاؤس میں جا کر گھس جاتا ہے ——— گانے کتنے بے معنی لگتے ہیں، انسانی رشتوں کے کھوکھلے پن کا اظہار ہیں یہ۔ گانے —— آوازیں ——— خوبصورت آوازیں پہلے کتنی اچھی لگتی تھیں، لیکن اب کتنی پرائی اور کتنی پرانی ہو گئی ہیں، وہ اس کو کیا دے سکتی ہیں؟ وہ دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتا اور خود حیرت میں ڈوب جاتا ہے، لوگوں کی آنکھیں کتنی پتھر کی ہو گئی ہیں، ان کے چہرے کسی قلعہ کی اونچی اور بڑے بڑے پتھروں والی دیوار بن چکے ہیں — وہ ایک دوسرے سے میلوں فاصلے پر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ ان سب کے درمیان خلا کی دیواریں کھڑی ہیں، جنھیں وہ محسوس کرتے ہیں، جنھیں پار کر کے وہ ایک دوسرے سے ہاتھ نہیں ملا سکتے، وہ ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے ——— پورا چائے خانہ پتھر خانہ بن گیا ہے،

لیکن وہ اپنے آپ کو اتنا تنہا کیوں محسوس کر رہا ہے ٹی ہاؤس میں تنہا ——— کمرے میں تنہا ——— یونیورسٹی میں تنہا ——— زندگی میں تنہا ——— پوری کائنات میں تنہا ——— نظام میں تنہا ——— تنہا! ایک خالی پیالے کی طرح ——— یہ کیا ہو گیا ہے اسے ———؟ یہ کیوں ہو گیا ہے؟ یہ تنہائی مٹنی چاہیے، یہ پیاس ختم ہونی چاہیے، اس پیالے کو بھر جانا چاہیے جسے وہ ایک بھوکے انسان کی طرح لیے پھرتا ہے ——— وہ چاہتا ہے وہ اندھیرے میں لوٹ جائے، لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے، اس کے چاروں طرف کئی سورج ہیں، ہر طرف سورج ہیں اور وہ اندھیروں کی تلاش میں ہے ——— ایک چراغ جلانے سے روشنی ہو سکتی ہے، لیکن ایک چراغ بجھنے سے اندھیرا نہیں

پیدا ہوتا!

اب اسے نیند نہیں آتی، چوبیس گھنٹے میں ایک منٹ بھی نہیں، کبھی ایک پل کے لیے آنکھ جھپکتی ہے، اور پھر وہ جاگ اٹھتا ہے اور گھبرا جاتا ہے، وہ کس کے بھروسے سو گیا تھا؟ اس کا اپنا کون تھا جو اس کی حفاظت کرتا؟ سبھی چور ہیں، ڈاکو ہیں، جو اس کو لوٹنے پر آمادہ ہیں۔

اسے نیند نہیں آتی ——— کیسے نیند آئے ——— وہ خالی ہو کر رہ گیا ہے۔ بے خواب راتوں کی طرح خالی ——— اسے کبھی نیند نہیں آئی، وہ جب سے جاگا ہے تب سے نیند نہیں آئی، دن، ہفتہ، مہینہ، سال گزر گئے، اور وہ اپنے آپ سے ڈرنے لگا ہے، کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے، نیند نہ آنے کا مطلب پاگل ہو جانا، وہ خوفزدہ ہو گیا ہے، وہ یونیورسٹی کی سڑکوں پر خالی خالی گھوما کرتا ہے، اور ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں پاگل نہ ہو جائے؛ وہ راتوں کو بے قرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور کپڑے تبدیل کر کے گھومنے نکل جاتا ہے ——— لیکن اب رات کے سناٹے اس سے باتیں نہیں کرتے، بلکہ وہ خود باتیں نہیں کر پاتا اس لیے کہ وہ جان گیا ہے ——— وہ جان گیا ہے کہ یہ سب کچھ ایک دھوکا ہے، اور وہ اپنے آپ کو بے وقوف نہیں بنا سکتا۔

وہ بے معنی، خالی میدانوں ——— اور چاندنی میں چمکتی ریت کے اوپر ٹہلتا رہے ——— اپنے خیال سے آزاد ہونے کی کوشش میں کوئی پتھر ہاتھ میں اٹھاتا ہے اور میدان میں بے سمت پھینکتا ہے، پھر اٹھاتا ہے ——— پھر پھینکتا ہے، پھر کسی ہال فنکشن میں جا کر بیٹھ جاتا ہے، میوزک کے سریلے پن پر کبھی کبھی وہ پھسل جاتا ہے لیکن پھر سنبھل کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور پھر وہی سناٹا اسے کاٹنے لگتا ہے، سناٹا ویسے ہی ہے جیسے سگریٹ نوش کو سگریٹ نہ ملے۔ اور وہ بیقرار ہو، راتوں میں دور دور تک سگریٹ کی دکان تک پہنچ جاتا ہے۔ راستے میں پڑے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کو چوری سے اٹھا لیتا ہو اور جلا کر پیتا ہو، ——— سگریٹ پینے میں اتنا مزہ نہیں جتنا نہ پینے میں دکھ ——— لوگوں کے ساتھ رہنے میں اب اتنی خوشی نہیں جتنی نہ رہنے میں پریشانی اور بے قراری ——— وہ بے روح انسان کی طرح، مردہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح ——— بے گوشت ——— بے خون ——— بے سمت ——— ہر جگہ گھومتا رہتا ہے۔ [illegible]

پنجروں کی طرح ——— اور ان کے درمیان وہ سب کچھ کھو چکے ہیں۔ سب کے سب۔ لیکن وہ کیا کر سکتے ہیں؟ اور یہ سوچ کر وہ کرب میں مبتلا ہیں اور وہ بھی انھیں میں سے ایک ہے' ———

آج وہ تین دنوں سے کھانا نہیں کھا سکا ہے' اس لیے کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے، لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے دس روپے ملے ہیں ——— جو اس نے اپنے ایک دوست کو قرض دیے تھے، اس نے ڈیڑھ روپے کی سگریٹ خرید لی ہے' اور مسلسل پی رہا ہے، تھوڑی دیر پہلے اس نے کھانا بھی کھا لیا ہے' اس کے بعد وہ اپنے ایک معصوم دوست سے جو جلد ہی اسی رات گھر جانے والا ہے' کہہ رہا ہے "آج میں بالکل فلسفی ہو رہا ہوں، اس کی وجہ بتاؤں؟"

اس کا دوست اس کی بات توجہ سے سُن رہا ہے اور وہ نہ جانے کیا کیا کہے جا رہا ہے' ——— ہر لفظ میں اُداسی' بے چینی اور کرب اور کا ایک دریا سمٹا آ رہا ہے ——— وہ دوست کی چارپائی کے پاس کبھی پائتانے سے ٹکائے' ہاتھ میں سگریٹ دبائے' اور آنکھیں زمین میں ٹھہرائے صرف اس لیے بیٹھ گیا ہے کہ اس کو ٹھہرنے کے لیے کوئی لفظ نہیں مل سکا ——— وہ یونیورسٹی کی کئی سڑکوں پر گھوم چکا ہے' اور بستر پر جاتے ہوئے اسے لگتا ہے' اور چلتے چلتے پاؤں اور جسم سب کچھ تھک چکے ہیں، اور دماغ چھا چھا جا رہا ہے۔

وہ دوست کو اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہے' وہ اُداسی کو اسٹیشن تک پہنچانا چاہتا ہے' وہ جانتا ہے کہ وہ اپنے دوست کو اسٹیشن چھوڑنے نہیں جا رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ رکشے پر بیٹھ جاتا ہے، دو ساتھی اداس ہو جاتے ہیں۔

رکشا اندھیرے میں بھاگا جا رہا ہے ایک سڑکوں پر [illegible] ہیں، درخت اور عمارتیں پیچھے چھوٹی جا رہی ہیں سہانا [illegible] جیسے چل رہے ہیں' اور وہ باتیں کر رہا ہے،

[illegible] "یار زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے [illegible] مقصد بڑا عجیب سا لگتا ہے' جیسے ہم بالکل خالی مکان ہوں جس میں کوئی رہتا نہ ہو، بالکل سونا سونا ——— سنّاٹا سا [illegible] کیے جا رہا ہو' اسے خود خیال نہیں کہ [illegible] کیا کہے جا رہا ہے

ہیں اپنے خالی پن کو دور کرنے کی ایک ناکام سی کوشش۔ اور پیاسا پیالہ۔ اس کے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں، آنکھیں سڑ جاتی ہیں۔ اور [illegible] ہوئی [illegible] جھک جاتی ہیں ——— اور اندر سے کسی چیز کی طلب ——— بھوکی آنکھیں ——— باہر جھانک رہی ہیں۔

سامنے سڑک کے کنارے۔ ایک گارڈن کے ریلنگ کے باہر چبوترے پر ایک مکمل تصویر دکھائی دیتی ہے ——— زندہ تصویر، ایک جوان، بیمار سی عورت' جس کے جسم پر ایک میلی سی ساڑی ہے۔ اور آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں۔ اور اس کے ہاتھوں میں ایک سوالیہ نشان ——— چند گھنٹوں کا بچہ' ماں کی پھیلی ہوئی ساڑی میں سانس لیتا ہوا ——— ایک عورت جو ایک مرد کے ساتھ جا رہی ہے لپک کر اس سے کچھ باتیں کرنے لگی ہے ——— شاید کچھ پوچھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں، جن میں ایک انتہائی خاموش لیکن بے پناہ التجا ہے ——— کچھ کہہ رہی ہیں۔ لیکن وہ یہاں۔ میدان میں۔ پتھر پر اس سنسان رات میں کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟؟ ...؟؟...؟؟

رکشہ آگے بڑھ جاتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ اتر کر اس سے باتیں کرے، لیکن رکشہ اور اس کے ساتھی ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

وہ اس عورت سے ملے ——— اس سے کچھ نہ پوچھے، بس صرف اتنا پوچھے "اگر ضرورت ہو تو یہ دو روپے رکھ لو" اور اتنا کہہ کر آگے بڑھ جائے اور کبھی لوٹ کر اس کے پاس نہ آئے ——— یہ خواہش اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد پیدا کرتی ہوئی کانٹے کی طرح اٹک سی گئی ہے اور پیار کے خون سے ——— اس کا پیاسا پیالہ اچھلنے لگا ہے۔

رکشہ آگے بڑھ گیا ہے لیکن وہ کچھ نہیں کر پایا ہے ——— اف [illegible] کا سانس لیا ہو [illegible] ——— [illegible] زیادہ نشیلہ۔ کتنے دنوں کے بعد پیدا ہوا ہے ——— خالی پیالے میں کچھ چشمے پھوٹ رہے ہیں، لیکن اب یہ چشمے پھر سمٹنے لگے ہیں اور پیالہ پھر پیاسا ہونے لگا ہے کیونکہ رکشا آگے بڑھتا جا رہا ہے، اس کا جی چاہتا ہے وہ رکشہ سے اتر جائے ——— لیکن ——— یہ بڑا کٹھن ہے۔

وہ اسٹیشن ——— وہاں اس کو کچھ نہیں دکھائی دیتا [illegible] [illegible] ——— [illegible] ——— [illegible] ——— وہ [illegible]

(بقیہ صفحہ پر)

قمر اقبال

ایک گرتی ہوئی دیوار کا سایہ بن کے
زندگی رہ گئی ٹوٹا ہوا رشتہ بن کے

وقت کی گرد میں پھر اس کا نشاں تک نہ ملا
پاس ٹھہرا تھا ہمارے کوئی لمحہ بن کے

اتنے شرمندہ ہیں آدم کے کیے پر کچھ لوگ
آدمی ہو کے بھی جیتے ہیں فرشتہ بن کے

دل سے گذرو تو سنبھل کر کہ سرِ راہ یہاں
منتشر خواب ہیں ٹوٹا ہوا شیشہ بن کے

سر چھپاؤں گا تری گود میں سورج کی طرح
دیکھنا شام مری شام کو دریا بن کے

رات تاریک ہے نیچے ہے سمندر ہر سو
اور ہم اڑتے ہیں اک زخمی پرندہ بن کے

دل کے بہلانے کی جب کوئی نہ صورت دیکھی
رہ گئے اپنے ہی ہاتھوں میں کھلونا بن کے

زندگی ہے کہ کسی آگ کے جنگل کا سفر
کون آئے گا ادھر ابر کا ٹکڑا بن کے

ہم نے اک عمر لکھے گیت محبت کے قمرؔ
اور اب رہ گئے خود اپنا ہی نوحہ بن کے

عروج زیدی

آفریں صد آفریں اس جرأتِ بے باک پر
سنگ وآہن کے زمانہ میں رہے ہیں آئینہ گر

زہر پینا ہو کہ ہو دار و رسن کو چومنا
ہم نے پایا ہے خرد کو ہر جگہ نا معتبر

یہ ٹھہر جائے تو رک جائے گی نبضِ کائنات
جرم اب دل کی ہے بس میرے نفس کی ہم سفر

سوچیے تو شورشِ جاں کے لیے ساماں بہت
دیکھیے تو ہم فقط وابستۂ شام و سحر

اے دلِ بیدار! میں ایسے میں کس کا ساتھ دوں
ہائے یہ رنگیں کشاکش درمیانِ خیر و شر

بے زباں سا ایک آنسو ترجمانِ رازِ دل
داستانِ آرزو کی اتنی شرحِ مختصر

تلخیٔ حالات کا غم کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں
وقت کے مرہم سے بھر جاتا ہے ہر زخمِ جگر

ہر بشر "حرفِ برہنہ" کہہ نہیں سکتا عروجؔ!
بات پردہ میں کہی جائے تو اس پہ ہے نظر

حکیم منظور

حاصل اس ایک رنگ کا چشمِ پُرآب ہے
اب سایۂ برف زار کا سر پہ آفتاب ہے

اک لمحہ مجھ کو سوچ، مری ذات سے الگ
کیا میری وسعتوں کا سمندر جواب ہے

اک بے کراں سکوت ہے ہر جسم کی قبا
اس کو اتار دے تو فقط اضطراب ہے

جو آ سکا نہ آج تک، آئندہ کے باوجود!
پھولوں کی آرزو، اسی موسم کا خواب ہے

یہ کیا! کہ میں جہاں سے چلا تھا وہیں پہ ہوں
شاید زمیں بھی کوئی عکسِ سراب ہے

احساس کس کو ہے کہ مری جلتی آگ پہ
اک طنز کی طرح یہ برستا سحاب ہے

یا گر پڑے زمین پہ! یا سر اقدس پڑے
اُس کا وجود طاقِ فلک کی کتاب ہے

سایوں کے گھٹتے بڑھتے سے منظر حسیں ہے وہ
لیکن مرے لیے یہ تماشا عذاب ہے

سلاٹنی گیٹ کریم کالونی اورنگ آباد (مہاراشٹر) ● گھر سیف الدین خاں، رام پورا یوپی ●

کرشن مُراری

آس نراس کے بیچ نرنتر پل پل تیری راہ تکے
اندھیارے میں چنچل نینوں کا البیلا دیپ جلے
ساون بھادوں رُت من بھاون کیسا جادُو ڈال گئی
شیتل کومل پُروائی سے میرے من میں آگ لگے
دُور گگن میں اُڑنے والے پنچھی چاند ستاروں تک
بیکلی میں یہ سوچ رہا ہوں دھرتی پر انسان سے
لہرائے ہے شوخ نوتن منگ سوچ چنچل مچل مچل
ساگر ساگر گاگر میں بھرنے کا پریاس کرے
ہارے ہارے ہم نگ چگ پر کیا موسم کی بات کریں
گرمی سردی بارش طوفاں سب یکساں آکاش تلے
انگ انگ میں ایھلا شا ناچے من میں چنچلتا
[illegible] متر کو ہم جگ میں سنیاس لیے

ظفر صہبائی

ہر ایک منظرِ آفاق نے کہا مجھ سے
میں تیرا عکس ہوں آگے نظر بڑھا مجھ سے
شعور میرا جو پوری طرح کھلا مجھ سے
گلے ملا نئی صدیوں کا تجربہ مجھ سے
یہ لگ رہا ہے مشینوں کا ایک حصّہ ہوں
کہاں پہ ٹوٹ گیا میرا رابطہ مجھ سے
زمیں زوال کے نقطے پہ جب بھی آئے گی
نئے زمانوں کی پھر ہوگی ابتدا مجھ سے
عجب مکان ہیں شہروں کے دھوپ بھی نہ ہوا
بڑا لطیف سا احساس چھن گیا مجھ سے
مرے وجود کو ترجیح دو ہر اک شے پر
جُڑا ہے زیست کا ہر ایک فلسفہ مجھ سے

[illegible] نئی دہلی۔　　●　　[illegible] پارک بھوپال۔

نوبہار صابر

دُھوئیں کے گھاٹ کی جانب بہاؤ میں دیکھا
عجیب حوصلہ کاغذ کی ناؤ میں دیکھا
کسی سے لاگ کسی سے لگاؤ میں دیکھا
اسیر سب کو اسی بھید بھاؤ میں دیکھا
بگڑ کے مجھ سے الگ بھی ہوا وہ رو یا بھی
یہ طرزِ رنگ بھی اس کے سُبھاؤ میں دیکھا
جھلس گیا مرا سایا بھی جب وجود کے ساتھ
پھر اُس کے بعد نہ سورج کو تاؤ میں دیکھا
دُکھوں کی راہگذر پر جو راہ چلے ٹوٹے
بھلا اُن کو دُکھوں کے پڑاؤ میں دیکھا
نفس نفس تھا دھوئیں کی لپیٹ میں صابر
بدن بدن کو دہکتے الاؤ میں دیکھا

احتشام اختر

اس قدر سخت سزا دی کس نے
میری پہچان مٹا دی کس نے
اب وہ گردابِ تمنا ہی نہیں
ناؤ ساحل سے لگا دی کس نے
نیند آنکھوں میں گھُلی جاتی ہے
اپنے دامن کی ہوا دی کس نے
ظلمتِ غم میں سکوں تھا کتنا
شمعِ اُمید جلا دی کس نے
دل کے سُنسان گھنے جنگل میں
یک بیک آگ لگا دی کس نے
اب تو مرنا بھی ہوا ہے مشکل
مجھ کو جینے کی دعا دی کس نے

علقمہ شبلی

کائناتِ مہ و خور جس سے درخشندہ ہے
کس لیے ذات پہ خود اپنی وہ شرمندہ ہے
وقت کی عشوہ گری کا ہمیں شکوہ کیوں ہو
شہرِ دل درد کے سورج ہی سے تابندہ ہے
جس کو قسمت سے کوئی نقشِ قدم بھی نہ ملا
اے مرے عہد، وہی تیرا نمائندہ ہے
میں نے مانا کہ ہوں گم کردۂ منزل لیکن
وقت کیوں نقشِ قدم کا مرے جوئندہ ہے
آپ شبلی کو فرشتہ نہ خدارا کہیے
آدمی ہونے پہ کب اپنے وہ شرمندہ ہے

دو نظمیں

اقبال کرشن

حصارِ تنگ

مرے دشمنوں کا حصارِ تنگ
مرے دوستوں کی زبان بند
میں جہادِ زیست میں بے سپر
مرا اسپ حوصلہ پاشکستہ۔ زمیں گرفتہ، لہولہان
نظر میں تخت نشیں غبارِ فریب و مکر

نہ دوا کی ہے، نہ دعا کی ہے
یہ گھڑی نزولِ بلا کی ہے
ہے عذاب و قہر و جلال کی
یہ گھڑی ہے میرے زوال کی

مری ظلمتوں کے نہنگ مجھ کو چبا لے آج
چبا لے آ

سفید کوّے کا مرثیہ

ہماری خوشیوں کے ثانیے کا
نحیف و لاغر
عجیب و نادر
سفید کوّا
ہمارے آلام کے تواتر کی ساعتوں کے
مہیب چنگال
تیز منقار
کالے کوّوں کی برق ادصاف یورشوں کی
صلیبِ اسود پہ آویزاں[1] ہے

---

[1] بروزن فاعلن

دو نظمیں

شاہد کلیم

سفر کا المیہ

شریکِ سفر میرا ــــ سورج
گھنے جنگلوں میں کہیں
کھو گیا ہے
اندھیروں کا اژدر
مری سمت
بڑھتا چلا آ رہا ہے
میں بے نور آنکھیں لیے
ایک نقطہ پہ ساکت
کھڑا ہوں

آخری منظر

شگاف ہیں در و دیوار میں زمیں کی طرح
جگہ جگہ سے ہیں برباد خوشنما محراب
کہیں چراغ فروزاں نہیں ہے طاقوں میں
تمام کمرے میں پھیلے ہیں مکڑیوں کے جال
منڈیر بن گئی گھر جنگلی کبوتر کا
پناہ لیتا نہیں اس میں کوئی آدم زاد
اک ایک کر کے چلے ہی گئے مکیں اس کے
کھنڈر میں ہو گیا تبدیل یہ بلند مکاں
اب اس طرف کوئی بھولے سے بھی نہ آئے گا

سنٹرل ایکسائز آفس ــــ گیا ــــ بہار

مرزا غالب کی بیماریاں اور مرض الموت

ڈاکٹر عبدالجلیل

مرزا غالب کے سوانح حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں ان کی صحت عموماً اچھی رہی، انھیں کوئی مستقل بیماری لاحق نہیں ہوئی۔ سفرِ کلکتہ میں جو ۱۸۲۵ء میں شروع ہوا وہ کانپور پہنچنے پر بیمار پڑ گئے۔ چونکہ کان پور میں انھیں کوئی اچھا طبیب نہیں ملا اس لیے وہ بغرض علاج لکھنؤ گئے اور چند ماہ وہاں رہے، ہمیں اس بیماری کی کوئی تفصیل معلوم نہیں (ہو سکتا ہے کہ معدہ خراب ہوگیا ہو، یا پیچش ہوگئی ہو جس کے ٹھیک ہونے میں کئی ماہ لگ گئے) غالباً کوئی شدید بیماری نہ تھی۔ مطبوعہ خطوط میں پہلی مرتبہ ۵ فروری ۱۸۵۳ء کے ایک خط سے ان کی بیماری کا پتا چلتا ہے۔ وہ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں: "دو دن سے وجع الصدر ہے اور میں بہت بےچین ہوں" غالباً یہ درد اعصابی تھا۔ اگر یہ ذات الجنب (PLEURISY) ہوتا، یا اس کا تعلق دل سے ہوتا، تو اس کے بعد بھی کہیں اس کا ذکر آتا۔ لیکن مرزا کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وجع الصدر کی شکایت نہ پہلے کبھی تھی اور نہ اس کے بعد کبھی ہوئی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی اعصابی درد رہا ہوگا۔

اس کے بعد اگلے ہی سال ۱۸۵۴ء میں انھیں لرزہ آیا۔ اس سے متعلق بھی تفتہ ہی کو لکھا ہے: "جس دن سے لرزہ چڑھا ہے کھانا میں نے مطلق نہیں کھایا ہے۔ آج پانچواں دن ہے، نہ کھانا دن میں میسر ہوا نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت ہے۔ ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لطف کو دیکھو کہ آج پانچواں دن ہے کھائے ہوئے، ہرگز بھوک نہیں لگتی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوتی" اس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے ملیریا ہوگیا ہو، شاید یہ کلکتہ میں رہنے کا اثر ہو اور وہاں بھی ہوتا رہا ہو، کیونکہ بھوک مطلق نہیں تھی۔ اس سے شبہ یرقان کی طرف بھی جاتا ہے، مگر اس کی دوسری علامات نہیں ملتیں، نہ آنکھیں زرد ہوئیں نہ پیشاب۔ کیونکہ اس صورت میں مرزا ذکر ضرور کرتے۔ اس لیے خیال یہی ہے کہ شاید یہ ملیریا تھا۔

اس کے بعد چار سال تک مرزا کے خطوط میں کہیں بیماری کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ایک جگہ مسہل کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ خود بھی مرزا نے اکثر لکھا ہے انھیں حکمت سے دلچسپی تھی، باقاعدہ حکمت کی تعلیم تو نہ تھی لیکن یونانی طریقہ علاج میں تجربہ کافی تھا۔ اکثر خطوط میں نسخے ملتے ہیں۔ مثلاً چوب چینی والا نسخہ تفتہ کو لکھا ہے یا عصارہ ریوند اور ارنڈی کے تیل والا نسخہ جو انھوں نے خود قولنج میں استعمال کیا۔

قولنج سے مراد کولائٹس (COLITIS) ہے یعنی بڑی آنت کا ورم۔ اس کی شکایت انھیں مرتے دم تک رہی۔ اکثر دورے پڑتے رہتے تھے اور وہ بہت بےچین رہتے تھے۔

وہ بیماری جس سے میرزا کو آخری عمر میں بہت تکلیف اٹھانی پڑی اور جو بالآخر ان کی موت کا سبب بنی، غالباً اس کی علامتیں اور اشارے ۱۸۵۸ء میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ وہ منشی شیو نرائن آرام کو ۴ دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں:

> "قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہوگیا اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی"

یہ پہلی علامت ذیابیطس کی تھی۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی کا ہاتھ چاقو سے کٹ جائے اور پک جائے تو یہ لازماً ذیابیطس ہی ہے، مدعا صرف یہ ہے کہ اگر ذیابیطس کی اور علامتیں موجود ہیں یا بعد کو

نمودار ہوجائیں۔ مثلاً پیشاب کا بار بار آنا، پیاس کی شدت، کمزوری آنکھوں سے کم دکھائی دینا، کانوں سے کم سنائی دینا۔ پھوڑے پھنسی کا نکلنا۔ خاص طور پر ایک ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر کے آدمی کو تو ہمیں اس واقع یعنی انگلی پک جانے کو بھی بہت اہمیت دینا چاہیے اور اسے بیماری کی ایک علامت قرار دینا چاہیے۔

۱۸۵۸ء میں اور کوئی اطلاع اس بیماری کی نہیں ملتی۔ ۱۸۵۹ء میں میرزا کے پہلی بار پھوڑے پھنسیاں نکلے جس کی اطلاع انھوں نے تفتہ کو ۱۷ جولائی ۱۸۵۹ء میں دی۔ غالباً معمولی دو چار پھوڑے نکلے ہوں گے جو کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو گئے۔ یوں تو ان کی کچھ ایسی اہمیت نہیں، البتہ انھیں بھی مرض کی ایک کڑی ضرور سمجھنا چاہیے۔ ۱۸۶۰ء کے خطوط میں کہیں بیماری کا ذکر نہیں۔ ۱۸۶۱ء میں پھر بیماری کا ذکر نہیں ہے مگر اس کی تفصیل نہیں ملتی۔

اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں مستقل بیماری کا ذکر ہے۔ تقریباً ہر خط میں جو اس سال لکھا گیا ہے، اس میں اس کا ذکر ہے۔ مرض بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ قریب سال بھر رہا۔ ظاہر ہے وہ اس سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ قریب بارہ پھوڑے دونوں ہاتھوں اور ٹانگوں میں نکلے، کبھی ایک ہاتھ پر، کبھی ایک ٹانگ پر، کبھی دوسری ٹانگ پر ورم رہا۔ پھوڑے پھوٹ کر بقول ان کے غار بن گئے۔ اس کے علاوہ بار بار پیشاب آنے کی شکایت جو پہلے سے تھی، اب اور زیادہ ہوگئی تو پیخ جو دَوری تھا، اب دائمی ہو گیا، پانی بار بار پیتے تھے۔ گویا وہ مرض جس کی پہلی علامت ۱۸۵۸ء میں نمودار ہوئی تھی، اب پورے شباب پر تھا۔

اس بیماری کے سلسلے میں میرزا نے جو خطوط لکھے ان تمام خطوط کا اچھی طرح مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً دسمبر ۱۸۶۲ء میں ان کے سیدھے ہاتھ میں ایک پھوڑا نکلا۔ شروع میں یہ پھنسی تھی لیکن بعد کو پھوڑا یعنی شب چراغ (کاربنکل) بن گیا۔ یہ پھوڑا پھوٹا تو اس کی جگہ غار سا رہ گیا۔ یہ ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا کہ ایک پھوڑا بائیں پہونچے پر نکلا۔ یہ پھوڑا ابھی اچھا نہیں ہوا تھا کہ اسی ہاتھ میں ایک اور پھوڑا نکلا۔ یہ تینوں پھوڑے پھوٹ کر زخم بن گئے۔ اس کے بعد دونوں رانوں میں یکے بعد دیگرے ایک ایک پھوڑا نکلا، پہلے سیدھی ران میں، پھر بائیں ران میں۔ اس کے بعد الٹے پانو میں ورم آگیا کفِ پا سے پشتِ پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس آگیا۔ اس کے بعد سوا ابھی کسی خاص جگہ نمایاں نہیں ہوا تھا کہ دوسرے پانو میں بھی ورم آگیا، دونوں پنڈلیوں میں تکلیف بڑھ گئی اور بالآخر ہڈیوں کے قریب دو پھوڑے نکل آئے۔ اس کے بعد پانو میں بھی ورم ظاہر ہو گیا اور پھوڑے کی صورت ظاہر ہو گئی۔ اس طرح سے کل نَو پھوڑوں کا سراغ ملتا ہے ایک سیدھے ہاتھ میں، دو الٹے ہاتھ میں، دو رانوں میں، دو پنڈلیوں میں، دو پانو میں۔ ممکن ہے، اور پھوڑے بھی نکلے ہوں جن کا ذکر میرزا نے نہ کیا، یا انہی نو کو تقریباً بارہ لکھا ہو۔

ایک خط جو انھوں نے انوار الدولہ شفق کے نام ۱۵ فروری ۱۸۶۴ء کو لکھا ہے اس کا نقل کرنا یہاں ضروری ہے، کیونکہ ان پھوڑوں سے میرزا پر کیا گزری، اس کا بہت سچا نقشہ اس خط میں ملتا ہے:

> "سالِ گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحبِ فراش رہا، اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا، چلنا پھرنا کیا! نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ۔ ان سب سے بدتر ایک صورتِ پُرکدورت، یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پانو تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑے پر ایک زخم ایک غار، ہر روز بارہ تیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے سے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بیتاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی۔ دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی، جاگ کر تڑپا کیا، پھر سو گیا، پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر تین حصے یوں گزرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں، ناتوان و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا، اگر اٹھتا ہوں

تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں جتنی دیر میں قدِ آدم
دیوار اُٹھے۔ آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں
کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا' میری خبر نہ لی۔"

ان پھوڑوں کے ساتھ ساتھ میرزا کو بار بار پیشاب کی تکلیف جو بہت پہلے سے تھی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ پیاس کی شدت تھی، کمزوری بھی بڑھ گئی تھی۔ قبض بھی اور زیادہ ہو گیا تھا۔ پانو کی کچھ انگلیاں ٹیڑھی پڑ گئی تھیں جن سے جوتا پہننے میں تکلیف ہوتی تھی۔

اس کے بعد تین سال ۱۸۶۴ء ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء میں کوئی نئی بیماری نہیں ہوئی۔ البتہ پیشاب کی کثرت اور قولنج کے دورے برابر پڑتے رہے۔ جیسا کہ انھوں نے خط موسومہ میر غلام بابا خاں (۱۸۶۶) میں لکھا ہے، غلام بابا خاں نے انھیں سورت بلایا تھا۔ اس کے عذر میں یہ خط لکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"پانو سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع، کیونکر قصدِ سفر کروں۔ تین چار شبانہ روز کس طرح قفس میں بسر کروں گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ناگہاں قولنج کے دورہ کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں، آنا میرا سعدت کسی صورت حیزِ امکان میں نہیں۔"

۱۸۶۶ء میں کمزوری بہت بڑھ گئی تھی پلنگ پر سے اٹھنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ بقول مرزا "چار پایہ بن کر اٹھتا ہوں، تب بھی پنڈلیاں لرزتی ہیں۔" یہ کمزوری بڑھتے بڑھتے اتنی ہو گئی کہ آخر میں مرزا بے سہارے خود اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں میں لے کر دالان میں لے آتے اور بقول ان کے ایک اندھیری کوٹھری میں ڈال دیتے۔ تمام دن اسی میں پڑے رہتے۔ سرِ شام پھر دو آدمی بدستور لے جا کر صحن میں پلنگ پر ڈال دیتے۔ یہ حال ان کا مرتے دم تک رہا۔ بینائی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، بہرے بھی خاصے ہو گئے تھے۔ حاجتی پلنگ کے پاس رکھی رہتی تھی۔ آخری زمانے میں پیشاب کی حاجت اور زیادہ ہو گئی تھی۔ گھنٹے بھر میں پانچ چھ بار اٹھنا پڑتا تھا۔ قولنج جو پہلے دوری تھا اب دائمی ہو گیا تھا۔ مہینے بھر میں پانچ سات بار تک دورہ پڑ جاتا تھا۔ غذا کم ہوتے ہوتے تو بمنزلہ معدوم ہو کے رہ گئی تھی قبض اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہفتہ ہفتہ بھر اجابت نہ ہوتی تھی، غرض حالت بد سے بدتر ہوتی گئی مرنے سے چند دن پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی پھر دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوا شاید اس سے ایک دن پہلے مولانا حالی عیادت کو پہنچے، اس وقت کئی پہر کے بعد کچھ ہوش آیا تھا اور نواب علاؤالدین احمد خاں کو خط لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے صحت کا حال پوچھا تھا اس کے جواب میں ایک فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو' ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" اس خط کا حوالہ دینے سے میری مراد یہ ہے کہ اگرچہ وہ مرنے سے پہلے کئی دن بیہوش رہے لیکن جب ہوش میں ہوتے تو ان کا دماغ بالکل صاف اور روشن ہوتا تھا۔

بگا بیگم (مرزا باقر علی خاں کی بیوی) فرماتی تھیں کہ موت سے ایک دن پہلے کچھ افاقہ ہوا تھا۔ کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر ملازم سے کہا کہ مرزا جیون بیگ (مرزا باقر علی خاں کی سب سے بڑی صاحبزادی) کو بلا لاؤ۔ ملازم گیا اور آ کر کہا کہ سو رہی ہیں' جب اٹھیں گی بھیج دی جائیں گی۔ اس پر فرمایا کہ جب وہ آئے گی ہم تب ہی کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد جونہی تکیے پر سر رکھا، بیہوش ہو گئے' حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو خبر دی گئی' انھوں نے آ کر دیکھا اور بتایا کہ دماغ پر فالج گرا ہے تمام کوششیں اور علاج کیے گئے مگر بے سود انھیں ہوش نہیں آیا۔ اگلے دن یعنی ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو دو پہر ڈھلے ان کا انتقال ہو گیا۔

●●

اعتراف

شمیم قاسمی

پہلے آندھی ـــــ !

پھر بارش ـــــ !!

اور تب طوفان ـــــ !!!

اور جب دائرے کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے والی لکیر میرا مقدّر بن گئی تو میں (کہ اننت دشاؤں کا گیان پراپت کرنے والا) کیچڑ میں لت پت چہرہ لیے اس ساحل پہ کھڑا تھا جہاں سے سیاہ جزیرے کی طرف جانے کے لیے ان گنت دروازے تھے اور ہر دروازہ کی چوکھٹ پر سفید چونچ والے کوؤں کا ایک جھنڈ اپنا سر رگڑ رہا تھا اور اس رگڑ سے پیدا ہونے والی بجلی کی چمک سے میرا وجود مختلف زاویے سے اننت دشاؤں میں بٹ چکا تھا۔ بکھرنا، سمٹنا . . . اور پھر بکھر جانا جیسے میرے ہی حصّے میں آیا ہے ـــــ لیکن اب کے کچھ اس طرح بکھرا ہوں کہ خود کو سمٹینا مشکل ہو گیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس سے سمجھوتہ کر لوں جس کی شفقتوں سے اور جس کے لمس سے آج میں محروم ہوں ـــــ اور جو میرا محافظ (ہے) تھا۔

ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب دائرے کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے والی لکیر میرا مقدّر بن گئی تو میں اس ساحل پہ کھڑا تھا جہاں سے سیاہ جزیرے کی طرف جانے کے لیے ان گنت دروازے تھے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ میں کس دروازہ سے اندر جاؤں ؟

یہاں تو کچھ ایسا ہے کہ ہر دروازہ سے اندر کا ٹمپریچر باہر آ رہا ہے اور پھر یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ کس دروازہ کا ٹمپریچر کتنا ہے؟ اور شاید اسی لیے ٹمپریچر کی پیمائش کر لینے کا ارادہ میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا ہے۔

اور جب میں نے ۔۔ ٹمپریچر کی پیمائش کے لیے بائیں طرف والے سے (جو ہے اور نہیں بھی) تھرمامیٹر مانگنا چاہا تو وہ میرے اس ارادہ کو بھانپتا ہوا بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ مسلسل اندھی فضاؤں کے سفر کی صعوبتیں جھیلتے رہنے کی وجہ سے اس تھرمامیٹر کا پارہ اب ٹھنڈا ہو چکا ہے جس سے تم اس ٹمپریچر کی پیمائش کرنے والے ہو۔"

اور تب میں چونکا ـــــ اور تب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بچپن سے دماغ سے کام لینے والا "میں" بائیں طرف والے کے ہاتھوں مجبور ہے!

رہ رہ کے یہ احساس کھائے جا رہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تھرمامیٹر ٹھنڈا ہو چکا ہے بلکہ بھی نہیں۔ اس کی تابیمان شکتی ختم ہو چکی ہے اور یہ صرف زیرو پوائنٹ ہو کر رہ گیا ہے۔

اس کے بغیر میں جینے کی تمنّا رکھتے ہوئے بھی جی نہیں سکتا کہ اس کے وجود سے انکار نا ممکن ہے۔

مجھے اس کے کھو جانے کا غم بھی نہیں ہے کہ مجھے اس کے پانے کی خوشی بھی کب رہی ہے !!

جب بھی میں نے کچھ پانے کی تمنّا کی ہے تو کچھ کھو دینے کا ارادہ بھی !

بغیر کچھ کھوئے کچھ پایا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ تو صدیوں سے ہوتا آیا ہے اور آج میں سوچتا ہوں ۔

کہ میں نے کیا پایا ہے ـــ ؟

کہ میں نے کیا کھویا ہے ... ؟؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے آج تک نہ کچھ پایا ہے اور نہ کچھ کھویا ہے ۔

نو گنج ـــــ سہسرام ـــــ بہار

(بقیہ صفحہ)

ہندی کا ایک جدید شاعر

انل بھارتی

میں ہندی کے ایک ایسے قلم کار کو آپ سے متعارف کرا رہا ہوں جو اُردو سے بھی واقف ہے اور ان دونوں زبانوں کو جو بہت سے باہمی رشتوں میں بندھی ہوئی ہیں، ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب لانے کا خواہش مند ہے۔

ڈاکٹر شیام سنگھ ششی جو آج کل بھارت سرکار کے محکمۂ پبلیکیشنز ڈویژن میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں، یکم جولائی ۱۹۳۵ء کو ہردوار، اتر پردیش کے چھوٹے سے گانو بہادر پور کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ذہانت کے آثار ان کے چہرے پر بچپن ہی سے روشن تھے۔ کھیل کود اور پڑھائی میں وہ اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ آگے رہے۔ ان کی نظموں کی پہلی کتاب ۱۴ سال کی عمر میں اس وقت چھپی تھی جب وہ اسکول کے طالب علم تھے۔

ڈاکٹر ششی نے ایم۔ اے۔ سوشیالوجی میں کیا، پوری یونیورسٹی میں ان کی پوزیشن امتیازی تھی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند انھوں نے انتھروپولوجی (ANTHROPOLOGY) میں ۱۹۶۰ء میں حاصل کی۔ اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں انھوں نے کافی وقت پہاڑوں پر گدی قبیلوں کے درمیان گزارا۔ وہ اب بھی ہندوستان کے دُور دراز علاقوں کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ وہاں کے پس ماندہ عوام کی زندگی کے مطالعے اور ان کی بہبود کے وسائل کی تلاش سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔

ڈاکٹر ششی اپنا موجودہ عہدہ سنبھالنے سے پہلے وزارتِ دفاع کے ہفتہ وار اخبار "سینک سماچار" کے ایڈیٹر انچارج تھے جو دس ملکی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ششی کی تحریریں ہندی اور انگریزی کے بہت سے موقر اخبارات و رسائل میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں اور دونوں زبانوں میں ان کی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں۔ ان کی ایک انگریزی کتاب NOMADS OF THE HIMALAYS کا اُردو ترجمہ بھی عنقریب ترقی اُردو بورڈ کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر ششی کی علمی ادبی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہے لیکن شاعری ان کی اوّلین پہچان ہے۔ ہندی کے موجودہ دور کے شاعروں میں وہ اپنا ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اگلے صفحات میں ان کی چند نظمیں اُردو رسم الخط میں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ اُردو قارئین بھی ان کے فکر و فن سے کچھ آشنا ہو سکیں:

سو سال بعد کی کویتا

ڈاکٹر شیام سنگھ ششی

سو سال بعد
میرے مرنے کے
دماغ ہو جائے گا
بہت بڑا، بہت بڑا
اور دل
بہت چھوٹا، بہت چھوٹا
اتنا چھوٹا
کہ بھاؤ
سکڑتے، سکڑتے
استتو کھو دیں گے
اپنا

کویتا نہیں ہوگی تب
ہمارے سُکشم وشئے پر
سیکس پر
بھوگ لیا ہوگا اُسے
دماغ سے ہی
آناً فاناً میں
اور تب
آدیش دے گا کمپیوٹر کو
میرا کوئی
'کویتا بناؤ'
سکائی لیب میں بیٹھ کر
منگل یا کسی انیہ گرہ میں جا کر
ایک کے بعد ایک
اُتر آئیں گی کویتائیں
پارورش کا قدر
کسی نئے اگنت تکنیکی
بیج گنت اور ریکھا گنت کی طرح

اور میں بکھر گیا

جیون کی پستک میں
لکھنے چاہے تھے
کتنے ہی
ادھیائے
بھن بھن وشیوں پر
سبھی سے لگاؤ تھا
چاہا تھا اُن کو
اپنی قلم کی
باہوں میں باندھ لوں
سب کچھ سمیٹ لوں
ایک ہی شواس میں
کنتو شواس گھُٹ گئی
اور آس ٹوٹ گئی
بہو مکھی پاش میں
اپنی شکتی پھنس گئی
اور میں بکھر گیا
اپنے ہی بھیتر میں
اکھڑ سا، شبد سا
بن سکا نہ واکیہ
کسی بھی پستک کا

رات کی قبر

میرے بھیتر
روز روز
کروڑوں اُلکائیں
ٹوٹتی ہیں
اننت انترِ یہ
آگ کی شور وچ
تھتیمکا جاتا ہے
لاوے کی لاریں
تر بتر کر جاتا ہے

ایک سیلتی آکاش گنگا
مجھ میں
پوری کی پوری سما جاتی ہے
ایک گرداب نل
میرے اردگرد چھا جاتی ہے
ایک طوفان اُٹھ کر
میرے استی میں بس جاتا ہے
ایک بھونچال بھنکر
میری نس نس میں دھنس جاتا ہے
اور پھر میں ——
لڑتا ہوں، جھگڑتا ہوں، الجھتا ہوں
مرتا ہوں ... جیتا ہوں ... مرتا ہوں
پھر اپنا کفن
اپنے آپ اوڑھ کر
سو جاتا ہوں
اگلی پو پھٹتے ہی
رات کی قبر سے
پھوٹ جاتا ہوں

ڈاکٹر شیام سنگھ ششی

مہانگر کا شرد

سڑکیں گونگی
گلیاں کانپتی ہوئی
دین بسیروں میں
ہانپتی ہوئی

بیڑی کی راکھ میں
راتیں کاٹتا ہوا
ایک دھوئیں سا انسان

اور شہر
کسی غمگین گھڑے میں
ٹھونسا ہوا
شمشان

مان کنور

کنہیا لال نندن
عقیل قیس

بہت دھندلی سی یاد آج بھی دل میں چپکی ہوئی ہے کہ میں نے اُسے ایک پتھر سے زخمی کر دیا تھا۔ اس وقت میں درجہ دوم میں پڑھتا تھا۔ گاؤں کا اسکول۔ دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہوئی تو بچوں کا جھنڈ چلا اور گھر اور اسکول کے بیچ جس طرح کی مستی چلتے چلتے، بچوں میں ہو سکتی ہے ہو رہی تھی۔ میرے کسی ساتھی نے مجھے چیلنج دیا کہ میں اس سے زیادہ اونچا ڈھیلا نہیں پھینک سکتا۔ میں نے تاؤ میں آ کر ایک اینٹ کا ٹکڑا اُٹھایا اور درخت کی اونچائی ناپنے کو زور سے پھینک دیا۔ اس کی فکر نہیں تھی کہ یہ کہاں گرے گا۔ فکر تو تب ہوئی جب پتا چلا کہ مان کنور کی ماں سرسوتی بائی میرے گھر پر شکایت لے کر مجھ سے پہلے پہنچ چکی ہے۔ پہنچتے ہی میری ماں نے میرے گالوں پر دے تڑا تڑ۔ اس بدمعاش کی بدولت مجھے ایک رنڈی کی شکایتیں سننی پڑ رہی ہیں! اور پھر تڑا تڑ۔

میرا کھانا میرے آنسوؤں میں ڈھل چکا تھا۔ بابا آئے تو اپنے پوتے کو روتے دیکھ کر ان کا وشوامتری غصہ بھڑک اُٹھا۔ کہاں گئی سسوری سرسیتا، شکایت اس کی کھوپڑی سے بہاؤں گا۔ سالی رنڈی، سمجھتی کیا ہے اپنے کو! جتنے آنسو میرے ناتی کے بہے ہیں اتنا خون نہ بہا دیا تو دیوی دیال نام نہیں۔ اور انھوں نے اُٹھائی اپنی لاٹھی اور چل پڑے مجھے بغل میں ساتھ لے کر۔ وہ طیش میں تھے۔ میرے آنسوؤں کے سامنے سرسیتا کی بڑھیا کے سر سے بہتا ہوا خون ان کے لیے پانی تھا۔۔۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ سرسیتا بائی نے میرے بابا سے شکایت لے کر پہنچنے کی معافی مانگ لی تھی اور بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ لیکن تب سے آج تک میں نے آسمان کی طرف کوئی پتھر نہیں پھینکا۔ جانے کیوں مان کنور کی یہ چوٹ کھائی تصویر آج بھی جیوں کی توں زندہ ہے۔

ایک بار ہو تو خیر، جب کوئی واقعہ بار بار کوند کر اندر ہی اندر آپ کو گنہگار بنانے پر آمادہ ہو جائے تو بھلا چُپ بھی کہاں تک رہا جا سکتا ہے؟ ابھی پچھلی دفعہ جب میں گاؤں گیا تو میں نے اپنے لنگوٹیا یار شیو کو ساتھ لیا اور مان کنور کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا ——

کون؟ اندر سے آواز آئی۔

—— میں! پردیشی۔

—— اچھا! آج پردیشی بن کر آئے ہیں؟ مان کنور نے اپنی مستی لگی بتیسی کے بیچ سے خوبصورت مسکراہٹ ماری اور کب آئے، وغیرہ کے ساتھ خیر خیریت پوچھتے ہوئے، بیٹھنے کو کہا۔

بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے لیکن ہم دونوں کے دل میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم لوگوں نے کئی بار یہ منصوبہ بنایا کہ مان کنور سے ایک دفعہ گھل کر باتیں کی جائیں اور اس کے اندرونی خیالات معلوم کیے جائیں کہ ایک طوائف کے روپ میں اس کا دل کیسا محسوس کرتا ہے، وہ اپنی زندگی میں درد کا سلسلہ پالے ہوئے ہے تو کیوں اس کے ساتھ شادی رچا کر نہ بیٹھ گئی جس نے زندگی بھر اپنی محبت نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ لیکن کبھی اس کے درد کو چھیڑنے کی ہمت نہ ہوئی ہمیشہ ایک ہچکچاہٹ۔ اس بار ارادہ مضبوطی پکڑ گیا تھا۔ میں نے کہا —— مان کنور۔۔۔ اور میرے سامنے سے مان کنور کی زندگی کی ساری [illegible] داستان گزر گئی

—— بولیے، بولیے! کیا کہہ رہے تھے آپ؟

—— تمھیں یاد ہے، بچپن میں میں نے بڑی زبردست چوٹ پہنچائی تھی۔

نہیں مجھے یاد نہیں، لیکن وہ چوٹ تو آئی گئی ہو گئی

معرفت ناوک حمزہ پوری، ایم۔ای۔اسکول، این سی۔ڈی سی۔سوندہ، ہزاری باغ بہار۔

ہے۔ جو ٹھیں تو میں نے اب جو کھائی ہیں، ان کا کوئی حساب ہے؟
حساب بھی تمھارے پاس ہوگا۔ لیکن کیا حرج ہے، اپنی زندگی کے اوراق پلٹ کر دیکھو لو۔ حساب میں کہیں بھول تو نہیں ہے —— نہیں بھول نہیں ہے۔ حساب بہت صاف ہے۔

میرے سامنے سائیکل کا ہینڈل تھامے، پان کھائے قرینے سے کڑھے بالوں والا ایک نوجوان کوندگیا جسے میں نے کئی دفعہ مان کنور سے بات کرتے، پان کھاتے آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس بات کو سالوں گزر گئے۔ میں نے پوچھا—— اب کہاں ہیں وہ آجکل؟

ہیں! ابھی بھی کبھی مل جاتے ہیں یا سامنے پڑ جاتے ہیں تو پوچھتے ہیں کوئی تکلیف ہو تو ضرور بتانا۔ میں آج بھی کچھ کہہ دوں تو اپنی کوشش بھر مدد کرنے سے نہیں کترائیں گے۔ سوچو، بھلا جب مجھ سے پوچھتے تھے کہ تو مجھ سے شادی کیوں نہیں کرلیتی تو میں کہہ دیتی تھی کہ اگر میں شادی کرلوں گی تو میری ماں کو روٹی کون دے گا؟ میری چھوٹی بہن پڑھ رہی ہے اس کی فیس کون بھرے گا؟

مان کنور کی آنکھیں چھلچھلا اٹھی تھیں۔ اپنی ماں کو نظروں سے ٹٹولنے کے لیے ادھر ادھر نظر گھمائی اور جب جان لیا کہ آس پاس نہیں ہیں۔ تو آنکھ سے ٹپکتا ایک ننھا سا قطرہ آنچل میں شتہ کھالیا۔

—— مان کنور! اور وہ سوتے سے جاگ اٹھی۔

—— کیا راگ چھیڑے ہیں آپ نے بھی! اپنے آنچل میں بندھی الائچی کی پھلیاں نکال کر میرے سامنے کردیں۔ میں نے الائچی تو لے لی لیکن چپی کا کسا ڈھیلا نہ کر پایا۔ خاموشی اسی نے توڑی —— پندرہ برس کی تھی جب پہلی بار کسی مرد کا ساتھ نبھانے کو مجبور ہوئی تھی۔

—— اس شخص کے بارے میں آج بھی کچھ کشش محسوس کرتی ہو؟

کرتی کیوں نہیں ہوں۔ آخر اس کے ساتھ آٹھ دس سال بیتے ہیں لیکن تب یہ علم نہیں تھا کہ ہمارا ساتھ دینے والا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آخر میری ماں کو ہی دیکھ لیجیے نا، اپنی ساری جوانی پیرنجش چاچا کو سونپ دی لیکن آج کوئی جھانک کر نہیں دیکھتا۔

—— تب پھر ان پر اعتبار کیسے کیے بیٹھی ہو... یہ بات میں نے شرارتاً چٹکی لینے کے لیے کہی تھی۔

مان کنور نے دہلا مارا:

یوں تو رنگ ایک ہے جس سے یہ رچی ہے دنیا
رنگ ان کا سا مگر ڈھونڈ کے پایا نہ گیا

میرے لنگوٹیا یار کھل اٹھے، شعر سن کر ان کی سرمدی چھوٹی
—— اچھا ایک بات بتائیے۔ آپ نے جب سب سے پہلے کسی اجنبی مرد کو اپنے بستر پہ پایا تو کیسا محسوس ہوا تھا؟ اور یہ پوچھتے ہوئے میرے یار کا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔
کسی طوائف کے لیے یہ سوال کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، لیکن مان کنور جھینپ گئی۔

—— عجیب سوال ہے آپ کا بھی! پھر ایک کھلکھلاہٹ اور وہی خاموشی۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ مان کنور اس انجانے تجربے کو گرفت میں لے آنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے اسے پکڑ بھی لیا لیکن نفظ دھوکا دے گیا۔

—— آپ اپنا سوال ذرا پھر دہرائیے۔ اس کے اصرار سے اس بار شیو کو زیادہ شرم آئی لیکن اس نے ایک ریسرچ اسکالر کی طرح اپنا سوال دہرایا۔ مان کنور نے خندہ پیشانی سے جواب دیا —— جو آدمی بستر تک پہنچنے کی حالت میں پہنچتا ہے، وہ اجنبی نہیں رہ جاتا۔

—— یہ زندگی تمھیں ناپسند رہی ہے، یہ ہم سبھی جانتے ہیں، تب پھر تم نے اسے اپنایا کیوں؟

—— پہلے اماں نے میرے لیے کوئی لڑکا دیکھ کر شادی کردینا چاہی تھی، لیکن پھر وہی بات کہ اگر میں شادی کرکے چلی جاتی تو گھر کی روٹیاں کیسے چلتیں؟ گھر کے حالات سے میں مجبور ہوگئی۔ ہاں ایک بات ضرور رہی ہے، جتنے سال ایک آدمی کی ہوکر رہی ہوں دوسرے کو جسم دینا قطعی پسند نہیں کیا۔

—— کبھی کوئی ایسا موقع بھی تو پڑا ہوگا جب مجبوری آگئی ہو اور...

—— موقع ضرور آئے ہیں، آئے کیوں نہیں! ناچ گا کر تی رہی ہوں، لیکن گانے کے لیے باہر جاتی رہی ہوں۔ ایک موقع تو ایسا

آیا تھا جب لگا کہ آج بھوں گی نہیں۔ لیکن انھیں سب باتوں سے تنگ آکر ناچ گانا چھوڑ دیا۔

——— ایک بات بتاؤ مان کنور، تمھارے دل میں یہ سوال نہیں اٹھا تھا کسی نئے آدمی کو آتا دیکھ کر کہ یہ آج تک یہاں کبھی نہیں آیا، آج کیوں آیا ہے؟ اور خاص طور سے جب تم خود اس بات کو مانتی ہو کہ رنڈی کے کوٹھے پر جو بھی جاتا ہے، بربادی کا صافہ سر پر باندھ کر جاتا ہے۔

——— کیوں نہیں! یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ کیوں آیا ہے جب آج تک نہیں آیا تھا لیکن اپنے گھر پہ الزام دے کر چپ رہ جاتی ہوں۔

——— تمھارے سامنے کسی کی زندگی آدرش رہی ہے کبھی؟ میں نے بات کو اصولی موڑ دینے کی کوشش کی۔

——— بات نہیں سمجھی آپ کی!

شبھو نے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے بات کا تھوڑا خلاصہ کیا لیکن شاید مان کنور کو خلاصے سے زیادہ ضرورت تھی حال میں لوٹنے کی۔ بات کو دو ٹوک کر کے بولی یہ سب خواب تھا میرے لیے، آدرش وادرش۔ میں اتنا ضرور سوچتی ہوں کہ اس گھر کی بجائے اور کہیں بھی ہوتی تو اس سے تو اچھی ہی رہتی۔

ایک ہلکی سی غم کی کسک اُس کے اِس جملے میں جو یقیناً تنہائیوں میں اسے کچوکے دیتی ہوگی۔ چلتے ہوئے میں نے ازراہِ شرافت کہہ دیا ——— اور تو کیا کہوں تم سے، لیکن میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کرنا۔ میں... مجھے پتا نہیں تھا کہ اس جملے سے سمندر اچانک مچل جائے گا۔ میری زبان اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھ کر وہیں رُک گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جیسے ہمدردی بھی اتنی بھاری پڑنے لگی ہو، درد کی اس تنہا تصویر کے سامنے کہوں تو کیا کہوں! اور میں خاموش واپس چلا آیا۔ میں ایک گناہ سے چھٹکارا پانے گیا تھا، اس سے بڑا گناہ کر آیا۔ تب سے آج تک سوچ نہیں پایا کہ مان کنور سے جب اگلی دفعہ ملنا ہوگا تو کیا کہوں گا۔ (ہندی کہانی) ●●

قوم پھر ہمّت سے آگے بڑھنے لگی ھے
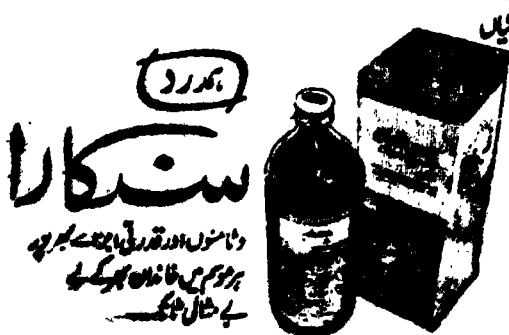
1975-76 ء

دستکاروں اور مزدوروں کو امداد

- ہتھ کرگھوں پر تیار کپڑے کے جمع شدہ ذخیرے کو لوگوں تک پہنچانے کے لیئے 2 47 لاکھ روپے کی رقم فراہم کی گئی۔
- ہتھ کرگھے کی صنعت کی ترقی اور اسے نئی زندگی دینے کے لیئے 13 ترقیاتی منصوبے اور برآمد کو فروغ دینے کے لیئے 20 مراکز زیر تشکیل ہیں۔
- "جنتا" کپڑے کی کوالٹی اور دستیابی میں سدھار ہوا ہے۔ جولائی 1975ء سے اب تک کپڑے کی پرچون سپلائی کے مراکز کی تعداد بڑھ کر 46,694 ہو گئی ہے، ان میں سے 80 فیصد مراکز دیہی علاقوں میں ہیں۔
- ملک بھر میں سڑکوں کے راستے مزدوری اشیاء کی نقل و حمل کو آسان بنانے کے لیئے 1,181 سے زیادہ قومی پرمٹ جاری کئے گئے۔
- صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت کو قابل عمل بنانے کے لیئے 617 سے زیادہ اداروں، جن میں مرکزی پبلک سیکٹر کے 147 ادارے بھی شامل ہیں، میں "شاپ کونسلوں" اور مشترکہ کونسلوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

نظمیں

ماہر منصور

تبدیلی

تغیر کی کرم فرمائیاں
اکثر حسین معلوم ہوتی ہیں
مگر اک بات ہے
ہر بار یہ محسوس ہوتا ہے
کہ ہم خود سے بچھڑتے ہیں

●●

ڈی۔ اے۔ غضنفر

بوجھ

جسم دبتا جا رہا ہے دم بہ دم
لمحہ لمحہ پھولتی جاتی ہے سانس
تلملا اٹھتا ہوں میں اونچی زمیں آتی ہے جب
چاہتا ہوں راستے میں پھینک دوں
پھینک بھی سکتا ہوں لیکن
کوششوں کے بعد بھی
سر سے گرا پاتا نہیں
جانے کیسا بوجھ ہے؟
جسم دبتا جا رہا ہے دم بہ دم
لمحہ لمحہ پھولتی جاتی ہے سانس

●●

جبار جمیل

مرگِ انبوہ

ذہن مردہ
روح مردہ
سوچ کی ہر لہر مردہ
بس فقط پوشاک ہی میں زندگی کا مس ہے
اور باقی کچھ نہیں
چلتے پھرتے مرثیے ہیں
مرثیوں کے شہر میں ہم آ گئے ہیں

●●

بمقابل مسجد — ذوبانگر — ٹمکور ● شعبۂ اردو — مسلم یونیورسٹی — علی گڑھ

سحر سعیدی

بُجھتا ہوا دیا ہوں ہوائیں نہ دو مجھے
اتنی تو دردناک سزائیں نہ دو مجھے

محرومیوں کا زہر بہت پی چکا ہوں میں
اب اور زندگی کی دعائیں نہ دو مجھے

ورنہ پلٹ کے وار کرے گی یہ خامشی
اس شہرِ بے نوا میں صدائیں نہ دو مجھے

لیکن قصور بھی تو بتائے کوئی مرا
یہ میں نے کب کہا کہ سزائیں نہ دو مجھے

اب پرچمِ غبار ہی میرا لباس ہے
رنگین موسموں کی قبائیں نہ دو مجھے

اپنے ہی غم بہت ہیں اُٹھانے کے واسطے
اب دوسروں کے سر کی بلائیں نہ دو مجھے

پوری طرح سے جسم چھپا بھی نہ پاؤں میں
ورثہ میں ایسی تنگ ردائیں نہ دو مجھے

ذوقِ سفر نیا ہے نئے مرحلے سحرؔ
ویران بستیوں کی فضائیں نہ دو مجھے

معصوم شرقی

کتنا وحشت ناک اپنا گھر لگے
اپنے ہی سائے سے مجھ کو ڈر لگے

ہم کسی گمراہ کو رہبر لگے
اور کسی کی راہ کا پتھر لگے

میں نے ہر پہلو سے پرکھا ہے اسے
زندگی بیمار کا بستر لگے

کھروی پہ کیجیے اپنی نظر
چلتے چلتے جب کبھی ٹھوکر لگے

پھر گیا آنکھوں میں صحرا کا سماں
اس قدر ویران بام و در لگے

کہہ دیا معصومؔ نے کیا آپ کو
بدلے بدلے آپ کے تیور لگے

حبیب احمر

آرزوؤں کے دریچے اس طرح اب وا کریں
اپنا عکسِ گم شدہ ہر سمت سے دیکھا کریں

تتلیاں رنگین لمحوں کی، کبھی کی اُڑ چکیں
ان کا یادوں کے سہارے کب تلک پیچھا کریں

وقت کے صحرا میں جلتی دوپہر کا یہ سفر
راہ میں مل جائے کوئی پیڑ تو سایا کریں

روشنی ہر دم جو دکھلاتا رہا اس شخص کو
اپنے اندر کس طرح اک بار پھر زندہ کریں

بھولنا چاہیں اسے تو بھول سکتے ہیں مگر
اپنی تنہائی سے ڈر لگتا ہے آخر کیا کریں

غزلیں

اعجاز تابش

ضبطِ نالہ سے جگر چاک ہے اپنا ایسا
باغِ ہستی میں نہ ہوگا کوئی غنچہ ایسا

جس کے دامن میں کوئی قطرۂ نیساں ہی نہ تھا
کاش بادل نہ مرے سر پہ گرجتا ایسا

جس کے پردے میں نہاں درد کی سوغات نہ ہو
اپنی قسمت میں نہیں کوئی سویرا ایسا

شوقِ دیدار بہت تابِ نظارہ معدوم
ہم نے دیکھا ہے سرِ طور تماشا ایسا

میری پلکوں پہ سلگتے ہیں یادوں کے چراغ
لوگ دیتے بھی ہیں اگر تو دلاسا ایسا

وقت کی دھار جسے کاٹ کے رکھ دے تابش
مجھ سے للہ نہ باندھو کوئی رشتہ ایسا

حسن رضا

منتظر ہوں خمارِ شب اُترے
میرے آنگن میں دھوپ اب اُترے

ہے سمندر سی تو مت پرواشت
مجھ پہ طوفان روز و شب اُترے

تیرگی، دھوپ، آندھیاں، گرداب
رفتہ رفتہ بدن میں سب اُترے

کتنا گہرا ہے آج سناٹا
دشتِ احساس میں یہ کب اُترے

ڈس لیا تیرگی نے مجھ کو رضا
زہر ناگن کا جانے کب اُترے

ساغر پالمپوری

بیٹھ کے تنہا ساحل پر
طوفانوں کی بات نہ کر

بند تھا اُس کا دروازہ
ہم لوٹ آئے اپنے گھر

جب تک اُن کا ساتھ رہا
رنگین تھی نظر نظر

وہ اک پل ہی مسکائے
پھول کھِل اُٹھے ڈگر ڈگر

پردیسوں میں بھٹکے کون
ساغر چھوڑ کے اپنا گھر

ناگور، راجستھان ● قاضی پورہ، کھنڈوہ، ایم پی ● اشوک لاج، مرانڈا، ہماچل پردیش

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

1975-76ء

پیداوار اور کارکردگی میں اضافہ

- معیشت میں ترقی کی شرح 5.5 فیصد رہی جبکہ 75-1974ء میں یہ صرف 0.2 فیصد تھی۔
- صنعتی پیداوار میں 5-6 فیصد اضافہ ہوا جبکہ 75-1974ء میں یہ صرف 2.5 فیصد تھا۔
- اناج کی پیداوار 11.40 کروڑ ٹن تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔
- پبلک سیکٹر اداروں کی مجموعی پیداوار میں تقریباً 36 فیصد اضافہ ہوا۔
- ریلوں اور ڈاک و تار کے محکموں میں وقت کی پابندی، مستعدی اور لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور ان کی بہتر خدمت انجام دینے کے کام میں نمایاں اصلاح۔

davp 76/93

تبصرے

من کے منکے —— از: کرشن موہن

قیمت: تین روپے - صفحات ۱۳۶-

ناشر: اسٹار پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

۳۶۵ رنگ برنگے موتیوں کا یہ دلکش ہار جس کہنہ مشق مالی نے گوندھا ہے اُسے ہم سب نام و شہرت سے تو جانتے ہی ہیں۔ ہم میں سے البتہ کچھ ہی جانتے ہیں کہ موتیوں کے اس پارکھی کی ریاضت تیس سال سے زیادہ ہے اور منکے منکے اُس کی پندرھویں مالا ہے یہ حقیقت ہے کہ جس لگن اور رفتار سے کرشن موہن نے لکھا ہے اور بدستور لکھ رہا ہے وہ اُس کے کسی دوسرے ہم عصر کے حصہ میں نہیں آئی۔ کرشن موہن نے اس کتاب کا مواد اپنی کتنی ہی پرانی اور نئی تصنیفات سے خود ہی اخذ کیا ہے۔ یہ شعری انتخاب اُس کے شاعرانہ اظہار کا ایک من موہک البم ہے اور سائز کے لحاظ سے بھی ہمیشہ جیب میں رکھنے کی چیز۔ یہ اشعار کرشن موہن کے بہترین اشعار ہیں ایسا کہنا مشکل ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ان اشعار کو اس نقطۂ نظر سے چُنا ہی نہیں گیا۔ یہ اشعار شاعر کے ایک خاص موڈ نے چھانٹے ہیں۔ یہ کام خود نہ کرکے کرشن موہن یا اُس کے ناشر نے کسی غیر جانب دار ایڈیٹر سے کروایا ہوتا تو چناؤ جو اب بھی خاصے کی چیز ہے، یقیناً اور بھی معتبر بن سکتا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اس قسم کا کام کسی شاعر کو خود نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی باپ سے پوچھا جائے کہ اس کی اولاد میں سے کون سا بیٹا یا بیٹی اُسے نسبتاً زیادہ عزیز ہے۔ ہر ورق پر تین اشعار درج ہیں اُن میں سے ایک یا دو بھلے ہی آپ کو پسند نہ آئیں (وجہ یقیناً کرشن موہن ہی کا تصور ہوگا) مگر یہ قطعی ناممکن ہے کہ تینوں کے تینوں آپ کو ناپسند ہوں۔ ہر ورق پر کم از کم ایک شعر ایسا ضرور ملے گا جو آپ کو بھا جائے گا اور اگر آپ صاحبِ ذوق قاری ہیں تو شاید آپ کے دل و ذہن کے کچھ تار بھی جھنجھنا اُٹھیں۔

شاعر کے اس تخلیقی سفر کی ابتدا کب کیونکر اور کن حالات میں ہوئی یہ مورخینِ ادب کے کھوجنے کی بات ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل کا کوئی محقق نقاد یا ان کا کوئی چاہنے والا یا وہ خود ہی اس سلسلہ میں ہماری معلومات میں اضافہ فرمائیں گے۔ فی الحال تو اس سفر کے وہ سنگِ میل گنوا دینا ہی کافی ہوگا جن کا کوئی نہ کوئی نشان کرشن موہن کے کسی نہ کسی موتی میں جھلکتا ہے۔

شاعر کی منزل ابھی دور ہے کبھی قریب آئے گی بھی تو ایک وقفہ کے لیے اور پھر دور ہو جائے گی کیونکہ منزلوں اور کامیابیوں کا کوئی واحد ناپ تول یا معیار نہیں ہوتا ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ کرشن موہن کی شخصیت میں انجماد نہیں ان کی شخصیت متحرک ہمیشہ چلتے رہنے اور آگے بڑھنے والی اور بتدریج ڈیولپ ہونے والی شخصیت ہے۔ آیئے آپ بھی ایک نظر دیکھ لیجیے یہ GALAXY

شبنم شبنم، دلِ نادان، تماشائی، روپ رس، دھوپ میری کلپنا کی، نگار و ناز، پیاس میری کلپنا کی، آہنگِ غزل، کونپل کونپل، شیرازۂ مژگاں، بیراگی بھنورا، اور گیان مالک کی نظمیں، منکے منکے سالِ رواں کے شروع میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس بیچ سنتے ہیں کہ اُن کا ایک اور مجموعہ 'ہرجائی تیری خوشبو' بھی چھپ کر تیار ہوگیا ہے۔

کرشن موہن کے ان اشعار میں زندگی ہے۔ ہنستی گاتی ناچتی زندگی اور مغموم تھکی ہاری روتی دھوتی زندگی۔ یہ اشعار آدمی کی فتوحات کے تذکرے ہیں اور اس کی شکستوں کے افسانے بھی۔ ان میں دل کی دھڑکنیں بھی ہیں اور سوچ اور شعور کے عناصر بھی۔ ان میں نزاکت ہے، نرمی ہے، توانائی ہے اور جوانی کی تیز و تند جھنکار ہے۔ الفاظ و بیان کے اس جادوگر کے یہاں تراکیبِ شعری کا ایک بے پناہ ذخیرہ ملتا ہے وہ زبان و بیان کی حد بندی کا قائل نہیں۔ اُس نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ اچھا شعر زبان کی پاکیزگی ہی نہیں بیان کی شوخی بھی مانگتا ہے۔ جس

آزادی اور لاابالی انداز میں کرشن موہن اپنی اُردو شاعری میں ہندی پنجابی بلکہ انگریزی تک کے الفاظ سمو دیتا ہے وہ دیدنی ہے وہ ہندی اُردو پنجابی اور انگریزی پہ یکساں دسترس رکھتا ہے۔ پرانی برج بھاشا پراکرت اور سنسکرت سے بھی اُسے رغبت ہے الفاظ ہندی کے ہوں یا خالص اُردو کے۔ اصل چیز اسلوب ہے، طریقِ استعمال ہے۔ خلوص اور خوبی سے نبھائے جائیں تو اپنی ظاہری نامناسبت کے باوجود الفاظ ایک منفرد حُسن کے حامل بن جاتے ہیں۔ بعض لوگ اس کی خوش گوئی اور بذلہ سنجی اور جدت پسندی کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مشقِ سخن اور ریاض سے کتراتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے سوچے سمجھے اور پرکھے بغیر لاپروائی سے کہہ دیتے ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ کرشن موہن ذرا سنبھل کر چلیں۔ کرشن موہن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر جان بوجھ کر فنِ شعر کا روایتی دائرہ اُلانگھ جاتے ہیں۔ خود ہم نے بھی کبھی کبھی ایسا محسوس کیا ہے مگر جب کبھی بھی لکشمن ریکھا سے ماورا ان اشعار کو دوبارہ پڑھا ہے تو اچھا ہی محسوس کیا ہے، بُرا نہیں۔

کرشن موہن فراخدل بھی ہے اور جودتِ طبع کا بھی حامل ہے۔ وہ اپنے مضامین کی قطعی نئی انوکھی اور جداگانہ بندش پہ نازاں ہے عروض پر اپنی مکمل دسترس اور الفاظ و بیان پر اپنی بے پناہ گرفت کا بھی اُسے علم ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کے کلام کو غلط تعریف و توصیف سے آراستہ ہونے کی ضرورت نہیں، "شعر میں اگر کچھ ہے تو شاعری بغاوت، بغاوت نہ رہ کر شہادت بن جاتی ہے۔ اگر ہم ہمیشہ انھیں مخصوص دائروں میں اُلجھے رہیں گے تو آگے کب اور کیسے بڑھیں گے؟"

نفسِ شعر حقیقی معنوں میں نہ گرامر کا محتاج ہے نہ زبان و الفاظ کا ہی۔ طرزِ بیان تخئیل اور آہنگ ہی سچی شاعری کے بنیادی عناصر اور ماخذ ہیں۔ اصل چیز شعر کے معنی ہیں۔ نغمہ ہے سُر تال ہے۔ کرشن موہن کی شاعری میں جو چیز اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ اس کی قلندرانہ فطرت اس کا تخیل اس کے محسوسات اس کے موضوع اور اس کے آئیڈیل ہیں۔ اس کی شاعری تجرباتی شاعری ہے۔ مشاہدوں کی شاعری ہے کوئی ذاتی خواہش مخفی نہیں۔ وہ انسانی معاشرے کے بہتر اور بدتر دونوں پہلوؤں سے واقف ہے۔ اس کا ریلزم امراض کا خود نہیں نہ اس کا آئیڈیلزم خشک حد ہے۔ اس کے کلام میں جھوٹ اور تصنع کو

کوئی دخل نہیں۔ اس نے ناممکن کو کبھی نہیں اپنایا۔ ہمیشہ حقیقت، سادگی، سچائی، راست بازی اور معقولیت کی پرستاری کی ہے۔ پیچیدہ مکلّف اور مصنوعی اندازِ بیان کی بجائے ہمیشہ سادہ سیدھا، اور ڈائرکٹ اندازِ بیان اپنایا ہے۔ وہ فطرت کا مصوّر ہے۔ فطرت جو سادہ سلیس صاف ستھری اور سیدھی ہے" جس میں کہیں خم ہیں تو وہ حُسنِ محض کے خم ہیں۔"

وہ بے حد پڑھا لکھا ہے۔ اکثر اُردو شعرا کی نسبت اُردو کے علاوہ انگریزی اور دوسری زندہ زبانیں بھی خوب جانتا ہے۔ اس کا ذہن معلومات کا ذخیرہ تو ہے ہی اس کے بیان میں دوسری زندہ زبانوں کے رنگوں کا لگا ہے گا ہے آ دھمکنا بھی غیر فطری نہیں۔ حیرت ہے کہ ایسے پختہ و عالمانہ شعور کا بندہ اتنا سیدھا سادھا کیسے ہے اس کی فطرت میں الجھاؤ بہت کم ہیں۔ ملاحظہ ہو:

آہ ترکِ تعلقات کے بعد
بات کرنی نہیں تھی، لیکن کی

کیا سمجھوتہ ہے:

تو مجھے غم میں سرنگوں نہ سمجھ
یہ تو میری نماز ہوتی ہے

○

مان بڑا ہے جوگ پہ تم کو، دنیا کو مایا سمجھے ہو
یہ بھی جانو، یہ بھی سوچو، وہ چپکے سے آجائیں تو

بانی نے مندرجۂ ذیل اشعار میں اساطیری احساس کا حُسن اور کاتھک کیفیت کا حُزن دیکھا ہے:

دل ایک صدیوں پُرانا اُداس مندر ہے
اُمید ترسا ہوا پیار دیوداسی کا

○

نرم سپنوں کی راگنی جیسے
بجتی ہوں چوڑیاں سہاگن کی

○

دل یاس اور آس کا سنگم ہے
صحرا بھی اور سمندر بھی

○

دل کا مناک جھیل ہے، جس کے کنارے پر
بیٹھی ہے اک حسینہ بھگوئے ہوئے بدن

○

مچل کے سیج پہ آ، اے مری رفیقِ حیات
ہوس کا تیج دکھا مثلِ داشتہ مجھ کو

○

تیرگی چھٹ گئی، ہر طرف روشنی بٹ گئی
رات اُس نے جو کپڑے اُتارے تو پو پھٹ گئی

○

نکھارتی تھی وہ ننگے بدن سے اپناپن
لباس میں تو مجھے اجنبی سی لگتی تھی

بانی لکھتے ہیں "کرشن موہن کی شاعری پورے وجود کی شاعری ہے ان کے ہاں کوئی موضوع شجرِ ممنوعہ نہیں۔ حسن وابستگی محض احساسی سطح پر نہیں بلکہ اس میں گوشت پوست اور اس کے لباس سے سیراب ہونے کی بھی آرزو شامل ہے۔" ننگی عورت، نئی نہائی، دُھلی دُھلائی نکھری سنوری عورت یا داشتہ وغیرہ کا ذکر کرشن موہن کے اس شعری انتخاب میں جا بجا ملتا ہے۔ یہ بے گناہی کی ندامت کا اظہار تو نہیں؟

میں کرشن موہن کو جانتا ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ اپنی اہلیہ محترمہ کے سوا آج تک اس نے کسی غیر عورت سے بستر پر ختم ہونے والا تعلق نہیں کیا۔ خدا گواہ ہے کہ میں یہ دعویٰ مسز کرشن موہن کی خوشنودی کی غرض سے نہیں کر رہا ہوں۔

اشعار کی ترتیب میں سلیقہ تو ہے مگر ایک انتخاب کے طور پر یہ کتاب کرشن موہن کی رنگارنگ شخصیت کا تمام تر عکس پیش نہیں کرتا۔

اس کتاب کے کچھ اشعار کا ہر خاص و عام کے زبان زد ہو جانا لازم ہے مگر اس طرح کی شہرت شاعر کی عاقبت نہیں سنوارتی۔

کتابت، طباعت اور سرورق استار سیریز کی دوسری کتابوں ہی کی طرح دیدہ زیب ہے۔

——— بلراج ورما

ذکرِ سیدین

شمسی طہرانی صاحب نے خواجہ غلام السیدین کی شخصیت و افکار پر $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کے ایک سو ساٹھ صفحے پر مبنی یہ کتاب شائع کی ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ اگرچہ معمولی ہے لیکن اپنے موضوع، مواد اور طہرانی صاحب کے جذبۂ عقیدت کے پیشِ نظر کتاب بلاشبہ قابلِ لحاظ ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ سیدین صاحب کی زندگی کے نہ صرف تمام پہلو آجائیں بلکہ ان کے افکار و خیالات کی نمائندگی بھی ہو جائے، اس لیے سیدین صاحب کی تقریروں اور تحریروں سے بڑے بھرپور اقتباسات دیے گئے ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ سفیرِ ہند برائے شام، پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے لکھا ہے اور مختصر الفاظ میں سیدین صاحب کی شخصیت اور صلاحیتوں کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کر دیا ہے۔ پروفیسر محمد حلیم خاں، صدر شعبۂ تعلیمات علی گڑھ یونیورسٹی نے اپنے مقدمہ میں نہ صرف سیدین صاحب کی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ بلکہ علی گڑھ کے ساتھ ان کے تعلق کو بھی واضح کیا ہے۔ حلیم صاحب کے مقدمے ہی میں ہمیں شمسی طہرانی صاحب کا بھی تعارف ملتا ہے کہ وہ علی گڑھ کے ان نوجوان اہلِ علم میں سے ہیں جنھوں نے علی گڑھ کی لاج رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔

شمسی صاحب نے اپنی اس کتاب میں سیدین صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور اس طرح ان کے علم و فکر پر کام کرنے والوں کے لیے ایک اچھی اساس مہیا کر دی ہے۔ ہم اُردو والوں کو ایسے کاموں کی ہمیشہ پذیرائی کرنی چاہیے جو شخصیتوں کا اظہار بھی کرتی ہیں اور دور کی نمائندگی بھی!

یہ کتاب اتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے مصنف نے خود شائع کی ہے اور منٹو سرکل کوارٹرس، سیکولر فورم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مل سکتی ہے۔ کتاب کی قیمت دس روپے ہے جو کتاب کی ظاہری پیشکش اور محدود صفحات کے پیشِ نظر قدرے زیادہ ہے۔

——— انور کمال حسینی

مطالعۂ خطوطِ غالب

مطالعۂ خطوطِ غالب ۱۸×۲۲/۸ کے ۴۲ صفحات پر مبنی ایک مختصر سا کتابچہ ہے جسے صفیہ کالج، بھوپال کے شعبۂ اُردو نے شائع کیا ہے۔ خطوطِ غالب پر اس سے پہلے بھی کافی کام ہو چکا ہے لیکن اس مختصر کتاب کی جسے عبدالقوی دسنوی صاحب نے مرتب کیا ہے، اپنی ایک حیثیت ہے۔ مطالعۂ خطوطِ غالب سے پہلے دسنوی صاحب کی مختلف موضوعات پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں غالب کے سلسلے کی بھی چار کتابیں ہیں: غالبیات، بھوپال اور غالب، نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی اور تقادرنامہ غالب۔ دسنوی صاحب اُردو طلبا کی ضرورتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ 'مطالعۂ خطوطِ غالب' طلبا کے لیے خصوصی طور پر ایک مفید کتاب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی خطوطِ غالب سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے قارئین کے لیے بھی اس کی افادیت کم نہیں۔ دسنوی صاحب نے خطوطِ غالب کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ خطوط کے بڑے دلچسپ اقتباسات بھی دیے ہیں۔ اور یہ اقتباسات یقیناً ایسے ہیں جنھیں غالب کے چیدہ اشعار کی طرح بار بار دوہرا کر لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ خطوطِ غالب کے بارے میں عبدالقوی صاحب کی یہ رائے بڑی حقیقت افروز ہے کہ

"غالب کے خطوط کے بارے میں یہ کہنا بھی درست ہے کہ ان میں بعض باتیں بالکل اسی طرح نہیں ہیں جس طرح انھیں ہونا چاہیے۔ ان میں کچھ غالب کے احساسات، جذبات، تجربات اور مزاج کو بھی دخل ہے۔ اس لیے ان کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں کچھ دوسری تحریروں کی بھی مدد لینی ہوگی۔ غالب کی ہر بات کو صحیفۂ آسمانی متصور کرنا نہیں چاہیے۔ صحیفۂ آسمانی نہ سمجھنا ہی ان خطوط کی عظمت کے لیے کافی ہے اس لیے کہ غالب ہم جیسے انسان تھے جو خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی رکھتے تھے۔"

اس مختصر کتاب کی دوسری خصوصیت اس کتاب میں شامل غالبیات سے متعلق ایک منتخب ببلیوگرافی ہے، اس ببلیوگرافی میں تنقید، تحقیق اور غالبیات کے عنوانات کے تحت کتب کی وہ منتخب فہرست دی گئی ہے جو غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بہتر مطالعے کے مواقع

مہیا کر سکتی ہے۔ کتاب کی قیمت ظاہر نہیں کی گئی ہے اس لیے شاید حیثیت ہدیہ پر مل سکے گی۔

——— انور کمال حسینی

کیوڑے کا بن

شاعری ہمیشہ ہی روحانی مسرت کا ذریعہ رہی ہے آج کی مشینی اور ہنگامی زندگی میں بھی اچھی شاعری تازہ ہوا کا ایسا دل پذیر جھونکا ہے جس سے روح میں شگفتگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

سلیمان خطیب دکنی زبان کے ایک جانے پہچانے شاعر ہیں۔ کلام میں وارفتگی، والہانہ کیف اور ترنم ہی نہیں بلکہ ایسی کسک بھی ہے جو دل پر براہ راست اثر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن کو بھی دعوتِ فکر دیتی ہے۔ شاعر اور دوسرے فنکار واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق تاثر حاصل کرتے ہیں اور ان کا فن ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں ایک پوری نسل کا سراپا نظر آتا ہے۔ سلیمان خطیب کی شاعری محض عشق و حسن کی داستان نہیں بلکہ دل کی کسک اور ذہن کی طلب کی عکاس بھی ہے

سلیمان خطیب کی شاعری کے پیش نظر مجموعے میں نظیر اکبرآبادی کی طرح گوناگوں موضوع نظر آتے ہیں۔ کیوڑے کا بن، نظموں کا مجموعہ ہے اور اس میں "گھر گھر کی بات" بھی ہے اور "محبت کی چھاؤں" بھی "دھنک" کے رنگ بھی ہیں اور "ہمالہ کی چاندنی" بھی، "نئے رستے" بھی ہیں اور "ڈھولک کے گیت" کی گونج بھی۔

"کیوڑے کا بن" کے سرسری مطالعے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ خطیب کی شاعری روائتی شاعری نہیں بلکہ ہمارے عہد کی ترجمانی شاعری ہے اور اُردو شعری ادب کے ذخیرے میں ایک اچھا اور نیا اضافہ ہے۔

کتاب ۱۷×۲۷/۸ کے دو سو تیس صفحات پر مشتمل ہے اور سفید کاغذ پر صاف ستھری کتابت طباعت اچھا تاثر دیتی ہے۔ سرورق بھی جاذب نظر ہے۔ "جشن سلیمان خطیب کمیٹی" گلبرگہ نے اسے زندہ دلان حیدرآباد کے لیے شائع کیا ہے اور یہ ادبی ٹرسٹ بکڈپو کنار اجنک، عابد روڈ، حیدرآباد سے بارہ روپے میں مل سکتی ہے۔

——— انور کمال حسینی

مانگے کا اُجالا

رِلکے کا ایک خط

دو ولس ویڈے متصل بریمن

۱۲ر جولائی ۱۹۰۳ء

کوئی دس دن ہوئے میں خستہ اور بیمار، پیرس چھوڑ کر شمال کے اس وسیع میدانی علاقے میں چلا آیا جس کی کشادگی اور سکونت اور نیلا آسمان مجھے دوبارہ صحت بخش سکتے ہیں۔ لیکن یہاں میرا خیر مقدم ایسی مسلسل بارش نے کیا جو آج جاکر تھمتی نظر آتی ہے اگرچہ اس وقت بھی تند ہوا کے تھپیڑے اس خطۂ ارض کو بے چین کیے جاتے ہیں۔ بہر کیف تابناکی کے اس اوّلین لمحے میں آپ کو سلام عرض کرتا ہوں۔

از حد عزیز مسٹر کاپس! میں نے آپ کا ایک خط بغیر جواب دے ڈال رکھا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ میرے ذہن سے اتر گیا، حقیقت تو اس کے برعکس ہے۔ وہ تو ایک ایسا خط ہے جسے پانے والا پڑھتا ہے۔ اس تحریر میں تو میں نے آپ کو اس طرح پہچان لیا ہے جیسے اب تک آپ میرے بالکل قریب ہی رہتے تھے۔ وہ خط ۲ر مئی کا ہے اور یقیناً آپ کو بھی اس کی یاد ہوگی۔ ان فاصلوں کی گہری یک سوئی میں جب جب میں اس خط کو پڑھتا ہوں جیسے کہ اس وقت ——— تو ایک بات مجھے بہت متاثر کرتی ہے، وہ ہے زندگی کے متعلق آپ کی فکر مندی اس تاثر کا احساس مجھے یہاں اکثر زیادہ ہوا بمقابلہ پیرس کے، جہاں شور و غل کی شدت کے تحت ہر شے گونج کر بے آواز ہو جاتی ہے۔ یہاں ایک عظیم وسعت میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے جس پر سے گزر کر سمندری ہوائیں ہر وقت آتی رہتی ہیں۔ یہاں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان ان سوالات اور احساسات کے متعلق آپ کو تشفی نہیں دے سکتا جو اپنی تہہ میں خود ایک اپنی زندگی رکھتے ہیں۔ بہترین انسان بھی ان الفاظ کے انتخاب میں غلطی کر سکتا ہے جن سے مرا ، نازک، ناقابلِ ترسیل بات کا اظہار ہے۔ تاہم میرا

ایقان ہے کہ آپ خود کو ایسی چیزوں سے وابستہ رکھیں جیسی کہ یہاں میرے گرد پھیلی ہوئی میری نظروں کو طمانیت بخش رہی ہیں تو آپ کو ان مسائل کا حل مل کر رہے گا۔ اگر آپ خود کو وابستہ کر دیں فطرت سے، فطرت کی سادگی سے، ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے جن کی طرف شاذ ہی کوئی نظر اٹھاتا ہے لیکن جو اچانک خلاف توقع عظیم اور بے پایاں بن سکتی ہیں۔ اگر آپ کے دل میں ان حقیر اشیا کے لیے خلوص کا جذبہ ہے اور آپ فطری بے لوثی سے ان بظاہر ادنیٰ وجود کا اعتماد حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں تو پھر ہر بات اور ہر شے آسان تر، مربوط تر اور مصالحت لانے والی بن جائے گی۔ اس کا احساس آپ کے شعور اور آگہی کی سطح سے اندرونی سطح پر ابھرے گا، کہ آپ کی عقل کے پھیرے پر کیوں کہ عقل بے چاری اس سفر میں متحیر ہو کر پیچھے رہ جاتی ہے۔ آپ ابھی کم عمر ہیں اس لیے تمام دیگر باتوں سے قبل میں آپ سے ایک درخواست کروں گا اور اصرار کے ساتھ کہوں گا کہ آپ ان تمام مسائل کے سلسلے میں صابر رہیں جو آپ کے دل میں ہیں۔ اور جن کا حل آپ کو ابھی نہیں ملا ہے۔ آپ صبر سے ان سوالات ہی کو سینے سے لگائے رہیں، جیسے وہ سوالات نہ ہوں بند خوانے ہوں یا ایسی کتابیں جو کسی بہت ہی غیر معروف زبان میں ہوں۔ کیوں کہ یہ وقت سوالوں کے جواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔ جواب آپ کو ابھی نہیں دیے جا سکتے۔ کیوں کہ ابھی آپ میں ان کو بسر کرنے کی قوت نہیں۔ اصل کام تو یہ ہے، جو کچھ ملے اسے بسر کرنا۔ چنانچہ فی الوقت ان سوالات ہی کو بسر کیجیے۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح [illegible] بسر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک غیر محسوس انداز سے، آپ ایک دن ان کے جوابوں کی حد میں داخل ہو جائیں۔ ایک [illegible] [illegible] آپ کو [illegible] تشکیل کا امکان بہت ممکن ہے آپ کے [illegible] اس کام کے [illegible] کو تربیت دیجیے۔ جو کچھ [illegible] آئے اس [illegible] ممکن ہو کے

اسے قبول کیجیے بشرطیکہ وہ آپ کی منشا (WILL) کا ایک جزو ہو اور آپ کے وجود کی دروں ترین کیفیت کا تقاضا ہو اس کو سہارا دے اور کسی بھی چیز سے نفرت مت کیجیے۔ جنس ایک مشکل ذمے داری ہے۔ بجا ارشاد لیکن ہم پر جتنی ذمے داریاں ہیں سب سخت مشکل ہیں۔ تقریباً ہر سنجیدہ بات مشکل ہوتی ہے' اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہر بات سنجیدہ ہوتی ہے۔ پس اگر آپ یہ نکتہ سمجھ لیں اور کسی طرح کوشش کر کے اپنی ذات میں سے' خود اپنی فطرت اور عادات میں سے' خود اپنے تجربے' اپنے بچپن' اپنے قویٰ میں سے پیدا کر کے ایک ایسا رشتہ جنس سے قائم کر لیں جو تمام تر آپ کا اپنا ہو (جس پر رسوم اور رواج کا اثر نہ ہو) تو پھر یہ خوف کہ کہیں آپ کھو نہ جائیں، کہیں آپ اپنی بہترین صلاحیتوں کے سزاوار باقی نہ رہیں، آپ کے دل سے بالکل نکل جائے گا۔

جسمانی تلذذ ایک حسیاتی تجربہ ہے' ٹھیک اسی طرح جیسے کسی شے کا نظارہ یا زبان پر کسی نفیس پھل کا بھرپور ذائقہ یہ ایک عظیم اور لامتناہی تجربہ ہے جو ہمیں بخشا گیا ہے تاکہ ہمیں دنیا کا علم ہو سکے ایسا علم جو مکمل اور مہتم بالشان ہو۔ اس بخشش کو قبول کرنا حاشا برا نہیں۔ بری بات تو یہ ہے کہ بیشتر لوگ اس کا غلط اور لا حاصل استعمال کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کے ارفع لمحات کو اس پر مرتکز کرنے کی بجائے انھوں نے اس تجربہ کو زندگی کے مضمحل لمحات کے لیے ایک محرک یا ناٹک بنا لیا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ انسان نے تو کھانے کے عمل کو بھی کچھ اور بنا دیا ہے۔ ایک طرف شدید افلاس تو دوسری طرف لامحدود اسراف، دونوں کے درمیان ہماری اس فطری ضرورت کی بنیادی خصوصیات دھندلا کر رہ گئی ہیں۔ اسی طرح ہماری تمام وسیع اور بنیادی ضروریات، جن کی تکمیل میں زندگی خود کو تازہ دم کرتی ہے، اب گندا اور غبار آلود ہو گئی ہیں۔ لیکن انسان انفرادی طور پر اب بھی انھیں خود پر واضح کر کے بسر کر سکتا ہے اور اگر ہر انسان نہیں تو کم از کم ایک تنہا انسان (THE SOLITARY MAN) ایسا کر سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنے معمولات میں دوسروں پر کمتر منحصر ہوتا ہے۔ وہ خود کو یاد دلا سکتا ہے کہ حیوانات اور نباتات میں جو حسن ہے وہ محض ایک خاموش اور پائدار روپ ہے محبت اور آرزومندی کا۔ وہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ حیوانات اور نباتات بڑی صبوری اور رضا کے ساتھ وصال، تعداد اور نمو کی منزلوں

سے گزرتے رہتے ہیں، اس لیے نہیں کہ انھیں جسمانی تلذذ کی تلاش ہے اور نہ اس لیے کہ وہ جسمانی رنجوری کے متلاشی ہیں بلکہ محض اس واسطے کہ وہ خود کو تابع مانتے ہیں، ان ضروریات کا جو تلذذ اور رنجوری کے پیمانوں سے وسیع تر ہیں اور رضا اور انکار کی شقوں سے عظیم تر یہ سر نہاں جو دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں موجود ہے، کاش اسے انسان انکسار اور بردباری کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لے۔ اسے ایک سنجیدہ اور وقت طلب ذمے داری سمجھ کر سہارے، بجائے اس کے کہ اسے محض ایک تفریح سمجھتا ہے اے کاش انسان ایسا کرے تاکہ وہ پھر اپنی برومندی (FRUIT FULL NESS) کی بھی تعظیم کرنے لگے، کیوں کہ برومندی تو اپنی ذات میں واحد ہے خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی، جسمانی تخلیق کا منبع بھی جسمانی ہی ہوتا ہے اور اس کی ماہیت بھی۔ یوں سمجھیے کہ وہ جسمانی تلذذ کی کسی قدر زیادہ لطیف' زیادہ پر از مسرت' اور زیادہ دائمی تکرار ہوتی ہے۔ خلاق ہونے' تخلیق کرنے' بنانے کا احساس دراصل کچھ نہیں ہے جب تک کہ دنیا میں اس کی مسلسل عظیم الشان تصدیق اور حقیقت پذیری نہ ہوتی جائے۔ یہ احساس کچھ نہیں ہے جب تک کہ اس کی ہزار گنا تطبیق اور ہم آہنگی اشیا اور جانوروں سے بھی نہ ہو اور اس احساس کا لطف محض اسی لیے ناقابلِ بیان حد تک خوب صورت اور تونگر ہے کہ اس میں ان گنت اشیا اور لوگوں کے حاملہ ہونے اور وجود میں آنے کی توریثی یادیں بھری ہوئی ہیں۔ ایک تخلیقی خیال کی گود میں (BEGTTING AND BEARING OF MILLIONS) ہزاروں بھولی ہوئی پیار کی یادیں تازہ دم ہو جاتی ہیں اور اسے توقع اور انبساط سے مالا مال کر دیتی ہیں۔ جو ہستیاں رات کو باہم دیگر ہم آغوش ہو کر تلذذ کی پینگیں بڑھاتی ہیں وہ ایک مہتم بالشان کام کرتی ہیں اور مسرتیں اخذ کرتی ہیں۔ وہ شدت اور گہرائی فراہم کرتی ہیں کسی آنے والے شاعر کے گیتوں کے لیے جو ناقابلِ بیان مسرتوں کے اظہار کے لیے مستقبل میں نمودار ہوگا۔ یہ ہستیاں مستقبل کو جگا دیتی ہیں اور اگرچہ ان سے غلطی بھی ہوتی ہے اور اگرچہ یہ اکثر اندھوں کی طرح ہر شے کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہیں' پھر بھی مستقبل تو آتا ہی ہے۔ ایک نیا انسانی وجود ابھرتا ہے اور اس امکان کی سطح پر جو یہاں اپنی زمانی تکمیل کو پہنچا چاہتا ہے' وہ قانون جاگ اٹھتا ہے جس کے تحت ایک قوی اور جاندار نطفہ اس رحم کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے جو اس کے لیے آغوش کشادہ ہوتا ہے۔ اچھا

باتوں سے ات حیران و پریشان ہوئیے، تہہ میں جاکر ہر چیز ایک قانون بن جاتی ہے۔ جو لوگ اس راز کو غلط طرح برتتے ہیں (اور ایسے بہت لوگ ہیں) وہ اسے کھو بیٹھتے ہیں، لیکن صرف اپنی حد تک، کیوں کہ انجام کار وہ اسے بغیر جانے ہوئے، ایک مہربند خط کی طرح دوسروں کو دے دیتے ہیں۔ اسی طرح ناموں کے تعدد اور معاملات کی پیچیدگی سے پریشان خاطر نہ ہوئیے مجھے لگتا ہے کہ ہر شے سے بالاتر اور سب پر حاوی اور ایک عظیم مادریت (MOTHER HOOD) ہے جسے ایک مشترکہ آرزومندی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک کنواری عورت (ایسی ہستی جس نے آپ کے دل کش الفاظ میں "ابھی کوئی کامرانی نہیں پائی") کا حسن اس کی مادریت ہے جسے جب اچانک اپنا احساس ہوتا ہے تو فکر مند اور آرزو مند مستقبل کے لیے خود کو تیار کرنے لگتی ہے۔ ایک ماں کا حسن اس کی شفقت بھری مادریت ہے اور ایک بوڑھی عورت کی عظمت اس کی یادیں ہیں۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ مرد میں بھی مادریت ہوتی ہے۔ جسمانی بھی اور روحانی بھی۔ اس کی تخلیق کاری بھی ایک طرح کا تولیدی فعل ہے۔ شاید دونوں جنس ہمارے اندازے سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ شاید اس دنیا کی نشاۃ ثانیہ بھی یہ ہوگی کہ مرد اور عورت تمام جھوٹے جذبات اور تکلفات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کے قریب آنا چاہیں، اس طرح نہیں جیسے مقناطیسوں کے متضاد قطبین، بلکہ اس طرح جیسے کوئی بھائی اور بہن، یا دو پڑوسی۔ وہ مل ہوں بہ حیثیت دو انسانوں کے، اور محض اس غرض سے کہ اس طرح صبر اور متانت کے ساتھ دونوں جنس کا وہ بھاری اور مشترک بوجھ اٹھا سکیں جو ان پر رکھ دیا گیا ہے۔

جو کچھ مستقبل میں شاید اکثر لوگوں کے لیے ممکن ہو، اس کو آج کوئی تنہا انسان (SOLITARY MAN) اپنے ہاتھوں سے تعمیر کر سکتا ہے، کیوں کہ تنہا انسان کے ہاتھ کمتر خطا کرتے ہیں۔ چنانچہ عزیز من اپنی تنہائی کو مرغوب رکھیے اور جو اذیت وہ تنہائی آپ کو بخشے اس کو خوش آیند نوحوں کی مدد سے برداشت کرتے جائیے۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس وقت جو قریب ہیں ان کے لیے آپ بہت دور ہو چکے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کے چاروں طرف ایک وسعت پھیلتی جا رہی ہے۔ اور جب صورت یہ ہو کہ جو کچھ نزدیک ہو وہ دور لگے تب تو آپ کی دوری کی حدیں ستاروں کے درمیان پہنچ چکیں۔ اپنی اس نمو پذیری پر مسرور ہوئیے۔ اس میں قدرتاً آپ کسی اور کو اپنے ساتھ نہیں لے چل سکتے۔ جو پیچھے رہ جائیں ان سے نرمی سے پیش آئیے۔ ان کے روبرو استقلال اور سکون کا اظہار کیجیے۔ نہ تو اپنے شکوک کے ذریعے انھیں اذیت پہنچائیے اور نہ ہی اپنے تیقن اور انبساط سے (جسے وہ سمجھ نہیں سکتے) انھیں خوف زدہ کیجیے۔ اپنے اور ان کے درمیان کوئی سادہ اور پُر خلوص رشتہ نکالیے جو لازم نہیں کہ بدلتا رہے۔ اگرچہ آپ خود ایک تبدیلی کے بعد دوسری تبدیلی سے گزرتے ہیں۔ ان لوگوں میں جو آپ کے لیے ناآشنا زندگی ہے اس سے پیار کیجیے اور جو لوگ سن رسیدہ ہیں ان کا لحاظ کیجیے، کیوں کہ وہ اسی تنہائی سے خوف زدہ ہیں جس پر خود آپ کو پورا بھروسہ ہے۔ اس بات کی سعی کیجیے کہ جو ناٹک والدین اور ان کی اولاد کے درمیان ہمیشہ ٹھنا رہتا ہے اس کو آپ سے کوئی تقویت نہ پہنچے۔ یہ ناٹک اگر ایک طرف خوردوں کی بیشتر قوت کھینچ لیتا ہے تو دوسری طرف ان کے بزرگوں کی محبت کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔ (وہ محبت جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی موثر اور حوصلہ بخش ہوتی ہے) ان سے نہ تو کوئی صلاح لیجیے اور نہ ہی بھروسا رکھیے کہ وہ آپ کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ اس محبت پر پورا اعتماد رکھیے جو آپ کے لیے ایک میراث کی طور پر مسلسل جمع ہو رہی ہے۔ یہ بھروسا رکھیے کہ اس محبت میں ایسی قوت اور برکت ہے کہ وہ آپ کو آپ کی بعید ترین منزل تک بآسانی پہنچا سکتی ہے۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ بہت جلد آپ ایک ایسا پیشہ اختیار کریں گے جو آپ کو خود کفیل اور خود مختار بنا دے گا۔ صبوری کے ساتھ اس ادراک کا انتظار کیجیے جس میں آپ پر واضح ہوگا کہ کہیں یہ پیشہ آپ کی باطنی زندگی کو محبوس اور پابند تو نہیں بنا دے رہا ہے۔ میرے نزدیک تو یہ پیشہ بہت ہی مشکل اور دقت طلب ہے کیوں کہ یہ روایات اور رسوم کے انبار سے بوجھل ہے اور اس میں اس کی گنجائش نہیں کہ کوئی شخصی یا ذاتی حل اس کے مسائل کا نکالا جا سکے۔ لیکن آپ کی تنہائی (SOLITUDE) آپ کے لیے ایک سہارا یا جائے پناہ ہوگی، اور بے انتہا نامانوس حالات کے درمیان بھی یہ تنہائی آپ کو ایسی بھول بھلیوں سے باہر نکل جانے کا راستہ دکھا دے گی۔ میری تمام دعائیں آپ کے ہم رکاب ہیں اور میرا ایقان آپ کا ہم سفر ہے۔

آپ کا
رائنر ماریا رلکے

مترجم: چودھری محمد نعیم　　(شب خون، الٰہ آباد)

بے حقیقت بن جانے کے فائدے

سوویٹ یونین میں ان دنوں ایک ناول جس کا نام "پشتے پر بنا ہوا مکان" ہے بڑی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ناول کا تھیم یہ ہے کہ بے حرکتی اور جمود بہت منافع بخش ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار گلیبوو ہے جو کسی بھی اہم مسئلے پر نہ کوئی پختہ رائے قائم کرتا ہے اور نہ کسی ثابت قدمی کا ثبوت دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ہر مصیبت سے بچا رہتا ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر رتبے پر پہنچتا رہتا ہے۔

گلیبوو کا ایک واقف کار اس کے بارے میں کہتا ہے "اس کا سب سے بڑا وصف یہ تھا وہ بے حقیقت تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں محسوس ہوا جن لوگوں میں بے حقیقت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ ترقی کے اونچے سے اونچے مراتب پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں"

آج کی دنیا پر یہ بات کتنی صادق آتی ہے۔ اگر کامیاب آدمیوں کی زندگیوں کی چھان بین کی جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بیشتر اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جسے نباہ کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ کبھی کسی کے راستے میں حارج نہیں ہوتے تھے، نہ کبھی تیز چلتے تھے۔ کسی بات کو مسئلہ تو بناتے ہی نہ تھے۔ وہ ترجیح اس بات کو دیتے تھے کہ خاموش رہیں لیکن اگر انہیں بولنا پڑتا تو ان کا لہجہ عام لہجے سے مختلف نہیں ہوتا تھا۔ بعض لوگ ان پر یہ نکتہ چینی کر سکتے ہیں کہ وہ کچھ زیادہ ہی محتاط تھے لیکن وہ کامیاب ہر پہلو سے تھے اور زندگی کی سیڑھی پر ان کا قدم اوپر ہی اوپر جاتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ بے حقیقتی، بے حرکتی کے مترادف بن گئی ہے۔ اگر آپ کو نباہ کرنے کا فن آتا ہے تو آپ زندگی میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اگر آپ کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتے، کوئی خطرہ مول نہیں لیتے، صرف دبکے پڑے رہتے ہیں تو فائدے ہی فائدے میں رہتے ہیں اور لوگ یہاں تک یاد کرنے لگتے ہیں کہ آپ میں کوئی خاص صلاحیت ہے۔

مثال کے طور پر سرکاری ملازموں کو لیجیے۔ ان میں سے جو کوئی فیصلہ نہیں کرتے وہ کوئی غلطی بھی نہیں کرتے۔ وہ صرف فائل کو آگے بڑھا دیتے ہیں اور اسی کے طفیل ترقی کرتے رہتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ان میں قوت فیصلہ کی کمی ہے۔ لیکن وہ ایسی باتوں کی پروا کب کرتے ہیں۔ انھیں مسلسل ترقی ملتی رہتی ہے اور کبھی کبھی تو انھیں معینہ میعاد سے پہلے ہی ترقی مل جاتی ہے۔ زندگی میں اور انھیں کیا چاہیے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کرتے کہ مسئلے کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بحث کر کے ایک ایسا نوٹ لکھ دیں، جو دونوں پہلوؤں کا ماحصل ہو اور اس کے بعد اسے اعلیٰ افسروں تک پہنچا دیں۔ تجربے نے انھیں سکھا رکھا ہے کہ اپنی رائے ظاہر کرنا مفید نہیں ہوتا۔ اگر فیصلہ کسی اور پر چھوڑا جا سکتا ہو تو خود فیصلہ کرنے کا خطرہ کیوں مول لیا جائے؟ ہو سکتا ہے کہ ان کے طرز عمل سے فیصلہ پر پہنچنے میں تاخیر واقع ہوئی ہو اور ایسے پروگرام جنھیں فوری طور پر عملی جامہ پہنانا ضروری ہو، التوا میں پڑ جائیں لیکن وہ خطرے سے ضرور بچے رہتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اور تشویش انھیں ہے ہی نہیں۔

وہ جانتے ہیں کہ کئی لوگوں کو فیصلہ کرنے کی سزا مل چکی ہے جب کوئی غلطی ہو جائے، جب پارلیمنٹ یا اسمبلی میں پریشان کن سوال پوچھے جائیں اور یہ چھان بین ہونے لگے کہ قصور کس کا ہے تو محفوظ راستے پر چلنے والے یہ سرکاری ملازم بڑے اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اپنے ماتحتوں سے کہتے ہیں "میں پہلے ہی سے جانتا تھا" ایسا نہیں کہ انھیں دوسروں کی الجھنوں سے خوشی ہوتی ہو لیکن ایسے لوگوں کو وہ ہمیشہ ناپسند کرتے ہیں جو انتظامی معاملات میں نئے نئے تصورات پر عمل پیرا ہوں۔

اور تب، جب ان لوگوں کی چابک دستی جو لال فیتے کو بالائے طاق رکھنا چاہتے ہیں، انھیں کسی مشکل میں ڈال دیتی ہے تو محفوظ راہ چلنے والوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ احتیاط، جرأت سے کہیں بہتر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جنھوں نے پرانے ضابطوں کی پروا نہیں کی اور کسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں اوپر سے ہدایات حاصل نہیں کیں وہ زندگی میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کیوں بدلیں؟ وہ نہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں اور نہ کوئی غلطی۔ یہ کوئی برا ریکارڈ نہیں۔

دانشوروں کا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ اس قبیلے کا امتیازی وصف بھی تقلید ہے۔ وہ ہر واقعے کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ آزادانہ طور پر سوچنا صرف ایک سوانگ ہے۔ ان کا ضابطۂ حیات اور ان کا فلسفہ یہی ہے: جس کا کھاؤ اس کا گاؤ۔ زندگی میں جو سہولتیں انھیں حاصل ہیں وہ ان سے دست کش ہونا نہیں چاہتے۔ ایسا نہیں کہ

وہ اپنے مقاصد کے لیے قربانی اور ایثار کی قدر نہ کرتے ہوں لیکن قربانی اور ایثار وہ دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

اگر فضا سوشلزم کے لیے ہموار ہو تو وہ سوشلسٹ ہیں۔ اپنے نعروں اور اپنی تقریروں سے وہ سوشلزم کا ہر جواز مہیا کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر فضا بدل جائے تو وہ سوشلزم بلکہ ہر ازم سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ موسم کے مطابق کپڑے کیوں نہ تبدیل کیے جائیں۔ وہ کہیں گے کہ وہ تو ہمیشہ پیداوار بڑھانے کے حامی رہے ہیں۔ وہ نہ کبھی ہڑتالوں کے حامی تھے اور نہ کسی بے راہ روی کے۔*

یہ کہنا مشکل ہے کہ کسی بات پر ان کا ایمان ہے بھی یا نہیں لیکن ان کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی دلچسپی صرف اپنی ذات سے ہے۔

دانشوروں کے پیش نظر چونکہ یہی مقصد ہے کہ وہ حفاظت سے اچھی زندگی بسر کریں اس لیے انھیں اس کی چنداں پروا نہیں ہوتی کہ وہ کامیابی کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا مطمح نظر صرف کامیابی ہے چاہے وہ کسی طرح حاصل ہو۔ طریق کار کی انھیں نہ کبھی پروا تھی نہ ہے۔ آرٹ اور ادب کو مبتذل بنانے سے انھیں کیا انکار ہو سکتا ہے اگر اس طرح اچھی زندگی کا مقصد حاصل ہو جائے۔

وہ اقدار کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اصولوں اور آدرشوں پر غیر مختتم بحثیں کرتے ہیں لیکن ان کی نظر ہمیشہ مادی فائدوں پر رہتی ہے۔ ان کا بڑا وصف جیسا کہ روسی ناول کے مصنف یوری ٹریفونوف نے کہا ہے، یہی ہے کہ ان میں بے حقیقت بننے کی صلاحیت ہے اور چونکہ اس صلاحیت سے انھیں فائدہ پہنچتا رہتا ہے، وہ بدلیں کیوں؟

کلدیپ نیر　　　(انڈین ایکسپریس، نئی دلی)

---

* تحریک ہڑتالوں اور بے راہ روی کا ہمیشہ مخالف رہا ہے اور پیداوار بڑھانے کی اہمیت بھی اس نے ہمیشہ تسلیم کی ہے۔ اگر کچھ لوگ جو پہلے ہڑتالوں اور بے راہ روی کے حامی تھے اور پیداوار بڑھانے میں مزاحم اب اپنا موقف بدل لیں تو تحریک کے نزدیک ان کی نئی روش کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ ان کی نیتوں پر شک ضروری نہیں۔

یہ کلدیپ نیر صاحب کا انکشاف ہے کہ وہ مخلوق جسے دانشور کہتے ہیں ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ ایک دانشور کی دلچسپی بنیادی طور پر تصورات سے ہوتی ہیں وجہ ہے کہ اس کی غیر مقلدانہ روش کو وہ لوگ بھی برداشت کر لیتے ہیں جن کے نزدیک یہ لوگ صرف جنونی ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے علم میں ہے اس قسم کے لوگ ہندوستان میں اکا دکا ہی ہیں۔ بیشتر مدعیان دانشوری تو اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں حافظ کہہ گیا ہے:

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

— ادارہ —

بزمِ احباب

● کمیونسٹ پارٹی کا محاذی ادارہ انجمن ترقی پسند مصنفین اعتدال کی راہ پر گامزن ہونے کا اعلان اس وقت کر رہا ہے جب سوویٹ روس کی کمیونسٹ پارٹی جس کی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی صرف ایک شاخ ہے، ثقافتی محاذ پر انتہا پسندی کی راہ کو پھر سے اپنا رہی ہے۔ سوویٹ انسائیکلوپیڈیا کی تازہ ترین جلد میں خروشچیف کے ان فیصلوں کا کوئی ذکر نہیں جن کا تعلق اعتدال پسندی سے تھا لیکن اسٹالن کے دور کے فنونِ لطیفہ کے زارِ اینڈری ژدانوف کے سخت گیرانہ فیصلوں کا ذکر موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تیس برس پہلے ژدانوف نے فنونِ لطیفہ کے بارے میں جو سخت گیرانہ پالیسی جاری کی تھی وہ جوں کی توں موجود ہے۔

مارچ کے مہینے میں سوویٹ روس کے تین اخباروں نے جن میں پراودا بھی شامل ہے ژدانوف کے ۸۰ ویں یومِ ولادت پر اس کی تعریف میں پُر جوش مضامین شائع کیے اور یہی پارٹی کے نظریاتی جریدے "کمیونسٹ" نے کہا۔ ان مضامین میں صفائی کی ان مہموں کا کوئی ذکر نہیں جو ژدانوف کے حکم پر چلائی گئیں البتہ اسے ایک ممتاز ثابت قدم اور مضبوط ارادے کا کمیونسٹ ضرور کہا گیا ہے۔

اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کم از کم ثقافتی امور میں سوویٹ روس وہی روش اپنا رہا ہے۔ جو ژدانوف کے دور میں تھی۔ یہ غیر مقلد مصنفین کے لیے ایک تنبیہ ہے۔

روس کی اس روش کی موجودگی میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا محاذی ادارہ انجمن ترقی پسند مصنفین اعتدال کی پالیسی کس طرح اپنا سکتا ہے[1]؟

—— شمیم احمد، انور

● جون کا تحریک بدست ہوا۔ پورن کمار ہوش کے انتقال پر تحریک کا خراج ایک ہونہار شاعر کے لیے ناقدری اور گروہ بندی کے اس دور میں یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ اُردو کے رسائل اور جرائد بھی ذاتی منفعت، اور رذیل گروہ بندیوں کی کھائی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ تحریک نے ہمیشہ اس رجحان کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اس پر ادارہ کو مبارکباد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

میری نظم کے آخری حصہ میں مصرعہ
سانس لے کے گھومتا ہے مثلِ باد
شب بہ شب

کے بعد والا مصرعہ پیسٹنگ کے جھول کی نذر ہو گیا ہے۔ براہِ کرم اس مصرع کو دوبارہ شائع کر دیجیے۔

دریچوں، روزنوں سے آنگنوں تک!
کھوجتے ہیں —— ...

کرشن موہن اور تنہا تماپوری کی مختصر نظموں، عظیم اختر، فضا ابن فیضی، کیف احمد صدیقی، لطف الرحمٰن، شاہد عزیز اور عبدالمتین نیاز کی تخلیقات کے علاوہ ہوش کی غزلیں دل کو چھوتی ہیں۔ کشور سلطان اور عطیہ پروین نے ہمیشہ کی طرح تاثر چھوڑا۔

ماتھے کا اجالا اور تبصرے باوقار ہیں اور ترتیب معیار کے عرش کو چھوتی ہے۔

—— حامد اکمل۔ گلبرگہ

● تحریک کے شمارہ مئی ۱۹۷۶ء میں حسن رہبر صاحب کی کہانی "ایک پل کا فاصلہ" شائع شدہ تحریک مارچ ۱۹۷۶ء کے متعلق جناب مظفر حنفی اور رومی اقبال صاحبان کے مکتوبات پڑھنے کا موقع ملا۔ اگر حسن رہبر صاحب کی کہانی مظفر حنفی صاحب کی نظم پریشانی کا ادائیگی" شائع شدہ ۱۹۷۶ء کا سرقہ ہے تو نظم بھی اقبال صاحب

[1] مگر آپ میرا مضمون محاذی اداروں کے فرائض کمیونسٹ پارٹی کی نظریاتی وضاحت میں پڑھیں گے تو آپ کی یہ الجھن دور ہو جائے گی۔ (گوپال متل)

کی کہانی "پتھر" شائع شدہ ماہنامہ "تخلیق" دہلی مارچ ۱۹۶۳ء سے کیا ہے ۔ ایسی معمولی سی مماثلت سے توارد، سرقہ یا چوری کا الزام لگانا بیجا ہی ہے جیسا کہ PLATO نے ادب و فن کو نقل در نقل کہہ کر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تھا اور شاعروں اور فلسفیوں کو اپنی کتاب "جمہوریہ" میں شہر بدر کرنے کا حکم صادر کیا تھا ۔ میں نے جناب حسن رہبر کی کہانی اور منظفر حنفی صاحب کی نظم بار بار پڑھی ۔ محمد عمر میمن کی کہانی "... بڑا اپدیشک ہے" تحریک دسمبر ۱۹۶۳ء پڑھیے ۔ فرض ایک ہی ہے ——— انسان خود غرض ہوتا ہے ۔

کوئی جذبہ، کوئی کیفیت، واقعہ، حادثہ یا سانحہ اپنے میں سب کچھ نہیں ۔ پیشکش کی اہمیت ہوتی ہے ۔

ایک کہانی پر دو طرفہ وار دیکھ کر میں نے سمجھا تھا شاید حسن رہبر صاحب کی کہانی TRUE COPY ہو جیسا کہ لوگ کرتے ہیں لیکن میں نے ایسا نہیں پایا ۔

——— م ۔ ق ۔ خان ۔ گیا

● مئی کے "تحریک" میں جوگندر پال کا افسانہ کافی پسند آیا ۔ ان کے علاوہ ایم منظر الزماں خاں، احمد تنویر کے افسانے بھی پسند آئے "مانگے کا اُجالا" نے میری معلومات میں کافی اضافہ کیا ۔ کرشن موہن کی "پچاس اور پچپن" کافی دلچسپ اور نفسیاتی نظم ہے ۔

——— فیروز بتیاوی، سیتامڑھی

● گوشۂ پورن کمار ہوش اچھا رہا لیکن ہوش صاحب کی تمام غزلیں ۷۶ ۔ ۷۵ء سے ہی منتخب کی گئی ہیں کچھ پُرانا کلام بھی شائع کرنا تھا ۔

——— سحر سیونوی، سیونی

● "تحریک" کی تبدیلیاں خوشگوار ہیں ۔ تازہ شمارے میں مرحوم پورن کمار ہوش کا گوشہ اگرچہ مختصر ہے، مگر تشنہ نہیں ۔ مرحوم سے میرے قریبی تعلقات تھے ۔ کچھ دنوں تک ان کے پڑوس میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ یہ قربت اسی کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی ۔

——— عبداللہ کمال بمبئی

● شارق میرٹھی کا تحقیقی مقالہ "شوکت میرٹھی اوّلین شارح کلام غالب" معلوماتی ہے ۔ منظومات میں فضا ابن فیضی، قیصر قلندر، ظفر غوری، نازش انصاری کی تخلیقات نے متاثر کیا ۔ گوشۂ پورن کمار ہوش کے لیے "تحریک" کے چند اوراق کو وقف کرکے آپ نے اس تعلق کا حق ادا کر دیا ۔ جس کی ہوش صاحب کی ذات گرامی مستحق تھی ۔

——— اعجاز اعظمی، ملیشیا

● تحریک کا بدلا ہوا رنگ روپ پسند آیا ۔ لکھنے والوں کے پتے بعض دوسرے رسالے بھی شائع کرتے ہیں مگر "تحریک" نے اس سلسلے میں اپنا انداز اختیار کیا ہے ۔
صفحات میں افسانے کو خالص ادبی مسائل کے لیے وقف رکھا جائے تو زیادہ اچھا ہو ۔

——— پرکاش فکری، رانچی

● تحریک کے مئی کے شمارہ میں حرمت الاکرام صاحب کا خط دیکھا، پڑھکر عبرت ہوئی اس سے زیادہ اور کیا کہوں ۔ معلوم نہیں کیوں ادبی دنیا گفتگو کے درمیان لوگ اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں، ایسے مسائل پر علمی تناظر میں غور کرنا چاہیے ۔

——— فضا ابن فیضی، مئو ناتھ بھنجن

● مئی کے شمارے میں حرمت الاکرام کا خط شائع کرکے آپ نے خوب کیا ۔ مدیر کو اتنی اخلاقی جرأت تو رکھنی ہی چاہیے ۔

——— انوار رضوی، نئی دلی

خبرنامہ

○ ۲۸ مئی کی شام کو ایوانِ غالب نئی دہلی کے خوشنما ہال میں ینگ رائٹرز فورم کی طرف سے نوجوان شاعر امیر قزلباش کے دوسرے شعری مجموعے ''انکار'' کے اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ جلسے کی صدارت حکومتِ ہند کی وزارتِ پٹرولیم کے نائب وزیر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری نے فرمائی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب کمار پاشی اور جناب بانی نے امیر قزلباش کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا۔ محترم انصاری صاحب نے بھی اپنی صدارتی تقریر میں امیر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں مشہور مغنیہ برشا گنگولی صاحبہ نے اپنی مترنم آواز میں امیر صاحب کی متعدد غزلیں سامعین کے سامنے پیش کیں۔ جلسے میں دلّی کے ممتاز شاعر، ادیب اور سخن فہم حضرات شریک تھے۔

○ ۵ جون کی رات کو سوجنیا کیندرا ادے پور کے سبزہ زار میں مقامی ادبی اور ثقافتی انجمن ''اپشام'' کی طرف سے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ مشاعرے کی صدارت ہندی اور سنسکرت کے عالم جناب جنار دھن گپتا صاحب نے فرمائی۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے دلّی سے مخمور سعیدی، احمد آباد سے محمد علوی اور رشید افروز، بمبئی سے ندا فاضلی اور ناتھدوارہ سے حمید سہروردی خصوصی مدعوئین میں تھے۔ ان کے علاوہ راجستھان کے جدید شاعروں میں ش۔ک۔ نظام، عابد ادیب، خلیل تنویر، شاہد عزیز اور دوسرے کئی شاعروں نے شرکت کی۔ داعیان میں نوجوان شاعر اور افسانہ نگار مشکور جاوید کا نام بھی شامل تھا۔

○ ۷ جون ۱۹۷۶ء کو ارم ایجوکیشن سوسائٹی لکھنؤ کے زیرِ اہتمام جنابِ ساحر ہوشیارپوری اور جنابِ نازش پرتاپ گڑھی کی قدر افزائی کے سلسلے میں ایک ادبی تقریب رویندر الیہ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت حکومتِ اتر پردیش کے چیف سکریٹری جناب محمود بٹ نے فرمائی۔ آغاز میں ڈاکٹر شارب ردولوی نے ساحر ہوشیارپوری کی غزلیہ شاعری پر مضمون پڑھ کر سنایا اور نازش پرتاپ گڑھی کی نظمیہ شاعری کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رسم گل پوشی کے بعد ساحر ہوشیارپوری کو غزل ایوارڈ اور نازش پرتاپ گڑھی کو نظم ایوارڈ پیش کیا گیا۔

تقریب کے دوسرے دور میں، ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جو رات کے ایک بجے اختتام پذیر ہوا۔ مقامی شعرا کے علاوہ جاں نثار اختر، خمار بارہ بنکوی، نذیر بنارسی، رفعت سروش، مشیر جھنجھانوی، شمیم جے پوری، ساغر مہدی، حفیظ میرٹھی، اور حسن کمال نے اہلِ ذوق حضرات کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ ۸ جون کو شام کے ۵ بجے اتر پردیش اردو اکادمی کے دفتر میں ایک سیمینار کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں ساحر و نازش کی ادبی خدمات پر مفصل روشنی ڈالی گئی۔ مقررین میں ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، احمد جمال پاشا، ابراہیم علوی اور سلمان عباسی کے نام شامل تھے۔ آخر میں ارم ایجوکیشن سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب شمس فرخ آبادی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ادبی ایوارڈ دینے کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رکھا جائے گا۔

○ ۱۲ جون کی شام کو آل انڈیا اردو ہندی سنگم کی کشمیر شاخ کی طرف سے سری نگر کے ٹورسٹ ریسپشن سنٹر میں جناب ڈی۔ پی۔ دھر کی یاد میں ایک جلسہ اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ جلسے کی صدارت ریاست جموں و کشمیر کے گورنر جھا صاحب نے فرمائی اور مشاعرہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشی صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ مشاعرے میں اردو اور کشمیری کے جن شاعروں نے شرکت کی ان میں تقاضی فیضی، حسن نعیم، مظہر امام، مخمور سعیدی، شہریار، بل کرشن اشک، سلطان اختر، حکیم منظور، حیات وارثی، شام رضوی، حامدی کاشمیری، سلطان شجاع، رفیق راز، رحمان راہی، فاضل کشمیری، عابد مناوری، اسرار جامعی اور خان اختر، نکہت خان اور ثریا رحمن کے نام شامل تھے۔ نظامت کے فرائض کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے انجام دیے۔ منتظمین میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری بھی تھے۔

دوسرے دن ٹی۔ وی۔ سنٹر پر ایک مشاعرہ ہوا جس میں مہمان شعرا نے شرکت کی۔ یہ مشاعرہ ظفر احمد صاحب نے آرگنائز کیا اور جناب مظہر امام نے کنڈکٹ کیا۔ جناب کمال احمد صدیقی اسٹیشن ڈائرکٹر ریڈیو کشمیر نے بھی مہمان شعرا کا کلام ریکارڈ کیا۔

بقیہ : تلاش

خالی خالی سا کھڑا ہے۔ اس لوہے کے ٹکڑے کی طرح جو کسی زبردست چک کے اثر میں گرفتار ہو۔

ٹرین آتی ہے، اس کا دوست سوار ہو جاتا ہے، وہ خالی آنکھوں سے اسے الوداع کہتا ہے، اس کا دماغ کہیں اور اٹکا ہوا ہے، ٹرین چھوٹتی ہے، اس کا دوست ہاتھ ہلا رہا ہے۔ وہ بھی ہاتھ ہلا رہا ہے، لیکن وہ کتنا گھبرایا ہوا ہے۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ٹرین کو اتنی زور سے دھکا دیتا کہ وہ ایک سیکنڈ میں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی، پھر ٹرین اندھیروں میں اوجھل ہونے لگتی ہے، اور وہ جلدی جلدی وہاں سے لوٹتا ہے، اس کے پاؤں قدرے دور دور پڑ رہے ہیں، وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے ---

تین دنوں کے بعد اس نے آج کھانا کھایا ہے اور پانچ روپے بچ گئے ہیں گھر سے پیسے آنے کی کوئی امید نہیں —— لیکن وہ کیا کرے؟ اپنے جسم کو اپنے پیٹ کو دیکھے، یا اس دماغ کو جو پاگل ہوا جا رہا ہے، اس دل کو جس میں اداسی کانپ رہی ہے۔

وہ دو روپے کا نوٹ نکال کر —— انگلیوں میں دبائے —— اب سڑک پر دوڑ رہا ہے، بہت ہی تیزی سے اس کے قدم اٹھ رہے ہیں اور وہ سوچ رہا ہے —— اس کے دماغ میں صرف ایک ہی سوال گونج رہا ہے —— کہیں وہ چلی نہ گئی ہو۔ ●●

بقیہ : فارقلیط صاحب

کوئی خوف ہی انھیں ان کے راستے سے کبھی منحرف کر سکا آزادی سے پہلے بیشتر وطن دوست مسلمانوں کی طرح انھیں بھی اپنے ہم مذہبوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑا اور آزادی کے بعد جب انھوں نے اپنے انھیں ہم مذہبوں پر ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کی تو بعض لوگوں کو ان کی اس حق گوئی کے خلاف شکایت پیدا ہو گئی لیکن پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی ان کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چونکہ دونوں صورتوں میں ان کے نکتہ چینوں کی نظر سے اوجھل رہا وہ یہ تھا کہ ان کی تنقید دونوں صورتوں میں ایک دوست کی تنقید تھی جس کا مقصد اصلاح احوال تھا اور اس میں عناد کا کوئی پہلو شامل نہیں تھا۔ یہ بات ان کے نکتہ چینوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ ایک دوست کی ہمدردانہ نکتہ چینی ایک منافق کی چاپلوسی سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

نئی نسل سے یہ مطالبہ کرنا تو بہت زیادہ ہوگا کہ وہ ان کے نقشِ قدم پر چلے لیکن یہ بھی کچھ کم نہیں ہوگا کہ وہ ان کی روایت کو بالکل ہی فراموش نہ کر دے اور جہاں تک ممکن ہو سکے اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ انجام دیتی رہے۔ (گوپال متّل) ●●

بقیہ : اعتراف

اگر ایسا ہے اور یہ سچ ہے تو میں اس ساحل پہ کھڑا ہوں جہاں سے سیاہ جزیرے کی طرف جانے کے لیے ان گنت دروازے ہیں۔

لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ میں کس دروازے سے اندر جاؤں؟

اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ آپ میری کہاں تک رہنمائی کریں گے۔

اب تک کی کہانی سنانے کے بعد میں ساحل پہ کچھ ٹیس لت پت چہرہ لیے آپ کے اس فیصلہ کا انتظار کر رہا ہوں جہاں سے دراصل میری کہانی شروع ہوتی ہے، نہیں شاید میں بھول رہا تھا جہاں سے میری آپ کی اور سب کی کہانی شروع ہوتی ہے اور ختم . . .

اب آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ . . . ؟؟ ●●

Regd No. D (D) 118 Phone : 271649 JULY 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK

آپ کی معلومات میں اضافہ کرنے والی بہترین کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
چین انقلاب	فریڈرک جینسر	۰/۷۵ روپے
چین میں اسلام کا ماضی اور حال	———	۰/۴۰ ״
ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول	وکٹر فیدر	۱/۰۰ ״
جمہوری انقلاب	برائن ماگی	۱/۰۰ ״
روس کے انقلاب	ڈیوڈ فٹ مین	۱/۰۰ ״
جمہوری سوشلزم	گائلس ریڈس	۱/۰۰ ״
ٹریڈ یونینیں — ان کا جائز اور ناجائز استعمال	آرتھر ہائٹرلی	۰/۵۰ ״
ببول کے پیڑ	(ایک آپ بیتی)	۰/۵۰ ״
دو انقلاب	آر۔ ایچ بروس لاک ہارٹ	۱/۰۰ ״
سوویٹ سفارت خانے میں	الیگزینڈر کزناچیف	۲/۰۰ ״
آج کا مارکسزم	رابرٹ کنکوئسٹ	۰/۷۵ ״
آج کا چین	ڈاکٹر ایس چندر شیکھر	۱/۰۰ ״
روسی انقلاب کی کامیابیاں	ڈاکٹر جان کیپ	۰/۵۰ ״
ایک روسی سائنسداں کے تجربات سرخ چین میں	مائیکل کلوچکو	۱/۰۰ ״
ادیب اور کمیسار	ہاروتھ جارج پلوگزی	۱/۰۰ ״
چین کا بدلتا سماج	چوچائی اور دون برگ چائی	۱/۰۰ ״
کمیونزم اور نو آبادیت	وکٹر کولرز	۱/۰۰ ״
کمیونزم اور صناعت	[illegible]	[illegible]
پرامن حملہ	ڈوگلس ہائڈ	۱/۰۰
خوش حالی کی تلاش	برائن کروزیر	[illegible]
پتھر کے دیوتا (چھ آپ بیتیاں)	مترجم، گوپال متل	۱/۰۰
اتحاد — ہماری ہار	ڈوگلس ہائڈ	۱/۰۰
تعلیم کی [illegible]	———	[illegible]

قارئین کو
یوم آزادی مبارک

شذرات ومضامین

افسانے

شاعری

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک
نئی دہلی

شمارہ: ۶ جلد ۲۳

ستمبر ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی
پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی: ایک روپیہ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ فی کاپی [illegible]

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمان پریس، دہلی

مقام اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲

زیادہ سے زیادہ
پیڑ
اگائیے
davp 76/271

کولمبو کانفرنس اور سوویٹ یونین

گوپال متل

کولمبو میں ناوابستہ ممالک کی جو پانچویں چوٹی کانفرنس ہوئی اس کے بارے میں اور کچھ بھی کہا جائے لیکن اس کی کارروائی پڑھنے والا ہر شخص یہ ضرور محسوس کرے گا کہ اس سے سوویٹ یونین کی تسکین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ ناوابستگی کے متعلق سوویٹ یونین کا موقف "نیو ٹائمز" میں شائع شدہ ایک مضمون کے مطابق یہ ہے :

"جدید دنیا میں خط امتیاز چھوٹے اور بڑے ملکوں میں نہیں، نہ امیر اور غریب ملکوں میں ہے۔ یہ خط امتیاز دو طاقتوں میں ہے۔ ایک طرف سوشلزم، ترقی اور امن کی طاقتیں ہیں، اور دوسری طرف سامراج، نوآبادیت اور رجعت کی۔"

ناوابستگی کی تحریک کو سوویٹ یونین کی مقرر کردہ راہ سے ہٹانے کے سلسلے میں سوویٹ یونین کو مغربی ممالک سے تو شکوہ ہے ہی لیکن سب سے زیادہ شکایت اسے چین سے ہے جو اس تحریک کو اینٹی سوویٹ پالیسی کے فروغ کا وسیلہ بنا رہا ہے۔ ایک سوویٹ ترجمان کے لفظوں میں "پیکنگ کے لیڈر دو برتر طاقتوں کی بدنام تھیوری کا ڈھنڈورا پیٹ کر ناوابستہ ممالک کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے پرامن اور آزادانہ وجود کو اصل خطرہ سوویٹ یونین سے ہے۔"

پانچویں چوٹی کانفرنس کے بارے میں چینی روزنامے "پیپلز ڈیلی" میں جو اداریہ شائع ہوا ہے اس میں یہ تو نہیں کہا گیا کہ ناوابستہ ممالک کو صرف سوویٹ یونین ہی سے خطرہ ہے لیکن کانفرنس کا ان لفظوں میں خیر مقدم ضرور کیا گیا ہے کہ اس نے سامراج، نوآبادیت اور بالادستی کے خلاف ناوابستہ ممالک کے جہاد کی روش کو قائم رکھا ہے، اپنی وحدت کو برقرار رکھا ہے اور یہ کانفرنس تیسری دنیا کے ان عزائم کی آئینہ دار ہے کہ وہ ریاستی خودمختاری اور قومی آزادی کا دفاع کرے گی اور بیرونی مداخلت اور جارحیت کا مقابلہ کرے گی۔

کانفرنس کا مجموعی رویہ یہی تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے بھی خط امتیاز طاقتور ممالک اور دوسرے ممالک کے درمیان ہی کھینچا۔ کانفرنس کے میزبان ملک شری لنکا کی وزیر اعظم مسز بندرانائکے نے اپنے ایک بیان میں ناوابستہ ممالک کو متنبہ کیا کہ وہ طاقتور دھڑوں کی مبینہ ہمدردی سے ہوشیار رہیں۔ ہندوستان کا موقف شروع ہی سے یہ رہا ہے اور اس پر وہ اس کانفرنس میں بھی قائم رہا کہ ناوابستگی کی تحریک کو صحیح معنوں میں ناوابستگی کی تحریک ہونا چاہیے۔ جون میں الجیریا میں رابطہ بیورو کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں ہندوستان کے وزیر خارجہ شری وائی۔ بی۔ چوان نے کہا تھا "بلاکوں سے ناوابستگی، ناوابستگی کی تحریک کی سالمیت کے لیے ناگزیر ہے۔"

سوویٹ روس اور اس کے حلیف ممالک کی روش تو یوگوسلاویہ تک کو پسند نہیں۔ مثال کے طور پر ۱۲ اگست کو ریڈیو زاگریب نے اپنے ایک نشریے میں کہا تھا کہ وارسا پیکٹ کے ممالک ناوابستگی کی تحریک کو اس لیے تو پسند کرتے ہیں کہ وہ سامراج دشمن ہے لیکن اس تحریک کا یہ پہلو انھیں پسند نہیں کہ یہ "بلاکوں کی بھی دشمن ہے اور بڑی طاقتوں کی بالادستی کی بھی۔"

کانفرنس کی کارروائی کو پڑھ کر کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ناوابستہ ممالک مجموعی طور پر کسی بلاک

سے خود کو وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں اور ظاہر ہے کہ کسی بلاک سے وابستگی کے بعد ناوابستگی باقی رہتی ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کانفرنس نے اقتصادی مطالبے زیادہ تر مغربی ممالک سے ہی کیے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مطالبوں کی تکمیل مغرب کے ترقی یافتہ ملک ہی کر سکتے ہیں۔ سوویٹ یونین سے یہ مطالبے کس بنیاد پر کیے جاتے جبکہ ٹیکنالوجی کے معاملے میں وہ خود بھی مغربی ممالک کے در کا سوالی ہے۔

سوویٹ یونین کو کانفرنس سے پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ تیسری دنیا اور ناوابستہ ممالک اس کی گرفت سے نکلتے جارہے ہیں یہ اور بات ہے کہ اس کا الزام وہ سامراجیوں کے سر ڈالتا تھا۔ ۲۹ جون ۱۹۷۶ء کو ریڈیو پیس اینڈ پروگریس نے اپنے ایک نشریے میں کہا تھا کہ "سامراجی طاقتیں ناوابستگی کی تحریک کی تخریب کی مسلسل کوششیں کر رہی ہیں اور اسے اس کے قدرتی حلیف سوویٹ روس سے الگ کرنے میں کوشاں ہیں۔ وہ اس نظریے کو فروغ دے رہی ہیں کہ تمام ممالک امیر اور غریب ممالک میں تقسیم ہیں۔ اس کے پیچھے یہ غلط نظریہ ہے کہ سامراجی ریاستیں اور سوشلسٹ ممالک ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔"

بہر حال روس مغربی ممالک پر کتنا ہی الزام لگائے اور ناوابستہ ممالک کے خلاف کتنی ہی برہمی کا اظہار کرے، اس حقیقت کو چھپانا اس کے بس میں نہیں کہ روسی سلطنت کی کُل آبادی میں روسی صرف ۴۳ فیصدی ہیں۔ باقی آبادی اور خطوں پر اس کے تسلط کو سامراج ہی کہا جائے گا اس صورت میں ناوابستہ ممالک اس معاملے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ وہ دونوں ہی سامراجیوں سے خبردار رہیں۔ ▲▲

فلاحی ریاست، کمیونزم اور تشدّد

گوپال متل

کمیونسٹ پارٹی کے محاذی ادارے انجمن ترقی پسند مصنفین[1] میں بالعموم دو قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جنھیں کمیونسٹ پارٹی اس محاذی ادارے کی تنظیم پر مامور کرتی ہے۔ دوسرے وہ جن کے بارے میں اکبر کہہ گئے ہیں؛

گو گردِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

یہ ایرے غیرے نتھو خیرے، جن کا ادب میں اپنا کوئی مقام نہیں ہوتا اس امید میں کمیونسٹوں کی غوغا آرائی میں شریک ہو جاتے ہیں کہ اس بنا پر انھیں تھوڑی بہت شہرت مل جائے گی۔

لیکن ایک تیسری قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کمیونسٹ نہ ہونے اور سماجی طور پر ممتاز ہونے کے باوجود مروّت کے نام پر اس انجمن کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ انجمن کی پہلی کانفرنس میں ڈاکٹر ٹیگور اور منشی پریم چند کو کمیونزم سے برملا اعلانِ بیزاری کے باوجود مروّت کے نام پر ہی کانفرنس کی سرپرستی پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ مطلب برآری کے لیے کمیونسٹوں کی نظرِ انتخاب جناب حیات اللہ انصاری اور جناب آنند نرائن ملّا ممبر پارلیمنٹ پر پڑی۔ ان دونوں حضرات کی شرکت سے کمیونسٹوں نے انجمن کو ذی وقار ثابت کرنے کے لیے فائدہ تو اٹھا لیا لیکن جو کچھ ان حضرات نے وہاں کہا اس پر وہ کافی برہم ہیں۔

جناب حیات اللہ انصاری نے بجا طور پر یہ سوال اٹھایا تھا کہ انجمن کے رہنما صرف کمیونسٹ پارٹی سے متعلق لوگ ہی کیوں ہوتے ہیں؟ اس پر ان کے خلاف مخصوص اعتراضات کو بار بار دہرانے" اور ماہنامہ "تحریک" کی ہمنوائی کا الزام لگایا جا رہا ہے۔

ملّا صاحب کی اس بات سے ترقی پسند خاص طور پر برہم ہیں کہ انھوں نے فلاحی ریاست اور سوشلسٹ ریاست میں امتیاز کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں میں جو فرق ہے "وہ تشدّد کا فرق ہے اور ہم تشدّد کا روادار نہیں۔"

اس کے جواب میں ملّا صاحب پر قانونی موشگافیوں کا الزام تو لگنا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ان کی سیاسی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے انھیں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ کمیونسٹوں نے جہاں کہیں بھی تشدّد کا استعمال کیا ہے وہ جاگیرداروں کے تشدّد کے جواب میں تھا۔ حالانکہ کمیونسٹ تحریک سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے تشدّد کمیونسٹوں کا بنیادی عقیدہ ہے اور اس کا استعمال وہ صرف ناگزیر حالات میں نہیں کیا کرتے۔

دنیا کا پہلا کمیونسٹ انقلاب روس میں لینن کی رہنمائی میں ہوا اور لینن نے جس حکومت کا تختہ اُلٹا وہ زار کی حکومت نہیں، ایک سوشلسٹ حکومت تھی۔ لینن کے حکومت پر شبخون کے ذریعے قبضہ کرنے کے بعد وہاں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے تھے جو روس کی تاریخ کے اوّلین آزادانہ انتخاب تھے۔ اس انتخاب میں روسی عوام نے لینن کی انتہا پسندی اور جاگیردارانہ رجعت پسندی دونوں کو مسترد کر دیا تھا اور معتدل سوشلزم کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ تین کروڑ ساٹھ لاکھ ووٹ دینے والے ووٹروں میں

---

[1] اس بات کا اعتراف کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک محاذی ادارہ ہے، انڈین کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹیو کمیٹی کے سینیئر رکن مصنفین کر چکے ہیں۔ اس کے بعد جھوٹ بھیوں کے تردیدی بیانات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

سے کمیونسٹ امیدواروں کے حق میں صرف نوّے لاکھ نے ووٹ دیا تھا اور تقریباً دو کروڑ دس لاکھ یعنی کل ووٹوں کی ۵۸ فیصد تعداد نے سوشلسٹ انقلابی پارٹی کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اسمبلی کے کل سات سو نمائندوں میں سے تین سو ستّر نمائندے اسی پارٹی کے منتخب ہوئے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے واضح اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ رجعت پسند کیڈٹ نمائندے اس اسمبلی میں صرف ۱۷ تھے۔ اگر لینن کے حملے کا ہدف رجعت پسند ہی ہوتے تو جبر کے استعمال کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ تو انتخاب میں برملا شکست کھا چکے تھے۔

آئین ساز اسمبلی کے حق میں روسی عوام کا جوش و خروش بھی کچھ کم نہیں تھا۔ آئین ساز اسمبلی کے دفاع کی لیگ کو انقلابی سوشلسٹوں اور منشویکوں نے منظم کیا تھا۔ اس لیگ کا مقصد یہ تھا کہ اسمبلی کے افتتاح کا خیر مقدم ایک پُرامن جلوس نکال کر کیا جائے یہ جلوس ۱۸ جنوری کی صبح کو تقریباً ۱۱ بجے نکلا۔ غیر مسلح مزدوروں کے ہجوم جو شہر کے مختلف حصّوں سے نکلے انھوں نے سرخ جھنڈے اور موٹو اٹھائے ہوئے تھے جن پر اس قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے "تمام ملکوں کے پرولتاریو متحد ہو جاؤ"۔ "زمین اور آزادی" "آئین ساز اسمبلی زندہ باد" یہ ہجوم جب مارس میدان پہنچا تو کسانوں کی سوویٹ ایگزیکٹیو کے ممبر بھی ان میں شامل ہو گئے لیکن جب مزدوروں اور کسانوں کا یہ جلوس ٹاریڈے محل (جہاں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا) کو جانے والی سڑک پر مڑا تو یکایک اس پر بولشویکوں نے رائفلوں اور مشین گنوں سے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ آئین ساز اسمبلی کی طرف جانے والی تمام سڑکوں پر چیدہ چیدہ بولشویک یونٹوں کا پہرہ تھا جنھیں یہ حکم تھا: "گولی چلانے سے قطعی گریز نہ کرنا"۔ اس روز پیٹرو گراڈ کے شہر میں ایک سو مرد اور عورتیں ہلاک اور زخمی ہوئے۔

لینن نے ہر قسم کے انتظامات کر رکھے تھے۔ اس نے لیباری نشانہ بازوں کے ایک دستے کو پیٹرو گراڈ بلا لیا تھا۔ اسے علم تھا کہ ان فوجیوں کو روسی عوام کے ساتھ کوئی خاص جذباتی وابستگی نہیں اور جو احکام انھیں دیے جائیں گے وہ ان کی اندھا دھند پیروی کریں گے۔

اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو لینن نے اپنے چہرے پر عیّارانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "چونکہ ہم اس حماقت کے واقعی مجرم ہیں کہ ہم نے اسمبلی کو طلب کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے، اس لیے آج اس کا اجلاس شروع کرنا ہی پڑے گا لیکن اس کے خاتمے کا وقت کیا ہوگا اس بارے میں تاریخ ابھی خاموش ہے"۔

ٹاریڈے محل عجیب و غریب نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اسمبلی کا کمرہ سپاہیوں اور فوجی ملاحوں سے بھرا ہوا تھا جن کے پاس بے تحاشہ ہتھیار تھے۔ ہر دروازے پر رائفلوں اور دستی بموں سے مسلح سُرخ محافظ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پبلک گیلریوں میں بھی زیادہ تر بولشویک تنخواہیئے ہی نظر آ رہے تھے لیکن اسمبلی کا اجلاس پھر بھی شروع ہوا۔

رواج کے مطابق اس کا افتتاح اسمبلی کے معمر ترین نمائندے نے کیا۔ یہ فریضہ انقلابی صفوں کے معمر ترین رکن موئنزوف نے انجام دیا جو "عزم عوام" کے دور سے اس وقت تک عوامی تحریک سے وابستہ رہا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر پہنچا تو بولشویک نمائندوں نے اپنی ڈیسکوں کو بجانا شروع کر دیا۔ گیلری میں ایک کمیونسٹ سپاہی نے اپنی رائفل موئنزوف کی طرف تان دی۔

سوشلسٹ انقلابی پارٹی کا لیڈر وکٹر چرنوف بھاری کثرت رائے سے اسمبلی کا چیرمین منتخب ہو گیا وہ اپنی تقریر بولشویکوں کی مسلسل رخنہ اندازی کے ماحول ہی میں جاری کر سکا۔ بولشویک نمائندے سکوورتسوف نے سوشلسٹ انقلابیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے درمیان ہر چیز کا فیصلہ ہو چکا ہے"۔ تسوف اور دوسرے بولشویک نمائندوں کی تقریروں کو سوشلسٹ نمائندوں نے خاموشی سے سُنا اور جب انھوں نے دشنام طرازی کی جب بھی ان کی تقریروں میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی

لیکن جب لسرٹیلی ان کا جواب دینے کے لیے کھڑا ہوا تو اس کے سر کی طرف رائفلوں کا رُخ کر دیا گیا اور فوجی ملاح اس کے چہرے کے سامنے پستول لہرانے لگے اور جب چیرمین نے نظم ضبط قائم کرنے کی اپیل کی تو شور وشر، سیٹیوں اور گندی گالیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

دوسرے دن جب اسمبلی کا اجلاس از سرِ نو شروع ہونا تھا تو نمائندوں نے دیکھا کہ ٹارئیڈے محل کے دروازے پر فوجی بندوقیں اور مشین گنیں لیے بیٹھے ہیں اور اندر جانے کا راستہ مسدود ہے۔ ان کے پاس میدانِ جنگ میں استعمال ہونے والی دو توپیں بھی تھیں۔ اسی دن ۱۹ جنوری ۱۹۱۸ء کو کمیونسٹوں نے ایک حکم کے ذریعے اسمبلی کو ختم کر دیا۔ جن اخباروں نے ۱۸ جنوری کے اجلاس کی خبر شائع کی تھی انھیں بولشویکوں نے دکانوں اور اخبار فروشوں سے چھین کر جلا ڈالا۔

اب روس میں ڈکٹیٹر شپ کے لیے راستہ ہموار تھا۔ کمیونسٹ اور ان کے ہمسفر اس ڈکٹیٹر شپ کو پرولتاری ڈکٹیٹر شپ[۶] کا نام دیتے ہیں لیکن لینن نے اسے "ڈکٹیٹر شپ اور صرف ڈکٹیٹر شپ" کا نام دیا تھا۔ اس کی توضیح کے مطابق اس ڈکٹیٹر شپ کو ایک ایسا "لامحدود اور مکمل اقتدار حاصل ہونا چاہیے جس کی راہ میں قانون اور ضابطہ حائل نہ ہو سکے اور جس کی بنیاد براہِ راست طاقت پر ہو۔"[۶]

یہ صرف نظریاتی موشگافی نہیں تھی۔ لینن جو کہتا تھا وہ کرتا بھی تھا۔ ٹراٹسکی کا کہنا ہے کہ لبرل اور سوشلسٹ اخباروں پر پابندی لگانے کے خلاف جب بھی کوئی بات کہی جاتی لینن پکار اٹھتا:

"کیا ان غنڈوں کے منہ میں لگام نہیں دی جا سکتی؟ مجھے بتاؤ کہ آخر یہ کس قسم کی ڈکٹیٹر شپ ہے؟"

جن غنڈوں کے منہ میں لگام لگا دی گئی ان میں میکسم گورکی بھی شامل تھا۔ اس کے اخبار "نودیا زیزن" پر ایک "ناموافق" خبر شائع کرنے کے جرم میں پچیس ہزار روبل جرمانہ کیا گیا اور بعد میں اُسے بالکل ہی بند کر دیا گیا۔ گورکی نے لینن کے ساتھ صلح کر لی تب بھی اسے اپنا اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

علی سردار جعفری نے کانفرنس میں مایاکوسکی کا نام بڑے طمطراق سے لیا تھا لیکن یا تو بر بنائے لاعلمی یا بر بنائے عیاری انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ مایاکوسکی نے کمیونسٹ جبر سے تنگ آ کر خودکشی کی تھی۔ لینن مایاکوسکی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ فروری ۱۹۱۹ء میں ایک موقع پر اسے ایک ایکٹریس مایاکوسکی کی نظمیں سنانے بیٹھ گئی۔ اس ایکٹریس نے اپنی یادداشتوں میں بس اتنا لکھا ہے کہ لینن اُسے ٹوک کر کہنے لگے کہ وہ پشکن کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن بونچ برویوچ (جو بڑے پرانے بولشویک تھے) کے بیان کے مطابق کنسرٹ کے بعد لینن ان کے سامنے جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑا تھا اور مایاکوسکی کی نظموں کے لیے "خرافات" اور "شرمناک" جیسے لفظ استعمال کیے تھے۔ پھر بعد میں اس نے جدید تر شاعروں کو ان الفاظ سے نوازا تھا: "مسخرے، جو انقلاب کو دل لگی کا کھیل بنا رہے ہیں"۔ اسی طرح جب لوناچرسکی (جو "نئے فنون" کا قدردان تھا) نے مایاکوسکی کی کتاب "پندرہ کروڑ" پانچ ہزار کی تعداد میں چھاپی تو لینن نے لکھا "یہ خرافات ہے، مسخراپن، ریاکاری اور نمائش پسندی ہے۔ ایسی مستقبل پسندی کی بنا پر لوناچرسکی کے کوڑے لگنے چاہئیں"۔

جمہوری سوشلسٹ اگر چاہتے تو لینن کے خلاف بروقت کارروائی کر کے اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو انجام بد سے بچا سکتے تھے اور یہ کچھ دشوار بھی نہیں تھا۔ لینن روس کے دشمن ملک جرمنی کی مہیا کردہ بند گاڑی میں سفر کر کے روس پہنچا تھا۔ اس قسم کے شواہد بھی موجود ہیں کہ لینن کو جرمنی سے مالی مدد ملی تھی اور کئی حلقوں کی طرف سے لینن کے خلاف جرمن ایجنٹ ہونے کا نعرہ بلند ہو رہا تھا لیکن پریم

---

[۶] "ریاست اور پرولتاری ڈکٹیٹر شپ" (۱۹۲۰ء) مجموعی تحریریں، جلد ہفتم صفحہ ۲۵۴، انٹرنیشنل پبلشرز، نیویارک ۱۹۴۳ء

تکمیل کا سال

دلی کی نمایاں کامیابیاں

قیمتوں میں کمی :- بڑھتی ہوئی قیمتوں میں کمی آئی۔ شرح مہنگائی صفر کے نشان سے بھی نیچے آگئی۔ اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا مثالی نظام لاگو۔ شہری اور دیہی علاقوں میں ۲۵۳ کوآپریٹیوں اور ۱۲ ہزار سستے داموں والی دکانوں کے توسط سے سستے کپڑے کی فروخت۔

بے گھر لوگوں کے لیے گھر۔ بے زمین لوگوں کے لیے زمین :- ۱۴۱۳۶ ایکڑ زرعی زمین ۴۵۲۸ ہریجن اور غریب بے زمین گھرانوں میں تقسیم۔ ۸۰۰۰ رہائشی پلاٹ غریب اور بے گھر ہریجنوں میں تقسیم۔ ہریجنوں کو مکان بنانے کے لیے ۱۸ لاکھ روپے کی مالی امداد۔

اپرنٹس شپ اسکیم : مقررہ نشانہ ۳۵۰۰ کے مقابلے میں ۳۵۲۵ نوجوانوں کو مختلف صنعتوں میں بطور اپرنٹس لگایا گیا۔

سماج دشمنوں کے پاؤں اکھڑ گئے :- بدعنوان بیوپاریوں کے خلاف ۲۲۵۹ چھاپے۔ ٹیکس چوری کے ۱۶ کروڑ روپے کے خفیہ بیوپاری سودوں کا پتہ لگایا گیا۔ جمع خوروں، ذخیرہ اندوزوں، منافع خوروں وغیرہ کے خلاف ۱۴ ہزار چھاپے مارے گئے۔

طلبہ کو راحت : ۸۵۳ اسکولوں میں کتاب بنک قائم۔ پنسل، کاپیاں وغیرہ سستے داموں پر مہیا۔ طلبہ ہوسٹلوں میں سستا کھانا دستیاب۔ اسکولوں میں ۱۲ نکاتی سدھار پروگرام پر عمل۔ پرائمری اسکولوں کے تمام بچوں کو مفت درسی کتابیں۔ غریب طلبہ کو اسکول کی وردیاں مفت دینے کی اسکیم پر ۸ لاکھ روپے خرچ۔

پیداوار میں اضافہ :- ۶۰۰ صنعتی شیڈوں کی تعمیر۔ چھوٹے چھوٹے صنعتی یونٹوں کو ۳ء۵ کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کیے گئے۔ سبزی کی کاشت کا رقبہ ۱۶ء۲۰ ہزار ہیکٹر (۱۹۷۲ء) سے بڑھ کر ۱۹ء۲۷ ہزار ہیکٹر (۱۹۷۶ء)۔ کثیر مقاصد والی فصلوں کے کاشت کے رقبہ میں اضافہ۔ حاشیائی کسان و مزدور ترقیات ایجنسی کے توسط سے غریب کسانوں کو بھرپور امداد۔

صاف و خوبصورت دلی :- شہری علاقے میں صاف ستھرا ماحول۔ علاقہ جامع مسجد کی نئی ترقی۔ سبزی منڈی کی آزاد پور میں منتقلی۔ ۲۰۰ منظور شدہ صنعتوں کی منظور شدہ علاقے میں منتقلی۔ ۵۰ ہزار پلاٹوں اور عام سہولتوں کے ساتھ ۲۰ نئی کالونیوں کی نو آبادکاری۔ غریب اور کمزور طبقے کے لوگوں کے لیے بہتر زندگی اور روزگار کے نئے مواقع۔ دلی کو سرسبز اور شاداب بنانے کے لیے ڈھائی لاکھ پودے محکمۂ ترقیات اور ایک لاکھ پودے اسکولوں کے ذریعے لگائے جائیں گے۔

دیہی ترقی :- ۵۰ دیہات میں صفائی۔ نشہ بندی اور خاندانی منصوبہ بندی کا وسیع پروگرام ۷۷-۱۹۷۶ء سال کے پہلے تین مہینوں میں ہی لاگو۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے آخر تک دلی کے سبھی گاؤں میں اس پروگرام کی توسیع۔

دلی خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں پر عمل آمد میں سب سے آگے :- افزائش نسل والے عمر گروپ کے ۴۱ء۳ فیصد جوڑوں نے مانع حمل چیزوں کا استعمال کرکے ملک بھر میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے جبکہ پورے ملک میں اس کا اوسط ۱۶ء۱ فیصد ہی ہے۔

ہم پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی کی فعال قیادت میں شاہراہِ ترقی پر
آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔

آیئے! ہم اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھول کر دلیش کی راجدھانی ۔۔ دلی کی شان بڑھانے کے لیے مل جل کر کام کریں۔

جاری کردہ :- محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی۔

کرشن موہن | غزل

چلے ریڈیو دُوردرشن کے سنگ   عجب ہے ترے گھر کی عشرت کا رنگ
جوانی، روانی، شریر اور شنگ   غمِ عشق آوارگی کی ترنگ
لگا جب سے دل پر نظر کا خدنگ   کٹی ہے مری تمکنت کی پتنگ
مسلط ہوئی تن پہ شامِ شباب   مگر پھن اٹھائے ہوئے ہے امنگ
ہوس نے مٹا کر ہی چھوڑا ہمیں   حقیقت میں ہے کام، کامِ نہنگ
ملن رین پچھلا ہے، بے چین ہے   رسیلا، چھبیلا، ترا انگ انگ
بزرگوں کی مستی کے سادھن تھے یہ   پئیں نوجواں اب چرس اور بھنگ
شکستوں کے طومار و انبار سے   بنی ہے مری زندگی عذرِ لنگ
ڈراتی رہی ہے مجھے لوک لاج   ستاتے رہے ہیں مجھے نام و ننگ
تری یاد کی راکھ کا ڈھیر ہوں   مجھے ڈس گیا ہے برہ کا بھجنگ
محبت کا آئینہ ہے روٹھنا   نرالے ہیں اِس جنگ کے رنگ ڈھنگ
ہوئے دم بخود مہر و ماہ و نجوم   بشر نے لگائی ہے ایسی شلنگ
اپج میں نہیں اب وہ پہلی سی دھج   لگا ہو مرے ذہن کو جیسے زنگ
نہ سوجھا مجھے کوئی شعرِ لطیف   تو ہونے لگا قافیہ میرا تنگ
تری سرد مہری شبِ سرد میں   نہ رہ جائے بن کر کہیں سرد جنگ
منور ہوا دل تری یاد سے   جو گزری ہے گاڑی تو چمکی سرنگ

یہ ہے کرشن موہن انوکھا چلن
ہوس بن گئی ہے فقیرِ ملنگ

نئی دہلی ——— پنڈارا روڈ ——— B-124

غزلیں

عادل منصوری

لب تراشیدہ فغاں بھی ممکن
ریت تحریر بیاں بھی ممکن

اوس کی بوند گرے سورج سے
اور سمندر سے دھواں بھی ممکن

تہہ در تہہ خلا، خالی ذات
درمیاں بند مکاں بھی ممکن

ہو منقش جو ہوا کی دیوار
پیٹھ پانی پہ نشاں بھی ممکن

زندگی موت کی محرومی ہیں
سود در سود زیاں بھی ممکن

فاصلے راہ میں راہب رخنہ
جو وہاں ہے وہ یہاں بھی ممکن

شہر کا چہرہ کبھو دیکھ بھی لے
زندہ کہ مردہ لہو دیکھ بھی لے

اب کہاں چاک گریباں والے
ہاں مگر دل کا رفو دیکھ بھی لے

بندگی پر نہیں موقوف مفر
سر اٹھا جام و سبو دیکھ بھی لے

چاہتے ہیں تجھے احباب بہت
ایک دن بن کے عدو دیکھ بھی لے

لفظ کی تہہ میں چھپا ہے کیا کیا
لفظ کو توڑ کے تو دیکھ بھی لے

مدحت الاختر

بہت عجیب ہے دنیا کسی کو کیا کہیے
بس اپنے آپ کو ہر رنگ میں برا کہیے

ملاؤں غیر کی آواز میں صدا اپنی
یہی نوا ہے اگر، مجھ کو بے نوا کہیے

ہزار رنگ ہیں ہر رنگ کے تعاقب میں
ہر ایک چہرے کو چہروں کا سلسلہ کہیے

ہوس کے کھیل میں بیٹھے ہیں ہار کر بازی
نہیں یہ ضد کہ ہمیں عشق آشنا کہیے

ملے جلے بھی رہے اور جدا بھی تھے سب سے
اسی ادا کو ہنر اپنی ذات کا کہیے

○ B/43 - شمع برہان سوسائٹی، سرخیز روڈ، احمد آباد ۳۸۰۰۵۱
○ استاد شعبۂ اردو فارسی ناگپور مہاودیالیہ ناگپور

محمور سعیدی | نظاروں سے آگے!

وہاں کیا ہے ؟ ان دھندلے دھندلے حصاروں سے آگے ؟
دھوئیں کی طرح لمحہ لمحہ بکھرتے نظاروں سے آگے ؟
وہاں کیا ہے ؟ کیا وہ انوکھا تماشا وہاں ہو رہا ہے ؟
جو بے نور آنکھوں کو بینائی دے گا ؟
وہاں کیا ہے ؟ کیا وہ طلسمی صدائیں وہاں گا رہی ہیں ؟
سماعت سے محروم کانوں میں جو اپنے گیتوں کا رس گھول دیں گی ؟
وہاں کیا ہے ؟ شہد و شکر کی وہ نہریں، وہ نادیدہ نہریں وہاں بہہ رہی ہیں ؟
کہ بے ذائقہ اور بے حس لبوں کو، چھلکتی ہوئی لذتوں کی جو سوغات دیں گی ؟
وہاں کیا ہے ؟ کیا وہ ہوائیں، فسوں گر ہوائیں وہاں رقص میں ہیں ؟
جو پتھر بدن کو جواں لمس کی نرمیوں سے شناسا کریں گی ؟
وہاں کیا ہے ؟ کیا وہ پُر اسرار مٹی مہک دے رہی ہے ؟
جو چاروں طرف سے ...
گنہ گار قدموں کو اپنی طرف کھینچتی ہے ؟!

سبھی اس طرف کیوں بڑھے جا رہے ہیں ؟
یہ کیسی ڈگر ہے ؟
جو گزری ہوئی زندگی کی طرح پُر کشش،
آنے والے دنوں کی طرح پُر خطر ہے !

۳۲۰۷ — پھاٹک تیلیان — ترکمان گیٹ — نئی دہلی ۲ — ۱۱۰۰۰۲

زاہدہ زیدی

وجدان

اُداس کیوں ہو
قریب آؤ۔
عمیق تاریکیوں میں اترو
نفس کی آواز کو
نقشِ پا بناؤ
یہ پیچ در پیچ اک سفر ہے
یہاں کوئی راستہ نہیں ہے
یہاں کوئی رہنما نہیں ہے،
بڑھو ——
مگر نہ عجلت سے کام لو اب
نہ خوف کھاؤ ——
ہراس کی وادیوں سے گزرو
فضائے پرہول سے نظر ملاؤ ——
بسیط پنہائیوں کے آوارہ پن کو دیکھو
ہوا کے دوش پر اڑو
اپنا بارِ گراں گراؤ ——

لپکتے شعلوں سے گزرو
بنجر زمیں پہ
زخموں کے گل کھلاؤ۔

وہ دیکھو
پردوں سے چھن رہی ہیں شعاعیں

شاید کہ عقب پردہ ہے
اک منظرِ تجلی
جو ہو سکے تو پردہ کوئی اٹھاؤ

سنو ——
فضاؤں میں یہ ارتعاش کیسا ہے
شاید سکوت کا ساز بج رہا ہے۔
بڑھو ——
ترنم کی موج پر بڑھو ——
لرزتی خاموشیوں کے ساگر میں
ڈوب جاؤ ——
یہ بحرِ بیکراں
جس کے ایک قطرے میں
کل کائنات موجزن ہے
لاکھ صدیاں اُبل رہی ہیں ——
یہی وہ لمحہ کہ جو ازل ہے
یہی وہ لمحہ کہ جو ابد ہے

۲۲۔ ذاکر باغ۔ علی گڑھ		مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ٹوٹا ہوا پل

م۔ق۔ خان

"تم لوٹ آئے، یونہی خالی ہاتھ؟ شہر نہیں گئے؟" حیرت سے پھٹی پھٹی دو آنکھیں اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"ندی کا پل ٹوٹ گیا ہے۔" اس نے مریل سی آواز میں کہا۔

"کیا کوئی ناؤ نہیں تھی؟"

"میں آدھے گھنٹے تک کنارے کشتی کا انتظار کرتا رہا ـــــ ندی کی لہریں آپس میں دست و گریباں تھیں وقفے وقفے سے میں محسوس کرتا کہ یہ جست لگا کر مجھے اپنی گرفت میں لے لیں گی اور ساتھ بہا لے جائیں گی۔ جس طرح بلی اپنے شکار پر جھپٹتی ہے اسی طرح لہریں کناروں پر اچھل آتی تھیں ـــــ ایک عجیب دہشت پوری فضا پر مسلط تھی۔"

"تعجب ہے ایک بھی ناؤ نہیں آئی!" حیرت زدہ آنکھیں پھر گویا ہوئیں۔

"میں واپسی کا ارادہ کر رہا تھا کہ دور سے ایک ناؤ آتی نظر آئی" اتنا کہہ کر وہ رک گیا جیسے اس کے حلق میں کوئی شے اٹک کر رہ گئی ہو۔

وہ اپنی جیب کی تلاشی لینے لگا۔ پھر اپنے کندھے ٹٹولے لیکن اس کا ہاتھ کچھ نہ تلاش کر سکا۔ وہ متوحش اور مضطرب تھا۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ اس نے خوف و دہشت کے عفریت سے چھٹکارا پانے کے لیے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اس کی بے چین نگاہیں خلا میں آوارہ تھیں باہر ہر شے کو تاریکی کے غلاف نے ڈھانک لیا تھا بس کہیں کہیں سیاہ دیو جیسے درختوں کی اوپری ٹہنیوں پر بیٹھے کوؤں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

"باہر کیا دیکھ رہے ہو؟ تم کہہ رہے تھے کہ ایک کشتی دور سے ......!"

"ٹھیک، ٹھیک! میں نے ملاح کو اپنی طرف بلایا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ دی اور مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرنے لگا۔"

"اس نے جواب میں دو لفظ تک نہیں کہے؟"

"وہ معذور تھا ـــــ اس کی زبان کٹی ہوئی تھی ـــــ" اس نے پھر باہر دیکھنا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کے سائے لہرا رہے تھے۔ اب تاریکی اور گہری ہو گئی تھی۔ چاروں طرف پر ہول سناٹا تھا۔

"اس کی زبان......؟"

"ہاں، اس کی زبان کٹی ہوئی تھی لیکن اس کے چہرے سے یہ بات مترشح تھی کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے ـــــ جب کشتی میرے قریب سے گزر گئی تو اچانک میری نظر اس کے اندر رکھے دو تابوتوں پر پڑی جو سفید چادر سے ڈھکے تھے ـــ۔" وہ اتنا کہہ کر پھر خاموش اور بے تعلق ہو گیا جیسے وہاں اب کوئی موجود نہ ہو اور وہ اکیلا کسی ویرانے میں کھڑا ہو۔

"پھر کوئی دوسری ناؤ آئی ہی نہیں؟"

"آئی...... میں ابھی اس کشتی کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ملاح کے گیت نے میرا دھیان توڑا۔ دوسری کشتی مرتے ہوئے سانپ کی طرح پانی پر لوٹ کھاتی ہوئی اس طرح آئی جیسے وہ پہلی کشتی کا تعاقب کر رہی ہو۔ میں پوری طاقت سے چلایا۔

ہاتھ سے بھی اشارہ کرتا رہا۔ دوسرے ہی لمحے کشتی کنارے آلگی۔ میں اس کی جانب بڑھا تھا کہ میری نظر ملاح کے چہرے پر گئی۔ وہ اندھا تھا ــــــ اس کی آنکھوں کے حلقے شکستہ مٹی کی قبر کی طرح دھنسے ہوئے تھے ان سے لہو کی دھار بہہ رہی تھی۔ وہ چپو اس طرح پانی میں ڈال رہا تھا جیسے کہ ندی کی سطح کھودنے کے لیے پھاوڑے مار رہا ہو۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنا قدم روک دیا ــــــ دوسرے ہی لمحے کشتی نے مچھلی کی طرح جست لگائی اور بیچ ندی میں چلی گئی۔ ندی کے دوسرے کنارے سے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اس کی جانب بڑھے ــــــ جیسے ہی وہ لوگ کنارے کے قریب پہنچے کشتی کنارے پر جا لگی جیسے ان میں مقناطیسی کشش ہو! انھوں نے ایک تابوت اس ناؤ میں رکھا اور پھر قریب کی جھاڑیوں میں روپوش ہو گئے ــــــ ناؤ پھر سطح آب کا سینہ چیرتی رواں ہو گئی۔"

"تب تو سچ مچ تم خوفزدہ ہو گئے ہو گے ــــــ!"

"میں کنارے سے ہٹ کر واپس لوٹنا چاہ رہا تھا کہ کچھ لوگ کئی ٹولیوں میں میری جانب آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ بھی اپنے کندھوں پر تابوت لیے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا تحیر و خوف نقطۂ عروج پر تھا کہ ان لوگوں نے تابوتوں کو ندی میں اُچھال دیا اور میری جانب دوڑ پڑے۔ میں سراسیمہ پہلے تو فیصلہ ہی نہیں کر پایا کہ کیا کروں لیکن غیر ارادی طور پر ہی میں بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے ہیں اور زمین کے اندر دھنسے جا رہے ہیں لیکن میں بھاگتا رہا ــــــ ایک گڈھا راستے میں آگیا اور میں اس میں لڑھک گیا۔ میں متواتر ان کے قدموں کی چاپ سنتا رہا ــــــ لیکن کوئی قریب نہ آیا ــــــ جب کافی دیر ہو گئی تو میں ڈرتا ہوا باہر نکلا۔ دُور دُور تک کہیں کسی متنفس کا پتا نہیں تھا۔ اب سورج درختوں کی اوٹ میں ڈوب رہا تھا اور پھر آگ کا یہ گولا فوراً ہی روپوش ہو گیا۔ سرخ بادلوں کے ٹکڑے زخمی پرندوں کی طرح خونیں اُفق پر منڈلا رہے تھے ــــــ!"

"ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ یہ سب کیا تھا؟" متجسس آنکھوں نے سوال کیا۔

ابھی اس نے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ ایک شخص روتا، کانپتا آیا اور اس کے قدموں پر گر کر گڑگڑانے لگا "میں لٹ گیا، میں برباد ہو گیا، مجھے بچالو"

"اوفوہ! ہوا کیا، کچھ کہو بھی تو ــــــ"

"پہلے ــــــ ہاں پہلے ہی ہوا ــــــ میری گھوڑی کی اگلی ٹانگ ٹوٹ گئی"۔

"تم ہمیشہ زیادہ بوجھ لاد دیتے تھے۔ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی"۔

"نہیں، گھوڑی تو خالی گاڑی میں کھڑی تھی ــــــ ایک بار ہنہنائی اور گر گئی۔ میں گیا تو دیکھا اگلی ٹانگ ٹوٹ کر جھول رہی تھی ــــــ میں بھاگا بھاگا گھر میں داخل ہوا تو ایک اور خوفناک منظر سامنے تھا۔ میرے کمرے کا فرش خون کے لوتھڑوں سے بھرا ہوا تھا..... میری بیٹی ــ وہ اُمید سے تھی ...... یہ چوتھا مہینہ... میں ایک گھنٹہ پہلے ہی تو گھر سے نکلا تھا۔ تب وہ بالکل اچھی تھی اور اب بےہوش پڑی ہے۔ بھگوان کے لیے کچھ کیجیے ــــــ میں اُسے شہر لے جاتا لیکن ندی کا پُل ٹوٹ گیا ہے۔ آپ نے سنا نہیں؟"

"ہاں، ہاں، وہ تو میں خود دیکھ کر آرہا ہوں ــــــ"

وہ دیوار میں بنی الماری سے کچھ نکالنے کے لیے اس کے پٹ کھولنے لگا۔ پٹ آگے کی جانب بڑھے لیکن پھر اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی انجانی طاقت انہیں اندر سے کھینچ رہی ہے۔ وہ پسینے میں تر ہو گیا لیکن پٹ نہیں کھلے۔ پھر دونوں نے مل کر زور آزمائی کی ــــــ پٹ قبضے سے باہر نکل کر ان کے ہاتھ میں آگیا اور وہ دونوں فرش پر لڑھک گئے۔

الماری کے اندر ایک چوہے نے پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کا جسم دو حصوں میں کٹ گیا تھا۔ جسم سے کھال کیلے کے چھلکے کی طرح الگ ہو گئی تھی اور سفید گوشت کا لوتھڑا خون کے چند دھبوں کے ساتھ آدھا

الماری کے اندر اور آدھا الگ، ہوئے پیٹ کے ساتھ لیٹا ہوا تھا ___ ندی کا آدھا پل کھڑا تھا اور آدھا ندی کے پانی میں ہاتھی کی سونڈھ کی طرح لٹک رہا تھا۔

وہ اس طرح گھبرایا ہوا تھا کہ بالکل سامنے رکھی شیشی بھی اُسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال بہ مشکل تمام اس نے شیشی کو اُٹھایا اور کارک کھولا۔ شیشی اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔ سفید دوا کا رنگ خون کی طرح سُرخ تھا اور اس سے جلے ہوئے گوشت کی بو آ رہی تھی ___

وہ عجیب خوفناک رات تھی! ساری رات اسے طرح طرح کے بھیانک خواب آتے رہے۔ آدھی رات کے بعد ایک زبردست طوفان نے پورے قصبے کو اپنے نرغے میں لے لیا ___ زنّاٹے دار ہوا کے جھکڑ در و بام سے ٹکرا کر عجیب آواز پیدا کر رہے تھے۔ کبھی اُسے لگتا جیسے چھت سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ ندی کا ٹوٹا ہوا پل مہیب دیو کے دانتوں کی طرح اس کو اپنی گرفت میں لینا چاہ رہا ہے .... قیامت کی رات تھی۔ صبح وہ ابھی سویا ہوا ہی تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا کر جگا دیا،

"آج کیا ہونے والا ہے؟"

"کیا ہونے والا ہے؟" اس نے دہرایا

"دونوں میمنے جو باہر بندھے تھے رسیاں تڑا کر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے میرے دیکھتے دیکھتے انھوں نے ایک دوسرے کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔ دونوں میمنے نہیں وحشی و خونخوار درندے بن گئے تھے!"

وہ اُٹھ کر باہر آیا۔ اب سورج کافی اوپر آچکا تھا اور ایک سفید گول ٹکیہ کی طرح ابر آلود آسمان پر نظر آ رہا تھا ___ آسمان کا رنگ تانبے کی طرح لال ہو رہا تھا اور مشرقی اُفق پر خون آلودہ گاج کی طرح بادلوں کے ٹکڑے ساکت و جامد تھے۔

اب قصبے کے لوگ چوپال میں جمع ہو رہے تھے۔ سبھی تشویش سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص ہراساں تھا۔ ہونٹوں پر خاموشی کی مہریں لگی تھیں ___ صرف آنکھوں سے خوف و استعجاب جھانک رہا تھا۔ لوگ مندر کے پجاری کے پاس گئے ___ مندر کا گھنٹہ بج رہا تھا ___ لیکن پجاری فرار تھا ___ وشال مورتی کی دونوں آنکھیں خالی تھیں اور اُن سے آنسوؤں کا سیل رواں تھا۔

مایوس ہو کر لوگ مسجد کی جانب گئے ___ مسجد ویران پڑی تھی موذن کا حجرہ کھلا تھا اور موذن چھت سے بندھی ایک رسّی میں جھول رہا تھا ___ لوگ اور بھی سراسیمہ ہو گئے ___ فضا پر ایک عجیب دہشت کا راج تھا ___ ہوا دھیرے دھیرے تیز ہوتی ہوئی، اجگر کی طرح پھنکارنے لگی تھی ___ گھٹی گھٹی سی فضا سے جیسے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی ___ آسمان بے وفا طوطے کی آنکھوں کی طرح اپنا رنگ بدل رہا تھا ___

ٹوٹا ہوا پل عجیب بے نیازی سے ندی کے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا ___

▲▲

فلاحی ریاست، کمیونزم اور تشدّد (بقیہ ص ۹)

ایسے وقت میں اگر جمہوری سوشلسٹ چاہتے تو لینن سے چھٹکارا حاصل کرنا دشوار نہیں تھا۔ لیکن ایک تو وہ تشدد کے، جس میں قید و بند بھی شامل ہے، نظریاتی طور پر خلاف تھے اور دوسرے وہ اس واہمے میں مبتلا تھے کہ لینن کی گرفتاری سے ترقی پسند طاقتوں کے اتحاد میں، جسے ہر قیمت پر برقرار رہنا چاہیے، پھوٹ پڑ جائے گی۔ اس طرح انھوں نے لینن کو اپنی سازش کی تکمیل اور روس پر ایک جابرانہ نظام مسلط کرنے کا موقع فراہم کر دیا جس کے اولین کشتے وہ خود تھے۔

▲▲

یومِ آزادی کی شانِ امتیازی

پنجاب نے غریبی کو دور کرنے کے لیے زبردست محنت کر کے ایک عظیم ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس کی شاندار کامیابیوں نے دلیش اور بدیش میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ پنجاب کے سارے دیہاتوں میں سو فیصدی بجلی کی سپلائی فراہم کرنا ایک زبردست کامیابی ہے۔ میں پنجاب کی سرکار اور عوام کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

اِندرا گاندھی

ہماری دُور اندیش اور محبوب پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کے تحت ایمانداری، محنت اور لگن سے کام کرنے کے ترقی یافتہ رجحان نے اندھیر گردی۔ افراتفری۔ بدامنی اور خوف و ہراس کا خاتمہ کر دیا ہے۔
ساری سٹیٹ کو مکمل طور پر بجلی سے منور کرنے کی مقررہ میعاد سے ۱۲ سال پہلے ہی حاصل کردہ تاریخی کامیابی کے بعد اب

پنجاب سٹیٹ الیکٹری سٹی بورڈ

پنجاب کے ہر من پیارے

چیف منسٹر گیانی ذیل سنگھ

کی مدبرانہ قیادت میں ایک بار پھر حلف لیتا ہے کہ پنجاب کے ہر گاؤں کے ہر گھر کو بجلی کی روشنی سے منور کریگا

ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ابھی بہت کام کرنا باقی ہے
1976-77 کے لیے ہمارے نشانے حسبِ ذیل ہیں :

جنرل کنکشن :	200,000
ٹیوب ویل کنکشن :	50,000
انڈسٹریل کنکشن :	4,500

قوم کے بہتر اور روشن مستقبل کے لیے سیوا کر رہا ہے

پنجاب سٹیٹ الیکٹری سٹی بورڈ۔ پٹیالہ۔

Issued by D.P.R./PSEB

ذکاء صدیقی

اُردو شاعری میں اِنسان دوستی

مضمون کے پہلے جملے ہی میں یہ واضح کر دینا میں بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک انسان اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ یہ جو غالب نے کہا ہے کہ :

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

تو یہ یا تو لسّانی ہے یا بے سود فلسفیانہ موشگافی —— اور یہ دونوں باتیں برائے شعر گفتن خوب ہوتی ہیں، چنانچہ مصرع گرم ہوگیا —— فھو المراد۔

لغت میں انسان کے سیدھے سیدھے معنی "آدمی" کے ہیں روزمرّے اور محاورے میں بھی دونوں الفاظ ہم معنی ہیں، لیکن اصطلاح میں "انسان" کے اتنے معنی ہیں کہ الامان و الحفیظ! ہمارے بعض بہت پڑھے لکھے آدمیوں نے، جن کے سرخیل محمد حسن عسکری ہیں، انسان اور آدمی میں فرق وا متیاز دکھانے بلکہ کرنے، کی تکلیف مالایطاق کی ہے۔ ان کے نزدیک "انسان گوشت پوست کے جیتے جاگتے آدمی کا نام نہیں ہے۔ یہ صرف "آدمی" کا سایہ ہے، ایک مطلق و مجرّد تصور ہے"۔

عسکری نے اپنے مضمون کے لیے مواد و تحریک بودلیئر اور اسپین کے ایک فلسفی و شاعر اُونامُونو سے حاصل کی تھی —— تو جب ممتاز حسین نے ان کے اس مضمون کا جواب "انسان اور حیوان" کے عنوان سے لکھا ("نئے تنقیدی گوشے") تو انھیں لازمی طور پر کارل مارکس اور اینگلز سے تحریک ملی۔ بات پڑھے لکھوں میں پڑ گئی۔ یگانہ کا شعر کہاں یاد آیا ؎

پٹم کیوں نہ ہو جائے مانگے کی آنکھ
کہ عینک سے دھاگا پر دیا تو کیا

اپنے مضمون کی تیاری کے دوران جب میں نے ان دو عالموں کے مقالے پڑھے تو بہت گھبرایا کہ جب تک یہ تحقیق نہ ہو جائے کہ آدمی کون ہے اور انسان کیا، میں کیسے اور کیا لکھ سکوں گا؟ دو دن اسی ادھیڑ بن اور کتابوں کی اُلٹ پلٹ میں گزر گئے —— پھر یاد آیا کہ مجھے "اردو شاعری میں انسان دوستی" کے موضوع پر لکھنا ہے تو یہ خیال کر کے جان میں جان آئی کہ اُردو شاعری میں "انسان" اور "آدمی" دونوں کو کم و بیش ہم معنی ہی سمجھا گیا ہے، اور اُس وقت سے جب بودلیئر ہوں یا مارکس، ان کا وجود بھی محض تقدیرِ الٰہی میں تھا —— "کم و بیش" کی ترکیب میں نے یوں لکھی کہ گا ہے گا ہے ہمارے شعراء نے ان دونوں میں امتیاز کرنے کی بھی کوشش کی ہے جیسے غالب کا مصرع آپ نے سُنا —— لیکن بقول مولانا حالی اس میں "کوئی منطقی استدلال نہیں ہے، شاعرانہ استدلال ہے"۔

تاہم —— مستثنیات کا ذکر نہیں، محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج، ۱۳ر جون ۱۹۷۶ء تک اُردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے آدمی اور انسان میں غیر شعوری طور پر امتیاز کیا ہو۔ ان شعراء میں میرزا مظہر جانِ جاناں، دردؔ، غالبؔ اور اقبالؔ جیسے فلسفی و عالم شاعر بھی شامل ہیں۔ یہ البتہ ہے کہ آدمی جب اپنے فضایلِ اخلاق کی معراج کمال پر پہنچ جاتا ہے تو اُسے انسان کہا جا سکتا ہے، لیکن ہوتا وہ آدمی ہی ہے!

جب یہ تحقیق ہو گئی کہ آدمی اور انسان الگ الگ چیزیں یا حیاتیاتی وجود نہیں ہیں —— کم از کم مجھے تو محقق ہو گیا ہے —— تو صرف شاعری کے تناظر میں یہ دیکھنا ہے کہ انسان

پروفیسر اینڈ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف پرشین، گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج، رام پور۔ یوپی

ہے کیا! ؟ ہمارے شاعروں نے انسان کو مختلف رنگوں کی عینک سے دیکھا ہے؛

قرآنِ حکیم کے مطابق انسان "خلیفۃ اللہ علی الارض" ہے۔ اسے خدا نے بنایا اس کے ہاتھ پاؤں درست کیے، اس میں اپنی روح پھونکی اور زمین پر بھیج دیا ——

صوفیوں نے انسان کو فضیلت و عظمت کا تاج پہنایا۔ خالق و مخلوق کے درمیان نسبت و تعلق کے پیش نظر ایک عالم گیر محبت کے تصوّر کا ارتقا ہوا اور اس سے یہ عقیدہ برآمد ہوا کہ مخلوق سے محبت خالق سے محبت ہے۔ خدمت کو محبّت کا تقاضا قرار دیا گیا جیسا کہ سعدی نے کہا ہے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

علمائے حیاتیات نے انسان کو ایک نامیاتی وجود مانا۔

ان تین نظریوں نے متعدد ذیلی نظریات پیدا کیے۔ ان ذیلی نظریات کو گنوانے کی بجائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے تین شاعروں کے نام لے لیے جائیں جو کم از کم تین مختلف نظریوں کے نمائندے یا مبلغ کہے جا سکتے ہیں۔ میری دانست میں یہ تین شاعر ہیں: خواجہ میر درد، نظیر اکبر آبادی اور اقبال۔ مجھے یقین ہے کہ ان تینوں شاعروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ ہم سب کے ذہن ان مخصوص تصورات کی طرف رجوع ہو گئے ہوں گے جو ان شاعروں نے انسان اور انسان دوستی سے وابستہ کر رکھے ہیں۔

انسان دوستی کے لیے انگریزی میں "ہیومنزم" کا لفظ آتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے "ارمغان مالک" میں اس کی تعریف و تشریح یوں کی ہے کہ: "ہیومنزم جسے ہم اُردو میں انسانیت کہہ سکتے ہیں، انگریزی زبان میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک عام معنی ہیں، ایک خاص معنی ہیں۔ عام معنی میں یہ ہمہ گیر انسانی ہمدردی اور نوعِ انسان کی محبت سے عبارت ہے اور خاص معنوں میں یہ ایک فلسفیانہ تصوّر ہے جس کی رو سے انسان عالم فطرت کی قوتوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے نہ فوق فطرت قوتوں کے ہاتھ میں —— بلکہ اپنا ایک مستقل وجود مستقل عقل و ارادہ اور پیمانہ اقدار رکھتا ہے اور کچھ حدود کے اندر اپنی زندگی اور اپنی سیرت جس طرح چاہے تعمیر کر سکتا ہے —"

ان دونوں تعریفوں کے تحت، انسان ایک آئیڈیل ہی کی حیثیت سے سمجھ میں آتا ہے! عام، زندہ، جیتے جاگتے، گوشت پوست کے آدمی کی حیثیت سے نہیں —— مجھے اعتراف ہے کہ میرا مطالعہ بہت محدود ہے، میں نے صرف اردو اور فارسی شاعری بالاستیعاب پڑھی ہے۔ مجھے ان دونوں زبانوں کی شاعری میں ایک نظیر کے، کاملاً، اور یگانہ کے، جزواً کوئی قابلِ ذکر شاعر ایسا نہیں ملا جس نے ایسے عام انسان کے لیے دوستی اور محبّت کے جذبات کا اظہار کیا ہو جو نہ خلیفۃ اللہ علی الارض ہے، نہ مردِ مومن۔ نہ سرمایہ داری سے بالکل بیزار نہ عوامی حکومت کے نشے میں مست و سرشار —— نہ نفسیاتی پیچیدگیوں کا مارا نہ فلسفوں کا پشتارہ —— جس کی مادّی ضروریات بھی ہیں اور غیر مادّی بھی، خواہ وہ اللہ والا ہو یا دُنیادار۔ جو بغیر آئیڈیل کے محض اپنی مادّی یا غیر مادّی ضروریات، احتیاجات، اور اختیارات کے تقاضے سے خوشی و غم، محبّت و نفرت، دوستی و دشمنی، رحم و ظلم، شرافت و رذالت، سیر چشمی و تنگ دلی، عالی حوصلگی و بے مروّتی کے متضاد و متناقض جذبات کا اظہار بے محابا بھی کر سکتا ہے اور دیدہ و دانستہ بھی میری مراد جس انسان سے ہے اس کے متعلق یگانہ نے کہا ہے:

شیطان کا شیطان، فرشتے کا فرشتہ
اِنسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

مجھے نہیں معلوم کہ مہتممین جلسہ نے جب مجھے "اُردو شاعری میں انسان دوستی" کے موضوع پر لکھنے کا حکم دیا تو ان کی مراد انسان اور انسان دوستی سے کیا تھی۔ بہر کیف میں نے اس بوالعجب انسان سے دوستی کو اپنے مطالعے کا موضوع قرار دیا ہے۔ مجھے نہ ہیومنزم کے مغربی فلسفے سے غرض ہے نہ انسانیت کے مشرقی فلسفے سے سروکار۔ میں تو کچھ عرض کروں گا اس بوالعجب انسان کے تناظر میں عرض کروں گا جس کی ہمدردی و دوستی کے پردے میں فلاسفہ و شعرا نے طرح طرح کے مزعومات و عقائد کی ایک طول طویل فہرست

تیار کر کے اس کے ہاتھ میں دے دی ہے کہ ان پر عمل کر،
تیری نجات انھیں میں ہے۔ اور وہ غریب یقین و وہم کے
دوراہے پر حیران و پریشان کھڑا اگر کا راستہ ڈھونڈ رہا ہے۔
خواجہ میر درد کو ہی نے صوفی شعراء یا تصوف کے مضامین
باندھنے والے شعراء کے نمائندے کی حیثیت میں انتخاب کیا
ہے۔ اردو کے تقریباً اسّی فیصدی شاعروں پر تصوف کی
پرچھائیں پڑی ہے۔ تصوف کے متعدد و مختلف نظریات
ہیں لیکن کم و بیش سب کا اصل اصول اخلاق انسان کی
صفا و تزکیہ ہے۔ مکارم اخلاق میں انسانی عظمت اور
انسانی مساوات کا جو تصور صوفیوں نے پیش کیا ہے اس
سے بڑھ کر آج بھی ہیومنزم کے تمام تر مشرقی و مغربی فلسفیوں
کے نظام ہائے فکر میں اور کیا ہوگا ـــــ! لیکن اس
تعمیر میں خرابی کی ایک صورت مضمر ہے۔ تصوف کی
ابتدا بنو امیہ کے دور میں ہوئی کہ جب بقول مولانا شبلی
نعمانی عسفا کی کا بازار گرم رہتا تھا، طبیعتوں میں شورش
پیدا ہوئی، لیکن جب کبھی شکایت کا لفظ کسی زبان پر
آتا تھا تو طرف داران حکومت یہ کہہ کر اس کو چپ کر دیتے
تھے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے، ہم کو
دم نہیں مارنا چاہیے، 'امنّا بالقدر خیرہٖ و شرّہٖ'
نتیجے میں آدمی تقدیر کے سامنے مجبور مان لیا گیا۔ یہی نظریہ
ہمارے صوفی شاعروں کا بھی ہے۔ میر ہوں یا سودا،
ناسخ ہوں یا آتش، مومن ہوں یا غالب یا ذوق،
فانی ہوں یا حسرت یا اصغر یا جگر یا فراق ـــــ
حتیٰ کہ اکثر یگانہ چنگیزی تک، سب کسی نہ کسی حد تک
جبریہ ہیں۔ لامحالہ ان کے یہاں انسان عموماً مجبور محض نظر
آتا ہے۔ چنانچہ میر:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

غالب:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

درد:

مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

" : جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنستے میں رو دیا ہوگا

" : کیا فائدہ درد شور و شر کا
اچھے ہے جو کچھ سو مار جی میں

یگانہ:

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے
اُف ری مشیت بھولے تو لاکھوں
پھلتے نہ دیکھے سارے کے سارے
قربان تیری اٹکھیلیوں کے
خود سر چڑھائے خود مار اتارے

جبر مشیت سے مجبور اس انسان کو کبھی احساس انا ہوتا
ہے تو وہ صحرا میں اذان بھی دے دیتا ہے:

درد:

انسان کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں
بازی کہاں، بساط یہ گرشاہ ہی نہیں

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا
جو کچھ کہ سنا تجھ میں، سو انسان میں دیکھا

لیکن یہ عارف ذات انسان بحرفانے شاذ ہی سر ابھارتا ہے۔
زیادہ تر تو اس پر وہ متصوفانہ مجہول شہادت سوار رہتی
ہے کہ اس سے دلکشی کرنے کا شوق پیدا ہونے کی بجائے
اس پر غصہ آنے لگتا ہے، کم از کم مجھے!
ترقی پسندی کے دور میں البتہ انسان کو مجہول

شہید کی جگہ فعّال آدمی کا درجہ ملا۔ لیکن یہ فعّالیت توڑ پھوڑ کے مترادف ہو کر رہ گئی۔ اس انسان سے بھی وحشت ہی ہوتی ہے۔ دو ایک مثالیں کافی ہوں گی۔ مجاز کی نظم "انقلاب" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ختم ہو جانے کو ہے سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام
گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشے میں شرابِ لالہ گوں
خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف کو جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں

اسی طرح دس شعروں میں خون کی ہولی کھیلی گئی ہے۔
مخدوم کی ایک نظم کا تو عنوان ہی "موت کا گیت" ہے۔ صرف ایک بند سنیے:

زلزلو آؤ، دہکتے ہوئے لاوا آؤ
بجلیو آؤ، گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

شہاب ملیح آبادی ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ فرماتے ہیں:

پیس ڈالوں گا، رگڑ دوں گا، مسل ڈالوں گا میں
سرِ غرور و کبر و نخوت کا کچل ڈالوں گا میں

یہی کیا ——— ترقی پسندی کے ابتدائی دور کی جو نظم لے لیجیے اس میں انسان دوستی کے معنی مزدور و دہقان دوستی لے کر شاعروں نے وحشت و بربریت کے وہ رجز گائے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔
سردار جعفری کی نظم "بغاوت"، پڑھیے "قیدی کی موت" یا "رومان سے انقلاب تک" اور کیفی اعظمی کی درمیانی عہد کی نظمیں: "سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج"، "فتح برلن"، "سلام اے روس تیرے شعلے عجب شگوفے کھلا رہے ہیں" وغیرہ، کس کس کا اور کہاں تک ذکر کیا جائے۔ خود "قبلۂ زندانِ جہاں" جوش صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ آخر سجاد ظہیر کو اس خونی انسان دوستی کے خلاف لکھنا پڑا کہ: "یہ ایک طرح کی ادبی دہشت انگیزی ہے۔ یہ ایک ذہنی اور جذباتی بلوہ ہے...... ان میں سے بہت سی باتیں جوش کہہ چکے ہیں، آپ انھیں کیوں دہراتے ہیں؟" (اردو کی جدید انقلابی شاعری، نیا ادب خاص نمبر، جولائی ۱۹۳۹ء؛ بحوالہ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک": خلیل الرحمٰن اعظمی)

ظاہر ہے نہ پوری ترقی پسند شاعری میں انسان کا تصور اتنا ہیبت ناک اور دہشت انگیز تھا نہ ان شاعروں نے ہمیشہ اسی طرح کی انسان دوستی کو روا رکھا جس کا نمونہ ابھی آپ نے سماعت فرمایا۔ جوش، مخدوم، مجاز، جعفری اور کیفی تو اب ہماری تاریخِ ادب کے محترم نام ہیں ——— تاہم اتنا کہنا پڑے گا کہ جس طرح شعرائے متصوفہ کا انسان مصنوعی تھا اور نتیجتاً اس سے دوستی کے جذبات بھی مصنوعی تھے، اسی طرح ترقی پسندی کے دور کا حال ہے۔ وہاں انسان کو مشیت کے ہاتھوں مجبور دکھایا جاتا تھا تو یہاں سرمایہ دار کے ہاتھوں ———!

صوفیا کی وہ مجہولیت و انفعالیت ہو یا ترقی پسندوں کی یہ منفی فعّالیت، ان دونوں نظریوں کے خلاف ایک ہی آواز سنائی دیتی ہے: اقبال کی ———!

ان کا انسان صوفیوں کے انسان کی بالکل ضد ہے۔ اگر صوفیوں کا انسان ایک حقیر سیّارے، زمین، نیز شرر کی مانند ایک ہستی بے بود تھا:

مثلِ شرر تنگِ چشم ہستیِ بے بود ہے
دیکھ نہ سکتا اسے تک بھی جدھر دیکھنا

تو اقبال کا انسان یزداں کو کمند میں پھانسنے کا عزم رکھتا ہے۔ ان کا انسان اپنی خودی کے ارتقا کے ذریعے اس مقامِ اعلیٰ تک پہنچ سکتا ہے جہاں خدا اس سے خود پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے! اقبال جبر و قدر کے مسئلے کو بالکل الگ زاویۂ نظر

سے دیکھتے ہیں :

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

خود "تقدیرِ یزداں" بننے کے لیے جس ذہنی، جسمانی و روحانی تربیت کی ضرورت ہے اس کے مدارج اقبال نے بتا دیے ہیں ـــــ جب انسان خود "تقدیرِ یزداں" بن جاتا ہے تو یہ کمال کا وہ درجہ ہوتا ہے جہاں سوچنا پڑتا ہے کہ :

مگر با ایزد انباز ست آدم! ؟
کیا آدمی خدا کا شریک ہے ؟

خدا کا شکر ہے کہ اب نیا ذہن اقبال کو نئی روشنی میں پڑھ سکتا ہے ! اگر اقبال پر نہ بڑھیے، بلکہ اقبال کو پڑھیے تو بڑے بڑے رموز و نکات کھلیں گے جیسا کہ مسز سروجنی نائڈو نے کہا تھا : "اقبال کی شاعری نے میری روح کو وطنیت کے سلاسل سے آزاد کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دی اور مجھ میں نوعِ انساں سے محبت کرنے کی ہمت اور قابلیت پیدا کر دی ہے۔"

(بحوالہ "اقبال اور انسان" صـ ۱۱۹)

من جملہ ان حقایق کے ایک یہ حقیقت بھی کھلے گی کہ وہ اقبال جسے رجعت پرست، مسلم احیاء پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے، خودی کے عین مقام ارتقا پر انسانیت کا یہ تصور رکھتا ہے کہ :

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

(آدمیت کیا ہے ؟ آدمی کا احترام آدمی کا مقام کیا ہے، ذرا سمجھ !)

حرف بد را بر لب آوردن خطا ست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا ست

(بدگوئی گناہ ہے ـــ کافر ہو یا مومن، سب خدا کی مخلوق ہیں ـــ)

بندۂ حق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

(اللہ کا بندہ خود اللہ ہی کے طور طریقے اختیار کرتا ہے اور کافر و مومن پر اللہ ہی کی طرح یکساں شفقت و مہربانی کرتا ہے)

اقبال کے فلسفے کا تمام تر سرمایہ حفظ و ارتقائے خودی ہے اور اس میں شرمانے یا جھجکنے کی یا معذرت خواہی کی کوئی بات نہیں ہے کہ ان کے فلسفے کی روح خالصتہً اسلامی ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ اقبال کا فلسفہ نہ تو ہر ایک کے سمجھنے کا ہے ـــ کون سا فلسفہ ہر ایک کے سمجھنے کا ہوتا ہے ! ـــ نہ ہر ایک کے عمل کرنے کا۔

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان دوستی کا تصور مذہب کے تصور سے جڑا ہوا ہے ـــ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مناظراتی مقالے : HUMANISM OF IRVING BABBIT میں پروفیسر بیبٹ کے اس خیال پر کہ انسان دوستی مذہب کا بدل ہے، تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان دوستی اور مذہب متوازی یا متقابل نہیں ہیں۔ انسان دوستی تو امر اتفاقی ہے! جب کہ عیسائیت مسلسل ہے ـ ایلیٹ کے خیال میں جس طرح عیسائیت کے بغیر یوروپین اقوام کا تصور بے محل ہے اسی طرح ہمارے برصغیر میں بھی مذہب کے بغیر انسان دوستی کا تصور نہ صرف بے محل ہے بلکہ تقریباً بے معنی ہے ـــ مذاہبِ عالم کے متعلق ہمیں کم از کم اتنا تو معلوم ہی ہے کہ ان کا مقصدِ اصلی ارتقائے روحِ انسانی ہے۔ اب اس ارتقائے روح کا تصور مثلاً اسلام میں کیا ہے اور ہندو دھرم میں، بدھ مت میں، سکھ مت میں اور عیسائیت میں کیا ـــ اس کی اہمیت موجودہ موضوع یعنی انسان دوستی کے سلسلے میں اتنی نہیں رہتی جتنی ان رسوم و رواج، روایات و معمولات اور تصاحب و تعامل کے طور طریقوں کی ہے جن پر تمام مذاہب کی مشترکہ چھاپ لگی ہوتی ہے۔ ان رسوم و رواج اور عقاید و روایات کے پیچھے برصغیر کا ہزار سالہ مشترک تہذیبی ورثہ ہے اور یہ ورثہ دار وہ عام آدمی

ہے جسے میں نے یگانہ کی دی ہوئی کنیت سے پکارا
ہے: "ابو العجب"۔

میری حقیر رائے میں اگر اس ورثے اور اس ورثے دار کو اردو شاعروں میں کسی نے سمجھا ہے تو وہ نہ درد اور ان کی قبیل کے صوفی شعرا ہیں نہ غالب، نہ اقبال، نہ ترقی پسند شعرا، نہ جدید شعرا۔ اردو شاعری کے سوا ڈیڑھ سو سال میں صرف ایک شاعر نے سمجھا ہے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے، اور وہ ہے نظیر اکبرآبادی۔

نظیر کا موضوعِ شعر انسان ہے، شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی۔ ان کی انسان دوستی یہ نہیں ہے کہ موقع بے موقع ہائے انسان وائے انسان اور جا بجا واہ انسان اور سبحان اللہ انسان کرتے رہیے، اور وقتاً فوقتاً معیار و اقدارِ زندگی بلند کرنے کے تیر بہدف نسخے تجویز کرتے رہیے۔ وہ اس انسان سے محبت کرتے ہیں جس میں بیک وقت طارمِ اعلیٰ پر کرسی نشین ہونے کی بھی بالقوۃ صلاحیت ہے اور جو بالفعل خاک سے بھی پست نہیں تو خاک نشین ہے —— چونکہ انھیں اس انسان سے محبت ہے اس لیے وہ اس کے اس سماج اور ماحول کو بھی دوست رکھتے ہیں جس میں وہ از مہد تا لحد زندگی بسر کرتا ہے۔ ان کے لیے انسان اور اس کی فطرت کا معمولی سے معمولی مظہر بھی گہری دلچسپی کا سامان و سرمایہ ہے۔ وہ اس معمولی مظہر کو ہر ہر پہلو سے دیکھتے ہیں، خود بھی لطف لیتے ہیں اور ہمیں بھی اس لطف میں شریک کرتے ہیں۔ ان کے یہاں آدمی آدمی میں انتر نہیں ہے۔ ان کا تصورِ آدمی کیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

دنیا میں بادشہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نماز، یاں
اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(آدمی نامہ)

انگریزی کی ایک کہاوت ہے کہ "بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے"۔ گرو دیو ٹیگور کا ایک پیمبرانہ جملہ بھی یاد رکھنے کا ہے کہ "ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا"۔ بچہ اگر ہندوستانی فلموں کا فلسفیانہ اور پکّے پکّے ڈائیلاگ بولنے والا بچہ نہ ہو تو کسے پیارا نہیں لگتا۔ نظیر جب بچوں کو دیکھتے ہیں تو انھیں اپنا بچپن یاد آتا ہے اور اُس کو یاد کرتے ہوئے وہ دوسرے بچوں کے بچپن میں جینے لگتے ہیں:

کیا دن تھے یار وہ بھی تھے جب کہ بھولے بھالے
نکلے تھی دائی لے کر پھرتی کبھی دوا لے
چوٹی کوئی رکھا لے بدّھی کوئی پنھا لے
ہنسلی گلے میں ڈالے منت کوئی بڑھا لے
موٹے ہوں یا کہ دُبلے گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم نے حیا ہے
آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے ننگے پھرے تو کیا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے
کچھ کھالے اس طرح سے کچھ اس طرح سے کھالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

بزرگوں سے سُنا ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ غیر تو غیر اپنوں تک کو دعا دینا چھوڑ دیں گے۔ سڑک پر چلتے، مٹی میں کھیلتے، دھوپ میں سوتے بچے کو دیکھ کر، دعا دینا، خواہ وہ کسی کا ہو، کتنی بڑی شرافتِ انسانی ہے اس کو کچھ اہلِ محبت ہی سمجھ سکتے ہیں نظیرؔ کے منہ سے یہ دُعا کتنی بھلی لگتی ہے :

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے
یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشا ہے
اور سچ اگر جو پوچھو تو بادشہ بھی کیا ہے
اب تو نظیرؔ میری سب کو یہی دعا ہے
جیتے رہیں سبھوں کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

نظیرؔ نے جوانی اور بڑھاپے کی بھی وہ وہ تصویریں بنائی ہیں اور نقشے کھینچے ہیں کہ دیکھا کیجے۔ لیکن ان مرقعوں کو آپ کے کسی اگلے اتوار کی فرصت کے لیے محفوظ کرتا ہوا آپ کو آگرہ بازار لیے چلتا ہوں جہاں میاں نظیرؔ عجیب سوانگ میں زندگی کا لطف لوٹ اور لٹا رہے ہیں :

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ
لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ
جس وقت بڑھا، ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کوئی ہم سے "میاں، آؤ، قلندر
وُہ کیا ہوئے اگلے جو تمھارے تھے وہ بندر؟"
ہم ان سے یہ کہتے تھے "یہ پیشہ ہے قلندر
ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں جنگلے کے اندر
جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچہ"

اس ریچھ کے بچے میں تھا اس ناچ کا ایجاد
کرتا تھا کوئی قدرتِ خالق کے تئیں یاد
ہر کوئی یہ کہتا تھا خدا تم کو رکھے شاد
اور کوئی یہ کہتا تھا ارے واہ رے استاد
تو بھی جیے اور تیرا سدا ریچھ کا بچہ

بازار میں کھڑے، ریچھ کا بچہ نچاتے، میاں نظیرؔ تماش بینوں کے ساتھ ترکی بہ ترکی ضلع بول رہے ہیں کہ جگت لڑ رہے ہیں کہ بارش شروع ہو گئی۔ سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ امیر غریب، چھوٹا بڑا ہر ایک کھِل اٹھا اور میاں نظیرؔ برسات کا لطف لینے لگے :

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں میں دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی، ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ رُت وہ ہے کہ جس میں خورد و کبیر خوش ہیں
ادنیٰ، غریب، مفلس، شاہ و وزیر خوش ہیں
معشوق شاد و خرم عاشق اسیر خوش ہیں
جتنے ہیں اب جہاں میں سب اے نظیرؔ خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

دلّی اور آگرے والے بھی عجیب مست مولا ہیں۔ اِدھر پھوار پڑی اور اُدھر وہ گھر سے نکلے۔ باغوں اور سبزہ زاروں میں کڑھاؤ چڑھ گئے، پکوان پکنے لگے، پیڑوں میں جھولے پڑ گئے ــــ لڑکیاں بالیاں پینگیں بڑھا رہی ہیں اور مرد، لڑکے ہوں یا جوان، شریف ہوں یا وضیع غریب ہوں یا امیر پاؤلیلوں اور دریاؤں میں پیر رہے ہیں، میاں نظیرؔ پینگوں کے ساتھ اٹھتی ہوئی جوانیوں کو تاک جھانک کر رہے ہیں :

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے

اور سینچے کبھی اس باؤلی کی جگت پر کبھی اُس کنویں کی منڈیر پر اور پھر آن دھمکے جمنا کنارے جہاں پیراکی کا میلہ ہو رہا ہے:

جب پیرنے کی رت میں دل دار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غم خوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے ناداں ہشیار پیرتے ہیں
پیرو جوان و لڑکے عیار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

تربینی میں آہا ہا ہوتی ہیں کیا بہاریں
خلقت کے ٹھٹھ، ہزاروں پیراکوں کی قطاریں
پیریں، نہادیں، اچھلیں، کودیں، لڑیں، پکاریں
لیتے وہ چھینٹ غوطے کھا کھا کے ہاتھ ماریں
کیا کیا تماشے کر کر اظہار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کیا کیا نظیر یاں کے ہیں پیرنے کے بانی
ہے جن کے پیرنے کی ملکوں نے آن مانی
استاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی
سب خوش رہیں، ہے جب تک جمنا کے بیچ پانی
کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

معمولی کتابی علم —— علم بھی نہیں، معلومات —— کے زعم میں خود فریبی، خوش فہمی، نکچڑھے پن اور کلبیت کے شکار —— اور یک فنے پن، ایک سرے پن کے احساس کمتری میں گرفتار ہم نام نہاد پڑھے لکھے لوگ اپنے تمام دعوؤں اور دلیلوں کے باوجود انسانیت اور انسان دوستی کا وہ صحت مند، واضح اور زندہ تصور نہیں رکھتے جو نظیر کا تھا، ان کی سی بھرپور زندگی جینا تو کیا، زندگی کو ان کے ذہن سے سوچنا بھی آج ہماری استعداد سے باہر ہے۔ زندگی ہمیشہ اتنی ہی پیچیدہ تھی جتنی آج ہے، چند مسایل کی شکل اور ماہیت بدل گئی ہے، اقدار کی بھی شکست و ریخت ہوئی ہے۔ بجا، درست، لیکن آدمی یعنی ہم، بقول فراق صاحب:

قرنوں کے مٹانے سے مٹے ہیں نہ مٹیں گے
آفاتِ زمانہ سے جھکے ہیں نہ جھکیں گے
اُبھرے تو دبانے سے دبے ہیں نہ دبیں گے
ہم موت کے مارے بھی مرے ہیں نہ مریں گے
ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے

زندہ رہنے کے لیے زندگی سے محبت شرط ہے۔ اور زندگی نام ہے انسان کا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ زندگی سے محبت کرنے کے لیے انسان سے دوستی کرنی ہوگی۔ اور انسان دوستی کا واحد و بہترین نمونہ نظیر نے اپنی اُردو شاعری میں پیش کر دیا ہے: لعلکم یتفکرون!

(۱۳ر جون ۱۹۷۶ء کو بزم ادب اُردو شملہ کے سیمینار میں پڑھا گیا۔)

غزلیں

عروج زیدی

انقلاباتِ شب و روز کے حامل ہم ہیں
ہم ہیں اُن کی نگہِ ناز کے قابل ہم ہیں

جو حقیقت میں ہیں گردِ رہِ منزل اب تک
وہ سمجھتے ہیں چراغِ سرِ منزل ہم ہیں

ذرہ ذرہ تری دنیا کا فسردہ ہوتا
باعثِ گرمیِ ہنگامۂ محفل ہم ہیں

ہم سے ٹکرا کے ہزیمت ہی ہزیمت ہوگی
باش اے شورشِ طوفاں کہ مقابل ہم ہیں

شرطِ انصاف نہیں اوروں پہ تہمت رکھنا
اپنی تابندہ روایات کے قاتل ہم ہیں

ہمیں کونین نہیں، حاصلِ کونین ملے
جن کی ٹھوکر پہ ہیں کونین وہ سائل ہم ہیں

سعیِ پیہم پہ بھی جس کو نہ فرشتے سمجھے
روزِ اول ہی سے وہ عقدۂ مشکل ہم ہیں

قوتِ سیلِ حوادث کا انہیں علم نہیں
جن کو یہ ناز ہے پروردۂ ساحل ہم ہیں

چاہے ہر خواب رہے تشنۂ تعبیر، عروج!
جو کبھی ہاتھ نہ پھیلائیں وہ سائل ہم ہیں

کرشن مراری

سوچ کی روشنی میں ہی گم ہو گیا
اِک خیالات کا ٹوٹتا سلسلہ

ٹوٹنا تھا اسے دل گیا ٹوٹتا
دردِ دل کا مداوا نہیں ہو سکا

شوخ تیری اداؤں کے ہی فیض سے
زندگی میں بہاروں کا موسم رہا

سحر کرتی گئی شوخ چتون تری
مسکراتی رہی ایک چنچل ادا

گیت پُر درد دل میں اترتے گئے
سوز کا ساز نغموں میں ڈھلتا گیا

زلف یوں اُن کے رُخ پر بکھرتی گئی
جیسے ساون کی چھائی ہو کالی گھٹا

آس اور یاس کی شوخیاں کیا کہیں
ولولوں نے بسایا ہے گھر اِک نیا

ایک دریا سماتا گیا ہر نفس
ایک ساگر اُٹھا لہر لیتا ہوا

سوچ میں ڈوبتے ڈوبتے ہی گئے
تیری البیلی نظروں کا تھا سامنا

پھر نظر سے نظر آج ٹکرا گئی
پھر محبت کا اس دل کو دھوکا ہوا

○ محمد سیف الدین خاں رامپور (یوپی)

○ ۴ بی - اردن روڈ - نئی دلی - ۱۱۰۰۰۱

بدنام نظر — سفر / تھکن ۲، ۳

(دو ۲)

سحر کا شورِ مسلسل
نہ جانے کون سی بدبو گھروں میں در آئی ؟
نہ جانے کون سے دھڑے سڑے ہیں گلیوں میں ؟
نہ جانے کس کے لیے بہہ رہے ہیں یہ نالے ؟
سحر کے شورِ مسلسل میں کس کو فرصت ہے ؟
مرے سوال سنے !

یہ دوپہر یہ مری طرح ہانپتا سورج
پناہ ڈھونڈھ رہا ہے نگر کی بانہوں میں
تمام کھڑکیاں دروازے بن گئے دیوار
سبھی دکانوں کے سر پر ہیں ان کے نام لکھے
رسول ، براج ، مدھو ، فینسی ، امر ، باٹا
وہ وقت ہے کہ نوالے بھی بیچ دیے سب نے
لو ہانپتے ہوئے سورج کی سانس ٹوٹ گئی

یہ ڈھلتے دن کا لہو خشک زرد سا چہرہ
سبھی دروں پہ پکارا
"نہیں ہیں" ایک آواز
سبھی گھروں میں لگا ہے بس ایک انچ کا ٹیپ
تمام راستوں پہ نیلے پیلے لڑکے ہیں
وہ میں کہ میں نے کوئی رنگ ہی نہیں پہنا
تو مجھ کو جانے کون ؟
میں اجنبی سا چلا جا رہا ہوں سہما ہوا
ندی ہے خشک کہیں ڈوب بھی نہیں سکتا
کہیں پہ پیڑ بھی پیپل کا مل نہیں پاتا

خمرشں ! رات کے آنسو
بس ایک صدائے گھنن گھن ،
میں اپنی ناک کے چھیدوں پہ ہاتھ رکھتا ہوں
نہ جانے کون سے نمرود کی اجل آئی ؟
نہ جانے رات کے آنسو رواں ہیں کس کے لیے ؟

▲▲

(تین ۳)

سوچتی پتیوں کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں
کون سائے میں بیٹھا ؟
موٹی چمڑی کو احساس ہوتا نہیں ہے
آنکھیں سیلاب میں بہہ چکی ہیں
کونپلیں کون سا رنگ پہنیں ؟
ڈالیاں کون سا پھول لے کر جھکیں ؟
خوشبوؤں کو ہوا لے اڑی ہے
پھل فقط پھل کا اک سلسلہ
نام و نمبر کے کھاتے ہیں جس کا کوئی تذکرہ تک نہیں

▲▲

غزلیں

ش۔ک۔ نظام

وہی نہ ملنے کا غم اور وہی گلہ ہوگا
میں جانتا ہوں مجھے اُس نے کیا لکھا ہوگا

کواڑوں پر لکھی ابجد گواہی دیتی ہے
وہ ہفت رنگی کہیں چاک ڈھونڈتا ہوگا

پرانے وقتوں کا ہے قصرِ زندگی میری
تمہارا نام بھی اُس میں کہیں لکھا ہوگا

چُبھن یہ پیٹھ میں کیسی ہے مُڑ کے دیکھ تو لے
کہیں کوئی تجھے پیچھے سے دیکھتا ہوگا

گلی کے موڑ سے گھر تک اندھیرا کیوں ہے نظام
چراغ یاد کا اُس نے بجھا دیا ہوگا

▲▲

طاہر تلہری

چیختا چنگھاڑتا دن رات کی چھت پر گرا
خامشی کی جھیل میں آواز کا پتھر گرا

قاتل و سفاک تھی کتنی ہوائے تند و تیز
راہ کا جو پیڑ زد میں آگیا کٹ کر گرا

گونج اُٹھیں زنجیر کی جھنکار سے خاموشیاں
ایسا لگتا ہے کوئی وحشی مرے اندر گرا

اب کسی تہذیب کا کوئی نشاں باقی نہیں
وقت کے بھونچال میں مسجد گری مندر گرا

بعد مدت اس سے مل کر دل میں اک ہلچل مچی
شب گزیدہ جھیل میں جیسے کوئی کنکر گرا

زرد چہرے پر سجائے اپنے زخموں کی دکان
رات کے اندھے کنویں میں دن کا سوداگر گرا

طاؔہر اپنے گرد ایسا مصلحت کا جال تھا
کوششِ پرواز میں میں بارہا اُڑ کر گرا

▲▲

رزّاق ارشد

رہیں کیسے ماضی سے کٹ کر میاں
کہ ہے نقش ہر بات دل پر میاں

جسے بھولنا چاہتا ہے کوئی
وہی یاد آتا ہے اکثر میاں

اگر بن پڑے کچھ دلاسہ ہی دو
لگاتے ہو کیوں اور نشتر میاں

بہت تھک گئے، گھر چلیں اب جہاں
لگا ہوگا فکروں کا بستر میاں

وہی ہم وہی آس کی رہ گذر
گذرتے ہو کیوں آج بچ کر میاں

مفر کا کوئی راستہ ڈھونڈ لو
سفر زندگی کا ہے دو بھر میاں

ہمارے دکھوں کا مداوا کرو
نہ ٹالو ہمیں صرف ہنس کر میاں

غموں سے نہ گھبرائے گا میرا دل
انھیں چاہیے کوئی تو گھر میاں

گذر جاؤ جیسے ہوا ہو کوئی
نہ بیٹھو کہیں بن کے پتھر میاں

کہاں تک اب ارشد یہ رودادِ غم
بہت سن چکے اب تو بس کر میاں

▲▲

○ گلاز اسٹریٹ، جودھپور ○ ○ ۲۰۷ پھاٹک تلیان ترکمان گیٹ نئی دہلی ۶-۱۱۰۰

نظمیں

اقبال منہاس

فرار

اُسے ضد رہی
مَیں بھڑکتے ہوئے سُرخ سورج کو
تاریک وادی میں روشن کروں
تاکہ برسوں سے فرشِ زمین پر جمی برف پگھلے
نئے بیج پھوٹیں
کلی کھل کے مہکے
مگر رات بھر
مَیں پہاڑوں پہ بکھرے ہوئے سنگریزوں کو
چُنتا رہا ـــــــ!
سُرخ سورج کو اپنے بدن میں چھپائے !!!

▲▲

نجم عثمانی

سچّائی

جسموں کے بن باس میں
روحیں قید ہوئی ہیں
تاریکی کے غار میں
سورج دفن ہوا ہے
سچائی کی کوکھ میں
کڑوا زہر بھرا ہے
زہریلی مرطوب ہوا میں
دم گھٹتا ہے
وقت کے ٹوٹے آئینے میں
ریزہ ریزہ عکس ہوا ہے

▲▲

غزلیں

ساحل احمد

تم اسے یاد کرو گے کب تک
شعر خوابوں کے لکھو گے کب تک

اپنے اندر کی لکیریں پڑھ کر
مثلِ کاغذ کے جلو گے کب تک

سبز پتوں کی عداوت سے بچو
سبز لمحوں میں جیو گے کب تک

پھول شاخوں پہ کھلے ہیں لیکن
تم انہیں پھول کہو گے کب تک

ریگِ صحرا میں سلگتے دیپک
راگ دیپک کے سنو گے کب تک

اب تمہیں خشک کرے گا سورج
غسلِ تہمت سے بچو گے کب تک

آؤ دریا میں نہائیں چل کر
بند کمرے میں رہو گے کب تک

جمیل کلیمی

ذات پر اپنی نظر رکھیے جناب
دوسروں کی کیوں خبر رکھیے جناب

صرف پھولوں کو نہیں کانٹوں کو بھی
ہو سکے تو ہمسفر رکھیے جناب

لے کے تلواریں نکل آئیں گے لوگ
بند مٹھی پر نظر رکھیے جناب

برف خانے میں کبھی سورج کو بھی
ساتھ لاکر دوپہر رکھیے جناب

گرم انگارے ہیں کانٹے ہیں یہاں
نیند اگر آئے تو سر رکھیے جناب

بھولے بھٹکے شعر آجائیں جمیل
ذہن کے دروازے در رکھیے جناب

ساحل سلطانپوری

میں درسگاہِ خرد میں اک اضطراب میں تھا
کہ بابِ حرفِ جنوں بھی مرے نصاب میں تھا

تمام خشک زمینیں نگل گیا پانی
میں ایک ننھا جزیرہ تھا کس حساب میں تھا

بہارِ چند نفس تھی گلوں کا سرمایہ
حیات جیسے کوئی نکہتوں کے خواب میں تھا

جنوں کی ژرف نگاہی نے رازِ دل کھولے
دیارِ عقل میں ہر آدمی نقاب میں تھا

عجب ہوا تھی اُڑا لے گئی درختوں کو
مگر وہ سبزہ تو اپنی آب و تاب میں تھا

شبِ فراق کا چہرہ چمک اُٹھا ساحل
کسی خیال کا شعلہ سا پیچ و تاب میں تھا

ایونگ کرسچین کالج۔ الہ آباد-۳　معرفت کلیم بک ڈپو بتاس بازار احمد آباد　ہاشم منزل سول لائن سلطان پور یوپی

ہریانہ میں دس سالہ سودمند ترقیاتی سرگرمی

- ملکی شرح کے مقابلہ میں چار گنا ترقی ہوئی ہے۔
- فی کس آمدن کے لحاظ سے ہریانہ کا ملک میں دوسرا مقام ہے۔
- زراعتی پیداوار 25.92 لاکھ ٹن سے بڑھکر 50.49 لاکھ ٹن ہو گئی۔

ریاست 13.55 لاکھ ٹن خوردنی اجناس مرکزی ذخیرہ کو دے رہی ہے
زیادہ پیداوار دینے والی فصلوں کے تحت آنے والا رقبہ 1.41 لاکھ ہیکٹر سے بڑھکر 15.23 لاکھ ہیکٹر ہو گیا ہے۔
مندرجہ طریق کار سے مزید 4.06 لاکھ ہیکٹر اراضی کو زیر آبپاشی لایا گیا :-
(1) لفٹ آبپاشی سکیم کے تحت پانی کو 570 فٹ اونچا اٹھاکر۔
(2) 638 کیوزکس پانی کو رِسنے سے بچاکر۔
(3) 1426 کیوزکس سیلاب کے پانی کو استعمال میں لاکر اور
(4) 1575 کیوزکس زیرِ زمین پانی کو بروئے کار لاکر۔
زرعی کاموں کے لیے کل میسر بجلی کا 45 فیصد استعمال ہو رہا ہے بجلی کی فی کس کھپت 57 یونٹ سے بڑھکر 132 یونٹ ہو گئی ہے۔
کمزور طبقہ کے لیے 16,000 مکانوں کی تعمیر کی گئی۔ ہریجنوں کو 2 لاکھ کے قریب مکانوں کے پلاٹ دئے گئے مزید براں بے زمین افراد کو 3 لاکھ پلاٹ کئے گئے۔ اصلاح اراضی کے نتیجہ کے طور پر 50,000 بے زمین کنبے مستفید ہوئے۔
صحت اور علاج پر ہونے والا خرچ 4.60 روپے فی کس سے بڑھکر 10.79 روپے ہو گیا اور دوائیوں پر ہونے والا خرچ 21 پیسے فی کس سے بڑھکر 99 پیسے ہو گیا ہے، جو کہ ملک میں سب سے زیادہ ہے۔
کنبہ بندی سے متعلقہ امور میں ہریانہ رہنمائی کر رہا ہے اور 22.3 فیصد نس بندی کے نشانہ کو حاصل کیا ہے۔
ہریانہ روڈ ویز کی بسیں 4.08 لاکھ کلومیٹر روزانہ مسافت طے کرتی ہیں۔ جو زمین سے چاند تک کا فاصلہ ہے اور روزانہ 4.25 لاکھ مسافروں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جاتی ہیں۔

ہریانہ ایک قابلِ دید اور فرحت افزا مقام ہے۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے دبچک، گولڈن اوریل، ہوسلنگ ٹیل، بسپل سن برڈ، میتور، میگپائی اور روزی پیلیکن جیسے نام ہندوستان کے سیر و سیاحت کے نقشہ پر آچکے ہیں۔

جاری کردہ:
محکمہ تعلقات عامہ۔ ہریانہ

لائٹ پول

سرور عالم ماہلی

"ہلو — !"

"جعفری صاحب"

"یس جعفری ..... ؟"

"— آج صبح آپ کے فلیٹ پر زاہد کو پوچھتا ہوا کوئی آیا تھا ؟"

ہاں — ، ہاں ، میں نے ان کا پتہ بتا دیا تھا — تمہارے ہی پاس تو رہتے ہیں بلاک سی ٹین میں — میں نے سمجھا دیا تھا بھئی ۔ سڑک کے اس پار ایک پارک ہے ۔ جس کے گرد چار منزل کے فلیٹ ہیں ۔ اسی میں بلاک سی ٹین ہے "۔

"— اور وہ بھٹکتا ہوا میرے پاس آ گیا !"

"تم بھی تو اسی بلاک میں رہتے ہو ، زاہد کا فلیٹ بتا دیا ہوتا "

"— رہتا تو ہوں لیکن زاہد صاحب سے میری نہ ملاقات ہے ، نہ شناسائی "

"کمال ہے ، کیا نمبر ہے تمہارا ..... !"

"سی فورٹین"

"حیرت ہے وہیں رہتے ہو اور جانتے نہیں "

"—"

"تو کہاں گیا وہ — !"

"اس نے اٹیچی میرے یہاں رکھ دی ہے اور کہیں چلا گیا ہے ۔ شام کو آئے گا اور آپ کے پاس جائے گا — "

"میرے پاس کیوں ۔ ؟"

"پتہ نہیں "

"ایسا تو نہیں ہے کہ زاہد وہاں — لیکن وہ تو میرے اچھے دوستوں میں ہیں مجھے ضرور بتاتے — تو وہ میرے پاس آئے گا ، لیکن کس وقت ؟"

"شاید میرے یہاں سے سیدھا آپ کے پاس جائے — !"

"یار اسلم ٹرائی کرو"

"— ایسا ہے کہ میں آج ذرا دیر سے گھر پہنچوں گا ۔ — اس سے پہلے وہ چلا جائے گا — پلیز جعفری صاحب — اس کی ہیلپ کرو "

"اچھا او ۔ کے "

میں سوچنے لگا کیا مصیبت سر پڑ رہی ہے ۔ پانچ بجتے ہی مجھے گھر پہنچنے کی فکر ہوئی ، ایک جگہ جانا تھا لیکن میں نے کار اسٹارٹ کی اور گھر روانہ ہو گیا — گھر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا — ابھی تک وہ نہیں آیا تھا ۔ بیگم نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ سے روکتے ہوئے پوچھا —

"کوئی آیا تھا ؟"

"نہیں تو ..... کیوں اس قدر پریشان کیوں ہو — !"

"کچھ نہیں پریشانی کیا — تم دروازہ لوک کر دینا "

"کچھ بتاؤ گے بھی کہ حکم ہی چلانا شروع کر دیا — پولیس پیچھا کر رہی ہے کیا — ؟" بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" وہ جو صبح آیا تھا ، زاہد کو پوچھتا ہوا ۔ زاہد کا فلیٹ اسے نہیں ملا ۔ وہ شام کو آنے والا ہے ۔ وہ اسلم کے فلیٹ پر پہنچ گیا — لیکن اسلم بھی عجیب ہے ۔ زاہد کو جانتا ہی

○ میکا کو اینڈ بنجا تھان ایس اے ۱۴ کیلاش کالونی ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸

نہیں، اسی بلاک میں رہتا ہے۔ صرف چار فلیٹ کا فرق ہے، آج آفس میں اس نے فون کیا تھا۔"

"تو یہ ہے ——! میں تو گھبرا گئی —— کیا قامت آرہی ہے کہ تم اس قدر حواس باختہ ہو۔"

بیگم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا

"وہ آئے تو کہہ دینا، میرے ہسبنڈ نہیں ہیں۔ میں کسی زاہد کو نہیں جانتی، —— وہ ٹور پر گئے ہیں۔ کوئی ٹھیک نہیں کب آئیں۔"

"لیکن کیوں —— ؟ چھوڑ آؤ لے جاکر زاہد کے یہاں ——"

"—— یہی ڈر یہ ہے کہ زاہد کہیں شفٹ کر گئے ہوں۔ یا گھر چلے گئے ہوں، تو میرے گلے پڑے گا۔ آج رات کو ——!"

"ہاں یہ تو مشکل ہے۔" بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ونڈو سے بات کر لوں گی۔"

میں سات بجے تک گھر سے باہر نہ نکلا۔ کچھ وقت اور گزرا تھا کہ کال بل کا شور ہوا۔ میں نے بیگم کی طرف دیکھا اور وہ اُٹھ کر سامنے کی ونڈو پر گئیں۔

"کون صاحب ——!"

"جعفری صاحب ہیں۔"

"جی نہیں ——"

"صبح تھے ——"

"جی ہاں، وہ سرکاری ٹور پر گئے ہیں۔ وہ نہیں مل سکتے، کیونکہ ٹھیک نہیں کب آتے ہیں۔ ٹور زیادہ دن بھی چل سکتا ہے۔ کوئی بات ہو تو کہہ دیجئے، میں کہہ دوں گی۔"

"وہ زاہد صاحب جو جھیل خاص میں رہتے ہیں، ان کے یہاں جانا تھا۔"

"میں کسی زاہد کو نہیں جانتی۔ میرے ہسبنڈ جانتے ہوں گے۔"

یہ کہتے ہوئے بیگم نے ونڈو بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد، میں دبے پیروں سے دروازے پر گیا۔ دروازے کے سوراخ سے باہر دیکھا۔

وہ کھڑا تھا —— خاموش پریشان ——!

اس کی اٹیچی زمین پر رکھی تھی —— وہ بڑی حسرت سے میرے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا —— جیسے ڈی۔ ڈی۔ اے۔ نے اسے نصب کر دیا ہو ——! بالکل لائٹ پول کی طرح ...... !!

۵۵

نجات

شکیل پونم
عقیل قیس

میں کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں —— کرسی پر۔ اور میرے ساتھ میری بے چینی ہے۔

میز پر کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ سامنے کھڑکی ہے۔

کھڑکی کے باہر سڑک ہے۔ ہوٹل ہیں، دکانیں ہیں، شور وغل کی آوازیں ہیں لیکن انسان نہیں ہیں، کیوں کہ جو نظر آتے ہیں وہ انسان نہیں ہیں اور جو انسان ہیں وہ نظر نہیں آتے۔ اور میں سہما ہوا ہوں کہ اپنے آپ کو میں بھی دکھائی نہیں دے رہا۔

کرسی سے اٹھ کر میں کھڑکی کے پاس چلا آتا ہوں۔ ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ ہے، جو میرے دل کے قرار کی طرح فنا ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کا دھواں خلا میں گھیرے بنا رہا ہے۔ وہ امید بھری معصوم آنکھوں کے سائے ہیں، جو بڑے خوفناک ڈھنگ سے میرے وجود کو اپنے گھیرے میں لینا چاہتے ہیں اور میں سہما ہوا ہوں مجھے خوف آ رہا ہے اس کمرے سے، فرنیچر سے، کتابوں سے، سلگتی ہوئی سگریٹ سے، اس کے دھوئیں سے ہر چیز سے، ساری چیزوں سے ...... اور میں کھڑکی کے باہر یوں دیکھ رہا ہوں، جیسے ادھر دیکھنے سے مجھے امید بھری آنکھوں کے سائے سے نجات مل جائے گی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس طرح مجھے نجات نہیں مل سکتی، کیوں کہ نجات فرار میں نہیں، نجات کنارہ کشی میں نہیں نجات خود سپردگی میں ہے اور میں خود سپردگی کی تعریف نہیں جانتا ...... لیکن جب میں سپردگی کی تعریف نہیں جانتا، تب اس شدید درد کے احساس سے مضطرب کیوں ہوں! میں خود کو گنہگار کیوں محسوس کر رہا ہوں؟

...... در اصل میں سب کچھ جانتا ہوں، سب کچھ سمجھتا ہوں، لیکن کوئی ہوس ہے جو مجھے خوش کر دیتی ہے اور خوش ہو کر میں خود کو بیوقوف بناتا ہوں ...... لیکن جب میں یہ سب سمجھتا جانتا ہوں تو پھر بیوقوف کیوں بنتا ہوں .... کیوں نہیں خود کو معصوم محبت کے قدموں میں پیش کر دیتا ہوں، کیوں نہیں فدا ہو جاتا مجبور چاہتوں پر۔ کیوں نہیں فنا ہو جاتا بے قرار محبت کی آگ میں جل کر؟ ...... مجھے کوئی چیز روکتی ہے ایسا کرنے سے کہ وقت نے مجھے ایک عجیب خود غرضانہ نظریۂ حیات دیا ہے۔

کھڑکی کے باہر، سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت پہلے کی سی ہے۔ میرے ہاتھ کی سگریٹ ختم ہو چکی ہے اور میں دوسری سگریٹ سلگا لیتا ہوں اور دھوئیں کے مرغولے خلا میں چھوڑنے لگتا ہوں کہ اس بے چینی کے عالم میں، فریب زدہ معصوم آنکھوں کے سایوں سے بچنے کی حالت میں، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں سوچتا ہوں کہ کسی کے ساتھ کچھ ہو جانا بھی عجیب ہے اور سب سے زیادہ کسی انسان کے ساتھ کچھ ہو جانا تکلیف دہ ہے کہ کچھ ہو جانا نہ ہونا نہیں ہو سکتا کہ وقت کی تختی پر رقم شدہ داستانوں کی تحریریں مٹائی نہیں جا سکتیں کہ گناہ کا مرتکب انسان گناہ کے اقرار سے بچ نہیں سکتا ...... لگتا ہے، ذہنی کشمکش میرے وجود کا ایک حصہ بن چکی ہے میں جن خیالوں سے نجات چاہتا ہوں، ان خیالوں کا جال مجھے اپنی جکڑ میں اور کستا جاتا ہے میں اپنے ماضی کو فراموش کرنے کی طاقت کہاں سے پیدا کر دوں؟ کر تو دیں، جن کی داستانیں وقت کی تختی پر لکھ دی

○ ایم۔ ای۔ سکول، این۔ سی۔ ڈی۔ سی سونڈا، ہزاری باغ۔ (بہار)

گئی ہیں امیدیں، جنھیں میں جنم دے چکا ہوں، انھیں میں
کیسے فنا کر دوں ختم کر دوں۔۔۔۔۔۔
آج سے تین ماہ قبل وہ زندہ تھا اور میں سایوں
کے گھیرے سے آزاد تھا۔ وہ میرا دوست —— آج وہ
نہیں ہے اور میرے لیے فرار ممکن نہیں کہ اُمیدوں کا سیلاب
مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے کہ تین مہینے پہلے میں جبراً گناہ
کی دلدل —— میں پھنس کر لذتِ —— ناچشیدہ کو محسوس
کیا کرتا تھا۔ گوشت کے زہر کو پی کر قدرت کے راز کو سمجھنے
میں لگا رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ آج کیوں نہیں پھر ایک بار ویسی
خواہش دل میں اٹھتی ہے؟ یہ فرار کی خواہش کیسی ہے؟
آج جب اپنی پرانی حرکتیں اپنا فرض بن چکی ہیں، تب میں
گناہ اور بداخلاقی کے خوف سے بے چین کیوں ہوں؟
۔۔۔۔۔ کہ جب میری زندگی کے اصول خودغرضی کی بنیاد
پر استوار تھے۔ تب امیدوں کے سایوں کو پیدا کرنے والی
حرکتوں سے مجھے بچنا چاہیے تھا۔ مگر اب تو میں ان کے بیچ
قید ہو چکا ہوں کہ یہ ایک مدت سے میری حرکتوں میں
پلتے ہوئے میرے گناہوں کا لہو پیتے رہے ہیں کہ اب
ان سے فرار ممکن نہیں۔۔۔۔۔۔!

میں کھڑکی چھوڑ کر ہٹ کھڑا ہوتا ہوں۔ دوسرے
کمرے میں آکر بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ آنکھیں موند لیتا
ہوں۔ یوں دل کا چین ڈھونڈھ رہا ہوں لیکن دُور دُور
تک کامیابی کا نام و نشان نہیں ایک گھٹن بھرا خوفناک گھیرا
مجھے اپنی گرفت میں لیے جا رہا ہے۔ میں خوفزدہ ہو کر آنکھیں
کھول دیتا ہوں۔ جسم پسینے سے شرابور ہے۔ کمرے میں
بھیانک خاموشی ہے —— میری بے بسی کا مذاق اُڑاتی
ہوئی۔۔۔۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔
میں اٹھ کر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگتا ہوں، لیکن
کوئی فائدہ نہیں۔۔۔۔ کہ فرار ممکن نہیں۔۔۔۔۔۔ کہ
نجات کا ایک ہی راستہ نظر آتا ہے —— سپردگی، اور
میں بےچین ہوں۔

کل شام میں اس کے پاس ایک ہفتہ بعد گیا تھا۔ اپنے
دوست کی موت کے بعد اس کے یہاں جانے میں میں نے
ایک دو دنوں کا فرق تو کئی بار ڈالا تھا لیکن اتنی بڑی مدت
کا فرق ڈالنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

کل جب اس نے کئی دفعہ اشاروں میں مجھے لہو کا زہر
پینے کی دعوت دی تب میں یوں ٹال گیا تھا۔ جیسے میں اس
کے اشاروں کو سمجھ ہی نہیں رہا ہوں میرے اس اخلاق
سے اسے گہرا صدمہ پہنچا۔ نراشا کے گہرے تو اس کے
ذہن پر پہلے ہی سے چھانے لگے تھے۔۔۔۔۔ لیکن کل
اس کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔۔۔۔۔۔!

میں کرسی پر بیٹھا خالی خالی نظروں سے اسے گھور رہا
تھا کہ اچانک وہ اپنی جگہ سے اُٹھی تھی۔ میرے قدموں میں
بیٹھ کر اپنا چہرہ میری گود میں چھپا کر، پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی تھی، بالکل ایک ننھی سی بچی کی طرح۔۔۔۔۔!
اور مجھے ایک بار لگا تھا کہ مجھے ہار مان لینی چاہیئے کہ فرار
ممکن نہیں۔۔۔۔۔۔!

کافی دیر تک وہ اسی طرح روتی رہی اور مجھے تبیس
دانت اور بیس ناخن ستاتے رہتے تھے کہ میں فرار اور
سپردگی کے فلسفوں کی چکی میں بڑی طرح پستا رہا تھا۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ آخر تھک کر وہ چپ ہو گئی تھی۔

بغل والے کمرے میں تین برس کا منّا سو رہا تھا۔ اچانک
وہ جاگ گیا اور چیخنے لگا، وہ اُسے اُس کمرے میں اُٹھا لائی۔۔۔
۔۔۔۔ اور منّے کا وجود پھر ایک دفعہ خود سپردگی کی طرف کھینچنے لگا۔
منّا جو مجھے اپنے (میرے اپنے) ہونے کے احساس سے بھر
جاتا ہے، جس سے بیگانے پن کی چادر میں نے ہزار بار اپنے
اوپر اوڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا، اس منّے نے
مجھے شکست دے دی کہ کانپتے ہاتھوں سے میں نے اس
سے منّے کو مانگ کر اپنی گود میں لے لیا —— اور امیدوں
کے سایوں کے گھیرے کے بیچ بری طرح قید ہوتا گیا۔۔۔۔۔
کہ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید فرار ممکن نہیں، کبھی نہیں!

۔۔۔۔۔۔ میں کمرے میں ہوں۔ میرے ساتھ میری
بے چینی ہے اور سایوں کے گھیرے ہیں —— خوفناک

(باقی ص ۱۴۸ پر)

مانگے کا اُجالا

ادب، فلسفہ اور فلسفیانہ تنقید

جس طرح معاشرتی نقادوں کے تنقیدی رویے ہمیں غیر ادبی مسائل میں الجھاتے ہیں اسی طرح فلسفی اور نفسیاتی نقادوں کی تنقیدیں ہمارے ذہن میں ادب کے متعلق ایسے غلط تصورات پیدا کرتی ہیں کہ ہم ادب کی اچھائی اور برائی کا تجزیہ ادبی قدروں کے بجائے اس اصول پر کرنے لگتے ہیں کہ ادب میں فلسفہ اور نفسیات کا عنصر کتنا اور کیسا ہے۔ ادب جس طرح سماج یا زندگی نہیں ہے اسی طرح وہ فلسفہ اور نفسیات بھی نہیں ہے۔ ادب ادب ہے اور اپنے طور پر فلسفے اور نفسیات سے استفادہ کرتا ہے۔ وہ نہ کسی فلسفیانہ نکتے کی تفسیر ہوتا ہے نہ کسی نفسیاتی الجھن کا حل پیش کرتا ہے۔ اس کا سروکار انسانی نفسیات سے ہوتا ہے، علمِ نفسیات سے نہیں۔ ادب میں جو کچھ نفسیاتی گہرائیاں ہیں وہ نفسیاتی کتابوں کی (CASE-HISTORIES) پڑھ کر حاصل نہیں کی جاتیں۔ اسی طرح ادب میں جو کچھ فلسفہ ہوتا ہے وہ فلسفے کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان افکار و خیالات کا نتیجہ ہوتا ہے جو فلسفیانہ نظاموں سے نکل کر انسانی دانشمندی کا جزو بن گئے ہیں۔ اسی لیے فن کار کے یہاں فلسفہ کم اور WISDOM زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے فن کے ذریعے کسی منضبط فلسفیانہ نظام کی تشکیل کی کوشش نہیں کرتا۔ کیوں کہ ایسا کرنا عموماً اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اگر ممکن ہو تب بھی — یعنی اگر فن کار خود فلسفی ہو تب بھی فن کے حدود میں فلسفے کی قدریں فن کارانہ قدروں کو کسی نہ کسی طرح مجروح کیے بغیر ممکن نہیں۔ یہ دیکھنا ادبی نقاد کا فرضِ اولین ہے کہ فن کار نے فلسفے کی تقلید میں اپنے فن کو کتنی گزند پہنچائی ہے۔ اگر فن کار نے فلسفے کو اپنا کر اپنے فن کو عظمت بخشی ہے تو یہ دیکھنا بھی نقاد کا کام ہے کہ اس کے فن کی عظمت کا سبب فن کارانہ جامعیت ہے یا فلسفیانہ بصیرت اور کیا محض فلسفہ اس بات کا اہل ہے کہ وہ فن کار کے فن کو بڑائی عطا کرے۔ اگر ایسا ممکن ہے تو پھر فن کاری جیسی کوئی چیز ہی نہیں۔ شاعر کو شاعر بننے سے پہلے فلسفی بننا چاہیے۔ وہ اگر اچھا فلسفی یا مفکر بن گیا تو بڑا شاعر بھی ہو گیا۔ یہ نہیں کہتا کہ فن کار فلسفی نہیں ہوتا یا فلسفے میں دلچسپی نہیں لیتا یا فلسفے کو ادب میں استعمال نہیں کرتا۔ یہ سب کام وہ کرتا ہے۔ لیکن یہ کام اس کی ادبی عظمت کے ضامن نہیں بنتے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو فن کاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس لیے نقاد تو یہی دیکھتا ہے کہ فن کار اپنے فن میں فلسفے کا استعمال کیسے کرتا ہے اور فن فلسفے کا کس قدر متحمل ہو سکتا ہے۔ نقاد فلسفے کی تفسیر و تاویل پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہتا ہے کہ فن اور فلسفہ کا رشتہ کیا ہے اور اس رشتے کو فن کار نے کیسے نبھایا ہے۔

شاعری ایک خود کفیل آزاد اور مقصود بالذّات سرگرمی ہے اس سے نہ کسی فلسفے کی تبلیغ کا کام لیا جا سکتا ہے نہ ترجمانی کا شاعری فلسفیانہ نظاموں سے فیض یاب ہوتی ہے لیکن ان کی باندی نہیں بنتی۔ شاعری فلسفہ کی خوشہ چیں ہوتی ہے لیکن بار برداری کا چوپایہ نہیں بنتی۔ شاعر ہر مناسب فلسفے سے اپنے کام کی چیزیں چن لیتا ہے اور شعر گوئی کے کام کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ فلسفے کے باغ کا گلچیں ہوتا ہے باغباں نہیں۔ فلسفے کی چمن بندی کا کام فلسفی کرتا ہے۔ وہ بیج ڈالتا ہے۔ کھاد استعمال کرتا ہے۔

پانی دیتا ہے۔ پودوں کو بڑا کرتا ہے۔ شاعر صرف پھول توڑتا ہے اور آگے نکل جاتا ہے، شاعر کسی فلسفیانہ خیال یا تصور یا نظریے کو اپنی شاعری میں پیش نہیں کرتا صرف اس کا استعمال کرتا ہے اور فلسفیانہ خیال کو اپنے شاعرانہ مقاصد کے لیے EXPLOIT کرتا ہے۔ خیال کو شاعری میں پیش کرنا اور چیز ہے اور خیال کو شاعری میں استعمال کرنا بالکل دوسری چیز۔ مثلاً ٹینی سن اور وکٹورین عہد کے دوسرے شاعروں پر ایلیٹ کو سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے صرف "خیالات" کو پیش کرتے تھے جب کہ ان کے برخلاف مثلاً شیکسپیئر "خیال" کو ایک زندہ حسی تجربے میں بدل کر اس کی پہنائیاں تلاش کرتا تھا۔ اسی لیے بڑا شاعر کبھی بھی کسی ایک فلسفی کا کاسہ لیس بن کر نہیں رہتا یہی نہیں بلکہ اس کے پورے فلسفے کو اپناتا تک نہیں۔ اپنانے کی بات جانے دیجیے اس کے فلسفے کو ایک فلسفی کی طرح پڑھتا تک نہیں۔ ایک عام آدمی کی طرح وہ اس کا اہل نہیں ہوتا کہ وہ کسی فلسفی کے نظام افکار کو مکمل طور پر سمجھ سکے اور اس پر عالمانہ دسترس حاصل کر سکے۔ اس لیے ایک فن کار کی حیثیت سے فلسفے میں اتنی ہی دلچسپی لیتا ہے جتنی کہ مثلاً ایک میز، کرسی، درخت، پھول، ہرن، بلبل اور شمع میں۔ جس طرح ان سب چیزوں کو وہ اپنی شاعری میں استعمال کرتا ہے اسی طرح فلسفی کے خیال کو EXPLODE کرتا ہے۔ مثلاً غالب نے وحدۃ الوجود کا تصور فلسفے سے لیا۔ کیوں کہ یہ ان کے کام کی چیز تھی، محض شاعری میں نہیں بلکہ ان کی زندگی میں بھی۔ وہ صوفی بنے ہوں یا نہ بنے ہوں لیکن اس تصور سے ان کے روحانی تجسس کے بہت سے تشنہ پہلوؤں کی تسکین ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو وحدۃ الوجود کے فلسفیانہ تصور کی تبلیغ یا تفسیر یا ترجمانی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ اس تصور کو اپنی شاعری میں بالکل شاعرانہ ضرورتوں کے لیے استعمال کیا۔ اس بات کا خیال رہے کہ شاعرانہ ضرورتوں میں فن کار کا حسی اور جذباتی تجربہ شامل ہے۔ اس لیے غالب کے اکاڈمک نقادوں کی طرح یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شاعرانہ ضرورتوں کا مطلب یہ ہے گویا غالب کے یہاں تصوف برائے شعر گفتن خوب تھا۔ شاعر کے لیے برائے شعر گفتن تو ہر چیز خوب ہوتی ہے اور فلسفہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ وہ کسی فلسفے کا پیرو نہیں بنتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی فلسفے کے افکار اس کے شعور کا جزو بن جائیں اور جس حقیقت کو وہ دیکھ رہا ہے اُسے زیادہ صاف طور پر دیکھنے میں اس کی معاونت کریں۔ اسی لیے شاعر کے یہاں ایک نہیں بلکہ مختلف فلسفیوں کے افکار کے ایسے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو باہم متضاد ہوتے ہیں لیکن شاعر کی حسیت کی آنچ پا کر ایسی ہم آہنگی اختیار کر لیتے ہیں جو اس کے فن میں تو قائم رہ سکتی ہے لیکن فن کے باہر منطق اور فلسفے کی دنیا میں برقرار نہیں رہ سکتی۔ شاعری میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ شاعر نے کون سے فلسفے کو اپنایا ہے بلکہ فلسفیانہ خیال کو بھی اپنے شاعرانہ مقصد کے لیے شاعر اسی طرح EXPLORE کرتا ہے جس طرح وہ کسی مذہبی یا سیاسی تصور کو۔

فن کار اپنے فن کے ذریعے نیا انسان تخلیق نہیں کرتا بلکہ آدمی جیسا کچھ ہے اسے پیش کر کے اس کی انسانی حدود اور پہنائیوں، کامرانیوں، المناکیوں، آرزوؤں اور تھرڈیوں کی آگہی بخشتا ہے۔ تصوریت فن کار کو جیتی جاگتی حقیقت سے بے نیاز کر دیتی ہے، فوق البشر اور انسانِ کامل اور نئے اشتراکی انقلابی آدمی کا فلسفیانہ آئیڈیل ہمیں انسان کے متعلق کچھ بھی تو نہیں بتاتا۔ وہ ادب جو آئیڈیل کو پیش کرتا ہے۔ اس کا طریقۂ کار بھی اپنی گرد و پیش کی زندہ داخلی اور خارجی حقیقت کی بجائے آئیڈیل کی تجریدی فضاؤں میں حرکت کرنے کا ہوتا ہے۔ شاعری یا تو شیلی کی شاعری کی طرح بہت ہی مہین RAREFIED ہو جاتی ہے یا اقبال، جوش اور سردار جعفری کی طرح خطیبانہ اور کتابی بن جاتی ہے۔ یہ بات ان شاعروں کے صرف اس کلام کے متعلق

کہی جارہی ہے جو آدم نو کے میلاد کی پیشین گوئی پر مشتمل
ہے ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ شاعری اچھی نہیں ہے ۔
خطابت کا اپنا ایک دھوم دھڑاکے والا اسلوب ہوتا ہے
جو اپنی جگہ خوب ہوتا ہے ۔ لیکن یہ اسلوب بڑا اسلوب
نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں جذبے اور خیال کے نازک
اور لطیف پہلوؤں کو پیش کرنے کے امکانات نہایت
ہی محدود ہوتے ہیں ۔ یہ اسلوب استعاروں کے بجائے
تشبیہوں اور علامتوں کی بجائے تمثیلوں سے اپنا
کام نکالتا ہے ۔ اس اسلوب میں مارچ کرتے ہوئے
فوجیوں کے قدموں کی رجزیہ دھمک اور ہمہمہ ہوتا ہے۔
رقص کرتے ہوئے جسم کے لہراؤ اور کٹاؤ نہیں ہوتے۔ بڑا
شاعر خطابت سے بھی کام لیتا ہے لیکن وہ اس کے متنوع
اور مختلف اسلوبی طریقہ ہائے کار میں سے ایک طریقہ
ہوتا ہے ۔ جب کہ چھوٹا شاعر اسے واحد طریقہ کار کے طور
پر استعمال کرتا ہے ۔ اسلوب میں نزاکتیں اور پہنائیاں اسی
وقت پیدا ہوتی ہیں جب فن کار اپنے تخیل سے حقیقت کا
ادراک کرتا ہے ۔ جیسا کہ شیکسپیر اور غالب نے کیا۔ پھر
تو زبان استعاروں اور علامتوں کی گنجان جھاڑیوں سے
ہزار بل کھا کر کبھی آہستہ خرام، کبھی خاموش کبھی بلند آہنگ
کے ساتھ گزرتی ہے اور اس کے پانیوں میں کبھی ترشے
ہوئے خیالات کے صاف اور شفاف پتھر چمکتے ہیں
تو کبھی موہوم اور نیم تاریک جذبات کی تہیں جھلکتی ہیں۔
غرض کہ خالص فکر اور تصوریت کے مقام پر شاعر کا جینا
خطرات سے خالی نہیں ہوتا ۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی
بڑا شاعر خالص فلسفی شاعر نہیں ہوتا ۔ بنیادی طور پر
وہ شاعر ہی ہوتا ہے ۔ اور فلسفے کو وہ ایک ذریعے کے
طور پر استعمال کرتا ہے منزل کے طور پر نہیں ۔ فلسفے کی
حلقہ بگوشی اس کی تجدید ہے، طاقت نہیں ۔ خود دو چار دی
فن کاروں کے فن کا مطالعہ یہ بات بتا دے گا کہ ان کا
رجحان کبھی انسانی کردار کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی بجائے
اس کردار کو اپنے فلسفے کی تمثیل کے طور پر پیش کرنے کا رہا

ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کردار کی
پیش کش میں تجریدی طریقہ کار اپنایا نہ جائے ۔ فن کار اس
طرح تخصیص سے تعمیم اور کردار نگاری کی بجائے تمثیل
نگاری کو رواج دیتا ہے ۔ بڑے فن کاروں نے انسانی
صورت حال کو اس کی TOTALITY کے ساتھ پیش
کیا ہے ۔ فلسفے سے وابستگی ایک ایسی آفاقیت کو جنم دیتی
ہے جو صورت حال کی حقیقی خصوصیات کی بجائے فکر و
خیال کی تجریدی فضاؤں کی حامل ہوتی ہے۔
اسی لیے نقادوں نے فن اور فلسفے کے رشتے
پر غور کرتے ہوئے نہایت احتیاط سے کام
لیا ہے ۔ یعنی انھوں نے اس بات پر دھیان
دلانے کی کوشش کی ہے کہ فن کی اپنی قدریں
ہیں اور محض فلسفے کی آستاں بوسی فن کار
کو عظمت اور تقدس عطا نہیں کرتی ۔ فن
اور فلسفے میں تعلق خاطر ضرور رہا ہے ۔
لیکن فلسفی نقاد غلطی وہاں کرتے ہیں جب وہ اس
تعلق کو ایک بنیادی قدر کے طور پر دیکھتے ہیں اگر دونوں
میں رشتہ ہے بھی تو بہت دور کا ہے ۔ فن اور فلسفہ دونوں
کے ڈسپلن جدا جدا ہیں ۔ فلسفے کا تعلق یا تو اکاڈمی سے
رہا ہے یا THEOSOPHY سے ۔ کسی نہ کسی طرح فلسفہ
مکتب سے وابستہ رہا ہے اور اپنی سسٹم بناتا رہا ہے جب
کہ فن کار بنیادی طور پر مکتب کا نہیں چوراہے اور چوپال
کا آدمی ہے ۔ اس کا تعلق مذہب سے رہا ہے ۔ لیکن مذہب
بھی بنیادی طور پر چوراہے اور چوپال کی چیز ہے جب کہ
تھیوسوفی اور تھیولوجی کلیسا اور دارالعلوم کی چیز ہے ۔ فن
کاری انفرادی سرگرمی ہے اور اس کا تعلق فن کار کے
حسی اور تخیلی تجربات سے ہے ۔ اس لیے فن کار سسٹم کا
اسیر نہیں ہوتا ۔ شیکسپیر ، غالب ، حافظ اور کبیر کے یہاں
ذرا فلسفیانہ فکر تلاش کرنے کی کوشش کیجیے ۔ آپ کو سخت
مایوسی ہوگی ۔ ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات
ملتے ہیں ۔ فلسفیانہ تفکر نہیں ملتا ۔ فن کار

نظام ہائے فلسفہ سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ ان خیالات سے متاثر ہوتا ہے جو ان نظاموں کے دیے ہوئے ہیں اور جو اس کے پاس عام تصورات کی شکل میں پہنچتے ہیں عموماً فن کار نے انھیں فلسفیانہ تصورات میں دلچسپی لی ہے جو اس کے وجودی مسائل کے حل اور رہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی، موت، خدا، کائنات اور انسان کے متعلق جب فن کار سوچتا ہے تو وہ ایک فلسفی کی طرح نہیں سوچتا۔ یعنی ان مسائل پر وہ کوئی اپنا فلسفیانہ نظام تشکیل دینا نہیں چاہتا۔ ان مسائل پر سوچ کر وہ لوگوں کی فکری اور دانشورانہ رہنمائی کرنا نہیں چاہتا۔ وہ تو ان مسائل سے پیدا شدہ اپنے حسی اور جذباتی تجربات کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ خدا کیا ہے۔ کیسا ہے، کیوں ہے؟ وہ تو یہ بتاتا ہے کہ خدا کے ساتھ یا خدا کے بغیر جینے کا کیا مطلب ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ موت کیا ہے اور موت کی طرف ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے یا موت سے سبق حاصل کر کے ہم اپنی زندگی کو کیا بنا سکتے ہیں۔ وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ موت کے سائے میں جینے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ موت زندگی کو کیسے بے معنی کر دیتی ہے اور موت کی حقیقت کیسی المناک، بھیانک اور درد ناک ہے، گویا فن کار بتاتا ہے کہ احساس کی سطح پر موت کے ساتھ جینے کا کیا مطلب ہے۔ موت کے تجربے کو گوارا بنانے کے لیے وہ مختلف طریقے سوچتا ہے۔ کبھی وہ مذہب اور روحانیت کا سہارا لیتا ہے اور ابدیت کے تصور میں تسکین پاتا ہے، کبھی تسلسلِ حیات اور قوتِ حیات کے فلسفے میں کبھی وہ موت کی بھیانکتا کا جواب عیش کوشی اور رندی اور غنیمت شمار عمر اور ہر چہ باد اباد اور فانی دنیا میں ہر لمحے کو جاوداں بنانے کے طریقوں کو اپنا کر کرتا ہے۔ غرض یہ کہ موت کی حقیقت اسے مریضانہ رومانیت سے لے کر حزنیہ افسردگی، المیہ، کرب اور روحانی سکون، سرشاری کی مختلف کیفیات سے دوچار کرتی ہے اور ہر شاعر کا موت کی طرف رویہ نہ صرف یہ کہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے بلکہ خود اس کے یہاں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ چناں چہ موت کے متعلق بھی وہ فلسفیانہ طور پر سوچتا نہیں بلکہ ضرورت کے مطابق وہ فلسفوں سے ایسی باتیں چن لیتا ہے جو موت کے مسئلہ پر اس کی جذباتی تشفی کے لیے کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔

بڑا شاعر نہ غم پسند ہوتا ہے نہ نشاط پسند، نہ رجائی ہوتا ہے نہ قنوطی۔ شاعر کے لیے منفی اور مثبت رویے کی اصطلاحوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے ایسے الفاظ صحافتی نقادوں کے آسان سہارے ہیں کیوں کہ وہ فکر کی طرح احساس کی بھی بکتر بند تقسیم کے رسیا ہوتے ہیں اور جب تک شاعری سفید اور سیاہ رنگ میں ان کے سامنے نہیں آتی تب تک وہ شاعر اور شاعری کے متعلق اپنا "رویہ" اور اپنی "فکر کی سمت" کا تعین نہیں کر سکتے اسی لیے ایسے نقادوں کے لیے محض خیالات یا شعور یا دو ٹوک رایوں یا فکر کی متعین سمت والی اکہری شاعری کی جو کشش ہے وہ پیچیدہ شاعری کی نہیں۔ فکر کی سطح پر نقاد کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی تنقید میں ہر چیز اور ہر انسانی معاملے کے متعلق دو ٹوک رویے تشکیل دے۔ لیکن احساس کی سطح پر فن کار کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے رویے یا نقطۂ نظر میں قطعیت پیدا کرے۔ فن کار تو احساس کی دھندلی ملگجی اور جھٹپٹے والی فضاؤں کا ہی سیاح رہے گا۔ اس کا تو کام ہی احساس کے ان نازک اور لطیف رنگوں کو دیکھنا ہے جو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایک چوکھے رنگ میں ڈوب کر نکلے۔ نہ تو وہ مکمل طور پر رجائی بن سکتا ہے نہ قنوطی۔ نہ غم پسند نہ پُر نشاط نہ انسان دوست نہ انسان دشمن۔ یہ نہیں کہ وہ تضاد کو روا رکھتا ہے بلکہ تضاد کو ہم آہنگی میں بدل دیتا ہے۔ وہ غم اور نشاط دونوں کو TRANSCEND کر جاتا ہے اور جس مقام پر پہنچتا ہے وہاں غم نشاط کا رنگ لیے ہوتا ہے اور نغمۂ نشاط میں بھی غم کی حزنیہ لے کا زیر و بم ہوتا ہے اس لیے فن کار کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے حسی

تجربہ کو نقاد کی طرح دانش ورانہ قطعیت کے ساتھ پیش کر سکے
کسی بھی معاملہ میں فن کار سے دو ٹوک رویے یا نپی تلی رائے
یا فکر کی ایک معیّن سمت یا صاف اور واضح نقطۂ نظر
کے مطالبے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حسّی تجربے کی دھندلکے
کی فضا سے نکل کر دانشوری کے سو کینڈل پاور والے
بلب کے نیچے بیٹھ کر چارٹ اور گراف اور فارمولے کی زبان
میں ایک چاق و چوبند بیوروکریٹ کی طرح صاف ستھری
صحافتی زبان میں اپنے رویئے یا اپنی رائے کا اظہار کرے۔
ایسی رائے وہ دے سکتا ہے لیکن یہ رائے پھر فن کار
کی رائے نہیں ہوگی اس کی رائے اس کے جذباتی رویئے
کی شکل میں صرف اس کے فن میں ظاہر ہو سکتی ہے اور
اپنے فن کے باہر دانش ورانہ سطح پر وہ جو کچھ سوچتا
ہے۔ اس کی قدر و قیمت اتنی ہی ہوگی جتنی کہ میرے
یا آپ کے خیالات کی۔ اس لیے ہر اس کوشش کی سخت
حوصلہ شکنی کرنی چاہیے جو فن کار کو اپنے فن کے باہر اپنے
رویّوں کی تشکیل پر اکساتی ہے اور اسے دانش ورانہ
سطح پر اپنی رائے اور اپنے رویئے کو FORMULATE
کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ صنعتی نظام کی طرف فن کار کا رویّہ
کیا ہے؟ کیا وہ اسے پسند کرتا ہے یا ناپسند۔ کیا وہ اسے قائم
رکھنا چاہتا ہے یا ختم کرنا چاہتا ہے؟ ایسی سب باتیں بے معنی
ہیں۔ کیوں کہ ایسی باتیں کرنے کا مطلب ہے آپ فن کار کو
اس کے حسّی اور جذباتی تجربے کی پیچیدہ مبہم اور رنگین فضا
سے باہر نکال کر فکر و دانش کی سطح پر کھینچ لانا چاہتے ہیں۔
اور یہ سطح اس کی جولانگاہ نہیں اس سطح پر تو وہ بھی
نقاد کے ہی قد و قامت کا آدمی بن کر رہ جائے گا اور
اکثر و بیشتر تو اس سے بھی کم قد کا۔ اسی لیے میں بڑے بھائیوں
کی ان تنقیدوں کو نہایت مشکوک نظر سے دیکھتا
ہوں جن میں وہ کسی نظام حیات یا نظامِ معاشرہ یا سائنس
یا مذہب کے متعلق اپنی دو ٹوک رائے یا اپنے طے شدہ فیصلوں
کا اظہار کرتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ فن کار کو بھی انہیں
کی طرح تخلیقِ فن سے قبل ایسی رایوں سے ایسے نتائج اور
ایسے فیصلوں پر پہنچنا ضروری ہے۔ جو چیز صحافت میں آسان
ہے وہ ادبی تخلیق میں ناممکن ہے۔

وارث علوی (شعر و حکمت، حیدرآباد)

توانا کردار

مولانا صلاح الدین نے اپنے موقف کے سلسلے میں کبھی
کسی کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ ادبی نظریات کے ضمن میں
بھی ان کی رائے غیر متزلزل تھی، وہ ادب کو کسی مقصد یا
نقطۂ نظر کے تابع قرار دینے کے سخت مخالف تھے اور محض
اسی بنا پر انھوں نے ترقی پسند تحریک کی مخالفت کی تھی۔
اس سے ترقی پسند حلقے میں یہ غلط فہمی عام ہوگئی تھی کہ مولانا
شاید بورژوا تحریک کے حامی ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ مولانا
خود مساوات اور انسان دوستی کے مبلغ تھے اور انھوں نے ساری
عمر جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے ایک شدید تگ و دو
کی تھی لیکن وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ ادب ذات کا اظہار ہے،
کسی نظریے کی تبلیغ کا آلہ نہیں، اسے سرمایہ داری کی مخالفت
میں استعمال کیجیے یا اس کی حمایت میں، خود ادب کو اس سے
سخت صدمہ پہنچے گا۔ وہ ادب کی تخلیق کے ضمن میں "ایسا
ہونا چاہیے" کے قائل نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یوں
ادبی تخلیق کی خود روانی مجروح ہو جاتی ہے۔ گلڈ کے سلسلے میں
بھی مولانا کا موقف صاف اور توانا تھا اور اس سوال پر بھی
وہ سمجھوتہ کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ کردار کی یہ توانائی
اور ارادے کا یہ ثبات مولانا کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔

وزیر آغا (شام و دوستاں آباد)

بزمِ احباب

"تحریک" جون ۷۶ء کے شمارہ میں آپ نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی ترجمانی کا حق جس خلوص سے ادا کیا ہے اس کے لیے صرف میں ہی شکرگزار نہیں ساری مسلم برادری آپ کی ممنون ہے۔

ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ شاید ہندوستان میں سب سے بڑا ادبی انعام ہے اس لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "آوارہ سجدے" کے سوا کیا کوئی دوسری کتاب ساہتیہ اکیڈمی کی اُردو کمیٹی کے ذی علم ممبروں کے علم یا مطالعہ میں نہیں آئی تھی جو انعام کی مستحق قرار دی جاتی؟ اگر جواب میں خاموشی ہے جو اب تک برتی جا رہی ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ دوست نوازی اور پارٹی نوازی کی بدترین مثال ہی نہیں انعام کی بھی سراسر توہین ہے۔

"سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ" بقول ڈیمٹروف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو "قدر و قیمت میں پارٹی کے ہزار ممبروں سے زیادہ ہیں" اس لیے انھیں اس سے بحث نہیں کہ "آوارہ سجدے" کی ادبی حیثیت کیا ہے۔ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی قائم کی ہوئی ساہتیہ اکیڈمی کی اُردو کمیٹی کے فاضل ممبروں کی خدمت میں جنابِ کیفی اعظمی کی کتاب سے نظم "نہرو" کا ایک بند پیش کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اسے کیا معنی پہناتے ہیں۔ مجھے معاف کیا جائے میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ کمیونسٹ نقطۂ نظر سے نہرو کے ظاہر و باطن میں تضاد تھا

جن تقاضوں نے اس کو دیا تھا جنم
اُن کی آغوش میں پھر سمایا نہ وہ
خون میں دید گو نجے ہوئے
اور جبیں پر فروزاں اذاں
اور سینے پہ رقصاں صلیب
بے جھجک سب کے قابو میں آتا گیا
اور کسی کے بھی قابو میں آیا نہ وہ

(نظم نہرو صفحہ ۱۳)

معزز ممبروں کی خدمت میں کھلونے کے یہ مصرعے بھی اس درخواست کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ ان کے مشارٌ الیہ کی نشاندہی فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

سوت کے چیلے مونج کے استاد
صدر مٹی کا ربر کے وزیر

(کھلونے صفحہ ۱۷)

لینن سے عقیدت یا اظہارِ عقیدت کے لیے کسی لائسنس کی ضرورت نہیں لیکن کیا درج ذیل شعر کے بغیر لینن سے اظہارِ عقیدت کی تکمیل ممکن نہ تھی؟

رہ نما پھرتے ہیں یا پھرتی ہیں بے سر لاشیں
رکھ دو ہر اکڑی ہوئی لاش پہ تم سر اپنا

(لینن صفحہ ۷۶)

ابو محمد شبلی، لکھنؤ،

اگست کا تحریک ملا۔ کرشن موہن کی نظم "سوریہ پوجا" خوب صورت نظم ہے۔ لیکن ایک بات کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ غلام کو قتل کر کے اُس کی لاش اس کے گھر بھجوا دی جاتی تھی جس کا گوشت سب گھر والے پکا کر پڑوسیوں کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔

غلام کا گھر ہی کہاں ہوتا تھا؟ غلام تو قدیم زمانے میں کسی جنگ میں پکڑ کر یا کسی قافلے کو لوٹ کر انسانوں کو زبردستی بنایا جاتا تھا جو شہر شہر اور ملک ملک بکا کرتے تھے۔ یہ آج تک نہیں سنا کہ کسی شہر میں غلام کا گھر اور گھر والے بھی

موجود ہوں۔ اور پھر یہ پروگرام روزانہ ہوتا ہو۔ اس طرح تو شہر میں لاکھوں غلام آن کے گھر اور سارے آن کے گھروالوں کو تسلیم کرنا پڑے گا جو قرین قیاس نہیں۔

کمیری غزل کے نیچے پتہ میں بڑودہ مہاراشٹر لکھا ہوا ہے۔ بڑودہ مہاراشٹر میں نہیں بلکہ گجرات میں ہے۔

——— خلش بڑودوی، بڑودہ

'تحریک' کا اگست کا شمارہ ملا۔ حسب معمول اچھا ہے غزلیں مجموعی طور پر اچھی کہی جاسکتی ہیں۔ خصوصی طور پر کوئی غزل تو کیا کسی غزل کا ایک شعر بھی کوئی گہرا تاثر نہ چھوڑ سکا۔ سارے شعر بس ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور گزر گئے۔ نظمیں چند ہی ہیں لیکن اچھی ہیں۔ وزیر آغا کا ترجمہ محض لفظی ترجمہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ نثری نظمیں یوں ہی صبر آزما ہوتی ہیں پھر ان کا ترجمہ بھی اگر اسی طرح کیا جائے تو اور بھی جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔

'تحریک' میں ادھر کئی خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں، کیا بہ لحاظ صورت، کیا بہ لحاظ معنی۔ پرچہ اب واقعی دیدہ زیب اور وزنی ہوگیا ہے اگر چند ایک تبدیلیاں اور ہو جائیں تو کیا اچھا ہو۔ پہلی تبدیلی تو یہ کہ ہر ماہ کسی وابستۂ 'نئے' شاعر یا ادیب کو خصوصی طور پر متعارف کرائیں۔ ایک شاعر کی کم از کم تین انتخاب تخلیقات ہوں جن پر ادارہ کی طرف سے مختصر مگر جامع نوٹ ہو جس میں شاعر کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری کا بھی بھرپور تعارف ہو۔ 'تحریک' نے یہ سلسلہ پہلے چلایا تھا لیکن یہ سلسلہ کیوں بند کر دیا گیا میں نہیں کہہ سکتا۔ دوسری تبدیلی یہ ہو کہ سیاسی مضامین اور افسانوں کے ساتھ ایک نہایت اہم ادبی مضمون یا کوئی تحقیقی مضمون ہو۔ گو کہ "مانجھے کا اُجالا" یہ کمی کسی حد تک پوری کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود تحریک کا اپنا ایک اچھا مضمون ضرور رہنا چاہیے۔ اچھا مضمون نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی مضامین اور افسانے نثری حصے کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے کہ آپ کے اسی تازہ شمارہ میں ایک 'افسانوی رپورتاژ' موجود ہے۔ لیکن اس کا حاصل؟

مجھے یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ یہ رپورتاژ دے کر تحریک کے صفحات کو ضائع کیا گیا ہے۔ ایک ظاہری تام جھام اور بالکل سطحی اور عمومی باتوں کے علاوہ اس سے کچھ نہیں ملتا۔ ہر ایک شخص کا ایک الگ میدان ہوتا ہے۔ نشتر صاحب کے بس کی بات نہیں کہ مضمون بھی سپرد قلم کرنے لگیں۔ ابھی لوگوں سے ان کی شاعری ہی ہضم نہیں ہو پا رہی ہے یہ نثری سلسلہ اس پہ مستزاد۔

——— فاروق شفق، کلکتہ

اگست ۷۶ ۱۹ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ صوری اور معنوی اعتبار سے پسند آیا۔ خصوصاً عبدالرحیم نشتر کا افسانوی رپورتاژ، دیکھکر چونک گیا، انھوں نے اس رپورتاژ میں جس ماحول کی عکاسی کی ہے میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے اس کے تمام کرداروں سے بخوبی واقف ہوں۔ مدحت الاختر، اقبال اشہر، رشید النظفر، شاہد کبیر وغیرہ تمام لوگ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ مدحت الاختر صاحب جو کالج میں میرے استاد رہ چکے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ میرے اچھے دوست بھی ہیں ان کا ذکر بڑے پر لطف انداز میں کیا گیا ہے۔ رپورتاژ میں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا، اور نہ ہی کوئی بات حقیقت سے بعید ہے۔ میری یہ تمنا ہے کہ وہ اس طرح کی چیزیں ہمیشہ لکھتے رہیں اور آپ انھیں شائع کرتے رہیں تاکہ انھیں لکھنے کی تحریک ملے اور وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

——— فدا المصطفیٰ فدوی بھوپال

جنوری ۷۶ء کے تحریک میں مختار شمیم صاحب کا مراسلہ شائع ہوا تھا۔ جس کے جواب میں راقم نے آن کے اعتراضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انتخاب قصائد اردو کے حواشی سے کچھ نئے الفاظ اور اصطلاحات اور آن کے محل استعمال کی نشاندہی کی تھی۔ میرا یہ مراسلہ ماہ اپریل کے تحریک میں جگہ پاسکا۔ جس پر شمیم صاحب نے جون ۷۶ء میں پھر ایک مراسلہ شائع کرایا ہے۔ آن کے نقطۂ نظر سے میں نے اپنے مضمون اور سابقہ مراسلے میں خوردہ گیری اور تاویلات سے کام لیا

ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راقم "کتنی لاعلمی میں بھٹک رہا ہے"۔ میں شمیم صاحب کے اِن ارشادات سے صرفِ نظر کرکے، اُن کے اعتراضات اور حوالہ جات کا تجزیہ اور اپنے سابقہ اعتراضات کے لیے کچھ سندیں پیش کر رہا ہوں۔

(۱) بدل مایتحلل کے سلسلے میں شمیم صاحب نے اپنے سابقہ مراسلے میں سحر صاحب کی تائید میں رشید حسن خاں صاحب کی فرہنگ سے استدلال کیا تھا اور بحث کو مایتحلل تک محدود رکھا تھا لیکن انھوں نے یہ تسلیم کیا تھا کہ "مضمون نگار نے بدل مایتحلل کی صحیح نشاندہی کی ہے"۔ میں اپنے مضمون میں اس طرف توجہ دلا چکا تھا کہ بدل مایتحلل ایک مکمل طبّی اصطلاح ہے اس لیے 'بدل' کو 'مایتحلل' سے علیحدہ نہیں کیا جانا چاہیئے۔ پھر شمیم صاحب کے مراسلے کے جواب میں بھی اس بات پر زور دیا اور بطور ثبوت شعر میں بدل کی موجودگی اور ما کے صلے کی بات کہی تھی یعنی اس فکِّ اصطلاح کی غلطی کو دو طرح ثابت کیا تھا۔ شمیم صاحب نے اپنے حالیہ مراسلے میں (جون ۷۶ء) اس اصطلاح کی طبّی و فنّی تعریف نقل کی ہے اور لغوی حوالے بھی دیے ہیں۔ بہتر یہ ہوتا کہ اس زحمت کے بجائے وہ اِسے سمجھنے کی کوشش کرتے کیونکہ اس تعریف سے مجھے بھی اختلاف نہیں تھا۔ اُن کے حوالہ جات سے نہ تو کوئی نئی چیز ثابت ہوئی نہ بحث میں کوئی نیا گوشہ سامنے آیا۔ اصطلاح کی فنّی تعریف اور لغوی حوالوں سے پہلے اور اُن کے بعد شمیم صاحب نے جو جملے لکھے ہیں اُن کو پڑھ کر کون ہے جو یہ نہ کہے گا کہ شمیم صاحب جواب برائے جواب اور بحث برائے بحث کی "دھن میں" (یہ اُنھیں کے الفاظ ہیں) خود اب تک میرے واضح اعتراضات اور اس اصطلاح کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔ جبھی تو وہ یہ لکھ رہے ہیں —— "لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ سحر صاحب نے مایتحلل کے لغوی معنی لکھ کر مرادی معنی خوراک، روزی لکھ دیے ہیں اور بدل کو عام فہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ اس سے بدل کا لفظ نہ مہمل قلیفہ رہتا ہے نہ حشو"۔ حوالوں سے پہلے شمیم صاحب نے ان جملوں کا اضافہ کیا ہے: "سحر صاحب نے اِن تفصیلات کو حذف کرکے بالواسطہ تعلق کی بنا پر مایتحلل کے مرادی معنی وہ خوراک جو تحلیل ہو جائے لے لیے ہیں"۔ شمیم صاحب کے اس جملے کا مفہوم شاید ہی کوئی سمجھ سکے کہ "بالواسطہ تعلق کی بنا پر...... الخ" کس چیز سے بالواسطہ تعلق کی بنا پر...؟ اِسی قسم کا جملہ انھوں نے حوالوں کے آخر میں لکھا ہے "سبب یہ ہے کہ خوراک سے دونوں کا تعلق براہِ راست نہیں بالواسطہ ہے"۔

شمیم صاحب برافروختہ ہیں کہ رشید حسن خاں صاحب اور سحر صاحب کے مطالب میں فرق کیسے نکل آیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "...... ورنہ رشید حسن خاں اور ڈاکٹر [illegible] سحر کے اندراج کا مفہوم ایک ہی ہے۔ فرق صرف 'ہو چکی' اور 'ہو جائے' کا ہے"۔ میں اپنے سابقہ معروضات کو بحال رکھتے ہوئے شمیم صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ دونوں میں مجھے بیّن فرق نظر آتا ہے۔ اور یہ صرف 'ہو چکی' اور 'ہو جائے' کا فرق نہیں

پروفیسر سحر صاحب کی عبارت ہے —— "وہ چیز جو تحلیل ہو جائے۔ خوراک، روزی"۔ اور رشید حسن خاں صاحب کی عبارت (بحوالہ شمیم صاحب تحریک جنوری ۷۶ء) —— "وہ غذا جو ہضم ہو چکی ہو"۔ اِن دونوں عبارتوں کا تجزیہ اس طرح کیا جائے گا کہ (۱) دونوں حضرات نے بدل کو علیحدہ کرکے صرف مایتحلل کے معنی لکھے ہیں (۲) سحر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب کی عبارتوں میں قلت و کثرت کا فرق یہ ہے کہ خوراک اور روزی رشید صاحب نے نہیں لکھے ہیں (بحوالہ شمیم) سحر صاحب کے یہاں اِن دونوں لفظوں کا اضافہ اصطلاح اور لغت کی رُو سے بدل کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے اور غلطی کا اصل سبب ہے۔ (۳) میں نے اپنے مضمون (تحریک ۵؍۷۶ء) میں لکھا تھا کہ خوراک اور روزی مایتحلل کے نہیں بدل کے معنی ہیں۔

شمیم صاحب لکھتے ہیں مایتحلل کے معنی لغت نگاروں نے "وہ چیز جو تحلیل ہو جائے" لکھے ہیں۔ اس پر مرادی مفہوم یعنی خوراک اور غذا کا اضافہ بالترتیب سحر صاحب

اور رشید حسن خاں صاحب نے کیا ہے۔ "کسی لغت میں یہ موجود نہیں"، شمیم صاحب کو لغت نگاروں کے یہاں صرف ماتحلل کے معنی نظر آئے۔ یا خود انھیں نے بدل کو علیحدہ رکھ کر معانی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ۹ آگے لکھتے ہیں (حوالہ سابقہ جملوں سے مربوط) "بدل ماتحلل کے معنی لغات میں 'عوض چیزے کہ تحلیل می شود از بدن' اور 'عوض اس چیز کا جو تحلیل ہو جائے۔' ملتے ہیں۔ (غیاث اللغات۔ فرہنگ آنند راج جلد اوّل۔ نور اللغات جلد اوّل) خوراک یا غذا کا یہاں بھی ذکر نہیں۔"

ان حوالوں کی روشنی میں شمیم صاحب سے میں یہ عرض کروں گا کہ (۱) لغت نگاروں نے سحر صاحب اور رشید صاحب کی طرح بدل کو ماتحلل سے الگ کرنے کی غلطی نہیں کی ہے۔ اور اس سے میرے ہی دعووں کی تائید ہوتی ہے۔

اُردو لغت نگار نے اصطلاح کے صرف لغوی معنیٰ لکھے ہیں۔ اور فارسی لغت نگار کے ذہن میں اصطلاح کا فنی مفہوم بھی تھا چنانچہ اس کی تعریف میں "از بدن" کا اضافہ ہے۔ ظاہر ہے کہ 'بدن میں' ایندھن کے طور پر کوئلہ یا لکڑی نہیں جھونکی جاتی بلکہ غذا داخل کی جاتی ہے اور یہی غذا تحلیل شدہ اجزا کا بدل بنتی ہے۔

(۲) نہیب کے صحیح مدلول اور زیر بحث دونوں شعروں میں اس کے محلِ استعمال کے سلسلے میں محترم شمیم صاحب نے غیاث، فرہنگ آنند راج اور نور اللغات کے حوالے اپنے مراسلے میں درج کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان سے "صحیح نتائج اخذ کرنا غالباً زیادہ دشوار نہ ہوگا۔"

شمیم صاحب نے اپنے حوالوں سے نتائج اخذ نہیں کیے ہیں حالانکہ یہ ضروری تھا۔ چنانچہ یہ کام راقم السطور انجام دینا چاہتا ہے۔ شمیم صاحب کا دعویٰ ہے کہ "سودا نے یہ لفظ عرفی سے لیا ہے اور ذوق کے پیش نظر عرفی اور سودا دونوں کے شعر رہے ہوں گے۔" "قصیدے کی مبالغہ آرائی کے انداز کا بھی تقاضا ہے کہ نعرے اور للکار (یا خوف و دہشت) سے وہ کام ہو جائے جو حقیقی غارتگری سے بھی نہیں ہو سکتا۔"

چونکہ آخری دو باتوں کا تعلق شعر میں لفظ نہیب کے محلِ استعمال سے ہے اس لیے یہ بحث بعد میں کی جائے گی پہلے لغوی بحث اور شمیم صاحب کے لغوی حوالوں کا تجزیہ ضروری ہے۔

شمیم صاحب نے اپنے مراسلے کی ابتدا میں لکھا ہے کہ "فارسی اور اردو کے لیے عربی سے واقفیت مفید ہے لیکن عربی الفاظ کے سلسلے میں فارسی یا اردو کے تصرفات و اختلافات کو عربی قواعد یا عربی لغات کی مدد سے رد نہیں کیا جا سکتا" لہٰذا شمیم صاحب کو عربی لغات اور عربی قواعد کا بار بار ذکر پسند نہیں لیکن ان کے دونوں فارسی حوالوں میں "عربی بالفتح" اور "عربی الاصل باشد" کے الفاظ سے لغت نگاروں کے اس رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ فارسی تصرفات کے باوجود وہ لفظ کی اصل اور اس کے اصل مدلول سے صرفِ نظر کرنا نہیں چاہتے۔

شمیم صاحب کے پیش کردہ حوالوں میں سے حوالہ (الف) میں غیاث نے پہلے نہیب بکسرتین کے معنی خوف و دہشت وغیرہ لکھے ہیں اور پھر بفتح اوّل کے معنی غارت، غنیمت وغیرہ۔ شمیم صاحب نے غیاث کا پورا حوالہ نقل نہیں کیا۔ ورنہ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ غیاث نے مؤخر الذکر کے معنی کے لیے کئی اور لغات کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اور اوّل الذکر معنی بلا حوالہ نقل کیے ہیں۔

حوالہ (ب) میں لفظ کی ان دونوں صورتوں کے علاوہ لفظ "نہیو" کی اصل سے بھی بحث کی گئی ہے بکسرتین والی صورت کو اس نے فارسیوں کا تصرف بتایا ہے اور ان معنوں کے لیے لکھا ہے کہ "پس بمعنی اوّل مجاز باشد"۔ گویا یہ مجازی معنی ہیں۔ اس کے بعد فارسی میں مستعمل (چند معنوں) کے لیے عرفی کے قطع بند دو شعروں سے سند پیش کی ہے۔

ان دونوں فرہنگوں میں لفظ کو عربی الاصل بتایا گیا ہے۔ اور نہیب کو امالۂ نہاب بتایا گیا ہے جو خاصا محلِ نظر ہے۔ اگرچہ شمیم صاحب کو عربی قواعد کا ذکر گراں گزرتا ہے۔ لیکن یہاں میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ عربی کے قاعدہ عربی کی رو سے نہاب کا امالہ نہیب (بکسرتین) ہو نہیں سکتا۔

اس صورت میں اس اختلاف کی تطبیق یا تاویل کی صرف یہی صورت ذہن میں آتی ہے کہ یا تو اس تبدیلی پر امالہ کا اطلاق غلط کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ جس طرح اس لفظ کے فارسی مدلول میں تصرف ہوا ہے اسی طرح امالہ بھی غیر عربی قاعدے کے مطابق ہوا ہوگا۔ اور پھر ہم اسے نہاب کی تفریس کہیں گے۔

حوالہ (ج) میں اس لفظ کے عربی الاصل ہونے کی طرف اشارہ تو کیا گیا ہے لیکن اس کا صرف فارسی مدلول بیان کیا گیا ہے۔ اور سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا فرہنگوں کے بخلاف نہیب بروزن نقیب کو غلط بھی بتایا گیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نور اللغات کے اس حوالے میں خوف، ڈر دہشت کے معنی لکھ کر آدج کے اس شعر سے سند پیش کی گئی ہے۔

قریب و دُور تھا یکساں نہیبِ جاہ و جلال
دُکانوں پر تھے سراسیمہ کوفے کے بقّال

"نہیبِ جاہ جلال" اگر ترکیب ہے اور نہیب کے بعد واو عطف نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے معنی جاہ و جلال کا خوف، ڈر دہشت ہوں گے اور کوئی اچھا معنی خیز مفہوم بر آمد نہیں ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر جاہ و جلال کو استعارۃً نہیب (بفتح اول) مان کر "غارت گر" کہہ دیا جائے تو شعر میں معنویت اور شعریت بہت بڑھ جائے گی۔ اس طرح شعر میں آدج کے محلِ استعمال سے لغت نگار کے معنی مختلف ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح اس حوالے کا یہ دوسرا مختلف فیہ پہلو ہوگا۔

ڈر اور خوف و دہشت کے معنی عربی کی مستند اور عام مطوّل اور مختصر فرہنگوں میں کہیں نہیں ملتے چنانچہ (الف) عربی زبان کی مستند ترین اور مطول لغتوں میں سے ایک "لسان العرب" میں اس مادّے کے تمام مشتقات میں سے کسی سے بھی یہ معنی لفظاً و معناً بر آمد نہیں ہوتے۔ حوالے کے لیے لسان العرب کی جلد "ب" مطبوعہ قاہرہ ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ (ب) مستند، مختصر اور سہل الحصول عربی فرہنگ المنجد میں بھی اس لفظ کے مدلولات کا یہی حال ہے۔

خوفِ طوالت سے حوالہ حذف کیا جاتا ہے۔

اس بحث میں راقم اس بات پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے کہ سودا اور ذوق کے زیر بحث اشعار میں "غارت کرنا" کا مفہوم زیادہ صحیح، انسب اور ارجح ہے۔ ایک اور بات کی وضاحت یہاں ضروری ہے اور وہ یہ کہ غارت کا مدلول اردو محاورے کے بخلاف عربی میں "ہجوم علی الاعداء" دشمن پر حملہ کرنا وغیرہ ہے۔ اسی طرح فارسی میں بھی اس لفظ کا مدلول اردو سے ذرا مختلف صورت میں ملتا ہے۔ جس کی ایک مثال یہ شعر ہے ؂

زغارتِ چمنت بر بہار منّت ہاست
کہ گل بدستِ نواز شاخ تازہ تر ماند

(طالب آملی)

شمیم صاحب کے دعوے کے مطابق فرہنگِ آنند راج کی سند پر جو اس نے عرفی کے شعر سے پیش کی ہے یہ لازم نہیں آتا کہ سودا اور ذوق نے بھی ٹھیک انھیں معنوں میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ کیونکہ خود ایک ہی شاعر کے یہاں ایک ہی لفظ دو یا زیادہ معنوں میں مستعمل پایا جاتا ہے۔ عرفی نے نہیب دادن کے معنی (شمیم صاحب کے محولہ اشعار میں) بطورِ تشجیع للکارنے کے لیے ہیں۔ شعر یہ ہیں، اور "ہاں" سے اس استعمال کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ایک دوسرے قصیدے میں خود عرفی نے "نہیبِ عدل" کے معنی انصاف یا داد رسی کی عظمت و ہیبت، مراد لیے ہیں۔

نہیبِ عدلِ تو در طبعِ آسمانِ محیل
کہ شیشہ است لبالب زمردمِ آزاری
بسانِ رنگِ زلیخا ز زلفِ مشکینش
بروئے ہم شکند شیوہ ہائے طرّاری

جہاں تک سودا اور ذوق کے زیر بحث اشعار میں اس لفظ کے مدلول کا تعلق ہے وہ واضح طور پر عرفی سے مختلف ہے۔ سودا کے شعر میں "دشمن پر تلوار کھینچنا" "میدان" اور "استقامت" کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس سے حقیقی غارت گری ہی مراد ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ "میدان" کھیل کا نہیں ہو سکتا بلکہ میدانِ جنگ ہی ہے۔ تلوار کھینچنے کا یہ مدلول متعارف عند

مشہور ہے۔ (نور اللغات۔ فرہنگِ آصفیہ۔ امیر اللغات کسی میں
بھی دیکھا جاسکتا ہے)

اسی طرح ذوق کے شعر میں بھی ممدوح کے نہیب ـــــــ
دشمن پر حملے کا ذکر ہے کیونکہ دشمن کی تلواروں کے حلقہ ہائے
جوہر کا فلس ماہی کی طرح الگ ہو جانا ایک طرف تو حقیقی
جنگ کو ظاہر کرتا ہے دوسری طرف انتہائی مبالغے کو بھی پیش
کرتا ہے فلسِ ماہی بجائے خود شمشیر کے ذریعے قطع و برید کے
تصور کو ذہن میں ابھارتا ہے۔ حلقہ ہائے جوہر تک کا عدمِ
رفاقت، دشمن کی صفوں میں انتہائی ابتری کا بھی مظہر ہے سودا
کے شعر میں استقامت کا قدم نکل جانے میں بھی یہی مفہوم
پوشیدہ ہے

حسود کا مادہ ح۔س۔د۔ ہے معنی اور مفہوم کے اعتبار
سے جس طرح حاسد اور حسود (بالفتح) میں نمایاں فرق ہے۔
اسی طرح اُن کی جمع میں بھی فرق ہے۔ الفاظ کی جمع کے لیے
عربی میں قواعد اور اوزان مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ بعض
الفاظ کی جمع سماعی بھی آتی ہے۔ حسود (بالضم) کو فرہنگوں
نے حَسَد کی طرح مصدر بھی بتایا ہے (مثلاً صراح اور غیاث
غالباً غیاث نے صراح ہی سے لیا بھی ہے) منتہی الارب نے
حُسود۔ حسادۃ اور حسیدہ لکھا ہے۔ جبکہ حاسد کی جمع حُسَّد۔
حُسّاد اور حَسَدۃ بتائی ہے۔ اور حَسود (بالفتح) کی جمع حُسُد
(بضمتین)۔

فارسی میں عام طور پر اس لفظ (حاسِد) کی جمع جو دیکھنے
میں آتی ہے وہ حُسّاد ہی ہے یا پھر فارسی والے اپنے قاعدۂ
جمع کے مطابق "ان" بڑھا کر حاسدان بنا لیتے ہیں۔ اردو میں
بھی اکثر یہی دو جمعیں، ایک فارسی اور ایک عربی، کثیر الاستعمال
ہیں۔ اردو جمع سے یہاں بحث نہیں ہے۔

شمیم صاحب نے لفظ حَسود و حُسود میں التباس کی بات
کہی ہے۔ انھوں نے اپنے سابقہ مراسلے میں یہ اصول پیش کیا
تھا کہ فرہنگ میں دیے ہوئے معانی کو اشعار سے الگ کر
کے نہیں دیکھنا چاہیے حالیہ مراسلے میں انھوں نے پھر لکھا ہے کہ
"معانی لکھنے میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھا گیا ہے"۔ اس لیے
شمیم صاحب سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا زیرِ بحث
شعر میں بقول اُن کے صاف طور پر واحد ہی کا موقع نہیں
ہے۔؟ اگر ہے تو پھر جمع اور واحد غائب کی بحث برائے
بحث سے کیا فائدہ ہے۔

فلزات۔ اس لفظ کو میں نے اپنے مراسلے میں اُن الفاظ
کے ذیل میں لکھا تھا۔ جن میں کتابت و طباعت کی غلطی کا
عذر قابلِ قبول ہو سکتا تھا۔ اسی ذیل میں چند ایسے الفاظ کی بھی
نشاندہی کی گئی تھی جن کا ذکر اپنے مضمون میں میں نے نہیں کیا تھا۔
شمیم صاحب کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ واحد میں تائے تحتی لغات
میں بھی موجود نہیں۔ عربی کا ایک اور لفظ فِلْذَۃ بھی ہے جو
اس لفظ سے قریب المخرج ہونے کے علاوہ قریب المعنی بھی ہے
جس کے معنی جگر کا ٹکڑا، سونے کا ٹکڑا، وغیرہ آتے ہیں۔ اولاد
کے لیے فلذۂ کبدی کا لقب اسی لفظ سے مستعمل ہے جس طرح
لختِ جگر، جگر گوشہ وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ مجھے اسی لفظ
(موخر الذکر) کی بنا پر مغالطہ ہوا تھا۔ سحر صاحب کی فرہنگ
میں فلزات کا واحد فلزّ صحیح درج کیا گیا ہے۔

موکبِ اجلال۔ زیرِ بحث شعر میں موکب کے محلِ
استعمال اور اس کے لغوی و مرادی معنی کے اعتبار سے میں
نے شعر کی جو تشریح کی تھی شمیم صاحب نے اپنے حالیہ مراسلے
میں اُسے بڑی حد تک مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں
نے میری عبارت تو نقل کی ہے لیکن صرف مفید مطلب جملوں
ہی کو لیا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ موکب کے معنی سپاہ و لشکر
نہیں بلکہ پیدل یا سوار چلنے والوں کی جماعت کے ہوتے
ہیں جس پر ہم جلوس کا اطلاق کریں گے۔ شمیم صاحب لکھتے
ہیں کہ "لغات میں موکب کے معنی سپاہ و لشکر کے علاوہ
گروہ سواراں کہ در سواری امیر باشد ملتے ہیں۔ سحر صاحب
نے کثرت اجلال کے پیش نظر سپاہ و لشکر کے معنی لیے ہیں؟"

شمیم صاحب نے سپاہ و لشکر کے معنوں کے لیے کسی
فرہنگ کا حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔ اُن کے محولہ فارسی جملے
پر کیا جلوس ہی کا اطلاق نہیں ہوگا، یعنی امیر کا جلوس؟
واقعہ یہ ہے کہ اس سے یہی معنی برآمد ہوتے ہیں شمیم صاحب

بے خیالی میں میری ہی بات کی تائید فرما رہے ہیں ۔ ذیل میں
چند لغوی حوالے درج کیے جا رہے ہیں ؛
(۱) موکب (کمجلس) نوعے از رفتار و گروہ رواں جہت
آرائش، سواراں باشند یا پیادگان یا جماعتِ شتر سواران ۔
(منتہی الارب فی لغات العرب ۔ ج ۴)
(۲) وکب، موکب بکسر کاف ۔ نوعے از رفتار و جمعِ
سواراں .... ؟ (صراح مع قراح) سپاہ و لشکر کے معنی
موجود نہیں ہیں ۔
(۳) موکب بکسر کاف ۔ ہمراہان پادشاہ ۔ سواراں در رکاب ۔
موکبِ ہمایونی (کنایہ) شاہ در حالِ حرکت با ہمراہان ۔ "فرہنگ
آموزگار" از آقای حبیب اللہ آموزگار ۔ تہران)
(۴) موکبٌ سواروں کا رسالہ جو کسی امیر کے آگے چلے جلو ۔
ایک قسم کی رفتار کو بھی کہتے ہیں ۔ مواکب اس کی جمع ہے ۔
(لالہ رام نرائن لال پبلشر الہ آباد ؛ "لغاتِ فارسی")
جہاں تک زیر بحث شعر میں اس لفظ کے محل استعمال
کا تعلق ہے ۔ اسے کلیدی حیثیت حاصل ہے ۔ اس بات
سے تو شمیم صاحب کو بھی اختلاف نہیں کہ شعر کا بنیادی اور مرکزی
مفہوم محشر میں حضرت فاطمہؓ کی آمد ہے ۔ پورے شعر میں دوسرا
کونسا لفظ ہے جو آمد کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے یا جس سے
نقل و حرکت کا مفہوم برآمد کیا جا سکے ؟ اگر شمیم صاحب
اس کلیدی لفظ کو خارج کر دیں گے تو شعر کی ساری بنا منہدم
ہو جائے گی اور وہ فضا غارت ہو جائے گی جو شاعر کا مقصود
ہے ۔ یہاں موکب، اجلال کی قلت و کثرت پر دال نہیں ہے ۔
جیسا کہ شمیم صاحب نے لکھا ہے اور "کثرتِ اجلال" کی ترکیب
وضع کی ہے ۔ شمیم صاحب نے "کثرتِ اجلال" کی اختراع
کے بعد موکبِ اجلال کو "ترکیبِ اضافت" بھی قرار دیا ہے ۔
اگر شمیم صاحب کو عربی کی طرح فارسی قواعد کا ذکر بھی ناگوار
نہ ہوتا ہو تو میں عرض کروں گا کہ فارسی قواعد کی رو سے اس
قسم کی ترکیب کو اضافتِ مجازی کہا جاتا ہے ۔

—— فرید احمد برکاتی، جے پور

نجات (بقیہ صفحہ ۔۔)

اور زبردست .... میں چاروں طرف سے ان کے بیچ
گھرا ہوں ۔ میں گھیرے میں جکڑتا جا رہا ہوں ۔ میرا دم گھٹتا
ہوا محسوس ہو رہا ہے گھٹن بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے ..
..... نہیں، نہیں میں خود اپنے ہاتھوں اوڑھی ہوئی بےچینی کے
گھیرے میں گھٹ گھٹ کر نہیں مر سکتا کہ نجات تو میرے ہی
بس میں ہے کہ امیدوں کے معصوم خوبصورت سائے مجھے
بےچین نہیں کرتے کہ فرار کی خواہش نے مجھے اندھا کر دیا تھا
...... کہ میں اب خود کو اس کے سپرد کر دوں گا کہ نجات
تبھی ممکن ہے ......

کمرے میں وہ ہے اور میں ہوں اور سپردگی کا سمندر گہرا
اور وسیع ۔ اور ایک مدت کے بعد پھر طوفان اٹھنے کے
آثار نمایاں ہو چکے ہیں، لیکن ہمیں فکر نہیں کہ ہر بار کی
طرح ہم پھر طوفان کی لپیٹ میں آ کر موت کی طرف ایک ۔
ایک قدم اور بڑھ جائیں گے ۔

آج میں خود اسے اس طوفانی ماحول میں سمندر کے سفر
کی دعوت دیتا ہوں اور وہ منظور کر لیتی ہے اور ہم اپنے اپنے
جسموں کے زہر کو بے نقاب کر دیتے ہیں کہ ایک بار پھر ہم
انہیں امرت سمجھتے ہوئے شنکر کی طرح اپنی روح کے
حلق میں اتار لیں گے .... اور امر ہونے کا عمل شروع
کر دیں گے ۔

ہم سفر شروع کر دیتے ہیں ۔ سفر کا رستہ بہت گہرا اور
تاریک ہے، اس لیے ہمارے جسم کے ہر حصے میں آگ روشن
ہو گئی ہے اور راستے میں روشنی اور آنچ پھیل گئی ہے اور
رقص کا فلسفہ ہے ...... رقص کا فلسفہ، روشنی اور
آنچ .... اور ہمارا سفر جاری ہے اور میں نجات
سے ہمکنار ہو رہا ہوں ۔

[ہندی کہانی]

خبرنامہ

کویت میں اردو

پچھلے چند برس میں کویت میں ہند اور پاکستان کے ایسے بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں جو اردو شعر و ادب کے دلدادہ ہیں اور ان میں سے بعض خود بھی شاعر یا ادیب ہیں۔ ان حضرات کی کوششوں سے وہاں ایک بزم ادب کا قیام بھی عمل میں آ گیا ہے جو وقتاً فوقتاً ادبی محفلوں کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔ اس بزم کے صدر برصغیر کے ممتاز نقاد اور محقق ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے بھتیجے اور داماد پروفیسر انور حسین صاحب ہیں اور سیکرٹری رشید دیپ صاحب۔ بزم کے دیگر عہدیداران اور ارکان میں ہند اور پاکستان دونوں مملکتوں کے شہری شامل ہیں۔ جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھتے ہیں تو اس گنگا جمنی تہذیب کا مرقع نظروں کے سامنے آ جاتا ہے جس کی آغوش میں اردو پروان چڑھی اور پھر جس کے آدرشوں کو اس زبان نے عام کیا ——— اسی طرح کا ایک جلسہ ۲۹ جولائی ۷۶ء کو پروفیسر انور حسین صاحب کی قیام گاہ پر ہوا جس کی صدارت کے فرائض پاکستانی سفارت خانے کے کمرشل اتاشی سوری صاحب نے انجام دیے۔ حاضرین میں اہل ذوق حضرات اور خواتین کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ مشاعرہ رات دس بجے شروع ہوا اور کافی رات گئے تک جاری رہا۔ جن شعرا نے کلام سنایا ان کا ایک ایک شعر درج ذیل ہے:

رشید دیپ:

میں حق کا خون ہوں بہتا ہوا صلیبوں پر
کوئی تو میری بھی پرچم کشائی کو نکلے

حامد کرتارپوری:

کبھی وہ وقت بھی تھا تیرا دیوانہ بھٹکتا تھا
مگر اب ڈھونڈتی پھرتی ہے منزل سوختہ جاں کو

محبوب نجمی:

وہ ایک تم کہ نمائش کا اہتمام عظیم
وہ ایک ہم کہ نظاروں سے ڈھونڈتے ہیں فرار

بشیر مغل:

تیری نظریں بدل گئیں شاید
ورنہ ہم لوگ اجنبی تو نہیں

فضل کریم اختر:

میکشی میں اہتمامِ خود فراموشی سہی
تمکنت غم کی غریقِ جام ہو سکتی نہیں

حفیظ سیکری:

میں نے پائی ہے غم کی وہ دولت
جو بہت کم کسی نے پائی ہے

باقی احمد پوری:

وہ کیا سنیں گے مرے دل کے ٹوٹنے کی صدا
سمجھ سکے جو نہ کچھ بھی شکستِ ساغر سے

طاہر بن کیفی:

نفس نا مرتب نظر بے قرینہ
ارے توبہ توبہ نظامِ محبت

سحر اکبرآبادی:

تیرے در نے غرور بخشا ہے
اب کہاں جھک سکے گا سر میرا

اطہر ندیم:

زخم وہ جو کسی سورج کی تمازت نے دیے
رات کے دامنِ شفقت میں لیے بیٹھا ہوں

پروفیسر انور حسین:

عکسِ رخ روشن جو بنا رنگِ مئے ناب
اس دستِ حنائی سے بڑھی جام کی خوشبو

قاسم امروہی: — ہم اس یقین سے محفل سجائے بیٹھے ہیں ؛ وہ آ رہے ہیں وہ آئے وہ آنے والے ہیں

راجستھان میں اُردو اکاڈمی کا قیام

راجستھان اور بیرونِ راجستھان کے اُردو حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی گئی کہ بعض دوسری ریاستوں کی طرح راجستھان میں بھی اردو اکاڈمی قائم کی جارہی ہے۔ راجستھان میں اردو بولنے اور اردو پڑھنے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد موجود ہے اور اس کی طرف سے وقتاً فوقتاً کچھ مطالبات صوبائی حکومت کو پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اردو اکاڈمی کے قیام سے امید کی جاسکتی ہے کہ ان مطالبات کی تکمیل کے راستے ہموار ہوسکیں گے۔ اس امید کو مزید تقویت اس سے حاصل ہوتی ہے کہ اکاڈمی کی صدارت کے لیے جناب رام کشور ویاس کے نام کا اعلان ہوا ہے۔ ویاس جی اردو کے تحفظ اور اس کی بقا سے سچی دلچسپی رکھتے ہیں اور راجستھان میں یہ زبان جن مسائل سے دوچار ہے ان سے بھی وہ باخبر ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ اکاڈمی کے دوسرے عہدیدار اور ارکان بھی ایسے لوگوں میں سے کیے جائیں جو اُردو کے سچے بہی خواہ ہوں اور کارگزاری کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ ہم نیک توقعات کے ساتھ اکاڈمی کے قیام کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

آہ! جاں نثار اختر

پچھلے دنوں بمبئی میں اردو کے مشہور شاعر جاں نثار اختر حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ اس سے پہلے بھی ان پر دو بار دل کا دورہ پڑچکا تھا تیسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔

جاں نثار اختر نامور باپ کے نامور بیٹے تھے ان کے والد مضطر خیرآبادی اپنے عہد کے مشہور و ممتاز شاعر تھے۔ اختر کو شاعری کا ذوق اُن سے ورثے میں ملا۔ ان کے اس فطری ذوق کی تربیت علی گڑھ کے ادبی ماحول میں ہوئی اور رفتہ رفتہ خود ان کا شمار اردو کے نامور شاعروں میں ہونے لگا۔

جاں نثار اختر غزل، نظم، رباعی، قطعہ بہت سی اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے اور ہر صنف میں ان کا انداز الگ پہچانا جاتا تھا۔ اپنے ہمعصر دوسرے کئی شاعروں کے برعکس ان کے تخلیقی سوتے ابھی تک خشک نہیں ہوئے تھے اور ان کی فکر کی تازہ کاری ابھی تک قائم تھی۔ ان کی تازہ غزلوں کا مجموعہ "پچھلے پہر" کے نام سے کچھ ہی عرصہ پہلے شائع ہوا تھا۔ اپنی ان غزلوں میں وہ نئی غزل کے لہجے سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ ان کے انتقال سے چند ہی روز پہلے رسالہ 'فن اور شخصیت' کا خاص نمبر بھی ان کی شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں شائع ہوا تھا۔ جس میں پرانے اور نئے سبھی لکھنے والوں نے ان کے فکر و فن پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

ہم ان کے انتقال پر پوری اردو دنیا کے غم میں شریک ہیں۔

ایک اور حادثہ

ابھی ان سطروں کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ کراچی سے ملّا واحدی صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ ریڈیو پاکستان کے نشریے کے مطابق انتقال کے وقت ان کی عمر نوے برس تھی۔

ملّا واحدی صاحب خواجہ حسن نظامی مرحوم کے قریبی دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔ ادب و صحافت کے علاوہ دلّی کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے تقسیم کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ کراچی منتقل ہوگئے تھے لیکن دلّی کی یاد ان کے دل سے کبھی نہ گئی۔ ان کی کتاب "میرے زمانے کی دلّی" دلّی کے معاشرتی ماحول اور یہاں کی معاشرتی روایات کی حامل شخصیتوں کا بہت اچھا مرقع پیش کرتی ہے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

Regd No. D (D) 118 Phone : 271649 September 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/67

TAHREEK

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

شمارہ ۷ جلد ۲۴

اکتوبر ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی، ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس

مقام اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات

بین الملکی تجارتی ادارے اور سوویٹ روس

ستیہ پرکاش

حافظ کا شعر ہے :

واعظاں کیں وعظ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سوویٹ روس کے موجودہ رویے پر اس شعر کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ اس نے بین الملکی کمپنیوں کی سرگرمیوں کے خلاف پروپیگنڈے کی زبردست مہم چلا رکھی ہے لیکن خود ان کمپنیوں کے ساتھ ایسے معاملت کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں اور موڈرن ٹیکنالوجی سے مستفید ہونے کے لیے وہ ان کے ساتھ معاہدے کرتا رہتا ہے۔

جون میں یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں کا یہ فیصلہ کہ "بین الملکی اجارہ داریوں کی پالیسیوں کے خلاف جہاد" تیز تر کیا جائے سوویٹ انگیخت ہی کا نتیجہ ہے اور اس کا مقصد بین الملکی کاروباری اداروں کو بدنام کرنا ہے۔ اس پروپیگنڈے کا مقصد ترقی پذیر ریاستوں اور یورپ کی کچھ ٹریڈ یونینوں کے ان اندیشوں سے فائدہ اٹھانا ہے جو انھیں بین الملکی کاروباری اداروں کی سرگرمیوں کے بعض پہلوؤں کے بارے میں ہیں۔ لیکن اس قسم کے اندیشوں کے باوجود ان ملکوں اور ٹریڈ یونینوں کو یہ احساس بھی ہے کہ سرمایہ کاری، ملازمتوں کی فراہمی اور مقامی اقتصادی نظام کے استحکام کے سلسلے میں یہ ادارے مفید فرائض بھی انجام دیتے ہیں لہٰذا ان کی کوشش یہ ہے کہ مقامی اور علاقائی سطح پر کوئی ایسا ضابطۂ کار مقرر کیا جائے جس سے ان اداروں اور مقامی ریاستوں کے مفادات میں کسی قسم کے تصادم کا امکان باقی نہ رہے۔

۱۹۷۵ء میں ترقی پذیر ریاستوں نے اقوام متحدہ کا ایک ایسا کمیشن مقرر کرایا جس کا مقصد یہ ہے کہ بین الملکی اداروں کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے کام اور اس کمیشن میں رابطہ قائم کیا جائے۔ اس کمیشن میں اڑتالیس ملکوں کے نمائندے شامل ہیں اور اس نے ضابطۂ اخلاق کے تعین کا کام شروع کر دیا ہے۔ بین الاقوامی لیبر آرگنائزیشن نے بھی ان اداروں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے اور جون ۱۹۷۶ء میں جنیوا میں جو عالمی ایمپلائمنٹ کانفرنس ہوئی تھی اس میں اس موضوع پر بحث ہو چکی ہے۔ جون ہی میں پیرس میں وزارتی سطح پر اقتصادی تعاون اور ترقی کی تنظیم کی میٹنگ میں کمپنیوں کے لیے ایک ضابطۂ کار طے کیا گیا جس میں اس قسم کی باتیں شامل تھیں جو میزبان ملکوں کے ضابطوں اور ان کی پالیسیوں کا احترام، غلط قسم کی کارروائیوں سے اجتناب اور آجروں اور مزدوروں کے روابط کو بہتر بنانا۔

لیکن سوویٹ پروپیگنڈہ جسے کامیاب بنانے میں بین الاقوامی کمیونسٹ محاذی ادارے بھی کوشاں ہیں، اس قسم کے مثبت اقدامات کو یکسر نظر انداز کرتا ہے اور اس کی ساری توجہ بین الملکی تجارتی اداروں کے حقیقی اور مبینہ منفی پہلوؤں پر ہے۔ اس پروپیگنڈے میں زیادہ زور اسی بات پر دیا جاتا ہے کہ اس سے قومی خود مختاری اور ریاستوں کے اقتصادی مفادات کو ضعف پہنچتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ بین الملکی تجارتی اداروں کے خلاف پروپیگنڈے کی اس مہم کے باوجود سوویٹ روس نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ان کا تعاون بھی حاصل کرتا رہا ہے اور ان کے ساتھ تجارتی معاملت بھی۔ سول وار کے فوراً ہی بعد موجودہ صدی کے دوسرے دہے میں

سوویٹ روس نے مغربی کمپنیوں کے ساتھ تین سو پچاس معاہدے کیے جن میں انھیں ہر قسم کی سہولتیں دی گئیں۔ ان کمپنیوں کو اجازت تھی کہ وہ ہر اقتصادی سیکٹر میں کاروباری مراکز قائم کریں اور نئی سوویٹ حکومت کو مغربی تکنیکی علوم سے بہرہ ور ہونے کے مواقع فراہم کریں۔ بیشتر مراعات کا تعلق روسی خام مال سے مصنوعات کی تیاری کے ساتھ تھا۔

کاکیشیا کے تیل کے میدانوں میں کنویں کھودنے اور تیل نکالنے کے لیے امریکی تیکنیک کا وسیع پیمانے پر استعمال ہوتا رہا۔ ۸۰ فی صدی کے قریب روسی تیل انہی طریقوں سے برآمد ہوا۔ تیل صاف کرنے کے تمام کارخانے مغربی کارپوریشنوں نے قائم کیے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم باٹومی کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ تھا جسے نیوجرسی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی نے قائم کیا تھا۔ اتفاق سے یہی کمپنی اب سوویٹ روس کے معاندانہ پروپیگنڈے کا ہدفِ خصوصی ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت میں بالخصوص ان شعبوں میں جن کا تعلق مشنری اور بجلی کے آلات تیار کرنے سے تھا، مغربی کمپنیوں کے ساتھ متعدد معاہدے کیے گئے تاکہ زار کے زمانے کی قائم شدہ فیکٹریوں کو مغرب کی جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے جدید بنایا جائے۔ مشنری کے شعبے میں جنرل الیکٹرک اور میٹرو ولیٹن اور وائکرز خاص طور پر سرگرم کار تھیں۔ جن کمپنیوں کو سوویٹ روس نے مشترکہ کاروبار کی دعوت دی ان میں اس قسم کے دیو قامت کاروباری ادارے بھی شامل تھے جیسے ڈیوپونٹ امریکن المونیم کمپنی، انٹرنیشنل ہارویسٹر کمپنی، سنگرز اور ویسٹنگ ہاؤس۔

روسیوں نے جن بڑے بڑے پروجیکٹوں کے لیے مغربی کمپنیوں سے معاہدے کیے ان میں گورکی موٹر فیکٹری بھی شامل تھی۔ ۱۹۲۹ء میں فورڈ موٹر کمپنی کے ساتھ تیار گاڑیوں اور ان کے پرزوں کی فراہمی اور فیکٹری کی تعمیر میں ٹیکنکل مدد فراہم کرنے کے لیے سوویٹ روس نے تیس ملین ڈالر کا معاہدہ کیا۔ اسی برس امریکہ کی آسٹن کی فرم کو گورکی کے کارخانے کی عمارت تیار کرنے اور اسے چالو کرنے کا ٹھیکہ دیا گیا۔

۱۹۶۰ء کے بعد تو مشرق اور مغرب کے درمیان بین الاقوامی تجارت کے فروغ کی رفتار مجموعی بین الاقوامی تجارت کے مقابلے میں کہیں تیز تھی اور مغرب کے بین الملکی اداروں اور سوویٹ روس کے درمیان تعاون کے جو معاہدے ہوئے وہ بہت بھاری بھر کم تھے۔ یورپ، جاپان اور امریکی تجارتی کمپنیوں نے روسی تیل اور گیس کی صنعتوں کی ترقی کے لیے سوویٹ روس سے بڑے بڑے ٹھیکے لیے اور ان کی تکمیل کی۔

کیمیکل ساز و سامان کی سپلائی کے لیے تین سو سے زیادہ معاہدے کیے گئے جن میں مکمل کیمیکل مشینوں کی سپلائی بھی شامل تھی اور ایسی مشینوں کی سپلائی بھی جن کا کام پیکنگ تھا۔ اس کے علاوہ پیکنگ کے کام آنے والی مشنری کی سپلائی کے معاہدے بھی ہوئے۔ اس وقت سوویٹ روس میں پولی تھین کے جتنے کارخانے ہیں ان میں درآمد شدہ مغربی مشنری ۸۰ فیصدی سے زیادہ ہے۔ آئی سی آئی نے مولیکل پولسٹر کا دھاگے کا جو کارخانہ تیار کیا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

حال ہی میں جن معاہدوں کو شہرت ملی ہے ان میں ایک معاہدہ اٹلی کی فیئٹ کمپنی کے ساتھ ہوا ہے یہ کمپنی دریائے وولگا کے کنارے ٹوگلیاتی کے مقام پر ایک ایسی فیکٹری قائم کرے گی جو ۱۹۷۰ء کے اواخر سے ہر برس چھ لاکھ پچاسی ہزار موٹر گاڑیاں تیار کر سکے۔ لیکن اس کارخانے کی تیاری میں جن مشکلات کا سامنا ہوا اس نے مغرب کی دوسری کمپنیوں کو چوکنا کر دیا ہے۔ دریائے کاما کے کنارے نبیرزہیو اچیلنی کے مقام پر ایک لاری فیکٹری قائم کرنے کے لیے سوویٹ روس نے جنرل موٹرس، میک ٹرکس اور ڈیملر بینز سبھی سے بات چیت کی لیکن ان میں سے کوئی بھی کمپنی یہ معاہدہ کرنے پر تیار نہیں ہوئی۔ بالآخر اس فیکٹری کی تیاری کا منصوبہ سوویٹ حکومت کو اپنے ہی ہاتھ میں لینا پڑا۔ رینالٹ کمپنی نے صرف ٹیکنکل مشورے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

سوویٹ روس نے اپنی اقتصادی ترقی کے لیے ہمیشہ

(باقی صفحہ [illegible] پر)

تین نظمیں

کرشن موہن

گریز

میاں بیوی اکٹھا رہ رہے ہیں ایک مدّت سے
مگر اب تک
نہیں ہو پائے ہمبستر
میاں معذور ہے بیوی اُسے اُکسا نہیں سکتی
عجب لنگور ہے جس میں
نہیں ہے جنسیت یکسر
محبت کا المیہ ہے
تماشا سوز کاہش کا
غضب یہ سانحہ ہے مرگِ خواہش کا

▲▲

تعصّب

پاک نفسی کی نمائش دن رات
اپنے مذہب کی ستائش دن رات
سامنے ان کے ہے ہر مذہب مات
"ناروادار" ہے اِن کی ہر بات
آستینوں پہ عقیدے پہنے
ایک بارِیش بزرگ آئے ہیں

لیکن

ہر شے ہے وِشواس میں
نغمی سپنوں، سہانی آس میں
سپنوں میں کھوئے ہوئے، سوئے ہوئے بچے کو
لیکن تابکے
سونے دے گی روشنی سورج کی، بازاروں کا شور
آخرش اُس کو جگا کر ہی رہے گا اور اُس کو
جاگنا بھی چاہیے

▲▲

کمار پاشی | شریف زادوں کے لیے

میں اپنے آپ کو جب آئینے میں دیکھتا ہوں
مجھ میں اک گہرا سمندر
سانس لیتا ہے
ہوا کچھ اس قدر نزدیک سے
چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
کہ میں ہنستا ہوا اک پھول بن جاتا ہوں
پل بھر میں

مرے آگے، مرے پیچھے
کئی رنگوں کے بادل پھیل جاتے ہیں
مجھے موسم پرانے یاد آتے ہیں

کوئی سرسبز سی لڑکی
مری آنکھوں کو چھوتی
دودھ گنگا سے ابھرتی ہے
مرے صدیوں پرانے جسم کی
صدیوں پرانی بھوک سے
جو اب بھی ڈرتی ہے
مرے آگے، مرے پیچھے
جو پہلے پھول ہے
پھر رنگ
پھر رنگوں کا بادل
پھر سمندر ہے
وہ میری بے ہوس آنکھوں کے اندر ہے

کوچہ جلال بخاری، اندرون دلی گیٹ، دلی ۱۱۰۰۰۶

غزلیں

فضا ابن فیضی

حیراں ہیں وہ، یہ دولتیں کیوں کر سمیٹیے
خوں تھوکیے تو لالہ و گوہر سمیٹیے

اس راکھ میں ہیں پھول بھی، چنگاریاں بھی ہیں
الفاظ کے ذخیرے سنبھل کر سمیٹیے

اک اک قدم پہ ساتھ ہے رسوائیوں کا خوف
آندھی ہے تیز، جسم کی چادر سمیٹیے

حیراں سے ہم کھڑے ہیں سرابوں کے درمیاں
صحرا بٹورئیے کہ سمندر سمیٹیے

وہ آسماں بھی مٹی کے ذروں میں بٹ گیا
خود کو اس انتشار میں کیوں کر سمیٹیے

میں تو لہولہان بھی ہو کر وہیں پہ ہوں
اب آپ اپنے طنز کے پتھر سمیٹیے

اک سعیِ رائگاں ہے ہنر کا یہ کاروبار
جب آئنوں کو توڑیے، جوہر سمیٹیے

وہ صد ہزار شیوہ ہے، جب دیکھیے اسے
شعر و شراب و نغمہ کے منظر سمیٹیے

کچھ غور کیجیے اس کے بدن کے نکات پر
اب تو فضاؔ یہ غزلوں کے دفتر سمیٹیے

▲▲

پریم وار برٹنی

تخیّل کی منظر نگاری لگے
خدا کی یہ دُنیا ہماری لگے

لچکتی ہوئی اُس بدن کی دھنک
دلآویز رنگوں کی دھاری لگے

مزاج اس قدر ہو گیا ہے لطیف
کہ گل پتھروں سے بھی بھاری لگے

بدن ہے کہ شمشیر ہے شعر کی
حسیں آب جس کی کنواری لگے

تراشا ہے یا آنسوؤں کا نمک
کہ ہر بوند امرت کی کھاری لگے

جو سورج کھلی آنکھ سے دیکھ لے
ترا روپ کیسر کی کیاری لگے

گھٹاؤں کے رتھ پر سجی پالکی
یہ کس مہ جبیں کی سواری لگے

یہ چمکا ہے اتنا جو نامِ خلوص
کسی چاند کی خاکساری لگے

شرابی ہے، شاعر ہے، جو ہے، سو ہے
ہمیں پریمؔ تیرا پجاری لگے!

▲▲

شہاب للت

ویسی کہاں ہے جیسی یہ دُنیا دکھائی دے
ریگِ رواں ہے دُور سے دریا دکھائی دے

"مندا کنی" ندی سی لگے وہ سُبک خرام
من کی پوترتا میں وہ "گنگا" دکھائی دے

ہر شام لے کے دُوار پہ نینوں کی آرتی
کرتی ہوئی وہ کنت کی پوجا دکھائی دے

آسیب جان کر جسے میں چیخ چیخ اُٹھوں
دیکھوں اُسے تو اپنا ہی سایا دکھائی دے

اس کو نہ منہ لگا یہ سُرا واسنا کی ہے
جتنی پیئے تو اُتنا ہی پیاسا دکھائی دے

کیا بجھ گئی سدا کے لیے شمعِ آفتاب
چاروں طرف اِمٹ سا اندھیرا دکھائی دے

کیا اعتبار دست شناسوں کی بات کا
تجھ سے نظر ملے تو نصیبا دکھائی دے

رخصت اب اے حواس کے نیلے سمندرو
اب تو بہت قریب کنارا دکھائی دے

دل میں ہے کامناؤں کا اک مشتعل ہجوم
شہرِ بدن تمام سلگتا دکھائی دے

صدیوں ستم اُٹھا کے یہ دھرتی کرے پکار
تب اے شہابؔ کوئی کنھیا دکھائی دے

▲▲

غزلیں

دل کو سکون بھی ہے بے قرار بھی ہے
پھر چاہت بھی نہیں۔ تیرا انتظار بھی ہے

احمد رئیس

خاک کو یوں نہ اُچھالو لوگو
اپنے چہرے تو بچالو لوگو

دو گھڑی پاس ہمارے بیٹھو
ہم فقیروں کی دُعا لو لوگو

شہر کا شہر ہوا ہے دشمن
سب کی پگڑی نہ اُچھالو لوگو

دل کے شیشے میں کسی صورت سے
کوئی تصویر سجالو لوگو

بے زمینی کا تو الزام نہ دو
چھانو میں اپنی بٹھالو لوگو

اپنی یادوں میں جگہ دو ہم کو
اپنے خوابوں میں بسالو لوگو

ہم مسافر ہیں مگر رات کی رات
شہر سے یوں نہ نکالو لوگو

▲▲

پہچان کر بھی ہم کو نہ پہچانتا تھا وہ
حالانکہ مدتوں سے ہمیں جانتا تھا وہ

یہ اور بات ہے کہ زمانہ بدل گیا
ورنہ ہماری بات بہت مانتا تھا وہ

اُس سے ہمارا نام نہ لیکر تو پوچھیے
کس کس کو اپنے شہر میں پہچانتا تھا وہ

سورج تھا وہ نہ چاند مگر تھا بہت عزیز
ہم کو بھی اپنا دوست بہت مانتا تھا وہ

محفل میں مدتوں وہ رہا محوِ گفتگو
تنہائیوں میں غیر ہمیں جانتا تھا وہ

▲▲

نازش انصاری

ختم جانو داستاں کوئی نہیں کچھ بھی نہیں
موڑ ایسا ہے جہاں کوئی نہیں کچھ بھی نہیں

دیکھیے تو دھوپ، بارش، برف، سناٹا، دھواں
سوچیے تو امتحاں کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں

چھت کے نیچے ایسا سوئے وہ کہ سوتے رہ گئے
کیا مکیں تھے کیا مکاں۔ کوئی نہیں کچھ بھی نہیں

میں نے سمجھا ہے خلا، اور تو نے جانا زندگی
روح و تن کے درمیاں کوئی نہیں کچھ بھی نہیں

دُور تک صحرا، مئی کی دھوپ، اک محمل نشیں
اور صدائے ساربان۔ کوئی نہیں کچھ بھی نہیں

▲▲

رپورتاژ

جیون تیرے کتنے روپ

عبدالرحیم نشتر

شوکیس کی طرح سجے ہوئے طلسمی شہروں کی مصنوعی فضا سے طبیعت اوب گئی تو میں بھنڈارہ کی طرف نکل پڑا۔ یہ ایک موضع ہے۔ پیتل کے برتنوں اور چاول کے لیے سارے مہاراشٹر میں مشہور۔ میں بس کی کھڑکی سے لگا بیٹھا ہوں اور میری نگاہیں دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی دھان کی بالیوں سے ایک میٹھی میٹھی، سوندھی سوندھی چمکتی ہوئی اور اوس میں بھیگی ہوئی شاداب و شگفتہ زندگی کو میرے سراپے میں قطرہ قطرہ اتارتی جا رہی ہیں اور میں ایک عجیب سی سہانی اور مدھر زندگی کو اپنی آتی جاتی سانسوں میں محسوس کر رہا ہوں۔ یہ گزرتے ہوئے ہرے ہرے مناظر، گنگناتی ہوئی ڈالیاں، جھومتے ہوئے درخت، درختوں پر جھنڈ بناتے ہوئے پرندے اور پرندوں کی اڑتی ہوئی ڈار، چڑیاں، فاختائیں، طوطے، کوئلیں، مینائیں اور سفید سفید پروں والے بگلے ——! زندگی سہانی ہے؟ زندگی ہے یا کویل کی کوک، پھول کی مہک، چاول کا رنگ، درختوں کا سایہ، مٹھو کی آواز، بگلے کی اڑان، پانی کا نغمہ، چرواہوں کا شور، بانسری کا سُر —— اور تیزی سے بھاگتی ہوئی —— لمحہ کی طرح —— تیز رفتار بس —— اور بس کے ہارن کی طرح فضا میں ارتعاش پھیلاتی ہوئی سبک، خنک، میٹھی اور تیز، طویل اور مختصر چیخ ——! زندگی تیرے کتنے روپ؟

بھنڈارہ کے بکھرے ہوئے بس اسٹینڈ پر اتر کر نگاہ چاروں طرف ڈالی ہے۔ مغرب کی سمت، شمال اور جنوب میں اپنے پنجے گاڑ کر کھڑا ہوا نہ زیادہ چھوٹا نہ زیادہ بڑا ایک نوزمان بس اسٹینڈ، اینٹ پتھر کی بنی ہوئی پکی عمارت کے شمالی پہلو میں ٹین کا بڑا سا شیڈ، مسافروں کی قطار در قطار نشستوں کے لیے ایک آستھائی سائبان۔

دھوتیوں میں بندھے ہوئے پرش اور کاشٹوں میں لپٹی ہوئی ناریاں۔ دیہاتی چہرے اور گاؤں کا حسن ——! نمک، چمک، کشش اور آکرشن۔ سرخ اور زرد بسیں۔ آتی ہوئی اور جاتی ہوئی۔ اترتے ہوئے مسافروں کی عجلت اور چڑھتے ہوئے مسافروں کی جلد بازی۔ سارا بس اسٹینڈ زندگی سے رچا ہوا۔ ایک بھرپور اور متحرک زندگی ایک سفر کرتی ہوئی دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی اور رفتار بڑھاتی ہوئی زندگی، خامشی کا سینہ چاک کرتی اور اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہوئی زندگی۔

چاروں دشاؤں میں ایک سرگرمی، ایک تحریک، تیز رفتار، تیز آواز! زندگی کتنا شور مچاتی ہے۔ زندگی ہے یا کوئی بکھرا ہوا بس اسٹینڈ اور بس اسٹینڈ ہے یا آوازوں کا میلا؟ میں اس میلے میں کھو گیا ہوں۔ مشرق کی سمت ہوٹلیں، طعام گاہیں اور پان کے ٹھیلے، رکشے والوں کی قطار، چلنا ہے بابو؟ لے چلوں مالک، الیچ ہے سیٹھ، طرح طرح کی آوازیں! بے فکر، مجبور، من موجی، لاپروا اور نشے میں ڈوبی ہوئی آوازیں ——! دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، پھٹے ہوئے ملبوس اور بکھرے ہوئے بال ——! میں اس شیڈ کے نیچے آگیا ہوں۔ جہاں موہنی صورتوں کی بھیڑ ہے۔ جہاں اجلے ملبوسات کا جمگھٹ ہے۔ جہاں چمکتے ہوئے چہرے ہیں۔ جہاں

دھنوں میں پالتوں کی پیک ہے۔ جہاں سگریٹ کا دھواں
مرغولے بنا رہا ہے۔ جہاں ہاتھوں میں اخبار ہے۔ بیٹریکیس
ہیں، ہینڈ بیگ اور سوٹ کیس ہیں اور ہونٹوں پر دنیا
جہان کی باتیں ہیں۔

میں پہچان کا کنڈکٹر دیکھ کر ٹکٹ کٹائے بغیر بس میں
بیٹھ گیا ہوں۔ دائیں طرف کی طرف کھڑکی والی نشست محفوظ
کرلی ہے اور اب میں نے کھڑکی سے باہر کی بکھری ہوئی ننگی
زندگی پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی ہے۔ ایک فقیر کو اپنی کھڑکی
کی طرف آتا دیکھ میں نے جھٹ سے اپنا سر اندر کرلیا ہے۔
"گداگری کو فروغ نہ دو"۔ بس میں لگی ہوئی یہ تختی مجھے میری
خود غرضی، بے رحمی اور غیر انسانی حرکت کی حمایت کرتی ہوئی
محسوس ہوتی ہے۔ میں اطمینان کا ایک سانس کھینچتا ہوں
اور اپنی البم نکال کر ایک پکنک کی تصویریں، لڑکیوں
کے ساتھ کھنچوائی ہوئی تصویریں دیکھنے لگتا ہوں۔ تصویریں
ہیں یا انیک کہانیاں، کہانیاں ہیں یا انیک گھٹنائیں،
گھٹنائیں ہیں یا ایک زندگی —— اور —— زندگی
تیرے کتنے روپ؟

بس ناہموار زمین کے چھوٹے موٹے گڑھوں سے اچھلتی
کودتی اور دائیں بائیں موڑ کاٹتی ہوئی تارکول کی سیاہ سڑک
پر آگئی ہے۔ تارکول کی دور تک پھیلی ہوئی سیاہ سڑک
میرے من کا میل اور میری آنکھوں کی گندگی اپنے جسم پر
ملے ہوئے میری بس کے ہمراہ دوڑ رہی ہے۔ دوڑ رہی ہے
اور گزرتی جا رہی ہے۔ تھوڑا میل پیچھے اور تھوڑا میل آگے۔
میں صاف ستھرے لباس میں ہوکر بھی کتنا میلا ہوں۔ بس وین
گنگا کے ایک میل لمبے پل کو پار کرتی ہوئی ہاتھ پر مڑ گئی ہے۔
یہ سڑک سیدھی "آنبار" اور "علیپتی" کی طرف جاتی ہے۔ موضع
مارودا گاؤں کے درمیان سے نکل کر دو فرلانگ دوڑنے کے
بعد بس نے پھر ایک موڑ کاٹا ہے اور اب اس کا رخ "آنبھورا"
کی طرف ہے جہاں آج کو دھا دس کی جترا ہے۔ ادا دس
کی اماوس بھری رات میں بھرنے والی اس جترا —— اس
تیرتھ استھان پر آج آس پاس کے دیہاتوں سے ہزاروں

یاتری بھگوان کے درشن کو پہنچیں گے۔ یاتریوں میں بوڑھے
بھی ہوں گے، جوان بھی ہوں گے اور بچے بھی۔ بڑھیاں
بھی ہوں گی، لڑکیاں بھی ہوں گی اور ننھی منی گڑیا سی بچیاں
دھرم اور بھگوان پر وشواس رکھنے والے پاکیزہ دل
بھی ہوں گے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والے انسان
بھی سماج میں ناستک بھی ہوں گے۔ پاپی بھی ہوں گے۔
سادھو بھی ہوں گے اور شیطان بھی، آخر تیرتھ استھان ایک
میلے کے سمان ہوتا ہے اور میلے میں تو ہر طرح کے لوگ آتے
ہیں۔ یہ دنیا بھی تو ایک میلا ہے اور اس میلے میں کتنے رنگ
کے انسان ہیں۔ دنیا ایک رنگی تو نہیں جیون ایک روپی تو
نہیں —— اپنی بری بھلی بھاؤناؤں میں لپٹی ہوئی
"آنبھورا" آگیا۔ سب مسافر اترتے ہیں اور میں بھی اتر پڑتا
ہوں۔ میں ایک مسلم نوجوان، اس تیرتھ استھان پر کیوں
آیا ہوں —— ؟ میں اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں وہاں بھی
اس کا جواب نہیں ہے۔

میں یاتری مسافروں کے پیچھے چل پڑا ہوں۔ ایک فرلانگ
چلنے کے بعد میں نے دیکھی ہے ایک ندی، حد نگاہ تک
پھیلی ہوئی ایک ندی —— ایک نہیں تین ندیاں۔
یہاں وین گنگا، کنہان اور آم ندی کا سنگم ہوتا ہے۔ گویا
مہاراشٹر میں بھی ایک چھوٹا موٹا الہ آباد موجود ہے۔ تین ندیوں
کا سنگم، تیسری ندی کا کلکل —— "آنبھورا" —— !
کولاسو پہاڑیوں کے بیچ میں مدھم گتی سے چلتی ہوئی ندی
اور ندی کے اس کنارے مندروں کا سلسلہ —— ! رام
لکشمن کا مندر، چیتن ایشور کا مندر اور ہری ہر سوامی کا
مندر، میں نے اطراف کا جائزہ لیا ہے اور میری چاروں
طرف منڈلاتی ہوئی آنکھوں میں ایک تیکھی، شاداب
اور شگفتہ زندگی سما گئی ہے۔ شاید یہ زندگی بہتا ہوا پانی
ہے یا پھر پانی کا رنگ ہے۔ کہیں دودھیا، کہیں سبز،
کہیں نیلا اور کہیں تھوڑا تھوڑا سرخ اور تھوڑا تھوڑا زرد
—— یا شاید یہ زندگی نہیں —— سامنے ہی چاروں
طرف حصار باندھے کھڑی ہوئی چھوٹی سی پہاڑیاں

ساہس بھی پیربل ہے جو میری آنکھوں میں اتر آیا ہے اور میری
آنکھیں پہاڑیوں کو بے لباس کرتی ہوئی ایک ان دیکھے وجود،
ایک اجانی شکل اور ایک اپریچت شکتی میں لین ہوتی
جا رہی ہیں۔

دھیرے دھیرے بہتا ہوا گہرا پانی، جس کے نرم و
نازک سینے کو چیرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیاں دوسرے
کنارے کی طرف بڑھ رہی ہیں، اپنے شکم میں بھگتی بھاونا
رکھنے والے پجاریوں کو لے کر، اپنے دلوں میں پراشچت
اور پشچاتاپ کی بھاونا رکھنے والے یاتریوں کو لے کر، اور
مجھ جیسے بے قرار ذہنوں کو لے کر جنھیں شانتی کی تلاش ہے۔
جنھیں دھیر چاہیے، ساہس چاہیے، ہرش چاہیے اور سکھ
چاہیے۔ شاید کولاسور کی سینکڑوں فٹ اونچی چوٹی پر بنے
ہوئے چیتن ایشور کی بارگاہ میں اسے پا سکوں ——؟

کشتی سے اترا ہوں تو تینوں ندیوں کے پانی نے میرے
پیر دھوئے اور تینوں ندیوں کی ریت میرے قدموں سے
لپٹ گئی۔ سوسواگتم۔ خوش آمدید —— ایک عجیب مسرت
بخش ٹھنڈک ہے جو میری بھیگی ہوئی ایڑیوں سے ہو کر میرے
دماغ تک پہنچ گئی ہے اور میں اس شیتل واتاورن میں کنارے
پر کھڑی ہوئی بیل بنڈیوں میں، چھوٹی موٹی کھانا بناتی ہوئی
کھانا کھاتی ہوئی ٹولیوں میں گروہ در گروہ مندر کی طرف
بڑھتی ہوئی بھیڑ میں اپنی پہچان جاننے کی چیشٹا کر رہا ہوں۔

اس کنارے لوگ ہیں۔ اُس کنارے لوگ ہیں۔ بیچ
میں ندی ہے۔ ندی میں کشتیاں ہیں۔ کشتیوں میں لوگ
ہیں۔ چاروں طرف گھنے درختوں کی گوٹ لگا لباس پہنے
ہوئے سرسبز پہاڑیاں ہیں۔ پہاڑیوں میں تنگ تنگ
راستے ہیں اور راستوں پر چڑھتے ہوئے یاتری ہیں۔
آنکھوں میں بھگوان کا روپ، دلوں میں بھگتی کی بھاونا۔
قدموں میں مندر تک پہنچنے کی لگن۔ ناریل، پھول اور
سیندور۔ پیشانی پر سرخ سرخ کمکم، سیاہ عبیر اور صندل
کے سرخ ٹیکے۔ ہاتھوں میں چراغ اور [illegible] گھنٹے،
گھنٹیوں کی مدھر آوازیں۔ نیچے آوازیں اٹھتی ہوئی ——
جگاتی ہوئی —— آس بندھاتی ہوئی —— آشائیں
جگاتی ہوئی اور زندگی درشاتی ہوئی آوازیں۔ میٹھی ——
مدھر —— فروغ —— چنچل —— بھاری ——
موٹی —— تلخ —— تیز —— رنگارنگ آوازیں
—— اور —— آوازوں کے میلے میں اپنی گم شدہ ذات
کو کھوجتا ہوا میں —— ! ایک غیر متعلق وجود! آنکھیں
چاروں طرف گھومتی ہیں۔ پہاڑیوں پر، ندی پر، درختوں
پر۔ اس کنارے پر اور اس کنارے پر ہر طرف بھیڑ، ہر طرف
ہجوم! لوگ ہیں یا ریت کا پھیلاؤ ہے؟ اور میں ایک ذرہ
—— ڈھیر ساری ریت میں منتشر، میں اکیلا، مجھ
اکیلے کی پہچان کیا، مجھ اکیلے کا وجود کیا ——؟ میں پتھر بھی
تو نہیں جو کولاسور کی سب سے اونچی چوٹی پر بنے ہوئے
مندر میں نصب ہے۔ جسے لوگ دودھ سے نہلاتے ہیں۔
پھولوں سے ڈھانپتے ہیں۔ عود اور صندل کی خوشبو سے
مہکاتے ہیں۔ تو کیا ریت پتھر سے بھی حقیر ہے؟ نہیں ——!
مگر ریت کا ایک ذرہ ——؟ زندگی کا ایک روپ
یہ بھی ہے ایک روپ وہ بھی۔

میں دیاکل ہوں۔ مجھے شانتی چاہیے۔ دھیرج چاہیے۔ ساہس
چاہیے۔ مگر جیون ایک روپی نہیں، ایک رنگی نہیں جو
شے مجھے مطلوب ہے وہی سب کو چاہیے۔ بھگوان ایک ہی سکھ،
ایک ہی طرح کا سکھ کیسے عطا کرے گا۔ اس کا وردان انیک
روپی ہے۔ پہاڑ، ندیاں، ریت، پانی، کشتی، منجدھار، کنارے،
بھگتی، پاپ، کرم، پھل اور —— اور میں —— ایک چھوٹا آدمی
—— چھوٹے لوگوں میں سے ملا ایک چھوٹا انسان، جس کی بے قراری
جس کا اضطراب اسے بھگوان کی طرف لے جاتا ہے [illegible]
کی بھاونا جگاتا ہے اور اسے دھل بنا دیتا ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] زندگی [illegible]
[illegible] لیکن میری پہچان کیا ہے [illegible]
[illegible] کیا ہوں؟ زندگی [illegible]
[illegible] زندگی تیرے کتنے روپ ——؟

بے بضاعتی

حمید سہروردی

بات کچھ بھی تو نہیں تھی۔ بس یونہی وہ سو گیا تھا۔ رات سونے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ دن کی ساری تھکن بستر میں جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور صبح ہشاش بشاش چہرہ، کھلا کھلا جسم ایک نئی توانائی اور نئے اور انوکھے جذبوں کے ساتھ مختلف النوع منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایسا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ بغیر منصوبوں کے۔ ہی معمول کی زندگی کے ہاتھوں، اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔

ہر شام کی طرح، آج شام بھی، نڈھال نڈھال، مضمحل مضمحل اپنے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر، اطراف کے ماحول پہ ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے، جیب کے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اور بند کمرے کے قفل میں ایک چابی گھمائی۔ قفل کھل گیا۔ چابی قفل کے اندر ہی رہنے دی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا ہمیشہ کی طرح بلی نے اس کا استقبال کیا۔ اور ہر شام کی طرح بلی، اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اس نے معمول کے مطابق بلی کو گود میں اٹھا لیا۔ بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی، اپنے آگے کے پیروں کو، اس کے چہرے پر رگڑنے لگی۔ وہ بلی کو دیں چھوڑ دیتا۔ پھر اندر کمرے میں جانب مشرق دیوار سے لگے ہوئے آئینہ میں دن بھر کی کیفیت کو پڑھ لیتا۔ اور بلی کو لے کر ایزی چیئر میں دھنس جاتا۔ پھر آہستہ آہستہ ایزی چیئر پہ ہی بیٹھا ہوا، بشرٹ کے بٹن کھولتا۔ اپنے پیر لمبے کرتا۔ تاکہ تھکن دور ہو جائے۔ بلی کو گود سے الگ کر کے، حمام میں چلا جاتا۔ نل کھول کر بالٹی سے صبح کا پانی پھینک کر، تازہ پانی بھر لیتا۔ منہ ہاتھ دھوتا۔ حمام خانے سے ڈرائنگ روم میں چلا آتا۔

اور میز پر پڑے ہوئے مختلف النوع رسائل کی ورق گردانی کرتا۔ تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتا۔ تاکہ دنیا میں ہونے والے واقعات اور حادثات سے بے خبر نہ رہے۔ اسی دوران اس کو خیال آتا کہ بلی صبح سے بھوکی ہے تو فوراً دودھ کا برتن بلی کے سامنے رکھ دیتا۔ بلی کی بھوک کے خیال کے ساتھ ہی اس کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگتیں۔ وہ پھر سے ویسے ہی کمرے کو بند کر کے، ہوٹل کی راہ لیتا۔ ایک آدھ گھنٹہ کے بعد واپس چلا آتا۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں یا رسائل پڑھ لیتا۔ یا پھر آفس سے ساتھ لائے ہوئے فائلوں میں خود کو مصروف رکھتا۔ تاکہ موجودہ بوریڈم کا احساس نہ ہونے پائے ——— بلی وقت سے پہلے ہی اونگھنے لگتی۔

اِدھر کچھ دنوں سے وہ خود کو اداس اداس سا محسوس کر رہا تھا یا پھر اپنے آپ میں ایک نئی تبدیلی کو پا رہا تھا۔ مالیخولیا اور رومانیت کے درمیان خود کو پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ نیند کبھی جلد چلی آتی اور بعض اوقات راتیں بھر کروٹیں بدل بدل کر نیند کو بلاتا تھا۔

تبدیلی کچھ یوں ہوئی تھی کہ وہ بجائے شام کے رات کے کھانے کے بعد گھر آنے لگا تھا۔ بلی میاؤں میاؤں کرتے نڈھال ہو جاتی تھی۔ البتہ وہ جب آتا تو بلی کے سامنے دودھ کا برتن رکھ دیا کرتا ——— شامیں گھر ہونے کے بجائے کہیں اور گزرنے لگی تھیں۔ وہ شہر سے باہر بغرض تفریح نکل جاتا۔ فطرت سے قریب ہونے کا ایک جذبہ بھی جاگتا تھا ——— وہ لمحہ کھو گیا ———

تعجب تو اس پر تھا کہ وہ ملیں ایک ہفتہ تک میں رہے

ہوئے، ایک دوسرے کے نام سے ناواقف تھے۔ بات بہت معمولی سی تھی۔ دونوں ذرا سی زحمت گوارا کرلیتے تو آفس کے رجسٹر سے ہی غائبانہ متعارف ہوجاتے۔ لیکن دونوں نے کبھی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ دونوں یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کی DESGNATION کیا ہے۔

اچانک ایک دوپہر کو جب سورج خفگی اور ناراضگی کے کینوس پر تھوک کر کہیں آسمانوں میں چھپا ہوا تھا اور ابر خوش و خرم ساری کائنات پر چھایا ہوا تھا۔ آفس کے کیمپس میں ہی ایک ریستوران میں پہلی مرتبہ اشاروں، کنایوں یا انجانے پن سے پرے راست گفتگو پر آتر آئے۔ دوران چائے نرشی آفس کی باتوں کی بجائے تازہ ترین ملکی اور غیر ملکی حالات پر بغیر کسی روک ٹوک کے تبصرے کیے جارہے تھے۔ ریستوراں میں بیٹھے ہوئے گاہکوں نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ دونوں یا تو پریمی ہیں، یا پھر آفیشل رشتہ داری ہے۔ ویسے اوروں کو ان دونوں سے کیا لینا دینا تھا ——— مقررہ وقفہ کے ختم ہونے سے چند منٹ پہلے، دونوں وہاں سے اٹھے۔ چائے کا بل دونوں نے اپنی اپنی جیبوں سے ادا کیا۔ نہ رومانیہ نے بل ادا کرنے میں پیش قدمی کی نہ ہی فیروز نے پہل کی سب کچھ ویسا ہی جو دو اجنبیوں کے درمیان ہوتا ہے ——— دونوں لمحہ لمحہ بسر ہوتے رہے ———

قطع نظر اس بات کے کہ دونوں ایک دوسرے کو کیا سمجھتے ہیں ——— ایک شام دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیلگوں آسمان میں اپنی نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ اور باوجود اس کے کہ ایک دوسرے سے خفا خفا اور ناراض تھے۔ ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہے تھے۔ ان دونوں میں کوئی بھی بات مشترک نہیں تھی لیکن دونوں ایک ساتھ جی رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں نے ایک جان ہوکر، صدق دل سے عہد وپیماں کیے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہیں۔ حادثے تو اتفاقات کے چہرے پر پاؤڈر، لپ اسٹک کا کام کرتے ہیں۔ بس ایک سپید و سیاہ کے درمیانی رنگ کی شام ہمیشہ کی طرح دونوں طےشدہ پروگرام کے مطابق منتخب جگہ پر موجود تھے۔ اور مصروف گفتگو بھی تھے۔ باتوں باتوں میں رومانیہ نے کہا "میں وہ نہیں ہوں، جو تم دیکھ رہے ہو، اور سمجھ رہے ہو۔ اور نہ وہ ہوں جسے تم جیسے مرد بار ہا سوچ سوچ کر اپنی نیت پر کلالانگ چڑھا لیتے ہیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں میں نے بارہا سوچا ہے کہ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں کہ تم اور تمہارے جیسے سینکڑوں مرد مخواہ مخواہ میرے بارے میں سوچتے ہوں گے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہوگا کہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہ سوچتے ہوں صرف ایک نظر دیکھتے ہوں گے اور آگے بڑھ جاتے ہوں گے۔ نجانے کیوں سب کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ میں کیوں خود کو کھویا کھویا سا محسوس کرتی ہوں۔ اور یہ سب کچھ لمحاتی ہوتا ہے۔ لیکن ہر روز، ایک نہ ایک بار ایسا ہی احساس، مجھ پر طاری ہوتا ہے۔ اور ہر وقت میں تم جیسے مردوں کو برا بھلا کہہ کر خود کو گناہ گار بنالیتی ہوں ———"

فیروز نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ رومانیہ کی باتوں کو سن ہی نہیں رہا ہے لیکن اُس کی آنکھیں، رومانیہ کی آنکھوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اور جذبہ رومانیہ کے شریر کے اندر ہی اندر بسر ہو رہا تھا۔ فیروز نے سوچا ——— میں اور مجھ جیسے مرد کیا سوچتے ہوں گے۔ کچھ بھی تو نہیں! کچھ تو کیسے نہیں۔ اس کے خد وخال میں میری دلچسپی کیا معنیٰ رکھتی ہے۔ اور مرد بھی تو ایسا ہی سوچتے ہوں گے۔ رومانیہ کے کہنے کے مطابق میں کیا دیکھ رہا ہوں اور کیا سمجھ رہا ہوں۔ شاید اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں۔ اور اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں تو کیا ایسی سہانی اور سلونی شاموں سے مسرت اندوز ہوا جاسکتا ہے؟ نہیں، نہیں، مجھے کچھ سوچنا ہی چاہیے۔ اس کے بارے میں، اس کی کہی ہوئی باتوں کے بارے میں۔ میں کیا سوچ سکتا ہوں۔

اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن وہ دونوں ایک

دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن کب تک ـــــ اب وہ کانی ڈھیلے ڈھیلے اور گیلے گیلے ہو چکے تھے۔ دونوں چُپ کی سیماؤں میں بیٹھے، ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

چلو، فیروز اب چلیں۔ آج بہت وقت ہو گیا ہے۔ نجانے فیروز کہاں گم تھا۔ رومانیہ بھی، وہاں سے اٹھی نہیں۔ اس کی ساڑی کا آنچل بےخبر زمین پر گرا ہوا تھا۔ اُس نے سمیٹا ہی نہیں ـــــ ہاں، چلو رومانیہ چلیں۔ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔

فیروز گھر پر آیا۔ ہر روز کی طرح، بلّی نے آج بھی اس کا استقبال کیا۔ اُس نے بلّی کو زور زور سے دبوچا۔ بلّی نے بھوکی شیرنی کی طرح آنکھیں نکال کر، زور زور سے چیختے ہوئے اسے دیکھا۔ ایک پنجہ بھی اس نے، اس کے ہاتھ پر مارا۔ جیسے ہی بلّی کا پنجہ اس کے دائیں ہاتھ پر پڑا اُس نے بلّی کو زمین پر چھوڑ دیا۔ اور فوراً باورچی خانہ میں چلا گیا۔ اور دودھ کا برتن اٹھا لایا۔ بہت دیر تک بلّی، اس کے قریب نہیں آئی۔ فیروز اس کو پیار سے بار بار بلاتا رہا۔ بلّی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اپنے غصّہ کو تھوک کر، اپنی بھوک کو محسوس کر کے، دودھ کے برتن کے قریب چلی آئی۔ فیروز نے پھر سے بلّی کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔ بلّی ایکدم چونک گئی۔ اور قریب چلی آئی۔

آج فیروز نے اپنا چہرہ آئینے میں نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی کتابوں اور فائلوں کو جھاڑا۔ چونکہ بہت دیر باہر رہا تھا۔ بستر میں گھس گیا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ سو گیا ـــــ نہیں، میں وہ نہیں ہوں جو تم دیکھ رہے ہو یا تم جیسے مرد سمجھتے ہیں ـــــ ہاں اُس شام رومانیہ کا بھائی کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ یہ رومانیہ کے پوچھنے پر معلوم ہوا تھا۔ وہ یونہی اس کے گھر چلا گیا تھا۔ رومانیہ نے دروازہ کھولا۔ وہ مکان میں داخل ہوا ـــــ رومانیہ ایسا لگ رہا ہے کیسا؟ ابھی ابھی خواب سے جاگ اٹھی ہو ـــــ چہرہ سوجا ہوا اور آنکھیں نیم وا، بال اس

کی پیٹھ پر ادھر اُدھر کھیل رہے تھے۔ ساڑی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ یقیناً وہ سو کر اٹھی تھی ـــــ اور اس نے اسے خلاف توقع اندر کمرہ میں لے جا کر بٹھایا تھا۔ اپنی خوابگاہ میں۔ پلنگ پر مچھر دانی پوری طرح سے گری ہوئی تھی ٹیبل پر بہت سی کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں ـــــ رومانیہ حمام خانے میں جا چکی تھی۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا رہا ـــــ اس کی چال میں غضب کی لچک ہے۔ جسم بھرا بھرا گداز گداز ہے۔ کچھ دیر بعد رومانیہ چائے کی ٹرے لے کر واپس آئی۔ دونوں نے چائے پی لی۔

میں وہ نہیں ہوں جو تم دیکھ رہے ہو اور سمجھتے ہو ـــــ

فیروز کی نظریں اس کے سر پر لگی ہوئی، اس کی ہی تصویر پر گڑی ہوئی تھیں کتنی حسین ہے یہ کمبخت ـــــ

رومانیہ نے کہا ـــــ کیا دیکھ رہے ہو۔

تمہاری تصویر ـــــ

پسند آئی ہے ـــــ

پسند ـــــ بہت زیادہ ـــــ

رومانیہ نے ساڑی کے پلو کو ٹھیک کیا ـــــ

کاش ـــــ

باہر سے کسی کے قدموں کی آواز آئی۔

ارے آپ ـــــ

رومانیہ کا بھائی کرکٹ کھیل کر واپس آ گیا تھا مگر کرکٹ کے متعلق فیروز کیا خاک بات کر سکتا تھا ـــــ کیا ب میں ہڑی سالا ـــــ تم کیسے ہو ـــــ ؟

اچھا ہوں ـــــ اتنا ہی کہہ کر وہ کمرہ کے باہر چلا گیا۔

رومانیہ خاموش تھی، شاید سوچ رہی ہو گی کہ فیروز نے "کاش" کے ساتھ کیا کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے "کاش" زور سے تو نہیں کہا تھا۔ اس نے سُنا بھی نہیں ہو گا۔ پھر کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے کنکھیوں سے اس کو دیکھا ـــــ بے حد حسین ہے کمبخت ـــــ کاش ـــــ

رومانیہ نے کہا —— کیا تم کل بمبئی جا رہے ہو —— ؟

کاش میں جا سکتا —— !

کیوں —— ؟

میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا ہے ۔ وہاں کیا دھرا ہے ۔ ایک دم خالی خالی پن ہی تو ہوگا ۔

کیوں —— ؟

بس یونہی —— کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر فیروز نے کہا ۔ اب چلتا ہوں ۔

رومانیہ کا بھائی منہ ہاتھ دھو کر واپس کمرہ میں آگیا ۔ اور آتے ہی فلم (ٹکور) کی باتیں کرنے لگا ۔ اس کی باتیں بڑی پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھیں ۔ فیروز نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا ۔ اور وہاں سے چلا آیا ——

ہاں ، اسے اچھی طرح یاد ہے —— رومانیہ اس شام کیسے پیر پھیلا کر بیٹھی تھی —— توبہ —— اور اس کے بعد لیٹ گئی تھی زمین پر ہی ۔ اور اس کی ناف چمک رہی تھی ۔ وہ ناف چومنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے کروٹ بدل لی —— اور اس کے خوبصورت پیر ، جنھیں روزانہ کلاس میں ٹیبل کے نیچے سے آنکھیں چرا چرا کر وہ دیکھتا ہے ۔ ہائے کمبخت کے پیر بھی کتنے حسین اور دلکش لگتے ہیں ۔ اور وہ جب چلتی ہے تو اس کے کولھے ایسے اچھل کود کرتے ہیں جیسے کائنات انگڑائی لے رہی ہو ۔ اور اس کے بال جو گھٹنوں تک بڑھے ہوئے ہیں ۔ چلتی ہے تو ایسے اچھلنے لگتے ہیں جیسے ناگ مدھر موسیقی سن کر سرشاری سے اچھل رہا ہو ——

—— کاش ——

اور اس کی تصویر کا ایک رخ جو مسکراتا ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ مونا لیزا کے بعد بس اس کی مسکراہٹ ہی سب کچھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی مخروطی انگلیوں میں قلم یوں محسوس کرتا ہوگا کہ وہ تا قیامت انھیں تراشی ہوئی انگلیوں میں پھنسا رہے ۔ کپڑے بھی روزانہ یہی سوچتے ہوں گے کہ اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم پر لپٹے رہیں —— کیسی مورتی ہے مورتی —— وہ کروٹ بدلتا ہے ۔ پھر سیدھا ہوتا ہے —— ارے رومانیہ ۔ ۔ ۔ ۔ رومانیہ —— جلدی آؤ ۔ ہاں ، ہاں میرے سامنے بیٹھو —— ہم دونوں ہوا کے گھوڑے پر سوار آسمانوں کی سیر کریں گے ۔ ہم دونوں بلند ہی اوپر جا رہے ہیں ۔ کیوں رومانیہ —— اس نے گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھما دی ہے اور اس کے پیٹ کو دبا کر پکڑ لیا ہے ۔ اس کی پشت اس کی گود میں ہے ۔ رومانیہ کچھ بھی تو نہیں کہہ رہی ہے ۔ کیا رومانیہ بھی یہی چاہتی تھی ۔ کتنے دن ، میں نے ضائع کیے ۔ کاش ——

رومانیہ اپنے جسم پر سے ایک ایک کپڑا اتار رہی ہے —— ! بس رومانیہ بس —— وہ اور رومانیہ آسمان سے زمین کی طرف آ رہے ہیں ——

کھٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھٹ ۔ ۔ ۔ ۔ کھٹ ۔ ۔ ۔

سائکل کی آواز ——

کون ہے ۔ ؟

میں دودھ والا صاحب ۔

فیروز کی آنکھیں کھل گئیں ۔

ہر روز بستر پر سونے والی بلی ، اس کے بستر پر نہیں تھی ۔

سلطان اختر | اقتباس ۲

راستوں سے گھنی چھاؤں چھن کر ہوا بے خبر ہو گئی
منزلوں کے تعاقب میں قدموں کی واماندگی منتشر ہو گئی
اور تہہ خاک بھی
خاک کا عکس روشن ہوا
اے خدا
فاصلوں کی صعوبت سے ہم کو بچا
ہم کو ہم سے ملا
بے بسی کا لہو چاٹ کر
زندگی نارسائی کے ملبے تلے دب گئی
تشنگی ریت کے لمس میں کھو گئی
نرم ہونٹوں کی پرچھائیں
صحرا نشیں ہو گئی
سرخ سرسبز شاداب چہروں کی پہچان غارت ہوئی
خواہشوں کی سیہ فام آنکھیں
سمندر کی تہہ چاٹ کر سو گئیں
اے خدا
تو بھی مجبور لوگوں میں شامل ہے تو
سن رسیدہ دعاؤں کے پر کاٹ دے
صعوبت کی دیوار پر
ریزہ ریزہ بدن بانٹ دے
اے خدا
پھر ہمیں پانیوں کے گھنے جنگلوں سے گزار

اے خدا
پھر ہمیں ریت کی دلدلوں میں اتار
اے خدا
پھر ہمیں آسماں سے پکار
ادھ کھلی مٹھیوں میں دبے فاحشہ خواہشوں کے قلم بے ہنر ہو چکے
روشنائی کی تیزاب کے ذائقے
بے ضرر ہو چکے
اے خدا
ہر طرف لفظ و معنی کی خوشبو اُگا
ہمیں روشنی سے ملا
بیوی بچوں کی بے رحم معصوم چیزوں کا گلا کاٹنا
خواہشوں کے دریدہ بدن بانٹنا
روز و شب کی گھٹن چاٹنا
اے خدا
آخری التجا
ہم کو ہم سے بچا
اے خدا
ہم کو اپنی صداقت کی پہچان دے

مرے داغ کے دائرے پر...“

ساجدہ زیدی

یہ خورشیں وقتیوں کی گھڑی
طوافِ غمِ ذات سے باز آؤ

دیکھو خالی سا ہے دل کا اسٹیج
سرد ہونے لگا رقصِ جاں

مرے داغ کے دائرے پر
اک الاؤ
دمِ واپسیں خود جلاؤ
آتشیں عکس سے، اس کے
اپنی کسی شام کی سرد بے کیفیوں میں
ڈرامے کا عنصر جگاؤ
کسی یونانی المیے کا عکس دیکھو
کسی کردار کے دل میں اترو،
کسی ایکٹ پر فیصل از اختتام
زرد پھولوں کا پردہ گراؤ

مرے داغ کے دائرے پر...
اِک دہکتا الاؤ، جلاؤ
آتشیں عکس سے اس کے
اپنی کسی شام کو زود مے رنگیں بناؤ

ہاں...
یہی ساعتِ واپسیں
میرے اصرار کے نام لکھ دو

مجھے آزماؤ
مری تندئیِ قلب و جاں آزماؤ

جو ہستی کی تکمیل ہوتا
مگر
ہو نہ پایا
وہی لمحہ رائیگاں آزماؤ

▲▲

غزلیں

دِل ایوبی

میں ستم کش نہ وہ ستمگر تھا
مر کے جینا مرا مقدر تھا

وہ نہ آیا تو کیا سحر ہوگی
غم کے ماروں کو شام سے ڈر تھا

ہائے وہ بیخودیِ عشق کی نیند
آنکھ کھولی تو معرکہ سر تھا

دیکھنے والے چونک چونک گئے
جانے کیا آئینے کے اندر تھا

کم سوادوں کے یہ نصیب کہاں
وہی ڈوبا ہے جو شناور تھا

سنتے ہیں بت شکن بھی کانپ اٹھا
دل میں ہر بت کے ایک آزر تھا

وسعتیں دیکھتے ہو اب دل کی
یہی قطرہ کبھی سمندر تھا

وہم ہے ناخدا کا سب اے دل
ڈوبنے والا بھی خدا پر تھا

والی آسی

عیاں رہا، کبھی چھپ کر ہمارے ساتھ رہا
وہ سایہ سایہ برابر ہمارے ساتھ رہا

ہمیں خبر نہ ہوئی اور تمام عمر کوئی
ہمارا بھیس بدل کر ہمارے ساتھ رہا

وہ کون ہے جو ہمیشہ اندھیری راتوں میں
کوئی چراغ جلا کر ہمارے ساتھ رہا

کہیں ملا ہے تو بچ کر نکل گئے اس سے
وہ ایک شخص جو اکثر ہمارے ساتھ رہا

کئی حسین مناظر ابھر کے ڈوب گئے
بس اک اجالا سا منظر ہمارے ساتھ رہا

یہی خیال ہمیں گھر کی سمت لے آیا
کہ ہم جہاں بھی گئے گھر ہمارے ساتھ رہا

مخالفین کی تعداد کم نہ تھی والی
مگر ہمارا مقدر ہمارے ساتھ رہا

واحد پریمی

اپنی تاریکیٔ احساس مٹالی جائے
اب کسی چاند سے چہرے سے ضیا لی جائے

کیا یہی بندہ نوازی ہے تری بندہ نواز
ہاتھ خالی ہی ترے در سے سوالی جائے

اس طرح دل نے بنایا ہے امیدوں کا محل
جیسے اک ریت کی دیوار اٹھالی جائے

عام رستوں سے گزرنا تو کوئی بات نہیں
بات تو جب ہے نئی راہ نکالی جائے

آب گلرنگ نہیں زہرِ ہلاہل ہی سہی
میکشو! پیاس کسی طور بجھالی جائے

اس بھرے شہر میں جب کوئی شناسا ہی نہیں
اپنی بستی ہی الگ کیوں نہ بسالی جائے

شدتِ تشنہ لبی کا ہے تقاضا واحد
ریگ زاروں میں کوئی نہر نکالی جائے

○ محلہ قافلہ، ٹونک راجستھان　○ مکتبہ دین و ادب، لاٹوش روڈ، لکھنؤ　○ ۲۰۹ سبزی منڈی نند نگری بھوپال

غزلیں

حسن عزیز

چمکے صدائے آب کے آئینے ایک دن
دھندلا گئے سراب کے آئینے ایک دن

پھر یہ ہوا کہ دھوپ کی جلتی چٹان سے
ٹکرا گئے گلاب کے آئینے ایک دن

تصویر اب پھر کہیں ابھرے گی دشت میں
گزریں گے پھر سحاب کے آئینے ایک دن

شہرِ نوا و حرف کی گمراہیوں کے بیچ
کام آ گئے کتاب کے آئینے ایک دن

عکسِ سوال ٹیڑھے کھڑے دیکھ کر حسن
تھے سرنگوں جواب کے آئینے ایک دن

▲▲

تابش حلیمی

ہر طرف ہے شہر میں سیلاب سا
اب کہاں دریا رہا پایاب سا

ہے نظر میں چہرہ اک مہتاب سا
جاگتے میں دیکھتا ہوں خواب سا

خون کے دھبے نظر آئیں گے کیا
رنگِ پیراہن ہو جب خوں ناب سا

کس قدر مجھ سے محبت ہے اسے
درد کا تحفہ دیا نایاب سا

چھاؤں میں ہے تر پسینے سے بدن
دھوپ کی شدت سے ہوں بیتاب سا

پی رہا ہوں آگ تابش آج کل
ذائقہ غم کا ہے اب زہراب سا

▲▲

ندرت نواز

جس پر اپنے ہونے کی کچھ خبر ملے
تجھ سے مل کر مشکل ہے وہ ڈگر ملے

ایسے تیرا روپ بسا ہے نظروں میں
تجھ کو پاؤں جس سے بھی اب نظر ملے

کانٹے تو ویرانے بھی آباد کریں
پھولوں کی فطرت میں کب یہ اثر ملے

جیون پتھ پر غم ہم کو نہیں چھوڑ سکا
چھوڑ گئے باقی جتنے ہم سفر ملے

دھوپ نہ ہو تو سائے بھی ناپید سے ہیں
غم کے ہونے سے خوشیوں کی خبر ملے

میری مانو آ جاؤ گھر لوٹ چلو
بچھڑ گیا ہے اب وہ جانے کدھر ملے

▲▲

○ ۹۶/۴۴، طلاق محل۔ کانپور ○ ہاکی بیڑی ورکس کامٹی (ناگپور) ○ بنگلا اسٹریٹ امروہہ ڈسٹرکٹ مرادآباد (یوپی)

کھلونا

حبیب کیفی

"پچھلے زمانے کی بات ہے ....." مس چودھری کہہ رہی تھی۔ کہے چلی جا رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی خشک زلفیں کھلی تھیں۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر جمنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"شہر ان دنوں بہت کم ہوا کرتے تھے"۔ اس نے مزید کہا، "گاؤں کی بات ہے ...... تم سن رہے ہونا؟"

میں پہلے ہی کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دل یہ چاہ رہا تھا کہ وہ میرا مقصد جان لے۔ میرے لیے انتظام کر دے۔ خود اپنے لیے بھی۔ مجھے اس کی داستان میں قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ تب ہار کر مجھے اس کی طرف متوجہ ہونے کی اداکاری کرنا پڑی۔

"اس زمانے کے لوگ بڑے دقیانوسی خیالات کے اور ہر قسم کے ہوتے تھے...."

"جیسے میں ہوں!" میں بولا۔

وہ مسکرائی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ اگر چاہتی تو آرام سے جھنجھلا سکتی تھی پر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی مسکراہٹ سنجیدہ تھی۔ شوخ ہوتی تو میں ہرگز نہ چوکتا۔

"سنو پلیز!" اس نے عاجزی سے کہا۔

میں نے سوچا، کیوں یہ آج مجھے بور کرنے پر تلی ہوئی ہے؟ جی چاہا کہ اٹھ کر اسے بہت قریب سے دیکھوں۔ دیکھوں کہ یہ کہیں کوئی دوسری عورت تو نہیں ہے!

"اس طرح میں کچھ بھی نہیں سنوں گا!" ضدی بچے کی طرح میں نے مچل کر کہا "اگر کچھ کہنا ہی چاہتی ہو تو مجھے اپنے نزدیک آنے دو...... ہمیشہ کی طرح!"

"میں نے کب منع کیا ہے؟ پر میری بات پوری توجہ کے ساتھ سنو گے، یہ شرط ہے!" وہ بولی۔

میں اٹھ کر اس کے برابر چلا گیا۔ وہ مہک سی رہی تھی۔ جی چاہا کہ اس کی تعریف کر دوں۔ پر اسے غیر معمولی طور پر سنجیدہ دیکھ کر میں نے کچھ نہ کہا۔ پسر کر میں نے اپنا سر اس کی رانوں پر رکھ دیا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سگریٹ جلا لیا۔

"ہوتا یہ تھا کہ ان لوگوں کو اپنی نسل کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ وہ لوگ ....." وہ اپنی رو میں کہنے لگی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ کان بھی اس کی طرف سے بند کر لیے۔ پر میں اس کی بات پوری توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں، یہ جتانے کی غرض سے میں سگریٹ پیتا رہا۔

اس وقت میری پسندیدہ کوئی اور جگہ ہوتی تو میں یقیناً وہاں چلا جاتا۔ مگر دور دور تک نگاہ دوڑانے کے باوجود بھی مجھے ایسی کوئی پناہ کی جگہ نہیں سوجھی۔ تب ہار کر میں اپنے ماضی کے دریا میں غوطے لگانے لگا۔

تب مجھے لارڈ بائرن اپنے وجود میں سمایا ہوا لگتا تھا ہزاروں سال قبل آئے کرشن اوتار پر مجھے پورا یقین تھا۔ سینما کی ریل چلنے لگی ———

"پڑھائی ایسے نہیں ہوتی بیٹے! ...... کتابیں کاپیاں لاؤ چاہے مت لاؤ، پر فیس کے بغیر کام نہیں چلتا.....!"

اور وہ لڑکا پھٹکار کر اسکول سے نکال دیا گیا۔ عورت نے اکلوتے لاڈلے کا حال سنا تو کھانستے کھانستے بے دم سی ہو گئی۔ لڑکے نے چاہا کہ عورت اس طرح نہ کھانسے۔ ٹھیک طرح رہے۔ بس...... وہ اگر چاہتی تو خود بھی آرام

عائشہ منزل۔ کوارٹر ۳۰، عقب ہنومان بھاکری۔ جودھپور-۱۹

سے رہ سکتی تھی۔ لاڈلے کو اچھا کھلانے پلانے کے علاوہ اسے اعلیٰ تعلیم بھی دلا سکتی تھی۔ مگر اس نے خود کو بچائے رکھا۔ محنت مزدوری کرتی رہی۔ اور ایک دن وہ کچھ اس طرح کھانسنے لگی کہ پھر کبھی اسے کھانسنے کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی!

"نوکری کرے گا؟...... پہلے اپنی حالت تو دیکھ!....."

لڑکا دھتکار دیا گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے بڑی اور اچھی جگہ کا موہ چھوڑ۔ اس نے خود سے کہا، کسی سستی جگہ کی سمت چل۔ کھانا مل جائے اور کپڑے۔ بس۔

آخر ایک جگہ ایسی مل ہی گئی۔ وہ ایک ڈھابا تھا یہاں چائے بسکٹ وغیرہ بھی بیچے جاتے تھے۔ کام تھا، جوٹھے برتن اور کپ پلیٹیں وغیرہ دھونا اور جھاڑو لگانا۔ لڑکا ڈھابے کے مالک کو بھگوان کا روپ سمجھنے لگا۔ کام چل نکلا تھا۔

لیکن جلدی ہی اس بھگوان نے اپنا اصلی روپ دکھا دیا۔ سارے کام مستعدی کے ساتھ نمٹانے کے بعد لڑکا کھانا کھا کر میلی سی گدڑی میں دبکا پڑا تھا۔ سردی کی رات تھی۔ بھگوان نے اسے اپنے پاس بلایا۔ لڑکے نے تعمیل کی اور...... وہ زیادہ کچھ سوچ نہ سکا۔ انکار اور قصور شرابے کا مطلب تھا، وہی ذلت کی زندگی اور بھوک۔ بے بسی میں وہ چیخ بھی نہ سکا۔ سب کچھ جیسے مشینی طریقے سے ہونے لگا تھا۔ ایسی سردی میں بھی لڑکے کو پسینہ آ چلا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہڈیاں تک بھینچ بھینچ کر توڑ ڈالی جائیں گی.....

لڑکا بعد میں اس سے الگ ہونے کے بعد اپنی گدڑی میں دبکا ہوا گھٹی گھٹی آوازیں روتا رہا تھا۔ نیند اسے بڑی دیر بعد آئی تھی۔ وہ اس خونخوار جانور کے خراٹے سنتا رہا تھا۔ اور جب اسے نیند آئی تو اس نے عجیب عجیب خواب دیکھ ڈالے...... ایک سوئی ہے جس کے چھید میں متواتر لوہے کا تار ڈالا جا رہا ہے...... ایک تالا ہے جس میں طاقت لگا کر چابی گھمائی جا رہی ہے.....

"تم کہاں ہو؟......... میں کیا کہتی رہی؟"

"کہ سنیما میں اس لڑکے کی حالت پر بڑا ترس آتا ہے! آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ اور اس جانور سے سخت نفرت ہوتی ہے!" میں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"جاگو بھئی، بس چودھری کی آواز تھی" "اس طرح خواب کیا دیکھنے لگے؟"

خواب بکھر گیا۔ سنیما بند ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا مس چودھری مجھے شکایت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ اپنے میں سے ہی....."

"پر ذرا رکو" میں بیچ میں ہی بول اٹھا "سنا ہے تم آج کل نشہ بندی سمیتی کی ممبر بن گئی ہو!"

وہ ادا کے ساتھ مسکرائی۔ بعد میں ہنسنے لگی۔ میں بھی ہنسنے لگا تھا۔ اس نے میرا مقصد جان لیا تھا۔ اٹھ کر وہ بیئر لے آئی۔ اس کی دانشمندی کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ابھی وہ آگے اور ترقی کر سکتی ہے۔ کیا تھی وہ اور کیا بن گئی! بنی ہی نہیں، بلکہ اپنوں کو بھی قابل اور عزت دار بنا ڈالا تھا۔ خود وہ ایک قابل رشک عہدہ پر فائز تھی اس کے عہدہ کا رعب تھا۔ شاید اس رعب کے باعث ہی وہ اب تک مس بنی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود بھی جسمانی طور پر خود کو اس نے کافی حد تک دلفریب اور پرکشش بنا رکھا تھا۔

چیئرز کے بعد اس نے سگریٹ جلایا۔

"تمہاری انہیں باتوں نے تو ستم ڈھا رکھا ہے!" گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اس نے میری تعریف کی۔

"اور میرا وجود، یہ جسم کچھ بھی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تھا"

"یعنی کباب نہیں ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"برا مت مانو۔ سنو، تمہاری بات تمہارے وجود سے الگ ہے کیا؟" کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میرے سینے پر رکھی۔

"ویسے تو تم اور تمہاری باتیں، دونوں ہی اچھی لگتی ہیں۔"
موقع پاکر میں نے اس کی تعریف کر دی۔
"کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟..... اتنے سارے اسکینڈل کے باوجود بھی تم یہ کہتے ہو؟"
"بحث تو نہیں کرتا پر اتنا ضرور ہے کہ ان کی بات ایک دم دوسری ہے۔ خیر چھوڑو۔"
"تو میں آگے کہوں اب؟"
"کیا؟"
"وہی جو میں کہہ رہی تھی!"
پھر کوفت سے دوچار ہونا پڑے گا؟...... میں خاموش رہا۔ اسے اس نے میری رضامندی سمجھ کر آگے کہنا شروع کیا۔ میرا سر اب تکیے پر تھا۔ موقع ملتے ہی میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پہلے تو میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ معلومات حاصل کرنے کی طرح اس سے میں نے کچھ چھوٹے چھوٹے سوال پوچھ ڈالے۔ اسی دوران میں نے پچھلے زمانے کے گاؤں دیکھ ڈالے۔ تصوری ہی تصویریں رس چودھری کی آواز کے سہارے میں نے وہاں کی سیر کی۔ بعد میں اسی طرح جانے کب سینما شروع ہو گیا.....

ڈھابے پر لڑکے کا استحصال ہوتا رہا۔ وہاں کی زندگی نے دھیرے دھیرے اسے ہوشیار اور ایک حد تک چالاک بنا ڈالا تھا۔ طرح طرح کے لوگوں کو دیکھنے سے رفتہ رفتہ اسے آدمی کو جاننے پہچاننے کی سمجھ بھی ہو چلی تھی۔ بعد میں وہ ذرا بے باک ہو گیا۔ اسی کے باعث ایک بار ہمت کر کے اس نے اس خونخوار سے تالہ بن جانے کے لیے کہہ ڈالا تھا۔ پر اس نے برا نہیں مانا۔
"تو ایسا کیسے ہے رے؟" گھر پر اس لڑکے سے ڈھابے والے کی بیوی نے ایک بار کہا تھا۔
کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟ اب پھٹکارے گی۔ دھتکارے گی۔ شاید پیٹ ڈالے غصیل تو ہے ہی۔ مجرم سا لڑکا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ ناراض نہیں لگ رہی تھی۔ اس سے لڑکے نے راحت محسوس کی۔

اور آن کی آن میں اس چار بچوں کی ماں نے لڑکے کو کس کر باہوں میں بھینچ لیا۔ وہ کچھ سمجھ نہ پایا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لڑکے نے سوچا۔ لیکن اسے زیادہ کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ عورت اس وقت وہاں تنہا تھی۔ دو پالنے میں اس کی دودھ پیتی بچی سو رہی تھی۔ عورت نے بڑھ کر وہاں کا صدر دروازہ بند کر لیا تھا۔ اب لڑکے نے خود سے پوچھا۔ کیا وہی سلسلہ یہاں بھی چلے گا؟ کیسے پر اس کے پاس تو........ عورت کی سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خمار سا آگیا تھا۔ اس اناڑی کو سمجھانے میں کچھ وقت تو ضرور لگا مگر آخر بات بن ہی گئی۔ اس گرمی کے موسم میں لڑکے کو جیسے ایک ندی مل گئی تھی۔ ندی کہ جس کے کناروں پر ملائم سیاہ دوب اور چکنی چٹانیں تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اس نے یہ سکھ جانا تھا۔ اس کے دل میں انتقام کا جذبہ موجیں مارنے لگا تھا۔ وہ جیسے اس خونخوار درندے کا پچھلا حساب چکاتا جا رہا تھا.....
بعد میں لڑکے کو اپنا اعتماد بڑھا ہوا لگنے لگا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔
"کسی سے کہنا نہیں!" لڑکا جب لوٹنے لگا تو عورت نے بڑی مٹھاس کے ساتھ اسے ہدایت دی۔ لڑکا مسکرایا تھا۔

معمول کے مطابق ڈھابے والے نے ایک رات لڑکے کو پکارا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ سمجھانے کی کوشش کی تو لڑکے نے اپنے تیکھے دانت اس کے بازو میں گاڑ دیئے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ لڑکے نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اسی دم وہاں سے بھاگ نکلا۔
"اپنے میں سے ہی وہ ایک نوجوان اور مضبوط آدمی کو چن لیتے تھے۔" رس چودھری نے زور دے کر کہا۔ اس کی آواز میں تیزی تھی۔ میں حال میں لوٹ آیا۔ اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ اچانک یہ اسے کیا ہو گیا؟ میں نے سوچا، تو اب یہ اپنی

معمولی چیز بھی اسے چڑھ جایا کرتی ہے ؟

"کیا نام بتایا تھا تم نے ؟" میں نے پوچھا۔

"سانڈ۔" نارمل ہوتے ہوتے وہ بولی "نام نہیں پہچان ہوتی تھی اس کی .... اور وہ لوگ اس سانڈ کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ اسے دیوتا مانتے تھے۔"

"لیکن اس سانڈ کا کام کیا ہوتا تھا ؟" اب میں اس کی داستان میں دلچسپی لینے لگا۔

"کام ؟" گلاس خالی کر کے وہ مسکرائی۔ میں نے غلط جانا تھا کہ اسے نشہ ہو چلا ہے۔ وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ نارمل بھی۔ اسی رو میں اس نے آگے کہا "وہ ان لوگوں کی بیویوں کے ساتھ سوتا تھا! ہاں، جس کسی کے ساتھ چاہتا، سو جاتا۔"

"ہر کسی کے ساتھ ؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں، شرط صرف یہ تھی کہ عورت شادی شدہ ہونی چاہیے۔ کنواری یا بیوہ نہیں۔" اس نے مزید کہا۔

مجھے اگلے وقتوں کے راجاؤں کی یاد آنے لگی۔ کس طرح وہ لوگ نئی نویلی دلہنوں کو پہلی رات اپنے شبستانوں کی زینت بنا لیا کرتے تھے۔ جب جی چاہتا ہر کسی عورت کو بلوا لیتے۔

"سو تو ٹھیک ہے۔" میں بولا "پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تھا ؟ —— مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"یقین کرنا چاہیے۔" اس نے زور دے کر کہا "یہ سب ان لوگوں کی رضامندی سے ہوتا تھا۔"

"لیکن کیوں آخر ؟"

"میں نے بتایا نا کہ ان لوگوں کو اپنی نسل کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ دیوتا سمجھ کر اس سانڈ کو خوب اچھا کھلاتے پلاتے تھے۔"

"کیا واقعی اس سے ان لوگوں کی نسلیں بڑھیا ہوتی تھیں ؟"

"سنا تو یہی جاتا ہے۔"

"اور سانڈ اس کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا ؟"

"ہاں، کچھ نہیں۔ لیکن یہ کیا کوئی کم کام تھا ؟" کہہ کر وہ آہستہ سے ہنس دی۔

"اور فرض کر لو کہ گاؤں میں قحط پڑ گیا، ایسے میں وہ لوگ کیا کرتے ؟" میں نے سوال کیا۔

"قحط سالی کے وقت لوگ آج کی طرح چالاکیاں نہیں کرتے تھے۔ اور پھر دیوتا تو دیوتا ہوتا ہے۔ اسے ہر حال میں خوش رکھا جاتا ہے۔ پیٹ کاٹ کر بھی اسے بھوگ لگایا جاتا ہے۔ دیوتا کے معاملے میں آج بھی ایسا ہے کہ نہیں ؟"

خاموش سا میں سوچنے لگا کہ خود میں کیا رہا ہوں۔ یادوں کا سیلاب آ رہا ہے۔ ایک ایک صورت نگاہ میں تیرنے لگی ہے۔ ایک ایک جسم ....

مجھے کسی نے باقاعدگی کے ساتھ سانڈ نہیں بنایا۔ پر میری حیثیت میں چودھری کے بتائے ہوئے سانڈ سے کسی بھی طرح کم نہیں رہی ہے۔ مجھے کسی نے پوجا نہیں، پر کتنوں نے میرے گن گائے ہیں، مجھے دعائیں دی ہیں۔ اور بدلے میں میں نے کیا نہیں پایا ؟ ہر طرح کی مادی آسائشیں حاصل کرتا رہا ہوں کتنا سخت گیر تھا میں! پھر بھی ان کے لیے اپنا سا رہا ہوں۔

اب صرف یادیں ہی تو ہیں۔ وہ عورت —— ہاں، وہی۔ ایک دفعہ ٹہلتا ہوا اُدھر سے گزر رہا تھا کہ اس نے پکار لیا۔ وہ سراپا دعوت بنی ہوئی مجھے مدعو کر رہی تھی۔ اور مجھے وہ ڈھابے کا مالک وہ خونخوار جانور یاد آ گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف منہ کر کے تھوک دیا۔ عورت یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ بعد میں میں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔

اور پھر شعور کچھ پختہ ہوا تو بوڑھے افسر کی وہ جوان بیوی ملی۔ اسی نے مجھے بڑے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ سکھایا تھا، قرینے سے جینے کی تحریک سی تھی، آداب سکھائے تھے، قیمتی شرابوں اور سگریٹوں کا چسکا لگایا تھا۔ ایک دفعہ اس نے زور دے کر مجھ سے بدیس چلنے کے لیے کہا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ روپے پیسے کی چنتا نہ تھی۔ بہتیں نے ہی

اس کا یہ آفر بڑے ادب کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا ـــــ اور
اس کی وہ سوتیلی جوان لڑکی۔ اس نے بھی تو مجھ سے فائدہ
اٹھایا تھا۔ وہ تو اَڑ گئی تھی کہ شادی کرے گی تو مجھ سے
ورنہ ساری عمر کنواری رہ جائے گی۔ جذباتی لڑکی! اور
وہ بوڑھا افسر مجھے بہت ہی بے بس لگتا تھا۔ وہ میرے
خلاف کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ دراصل وہ اس قابل
تھا ہی نہیں۔

ایک اور یاد! زبردست رومان تھا وہ۔ کافی
دنوں تک چلا تھا۔ اس کا تو کافی چرچا بھی رہا تھا۔ اس
خوبصورت شوخی کا پتی تو بوڑھا نہیں تھا۔ بلکہ بظاہر
تو وہ کئی جوانوں کو مات کر دینے والا نظر آتا تھا۔ پُرکشش
شخصیت۔ ایک دم چست درست اور اسمارٹ لیکن
اس کی بیوی نے ہی ایک بار اکیلے میں مجھے بتایا تھا کہ وہ
بے حد پھسپھسا اور ڈھیلا اناڑی ہے۔ یہ سن کر میں نے
ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل مجھے سنبھل
جانا پڑا۔ اس نے نہایت ہی دلفریب انداز میں مجھے یہ بھی
بتا ڈالا کہ وہ میری جان کا دشمن بن چکا ہے۔ یہ عین فطری
تھا۔ اور وہ مجھے بچانا چاہتی تھی۔ یہ بھی فطری تھا۔ وہ
بھی جذباتی ہو کر کہنے لگی تھی کہ میں اُسے کہیں دور لے جاؤں،
ہمیشہ کے لیے ..... میں چوکنا ہو گیا تھا ہوشیار رہنے
لگا۔ پر کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہوا تو صرف یہ کہ کوشش کر کے
اس کے پتی نے بہت دور ایک دوسرے شہر میں اپنا تبادلہ
کرا لیا تھا۔ اور ایک آخری اور قدرے الوداعی ملاقات
میں رونے سسکنے کے بعد وہ مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ وہ بالآخر
اپنے پتی کے ہمراہ چلی گئی۔

اور وہ کمسن لڑکی ..... اس نے تو اس قدر دنیا
نہیں دیکھی تھی۔ ایک ہی خرابی تھی اس میں۔ وہ بڑی غصیل
تھی۔ اُسے اپنے باپ کی دولت کا بڑا زعم تھا۔ عادتاً وہ
وہ گاہے بگاہے مجھ پر بھی بگڑ پڑتی تھی۔ اور اس کے عوض
میں اسے سزائیں دیتا تھا۔ میں اُسے پیٹ ڈالتا تھا۔ کئی
[illegible] اس کی صورت تک نہ دیکھتا۔ لیکن پھر بھی وہ
مجھ سے شکوہ نہ کرتی۔ اُسے شکایت تھی تو یہ کہ میں اُس سے
دُور کیوں رہتا ہوں؟ عجیب ماٹی کی بنی ہوئی تھی وہ۔
مار وہ سہہ لیتی لیکن میرا روٹھنا اور دُور رہنا وہ سہہ نہیں
پاتی تھی ..... آخر وہ بھی گئی۔ اب تو وہ کئی بچوں کی ماں
بن چکی ہو گی۔ جانے کس کامپلیکس کا شکار تھی وہ؟

اسی طرح ایک اور عورت ..... چاہ کر بھی میں اُسے
نہیں بھول سکتا۔ عمر میں وہ مجھ سے کافی بڑی تھی۔ پر تھی
وہ زندہ دل اور دولتمند۔ وہ بیوہ میری بڑی تواضع کیا
کرتی تھی۔ وہ کرکٹ کی بڑی شوقین تھی۔ اس کے مطابق
میں آل راؤنڈر تھا۔ وہ کہتی، چوکے چھکے لگانے میں تم بہت
ماہر ہو ..... تمہیں ایسی ویسی گیند کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے
..... اس نے تو مجھ پر اپنا کاپی رائٹ جتانا شروع
کر دیا تھا!

میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ بیئر پی جا چکی تھی۔
میں بے تحاشہ سگریٹ پیتا رہا تھا مس چودھری .....
میں چاہ رہا تھا کہ وہ اب بھی میرا مقصد جان لے۔ اس کے
لیے میں اس کی تعریف کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہاں
تک کہ خود کو میں اپنے مزاج کے خلاف اس کی منت
سماجت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ پر اُدھر
وہ کچھ اور ہی عالم میں تھی۔ سانڈ کی داستان وہ ابھی اور
آگے سنانا چاہتی تھی شاید۔

سنو۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو شائستہ رعب
سے اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس پر اپنا
عہدہ حاوی ہو گیا ہے۔ پر میں نے اس کی پرواہ کی۔
لفظ نہ ملے اور رہا نہ گیا تو میں نے اسے نرمی کے ساتھ
اپنے پاس کھینچ لیا۔ اس نے اعتراض
نہیں کیا۔ وہ کھلی بھی نہیں۔ میں نے اس
کے لب سنبھالے۔ وہ بندھی رہی۔
میں آگے بڑھا۔ اس نے رکاوٹ نہیں
ڈالی۔ پر خود کو اس نے پہلے ہی کی طرح
لاتعلق بنائے رکھا۔ آخر جب کسی بھی طرح

اس کی طرف سے جواب یا بڑھاوا انہیں ملا تو مایوس ہو کر اُسے دیکھتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

"سنو گے؟" مجھے ہٹتے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"تم مجھے ٹرخا رہی ہو!" میں جھنجھلایا۔

"نہیں" ٹھنڈی آواز میں وہ بولی "میں انکار نہیں کرتی۔ آگے کبھی منع کیا ہے؟...... لیکن تم مجھے کہہ لینے دو! ...... کیا تمہیں اس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں؟"

"ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ تم ہو۔" میں نے پھر کوشش کی۔

"سنو، پلیز!" اس نے عاجزی کی۔

"کہو۔" میں ہار گیا۔

"یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ اور جب بالآخر سانڈ کمزور ہونے لگتا تو وہ لوگ کیا کرتے، جانتے ہو؟"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جب لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا تو وہ ایک جشن مناتے۔ اس جشن کی تیاریاں کسی تہوار کی طرح ہی کی جاتی تھیں۔ سانڈ کو خوب سجایا جاتا۔ اس کی پرستش کی جاتی۔ اور اس جشن والے دن سب لوگوں کی موجودگی میں سانڈ کو ایک مقررہ مقام پر لے جا کر قتل کر دیا جاتا تھا!"

یہ سن کر مجھے ایک زبردست دھکا لگا —— یہ کیا؟ اپنے دیوتا کا قتل! کیسے لوگ تھے وہ؟

"قبیلے کا سردار یا یوں کہنا چاہیے کہ سرپنچ اس کمزور لیکن خوب سج دھج والے سانڈ کے جسم پر سب سے پہلے کسی تیز دھار والے ہتھیار سے ہلکا سا وار کرتا۔ بعد میں سب لوگ ایسا ہی کرتے۔ اس کا جسم ہتھیاروں سے چھلنی کر دیا جاتا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سانڈ موت کی آغوش میں چلا جاتا!"

میں نے اپنی طرف دیکھا۔ مجھے دہشت ہونے لگی تھی۔ یاد آیا —— میرے بالوں کا رنگ بدلنے لگا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے ہیں۔ کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں۔ اب کوئی نیا سلسلہ نہیں چلتا۔ بلکہ چلتے ہوئے سلسلوں میں بھی رکاوٹیں پیدا ہونے لگی ہیں۔ وہ کل تک میری قربت کے لیے ترستے تھے، اب دامن بچانے لگے ہیں۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ میں نے غلط کیا جو یہ راہ اختیار کی اور سانڈ بنا۔ ورنہ میں بھی ایک گرہست ہوتا۔ عام شہری ہوتا۔ اُف! ...... یہ مس چودھری، کیا یہ میری بیوی بن سکتی ہے؟ شاید نہیں۔ شاید ہاں۔ پھر وہ کچھ اس طرح خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی کہ مجھے مار کر لہولہان ہو جانے کا احساس کچوٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ وہ اکثر اپنے پرس میں ایک پستول رکھتی ہے۔ تو کیا وہ مجھے نشانہ بنانا چاہتی ہے؟...... قبیلے کا سردار سانڈ پر وار کرے گا؟......

"پھر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"پھر کیا؟ جلدی ہی وہ کسی نئے سانڈ کا انتخاب کر لیتے۔"

اور میں ایک جھٹکے کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا۔ میں نے وداع چاہی۔ اُس نے وجہ پوچھی۔ لیکن میں کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ حالانکہ وہ اب تیار تھی، پر مجھے ایسا لگا کہ وہ اپنے پستول کی گولیوں سے میرا جسم چھلنی کر دے گی۔ جی میں تو آیا کہ ایسی موت قبول کر لوں۔ مگر ہمت جواب دے گئی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

میں آج بھی شکست خوردہ سا بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ مجھے اس سے انکار ہے کہ میں کبھی سانڈ رہا تھا۔

▲▲

چارہ گر

تحریر : بن پھول
ترجمہ : رفعت نواز

بھیکو ہمارے یہاں گھریلو کام کاج کے لیے ملازم رکھ لیا گیا۔ بھیکو اور کوئی کام کرنے کے لائق بھی کہاں تھا۔ نہ وہ پڑھا لکھا تھا نہ سلیقہ مند۔ برتن مانجھنا، گھر کی صفائی، اور کپڑے دھونا اور بازار سے سودا سلف لانا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ پیوند لگی قمیص اور میلی دھوتی پہنے ہر کام خاموشی اور مستعدی سے کیا کرتا، اس کی جسمانی حالت دیکھ کر یہ گمان ہوتا کہ اسے پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا ہے لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی۔

میں صبح نو بجے گھر سے نکلتا اور واپس لوٹتا تو رات آ چکی ہوتی، گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی، بھیکو کی شکایتیں کرنے لگتی کہ اس نے یہ کام نہیں کیا وہ کام بگاڑ دیا فلاں فلاں چینی کے برتن پھوڑ دیئے، بازار میں اتنے پیسے گنوا دیئے۔ بھیکو خاموش کھڑا سنا کرتا اپنے دفاع میں کچھ نہ کہتا۔ میں اس سے کچھ پوچھتا تو جواب دیتا "مائی جی بالکل سچ کہتی ہیں میں ہی مورکھ ہوں، مجھ سے یہ کام ہو نہیں پاتا، مجھے اس کام کا تجربہ نہیں، میں تو کھیتوں میں کام کرنے والا کسان ہوں"۔

"زمین ہے تمہارے پاس" میں نے پوچھا۔

"دو بیگھہ ہے"۔

"زمین رکھ کر باہر کام کیوں کرتے ہو"۔

بھیکو نے رک رک کر کہا "اب ہمرے پاس زمین نہیں ہے، زمین گروی رکھ کر بہن کی اور اپنی شادی کے لیے قرض لیا تھا اور قرض کی ادائی میں زمین سے ہاتھ دھونا پڑا"۔

بھیکو میرے یہاں کام کرتا رہا۔ گو کہ میری بیوی اکثر گالی گلوچ کیا کرتی اور کبھی کبھی دھول دھپا بھی کیا کرتی۔ وہ یہ سب کچھ مجبوری سے برداشت کیے جا رہا تھا کہ اسے کہیں اور کام نہیں ملتا تھا۔ مجھے اس پر بڑا رحم آتا اور بیوی کے برتاؤ پر شرم آتی۔ ہم خود کو مہذب کہتے ہیں اور ایک انسان سے جانور جیسا سلوک کرتے ہیں۔ ایک دن بھیکو کام پر نہیں آیا۔ بیوی بپھر گئی "آپ کا بھیکو تو آج آیا نہیں، اپنا کام خود کرو اب، برتن مانجھنا، جھاڑو لگانا اور کپڑے دھونا میرے بس کا روگ نہیں"۔ اس دن ہم دونوں نے مل کر کام نمٹا دیا۔ بیوی بار بار تمہارا گھر، تمہارا گھر کہہ کر مجھے اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ گھر کے کام کے لیے ملازم کا انتظام کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میں اس مسئلہ کو سلجھانے کی ترکیب سوچ رہا تھا کہ ہمارا پڑوسی چیالو متر آ گیا۔ یہ شخص مجھے پسند نہیں کہ اس کی فطرت میں کینہ ہے۔

"بھیکو نہیں آیا تو بیچاری بی بی کو سب کام کرنا پڑ رہا ہے، جلد ہی ملازم کا انتظام کر دو بھائی" چیالو متر نے ہمدردی دکھائی۔

"کمینے، مجھے تیری ہمدردی، اور مشورے کی ضرورت نہیں" میں نے کہنا چاہا لیکن اخلاقاً مجھے کہنا پڑا "ہاں کچھ کرنا تو پڑے گا ہی"۔

چیالو متر، بیوی کا بچپن کا دوست تھا، وہ میری سسرال کے پڑوس میں رہتا تھا اور میری بیوی نے اس سے گانا سیکھا تھا۔ شادی کے بعد وہ میرے ساتھ یہاں آ گئی تھی۔ لیکن کچھ دن بعد متر بھی انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے اسی شہر میں آ گیا پہلے تو وہ شہر کے دوسرے کنارے پر کسی ہیں میں رہتا تھا لیکن بی بی کی تنہائی کا خیال کر کے وہ ہمارے پڑوس والے

محلہ گھاٹی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

مکان میں آگیا تھا اور میرے یہاں پھر سے کٹار کلاسس شروع ہو گئی تھیں، ایسی صورت میں میری بیوی گھر کا کام کیسے کر سکتی تھی، ہم جگالی بہرحال بڑے کانچرڈیں تا۔

گھر سے باہر نکلا تو بھیکو مل گیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ بھیکو نے معذرت خواہ لہجے میں کہا "صاحب میں آپ کا کام ٹھیک سے نہیں کر پا رہا تھا، مائی جی کو بھی میرا کام کبھی پسند نہیں آیا۔ اب میری بیوی آپ کے یہاں کام کرے گی اسے گھریلو کام کاج کا تجربہ بھی ہے اور مائی جی کو اب کوئی شکایت نہیں ہوگی"۔ بھیکو کی بیوی سر جھکائے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ متر بھی باہر آگیا اور کہنے لگا "اسے رکھ لو بھائی، چلو تمہاری پریشانی دور ہو گئی"۔

میں نے بھیکو سے پوچھا "تم کیا کام کرو گے؟"

"پھیری کر کے کچھ کما لوں گا صاحب"

سیما گھر میں آگئی ——— بی بی نے اسے سمجھا دیا کہ کون سا کام کس طرح کرنا چاہیے اور وہ گٹار کا ریاض کرنے لگی۔

ملازم کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا لیکن ایک دوسرا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا سیما کو پیٹ بھر کھانے کو ملا تو اس نے ہاتھ پیر نکالے، اس کی جوانی شباب پر آگئی۔ بہرحال وہ نوجوان اور خوبصورت تھی اور اسے نبھانا ایک مسئلہ تھا۔

ایک دن بیوی غصہ میں بھری سیما کو ڈانٹ رہی تھی۔ "بے شرم، چھوٹے کپڑے پہن کر مردوں کے سامنے دندناتی پھرتی ہے"۔

دفتر میں بیٹھا تھا کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ ایک عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

"بلاؤ اسے"

سیما کمرے میں آگئی۔ اس نے بڑی بے باکی سے کہا "صاحب ساری خریدنی ہے کچھ روپے دیجئے مائی جی نے جتا دیا ہے کہ جب تک میں تن بھر کپڑا پہن کر نہ آؤں گی وہ مجھے کام نہیں کرنے دیں گی۔ واقعی میری ساری پھٹی ہوئی ہے" اس نے آگے پیچھے گھوم کر پھٹی ساری دکھائی میں اس کی جرأت دیکھ کر گھبرا گیا ———

"یہاں کیوں آگئی۔ مالکن سے روپے مانگ لیے ہوتے"۔

"وہ متر صاحب کے ساتھ کہیں گئی ہیں"۔

یاد آیا کہ وہ کسی پکنک پارٹی میں جانے والے تھے۔ میں نے سیما کو پچیس روپے دیے اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مٹکتی ہوئی چلی گئی۔

دوسرے دن سیما نئی گلابی ساری پہنے کام کر رہی تھی، گلابی ساری میں وہ کنول کا پھول لگ رہی تھی۔ بیوی اور متر کو معلوم ہو گیا کہ ساری میں نے دلائی ہے۔ متر نے اس سلسلے میں کچھ زہر اگلا ہوگا کہ بیوی بھی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگی۔ بیوی ان دنوں بڑی بے باک ہو گئی تھی اور اکثر اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتی تھی۔ سیما کی ساری کے سلسلے میں اس کی جلی کٹی باتیں سن کر میں چونک پڑا اندازہ ہوا کہ بیوی کتنی تنگ نظر اور شکی ہے۔ بیوی اکثر سیما کو ڈانٹتی رہتی۔ اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ ایک دن بھیکو مجھ سے مل کر کہنے لگا "صاحب، سیما آپ کے یہاں کام کرنا نہیں چاہتی مائی جی اسے بہت تنگ کرتی ہیں۔ اس نے بہت برداشت کیا لیکن اب مائی جی کی باتیں وہ نہیں سن سکتی"۔

پھر اس نے پچیس روپے مجھے دیتے ہوئے کہا "سیما نے ساری کے لیے جو روپے لیے تھے وہ لوٹا رہا ہوں۔ سیما کا حساب صاف کر دیجئے"۔

مجھے بھیکو کی باتوں پر غصہ نہیں آیا کہ وہ سچ تھیں۔

کچھ دن بعد میں نے سیما کو للو رام مارواڑی کے یہاں کام کرتے دیکھا۔ للو رام ہمارا پڑوسی ہے۔ اس کے گھر کے باہر ہی میونسپلٹی کا نل اور حوض تھا۔ سیما اکثر حوض پر بیٹھی کپڑے دھویا کرتی یا برتن مانجھا کرتی۔ محلے کے نوجوان اس کے گرد منڈلاتے رہتے اور چھیڑا کرتے۔ سیما بھی خوش خوش ان پر فقرے کسا کرتی ——— چند ہفتے بعد سیما اس محلے میں نظر نہیں آئی۔ سوچا شاید گاؤں چلی گئی ہوگی ——— ایک دن بھیکو مجھ سے دفتر آ کر ملا۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور بتایا

کہ سیما بیمار ہے وہ اسے ڈاکٹر سوشیل سین کو دکھانا چاہتا ہے۔ اگر میں ڈاکٹر سین کو ایک رقعہ لکھ دوں تو وہ اس کے ساتھ رعایت برتیں گے۔ میں نے فوراً ڈاکٹر سین کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیکو کے حوالے کر دیا۔

کوئی پندرہ دن کے بعد ڈاکٹر سین سے ایک پارٹی میں ملاقات ہو گئی میں نے ان سے سیما کے بارے میں پوچھا وہ شرارت سے مسکرائے اور بولے "تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو ——— سیما تو آتشک میں مبتلا ہے اور تمھیں تو معلوم ہے کہ آتشک کس وجہ سے ہوتا ہے"۔

میں چونک پڑا ——— میں نے اپنی صفائی میں کہا "اس کا شوہر میرے یہاں ملازم تھا اس لیے رقعہ لکھ دیا تھا"۔

بھیکو یہاں وہاں خوانچہ لیے پھیری کرتا نظر آجاتا تھا۔ ایک بار اس سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ سیما اب اچھی ہو گئی ہے۔

"میں نے اسے بہت دن سے نہیں دیکھا کہیں کام کر رہی ہے کیا؟"

"میں اسے گھر سے نکلنے نہیں دیتا لوگ خواہ مخواہ اسے پریشان کرتے ہیں۔ وہ کم عمر اور ناسمجھ ہے نا ——— اب وہ گھر میں رہ کر چیزیں تیار کرتی ہے جنھیں میں بیچتا ہوں"۔

ایک دن برآمدے میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ سامنے سے سیما زخمی حالت میں اسٹریچر پر لے جائی جا رہی تھی اس کے ساتھ دس پندرہ آدمی تھے بھیکو بھی اس بھیڑ میں سر جھکائے چل رہا تھا۔ یوں جیسے وہی اس حادثے کا ذمہ دار ہو، پوچھنے پر بتایا گیا کہ سیما کا مالک مکان کے نوجوان بیٹے سے معاشقہ چل رہا تھا۔ مالک مکان کی بہو کو اس سلسلے کی خبر ملی تو اس نے باپ کو مطلع کیا اور عاشق کے خسر نے پہلوانوں کے ذریعہ سیما کی خوب پٹائی کروائی۔ وہ تو اسے مار ہی ڈالتے لیکن محلے کے کچھ نوجوان کود پڑے اور سیما بچ گئی۔ بھیکو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا اور میرے قدموں پر گر گیا۔

"صاحب سیما کو بچا لیجئے۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بھولی ہے لوگوں کے بہکاوے میں آجاتی ہے۔ آپ نے مکان مالک کے لڑکے کو نہیں دیکھا وہ بڑا بدمعاش ہے۔ چونکہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے، بڑے آدمی کا داماد ہے اس لیے کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ ایک بار اور تکلیف دیتا ہوں، اپنے ڈاکٹر دوست کو ایک سفارشی خط دیجئے۔ میں دوا دارو کے اخراجات برداشت کروں گا"۔

سمی ہی نے کھڑکی سے جھانک کر کہا "اس جھگڑے میں مت پڑو"۔

"میں کچھ نہیں کر رہا، صرف ڈاکٹر سین کو رقعہ دے رہا ہوں"۔ میں نے ڈاکٹر سین کو لکھا کہ سیما کو تم جانتے ہو، اس کا علاج دلچسپی سے کرنا مہربانی ہوگی۔

ایک ماہ بعد بھیکو سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ سیما کو ڈاکٹر صاحب نے بچا لیا ہے۔

"کیا اب بھی وہ نوجوان اسے ستاتا ہے؟ اگر وہ ستائے تو مجھ سے کہنا۔ نیا ایس۔ پی میرا پرانا ملاقاتی ہے اس سے کہہ کر صاحبزادے کا دماغ درست کرا دوں گا"۔

"صاحب میں نے سیما کو میکے بھجوا دیا ہے، وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے اور خوش ہے۔ میں اسے پچاس روپے بھجوا دیتا ہوں ہر مہینے"۔

پھر کوئی پانچ سال بعد بھیکو سے ملاقات ہوئی بھیکو رکشا چلا رہا تھا۔ مجھے رکشا کی ضرورت تھی۔ "ان دنوں کیا رکشا چلاتے ہو؟"

"ہاں جناب"۔

"اچھا تو چلو کورٹ تک پہنچا دو" میں آرام سے رکشا میں بیٹھ گیا۔

"صاحب کورٹ کیوں جا رہے ہو، آج آفس جانا نہیں ہے کیا؟" بھیکو نے پوچھا۔

"کچھ کام ہے" میں نے کہا۔

"مائی جی تو خیریت سے ہیں نا؟"

میں خاموش رہنا چاہتا تھا لیکن [illegible]

"سب ٹھیک ہے بھیکو ۔۔۔ سیما کا کیا حال ہے؟"

"سیما مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔"

"کیا کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ پولیس کو مطلع کیا تم نے؟"

کیا فائدہ صاحب، جب وہ دل سے مجھے نہیں چاہتی تو پولیس، کورٹ کچہری جانے سے فائدہ؟ سیما خوبصورت ہے جوان ہے اس کے دل میں ارمان ہیں، میرے یہاں اسے کون سا سکھ ملا۔ اپنے ساتھ رکھ کر اسے اور کیوں جلاؤں؟ بھیکو کی آواز جذبات سے بھرا گئی۔ اس کی باتیں سن کر میں چونک پڑا۔

کچھ دن پہلے سی سی مجھے چھوڑ کر مترا کے ساتھ چلی گئی تھی اور میں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تھا اور آج پیشی تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ اب مقدمہ واپس لے لوں گا۔ بھیکو کی سیدھی سادی باتوں نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔

ایک سال اور بیت گیا۔ سی سی واپس آگئی تھی اور اب وہ وفا شعار اور شوہر پرست بیوی بن گئی تھی کسی گرو کو بھی ماننے لگی تھی۔ ایک دن بھیکو ہانپتا کانپتا آیا "صاحب ڈاکٹر کے نام رقعہ لکھ دیجیے۔ سیما سخت بیمار ہے۔ اس کے پیروں کو فالج مار گیا ہے" اور بھیکو رونے لگا ۔۔۔۔ میں نے ڈاکٹر سین کے نام رقعہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔

(بنگالی کہانی)

غزلیں

قوی ٹونکی

جستجو کوچۂ قاتل کی کیے جاؤں گا
اے اجل تیری تمنا میں جیے جاؤں گا

کام تدبیر سے تا عمر لیے جاؤں گا
چاک ہے دامنِ تقدیر اسے سی جاؤں گا

خاک میں ملنے نہ دوں گا ترے غم کی دولت
اشک آنکھوں میں جو آئیں گے پیے جاؤں گا

رنگ تصویرِ غمِ عشق میں بھرنے کے لیے
خون ہر آرزوِ دل کا کیے جاؤں گا

اے قوی چاہے بنے یا نہ بنے یہ امرت
عمر بھر زہرِ غمِ عشق پیے جاؤں گا

سکندر عرفان بی اے

ماندگی کی گود میں کچھ دیر سستانے تو دو
مجھ تھکے ہارے مسافر کو سکوں پانے تو دو

وہ بسوں کی بھیڑ میں مجھ تک تو آ سکتا نہیں
دوستو ! بوڑھے بھکاری تک مجھے جانے تو دو

ختم ہو جائے گا سب جوش و خروش و اضطراب
بڑھ کے دریا کو سمندر کے قریب آنے تو دو

رہزن و رہبر میں ہے کیا فرق سب کھل جائے گا
قافلوں کو راستوں پر ٹھوکریں کھانے تو دو

ہم فضاؤں میں بکھر جائیں گے عرفاں ہر طرف
سازِ ہستی پر ہمیں نغماتِ غم گانے تو دو

شفق تنویر

کبھی اپنے کو یوں بھی تو سزا دوں
کہ کش سے پہلے ہی سگریٹ بجھا دوں

فضا جتنی ہو چاہے خوبصورت
مگر پردہ میں کھڑکی کا گرا دوں

پھرے گا کب تلک آوارہ سورج
میں بڑھ کر ہاتھ میں انگلی تھما دوں

علاوہ جلتے بجھتے جگنوؤں کے
مرے بچو ! تمہیں دوں بھی تو کیا دوں

وہ خود کو قتل کرنے پر تُلا ہے
اُسے تنویرؔ جینے کی دعا دوں

○ نغمہ باغ روڈ ٹونک (راجستھان) ○ C/O ریلوے بک اسٹال لکھنؤ (یو پی) ۲۲۵۰۰۱ ○ کوارٹر نمبر 2N-۰۲ [illegible] ۴۶۲۰۱۶

غزلیں

شکیل احمد عاصم بریلوی

تھے میرے انتظار میں مخدوش راستے
گزرا تو اہتمام سے لوٹا گیا مجھے

ہٹنے لگے ہیں راہِ وفا سے قدم مرے
لوٹا دے اے خدا مرا دیوانہ پن مجھے

تنہائیوں کی دھوپ ہے صحرائے زیست میں
ایسے میں سایہ دار کوئی تو شجر ملے

آتش فشاں پہاڑ پہ بیٹھا ہوا ہوں میں
اک بے ثبات زیست کا پیکر لیے ہوئے

دہرا رہا تھا آج میں افسانۂ حیات
آیا جو اُن کا نام تو آنسو نکل پڑے

زنداں میں ذکرِ طاقتِ پرواز کیا کریں
اتنا تو یاد ہے کہ کبھی بال و پر بھی تھے

کچھ تو مرے سکوتِ مسلسل نے کہہ دیا
کچھ میرے اشک میرا فسانہ سنا گئے

▲▲

طرب میرٹھی

کرے وہ چھپ کے نقاب وار سامنے آئے
جو حوصلہ ہو تو اک بار سامنے آئے

تھکن بدن کی اتاری نہ بیٹھکر ہم نے
ہزار سایۂ دیوار سامنے آئے

وہ جن کے سائے میں بھی سب کو دھوپ لگتی تھی
یہاں کچھ ایسے بھی اشجار سامنے آئے

نقاب اوڑھی ہوئی تھی جنھوں نے رہبر کی
وہ راہزن تو کئی بار سامنے آئے

لگا ہوں میں اسے پہچاننے کی کوشش میں
نہ لفظوں کی کوئی دیوار سامنے آئے

میں اُس کے ہاتھوں طرب قتل شوق سے ہو جاؤں
جو کوئی میرا طلبگار سامنے آئے

▲▲

مجید کوثر

کل شب تمہاری یاد کے گھنگرو چھنک اُٹھے
تم نے دیئے تھے زخم جو پھر سے مہک اُٹھے

اکبار خواہشات کا جنگل مہک اُٹھے
جو بجھ گیا بدن میں وہ شعلہ دہک اُٹھے

کب تک اکیلا رات کے جنگل میں دوں صدا
آدم نہیں تو کوئی پرندہ چہک اُٹھے

فٹ پاتھ پر وہ مر کے اکیلا پڑا رہا
کوئی نہیں تھا پاس جو روئے سسک اُٹھے

اُس سنگدل کے نام کی تاثیر دیکھنا
الفاظ جیسے بن کے نگینہ دمک اُٹھے

کل اُس کو قتل کر کے بہت خوش تھے ہم مگر
رہ رہ کے آج دل میں یہ کیسی کسک اُٹھے

وہ تیرگی کہ جان پہ بن آئی ہے مجید
کوئی دیا جلے، کوئی جگنو چمک اُٹھے

▲▲

○ محلہ شیش گراں بسی کرتپور (بجنور) ○ اُردو ٹیچر اسلامیہ سیکنڈری اسکول [illegible] ○

غزلیں

اسلام پرویز

شاخ سے پتّے گرے اور جسم ننگا ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے اک پیڑ بوڑھا ہو گیا

میری ہستی کے عناصر مل چکے تھے خاک میں
کیا کشش تھی جسم جل میں بکھرے میں یکجا ہو گیا

سنگ باری ہو رہی تھی آئینہ خانے پہ جب
ٹوٹ کر میرا بھی چہرہ ریزہ ریزہ ہو گیا

دل کا دروازہ ہے سُونا دوستو
ہو گیا آخر میں تنہا دوستو

اپنی پلکوں میں نہ جانے کس طرح
قید کر رکھا ہے دریا دوستو

گھر گیا ہوں میں حصارِ جسم میں
ہے بہت مشکل نکلنا دوستو

▲▲

تابش پرتاپگڈھی

گلوں کی چاہ میں آؤ گے تو ناکامیاں ہوں گی
مرے دل کے شجر میں صرف سوکھی پتّیاں ہوں گی

مناسب ہے کہ پی ڈالو ہر اک زہرِ غمِ دنیا
بیاں کرنے پہ دنیا سے فقط رسوائیاں ہوں گی

بسر کر لوں گا اپنی زندگی اس اک سہارے پر
چلا جائے گا تو لیکن تری پرچھائیاں ہوں گی

چلا ہوں منزلِ فردا کی جانب دوستو لیکن
سُنا ہے راستے میں سخت تر دشواریاں ہوں گی

ابھی تو دور تک تابشؔ ملے گی صرف ویرانی
"پھر اس کے بعد سنتے ہیں کہ کچھ آبادیاں ہوں گی"

▲▲

اعجاز اعظمی

نازاں ہے روحِ خالقِ اکبر کے سامنے
قطرہ امڈ رہا ہے سمندر کے سامنے

وہ شمع ہوں کہ راہ کو روشن کیے رہا
جلتا تھا مجھ کو رہزن و رہبر کے سامنے

اک سلسلہ پہاڑ کا پھیلا عقب میں ہے
اک بحرِ بے کراں ہے مرے گھر کے سامنے

اعجازؔ تم نصیب کے قائل نہیں تو کیا
چلتی نہیں کسی کی مقدر کے سامنے

▲▲

○ ڈاکخانہ مہسول، سیتا مڑھی (بہار) ○ بیگم وارڈ، پرتاپ گڑھ، یوپی ○ [illegible]

تبصرے

● کتاب : ہرجائی تیری خوشبو
شاعر : کرشن موہن
قیمت : تین روپیہ
ناشر : سمن پاکٹ بکس، دریا گنج، نئی دہلی

کرشن موہن نے اپنے اس شعری مجموعہ کو "من کے بانکپن" کے نام منسوب کیا ہے۔ کتاب چار حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں کھُردری غزلیں ہیں۔ دوسرے میں نظمیں، تیسرے میں قطعات اور چوتھے میں پھر غزلیں۔

کرشن موہن کے کلام کا ایک واضح عنصر روایتی شاعری سے انحراف ہے۔ اُس کا اسلوبِ بیان (عام طور پر) سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ زبان پر پوری قدرت رکھتے ہوئے بھی الفاظ و معانی سے کھیلنا البتہ اُس کا محبوب مشغلہ ہے۔ جس کی وجہ سے کبھی کبھی یہ زبان کسی قدر ناہموار بھی لگنے لگتی ہے۔

کرشن موہن ایک وسیع النظر شاعر ہے جس کا مغربی اور مشرقی ادب کا وسیع مطالعہ ہے۔ وہ مغربی مادیت اور مشرقی روحانیت کا یکساں قدرداں ہے۔ ہندی بھاشا کی سادگی، اور نرمی۔ انگریزی کی صفائی بیان اور فارسی کی نازک خیالی اُس نے جی کھول کر اپنائی ہے۔

کرشن موہن جانتا ہے کہ جیسے جیسے زندگی کے طور طریقے بدلتے ہیں ویسے ویسے ادبی مذاق بھی بدلتا ہے وہ صرف دل بہلانے۔ دوسروں کی دلجوئی کرنے یا وقت گزارنے یا جذبۂ جدت کی تسکین کے لیے ہی کبھی کوئی شعری تجربہ نہیں کرتا زندگی کے وہ تجربات اور تاثرات جن سے وہ خود دوچار ہوتا ہے، اس کے ہاں شعر کا روپ دھار لیتے ہیں جذبات و احساسات کی شدت ہی اس کے کلام کو بلند اور بامعنی بناتی ہے۔ اس کے اشعار قاری کے جذبات خیالات کو سہلاتے ہی نہیں ان میں حرکت اور قوت بھی پیدا کرتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہو وہ عربی الفاظ اور محاورات کے آزادانہ استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا بشرطیکہ موضوع میں دلآویزی رہے اور شعریت کا رنگ روپ نہ بگڑے۔

کرشن موہن کھُردری شاعری کا ولی یعنی معلمِ اوّل ہے۔ اِس اسلوب کو ظفر اقبال نے بعد میں اپنا لیا بلکہ وہی وہ آج اس اسلوب کا بڑا سرگرم شاعر مانا جاتا ہے۔ کرشن موہن نے خوب کہا ہے:

اس رنگِ اجتہاد کے ہیں مدعی کئی
توڑا ہے گرچہ میں نے غزل کی زبان کو

کرشن موہن معلومات کو شاعری میں وقیع درجہ دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شعور کے آبِ حیات سے سیراب ہو کر ہی تخیل پر لطف اور پُر اثر ہوتا ہے۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کرشن موہن سوچتا کم اور لکھتا زیادہ ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ درحقیقت وہ ہمیشہ سوچتا ہی رہتا ہے اور لکھتا ہے تو بھی سوچ سے مجبور ہو کر ہی:

کوئی چڑیا میری چاند پہ مارے چونچ

یہ چڑیا اُس کی ذہنی کاوش ہی کی علامت ہے۔

کرشن موہن عروض اور صوتیات کا بالغ نظر طالب علم ہے اور جانتا ہے کہ محض قافیہ بانی ہی شاعری نہیں ہوتی پھر بھی کبھی کبھی محض اس قافیہ بانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے پوری غزل کہہ جاتا ہے۔ جیسے:

بھولے بچپن کا مزہ نانی میں ہے
لطف جوبن کا ئے صافی میں ہے

مگر اس قافیہ بانی کے چکر میں بھی وہ:

راحتِ ہستی، صفائے معرفت
دل کے آئینہ کی شفافی میں ہے

جیسا عمدہ شعر بھی کہہ گیا ہے۔
اس کے چند اور کیفیت آگیں اشعار ملاحظہ ہوں۔

سوکھے پتھر میگھ کو ترسیں
آنکھیں تیرے ملن کی پیاسی

ہیں من کی اداسی کا درپن
رنگیں باتیں باتونی کی

آدھی دھوپ ہے آدھا سایہ
کیسا ہے امید کا آنگن

رات مرا پتھر بھی پگھلا
اور تری نرگس بھی روئی
کیسا کلجگ، ننگی ہوکر
سیج پہ بحث کرے البیلی
عریانی بے کیف ہوئی ہے
بھرتی ہے ہر عورت ننگی

طائرِ جاں ایک دن اڑ جائے گا
توڑ کر تن کے چمکتے کنج کو

کرشن موہن کو اپنی شاعری کے کھردری ہونے کا احساس ہے مگر وہ اس اسلوب کو نرم و نازک شاعری ہی کی طرح ضروری مانتا ہے اور کبھی کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا۔

بہکی باتیں، اکھڑا لہجہ
کیسا شاعر کرشنا موہن

تھے اس قدر کھردرے تیرے شعر
تجھے کرشن موہن یہ کیا ہوگیا ہے

کرشن موہن کب تلک یہ کھردرا پن
اب کرا لے رنگ روغن اس کے اوپر

ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ شروع شروع میں غالب کی شاعری پر بھی کھردری ہونے کا الزام تھا۔

میرے خیال میں غزل کی نسبت نظم کرشن موہن کے مزاج کے زیادہ قریب ہے اس کتاب کا حصہ نظم بہت اچھا ہے "رہبر کی یاد" میں "گاندھی جی کو من سمراٹ" اور "وحشی" "کونور کی قلم" کہنا بہت خوب ہے۔

"رہگذر یونہی چلتی رہے" اور "پیاس میری کلپنا کی" بہت کامیاب نظمیں ہیں۔ ان کے یہ مصرعے:

اور میں ان چٹانوں پہ چلتا رہا
یہ نہ پگھلیں، مگر میں پگھلتا رہا

کلپنا میں چیتنا کا روپ ہے، آکاش درپن
وشو کے سکھ کو سمرپن
کرشن موہن کیا کبھی بجھ بھی سکے گی؟
پیاس میری کلپنا کی

خدا نہ کرے یہ امر پیاس کبھی بجھ جائے ابھی ہمیں کرشن موہن کی ذات اور شاعری سے بڑی توقعات ہیں۔

قطعات میں من ملن، شاخِ صندل، سماج کے تین تصور خوب ہیں۔ یہ اشعار بھی قابلِ داد ہیں۔

قابلِ رشک بنے جاتے ہیں
قہقہے اشک بنے جاتے ہیں

نرم ہونٹوں پہ تبسم کا نکھار
کونپلیں پھوٹ رہی ہوں جیسے

گھنے گھنیرے پتوں میں سے چندا ایسے جھانک رہا ہے
جیسے دکھیارے جیون میں سکھ کے سپنے من بہلائیں

کرشن موہن کا کلام اور اس کی شاعری کا اسلوب بسواد اپنے ہم عصر

شعرا سے الگ تھلگ رہا ہے اُس کی انفرادیت کی چھاپ اس
کتاب میں بھی قائم ہے۔
کتاب کی طباعت کتابت اور کاغذ نفیس ہے۔
سرورق بہت ہی عمدہ اور جاذبِ نظر ہے۔

—— بلراج ورما

بلاشبہ دوستی کا رشتہ دنیا کے مقدس رشتوں میں سے ایک ہے۔ دوستانہ تعلقات قوموں کے ہوں یا افراد کے دوستی ہمیشہ خوشی اور مسرت بہم پہنچاتی ہے۔ لاہور (پاکستان) کے جناب سید مقبول احمد دہلوی سے مجھے قلمی دوستی کا شرف حاصل ہے اور یہ دہلوی توسل ہی ہے کہ اردو کی نئی نئی مگر منتخب پاکستانی مطبوعات پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ جہاں یہ رابطہ ذہنی آسودگی فراہم کرتا ہے، وہیں جب کبھی مقبول صاحب لمبی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں تو انتظار ایک بوجھ بن جاتا ہے دوستی اور خاموشی، انھیں یکجا نہیں ہونا چاہیے ورنہ راستے جنگل بن جاتے ہیں!

مقبول صاحب کے توسط سے دو پاکستانی شاعروں سے رابطہ قائم ہوا جن کا شمار پاکستان کے اُن نوجوان شاعروں میں ہوتا ہے جو گزشتہ دس پندرہ سال میں اُبھرے۔ یہ دو شاعر ہیں: سلیم شاہد اور شاہد شیدائی تخلص مشترک ہے لیکن اسلوب دونوں کا منفرد ہے۔

صبح سفر سلیم شاہد کی غزلوں کا مجموعہ ہے اور ورق ورق میں شاہد شیدائی کی غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی شامل ہیں۔

● صبح سفر (سلیم شاہد کی غزلوں کا مجموعہ)

صفحات: ۲ ، قیمت: سات روپے
ناشر: ہم عصر، ۵ ٹیمپل روڈ، لاہور۔

سلیم شاہد ان محسوسات کا شاعر ہے جو بنیادی بھی ہیں اور ابدی بھی ——— سلیم شاہد نے زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور ان میں خونِ دل کی آمیزش کر کے زندگی کی اثر انگیز تصاویر پیش کی ہیں۔ وہ ماحول کی گھٹن کا شکار ہے لیکن اس میں گھرا ہونے کے باوجود وہ گھٹن کو ایک تماشائی کی طرح دیکھتا ہے اور اس کے مشاہدے کی گہرائی عام اشیاء اور واقعات کو بھی ایک نیا اور چونکا دینے والا رنگ عطا کرتی ہے سلیم شاہد کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور طرزِ بیان میں وہ شگفتگی بھی جس کی بدولت روایت میں بھی جدت کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔

جن اشیاء اور واقعات کو ہم روزانہ دیکھتے ہیں اور انھیں معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں ان ہی اشیاء اور واقعات کو سلیم شاہد کی قوتِ مشاہدہ ایک نیا رنگ عطا کر دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کو لیجیے جن میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ جدید فکر کی لہریں بھی دکھائی دیتی ہیں:

صبح کا دروازہ کھلتے ہی چلو گلشن کی سمت
رنگ اُڑ جائے گا پھولوں کا اگر تاخیر کی

تجھ سے بچھڑ کے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے
کیوں بستیوں کا وہم ہوا ہر چٹان پر

میرے پیروں میں تو زنجیریں گلی کوچوں کی ہیں
مجھ سے ملنے شہر کی گنجان آبادی میں آ

سلیم شاہد زندگی میں جمود کا قائل نہیں۔ وہ مسلسل آگے بڑھتے رہنا چاہتا ہے۔ جس کے لیے حرکت اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آدرش واد یا خالی نعرے بے کار ہوتے ہیں:

کٹتا ہے کبھی ناخنِ انگشت سے کہسار
پتھر نہ کریدو، کوئی تدبیر نکالو

جرم بے لذت ہے ساحل پر تری تر دامنی
یا پلٹ خشکی کی جانب یا کھلے پانی میں آ

سلیم شاہد کے ہاں روایت کا احترام بھی ہے اور روایت پرستی کے خلاف جہاد بھی۔ اس رویے نے اس کی غزل میں ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے:

مٹی کا جسم لے کے چلے ہو تو سوچ لو
اس راستے میں ایک سمندر بھی آئے گا

حسرت رہی کہ صورتِ ابر رواں چلیں
کب سے مثالِ سنگ پڑے ہیں ڈھلان پر

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ سلیم شاہد حرکت اور عمل کا قائل ہے اور ظاہر ہے ایسا شاعر قنوطی نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں انسان تھک کر بیٹھ جانے کا ارادہ کرتا ہے سلیم شاہد وہاں آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ جہادِ زندگی میں ناکامیوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے اس لیے کامیابیوں کے حصول کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

شاہد بجا یہ زعم کہ گوہر شناس ہو
یہ سوچ لو کہ ہاتھ میں پتھر بھی آئے گا

ناکامیاں ایک باعمل انسان کو دل شکستہ نہیں کرتیں بلکہ اسے نیا حوصلہ دیتی ہیں اور اسے یقین دلاتی ہیں کہ کامیابی ایک نہ ایک دن قدم ضرور چومے گی۔

سورج زمیں کی کوکھ سے باہر بھی آئے گا
ہوں منتظر کہ صبح کا منظر بھی آئے گا

صبح سفر خوبصورت ٹائپ میں چھاپی گئی ہے، جس کا سرورق اسلم کمال کے فن کا کمال ہے اور اس طرح سے یہ پیش کش قابل پذیرائی ہے۔

● ورق ورق (شاہد شیدائی کا مجموعۂ کلام)

صفحات ۱۱۲ قیمت : بارہ روپے
ناشر : مکتبۂ تاجور، ۶۶۳، شاد باغ، لاہور

ایک بڑے مصنف کا کہنا ہے: "زندگی آسمانوں میں پرواز نہیں کرتی بلکہ دھرتی کے سینے سے لگ کر سکتی ہے"۔

شاہد شیدائی کی شاعری میں اسی دھرتی کی شاعری ہے۔ وہ ذہنی پرواز کی رفعت پر پہنچنے کے بعد بھی اس زمین سے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے اور ماحول سے ترک تعلق نہیں کرتا۔ شاہد کی شاعری اس کے محسوسات اور ذاتی تجربات کی ترجمان ہے۔ شاہد کے محسوسات خارجی بھی ہیں اور داخلی بھی لیکن کسی حالت میں بھی وہ مادرائی یا غیر دنیاوی نہیں۔ شاہد شیدائی ایسا حقیقت پسند شاعر ہے جو اپنے گرد وپیش پر ہر وقت نظر رکھتا ہے اور اپنے ماحول سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑتا :-

دیکھوں تو مرے غم میں شریک ایک زمانہ
سوچوں تو یہاں کوئی مکیں ہے نہ مکاں ہے

میری ہستی ہے یہاں کتنی حقیر !
میرا سایہ بھی بڑا ہے مجھ سے

شاہد شیدائی کی شاعری میں روایات کی چاشنی ملتی ہے لیکن روایات نے اس کی ذہنی پرواز پر روک نہیں لگائی ہے۔ شاہد شیدائی کی یہ خوبی ہے کہ روایت کے لباس کو بھی وہ حقیقت کے رنگ میں رنگ دیتا ہے، اپنی غزلوں میں ماحول کی بھرپور عکاسی کی بجائے شاہد مختلف پہلوؤں کی جھلکیاں پیش کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے درست ہی ہے کہ غزل کے ضابطے تفصیلات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تفصیلات نہ صرف یہ کہ غزل کو غزل نہیں رہنے دیتیں بلکہ شاعری کو بھی بسا اوقات اس کے رتبے سے گرا دیتی ہیں۔

شاہد شیدائی کا سفر گاؤں کی پُرسکون فضا سے لے کر شہر کی گرد آلود فضا تک پھیلا ہوا ہے اور بالآخر اسے گاؤں کی فضا ہی اپنا کر لیتی ہے۔ کیونکہ اس فضا میں محبت کی خوشبو ہے، ریاکاری نہیں خلوص ہے اور سچا پیار ہے۔ شاعر کی ندامت بھری آواز اس حقیقت کا اس طرح اعتراف کرتی ہے:-

شہر میں آکے انھیں بھول گئے ہو شاہد
گاؤں کے لوگ ملے تھے وہ گلہ کرتے تھے

یا پھر یہ خواہش :

اپنا بھی لے تو گاؤں کی سادہ سی زندگی
شاہد، عبث ہیں شہر میں زیبائشیں بہت

منزل کی جستجو میں ہم سے بھی سر پھرے
پتھر ملا تو پھول سمجھ کر اٹھا لیا

شاہد شیدائی انسان دوست ہیں۔ انسانیت کے شیدائی ہیں، انھوں نے بلاشبہ جدید دور کی وسیع النظری کو اپنی تخلیقی زندگی کا جوہر بنالیا ہے اور اپنے تجربات کو احساس نو کی بھٹی میں پوری طرح تپایا ہے:

مرا مذہب نہ مجھ سے پوچھ شاہد
میں انسانوں میں شامل ہوگیا ہوں

شاہد شیدائی کی شاعری فکری اور احساسی تجربات کی شاعری ہے اور جہاں اس کے لہجہ میں ایک حساس دل کی کسک موجود ہے وہیں اس کا لہجہ عزم، حوصلہ اور خود اعتمادی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ بقول اسرار زیدی "شاہد شیدائی کی غزلوں میں زندگی کا حسن بھی ہے اور اس کی وہ بدصورتیاں بھی ملتی ہیں جو آج کے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹے جارہی ہیں۔ اس کا فن پوری زندگی اور اس کے حسن و قبیح کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک باشعور شاعر اور فنکار نظر آتا ہے"
عمدہ سفید کاغذ پر خوبصورت آفسٹ کتابت طباعت اور جاذب نظر سرورق کے ساتھ سورق ورق، شاعری جدید رجحانات اور امکانات کا اظہار بھی ہے اور شاہد شیدائی کے تابناک مستقبل کی نشاندہی بھی! (انور کمال حسینی)

● سہرا (در صنعت توشیح و طلسم جمیل)

۳۲ —— ۲۰ ہجری

مصنف :- مسلم آفاقی

کسی شادی کے موقع پر کبھی سہرا جوشِ مسرت سے لکھا جاتا ہے کبھی "زرہ امتثال امر" مگر جناب مسلم آفاقی مدیر "رحیم" رام پور کا زیر تبصرہ ۲۸ ۔اشعار کا سہرا واقعی ایک نادر طلسمی توشیحی سہرا ہے جس کے مصاریع اولی کے پہلے حروف بالترتیب جمع کرنے سے نہ صرف نوشاہ کا نام بنتا ہے بلکہ اس کے اعداد بحساب جمل ۱۹۷۶ء برآمد ہوتے ہیں اگر ہم انھیں مصاریع کے حروف آخر جمع کریں یا مصاریع ثانی کے سر مصرع حروف کے اعداد جمع کریں جب بھی دونوں صورتوں میں بحساب جمل سال عیسوی ۱۹۷۶ء برآمد ہوگا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی اگر سب اشعار کے مصاریع اولی کے پہلے حروف کے اعداد جمع کیے جائیں تو بھی ۱۹۷۶ء برآمد ہوگا، علاوہ ازیں مصاریع کے آخری حروف اور مصاریع ثانی کے پہلے حروف کے اعداد جمع کرنے سے بھی ۱۹۷۶ء برآمد ہوگا)
مقطع کے دونوں مصرعے تاریخی ہیں مصرعۂ اولیٰ سے بحساب جمل ۱۳۹۶ھ اور مصرعۂ ثانی سے ۲۰۳۲ بکرمی برآمد ہوتے ہیں
المختصر سہرے میں یہ اور اسی نوعیت کے دیگر فنی کمالات اہل نظر و ارباب فن سے داد طلب ہیں فن تاریخ گوئی اب ختم سا ہو رہا ہے ایسے ماحول میں شاعر کی یہ کاوش اور یہ دقت نظری لائق داد اور قابل مبارک باد ہے ۔

(ع - ز -)

بین الملکی تجارتی ادارے اور سوویٹ روس بقیہ ص ۵

مغربی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھایا ہے اور بڑی بڑی بین الملکی کمپنیوں کے ساتھ معاہدوں کو ترجیح دی ہے کیونکہ سوویٹ منصوبے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ انہیں بڑے بڑے ادارے ہی جنہیں بہترین مغربی ٹیکنکی وسائل حاصل ہوں پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں ۔

▲▲

مانگے کا اُجالا

اسلوب کی اہمیت

اگر استعارے کی زبان میں بات کی جائے تو یوں ہے کہ خدا ذات ہے اور کائنات اسلوب! یہاں میں نے اسلوب کو انکشافِ ذات اور اظہارِ ذات کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ گویا اسلوب ذات اور شخصیت کا اظہار ہے۔ تنقید میں اسلوب سے مراد لکھنے کا وہ رویّہ یا انداز ہے جس سے لکھنے والے کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے عصر کا مزاج بھی واضح ہو گویا اسلوب شخصیت اور روحِ عصر کے ساتھ خیال کے اظہار کا وسیلہ بھی ہے۔ اُردو میں اسلوب انگریزی لفظ STYLE کے معنوں میں مستعمل ہے STYLE فرانسیسی لفظ ہے جس کے لغوی معنی وہ نوکدار اوزار ہے جو پودے کی جڑوں کو ٹھیک کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ پرانے زمانے میں اس نبار قلم کو بھی STYLE کہا جاتا تھا جو لکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اصطلاح میں اس سے مراد اظہار، لکھنے کا رویّہ، لکھنے کا طریقہ خیال کو پیش کرنے کی ہیئت اور عمل کا ایک خاص رویّہ ہیں۔ اُردو میں STYLE کے لیے اسلوب مستعمل ہے، اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی طور طریقہ اور ڈھنگ ہیں اصطلاح میں اسلوب سے مراد لکھنے کا انداز، اظہار اور خیال کو پیش کرنے کا طریقہ ہے۔

ادبی تنقید میں اسلوب کی بحث بہت پرانی ہے ارسطو نے اپنی شعریات میں اس کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس نے اسلوب کی بنیادی تعریف نہیں کی بلکہ اچھے اور برے اسلوب کی خوبیاں اور خامیاں گنوانے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ ارسطو کے نزدیک اسلوب "ایک ہیئت" ہے گویا وہ اسلوب کو خیال کا لباس تصور کرتا ہے۔ بعد والے نقادوں نے اسلوب پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کی سادہ سے سادہ تعریف یہ کہ "مناسب لفظوں کو مناسب طور پر استعمال کرنا اسلوب ہے" خیر یہ تو نصابی تفصیل تھی۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اسلوب کوئی چیز ہے؟ اور کیا ادب میں کسی دور کا تشخص کرتے وقت ہم اسلوب کو کوئی اہمیت دیں گے اور خیال اور اسلوب میں سے کونسی چیز فن پارے کو عصری تازگی عطا کرتی ہے۔

میرے نزدیک ہر شئے کا ایک اسلوب ہے، گویا ہر خیال اپنے اسلوب کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے۔ کیا اسلوب کوئی اہم چیز ہے؟ ممکن ہے کچھ لوگ اس کی اہمیت سے انکار کریں اور کہیں کہ چیزوں کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اصل چیز تو خیال ہے۔ یہ بات اپنی جگہ جزوی طور پر ٹھیک ہے، لیکن اگر ہم ایک چیز کو مختلف انداز سے بیان کرتے چلے جائیں اور بعد میں ان کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان بہت سے مختلف انداز میں سے ایک انداز بہت ٹھکا ٹھکایا اور مکمل ہے۔ سو یہ ایک مخصوص انداز ہی اس خیال کا اظہار یا اسلوب ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلوب کسی خیال کا وہ مناسب اظہار ہے جس میں خیال کی تمام تر نزاکتیں اور لطافتیں اس طرح سما جائیں گی کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی تخلیق کی عصری حیثیت کا تعین جن باتوں سے کیا جاتا ہے ان میں عصری معاشرتی مزاج کی عکاسی اور اسلوب دونوں کو برابر کی اہمیت حاصل ہے۔ اسلوب کسی چیز کو عصری تازگی کے ساتھ ساتھ تصدیقی پہچان بھی عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر جے براؤن کا کہنا ہے کہ اگر خیال کی مثال سونے کی ہے تو اسلوب وہ مہر ہے جو اسے عصری سچائی دیتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ یہ کس بادشاہ کی ٹکسال سے جاری کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جے براؤن نے اسلوب کو

اس لحاظ سے فوقیت دی ہے کہ ہر دور کا اسلوب اپنے عہد کی پہچان ہوتا ہے۔ بہت سے خیال مسلسل سفر کرتے ہیں اور ایک عہد سے دوسرے عہد میں اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آتی۔ یوں بھی تہذیبی، فکری اور فلسفیانہ سطح پر تبدیلیاں سرعت سے نہیں ہوتیں بعض اوقات کسی فلسفیانہ اور تہذیبی دائرے کی عمر سینکڑوں برسوں پر پھیلی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس دوران جو چیز ایک عہد کے فلسفے، فکر اور خیال کو دوسرے عہد کے فلسفے، فکر اور خیال سے جدا کرتی ہے وہ اسلوب ہے۔ چنانچہ اسلوب ہر عہد میں نہ صرف تبدیل ہوتا ہے بلکہ ایک لکھنے والے کو دوسرے لکھنے والے سے جدا بھی کرتا ہے۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ہر لکھنے والے کا اپنا ایک انداز ہے لیکن مجموعی طور پر پورے عصر کے اسلوب کی ایک شکل بنتی ہے، یا پوری تحریک کی ایک صورت بنتی ہے اور یہی اسلوب کی وہ پرت ہے جو نہ صرف اپنے عہد کا تشخص کرتی ہے بلکہ ایک مخصوص تحریک یا فکری رو کی بھی پہچان بنتی ہے۔

کسی لکھنے والے کے اسلوب کو خاص شکل عطا کرنے میں جو چیزیں حصہ لیتی ہیں ان میں شخصی اثرات کے ساتھ ساتھ عصری، تہذیبی اور سیاسی حالات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ شخصی اثرات میں خاندانی ماحول، بچپن کے حالات، خون کے نسلی تسلسل اور رشتوں کا سماجی پس منظر شامل ہیں، عصری صورتِ حال میں سب سے پہلے جغرافیائی اور ملک کی سرحدی شکل میں موسم اور زمینی جغرافیہ کا انسانی سائیکی پر اثر، تہذیبی حالات، سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد زبان، زبان کی ارتقائی عصری شکل، اور لکھنے والے کی سائیکی کے ساتھ لفظوں کے چناؤ اور جملوں کی ساخت کا رشتہ اور دوسرے تکنیکی اور فنی معاملات کا اسلوب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

اسلوب پر شخصی اثرات انفرادی تجزیئے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہاں اسلوب کی مجموعی صورتِ حال کی بات کر رہا ہوں، اس لیے میں یہاں صرف اسلوب میں لفظ اور اس کے برتنے کے سلیقے سے بحث کروں گا۔ ہر لفظ اپنا ایک داخلی اور خارجی آہنگ رکھتا ہے۔ خارجی آہنگ کسی لفظ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک لفظ کا ملاپ دوسرے لفظوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً قافیہ کی صورت میں، لیکن لفظ کے داخلی آہنگ کا تعلق خیال کے ساتھ ہم آہنگی اور حسنِ ترتیب دونوں سے ہے سوال یہ ہے کہ کیا ہر لفظ میں ہر وقت اور ہر جگہ داخلی آہنگ ہوتا ہے یا جب ہم کسی لفظ کو ایک خاص سیاق و سباق اور ترتیب میں لاتے ہیں تو داخلی آہنگ اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کیا لغت میں لکھے ہوئے لفظ میں بھی داخلی آہنگ ہے یا جب ہم اس لفظ کو کسی فن پارے میں ایک خاص ترتیب اور حالات میں استعمال کرتے ہیں تو تب داخلی آہنگ پیدا ہوتا ہے ظاہر ہے اگر ہم کسی لفظ کو علیحدہ کر کے لکھیں تو اس میں کسی قسم کا کوئی آہنگ نہیں ہوگا لیکن جب ہم اسی لفظ کو خیال کے اظہار کا وسیلہ بنا کر ایک خاص ترتیب میں لاتے ہیں تو تب آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کے داخلی اور خارجی آہنگ کا مسئلہ دراصل اسلوب کے دائرے میں آتا ہے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ اسلوب اپنے دور کی پہچان ہے اور ایک عہد کو دوسرے عہد سے جدا کرتا ہے۔ اسلوب وہ مہر ہے جو خیال کی زمانی اور عصری حیثیت کا تعین کرتی ہے۔ گویا اسلوب خیال کو رائج الوقت ٹکسال کی مہر لگاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی خیال کو اگر دو مختلف عہد کے فنکار بیان کریں تو اسلوب کی وجہ سے ان میں ایک زمانی فرق پیدا ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر اعجاز راہی، منٹو کے افسانے "رحمی" کو لکھے تو وہ اس کی فنی بنت اس طرح کرے گا اور اسے اس انداز میں لکھے گا کہ وہ آج کا افسانہ ہوگا اور اگر منٹو، اعجاز راہی کی "تیسری ہجرت" کو لکھتا تو وہ منٹو کے دور کا افسانہ ہوتا، انہی فنی اور اسلوبی خصوصیات کے ساتھ جو منٹو اور اس کے دور کا خاصہ تھیں۔ اسلوب اپنے عہد کی سماجی سیاسی اور تہذیبی صورتِ حال کا گواہ بھی ہوتا ہے، یوں کہ علامت اور استعارہ جو اسلوب کا حصہ ہیں دراصل اپنے عہد کی صورتِ حال سے جنم لیتے ہیں۔ علامت کی پیدائش اپنے عہد کی ضرورتوں اور

مجبوریوں کی مرہونِ منت ہے چنانچہ جب یہ علامتی اسلوب
کا حصہ بنتی ہے تو اسلوب خود بخود اپنے عہد کا گواہ بن
جاتا ہے۔

میں نے بھی عرض کیا تھا کہ ہر عہد کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔
اسلوب کی انفرادی پرت انفرادی تجربوں کی متقاضی ہے لیکن
انفرادی اسلوب تکنیک اور اصناف کی حدبندیوں سے بڑی چیز
ہے۔ اس لیے کہ تکنیک کا تعلق اصناف کی مروجہ حدبندیوں اور
خیال کی فنی ہیئت سے ہے، جب کہ اسلوب اس لباس کی طرح ہے
جو اپنے عہد کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے
افسانہ، نظم اور غزل مختلف اصناف ہیں لیکن اگر ہم آج کے نئے
افسانے، نظمیں اور غزلیں پڑھیں تو ہمیں ان سب میں آج کے
دور کے اسلوب کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ میں جب اسلوب کی
اہمیت کا ذکر کرتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں خیال کی
اہمیت سے انکار کر رہا ہوں۔ خیال تخلیق کا بنیادی جوہر ہے
اور جب ہم نئے ادب کی بات کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں
کہ نیا ادب، نئی فکر، نئی جہت اور نئے اسلوب کی تثلیث
ہے۔ یوں بھی تخلیق ایک مرکب عمل ہے جس میں مختلف چیزوں
کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ چنانچہ اس ساری بحث کو مختصر کرتے
ہوئے یہ کہوں گا کہ ہر عہد کا اسلوب اپنے دور کی فکری اور
تہذیبی تاریخ رقم کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کے مزاج اور
اسلوب کا عصری تشخص کرتا ہے اور ہم کسی عہد کے اسلوب
کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اس عہد کا مادّی اور ماورائی المیہ تلاش
کر سکتے ہیں اور شخصی سائیکی کے ساتھ ساتھ مجموعی قومی سائیکی
کی پیچیدہ گہرائیوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں کہ اسلوب اپنے
عہد کی پہچان اور فرد کے ساتھ پورے عہد کو مشخص کرتا ہے۔

رشید امجد (اوراق، لاہور)

بغداد کے کتب خانے

عباسی خلیفہ منصور (۷۵۴ ـ ۷۷۵ء) علم و فن کا
بڑا قدرداں تھا۔ اس نے دوسری زبانوں کی سیکڑوں
کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرائیں۔ ہارون الرشید (۷۸۶ء
۔ ۸۰۹ء) نے بیت الحکمت قائم کیا۔ اور ترجمہ کے کام کو عروج
تک پہونچا دیا۔ بیت الحکمت کے دو سیکشن تھے۔ ایک
کتب خانہ اور دوسرا دارالترجمہ۔ کتب خانے میں عربی،
فارسی، سنسکرت، یونانی، سریانی، قبطی اور کلدانی زبانوں
کی کتابیں بڑی تعداد میں پہونچتی رہتی تھیں۔ ابن الندیم نے
لکھا ہے کہ مشہور فارسی عالم ابو سہل الفضل بن نوبخت
بیت الحکمت میں مترجم تھا۔ ہارون الرشید کی خاص
دلچسپی کی وجہ سے اس نے فارسی کی بہت سی کتابیں عربی میں
منتقل کیں۔ ہارون کے زمانے میں جو ملک فتح ہوتے تھے
وہاں سے دیگر اموال غنیمت کے ساتھ کتب خانے بھی اونٹوں
پر لد کر حریم خلافت میں پہونچتے تھے، پھر ان کی کتابیں عربی
میں منتقل ہوتی تھیں۔ انکرہ اور عموریہ کی لڑائیوں میں بازنطینیو
کو شکست ہوئی تھی، نتیجہ میں ہارون کو یونانی زبان کی بہت
سی کتابیں دستیاب ہوئیں جنھیں اس نے کمال تحفظ کے ساتھ
بغداد بھجوایا، ان کتابوں کے ترجمے کے لیے اپنے عیسائی
طبیب کی نگرانی میں ایک عملہ مقرر کیا، اس طرح یونانی علوم
کے خزانے عربی کے ذخیرے میں منتقل ہوتے رہے۔ اس کے
بیٹے اور جانشین مامون (۸۱۳ ـ ۸۳۳ء) کے عہد حکومت
میں علمی سرگرمیوں پر بہار تازہ آئی، وہ خود ایک اچھا عالم اور
علم و فن اور ارباب کمال کا قدرداں تھا۔ اس کی توجہ سے
بیت الحکمت کے کتب خانے میں کتابوں کی تعداد میں
کافی بڑا اضافہ ہوا۔ اس نے ایرانی علماء و فضلاء کو بحیثیت
مترجم کے مامور کیا، مثلاً ابن البطریق، حنین بن اسحٰق اور
سلام الحجاج بن مطر وغیرہ، انھوں نے ترجمے کے ساتھ مفید
حاشیے بھی لکھے۔ مامون کی ماں اور بیوی ایرانی النسل تھیں اور
خود اس کے دل میں ایرانی شعوبیوں کے لیے بڑی گنجائش
تھی۔ اس کا وزیر فضل بن سہل بھی جس کا کہ وہ اپنی تخت نشینی
کے لیے مرہونِ منت تھا، ایرانی تھا۔ لیکن باوجود اس
کے کہ مامون کے چاروں طرف ایرانی ماحول تھا، وہ
بیت الحکمت کے لیے دوسری زبانوں کی کتابوں کی

فراہمی کے سلسلے میں بڑی فیاضی اور وسیع النظری سے کام لیتا تھا۔ اس نے تقریباً تمام اہم علوم کی یونانی کتابوں کے ترجمہ میں غیر معمولی کوشش اور توجہ سے کام لیا اور تاریخ عرب کے ، جاہلی عہد، سے متعلق نہایت اہم ادبی اور تاریخی مواد، مثلاً قصائد، اشعار، خطوط، تجارتی دستاویزات اور تحریری معاہدے وغیرہ جمع کیے۔ اس طرح مامون نے بیت الحکمت کے کتب خانے کو ایسی چیز بنادیا کہ اس کا شمار اس عہد کے عجائبات میں ہونے لگا۔ اس کتب خانے کی عظمت و شوکت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ باوجود اُن تباہیوں اور بربادیوں کے جس سے بغداد کو وقتاً فوقتاً گذرنا پڑتا تھا، اس کی بہت سی کتابیں ساتویں صدی ہجری تک دستیاب ہوتی رہیں۔ ان میں سے کئی ابن عصیبہ کے پاس تھیں جن کا اس نے حنین بن اسحاق کے سوانحی تذکرہ میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان پر مامون کا طغرا اور حنین کے دستخط دیکھے جاسکتے ہیں۔

شخصی کتب خانوں کی بھی بغداد میں کمی نہیں تھی لیکن یہاں صرف دو کا تذکرہ کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک علی بن یحییٰ منجم (۲۷۵ھ) کا کتب خانہ تھا جو خزینۃ الحکمت کے نام سے مشہور تھا، دنیائے اسلام کے دور دراز شہروں سے اہل علم سفر کی گوناگوں صعوبتیں برداشت کرکے اس کی نایاب کتابوں سے استفادہ کے لیے بغداد آتے تھے اولگا پنٹو جس نے اسلامی کتب خانوں پر ایک عالمانہ مقالہ قلمبند کیا ہے، یاقوت کی معجم الادباء کے حوالے سے لکھتا ہے کہ جو لوگ اس کتب خانے سے استفادہ کے لیے آتے تھے ان کے لیے قیام و طعام کا انتظام موجود رہتا تھا۔ ابو معشر المنجم خراسان سے حج کی نیت سے روانہ ہوا، بغداد آکر جب وہ اس کتب خانے کی زیارت کے لیے اس میں داخل ہوا تو اس کے ذخیرہ کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا، پھر تو اس نے حج کا ارادہ ترک کردیا، یہاں قیام کیا اور اس کی کتابوں سے اس نے جی بھر کر استفادہ کیا، کہتے ہیں کہ یہاں ابو معشر کو وہ کتابیں ملیں کہ اگر وہ انھیں نہ دیکھتا تو علم نجوم میں اسے وہ مرتبہ نہ ملتا جو اسے حاصل ہوا۔۔۔ دوسرا کتب خانہ محمد بن حسین بغدادی کا تھا۔ یہ ایک طرح کا علمی عجائب خانہ تھا جس میں نادر اور بیش قیمت کتابیں، قدیم دستاویزات اور تحریریں جمع کی گئی تھیں اور اس لحاظ سے شخصی کتب خانوں میں اس کی مثال مشکل سے ہی مل سکتی تھی۔ ابن ندیم نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے کتابوں اور دستاویزوں کا ایسا بیش قیمت ذخیرہ اور کہیں نہیں دیکھا۔ محمد بن حسین کسی قدر بخیل واقع ہوا تھا اور اس کے کتب خانے میں رسائی آسان نہ تھی۔ ابن ندیم کو بھی اس کے دیکھنے کی اجازت مشکل سے ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ محمد بن حسین کو اس کا یقین ہوگیا کہ ابن ندیم ایماندار شخص ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہاں خراسانی، چینی اور مصری کاغذ اور چمڑے پر لکھی ہوئی ایسی مستند تحریریں تھیں جن پر مصنفین کے دستخط ثبت تھے یا مشہور عالموں کی سندیں مرقوم تھیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سلاطین اور قبائلی سرداروں کو جو خطوط لکھے تھے ان کے اوریجنل اسی کتب خانے میں تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے کئی تحریری بیان اور مشہور نحویوں کے رسائل اور حضرت سفیان ثوری اور اوزاعی کی تحریریں بھی یہاں محفوظ محفوظ تھیں۔ ابن ندیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی کتب خانے سے مجھے معلوم ہوا کہ علم نحو کی تدوین اور ترقی کی بنیاد ابوالاسود دولی (م ۶۸۸ء) نے ڈالی تھی۔

ضیاء الحسن فاروقی (جامعہ نئی دلی)

مشرق و مغرب کا سنگم

مسٹر آصف علی بیرسٹر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں بننے سے پہلے کانگرس کی ہائی کمانڈ میں شامل تھے حکومتیں بننے کے بعد وہ ہندوستان کے وزیر رہے، سفیر رہے اور گورنر رہے لیکن آصف علی نرے سیاسی آدمی نہیں تھے، شعر و شاعری کا بھی انھیں شوق تھا۔ نثر بھی اچھی

لکھتے تھے اور بات چیت میں تو بڑے بڑے ادیبوں پر چھا جاتے تھے۔ جب سیاست سے جی اکتاتا یا سیاسی زندگی میں ناکامی کی جھلک نظر آتی تو آصف صاحب ترک سیاست بلکہ ترک دنیا پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ تصوف اور روحانیت کی گفتگوئیں کرنے لگتے تھے۔ سیاست کے ساتھ وکالت کو بھی ٹھکرا دیتے تھے۔

آصف صاحب کی زندگی میں مد و جزر بہت آتا رہتا تھا۔ طبیعت تو تھی شاعرانہ اور رئیسانہ، اختیار کر لیا جیل کا جانا۔ پھر آج پیرو حکم ٹال رہے ہیں۔ کل رہنما مشورہ نہیں مانتے۔ کبھی روپیہ ہے تو بہ افراط، کبھی روپیہ نہیں ہے تو مطلق نہیں۔ آصف صاحب کی والدہ سیر چشم بی بی تھیں۔ آصف صاحب کو بھی انھوں نے شاہ خرچ بنا دیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں آصف صاحب بحیثیت وکیل کراچی تشریف لائے اور مہینہ بھر میں پینتالیس ہزار روپے کمائے اور پینتالیس کے پینتالیس ہزار روپے کراچی ہی میں برابر کر گئے۔ آصف صاحب کی زندگی میں اعتدال نہیں تھا۔ آصف صاحب کی زندگی کانٹا لگا پھول تھی۔

آصف صاحب کی جس بات کا ہر شخص معترف تھا وہ ان کی مشرقیت تھی۔ آصف صاحب ایف۔ اے کر کے انگلستان چلے گئے تھے۔ انگلستان جاتے وقت تک لباس ترکی ٹوپی، شیروانی اور چھ سات گرہ چکلے پائنچوں کا پاجامہ تھا۔ انگلستان سے لوٹے تو انگریزی لباس میں لوٹے۔ مگر دیسی لباس بھی باقی تھا۔ بلکہ اس میں اور اضافہ ہوا۔ آڑا پاجامہ، انگرکھا اور دو پلی ٹوپی پہننے لگے۔ گھر کی آراستگی بھی وزیر بننے سے پہلے اور وزیر بننے کے بعد دونوں طرح کی تھی، مغربی بھی اور مشرقی بھی۔

جوں جوں عمر بڑھتی گئی، آصف صاحب کی مشرقیت ابھرتی گئی۔ دماغ پر مغربی تعلیم کا اثر ضرور تھا، لیکن دل بالکل مشرقی تھا۔ عید کے دن دلی کے کوچہ چیلان میں کسی گھر سے ڈومنیوں کے گانے کی آواز آتی تھی، تو وہ صرف آصف صاحب کا گھر تھا۔

دلی میں ایک بڑے میاں سرود ہاتھ میں لیے پھرا کرتے تھے۔ کوئی کہتا تو سرود بجا کر سنا دیتے، ورنہ خاموش گزرتے چلے جاتے۔ کسی سے بولتے ہوئے انھیں کبھی نہیں دیکھا، ان کی ادائیں آصف صاحب کو بہت پسند تھیں۔ بڑے میاں سرود پر ابو ظفر بہادر شاہ کی غزلیں گاتے تھے۔ اور سماں باندھ دیتے تھے۔ ریڈیو نکلا تو آصف صاحب انھیں دلی ریڈیو اسٹیشن لے گئے اور ریڈیو پر سننے والوں سے خود ان کا تعارف کرایا۔

آصف صاحب دلی کی تہذیب اور شائستگی کا نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ذہانت و طباعی، متانت و سنجیدگی اور علم و فضل ہی سے سرفراز نہیں فرمایا تھا، حسن صورت اور حسن سیرت، خوش گفتاری اور خوش ذوقی بھی دی تھی۔ دلی کے شرفا میں غصّے کا اظہار معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آصف صاحب غصّے کو ضبط نہ کر سکتے تو اردو بولتے بولتے انگریزی بولنی شروع کر دیتے تھے یعنی دلی کی زبان کو غصّے کی کرختگی سے بچا جاتے تھے، جیسے بعض الفاظ اور فقرے ہیں۔ جنھیں ہم اردو میں کہتے ہوئے شرماتے ہیں اور عربی، فارسی اور انگریزی میں انھیں بے تکلف بول جاتے ہیں۔

اردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنا آصف صاحب کی چڑ تھی، وہ اردو بولتے تھے تو ٹھیٹ اردو بولتے تھے۔ میرے زمانے میں دلی نے دو مقرر پیدا کیے۔ ایک مولانا احمد سعید۔ دوسرے آصف علی۔ مقرر اور بہتیرے تھے لیکن ان دونوں کو نہیں پہنچتے تھے۔

ملا واحدی مرحوم (منادی نئی دہلی)

بزمِ احباب

● "تحریک" کا "آزادی نمبر" بابتہ ستمبر ۱۹۷۶ء نظر افروز ہوا۔ جس میں سب کچھ ہے لیکن آزادی سے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔ 'کرشن موہن' کی غزل جسے آپ نے بہتر مقام دیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس میں شاعر نے کیا کہا ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تقریباً ساری آزاد نظمیں بے معنی سی ہیں۔ ایسی نظموں کی اشاعت محض صفحات کو کالا کرنا ہے۔ غزلیں بھی کچھ عجیب سی ہیں ——— عروج زیدی کی غزل کا مطلع

انقلاباتِ شب و روز کے حامل ہم ہیں
ہم ہیں ان کی نگہِ ناز کے قابل ہم ہیں

دوسرا مصرعہ میری سمجھ میں نہ آسکا۔ ہم ہیں سے محض وزن پورا کیا گیا ہے۔

افسانہ 'لائٹ پول' میں کیا کہا گیا ہے، شاید کچھ بھی نہیں۔ ایسی لغو اور بے معنی کہانیاں تحریک جیسے ستھرے پرچے کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتا ہے آپ صرف نام دیکھتے ہیں کام نہیں۔ جب کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ "کیا کہا ہے" "کس نے کہا" یہ نہیں دیکھنا چاہیے۔

اب تک "تحریک" کے جس قدر شمارے میری نظر سے گزرے ہیں ستمبر کا یہ شمارہ سب سے ردی ہے۔

——— حضور سہسوانی، سہسوان

● تحریک کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ نہایت ہی پسند آیا۔ تحریک کی کامیابی کا راز آپ کی انتھک کوششوں اور کاوشوں میں مضمر ہے۔ کاغذ، چھپائی، نظم و نثر کی ترتیب قابلِ دید ہوتی ہے۔ خصوصاً معلوماتی اور سیاسی موضوعات پر تفصیلی مواد اکٹھا کر کے اسے شامل اشاعت کرنا ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ اسلئے اردو کے اکثر ادبی رسالے ایسے مضامین سے خالی رہتے ہیں۔

——— اشرف آثاری، سرینگر

● کرشن موہن کی نظم 'سورج پوجا' کے بارے میں غلش بروڈوی صاحب نے لکھا ہے کہ غلام کا گھر ہی کہاں ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے پہل غلام، قدیم زمانے میں کسی جنگ میں پکڑ کر انسان کو زبردستی بنایا جاتا تھا جو ملک ملک بکا کرتے تھے لیکن بعد میں بعض ملکوں میں ان غلاموں کی سماج کے نچلے طبقے میں شادیاں ہوئیں اور انھوں نے گھر بسائے مثلاً میکسیکو میں، جس کی رسم قربانی اس نظم کا مذکور ہے، غلاموں کی بستیاں آباد تھیں جہاں اُن کے پریوار رہتے تھے۔ 'غلام ابنِ غلام' کی ترکیب بے معنی نہیں۔ میکسیکو میں غلاموں کی تعداد بہت زیادہ تھی اگرچہ سورج پوجا کی ظالمانہ رسم زیادہ عرصہ قایم نہ رہی اور نہ ہی قایم رہ سکتی تھی۔

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ اس داستان یا ستان کا کوئی حصہ تاریخی حقیقت کے خلاف ہے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ شاعر اپنے مقصد یعنی ایک گھناؤنے وشواس کی تصویر کشی اور اس کے کھوکھلے پن کی 'ترسیل' میں بغایت کامیاب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی یہ نظم، شاعری میں اسطورہ سازی (myth-making in poetry) کی ایک عمدہ مثال ہے۔ میں تو اس غیر معمولی نظم کو اردو شاعری میں وقیع اضافہ سمجھتا ہوں۔

——— عبدالکمال، میرٹھ

● "تحریک" ستمبر ۱۹۷۶ء کے شمارے 'بزم احباب' میں فاروق شفق صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ اس میں بعض مشورے تو یقیناً مفید ہیں لیکن عبدالرحیم نشتر صاحب کے افسانوی رپورتاژ کے متعلق اُن کا یہ کہنا کہ "رپورتاژ لا حاصل ہے اور اسے دے کر تحریک کے صفحات کو ضائع کیا گیا ہے۔ سطحی اور معمولی باتوں کے علاوہ اس سے کچھ نہیں ملتا" بالکل بے بنیاد ہے۔ آگے

اور بھی گل کھلاتے ہیں" ہر شخص کا ایک الگ میدان ہوتا ہے۔ نشتر صاحب کے بس کی بات نہیں کہ مضمون بھی سپردِ قلم کرنے لگیں۔ ابھی لوگوں سے اُن کی شاعری ہی ہضم نہیں ہو پا رہی ہے"

یہاں یہ کہنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا کہ ہر شخص کا ایک الگ میدان ہوتا ہے، حالی۔ آزاد۔ کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کیا کسی ایک ہی میدان تک محدود رہیں ؟

ہر دور میں ایسے فنکار موجود رہے ہیں جو شعر و ادب کے مختلف شعبوں میں اپنے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ کیا فاروق شفق صاحب اس حقیقت سے منہ موڑ سکتے ہیں ؟ پھر عبدالرحیم نشتر صاحب پر پابندی کیوں عائد کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف شاعری یا صرف نثر تک محدود رہیں ؟ ان کی یہ رائے ان کی تنگ نظری کی دلیل ہے۔

——— شیخ رحمٰن آکولوی، آکولہ

جولائی ... کے شمارے میں کرشن موہن کے شعری انتخاب "من کے منکے" پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا "میں کرشن موہن کو جانتا ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ اپنی اہلیۂ محترمہ کے سوا آج تک اُس نے کسی غیر عورت سے بستر پر ختم ہونے والا عشق نہیں کیا، وغیرہ" جنابِ ضیا فتح آبادی نے اگست کے شمارے میں لکھا ہے: "ایسا دعویٰ ظاہر ہے کہ کرشن موہن کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ قیاس کرنے کی بات اور ہے" اِس سلسلہ میں اپنی طرف سے مزید کچھ نہ کہہ کر میں کرشن موہن کی نظم "وفادار" بطور حوالۂ تصدیقِ دعویٰ انہیں پیش کرتا ہوں:

یہ ہوا کتنی ہی بار
دلِ بے تاب میں لے کر نئے احساس کی پیاس
جب کسی دوسری عورت کے پاس
شوق سے جاتا تھا میں
چاند ابھرتا ہی نہ تھا، بادل سے
"کام" ناکام ہی رہ جاتا تھا
نفسِ امّارہ کا
سر پہ الزام ہی رہ جاتا تھا
تجربے تشنہ رہے
ہار کر آخر کار
یاترا پہلی ڈگر پہ ہو لی
دور لہراتا ہے اُس بیتے سمے کا آنچل
ایک موہوم سا نشتر مرے دل کے اندر
چٹکیاں لیتا ہے، مسکاتا ہے
ایک مچلا ہوا میں،
اپنے ہی گھر میں گرفتار رہا
کتنا ناتجربہ کار اور وفادار رہا

یہ نظم شاعر کے اُن "ناکردہ گناہوں کی نمائش" (گوپال متل) یا "بے گناہی کی ندامت" (مخمور جالندھری) کا اعتراف ہے جس کی طرف میں نے محض اشارہ کیا تھا۔

جس عشق کا میں ذکر کرتا ہوں وہ راحت کے چند لمحات کے لیے کسی خریدی ہوئی عورت کے ننگے بدن سے سانپ کی طرح لپٹ جانے کا نام نہیں، ایک بھرپور مرد کا دُہرا عشق ہے۔

میرے مندرجۂ ذیل جملے پر بھی ضیا صاحب نے اعتراض کیا ہے، "اس کتاب کے کچھ اشعار کا ہر خاص و عام کے زبان زد ہو جانا لازمی ہے مگر اس طرح کی شہرت شاعر کی عاقبت نہیں سنوارتی" ضیا صاحب کا خیال ہے کہ کوئی دوسرا مناسب ایکسپریشن نہ پا کر ہی میں نے لفظ "عاقبت" کا استعمال کیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں صاحبِ زبان نہ ہو کر محض ایک پنجابڑا ہوں اور اُردو زبان سے میری واقفیت کوئی ایسی گہری نہیں ہے۔ میں بس اِتنا جانتا ہوں کہ میں ہمیشہ اُنہیں الفاظ کا استعمال کرتا ہوں جن کے معنی کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی۔ کرشن موہن اُن شاعروں میں سے ہیں جن کے شعری مذاق کا کوئی واحد حلقہ یا دائرہ نہیں ہوتا۔ کرشن موہن کا دائرۂ نظر وسیع

ہے۔ ایسے شاعر سے جس کا مستقبل مانع ہو اور جس کی ذات سے خاص اچھی اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں توقع ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف زمانۂ آئندہ یا آنے والے ادوارِ زندگی بلکہ حیات بعد الممات کا بھی خیال و احترام رکھے۔ ننگے بدنوں کے بے تکلف، عریاں تذکرے جو زیرِ بحث انتخاب میں اکثر پڑھنے کو ملتے ہیں، ظاہر ہے اونچی شاعری نہیں مگر اونچی شاعری کی نسبت جلد مقبولِ عام ہو جاتے ہیں۔ میں نے اسی مقبولیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ ایک اچھے شاعر کی عاقبت نہیں سنوار سکتی کرشن موہن میری نظروں میں ایک پڑھا لکھا، سمجھدار، سلجھا ہوا فلسفی شاعر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مقبولیتِ عامہ ہی کو وہ اپنا نصب العین بنا لے۔

ضیا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں: "بلراج ورما کچھ کہنا چاہتے تھے مگر اُن کو خود معلوم نہیں ہوا کہ کیا کہنا ہے، کہنے کے لیے الفاظ کی تلاش تو دور رہی۔ یا پھر انھوں نے کرشن موہن کی تعریف و توصیف میں ڈھائی صفحات میں جو کچھ کہا ہے اُس کی صداقت کا یقین خود انھیں نہیں ہو پایا۔"

تنقید کے جوش میں ضیا صاحب نے ناچیز کی علمیت اور واقفیت پر بھی شک و شبہ کی "گنجائش" دیکھی ہے۔

جہاں تک علمیت کا تعلق ہے مجھے اعتراف ہے کہ وہ سوفی صدی درست ہیں کیونکہ جہاں تک نارمل تعلیم کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ بندہ نے اُردو زبان پرائمری تک ہی پڑھی ہے۔ وہ بھی اپنے گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب سے۔ یہ دوسری بات ہے کہ زمانۂ طفلی کے ان چار برسوں ہی میں میرے اُس معلمِ اول و آخر نے میرے ذہن میں کچھ ایسی بنیادیں رکھدی تھیں کہ باقاعدہ بی اے وغیرہ تک پڑھ کر بھی میں ہندی میں اُس طرح نہیں لکھ سکتا جس طرح اُردو اور انگریزی میں لکھتا ہوں۔

——— بلراج ورما

▲▲

خبرنامہ

○ ۲۷ر اگست ۷۶ء کو شام کے چھ بجے کلچرل اکاڈمی کے ذفتر لال منڈی میں انجمن ترقی اُردو (کشمیر) کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے شعری مجموعے 'نایافت' کی رسمِ اجراء انجام پائی۔ تقریب کی صدارت مدیر آئینہ اور ممبر پارلیمنٹ شمیم احمد شمیم نے کی۔
تقریب کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے میزبان محمد یوسف ٹینگ نے کہا کہ حامدی کاشمیری شروع میں (جیسا کہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام 'عروسِ تمنا' سے ظاہر ہوتا ہے) رومانی ذہن کے مالک تھے۔ لیکن بعد میں ان کے ذہنی سفر میں بنیادی تبدیلیاں آگئیں ان کا ذہنی سفر خطِ مستقیم کے بجائے خطِ منحنی کا تھا اور اب گزشتہ دس پندرہ برسوں میں ان کی شاعری اور تنقیدوں میں جس نئی حسیت کا اظہار ملتا ہے۔ وہ ان کی ذہنی اور تخلیقی پیش قدمی کا ثبوت ہے۔

مظہر امام نے کہا کہ حامدی کے یہاں رنگوں کا استعمال خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ خاص کر ان کے یہاں سیاہ اور زرد رنگوں کا استعمال موجودہ زندگی کی بے اطمینانی بے رنگی۔ تاریکی اور نارسائی کو ظاہر کرتا ہے۔

رحمان راہی نے کہا کہ حامدی کاشمیری نے اس عہد کی فریب شکستگی کو محسوس کیا ہے۔ اور یہاں کا عادی رجحان ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمان نے کہا کہ حامدی کاشمیری کی شاعری کی تین خصوصیات نمایاں ہیں۔ (۱) یہ کہ انھوں نے چند بنیادی رنگوں کا استعمال کیا ہے۔ جو علامتی اہمیت رکھتے ہیں۔ (۲) ان کی شاعری میں بار بار گھر کا تصور ابھرتا ہے۔ ان کے ہاں۔ دریچے۔ دروازے۔ بام و در کا متواتر استعمال علامتی ہے۔ (۳) ان کے یہاں غیر نظریاتی شعری رویہ ماقبل کے شعراء سے مختلف ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

شمیم احمد شمیم نے کہا کہ حامدی کاشمیری نے روایت شکنی کا صبر آزما مرحلہ طے کیا ہے۔ انھوں نے اپنے پیچیدہ تجربات کے اظہار کے لیے ایک غیر مانوس اور قطعی نیا لہجہ چنا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حامدی کاشمیری کی آواز میں انفرادیت اور قوت پیدا کرنے میں انھوں نے بھی حقیر سا حصہ ادا کیا ہے جبکہ ان کی ابتدائی تحریروں کو وہ سخت تنقیدوں کا ہدف بناتے رہے۔

آخر میں حامدی کاشمیری نے حاضرین اور مقررین کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ ان کے شعری رویے میں انقلابی تبدیلی آگئی ہے۔ وہ اب خارجی حقیقت سے انحراف کرکے داخلی وجود میں اٹھنے والے سوالوں۔ آوازوں اور نالوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ کل کے شاعر کو اپنے نالوں کا جواب ملتا تھا۔ لیکن ان کے نالے خلا کے سناٹے میں گم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ خیالات کے شاعر نہیں بلکہ اپنے وجود کی سیاحت میں حسی پیکروں سے متصادم ہوتے ہیں۔ ان کو ہی لفظ و پیکر میں ڈھالتے ہیں۔

رفتید و لے نہ از دلِ ما

○ پچھلے دنوں دلی میں مشہور افسانہ نگار پریم ناتھ در معمولی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ در صاحب اُن کے پہلے لکھنے والوں میں تھے، کم لکھتے تھے لیکن ان کا شمار صاحبِ اسلوب افسانہ نگاروں میں تھا۔ "نیلی آنکھیں" ان کا آخری افسانوی مجموعہ تھا جو چند برس پہلے شائع ہوا تھا۔
در صاحب نے سرکاری ملازمت میں کئی ذمہ دارانہ

مہدوں پر کام کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے جب اردو مجلس کا پروگرام شروع ہوا تو انھیں اس پروگرام کا نگراں مقرر کیا گیا ان کے ساتھیوں اور ماتحتوں کو اعتراف ہے اور اردو حلقے بھی اس امر سے واقف ہیں کہ اس پروگرام کو کامیاب بنانے اور اس کی مقبولیت بڑھانے کے لیے انھوں نے کئی ایسے مثبت اقدامات کیے جن کی توقع اردو کے ایک سچے بہی خواہ اور ارادے کے مضبوط انسان ہی سے کی جا سکتی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو سے وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوشی کے بعد کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ نے انھیں کشمیر بلا لیا تھا اور اپنا پریس ایڈوائزر مقرر کیا تھا۔ در صاحب خود کشمیری تھے اور شیخ صاحب اور کشمیر کے دوسرے ممتاز لیڈروں سے ان کے اس وقت سے دوستانہ تعلقات تھے جب وہ ریاستی سیاست میں عملی حصہ لیتے رہے تھے۔

در صاحب کے انتقال سے اردو اپنے ایک سچے خدمتگزار اور بہترین دوست سے محروم ہو گئی۔ ہم اس غم میں پوری اردو دنیا کے شریک ہیں۔

○ محمد عبدالرحمٰن جو دلی کے صحافی حلقوں میں صرف رحمٰن کے نام سے مشہور تھے چند دن بیمار رہ کر نئی دلی کے صفدر جنگ اسپتال میں وفات پا گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف ۴۳ برس تھی۔

رحمٰن کا تعلق حیدر آباد سے تھا لیکن وہ پچھلے کئی برس سے مشہور انگریزی اخبار "انڈین ایکسپریس" کے چیف رپورٹر کی حیثیت سے دلی میں مقیم تھے اور اپنی شخصی خوبیوں اور پیشہ ورانہ لیاقت کے سبب دلی کی ادبی، صحافتی اور سماجی زندگی میں انھوں نے اپنے لیے ایک خاص جگہ بنا لی تھی۔ وہ دلی کے اخبار نویسوں کی دو انجمنوں میں سے ایک کے صدر اور دوسری کے نائب صدر تھے۔ ان کے پس ماندگان میں ان کی بوڑھی ماں کے علاوہ، ان کی نوجوان بیوہ، دو سال کی ایک لڑکی اور مہینہ بھر سے بھی کم عمر کا ایک لڑکا شامل ہے۔ اس سوگوار خاندان کی مالی امداد کے لیے دلی کے اخبار نویسوں نے جو فنڈز فراہم کیے ہیں، وہ فرض شناسی کی ایک اچھی مثال ہیں۔

○ پادری ہنین ریحانی اردو کے معروف شاعروں میں تھے ان کا تعلق اردو شاعری کے لکھنوی اسکول سے تھا اور وہ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے شاگرد تھے لیکن ان کا مستقل قیام حیدر آباد میں تھا۔ وہیں کے ایک اسپتال میں انھوں نے بعارضۂ فالج انتقال کیا۔

ہنین ریحانی صاحب کا کلام اردو کے اکثر رسالوں میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ کچھ برس پہلے انھوں نے کتابی صورت میں بھی اپنا کلام شائع کیا تھا اور اردو کے مسیحی شاعروں کا ایک تذکرہ بھی مرتب کر کے چھپوایا تھا۔ تبلیغی لٹریچر کا ایک ذخیرہ بھی ان کی یادگار ہے۔

گوپال مِتّل کی دو مشہور و مقبول تصانیف
لاہور کا جو ذِکر کیا
ادبی اور سیاسی یادداشتوں کی حکایتِ لذیذ
غیر منقسم پنجاب کی کہانی — گوپال مِتّل کی زبانی
ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
دوسرا ایڈیشن — قیمت ۔ دس روپے
صحرا میں اذان
شعری مجموعہ
اُردو شاعری کی مستحکم اور معتبر آواز
آفسیٹ کی خوشنما طباعت
قیمت : آٹھ روپے
کرشن موہن کے شعری مجموعے جو خواص و عوام میں یکساں مقبول ہیں
شیرازۂ مژگاں ○ گیان مارگ کی نظمیں ○ کوئے ملامت
قیمت دس روپے
قیمت : دس روپے
قیمت : دس روپے
مخمور سعیدی کے شعری مجموعے جدید شاعری میں فکری توازن کی ایک روشن مثال
آواز کا جسم
قیمت ۔ دس روپے
سیہ بر سفید
قیمت : چھ روپے
سب رنگ
قیمت ، پانچ روپے
گفتنی
قیمت ، چار روپے
نیشنل اکادمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Regd No. D (D) 118 Phone : 271649 October 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 648/57

TAHREEK

Price

Rs. 1/25

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک نئی دہلی

شمارہ: ۸ جلد: ۲۴

نومبر ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ○ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی: ایک روپیہ پچیس پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر:

گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس۔ دہلی۔

مقامِ اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

بحرِ ہند کو خطۂ امن بنانے کا مسئلہ

گوپال متّل

بحرِ ہند کو امن، سلامتی اور تعاون کا خطّہ بنانے کے لیے نوجوانوں اور طلبا کو آمادۂ جہاد کرنے کی نیت سے کمیونسٹوں کے ایما پر ایک نام نہاد بین الاقوامی کانفرنس کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ یہ کانفرنس ایک نہایت نامبارک اور ناسازگار موقع پر ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس کا انعقاد ایسے وقت پر ہو رہا ہے جب ایک طرف ناوابستہ اور ساحلی ریاستوں کے موقف اور دوسری طرف سوویٹ یونین کے موقف کا فرق نمایاں سے نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔

حال ہی میں ناوابستہ ممالک کی چوٹی کانفرنس کولمبو میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کی ۱۹ راگست کی سیاسی قرارداد میں بڑی طاقتوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ بحرِ ہند کے علاقے سے اپنی بحری فوجیں اور فوجی تنصیبات ہٹا لیں۔ صدر [illegible] اور مسز بندارا نائیکے بحرِ ہند کو "خطۂ امن" بنانے کی تجویز کے متحرک تھے، اور دونوں نے ہی بحرِ ہند میں غیر ساحلی ملکوں کی فوجی موجودگی پر شدید اعتراض کیا تھا۔ بحرِ ہند میں سوویٹ روس کی موجودگی اور مداخلت نے ساحلی اور عقبی ملکوں کو جس تشویش اور اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے، اس قرارداد میں اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

اس کانفرنس کے بارے میں سوویٹ ردِ عمل خاصا عجیب و غریب رہا۔ کانفرنس کے متعلق سوویٹ یونین کی طرف سے جس انداز سے اظہارِ رائے کیا گیا اس سے واضح طور پر برہمی اور بیزاری ظاہر ہوتی ہے۔ بڑی طاقتوں کی حریفانہ مقابلہ آرائی پر کانفرنس کی ممبر قوموں کی اکثریت کی تشویش سوویٹ یونین کی نظر میں محض ایک "من گھڑت داستان" ٹھہری۔ مثال کے طور پر، "نیو ٹائمز" (ماسکو) نے اپنے ۱۹۷۶ء کے ۳۵ ویں شمارے میں دی۔ رسونیسکی کا ایک مضمون شائع کیا، جو بعد میں دہلی میں تعینات روسی سفارت خانے کی طرف سے شائع ہونے والے پروپیگنڈا میگزین "سوویٹ ریویو" میں بھی چھپا۔ اس مضمون میں دل کا غبار اس طرح نکالا گیا ہے:

"یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبو کانفرنس میں سب ہی مقرروں نے امن اور سلامتی کے باب میں حقیقی تعلق خاطر یا تشویش کا مظاہرہ کیا ہے یا انھوں نے ناوابستہ تحریک کی سامراج دشمن مہم کو بھرپور انداز میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ تقریروں میں تو نہایت عجیب انداز کی، بلکہ انتہائی غلط سلط اور حقیقت سے کوسوں دور باتیں بھی سنی گئیں۔ ان پر اخبارات اظہارِ رائے بھی کر چکے ہیں .... ایک من گھڑت داستان یہ بھی پھیلائی گئی کہ امن کے لیے خطرے کا سرچشمہ سامراجی جارحیت نہیں، بلکہ مختلف ملکوں کا "بلاکوں میں بٹ جانا اور حریفانہ مقابلہ آرائی میں شریک ہو جانا" ہے۔ مثلاً اس سلسلے میں یہ حجت بازی کی گئی کہ بحرِ ہند کو خطۂ امن بننے سے جو چیز روکے ہوئے ہے وہ سامراجی فوجی اڈے نہیں، "بڑی طاقتوں کا حریفانہ مقابلہ" ہے۔"

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اس کا موقف اتفاق سے بالکل وہی ہے جس کا اظہار ناوابستہ ممالک کی چوٹی کانفرنس کی سیاسی قرارداد میں کیا گیا ہے۔ "ہندوستان ٹائمز" مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۷۶ء کے مطابق ہندوستان اور

موریتانیہ نے امریکہ، سوویٹ یونین اور بحر ہند کا بحری استعمال کرنے والے دوسرے ملکوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس علاقے کو خطۂ امن بنانے کے لیے ساحلی اور عقبی ملکوں سے مکمل تعاون کریں ـــــ ایسا خطۂ امن جو "غیر ملکی فوجی اڈوں اور بڑی طاقتوں کی حریفانہ مقابلہ آرائی سے یکسر پاک ہو۔"

چین نے بھی خطۂ امن کی تجویز کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس نے روسیوں کو ان کی فوجی "توسیع پسندی" کے لیے بار بار جھاڑ بھی پلائی ہے۔ یکم جون ۱۹۷۶ء کو پیکنگ ریڈیو کے ایک نشریہ میں بحر ہند میں سوویٹ یونین کی بڑھتی ہوئی موجودگی اور مداخلت کی ایک پوری فہرست گنائی گئی تھی۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کس طرح اس دراندازی کا آغاز بظاہر بڑے بے ضرر ڈھنگ سے ہوا تھا۔ ابتدا میں یہ جہاز "دوستانہ دوروں، بحری چھان بین، ماہی گیری، گودیوں پر عارضی قبضے یا بندرگاہوں کی تعمیر میں مدد کی آڑ میں" ہوا تھا۔ اور اب یہ عالم ہے کہ بحر ہند میں سوویٹ جہاز:

"بیس سے زیادہ بحری جہازوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ لگ بھگ چالیس ٹرالر ہیں جو الیکٹرانک جاسوسی کر سکتے ہیں۔ یہ "اصلاح پسند" سوویٹ یونین کے بحری بیڑے بھی آبنائے سنگاپور اور آبنائے ملاکا کے راستے سے بحر ہند میں آتے جاتے رہتے ہیں... پچھلے سال انھوں نے بحر ہند میں کل ملا کر ۲۰۰۰ جہازی دن گزارے۔ امریکہ کے جہازوں کے مقابلے میں دنوں کی یہ تعداد تین گنا سے بھی زیادہ ہے۔"

سوویٹ یونین بحر ہند میں اپنی موجودگی سے انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ تو اس خطے میں اپنی موجودگی کو اس بنیاد پر حق بجانب قرار دیتا ہے کہ:

"سوویٹ یونین نے بحر ہند کے خطے کے ملکوں کو ہمیشہ بڑے پیمانے پر مدد دی ہے۔ چاہے سامراج وادی رجعت پسند اور جارح طاقتوں کے خلاف ان کی قومی آزادی کی جدوجہد کا معاملہ ہو یا معاشی خود مختاری کے لیے ان کی کوششوں کا۔"

تاہم وہ بحر ہند میں اپنے فوجی اڈوں کی موجودگی سے ضرور انکار کرتا ہے، اگرچہ اس کی اس تردید میں کوئی وزن نہیں ہے۔ بار بار ایسی سوویٹ تنصیبات کے فوٹو ہوائی جہاز سے لیے جا چکے ہیں۔ یہ فوٹو اخباروں میں بھی چھپے ہیں اور ساری دنیا نے انھیں دیکھا ہے۔ لیکن جب صومالی سرکار نے چند افریقی اور دوسری قوموں کے صحافیوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ خود موقع پر جا کر کیفیت کا جائزہ لیں اور اس طرح ان فوٹوؤں کی حقیقت کو پرکھیں تو انھیں بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ اس علاقے میں انھیں سرے سے داخل ہی نہیں ہونے دیا گیا۔ بلندی سے وہ جتنا کچھ بھی دیکھ سکے، اس کی بنیاد پر ایک افریقی رپورٹر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان فوٹوؤں کو اشاعت کے لیے عام کرتے وقت امریکہ کے محکمۂ دفاع نے ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں کچھ زیادہ ہی احتیاط برتی تھی۔ اس رپورٹر نے، جس کا نام پیچ بتیرو ہے، ۳۰ جون ۱۹۷۵ء کو "ڈیلی نیشن" (نیروبی) میں لکھا:

"جب یہ صحافی بلندی پر اڑ رہے تھے تو انھیں وہاں سے وہ شہر صاف نظر آ رہا تھا۔ فوٹوؤں میں جن مقامات کی نشان دہی کی گئی تھی، وہ سب کے سب دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں وہ ہوائی پٹی بھی شامل تھی جو پینٹاگن کے بیان کے مطابق زیر تعمیر ہے۔ لیکن جو اس تصویر کے رو سے ہوائی جہازوں کے آنے جانے کے لیے بالکل تیار معلوم ہوتی تھی۔"

اس صحافی نے تفصیل کے ساتھ یہ روداد بھی بیان کی ہے کہ کس طرح اسے اور اس کے ساتھیوں کو اس علاقے میں نہیں جانے دیا گیا جس کی نشان دہی فوٹوؤں میں میزائلوں کی دیکھ بھال کے مرکز کے طور پر کی گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اتنی روک تھام کے باوجود ایک جگہ سے وہ سسٹم ان صحافیوں کو نظر آ ہی گیا جو امریکی محکمۂ دفاع کی صراحت کے بموجب میزائلوں

(باقی ص۵ پر)

عرب اتحاد میں نیا رخنہ

گوپال متل

ایک طرف عرب ممالک آپس میں اتحاد قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور شام اور مصر تک اپنی دیرینہ رقابت کو خیرباد کہہ رہے ہیں، دوسری طرف روس عرب ممالک کے اتحاد میں رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس مقصد کے لیے ایک ایسے عرب حکمران کو استعمال کر رہا ہے جو اس کے نظریاتی موقف کا سرگرم ترین مخالف رہا ہے۔ ہماری مراد لیبیا کے کرنل قذافی سے ہے۔

روس اور کمیونزم پر کرنل قذافی کی رائے دو ٹوک رہی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں "جیون افریقہ" میں ان کا درج ذیل بیان شائع ہوا تھا:

"روس سامراج دشمن بلاک کا راہ نما ہونے کا مدعی ہے لیکن ایسا ہے نہیں۔ یہ بھی دوسرے طاقتور ملکوں کی طرح ہے۔ یہ دوسرے سامراج یعنی امریکہ کی جگہ لینا چاہتا ہے۔"

قذافی کا کہنا تھا کہ کمیونزم آدمی کو اس کی آزادی سے محروم کرتا ہے اور "سامراج مشرق سے بھی آ سکتا ہے اور مغرب سے بھی۔"

مقامی کمیونسٹ پارٹیوں اور کمیونسٹوں کے بارے میں بھی انھوں نے اپنی رائے ظاہر کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ۱۳ر مئی ۱۹۷۳ء کے ہفت روزہ "میڈیٹرین نیوز" میں ان کے رویے کا اظہار ان لفظوں میں ہوا تھا: "کمیونسٹ غیر ملکی طاقت کے ایجنٹ ہیں۔ انھیں تمھاری آرزوؤں اور تمھاری قومی امنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" اور ۱۳ر جنوری ۱۹۷۵ء کے لبنانی اخبار "لاریویو دو لے جور" کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کمیونزم پر ان لفظوں میں چوٹ کی تھی کہ "یہ نظریہ دنیوی جنت کا وعدہ کرتا ہے لیکن یہ صرف ایک نئی آمریت قائم کرتا ہے۔"

ایک وقت تک سوویٹ یونین لیبیا اور مصر کے متعلق غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیے رہا۔ لیکن جب سے صدر سادات نے مصری سوویٹ دوستی کے معاہدے کو ختم کیا ہے، روس مصر کی سرگرم مخالفت اور لیبیا کی سرگرم حمایت پر کمربستہ ہو گیا ہے۔ ۳۰ر اگست ۱۹۷۶ء کے "پراودا" میں جو سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کا سرکاری اخبار ہے، ایک مضمون میں لیبیا کی سرگرم حمایت کی گئی ہے اور اسے دوسرے عرب ممالک کے مقابلے میں حق بجانب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس مضمون میں یہ بھی درج ہے کہ مصر اور لیبیا کی سرحد پر جو جھگڑے ہو رہے ہیں، ان سے مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئے تصادم کا خطرہ ہے۔

مصر جواباً خاموش نہیں رہا۔ نیم سرکاری اخبار "الاہرام" کے ۳۱ر اگست کے اداریے میں مصر نے "پراودا" پر الزام لگایا کہ وہ لیبیا کے کرنل قذافی کی حمایت کر رہا ہے اور ایسا کرتے وقت اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کو بالکل نظر انداز کر رہا ہے جن میں قاہرہ اور اسکندریہ کی پرہجوم جگہوں پر بم پھینکنا بھی شامل ہے۔ "الاہرام" نے لکھا کہ "سوویٹ رویہ آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کہیں لیبیا نے سوویٹ یونین کی بالادستی تو قبول نہیں کر لی؟ کہیں لیبیا کے لیڈروں نے سوویٹ فیصلوں کی تکمیل تو اپنے ذمے نہیں لے لی؟"

"الاہرام" کا بیان کس حد تک صحیح ہے، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مئی ۱۹۷۵ء کے بعد جب سوویٹ وزیر اعظم کوسیگن لیبیا گئے، سوویٹ یونین کے بارے میں قذافی کے لہجے میں نرمی ضرور آئی ہے۔ مصری اخبار "روز الیوسف" کی ۶ر ستمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں قذافی کا

بقیہ صفحہ [illegible] پر

غزلیں

بسمل سعیدی

ہنگامۂ ہمرہاں نہیں ہے
منزل ہے تو کارواں نہیں ہے

کچھ کہنے کو مجھ سے مت کہو تم
کہنے میں مری زباں نہیں ہے

اللہ رے بند و بست قاتل
خنجر بھی تو خوں چکاں نہیں ہے

در آنے کا ہر اک کے امکاں نہیں ہے
درِ دل پہ حالاں کہ درباں نہیں ہے

کسی اور نسبت سے چاہیں گے تجھ کو
ترے حسن کے عشق شایاں نہیں ہے

پہنچتا ہے جو دستِ اہلِ کرم تک
مرے پیرہن میں وہ داماں نہیں ہے

شفا منزل، ٹونک، راجستھان

بانی

رہی نہ یارو آخر سکت ہواؤں میں
چار دیے روشن ہیں چار دشاؤں میں
کائی جمی تھی سینے میں جانے کب سے
چیخ اُٹھا وہ آکر کھلی فضاؤں میں
اپنی گم آوازیں آؤ تلاش کریں
سبز پرندوں کی سیال صداؤں میں
میں بھی کرید رہا تھا خاک کی پرتوں کو
وہ بھی جھانک رہا تھا دور خلاؤں میں
ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کے وہ آبیٹھا تھا
اُلجھ گیا برگد کی گھنی جٹاؤں میں
گھاٹ گھاٹ کوشش کی پار اُترنے کی
ہر کوئی دشمن تھی سب دریاؤں میں
وہ سرسبز زمینوں تک ہم سفر رہا
اُڑ نہ سکا پھر میرے ساتھ ہواؤں میں
پانی ذرا برسنے دے، منظر پھر دیکھ
رنگ چھپے ہیں سب اِن سیہ گھٹاؤں میں
آ، میں تیرے من میں جھانکوں اور بتاؤں
کیوں تاثیر نہیں ہے تری دعاؤں میں
سب آپس میں لڑ کر بستی چھوڑ گئے
خوش خوش جا آباد ہوئے صحراؤں میں
ایک طلب نے بانی بہت خراب کیا
آخر ہم بھی ہوئے شمار گداؤں میں

۲/۴۸، اولڈ راجندر نگر، نئی دہلی ۶۰

کرشن موہن

غزل

وشنو سب سے پہلا ہپّی تھا — عیسیٰ بھی اک ہپّی ہی تھا
سادھارن جن بھی کوئی تھا — بھارت میں ہر کوئی مُنی تھا
کوئی رشی تھا کوئی کوی تھا — کوئی ششی تھا کوئی روی تھا
کیچڑ کا نروان کنول ہے — پستی کا رازِ مستی تھا
اس نے اک دُنیا کو نوچا — ہٹلر کتنا دُنیاوی تھا
گوتم جب نکلا جنگل کو — اُس کے ساتھ چلا میں بھی تھا
راہِ تقوے کا ہر رہبر — خود ہی صیدِ کبر و منی تھا
روپ تھا یا بہروپ تھا اس کا — کون فقیر اور کون غنی تھا
جس نے سنبھالی گرتی دھرتی — کل یُگ میں بھی ایک رشی تھا
ریت اڑتی ہے من آنگن میں — چاہ کا مقصد کیا آندھی تھا
جب دولت میری ساتھی تھی — ہر کوئی میرا ساتھی تھا
انساں تو رزقِ اوّل ہی — ارمانی تھا، نقصانی تھا
کام نہ آیا جس کا موتی — میرا من ایسی سیپی تھا

ق

مجھ کو یہ سنسار نہ سمجھا — دوش اس میں بھی میرا ہی تھا
میں من کا جوگی بیراگی — تن کا بھوگی انوراگی تھا
کرشنا موہن ہر نانک کب
ناگ ارجن جیسا گیانی تھا

اسٹون ایج

شرون کمار ورما

وہ کھڑا مزدوروں کو پتھر تراشتے دیکھ رہا تھا۔

تبھی وہ مختصر سا قافلہ موڑ پر نمودار ہوا۔ ہتھکڑی لگا ایک شخص بکھرے بالوں، گندے کپڑوں اور سوجے چہرے والا —— شاید اسے بہت مار پڑی تھی۔ چار سپاہی اور کچھ تماشبین۔

ایک پتھر سے چنگاریاں اڑیں اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اسسٹنٹ انجینیر بتا رہا تھا کہ پتھر آرائش کے لیے لگائے جا رہے ہیں۔ چار دیواری بھی پتھر کی ہوگی۔ کئی منزلہ عمارت بن رہی تھی۔ تبھی ایک منحنی سا شخص قافلے سے نکل کر پتھروں کے ڈھیر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہاں کھڑے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک بار پوچھنے پر وہ کل ماجرا تفصیل سے سنانے لگا۔

ہتھکڑی لگا وہ شخص پڑھا لکھا، بال بچے دار آدمی تھا وہ عرصے سے ایک کمرہ لے کر اکیلا رہ رہا تھا۔ اس کے بیوی بچے گاؤں میں تھے۔ اس کے خلاف کبھی کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس دوپہر اس نے بارہ تیرہ سالہ ایک لڑکی سے زبردستی ——

ایک ٹرک پتھر لے آیا تھا اور اب مزدور اُسے خالی کر رہے تھے۔ پولیس اُس شخص کو دین میں بٹھا کر لے گئی تھی اور لوگ بکھر گئے تھے۔

'بڈھے کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے'

'ایسے شخص کو سنگسار کرنا چاہیے'

'پتھر باندھ کر دریا برد کر دینا چاہیے'

'جی ان پتھروں سے عمارت کا حسن نکھر آئے گا' انجینیر کہہ رہا تھا۔

وہ اس دوران دیوار سے لگا کھڑا یہ باتیں سنتا رہا تھا۔ اس نے نہ کچھ کہا نہ پوچھا' جیسے اسے ان کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ وہ ایک عجیب ذہنی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ بڈھا، اس کی حرکت اور وہ عمارت۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بڈھے اور اس عمارت میں کیا تعلق ہو سکتا تھا۔

بس آئی۔ بہت سے مسافروں کو لے کر چلی گئی۔ وہ مزدوروں کو دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ جب یہ عمارت مکمل ہو جائے گی تو یہ مزدور، جو بنجر زمینوں اور موٹے ساہوکاروں کے بھگائے ہوئے ہیں کہیں اور چلے جائیں گے، ایسی ایسی شاندار عمارتیں بنانے۔ اور اس عمارت میں کیسے کیسے خوبصورت فلیٹس بنیں گے، کیسے کیسے لوگ آئیں گے، کتنی ہلچل رہے گی۔ عشق و محبت کی کیسی کیسی دلچسپ داستانیں بنیں گی اور ریپ —— اور وہ بڈھا کھلا گریبان اور سر پر خاک لیے اس کے سامنے آ گیا۔

اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ سڑکوں پر انسانوں کا سمندر تھا۔ اسی مہانگر میں وہ پیدا ہوا تھا۔ انھیں سڑکوں پر چل کر وہ اتنا بڑا ہوا تھا —— پچاس برس ہو گئے۔ اس شہر نے بھی کتنے رنگ بدلے ہیں —— دو جنگی طیارے ان خوبصورت رنگوں پر دھوئیں کی چادر ڈالتے ہوئے تیزی سے گزر گئے۔

ایک بس اور آئی رش نکل گیا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ پچھلے چند برسوں سے اُس نے گھر والوں کے ساتھ ایک خاموش سمجھوتہ کر لیا تھا۔ چھوٹے موٹے کام اس کی بیوی کر لیا کرتی

۱۸۰/۱۱ —— کوچہ لبان —— امرتسر —— پنجاب

تھی - بازار کا کام لڑکے کے سپرد تھا - وہ خود گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا - یوں سب سکھی ہو گئے تھے - روز جھگڑا نہ لڑائی نہ تکرار - رتنا اس کی بیٹی دفتر سے آ کر کام میں ماں کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی، کھانے کے بعد اپنے کمرے میں ناول یا ٹرانسسٹر لیے بیٹھتی - سریش کی شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا - اس لیے وہ دفتر سے سیدھا گھر آتا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چڑھتا - گنگناتا یا سیٹی بجاتا رہتا اور بات بے بات ہنسنے لگتا - اُن کی ماں دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑا آرام کرتی اور سہ پہر کو پڑوس میں کیرتن پر چلی جاتی - شام کو وہ لوگ ٹیرس پر اکٹھے ہوتے، چائے پیتے، گپ کرتے اور رات کا کھانا کھاتے اور اپنے اپنے کمروں میں بند ہو جاتے - ایسے ہی موقع پر ایک شام چائے پر رتنا نے ہنس کر کہا تھا ——— "بابو جی یہ سب کتنا عجیب لگتا ہے جیسے چڑیا گھر کے جانور اندھیرا ہوتے ہی اپنے اپنے ڈربوں میں گھس جاتے ہیں - اسے ہی کلچر ڈھونا کہتے ہیں ؟"

شام گہری ہونے لگی تھی - آسمان پر شوخ رنگ سُرمئی ہوتے جا رہے تھے - فضا میں شام کا مانوس شور تھا - عمارت کا کام بند ہو چکا تھا - چوکیدار اپنی عارضی ہٹ کے دروازے پر لالٹین لٹکا رہا تھا - پٹرول پمپ کے 'فوری خدمت' والے دلکش اور لمبے چوڑے بورڈ کے قریب وہ عورت اور اخبار والا لڑکا ایک ساتھ پہنچے ——— وہ روز ہی اس وقت ساتھ ساتھ وہاں پہنچ جاتے تھے، گو ان کی راہیں الگ الگ تھیں ——— عورت اور وہ لڑکا ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بس اسٹاپ تک آئے - عورت حسبِ معمول لیمپ پوسٹ کے قریب رُک گئی - اس نے ادھر دیکھا جہاں وہ کھڑا تھا - اخبار والا سیدھا اس کے پاس آ گیا - اس نے ایوننگ نیوز کا پرچہ خرید لیا - لڑکا آواز لگاتا چلا گیا -

پھر وہی قتل کی خبر تھی - ایک جوان عورت کی لاش نالے سے ملی تھی - اُسے سفاکی سے قتل کیا گیا تھا - جسم پر تیز دھار چاقو کے کئی زخم تھے - سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے - مارنے کے بعد اُسے جلانے کی کوشش کی گئی تھی - پچھلے کچھ دنوں میں قتل کا یہ تیسرا واقعہ تھا ——— جب سے شہر پھیلنا اور بڑی بڑی عمارتیں بننا شروع ہوئی ہیں، قتل، زنا بالجبر اور ایسے ہی جرائم میں اضافہ ہو گیا ہے ——— اس کے ذہن میں خیال آیا ——— اس نے عورت کی طرف دیکھا - اگر اسے کوئی قتل کر دے اور اس کی لاش لیمپ پوسٹ کے قریب ملے تو ——— وہ مسکرائی تھی - آرٹ پیپر پر چھپے رنگین، عریاں اشتہار کی طرح - اُس کی بس آ گئی سب کچھ بھول کر وہ بس میں سوار ہو گیا - وہ عورت سدا کی طرح وہیں کھڑی رہی - شہر پھیلانے دھواں اُگلتی چمنیاں اُگتی چلی گئی ہیں تو ان عورتوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے -

وہ جب گھر پہنچا، اس کی بیوی کیرتن سے لوٹ رہی تھی - وہ ساتھ ساتھ چڑھتے ہوئے اوپر آئے، لیکن آپس میں کوئی بات نہیں کی - سیڑھیاں طے کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور اس کی بیوی کچن میں - لباس تبدیل کر کے - وہ ٹیرس پر اپنی مخصوص کرسی پر جا بیٹھا - تھوڑی دیر بعد رتنا، سریش اور بہو آ گئے - چائے بھی آ گئی - رتنا نے آفس میں اپنی ترقی کے بارے میں بتایا - سب نے اُسے مبارک باد دی - سریش نے دفتری امتحان میں اول آنے کی خوشخبری سُنائی - اُسے بھی سب نے مبارک باد دی - ماں خاموشی سے سب کے لیے چائے بناتی رہی - وہ چُپ چاپ پیالیوں پر کھلے گلابوں کو دیکھتا رہا ——— اس کے ذہن میں وہ عورت، عمارت اور ٹھیکیدار کا شخص تھا - سریش نے دفتر کے لطیفے سنائے رتنا نے نئی RECEPTIONIST کی نقل اُتاری - جب اس سے فرمائش کی گئی تو وہ اس عمارت کے بارے میں بتانے لگا - اُس نے محسوس کیا ان لوگوں کو اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں تھی - ایک ایک کر کے سب چلے گئے - رہ گئی اس کی بیوی جو ریلنگ پر کھڑی دُور ہوائی اڈے کی طرف دیکھ رہی تھی ——— اس نے دیکھا ——— وہ پیچھے سے کتنی پھیلی ہوئی تھی - کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی پرانا اخبار ہے ——— وہ پلٹی - ایک جہاز رن وے پر اُترنے کے لیے نیچے آ رہا تھا -

" وچار کیا اپنے فیصلے پر ؟ " اُس نے پوچھا -

" رن وے نزدیک ہونے کے کارن کتنی پریشانی رہتی ہے " وہ بولا -

" میں کیا پوچھ رہی ہوں - "

" کیا ——— کیا پوچھ رہی ہو ——— " جہاز دُور چلا گیا تھا -

"اچھا، فیصلہ، ہاں بہت وچار کیا، فیصلہ غلط نہیں ہے۔"
"یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی تو بچے ہنستے ہیں، پھر دنیا ہنسے گی۔"
"ان باتوں کی چنتا نہیں کرنی چاہیے —"
"ایک ہی گھر میں رہ کر —" وہ چائے کے برتن لے کر چلی گئی۔
وہ ایوننگ نیوز پڑھنے لگا۔
بہو منی پلانٹ پودوں والے چھوٹے چھوٹے گملے لے آئی انھیں لٹکانے کی کوشش میں وہ تن تن جاتی تھی، جیسے کوئی تیر چلانے لگا ہو — عورت کو پیچھے سے اس سے زیادہ نہیں پھیلنا چاہیے — اُسے احساس ہوا وہ گناہ گار ہو رہا ہے۔
"بہو۔"
"جی۔"
"سریش سے کہو لٹکا دے۔"
وہ چلی گئی۔ پچھلے کمروں میں قہقہے فواروں کی طرح اُچھل رہے تھے۔ سریش آگیا اور گملے لٹکانے لگا۔ رتنا بھی چلی آئی۔ کچن سے گوشت پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے اخبار رکھ کر فضا میں سونگھا۔
"رتنا گوشت پک رہا ہے کیا؟"
"جی۔" رتنا نے قدرے بڑا گملا درمیان میں لٹکانے کی رائے دے کر کہا۔ "بابو جی ہم تو ابھی بوڑھے نہیں ہوئے۔"
"ہاں بابو جی۔" سریش نے کہا۔ "آپ مت کھائیے، لیکن گھر میں پابندی تو ٹھیک نہیں — پہلے بھی تو پکا کرتا تھا، آپ بھی تو کھاتے تھے۔"
جہاز بہت نیچے آگیا تھا۔ وہ اُدھر ہی دیکھنے لگا۔
کھانا کھا کر جب وہ اوپر جانے لگا تو کوشش کے باوجود بہو ہنسی ضبط نہیں کر سکی۔ اُس کی بیوی نے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک پل کے لیے وہ زینہ پہ ڈکا، پھر دھیرے دھیرے اوپر چلا گیا۔ اُس جرنیل کی طرح جسے فتح و شکست سے کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔
یہ بیوی سے الگ اوپر سونے کا فیصلہ اُس نے جذبات کی رَو میں اچانک ہی نہیں کر لیا تھا۔ کئی دن تک وہ اس پر غور کرتا رہا۔ مہینوں وہ اس ذہنی کشمکش میں رہا تھا — بہت پہلے جب اس کی بیوی ایکسماتک کام سے فارغ ہو کر آئی تو وہ جاگ رہا تھا۔ بہو کے کمرے سے آنے والی آوازیں سونے نہیں دے رہی تھیں۔ رتنا کے کمرے میں ٹرانسسٹر پر پُرانے فلمی گیت گونج رہے تھے۔ جب سے سریش کی شادی ہوئی تھی، اُس کے کمرے میں جیسے زلزلہ آیا رہتا تھا۔ جب تند و تیز ہوا میں سمندروں پر چلتی ہیں تو کنارے دور تک بھیگتے ہیں۔ بہو کو بات بات پر جینے ہنسنے کی عادت ہو گئی تھی اور وہ سریش کو سنبھالنے میں جیسے تن من سے جٹ گئی تھی — اس کی بیوی نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا اور اس بات پر ساس بہو میں اکثر تکرار ہو جایا کرتی تھی۔ ان ساس بہو میں بھی کبھی کبھی ٹھن جاتی ہے۔ یہ سب عورت کو بھلا کون سکھاتا ہے۔ اور اب اس کی بیوی نہ سیہر و تفریح کی دلدادہ رہی ہے۔ نہ اسے سنبھالنے کی چنتا کرتی ہے۔ اب اسے ایک ہی چنتا ہے۔ رتنا کو کسی ایسے گھر میں دے دے جہاں جا کر وہ کسی ماں کے ہونہار بیٹے کو چپکے سے سنبھال لے۔
"سوئے نہیں —؟" اس کی بیوی نے پوچھا تھا۔
اس کے کان ایک اینٹ کی دیوار کے پیچھے بیٹے اور بہو کی سرگوشیوں پر تھے اور آنکھیں چھپکلی پر۔ وہ بھلا کیا جواب دیتا۔ انجانے میں اُس کا ہاتھ بیوی کی پیٹھ پر جا پڑا۔
"اب بس بھی کرو — بہو آگئی ہے گھر میں" —
وہ شرما گئی۔
اس نے حیرت سے بیوی کی طرف دیکھا۔ عورت اس سے آگے آدمی کی منزل نہیں جانتی۔
"آدمی بنو۔" ساتھ والے کمرے میں بہو نخرے سے کہہ رہی تھی۔ "ابھی وہ لوگ جاگ رہے ہیں، صبر نہیں کر سکتے" —
خاموشی — پھر وہی باتیں جن سے شعلے لپکتے ہیں —
"تبھی تو میں کہتی ہوں کہ الگ جگہ لے لو۔"
"مجھے بہو کی یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "ایک ہی تو لڑکا ہے ہمارا، گھر اجاڑے گی۔"
"یاد ہے تم نے بھی ایک رات یہی سب کہا تھا۔"
"اچھا ہاتھ ہٹاؤ۔"
"اوہ، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔"

"اب رہنے بھی دو - میں کیا تمھیں جانتی نہیں، یہ جو ہفتہ بھر سے منہ پھلائے بیٹھے ہو ۔۔۔" وہ مسکرا دی -

یہ عورت اُسے سمجھتی ہی نہیں - اتنے برسوں میں نہیں سمجھ پائی ۔۔۔ کمال ہے! وہ رات بھر سوچتا رہا - اگلے دن، اس سے اگلے دن - کئی دن سوچتا رہا اور آخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ الگ سویا کرے گا ۔۔۔ گھر میں سب ہنسے - بہو تو کمرے میں دیر تک ہنستی رہی تھی -

دھیرے دھیرے سیڑھیاں طے کر کے وہ چھت پر آگیا تھا - دیر تک وہ ٹہلتا رہا - ریڈیو آخری گیت سُنا کر خاموش ہو گیا تھا - آسمان پر ستاروں کے دیپ ٹمٹما رہے تھے - نیچے بہو کے کمرے کی بتی جل رہی تھی - وہ منڈیر پر جھک گیا - کیاری کے پھولوں پر کوئی سایہ اونچا نیچا پڑ رہا تھا - ایک اور سایہ اُس پر چھا گیا ۔۔۔ اُسے اپنی اس حرکت پر تعجب ہوا - یہ کیا بے ہودہ پن ہے - وہ وہاں سے ہٹ آیا -

اگلی شام بس سٹاپ پر کھڑے اس نے دیکھا - کاریگر پتھر تراش رہے تھے - وہ اپنی بس کا انتظار کر رہا تھا - رش نکل چکا تھا - وہی عورت "فوری خدمت" والے بورڈ کے قریب دکھائی دی - لڑکا بھی آگیا لیکن اُس کی بس نہیں آئی - وہ دونوں اس کے قریب آ گئے - بس نہیں آئی - دھیرے دھیرے سب مسافر کسی نہ کسی سواری سے چلے گئے - وہ اکیلا رہ گیا - وہ عورت پہلی مرتبہ اُس کی طرف دیکھ کر کھل کر مسکرائی اور اس کے قریب آگئی -

"اب ؟" اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں -

اسے اپنی بیوی اور اس عورت میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا -

"شاید کہیں بریک ڈاؤن ہو گیا ہے -" وہ بولی -

"شاید -"

"میرا گھر پاس ہی ہے، چلوگے - ؟"

عمارت کے چوکیدار نے زرد روشنی والی لالٹین لٹکا دی تھی - وہ عورت پورے بدن سے ہنسی تھی -

"وہاں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی -"

اس نے عورت کی بات کا جواب نہیں دیا - لپک کر ایک خالی اسکوٹر میں سوار ہو گیا - عورت زور سے ہنسی تھی اور سڑک پار کر کے دوسرے فٹ پاتھ پر چلی گئی تھی -

گھر میں سب نے اس کے دیر سے آنے کا سبب پوچھا - وہ خاموش رہا - اس کی بیوی نے دریافت کیا تو وہ بولا -

"بریک ڈاؤن -"

چائے کے بعد سب اُٹھ گئے تو اس نے آسمان کی طرف دیکھا ۔۔۔ جہاز تو کب کا اتر چکا تھا - آسمان خالی تھا - وہی لیٹ ہوا تھا - اُس نے ریلنگ پر جھک اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا -

"میرا بستر اپنے کمرے میں لے آؤ ۔۔۔"

وہ مسکرا دی -

●●

آنند لہر

سڑک

اس سڑک پہ دن رات آدمی، گھوڑے، بسیں چلتی رہتی ہیں لیکن یہ سڑک کبھی نہیں چلتی یہ آگے بڑھتی ہے۔ زندگی کی سڑک کی طرح جو ختم ہو جاتی ہے لیکن واپس نہیں آتی اور اس پر چلنے والا وقت ہماری تقسیم اوقات اور طرح طرح کے نام دینے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ سڑک کو معلوم نہیں کہ یہ کہاں سے آئی ہے لیکن لوگ یہ بتاتے ہیں کہ سامنے والے جنگل کو انھوں نے اسی سڑک کے ذریعہ چھوڑا تھا اور بعد میں وہ اسی سڑک کے کنارے بس گئے مکانوں میں جن کی دیواروں نے انسان کو سڑک سے الگ کر دیا لیکن ان کی کھڑکیوں ان کے دروازوں نے ایک تعلق بنائے رکھا۔ کبھی کبھی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اونچی منزلوں والے یہ مکان آسمان کو چھونے لگے ہیں حالانکہ وہ سب یہ جانتے ہیں کہ آسمان نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ ہر آدمی کا اپنا آسمان ہے جس کی نظر جہاں پہنچی وہیں اس کا آسمان۔ آسمان زمین پر رہنے کا ایک سہارا ہے زندہ رہنے کے لیے ایک وجہ ہے اور مرنے کے لیے ایک حوصلہ ہے۔ آسمان ایک ایسا خیال ہے جو ہر ستارے کو یہ بتاتا ہے کہ وہ اس خلا میں اکیلا نہیں ہے۔

یہ بھی سنا ہے کہ جنگل میں سب کا نام انسان تھا یا یوں کہیں کہ جنگل میں کسی کا کوئی نام نہیں تھا۔ سانپ، گیدڑ، شیر، چیتا اور انسان۔ لیکن یہاں ہندو ہیں، مسلمان ہیں، سکھ ہیں، عیسائی ہیں۔ دھرم، مذہب اور ذاتیں ہیں، رشتے ناطے اور تعلقات ہیں۔ ایک کی بہن دوسرے کی بیوی ہے۔ ایک کی چچی دوسرے کی ساس ہے۔ ایک کا دوست دوسرے کا دشمن ہے۔ گویا ہر کوئی دوسرے کا کچھ ہے۔ یہ سب ان ناموں میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ اب اپنے لیے نہیں بلکہ ان ناموں کے لیے جیتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ نام لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور لفظوں کی حقیقت عارضی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ کاغذ پر ایک دھبہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اپنا مطلب کھو دیتا ہے۔

اسی سڑک کے کنارے سامنے والے مکان میں ایک آدمی رہتا ہے۔ جس کا نام محمد علی ہے وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ کسی کو بھائی بنانا چاہتا ہے۔ کتنی ظالم ہے یہ سڑک جو آج تک اسے ایک بھائی نہ دے سکی اور اسی سڑک کے کنارے رام لعل اپنے اکلوتے بھائی کو اس لیے مارنا چاہتا ہے کہ وہ کل جائیداد میں اس سے حصہ مانگے گا۔ ان دونوں باتوں کا ظالم سڑک پر کوئی اثر نہیں۔

اس سڑک کے سامنے پہاڑی پر محمد جو کا گھر ہے۔ جس کے لڑکے کے پیٹ میں درد ہے اور اس کے پڑوسی دین محمد کے لڑکے کے گردے میں درد ہے اور سائیں پھکڑ جادو ٹونے کے لیے مشہور ہے۔ محمد جو نے سائیں پھکڑ کو دو ہزار روپیہ اس لیے دیا کہ وہ اس کے لڑکے کے پیٹ کے درد کو کسی اور کو دے دے۔ اور دین محمد نے سائیں پھکڑ کو زمین کا ٹکڑا دے کر خوش کیا کہ وہ اس کے لڑکے کے گردے کے درد کو ٹونے کے ذریعہ کسی اور کے گردے میں پہنچا دے۔ ہوا یوں کہ محمد جو کے لڑکے کا پیٹ کا درد دین محمد کے لڑکے کے پیٹ میں چلا گیا اور اس کے لڑکے کا گردے کا درد اس کے لڑکے کو مل گیا۔ درد بدل گئے تکلیفیں وہیں رہیں۔ دراصل ہم درد بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنا درد دوسروں کو دینا چاہتے ہیں۔ اسے ختم نہیں کرنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں غریب رہے صرف میں غریب نہ رہوں۔ بھوک رہے صرف میں بھوکا نہ رہوں۔ اس زمین سے بھوک پیاس، درد ختم کیسے ہوں۔ جب کہ ہم انھیں ختم کرنا چاہتے ہی نہیں۔

وہ دیکھا ایک آدمی جدھر گاڑی مڑتی ہے اُدھر ہی مڑ جاتا

پلاٹ نمبر ۱۹ ــــ بخشی نگر ــــ جموں

ہے۔ پولیس والا اُسے ایک مہینہ تھپڑ مارتا رہا۔ ایک مہینہ مار کھانے کے بعد اسے معلوم ہوا جب گاڑی آئے کھڑے ہو جاؤ ڈرائیور خود بخود راستہ بنا لے گا۔ پولیس والا اگر مارنے کے بجائے اُسے سمجھا دیتا تو وہ ایک مہینہ مار نہ کھاتا اور یہ نہ سوچتا کہ ایسی حالت سے بچنے کا طریقہ کیا ہے بلکہ اس سے آگے سوچتا۔

سامنے والے مکان میں ایک ڈاکٹر کینسر کا علاج ڈھونڈ رہا تھا کہ آدھا علاج ڈھونڈنے کے بعد مر گیا۔ اب دوسرے آدمی نے ڈھونڈنا شروع کیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ آدھا علاج ڈھونڈنے کے بعد یہ بھی مر جائے گا۔ لیکن پہلا آدمی جہاں تک اُس نے ڈھونڈا تھا دوسرے کو بتا دیتا تو کینسر کا علاج مل جاتا کیونکہ دوسرا وہیں سے شروع کرتا۔ لیکن سڑک کے کنارے رہنے والے لوگ دوسروں کو اپنے تجربات کا فائدہ کم ہی اُٹھانے دیتے ہیں گو جنگل میں ایسا نہیں تھا۔

میں اس وقت سڑک کے درمیان میں ہوں۔ مجھے چلنا ہے صرف چلنا ہے۔ آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ ہزاروں سال گزر گئے مجھے چلتے ہوئے۔ میں نے کئی دریاؤں کو تیر کر پار کیا۔ پہاڑوں کو پھاندا۔ تپتے صحراؤں کی گرمی اپنے پر سہی۔ ریت میرے کانوں اور ناک میں چلی گئی۔ مٹی میرے جسم سے لپٹ گئی۔ میں صرف آگے چلتا جا رہا ہوں۔ میں کروڑوں میل چلا۔ لیکن میں گھرا رہا۔ مشرق، مغرب، شمال جنوب میں میں ہمیشہ اُن کے بیچ میں رہا۔ آخر میں وہیں پہنچ گیا جہاں سے میں چلا تھا۔

اب میں مغرب کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ وہی سفر، وہی پہاڑ وہی سمندر، وہی دن رات، سال، صدی صحرا، کچھ وہی۔ غم بھی وہی۔ خوشی بھی وہی۔ صرف دل کو ایک تسکین ہے کہ میں نے راستہ بدل لیا۔ پھر میں وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔

اب میں شمال کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اب میں جنوب کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ پھر وہی "آگے" "پیچھے" "دائیں" "بائیں" انہی سمتوں میں گھرا رہا۔ میرا وجود آزاد نہ ہو سکا۔ میری رفتار مجھ سے آگے بڑھ گئی میری سوچ مجھ سے آگے نکل گئی۔ اور میں وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔

میں مشرق ہوں میں مغرب ہوں

میں شمال ہوں میں جنوب ہوں

سب لوگ میرے گرد گھومتے ہیں۔ سب مجھ میں ہیں میں سب میں ہوں۔ سب گھومتے ہیں۔ زمین، سورج، چاند، ستارے سب گھومتے ہیں اپنے محور کے گرد کیونکہ یہ اپنے خدا ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے گرد گھومتے ہیں۔ کائنات کو مجموعی شکل دینے کے لیے۔ ستاروں اور خلا کے درمیان تعلق پیدا کرنے کے لیے۔ زمین کا سورج سے اور چاند کا زمین سے رشتہ صرف گھومنے کا ہے اور اسی تعلق سے یہ ساری کائنات زندہ ہے۔

اپنی زندگی کے لیے اپنے محور کے گرد گھومنا ضروری ہے۔ اور کائنات کی زندگی کے لیے ایک دوسرے کے گرد گھومنا ضروری ہے۔ یہی زندگی کا فلسفہ ہے۔

لیکن یہ سڑک تہذیب کی نشانی ہے۔ چلیے چلو اس پر لیکن یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دراصل یہ سڑک ایک وسیع جنگل کے دو بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو آپس میں ملاتی ہے۔

●●

غزلیں

عروج زیدی

غمِ جہاں تو مقدر ہے آدمی کے لیے
نشاطِ دل بھی ہے لیکن کسی کسی کے لیے

گراں نہ ہو یہ کہیں دوستوں کی فطرت پر
خلوص ڈھونڈ رہا ہوں میں دوستی کے لیے

جہاں خلوص و محبت سے ہو پذیرائی
وہی مقام تو جنت ہے آدمی کے لیے

ہر اک چراغ تلے ظلمتوں کے ڈیرے ہیں
چراغ ہم نے جلائے تھے روشنی کے لیے

بہ فیضِ جذبِ محبت وہ دن بھی دور نہیں
تم اپنا ہاتھ بڑھاؤ گے دوستی کے لیے

مری تلاش و طلب کو خراج پیش کرو
تم انتخاب میں آئے ہو دشمنی کے لیے

میں اپنے حالِ پریشاں پہ مطمئن ہوں عروج
کسی کے ہونٹوں پہ مچلی ہوئی ہنسی کے لیے

کرشن مراری

آس نراس کے بیچ نرنتر پل پل تیری راہ تکے
اندھیارے میں چنچل نینوں کا البیلا دیپ جلے

ساون بھادوں رت من بھاون کیسا جادو ڈال گئی
شیتل کومل پروائی سے میرے من میں آگ لگے

دور گگن میں اڑنے والے پہنچے چاند ستاروں تک
لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں دھرتی پر انسان ملے

لہرائے ہے شوخ پون سنگ سوچ البیلی مچل مچل
ساگر ساگر کو گاگر میں بھرنے کا پرایاس کرے

ہارے ہارے ہم پگ پگ پر کیا موسم کی بات کریں
گرمی سردی بارش طوفاں سب یکساں آکاش تلے

انگ انگ مچلے البیلا نا چے من میں چنچلتا
ڈھونڈیں دشی کرن منتر کو ہم جگ میں سنیاس لیے

غزلیں

کیف احمد صدیقی

کس کی مُٹھی ہے میری مُٹھی میں
ساری بستی ہے میری مُٹھی میں

یہ زمیں ہی نہیں ہے زیر قدم
آسماں بھی ہے میری مُٹھی میں

دن نکلتا ہے میرے ہاتھوں سے
رات ڈھلتی ہے میری مُٹھی میں

دیکھ دُنیا کی ساری تاریکی
جگمگاتی ہے میری مُٹھی میں

جو کسی سیپ میں نہیں ملتا
اب وہ موتی ہے میری مُٹھی میں

اب مجھے قید کرنے والا بھی
مثلِ قیدی ہے میری مُٹھی میں

کیفؔ مدت سے اک عروسِ غزل
گنگناتی ہے میری مُٹھی میں

جو کھنچی گئی تھی مری انگلیوں سے
وہ صورت بھی بگڑی مری انگلیوں سے

بہ گنگا مرے ہاتھ میں منجمد تھی
یہ جمنا بھی نکلی مری انگلیوں سے

پگھلتا ہے سونا ترے ناخنوں سے
ٹپکتی ہے چاندی مری انگلیوں سے

مرے جسم میں قید تھی جو سیاہی
کرن بن کے پھوٹی مری انگلیوں سے

جواب تک کسی فلسفی سے نہ سُلجھی
مری ڈور اُلجھی مری انگلیوں سے

وہ کیوں جم گئی کیفؔ نوکِ قلم پہ
رواں تھی جو سُرخی مری انگلیوں سے

شیخ سرائے، سیتا پور، یوپی

حکیم منظور

خود آپ اپنے واسطے آزار بن گیا
میں بکھری خوشبوؤں کا طلبگار بن گیا

خاموشیوں کے زردِ تکلم کے ڈر سے وہ
اک ان سُنی صدا کا طرف دار بن گیا

موجِ شفق لہو کی طرح کیوں رواں نہ ہو
سورج تمام دیدۂ خوں بار بن گیا

بازار میں وہ گرمیِ بازار کیا ہوئی
بکنا کسے تھا؟ کون خریدار بن گیا

دِل میں اُتر رہا ہے کھُلی آنکھ کا فسوں
خوابیدہ نقش منظرِ بیدار بن گیا

موجِ ہوا کا رقص میں دیکھوں گا کس طرح
آئینہ میری آنکھ کی دیوار بن گیا

نقطے میں بند تھا، تو مری فہم میں نہ تھا
کھُلنے لگا تو اور بڑا اسرار بن گیا

منظورؔ بے جہت کا سفر بھی عذاب ہے
ہر نقشِ راہ باعثِ آزار بن گیا

۱۷۶ برک کالج، اونچا سمندر خاں، جموں

نظمیں

شمس فریدی

ایک نظم

میں کہ　آوارہ و گمنام پرندے کی طرح
اُڑ کے چلا آیا ہوں
کوئی ہمدم ہے نہ مونس ہے یہاں اب میرا
کوئی آواز تو پہچانی ہوئی کاش سنائی دیتی
اجنبی بھیڑ سے گھبرا کے میں بھاگ آتا ہوں
ایک پتھر ہے سمندر کے کنارے تنہا
اب یہی دوست بنا ہے میرا
روز میں شام کو آ کر اُس سے ـــ ایک دو بات
بھی کر لیتا ہوں

آج تو اور بھی حیران ہوں میں
آج یہ پوچھ رہا ہے مجھ سے،
"اس طرح بھاگ کے آتے ہو کہاں سے بولو؟
ڈھونڈتے پھرتے ہو تم روز یہاں پر کس کو
کچھ کہو　اپنی زباں تو کھولو
کیوں پریشان سے لگتے ہو مجھے؟
میں تو پتھر ہوں مگر،
دیکھتا ہوں میں تمہیں جب بھی، پگھل جاتا ہوں

انوار رضوی

وجدان

کالی رحمت سے نور بہا
اجلی راتوں میں پھول کھلے
بستی بستی سونا بکھرے
اور بند دریچوں کی دلائیں سر دھنتی ہیں
چہروں میں شفق تھی پھوٹ پڑی
لمحات کے سینے گرم ہوئے
دہلیز پہ کرنیں ناچ اٹھیں
در و بام مسرت سے چیخے

گونگے نے ہرے کو سبز کہا

محمد امین

آبرو

جنبشِ لب ذرا سلیقے سے
سارا احوال آج کہنا ہے
ہاں مگر اتنی بات یاد رہے
سامعہ آجکل خموشی ہے
حافظہ آجکل معصیت ہے
باصرہ آجکل اندھیرا ہے
ذائقہ آجکل ندارد ہے
عشق کی آبرو نہ لٹ جائے
جنبشِ لب ذرا سلیقے سے
سارا احوال آج کہنا ہے

پوسٹ آفس بکس ۱۰۰۳۱ مسکت، عمان ● ترقی اردو بورڈ ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم نئی دہلی ● میکڈونل ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نظمیں

تنہا تماپوری

سناٹوں کی سرگوشیاں

دعاؤں کا موسم کہاں چھوڑ کر
آ گئے ہو
یہاں :
شعبدے ذات کی شرپسندی میں لرزش کو آہٹ بتا کر
اُجالوں کی حاجت میں گندی صداؤں کو
بے عود و عنبر جلانے چلے ہیں
نقائص کا انبار نا ماض ہے
معترض خاک میں ڈھونڈتے ہیں نشاں !
دھیان کی سیڑھیوں پر
کسیلے لوازم کو اخبار دے کر
لہو چاند کا بوتلوں میں چھپائے
سلگتی ہوئی نفرتیں چاٹ کر
آج —— سب سو گئے ہیں !!

دعاؤں کا موسم
کہاں چھوڑ کر آ گئے ہو یہاں !!

سمجھوتہ

درِ گل پہ سورج کی دستک سے پہلے
سجالوں گا اپنی جبیں پر
گئی رات کی خنکیاں
ساعتوں کے مقدر میں ہے تشنگی
کیسے انعامِ شبنم کی جرأت کروں
شرمساری سے لوٹوں، یہ ممکن نہیں
ہو سکے تو ابھی
یادِ رفتہ کی سوگند کو بھول کر
تتلیوں کے سبھی رنگ چھونے چلوں
یوں
نئے دن کے ہمراہ جینے چلوں

رنگم پیٹ —— ضلع گلبرگہ —— کرناٹک

رشتے

راج شرما ایم اے

وہ آہستہ سے دری پر آکر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی چھڑی اپنے پاس ٹکالی۔ پھر بیٹھتے بیٹھتے کندھے سے تھیلہ اتار کر اپنی بغل میں ہی رکھ لیا۔ تھوڑا سا آگے سرکتا ہوا میری ماتا جی سے کہنے لگا۔ "کیا کہوں، رادھا کی ماں، بہت بُرا ہوا ہے"

سبھی اُس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ نئی پود اُس سے شناسا نہیں تھی۔ وہ لانبے قد کا مگر بڑھاپے کے بوجھ سے کچھ دبا دبا سا تھا۔ سر پر سفید پگڑی، کانوں میں پیتل کی چھوٹی چھوٹی بالیوں جیسے حلقے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں جن کے سارے بال سفید تھے۔ کندھوں پر ایک کپڑا جس کا ایک سرا اُس نے آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ افسوس کرنے آیا تھا نا! اِسی لیے۔ نئی پود کی تو بات ہی نہیں، وہاں بیٹھے بہت سے لوگ اُسے نہیں جانتے تھے۔ مگر میں جانتا ہوں۔ وہ باتیں کر رہا تھا۔ اور میں اُس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ ہمارے نانا جی کا چچیرا بھائی ہے۔ سُنی سُنائی بات ہے (کیونکہ میں تو معرضِ وجود میں بھی نہیں آیا تھا) اُس کے والدین چھوٹی عمر میں ہی زندگی کے تلخ و شیریں، گرم و سرد حادثات کی تاب نہ لاکر بھگوان کو پیارے ہو گئے تھے۔ اُس کی پرورش میرے پڑنانا جی نے کی تھی۔ میرے ننھیال میں سبھی اُس کو چاچا کہتے تھے۔ ایک طرح سے وہ گاؤں میں جگت چاچا ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے نانا جی عمر میں اس سے کہیں بڑے تھے۔ جب میرے نانا جی نے رحلت کی تو وہ ۵۰-۴۰ برس کا رہا ہوگا۔ وہ گھر گرہستی سے یوں ڈرتا تھا جیسے دیہات کے لوگ کسی سر پھرے بھینسے سے ڈرتے ہیں۔ وہ گاؤں کے پنڈت خاندان سے تھا اور ایک ننھی سی دُکان کے سامنے بیٹھا یا تو کوئی جڑی بوٹی کوٹتا رہتا یا لوگوں کو شبھ مہورت بتاتا رہتا۔ اپنی کم سنی میں جب کبھی میں ننھیال جاتا تو اس کی دُکان میں چھوٹے چھوٹے مٹی کے برتنوں سے گُڑ، مونگ پھلی اور بتاشے نکال نکال کر کھایا کرتا تھا۔ وہ مجھے اور میرے ہم عمر دوسرے بچوں (پھوپھی زاد یا ماموں زاد بچوں) کو اپنی دُکان سے کچھ بھی لے لینے سے کبھی روکتا نہیں تھا۔

وہ باتیں کر رہا ہے۔ میں بظاہر سُن رہا ہوں مگر اس کے بارے میں اپنے دماغ میں آ اُٹھنے والے خیالات کے تانے بانے سے چھٹکارا نہیں پا رہا ہوں۔

میرے نانا جی نے بضد ہو کر اُس کی شادی کر دی تھی۔ لڑکی جو جگت چاچی بن کر آئی عمر میں چاچا سے کہیں چھوٹی تھی۔ یہ بٹوارے سے کوئی چھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ پھر جب کبھی میں ننھیال گیا تو اُن کے ایک لڑکی تولد ہو چکی تھی۔ وہ اُسے گود میں اٹھائے، دُکان پر بیٹھا رہتا جب کوئی گاہک آتا تو اُسے سودا سلف دے دیتا ورنہ بچی کے ساتھ کھیلتا رہتا یا اُسے کھلاتا رہتا۔ تب تک میں بی اے پاس کر چکا تھا۔ سوچا کرتا تھا کہ عمر کے اس فرق کے باوجود اُن کی ازدواجی زندگی شاید خوشیوں کی حامل ہوگی۔

پھر پاکستان بن گیا۔ گاؤں کے سارے ہندو اور سکھ ہندوستان چلے آئے میرے ننھیال کا سارا کنبہ جس میں چاچا بھی شامل تھا پہلے امرتسر اور پھر لدھیانہ آ گئے۔ کہتے ہیں کہ

مکان نمبر ۱۱۹ - سیکٹر ۱۹ بی - چنڈی گڑھ - (یو۔ ٹی)

وہاں چاچا کا کوئی سسرالی رشتہ دار اُسے مل گیا تھا اُس نے ایک مسلمان کے خالی مکان پر قبضہ کر کے چاچا کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میرے ناناجی اور ماموں پہلے پٹیالہ اور پھر کانپور چلے گئے۔ انھوں نے چاچا کو بہت کہا مگر بے چارہ نئی چاچی اور اُس کے میکے والے رشتہ داروں کے سامنے ایک نہ چلی اور وہ لدھیانہ ہی رہ گیا۔

کچھ عرصہ بعد ایکبار میرے ناناجی جب پنجاب آئے تو وہ لدھیانہ بھی ہو کر آئے تھے۔ انھوں نے یہاں پہنچ کر میرے والد کو بتایا تھا۔

"بھئی رام چند کے ساتھ تو بہت بُرا ہوا"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"اُس کی بیوی کملا اُس کو چھوڑ گئی ہے۔"

"کہاں گئی ہے۔"

"کسی اور کے گھر جا بسی ہے۔"

"ہیں" میری ماتاجی نے بات سُنی تو حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے جیسے کچھ جاننا چاہا تھا۔

"اُس کی بیٹی؟" میرے والد نے استفسار کیا تھا۔

"اُسے بھی ساتھ ہی لے گئی ہے!"

"چاچا؟"

"وہ وہیں ہے۔ میں نے بڑا کہا کہ تجھے کوئی حیل حجت کرنی تھی، پولیس کو بتایا ہوتا۔ مگر وہ مٹی کا مادھو کہتا ہے جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ روٹی کا تو کوئی وسیلہ ہے نہیں اُس کے پاس، اُس نے پنڈتائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ ہاتھ دیکھنے لگا تھا مگر بھئی اپنے گاؤں میں شرم تھی، اب کس کو اچھے بُرے کی پروا ہے۔ اُس کملا کی بچی کو دیکھو کیا کرتوت کر دکھائی ہے۔ ہم نے تو کہا تھا۔ ہمارے ساتھ رہو مگر ہونی کہاں ٹلتی ہے۔"

"مگر کہاں گئی ہے بھاگ کر؟" میری ماتاجی کی آواز تھی۔

"دو گلیاں چھوڑ کر، چھاؤنی محلہ میں ہی"

"کون ہے؟"

"ایک دکاندار، اُس سے سودا سلف لینے جاتی تھی۔ اُس کا بھی اُن کے گھر آنا جانا تھا۔ پاکستان میں اپنے ہی ضلع کا رہنے والا تھا۔ کہتے ہیں ناکہ راجہ، عورت اور بیل اسی طرف جھکتے ہیں جو سب سے نزدیک ہو، یہی ہوا۔"

"ہے کون؟"

"براہمن ہی ہے۔"

"چلو تو پھر" جیسے میری ماتاجی کو یک گونہ تسکین مل گئی ہو۔

"مگر بیٹا، بہت بےشرم نکلا ہے رام چند، اس کے گھر آتا جاتا ہے۔ وہ اس کے کپڑے لتّے بھی دھو دیتی ہے۔ کبھی کبھی کھانا بھی کھلا دیتی ہے۔"

"جس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ کچھ نہیں کہتا؟" اِس سوال میں حیرانی کی آمیزش تھی۔

"کیا کہنا ہے۔ اگر رام چند میں کوئی مردوں والی بات ہوتی تو وہ جاتی ہی کیوں اُسے چھوڑ کر۔"

میں نے وہیں، اُس کمرے میں سوتے ہوئے کا بہانہ کرتے ہوئے، ساری باتیں سُن لی تھیں۔

اور آج ایک عرصۂ دراز کے بعد رام چند ہمارے گھر میرے والد کی وفات پر ماتم پرسی کے لیے آیا تھا۔

وہ بتا رہا تھا "بس سٹینڈ پر اُترا، پوچھا، بھئی نیک بخت کیا لوگے خالصہ کالج کا۔ جواب ملا۔ ڈھائی روپیہ۔ میں نے کہا۔ اچھا تو پھر راستہ ہی بتا دو، کتنا بدل گیا ہے تمہارا شہر، رادھا کی ماں۔ اب بس سٹینڈ [illegible] کہیں کا کہیں چلا گیا ہے۔"

ماتاجی سر ہلا رہی تھیں جیسے اس کی باتیں اُنہیں اچھی لگ رہی ہوں وہ کرپا کرم کا ہی دن تھا میں نے دیکھا تھا کہ تھوڑی پڑھنے اور بیٹھنے کے بعد، عورتیں آپس میں مذاق کر رہی تھیں۔

"اب تیرے کتنے بچے ہیں ری!"

"اری تو بچ، تجھے ہی جاؤ گی آگے؟"

"یہ بے ڈھول سا لوتھڑا کس کا ہے؟"

ایک عرصے کے بعد ماموں زاد، چچا زاد اور پھوپھی زاد لڑکیاں اکٹھی ہوئی تھیں۔ خوشی کے موقعہ پر آنا نہ بن پڑے تو کوئی بات نہیں مگر ماتم پر نہ پہنچو۔ تو سمجھو کہ جینے مرنے سے بھی گئے۔ تب کاہے کی رشتہ داری۔

"تب ہم نے ایک دو جگہ پانی پیا۔ ایک دو جگہ سستائے اور پہنچ گئے۔ بھئی پنڈت دوارکا داس سے تو ہمارا خاص پریم تھا نا۔ بھلا کیسے رہ جاتے۔"

"اچھا کیا چاچا، اور ہاں کانپور سے کرم داس کا بیٹا موہن بھی آیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ واپسی پر لدھیانہ تمہیں ملنے جائے گا۔"

"اچھا؟ کہاں ہے؟"

"کہیں باہر گیا ہے۔"

"اور کوئی نہیں آیا وہاں سے"

"نہیں، کس نے آنا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے چاچا، آہستہ آہستہ سب چل بسے ہیں۔ کرم داس نے لڑکے کو بھیج دیا۔ مہربانی اس کی۔ اگر بڑے زندہ ہوتے۔۔۔۔" یہ کہتے کہتے میری ماتا جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"چلو، کوئی بات نہیں بیٹی۔ سارے بیٹھے تھوڑے ہی رہتے ہیں دیکھو نا! پنڈت دوارکا داس جی کی کوئی عمر تھی ابھی۔۔۔۔۔"

میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے چاچا سے پوچھا "چاچا، کوئی چورن ہے؟"

"ہاں۔ ہاں، بڑے معرکے کا۔ پتھر ہضم۔ لو میں تمہیں دیتا ہوں" اور پھر اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال اور میری ہتھیلی پر تھوڑا سا چورن ڈال دیا۔ مجھے چورن کھاتا دیکھ کر کچھ بچے بھی وہاں آگئے۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟" چاچا نے پوچھا۔

"موہنی کا"

"یہ؟"

تب میری بہن نے سب بچوں کا جو وہاں آگئے تھے۔ تعارف کروا دیا۔

"چلو۔ چاچا، کچھ کھا پی لو" میرے چھوٹے بھائی نے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور چاچا کچھ انکار کرنے کے بعد (رواج تھوڑا ہی توڑنا ہوتا ہے) اٹھ کر بیٹھک پر چلا گیا

کچھ دیر بعد، جب میں بیٹھک میں گیا تو میں نے دیکھا کہ چاچا کے اردگرد بچوں کا جمگھٹا سا تھا۔ سبھی اپنے اپنے ہاتھ دکھانے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

"میرا ہاتھ پنڈت جی"

"پہلے میرا"

اور چاچا سبھی کو تقریباً ایک سی باتیں بتا رہا تھا۔

"تیری عمر بہت لمبی ہے"

"تو بی۔ اے پاس کرے گا"

"تو، تو بھئی شاباش، پردیس سمندر پار جائے گا"

بچے خوش تھے۔

میں نے پوچھا "چاچا جی۔ شروع کر دیا اپنا کاروبار"

"اوہ، نہیں بھلے مانس، یہ تو صرف وقت کاٹنے کے لیے ہی۔۔۔۔"

"نہیں۔ ہمارا بھی ہاتھ دیکھیے" میری بیاہی چھوٹی بہن باہر سے آکر اپنا ہاتھ آگے بڑھا رہی تھی۔ پھر اور بھی عورتیں۔۔۔۔۔۔ سب کو اپنے اپنے مستقبل کی فکر تھی۔

"آپ بھی اپنا ہاتھ دکھا دیجیے گا"

میرے چھوٹے بھائی کی بیوی اپنے خاوند سے کہہ رہی تھی۔ وہ کچھ اور ہی طرح کا نوجوان ہے۔ نسائی کھا پچا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

"چاچا، کیا آپ واقعی ہاتھ دیکھ کر آنے والے کل کا حال بتا دیتے ہیں"

چاچا نے اس کی طرف عجیب سی مسکراہٹ بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگا "بیٹے، ہزاروں گنی، لاکھوں گیانی، کروڑوں سیانے، مگر خدا کی باتیں خدا ہی جانے"

"پھر بھی"

"ہاں، کچھ جانتا تو ہوں۔"

"مگر اخباروں میں جو "آج کا دن" کالم چھپتے ہیں اُن میں ہر اخبار میں کچھ علیحدہ علیحدہ ہی لکھا ہوا ملتا ہے۔"

"بھئی اصل بات تو یہ ہے کہ مستقبل کو مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ..... اَد بڑے سیانے۔ ہمارے بھی تو پیٹ لگا ہے۔ روٹی تو کما کر کھانی ہی ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ ہنس پڑا۔

"میرا ہاتھ تو دیکھیے، یہ تو جگہ بے جگہ اپنی فلاسفی بگھارتے پھرتے ہیں۔" میرے چھوٹے بھائی کی بیوی کہہ رہی تھی۔

میں بیٹھک سے باہر آ گیا مگر سوچ میں ڈوبا ہوا جب آدمی کوئی بات سمجھ نہیں سکتا، تب وہ تخیل کی وادی میں بھٹک کر کچھ پل کے لیے سکون کا متلاشی ہوتا ہے۔ اگر چاچا کو ہاتھ دیکھنا آتا ہوتا تب وہ اپنا ہاتھ نہ دیکھ لیتا بھلا۔

مجھے دیکھ کر میری ماتا جی نے آواز دی "رام چند کہاں ہے؟"

میرے بتانے پر ماتا جی بیٹھک کی طرف چل دیں اور ہم شام کو کریاکرم سے وابستہ بندوبست کرنے میں مصروف ہو گئے۔

زیادہ تر مہمان تو چلے گئے تھے مگر کنبہ کے افراد، کانپور سے آیا موہن لال اور چاچا ابھی یہیں تھے۔

رات کو کھانا کھا کر لیٹنے لگے تو چاچا کہنے لگا "رادھا کی ماں تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔"

"کہو چاچا۔"

"موہن لال کہہ رہا ہے کہ میں اُس کے ساتھ کانپور چلا چلوں۔"

"تم نے لدھیانہ کرنا بھی کیا ہے۔ بوڑھا جسم ہے۔ پل بھر کا بھروسہ نہیں۔ وہاں اپنے گھر کے چار افراد تو ہیں کندھا دینے کو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں سوچتا ہوں۔"

"چاچا، لدھیانہ تیرا اپنا مکان تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"کہاں؟" ماتا جی بولیں۔

"وہ جو چھاؤنی محلے میں ان کو ملا تھا۔"

"کہاں، وہ تو۔"

ماتا جی نے ابھی بات پوری نہیں کہی تھی کہ باہر سے کسی نے آواز دی اور وہ چلی گئیں۔

"تو تمہیں پتہ نہیں،" چاچا بتانے لگا۔ "وہ میری بیٹی تھی نا جو پاکستان میں پیدا ہوئی تھی۔"

"ویری"

"ہاں جس کا نام ویری رکھا تھا کہ اُس کے بعد لڑکا ہوگا تو وہ ویر والی (بھائی والی) ہو جائے گی۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔" میں نے کہا "اُسے کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ وہ جوان ہو گئی تھی۔"

"تو پھر تمہیں کیا۔ اُسے تو اُس کی ماں ساتھ ہی لے گئی تھی نا۔"

"ہاں، سُن تو سہی۔ وہ جوان ہو گئی تھی۔ کملا نے اس کے لیے کوئی لڑکا دیکھا تھا۔ میرے پاس آئی۔ بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ میں نے کہا۔ کر ڈالو۔ وہ بولی۔ دیکھو، یہ لڑکی تمہاری بھی ہے اور میری بھی۔ میں نے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اِسے چار لفظ پڑھا دیے ہیں، دوسرے بچّوں کے ساتھ وہ بھی سکول جاتی رہی ہے۔ اب اُس کی شادی کرنی ہے۔ ہمارے پاس روپے نہیں، میں نے کہا۔ میرے پاس ہیں کیا؟ وہ بولی مکان تو تمہارے نام ہو ہی چکا ہے۔ میں نے کچھ غصّے سے کہا۔ کیا معلوم اس لڑکی کو تم نے میری رہنے بھی دیا ہے یا نہیں۔ کہنے لگی قسم لے لو بھگوان کی، چاہو تو سکول جا کر پوچھ آؤ۔ پانچویں تک تو اِسی محلے کے سکول میں ہی پڑھی ہے تم کاغذوں میں بھی اُس کے باپ ہو۔ پھر میں نے سوچا کملا چلی گئی تھی۔ اچھا کیا تھا یا بُرا۔ مگر یہ بیٹی تو میری ہی ہے اور پھر کملا میرے ساتھ آٹھ برس تک رہی تھی۔ لوگ پَل دو پَل کے ساتھ کو نہیں بھولتے۔ تو بیٹا، میں نے مکان بیچ دیا۔ جو دو پیسے ملے وہ اس بیٹی کی شادی

پر خرچ کر ڈالے۔ کپڑا الٹے لے دیا تھا گہنے نما دیے تھے۔ کنیادان تو کیا تھا کملا نے اور اس کے گھر والے نے مگر شادی میں نے پڑھوائی تھی۔"

میں نے دیکھا چاچا کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ اور وہ اپنے صافے سے پونچھ رہا تھا۔

"پھر تو اب لدھیانہ میں تمہارا کیا رکھا ہے؟"

اُس کے بوڑھے چہرے پر کچھ منٹوں کے لیے سوچوں کی لکیریں اور بھی گہری ہوتی معلوم ہوئیں مجھے۔

"ہاں یہ تو ہے ہی" وہ آہستہ سے بولا۔

"اب لدھیانہ میں کہاں رہتے ہو؟"

"وہیں ایک پرانے مندر کے باہر کا ایک کمرہ لے رکھا ہے میں نے"

"کبھی کملا ملی ہے؟"

"ہاں۔ کبھی کبھی اُس کے گھر چلا جاتا ہوں"

"پھر تو...... کانپور چلے ہی جاؤ۔ تمہیں وہ کتنا مجبور کرتے ہیں"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹے۔ مگر میں سوچتا ہوں"

"کیا سوچتے ہو چاچا۔ اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے"

کچھ دیر کے لیے چاچا خاموش رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر کوئی بات اٹکی جان پڑتی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر نہ معلوم کس فکر میں تھا۔ کہتے ہیں کبھی کبھی کوئی بات زبان تک آتے آتے جذبات کے سمندر میں ڈوب بھی تو جاتی ہے۔

چاچا کہہ رہا تھا "میں سوچتا ہوں۔ لدھیانہ میں روٹی کا وسیلہ تو ہے ہی"

"وہ جو تمہیں لے کر جا رہے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ اپنا سمجھتے ہیں نا۔ وہ کسی بل بوتے پر ہی لے کر جا رہے ہیں۔ تم اُن کے اپنے ہی تو ہو"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کملا"

"کملا" میں نے کچھ پریشانی سے پوچھا۔

"میں سوچتا ہوں۔ اُس سے بھی مشورہ کر لیتا"

"کملا، تمہاری کیا لگتی ہے؟"

میری ماتا جی نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ چاچا خاموش رہا۔ کچھ دیر ہم سب خاموش رہے۔ ماتا جی کہہ رہی تھیں "پتا جی سسکتے مر گئے۔ وہ تو کشتی میں اپنے سارے کنبے کو اکٹھا دیکھنا چاہتے تھے مگر......"

میں نے چاچا کو سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھا۔ کچھ کہنا ٹھیک نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے کہہ ہی ڈالا۔

"چاچا۔ ہم بھی تیرے خیر خواہ ہیں۔ بھلا تجھے لدھیانہ میں کونسا خاص مشورہ کرنا ہے"

"اور پھر وہ اب ہماری لگتی بھی کیا ہے" ماتا جی نے کچھ تلخی سے کہا۔

چاچا آہستہ سے بولا "رادھا کی ماں۔ رشتے کیسے، وہ بھی تو میری لڑکی کی ماں ہے۔ چاہے... چاہے..."

وہ اٹک اٹک کر کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اور میری ماتا جی اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

▲▲

ایک اور دن کا قتل

مہدی ٹونکی

"کیا آج کام پر نہیں جانا؟" کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ پنڈت جی مجھے جگا کر واپس جا رہے تھے۔ جب بھی دیر تک سوتا ہوں پنڈت جی مجھے آکر جگا جاتے ہیں۔ میں آنکھیں مل کر کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں نیلے آسمان کا پیٹ پھٹ چکا ہے۔ نوزائیدہ آفتاب کے سنہری ہاتھ پاؤں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جسم بہت ٹوٹ رہا ہے۔ بیٹھے رہنے میں بھی بوجھ لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے پھر لیٹ جاؤں لیکن آفس میں دیر سے پہنچنے کا خدشہ دماغ کے اگلے حصّہ میں اُتر آتا ہے تکیے کے نیچے سے لائیٹر اور سگریٹ کی پیٹی نکال کر سگریٹ سلگاتا ہوں ایک لمبا کش لینے کے بعد اندر اپنے جسم میں، دماغ میں تناؤ کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ میری نظر سامنے کونے میں اسٹوو پر جاتی ہے —— ابھی تو چائے بنانا ہے۔ بنا چائے پیے بیٹرن نہیں جا سکتا۔ بنا چائے پیے تو چلا ہی نہیں جاتا۔ کمزوری کے لحاظ سے میں اس وقت سو برس کا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے جسم کا ایک ایک حصّہ میرے جسم سے الگ الگ گرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ کمر جیسے جھک کر کمان ہو گئی ہے۔ کندھے پیچھے کی طرف جاتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔ دونوں کندھوں کے بیچ گردن کھونٹی کی طرح سے گڑی ہوئی لگ رہی ہے۔

سگریٹ ختم کر کے اسٹوو جلاتا ہوں اور دو کپ چائے کا پانی رکھتا ہوں۔ دودھ رات کو ہی لا کر رکھ لیا کرتا ہوں۔ پانی اُبلنے تک اس پر آنکھیں گاڑے اسٹوو کی بھر بھر سنتا رہتا ہوں۔ کپ میں چائے لے کر کھڑکی کے پاس دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ نیچے سامنے نظر جاتی ہے۔ اس کرائے کے مکان کے اکلوتے نل پر ابھی بھیڑ نہیں لگی تھی۔ گووند بھنڈاری کی خوبصورت بیوی کوئی کپڑا نچوڑ رہی تھی۔ کپڑے کا ایک سرا نچوڑا ہوا دونوں گھٹنوں کے بیچ دبا ہوا تھا اور دوسرے سرے کو وہ دونوں ہاتھوں سے بل دے کر پانی نچوڑ رہی تھی۔ اس عمل میں کمر جھک جانے کی وجہ سے بلاؤز میں سے شہد کے دو خوبصورت چھوٹے چھتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بس ایک لمحہ میں، میں زنزنا گیا۔ جس طرح بٹن پر ذرا سا دباؤ پڑتے ہی پنکھا زنزنا جاتا ہے۔ ادھر نظریں گاڑتے ہی میرا دھیان کملا پر جاتا ہے سانولی سی لڑکی جو مجھے ہر وقت گھورتی رہتی ہے۔ پیاسی آنکھوں سے مسکراتی رہتی ہے۔ نچلی منزل کے بابو مکھو نندن کی یہ لڑکی کبھی کبھی تو ایک ہی دن میں کئی بار کچھ نہ کچھ مانگنے، کچھ نہ کچھ پوچھنے کے بہانے میرے کمرے میں آ جاتی ہے یا اس منزل کے دوسرے کنارے پر رہنے والی نرس کرشنا کے پاس! لیکن آتے جاتے مجھے دیکھتی ضرور ہے۔ پتہ نہیں کیوں کبھی بھی اُس کے جسم کی طرف پورا دھیان نہیں گیا اور نہ اسے دیکھ کر دل میں گرمی پیدا ہوئی۔ جب کبھی بھی وہ دن میں اکیلے میں دکھائی دیتی تو میرے دل میں نفرت سی پیدا ہو جاتی لیکن ہاں کبھی کبھی، مہینوں میں، رات کے اکیلے سُونے پن میں اس کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہوتی۔ اور ایسے میں آس پاس چل پھر کر اُسے تلاش کرتا لیکن اس وقت وہ کبھی نہ ملتی۔ تب میں اپنی سُستی اور ڈھیلے پن پر پچھتاتا لعنت ملامت بھیجتا، فیصلہ کرتا کہ کل ضرور ہی کملا سے بات کروں گا۔ پیار بھری مسکراہٹ سے دیکھوں گا۔ مجھے اس وقت اُس کا سانولا جسم بھی بہت حسین لگتا اور میں آنکھیں بند کر کے کھو جاتا۔ لیکن سویرا ہوتے ہی اس کا لبھاؤنا پن ختم ہو جاتا۔ اس کے لیے وہی بے رُخی، وہی نفرت جاگ اُٹھتی۔

مبارک منزل —— پانچ بتی —— ٹونک

نل کے پاس اب بھیڑ لگ گئی تھی۔ بھیڑ میں عورتیں بھی شامل تھیں اور مرد بھی۔ دھاری دار کپڑے کے لمبے ڈھیلے انڈر ویر پہنے یہ مرد مجھے بہت گھناؤنے معلوم ہو رہے تھے۔ لیٹرن سے آ آکر نل کے آس پاس مٹھی میں مٹی دابے کھڑے تھے۔ انڈر ویر پر آگے پیچھے پانی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ مجھے ایسی حالت والے مرد بہت بُرے لگتے ہیں۔ کرتہ یا قمیض پہن کر لیٹرن جانے میں کیا حرج ہے؟ ننگی، بھدّی بالوں دار، چکنی، کالی، پتلی پتلی موٹی ٹانگیں دکھلانا کیا ان کو اچھا لگتا ہے؟ عورتیں ان کے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی؟ اس وقت دیکھو —— کیسے ہر ایک عورت کے سینے کا، چہرے کا معائنہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی نظریں بچا کر، عورتوں کے سینوں پر، ننگے پیٹوں پر آنکھیں گڑوئے دے رہے ہیں۔ اس پر کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی ماں، بہن، بیٹیوں کی عزّت کرتے ہیں۔

انھیں بکواس کے خیالات میں کپ خالی ہو جاتا ہے۔ لیٹرن کے دروازوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ دو خالی ڈبے دکھتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے دو پاخانے خالی ہیں۔ چائے پینے سے ریڑھ کی ہڈی میں سیدھاپن آگیا ہے۔ ہاتھوں اور ٹانگوں میں سکت واپس لوٹ آئی ہے۔ سگریٹ سلگا کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہوں۔

نہانے کے بعد جب دوبارہ چائے پیتا ہوں تو ایک نئی قسم کی طاقت، امنگ اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی لگتی ہے۔ بہت چُست ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کھانا بنانا ہے اس کے لیے ایک دم تیار ہو گیا ہوں۔ چائے پینے سے مجھ میں ایسی ہی طاقت اور امنگ آجاتی ہے جس طرح بچّے میں، ماں کا دودھ پینے کے بعد زور زور سے ہاتھ پاؤں چلانے کے لیے طاقت آجاتی ہے۔

کھانا تیار کر کے گھڑی دیکھتا ہوں —— ساڑھے نو بجے ہیں —— اوف —— نوہ دیر ہو گئی۔ جلدی سے تیار ہوتا ہوں۔ دفتر جانے کے لیے آدمی نہ جانے کیوں مشین بن جاتا ہے! سیدھا شک دفتر کی طرف۔ کام کی طرف دوڑا چلا جاتا ہے۔ میں بھی مشین بن گیا ہوں۔ دماغ میں 'ٹیپ' بار بار گونج رہا ہے —— دس بجے دفتر پہنچنا ہے —— دس بجے دفتر پہنچنا ہے —— ...

اور اس طرح ہر ایک دن کی طرح آج کی زندگی کا سیدھا بھی ختم ہوگیا!

سیکشن انچارج کی ٹیبل پر رکھے رجسٹر میں حاضری بنا کر اپنی ٹیبل تک پہنچنے میں مجھے پندرہ منٹ لگ جاتے ہیں۔ کسی سے رام رام تو کسی سے نمسکار، کوئی خاص خبر —— کوئی اطلاع —— آفس کے کسی ساتھی کی خبر —— واقعہ حادثہ —— وغیرہ وغیرہ پھر فائلوں کے ڈھیر میں کھو جاتا ہوں۔ بار بار، چھوٹے صاحب سے لے کر بڑے صاحب تک کی مختلف ترنگوں والی گھنٹیاں دن بھر سننا پڑتی ہیں۔ کل کے 'ایمیجیٹ' 'بہت ضروری'، 'ارجنٹ'، 'ویری امپورٹنٹ'، 'اوّلیت دیں' والے کام اب تک نہ کرنے پر صاحب لوگوں کی بھاری گرجدار پھنکار اُن کے کمروں کی چار دیواری توڑ کر باہر نکل آرہی ہے۔ آس پاس کے کلرک سہم جاتے ہیں، گردنیں جھک جاتی ہیں۔ چرچراکر دروازے کھلتے ہیں۔ بابو لوگ پسینہ پونچھتے ہوئے بڑبڑاتے صاحب کے چیمبروں سے نکلتے ہیں۔ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ —— کھٹ... ٹائپ رائٹرس کی آوازیں اور تیز ہو جاتی ہیں۔ گھنٹی کے پھر بج اُٹھنے پر کلرکوں کے دل ڈر جاتے ہیں —— دیکھیں اب کس کا بلاوا ہے؟ چپراسی اِدھر سے اُدھر ٹیبلوں پر پہنچتا ہے، رکتا ہے، پیغام دیتا ہے۔ کلرک ہوشیار ہو کر پوری بات سنتا ہے۔ پھر اِدھر اُدھر سے فائل نکال کر کاغذ ڈھونڈتا ہے یا پین ٹیبل پر رکھ کر خدشات سے بھرا صاحب کے چیمبر کی طرف جاتا ہے۔ یہ سلسلہ دن بھر چلتا ہے، ہر روز چلتا ہے۔

اور کبھی کبھی بابوؤں کے خاص چپراسی دوسرے بابوؤں کے پاس چھوٹی چھوٹی پرچیاں لے کر پہنچتے ہیں —— "سخت ضرورت ہے پچاس روپے چاہئیں۔ پے مینٹ پر لے لینا۔"

"دس روپے چاہئیں۔ ابھی دے دو۔"

"کینٹین میں لنچ ٹائم میں ملو بہت ضروری کام ہے۔"

اس لین دین میں چپراسی بھی چائے سے گرم ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس میدان میں منجھا ہوا ہوں۔ مہینے میں دو تین بار پرچیاں لکھنا ہی پڑتی ہیں۔ اپنا خرچ اور ماں باپ کی ذمّہ داری! تنخواہ کو کوئی کہاں تک کھینچے؟ یہ تو ایک دو مہینے جوڑ توڑ سے ہی پوری ہو جاتی ہے۔ دوسرے چھوٹ پُٹ کے خرچ کہاں سے پورے ہوں؟

آفس ٹائم کے لمبے وقت میں راحت کا تھوڑا سا وقت چلتا ہے۔

لنچ ٹائم! کہنے کو سب کے لیے لنچ ٹائم ہے لیکن لنچ (دو چھوٹے ڈبوں والی ٹفن میں بھرا کھانا) لیتے ہیں صرف دو یا تین فیصد لوگ۔

لنچ ٹائم ہو گیا ہے۔ سب لوگ گرگرا کر اپنی اپنی کابک سے نکل آئے ہیں، سوائے صاحب لوگوں کے۔ بڑے صاحب لوگ کارول ہیں بیٹھ کر لنچ لینے چلے جاتے ہیں۔ چھوٹے صاحب لوگ (آفس انچارج سپرنٹنڈنٹ، سیکشن انچارج، ڈپٹی اسسٹنٹ وغیرہ) جو بابوؤں سے تو اوپر ہیں لیکن پورے صاحب نہیں ہیں، اپنے اپنے کمروں میں بیٹھ کر ٹفن کھول لیتے ہیں یا چائے منگا لیتے ہیں۔

کینٹین کا ماحول ایک دم بھپکا ہوا ہے۔ بابوؤں کی تیز بول چال ہنسی قہقہے، پیالیوں کی کھڑکھڑاہٹ پر چھا جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میزیں بھر چکی ہیں۔ لوگ دیواروں سے ٹکے، کاؤنٹر کے سہارے کھڑے بات چیت میں مشغول ہیں۔ پرچی باز آدمی اپنے دساہو کار ساتھی سے چپکا بیٹھا ہے۔ لنچ، میں خاص اہتمام ہے۔

میں اس بھنبھناہٹ کے ماحول میں، دیوار سے لگا چائے کی چسکیاں لے رہا ہوں۔ ہر روز ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس ماحول میں کوئی رس نہیں کوئی مزا نہیں کوئی نیا پن نہیں۔ نہ ہی اپنے اپنے سیکشن انچارج، آفس سپرنٹنڈنٹ یا افسر سے نوک جھونک، گالی گلوچ والی باتیں۔ جن میں خاص حصہ دار ہیں —— نوجوان کلرک! پتلی ٹائٹ کمر، لمبی پائنچوں والی پتلونیں، بڑھے ہوئے بال —— ایک خاص طرح کا طبقہ! فکروں سے آزادی چاہنے والا، فرض سے بھاگنے والا یہ طبقہ، سرور و مستی میں ڈوب جانا چاہتا ہے، بے فکر رہنا چاہتا ہے۔ چاہے یہ کیسے بھی حاصل ہوں، چاہے غیر مستقل ہی کیوں نہ ہوں۔ کون سمجھائے —— فرض سے فرار نادانی ہے۔ اپنا سُکھ چاہنے کے لیے دوسروں کو دکھ میں رکھنا ناانصافی ہے۔ ایسا سُکھ دھوکہ ہے، سپنا ہے سراب ہے۔ سُکھ، فرض سے بھاگنے میں نہیں، فرض کی ادائیگی میں ہے۔ یہ باغی نوجوان کسی کی ماتحتی قبول کرنا نہیں چاہتے۔

اور انھیں میں سے کچھ لوگ میزیں گھیرے روزانہ کی طرح ایک دوسرے کو لڑکیوں کے بارے میں رپورٹ دے رہے ہیں۔ اپنے سیکشن آفس سے لے کر دوسرے آفس تک کی لڑکیوں کی مکمل رپورٹ! مادھا آج کتنی دیر تک بوس ملہے اُن کے چیمبر میں بیٹھی ڈکٹیشن لیتی رہی۔ بیلا نے آج کتنا کھلے گلے کا منی بلاؤز پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے سیکشن انچارج بار بار خود ہی کاغذ دینے اس کے پاس چلا آتا تھا۔ دھونے آج کون سے پرنٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی؟ یہ کس کے تحفے کی تھی؟ ورشا آج کس کے ساتھ اسکوٹر پہ بیٹھ کر آئی تھی؟ نامرہ نے سیڑھیاں اترتے وقت کس کی طرف خاص مسکراہٹ سے دیکھا تھا؟ —— اور پھر ان کے خاص جسمانی حصّوں کے بارے میں باتیں —— قہقہے۔

لنچ ٹائم ختم ہو چکا ہے۔ کینٹین سے بھیڑ چھٹ رہی ہے۔ اب پھر وہی سیڑھیاں، وہی راستہ، وہی جیل، وہی فائلیں اور پھر وہی کال بیل —— ٹرررن ٹررررر . . .

پانچ بج چکے ہیں۔ دفتروں کی بھیڑ سڑکوں پر نکل آئی ہے۔ صبح کے تر و تازہ چہرے اس وقت کمہلائے ہوئے ہیں۔ دفتروں کے گیٹس سے ایسے باہر نکل رہے ہیں جیسے ذرا رک کے اور کسی نے پیچھے سے پکڑ لیا تو۔۔۔ فٹ پاتھ پر آسانی سے چلنا مشکل ہے۔

میں لوگوں کے چہرے دیکھتا، اُن سے ٹکراتا، ملیں ایریا کی طرف نکل آیا ہوں۔ روزانہ کا راستہ ہے۔ یہ ایریا خوبصورت ترین علاقہ ہے۔ کالی کالی، لمبی لمبی سڑکیں، ملوں کے مختلف حصّوں کو گھیرے دُور تک چلی گئی ہیں۔ ملوں کے دروازوں پہ مزدور لوگ اندر جانے کے لیے کھڑے ہیں۔ اپنی باری کے انتظار میں۔ میں ایک منٹ رُک کر ان کو دیکھتا ہوں —— پیلے پیلے بیمار چہرے، اندر دھنسی آنکھیں، بار بار اندر کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ پھر اُن کی نظریں چمنیوں پر سے ہوتی ہوئی اوپر آکاش میں بکھرتے دھوئیں پر رُک جاتی ہیں۔ کتنے سنجیدہ ایسے جذبات سے عاری سوکھے چہرے لیے! جیسے ان لمبی لمبی چمنیوں سے نکلتا دھواں ان کی ہڈیوں کو، خون کو جلا کر نکالا جا رہا ہے۔ ان محنت کش لوگوں سے الگ ایک اور طبقہ ہے جو کچھ تندرست ہے، صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ لیکن وہ بھی فکر مند دکھائی دے رہے ہیں۔ بار بار گھڑی دیکھ رہے ہیں۔ وقت کی اتنی پابندی؟ سُکھی ہوتے ہوئے بھی اتنے فکر مند؟ میں ان کے چہروں پر اطمینان ڈھونڈتا ہوں، سکھ کی مہک تلاش کرتا ہوں لیکن مجھے ان کے مکھ منڈل پہ بے فکری نہیں ملتی۔ گیٹس کے پاس

ویسے ہی کھڑے ہیں جیسے سلاٹر ہاؤس کے پاس بھیڑ بکریاں، کیا وقت اتنا قاتل ہے؟ کیا فرض کا بجا لانا انسان کے لیے اتنا دکھ دینے والا ہے؟

میں آگے بڑھ جاتا ہوں سول لائن کی طرف۔ سمندر کے کنارے کی یہ بستی شہر کی آبادی سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اس راستے سے ہمیشہ نفرت سی رہی ہے۔ مہذّب لوگوں کے رہنے کی جگہ۔ مین روڈ کے دونوں طرف دُور دُور تک بنے ہوئے کابک جیسے کوارٹرس، بنگلے جن پر ہر وقت سناٹا چھایا رہتا ہے۔ ان میں رہنے والے لوگ مہذّب کہلاتے ہیں۔ یہ کیسی تہذیب ہے؟ ——— انسانوں کے بیچ رہنے کے بجائے علیحدہ اکیلے میں رہنا ہی کیا تہذیب ہے؟ میں نے پڑھا تھا ——— انسانوں کے ایک ساتھ رہنے پر ہی تہذیب کا جنم ہوا ہے۔ مل جل کر رہنے پر ہی انسانوں میں وحشی پن کم ہوا ہے جنگلی پن کا خاتمہ ہوا ہے۔ مل جل کر رہنے اور امداد باہمی کے جذبے سے ہی جنگلی انسان مہذّب بنا ہے۔ لیکن یہ لوگ ہماری آبادی سے الگ ہو کر، ہم سے دور اکیلے میں رہنا چاہ رہے ہیں۔ یہ کیسے مہذّب ہیں؟ ہمارے دکھ میں ہمارے سُکھ میں شریک ہونے کے بجائے بے رخی برت رہے ہیں۔ یہ کیسی تہذیب ہے؟ ایسا لگتا ہے جیسے ہم انسان دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے ہوں۔ ایک ہم لوگ ہیں ——— آپس میں مشین کے پرزوں کی طرح سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے محنت کش لوگ! کسی بھی ایک کے گھر میں جھانکو، ایک ہی گھر میں سب گھر دکھ جائیں گے ——— الجھنوں کی دیواریں، دُکھ کے دروازے اور غربت کی چھتیں اور ان کے بیچ سسکتے ہم!

دوسرے لوگ ہیں یہ مالدار، تجارت پیشہ لوگ اور آفیسرس صاف ستھرے، سفید، خوبصورت، رنگین کپڑے پہنے، شام کے وقت اپنی اپنی کابکوں سے نکلتے لوگ! لال تکون والے خاندان کے یہ فرد، جن کی خوشیاں اسی محدود خاندان تک ہی محدود ہیں۔ ہم سے ایسے ہی ملتے ہیں، ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں، جیسے ہم اچھوت ہوں کوڑھی ہوں، تپ دق زدہ ہوں۔

ہونہہ ——— میں سر کو جھٹک دیتا ہوں۔ کیسی کیسی فضول باتیں سوچوں؟ ہماری بستی سے بھی جب کوئی اپنی کوشش سے 'مہذّب' بن جاتا ہے تو ویسا ہی اس کا طور طریقہ ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہے بُرجا ——— ایسا ہی بے مروّت! ہاں جی اپنا اپنی قسمت ہے۔

میں رُک جاتا ہوں ڈامر روڈ ختم ہو گئی ہے۔ سول لائن کی بستی کا اختتام! آگے محنت کش لوگوں کی بستی امبیڈکر نگر کی شروعات! دور دور تک کچے پکے مکان، چھوٹے بڑے گھر، گھنی آبادی سے لیے ہلچل میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سوچتا ہوں، گھر جاؤں گا وہی تنہائی وہی سونا پن ملے گا۔ گھر تبھی جاتا ہوں جب اندھیرا ہو جاتا ہے۔ راستے کی بتیاں جل اٹھتی ہیں۔ بیچ کا یہ وقت پبلک لائبریری میں، پارک میں یا سمندر کے کنارے گذارتا ہوں۔ اور یہ وقت کہاں گزاروں؟ اس وقت بھی سوچ رہا ہوں۔ فیصلہ نہ کر پانے پر بھی میرے پاؤں اپنے آپ ہی سمندر کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شہر میں، بستی میں میرا جی نہیں لگتا۔ شہر کا شور و غل، دور نکل بھاگنے پر مجبور کرتا ہے۔ دل میں ساری بستی کا دھواں بھر جاتا ہے۔ ایسے میں کھلے میدان میں سانس لینے کو جی چاہتا ہے اور تب گھنٹوں سمندر کے کنارے ریت پر لیٹ کر دماغ کو سکون دیتا ہوں۔ اپنی قبر میں واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔

سمندر کے کنارے کھڑے کھڑے نہ جانے کب لال لال سورج سمندر کے آخری کنارے پر پہنچ گیا۔ جی چاہا اسے ڈوبنے سے بچاؤں اس گول لال چمکتے سورج کو اپنے کندھے پر رکھ کر گھر لے چلوں تاکہ کبھی اندھیرا نہ ہو کبھی رات نہ ہو ۔ اس کے رہنے سے تنہائی مٹ جائے۔ سونا پن مٹ جائے۔ میں اسے چھت کے آنکڑے سے لٹکا دوں گا اور پلنگ پر لیٹا لیٹا اسے دیکھتا رہوں گا لیکن میرے دیکھتے دیکھتے آفتاب سمندر سے جا لگا، میں گھبرا اُٹھا۔ تیزی سے بھاگتا ہوا سمندر میں اُتر گیا، آفتاب کو ڈوبنے سے روکنے کے لیے لیکن جلد ہی بڑی بڑی بھاری لہروں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں تنکے کی طرح سے ڈگمگانے لگا۔ بے بسی سے کمر تک پانی میں ڈوبا آفتاب کا خون ہوتے دیکھتا رہا۔ جلد ہی اس کا لال رنگ سمندر پر چاروں طرف پھیل گیا۔ آسمان میں چھوٹے چھوٹے بادل لال رنگ کے ہو گئے آفتاب تڑپتا ہوا سمندر کے آخری کنارے پر ڈوبنے لگا۔ سارا سمندر لال ہو گیا۔ میں سست ڈھیلا سا آفتاب پر نظریں اٹکائے کھڑا رہا آفتاب کی آخری کور بھی ڈوب گئی۔ سمندر اور آسمان پیاس کا خون اور بھی پھیل گیا۔ میں نے اپنی ہتھیلیاں پانی سے نکال کر دیکھیں۔

گیلی ہتھیلیاں لال تھیں۔ جیسے انھوں نے ہی سورج کو قتل کیا ہو، دن کا قتل کیا ہو۔ دھیرے دھیرے دائیں بائیں طرف سے اندھیرا رینگ آنے لگا۔ سمندر کا پانی کالا ہو گیا، جس طرح لال خون ہوا لگنے پہ کالا ہونے لگتا ہے۔

میں بستی کی طرف پلٹا ہوں۔ اُسی چال سے اُسی دل سے جیسے اپنے کسی رشتہ دار کو شمشان گھاٹ پر جلا کر واپس لوٹ رہا ہوں۔ آس پاس کی جھاڑیوں سے جھینگروں کی جھائیں جھائیں بڑھتی جا رہی ہے۔

رات کے دس بج چکے ہیں۔ بیر لٹکائے پلنگ پر سوالیہ نشان بنا بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے چھوٹے بڑے کئی برتن بھرے پڑے ہیں۔ نہ جانے من کے کس کونے سے دماغ میں اداسی آ کر بس گئی ہے جھٹکنے پر بھی کنکھجورے کی طرح سے ہٹتی نہیں ہے اور بھی کھوپڑی کو جکڑ لیتی ہے۔ اسٹوو کی لگاتار بھربھر جو ابھی ابھی ختم ہوئی ہے، اب اس کی غیر موجودگی نے دماغ کو اندر سے کُترنا شروع کر دیا ہے۔

تین بائی پانچ گز والے اس کمرے کی دیواروں پر نظریں دوڑاتا ہوں۔ پیلی پیلی دیواریں جو سفیدی کے انتظار میں اب کالی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے نیچے کا حصہ تو چکنا اور کالا بھی ہو گیا ہے۔ سامنے دیوار پر کئی جگہ کوئلے سے، پنسل سے لکیریں کھنچی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ، بے مقصد بے معنی الفاظ جو یقیناً کسی بچے کی کوشش کا نتیجہ ہوں گے۔ مجھ سے پہلے رہنے والے اس کمرے کے کرایہ دار کے بچے ہوں گے۔ ان لکیروں سے اوپر، پنسل سے جگہ جگہ روپے پیسوں میں حساب لکھا ہے۔ کہیں کہیں تاریخیں بھی لکھی ہیں۔ پچیس واٹ کی روشنی کمرے میں پیلا اُجالا کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔

دائیں طرف کے برابر کے کمرے سے بچوں کے شور اور میاں بیوی کے بکنے جھکنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ان کا یہ ہر رات کا معمول ہے پانچ بچوں کی مانگوں اور ان کی ریں ریں سے پریشان ہو کر وسودھا پہلے تو انھیں کوستی ہے، پیٹتی ہے۔ جب وہ اور رونے لگتے ہیں تو پھر رامیشور سے لڑ پڑتی ہے۔ ہار رامیشور کی ہی ہوتی ہے۔ جواب دے بھی کہاں سے؟ کارخانے سے نچوڑا ہوا تو آتا ہے جس دن وہ دکھ کی انتہا پہ ہوتا ہے تو وہ شراب پی کر آتا ہے۔ یہی تو دُکھ دور کرنے کا واحد ذریعہ ہے اُس کے پاس!

دھیان ہٹا کر، برابر کے بائیں طرف کے کمرے کی طرف کان لگاتا ہوں۔ وہی پھسپھساہٹ، وہی چپڑ چپڑ باتیں۔ یہ موہن اور رجنی سوتے وقت نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ بہت دھیرے دھیرے سرگوشیاں، دھیمی دھیمی ہنسی ——— کوئی ان کی باتیں سُن نہ لے۔ لیکن انھیں پتہ نہیں کہ ایک اینٹ کی دیوار اُن کی راز کی باتیں صاف صاف کہہ دیتی ہے۔ جی چاہتا ہے، دیوار میں سے ایک اینٹ نکال کر اتنا پوچھوں کہ تم ہر رات کو کیا باتیں کرتے ہو؟ تمھارا دل نہیں بھرتا کیا؟

ڈھیر سارے برتن آنکھوں میں چبھنے لگتے ہیں۔ اُٹھ کر دھوتا ہوں۔ جب تولیے سے ہاتھ صاف کر کے پلنگ پر آ بیٹھتا ہوں تو دونوں کمروں میں خاموشی چھائی ہوئی پاتا ہوں۔ نیند نہیں آ رہی ہے ——— آئے بھی کیسے؟ جسم تھکتا ہے تو نیند آتی ہے۔ لیکن جب زندگی تھک جاتی ہے تو آنکھیں نیند کے لیے ترس جاتی ہیں۔ نیند بے فکری کی نشانی ہے، دماغی سکون کی نشانی ہے۔

میری زندگی کے تیس سال دُکھوں کے تیزاب میں گل چکے ہیں۔ کبھی کبھی ان بیتے برسوں کی ریل حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوں تو زخموں کے کھرنڈ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ نہ کوئی ایسا میٹھا من بھاون حادثہ یاد آتا ہے جسے بار بار یاد کیا جا سکے۔ پہلے رنگین کل کی تمنا لیے حال سے بھاگ کر مستقبل کے لیے جیے جاتا تھا لیکن کبھی بھی رنگین کل کی کونپل، پھولوں میں نہیں تبدیل ہوئی۔ اب تو رنگین کل کے سپنے دکھنا بھی بند ہو گئے۔

کبھی کبھی بند دروازے پر کان لگائے کسی کے ہلکے سے دروازہ تھپتھپانے کی آواز کا انتظار کرتا ہوں اور تصوّر کرتا ہوں کہ میرے جواب نہ دینے پر وہ دروازے کو دھیرے سے کھول کر اندر آئے گی۔ پھر اُسے بند کر کے سہانی مسکراہٹ سے میرے من کے بوجھ کو، دماغ کی اُداسی کو دور کرے گی۔ مسکراتے ہوئے دھیرے دھیرے چل کر وہ میرے پاس آئے گی اور میری اُداس آنکھوں پر تازہ گلابی ہونٹ رکھ کر ٹھنڈی رنگین روشنی بھر دے گی۔ ہمدردی اور اپنائیت کی ہتھیلیوں میں میرا چہرہ لے کر کہے گی ——— "تم اتنے فکرمند کیوں ہوتے ہو؟ تمھارے ساتھ میں جو ہوں۔ سُکھ اور دُکھ تو انسان کی زندگی کے

ملاقات ہیں۔ میں تمھارے ہر غم میں شریک ہوں۔ ہر خوشی میں ساتھ ہوں ——— اداسی چھوڑو اور میری مسکراہٹ کا جواب بشاش چہرے سے دو۔"

لیکن کوئی نہیں آتا، انتظار میں آنکھیں پتھرا کر رہ جاتی ہیں۔ رہتا ہے وہی اکیلا پن، سونا پن۔ رہتی ہے وہی مایوسی، اُداسی! مستقبل سے نا اُمید! جو کل تھا، وہ آج بھی ہے۔ جو آج ہے وہ کل بھی رہے گا ——— وہی ایک حالت! زندگی تو جیسے دو حصّوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے ——— صبح اور شام۔ صبح جینا اور شام کو مرنا۔ کسی شاعر نے سچ ہی تو کہا ہے:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

تو کیا میں ختم ہو رہا ہوں؟ ہاں ——— پل پل۔ لمحہ بہ لمحہ تمھیں پتہ نہیں، گزرتے لمحوں کا دھیان نہیں۔ صرف دن دیکھتے ہو، راتیں گنتے ہو۔ ہر آنے والا لمحہ تمھیں موت کی طرف لے جا رہا ہے۔ تم لمحہ لمحہ مر رہے ہو۔ تم جب سے پیدا ہوئے ہو لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہے ہو۔ تمھارے سویرے شام کا نظام کپڑے کے تھان کی طرح تمھاری زندگی کو لپیٹ رہا ہے۔ تم نے اپنی زندگی صبح اور شام میں بانٹ رکھی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو دن کو کام کی درانتی سے کاٹنے میں مشغول ہو جاتے ہو اور جب شام کا ٹکڑا ہاتھ میں آتا ہے تو تم مطمئن ہو جاتے ہو جیسے زندگی ہمیشہ ایسے ہی چلتی رہے گی۔ بنا کسی تغیّر کے۔

اور میں اپنے اس مرنے پر گھبرا جاتا ہوں ——— نہیں نہیں۔ ابھی میں مرنا نہیں چاہتا ——— میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں جینے میں کوئی رس نہیں، مزا نہیں پھر بھی نہ جانے کیوں جینے کی خواہش ہے۔ موت کے نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے، پریشانی ہوتی ہے۔

کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں۔ باہر نیچے بلب کی بہت دھیمی روشنی میں نل دکھائی دیتا ہے۔ سونی سونی جگہ۔ نل پر نظر پڑتے ہی میری آنکھوں کے سامنے صبح کا منظر گھوم جاتا ہے۔ کپڑا نچوڑتی ہوئی گووند بھنڈاری کی بیوی گیتا ——— اُس کی نیم برہنہ چھاتیاں! دماغ گرم ہو جاتا ہے۔ کملا یاد آتی ہے۔ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں کمرے سے نکل کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا تیز نظروں سے کملا کو تلاش کرتا ہوں۔ پوری بلڈنگ میں گھوم جاتا ہوں لیکن کملا نہیں ملتی۔ نا اُمید ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ جاتا ہوں۔ اپنے مقبرے میں آ جاتا ہوں۔

وہی خاموشی، وہی تنہائی، وہی سناٹا! میں پلنگ پر لیٹ جاتا ہوں۔ میری آنکھیں بے بسی سے مجبوری سے کمرے میں چاروں طرف ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے زندگی کا خاتمہ ہو رہا ہو۔ تکیے کے نیچے رکھی گھڑی دماغ میں ڈنک لگا رہی ہے ——— ٹک ٹک ٹک ٹک ..... جیسے کہہ رہی ہو موت موت موت!

●●

ٹیسٹ اسٹار ۱۹۸۹ء
نونہال بے بی ٹانک
آپ کے بچے کے لیے جو کل کا ہیرو ہے
نونہال بے بی ٹانک
ہمدرد

غزلیں

عقیل شاداب

ہر چہرہ جب مرہونِ غازہ ہوگا
بھلے بُرے کا کیسے اندازہ ہوگا
تنہائی کا گھاؤ ابھی تازہ ہوگا
کھُلا ہوا اُس کا دروازہ ہوگا
جس سے ٹکرا کر میں چکنا چور ہوا
بھولا بھٹکا سنگِ آوازہ ہوگا
جھوٹے آدرشوں کے بیہڑ جنگل میں
کس کو اپنے پن کا اندازہ ہوگا
ہو لہو پھر ہوگی دیوارِ گریہ
خون کسی کا جب تازہ تازہ ہوگا
یکتائی کے دعوے دار بہت ہونگے
لیکن ہم جیسا بعضا بعضا ہوگا
اِک دن آئے گا جب مستقبل شاداب
ماضی کے خوابوں کا شیرازہ ہوگا

ظفر غوری

ایک بے قیمت صفر میں جان سی پڑ جائے گی
جب کوئی تنہا عدد میرے برابر آئے گا
اس کو باہوں میں لیے سینہ سپر دنیا میں ہوں
دیکھنا ہے کس طرف سے پہلا پتھر آئے گا
کل مرے زخمِ سفر کے کوئی پہنچا دے وہاں
اس پہاڑی کے ادھر جو آخری گھر آئے گا
سبز ساون کی ہوا ملتے دو سوکھی بیل سے
گھر مہک اُٹھے گا ایسا رنگ اس پر آئے گا
راکھ چہروں پر سجائے بے حسی کی بستیاں
ٹوٹے رشتوں کا لہو کب جسم میں در آئے گا
پھر اسی اندازسے میں نے اُٹھایا جامِ جاں!
پھر یہ تلخابِ جہاں اس میں سمٹ کر آئے گا
دیکھیے اس خار وخس کے گھر پہ کیا گزرے ظفر
پھر کوئی کوندا تڑپ کر تن سے باہر آئے گا

عبد اللہ کمال

سب مناظر، سب تصور بے نشاں ہو جائیں گے
تیز رو لمحوں میں سب پیکر دھواں ہو جائیں گے
زرد پتے، سبز شاخوں پر رہیں گے کب تلک
موسمِ شاداب تک نذرِ خزاں ہو جائیں گے
ہر جگہ آسیب ہے تنہائی اپنی، اور لوگ
منتظر ہیں: ہم شریکِ کارواں ہو جائیں گے
پھر ستارے ٹانکنا، حدِ نظر کہتا ہمیں!
دیکھ لینا ہم بھی اک دن آسماں ہو جائیں گے
ہاں ابھی تک قصئہ تازہ ہیں عبد اللہ کمال
رفتہ رفتہ بھولی بسری داستاں ہو جائیں گے

غزلیں

فرحت کیفی

کبھی دھیمی کبھی اونچی صدا ئیں
ہراک یُگ کے لیے بالکل نیا مَیں
کسی اخبار کی سُرخی بنادو
نہیں کچھ اور بس اک حادثہ مَیں
ہم انساں تھے رہے اپنی ہی ضد پر
خدا کہتا رہا دیکھو خُدا مَیں
مجھے اک گوشۂ دل میں چھپالو
اُبھرآؤں گا بن کر اک دُعا مَیں
زمانہ اَن سُنی کردے تو کیا غم
مجھے کہنا تھا سو کہتا رہا میں
یہ ہے اک پتّھروں کا شہر فرحت
یہاں کس کے لیے لب کھولتا میں

ساحل احمد

بہتے دریا کو صدا دیتا ہوں
ریت پانی میں بہا دیتا ہوں
جب بھی پانی پہ ہوا چلتی ہے
بلبلہ بن کے دکھا دیتا ہوں
پیلے پتّوں کی کہانی لکھ کر
رنگ پھولوں کا اُڑا دیتا ہوں
اپنے ہاتھوں سے دبا کر پانی
سطح دریا کو جگا دیتا ہوں
ناؤ کاغذ کی چلا کر ساحل
راستہ ان کو دکھا دیتا ہوں

نجم عثمانی

بے خبر تھا خود سے، اپنی ذات سے واقف نہ تھا
میں دلِ غمگیں کے احساسات سے واقف نہ تھا
یوں تو پہلے بھی شجر کی پیاس بجھ پائی نہ تھی
اس قدر سوکھی ہوئی برسات سے واقف نہ تھا
میں وہاں کی زندگی پر رشک کرتا تھا بہت
جب تلک اس شہر کے حالات سے واقف نہ تھا
مانگتا رہتا تھا سورج کی تپش سے میں پناہ
دل مرا جب تک شبِ ظلمات سے واقف نہ تھا
چاند تارے ہو رہے ہیں اس کے فرشِ راہ آج
کل تلک جو خاک کے ذرّات سے واقف نہ تھا

ٹی-اے-واچ کمپنی ملوکارڈ، مدراس ● ٹرزر، ای-سی-کالج - الہ آباد، یوپی ● معرفت سید ابوالقاسم صاحب-ایم-پی-ایف-آفس- مصطفٰباد

غزلیں

عشرت دھولپوری

غمِ زمانہ سے کیا دل کا آئینہ ٹوٹے
نہ سنگِ راہ سے منزل کا آئینہ ٹوٹے

خود اپنی شکل کو بھی آدمی نہ پہچانے
جو زندگی کے مسائل کا آئینہ ٹوٹے

کھنچے تو کیسے کھنچے حسنِ یار کی تصویر
جمالِ رُخ سے مقابل کا آئینہ ٹوٹے

ہماری چُپ کو سمندر کی خامشی جانو!
جو لب ہلائیں تو ساحل کا آئینہ ٹوٹے

جفاکشوں کا تبسم بھی کیا قیامت ہے
غرورِ خنجرِ قاتل کا آئینہ ٹوٹے

وہ اپنے آئینہ خانوں کی پہلے خیر منائیں
جنھیں یہ ضد ہے مرے دل کا آئینہ ٹوٹے

خود اپنے پاؤں چلے پیکرِ غزل عشرت
جو زُلف و رخ کے سلاسل کا آئینہ ٹوٹے

خورشید سحر

صداؤں پہ صدائیں دے رہا ہے
وہ مجھ میں رہ کے مجھ کو ڈھونڈتا ہے

لبوں پر برف جمتی جا رہی ہے
بدن میں گرم موسم گونجتا ہے

میں دشتِ خوف میں تنہا کھڑا ہوں
مرے چاروں طرف پاگل ہوا ہے

لرز جاتا ہوں میں اندر ہی اندر
مجھے جب غور سے وہ دیکھتا ہے

لہو میں چیونٹیاں سی رینگتی ہیں
کئی دن سے بدن سونا پڑا ہے

سحرؔ امّید کا دامن سمیٹو
نہ آنے کی قسم وہ کھا چکا ہے

ساغر پالمپوری

ہر خوشی سے یہ خفا لگتا ہے
کچھ تو اس دل کو ہوا لگتا ہے

سرِ بازار لُٹے ہیں ہم لوگ
حاکمِ وقت خفا لگتا ہے

ملا پردیس میں اپنا کوئی
پھول صحرا میں کھلا لگتا ہے

ہائے کیا چیز ہے محرومی بھی
اپنا سایہ بھی جدا لگتا ہے

بھول جاتا ہوں میں خود کو ساغرؔ
جب کہیں اس کا پتہ لگتا ہے

سیکریٹری میونسپل بورڈ دھولپور، راجستھان ● مہادیوا محلہ، آرہ - بھوجپور ● اشوک لاج، مرانڈا، ہماچل

نظمیں

سرشار بلند شہری

انتظار

آج موسم بہت خوشگوار ہے
جھیل کے کنارے
ببول کی شاخ پر
بیّے کے گھونسلے میں
سبز روشنی رقص کر رہی ہے
آپ نے جو ملاقات کے لمحے
تجویز کیے تھے
اختتام پذیر ہیں

جے۔ اے غضنفر

ایک نظم

نرم و نازک حسین ایک ننھا شجر
اپنے اندر چھپائے ہوئے برگ و بر
لمحہ لمحہ جواں ہو رہا ہے مگر
کیا خبر
سر پہ بجلی کے تاروں کا ہے سلسلہ

ماہر منصور

ذوقِ سفر

موجِ دریا کے چلن کا ہے مجھے علم مگر
مجھے دریا میں اُترنے دو، مجھے بڑھنے دو
میں مسافر ہوں، مجھے جانا ہے
سانس کی تیزیٔ رفتار سے
ڈرتے کیوں ہو۔ ؟؟

نظمیں

پیغام آفاقی

①

مہر دانش کی یہ روشنی، زندگی کے اندھیرے
یہ میدان، یہ خون، یہ لاش پہ لاش
گھمسان کی جنگ،
کوئی گکرا مرثیہ لکھ رہا ہے
کوئی رزمیہ لکھ رہا ہے
میں حیران ہوں، کیا لکھوں؟؟
کیا لکھوں؟؟

②

میں کپڑے بدل کر نکلتا ہوں جب
لوگ اس طرح تکتے ہیں، جیسے
میں بدلا ہوا ہوں

③

صبح سے شام تک اک عجب سلسلہ
لڑکیاں، میز کرسی
کتابیں،
تھکن، مسکراہٹ
دھڑکتے ہوئے دل
اداسی — سرِ شام پھر میں اسی گھر میں
اب جھنجھلا رہا ہوں

④

پاؤں رکتے نہیں
آنکھ کھلتی نہیں
اجنبی راستوں پر
میں بڑھتا چلا جا رہا ہوں
میں کیا ہوں؟ کہاں ہوں؟
کہاں جا رہا ہوں؟

⑤

چیونٹیاں، مکڑیاں،
تکنیاں
زندگی

چند دیواریں ان پہ
لٹکتی ہوئی ہڈیاں،
بھوت، یہ خوف
کیا ہے یہ سب کچھ
میں کیا کیا بناتا چلا جا رہا ہوں؟

⑥

جوق در جوق
بے آنکھ، بے کان، بے چہرہ انسان
کہاں کون ہے کون جانے؟
مگر ہم سبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
کسی اجنبی دھن پہ
ہیں رقص میں

⑦

خلا کے اس روشن آنگن میں، پاگل دھرتی ناچ
رہی ہے

خون ملی مٹی کی راہیں
چلتے راہی، بوجھل پاؤں
سرخ فضائیں، جلتے بادل، شام کی آمد
پیلی دھوپ
آج کا سورج
اپنی ہی کرنوں کے دھویں میں
اپنا چہرہ گھول رہا ہے

⑧

یہ در و دیوار، یہ کمرہ، یہ لمحے
اور میں
صرف میں
اور یہاں کوئی نہیں
کچھ بھی نہیں
میں کہاں ہوں؟
قبر میں لیٹا ہوں کیا؟؟

ونایک مہادیو گوکلکرنی
بدیع الزماں خاور

اے مرے دل

تجھ کو جب تک ترے دریچے سے
نظر آتا ہے آسماں اے دل!
تو نہ گھبرا کسی اندھیرے سے
پھر اندھیرا وہ چاہے جیسا ہو!
اُس سے اے دل! نہ ڈر ——— نہ ڈر
وہ خواہ موت کے غار کا اندھیرا ہو!!

دیکھ، یہ بادلوں کی مناّہی
خوبصورت ہے کس قدر اے دل!
دیکھ، سُورج نے اپنی کرنوں سے کیسا سونا بکھیر رکھا ہے

اولیا، صوفیا، رشی، سادھو
تجھ کو اکثر جو یاد آتے ہیں
رنگ‌ہا، جو ترے خیالوں میں روشنی بن کے جگمگاتے ہیں
سب اسی آسماں پہ پہنچے ہیں
سب اسی آسماں میں رہتے ہیں
تجھ کو جب تک دکھائی دیتا ہے
آسماں یہ، ترے دریچے سے
تب تک اے دل! بہا نہ تو آنسو
لاکھ اندوہ و غم رہیں پھر بھی . . . . .

ہفت قُلزم کے آب سے جب تک
ساری دھرتی کو سینچنے کے لیے
نیلگوں آسماں پہ یہ بادل تجھ کو اُٹھتے ہوئے
نظر آئیں
اپنے خاموش درد کا ——— تب تک
اے مرے دل نہ سُن کوئی نغمہ !!
یہ جو ہے آسماں کا گنبد
اسی گنبد کے نیلے سایے میں کرتے رہتے ہیں سب سفر آگے . . .
اپنے اپنے علم اُٹھائے ہوئے
تنگ اتنا نہیں ہے یہ گنبد
بھول جائے جو تجھ کو ہی
اے دل!
جس میں تو ہی فقط سما نہ سکے

جس نے یہ آسماں بنایا ہے
نیلے گنبد میں جو سمایا ہے
وہ خدا ہے بڑا رحیم اے دل!
اس لیے
آسماں یہ جب تک
آ رہا ہے نظر تجھے اے دل!
تو نہ گھبرا کسی اندھیرے سے . . . . .

(مراٹھی نظم)

ایشور چندر
یوسف جمال

زنگ

یہ پہلا موقع تھا، جب اس قسم کا کوئی خط اس کے نام آیا تھا، ڈاکیہ سبز رنگ کا ایک لفافہ دے گیا تھا، جس پر اس کا پتہ درج تھا، اور جب لفافہ چاک کرکے پڑھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز اٹھا۔ لکھا تھا:

"کمینے! تمھاری جھوٹی گواہی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے آدمی کو سزا ہوگئی۔ ہم نے تمھیں کافی چھوٹ دی، لیکن اب کان کھول کر سن لو کہ تمھاری زندگی صرف اگست تک ہے، تم اگست کے بعد زندہ نہیں رہوگے۔ یہ محض دھمکی نہیں ہے، ہم جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ اگست کی کسی بھی تاریخ میں اپنی موت کے خیر مقدم کے لیے تیار رہو۔"

خط ٹائپ شدہ تھا، نیچے کسی کا نام یا کسی کے دستخط نہیں تھے۔ وہ بار بار خط پڑھتا اور کانپ جاتا۔ کافی دیر سوچنے کے باوجود بھی یہ جاننے سے قاصر رہا کہ خط بھیجنے والا کون ہے؟ جس کے کسی آدمی کو، اس کی جھوٹی گواہی کی وجہ سے جیل ہوگئی تھی، اور اب اس کے حمایتی اس کی جان کے درپے تھے۔ خط کی عبارت سے صاف طور پر ظاہر ہو رہا تھا کہ خط بھیجنے والا اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی استطاعت رکھتا ہے۔

دراصل جھوٹی شہادت دینا اس کا پیشہ بن کر رہ گیا تھا۔ رقم لے کر وہ کسی بھی شخص کے خلاف جھوٹی گواہی دے دیتا تھا۔ اب تک ان گنت لوگوں کے خلاف وہ جھوٹی گواہیاں دے چکا تھا، او نتیجے میں بہت سے لوگ جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ یا جرمانہ ادا کر چکے تھے۔ اسی بنا پر وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ ایسا کون شخص ہے جس کے ہمدردوں نے اسے ایسا خطرناک خط لکھا ہے؟

یہ پیشہ اپناتے ہوئے اسے پہلی بار یقیناً خوف محسوس ہوا تھا، وہ بھی اس لیے کہ پہلی گواہی اس نے ایک چھٹے ہوئے دادا کے خلاف دی تھی، جسے اس نے اس سے پہلے دیکھا تک نہیں تھا اور نہ اس نے یہ دیکھا تھا کہ دکاندار پر اس نے کیسے چاقو چلایا تھا، کیسے اس کے پیٹ میں چاقو گھس جانے کے بعد دادا نے اسے ٹھوکروں سے فٹ بال کی طرح اڑا اڑا کر اس کا دم نکال دیا تھا۔

لیکن اس نے وہ جھوٹی گواہی ایسی صفائی سے دی تھی کہ جج اور ممبران جیوری وغیرہ نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے پورا منظر ہے۔ یہ اس کی پہلی گواہی تھی۔ دادا کو پانچ سال کی قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ اور جب کٹہرے سے باہر نکلا تو دادا نے اسے ایسی خونخوار نظروں سے گھورا کہ وہ کانپ اٹھا۔ اسے لگا کہ پانچ سال کے بعد جب یہ باہر نکلے گا تو ضرور اس کا خون کر دے گا۔ لیکن میعاد پوری ہونے کے بعد جب دادا باہر نکلا تو اسے راستے میں متعدد بار دیکھنے کے بعد بھی اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔

اس واقعے کے بعد تو اس کی ہمت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ روپیہ لیتا اور جھوٹی گواہیاں دیتا۔ کسی کو جیل ہو یا پھانسی، اس کی بلا سے، اسے تو روپے سے مطلب تھا اور روپے اسے مل جایا کرتے تھے۔

انھیں دنوں اس نے اپنے ایک پڑوسی سے حسب منشا رقم لے کر جھوٹی گواہی دی تھی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس کی بیوی شوہر کی غیر موجودگی میں ایک غیر مرد کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے۔" دراصل اس کا شوہر پڑوس کی ایک خوبصورت لڑکی

کے ساتھ عشق کی پینگیں لڑا رہا تھا۔ وہ خود ہی اپنی بیوی کو چھوڑنا چاہتا تھا، لہٰذا اس کی جھوٹی گواہی کی بنا پر عدالت کے ذریعہ اس کے شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔

اور کچھ تو ہوا نہیں، بس اتنا ہوا کہ لڑکی کا بھائی ایک بار اس کے پاس آیا تھا اور غرّا کر بولا تھا۔ "تم نے جھوٹی گواہی دے کر میری بہن کی ساری خوشیاں برباد کر دیں، مگر یاد رکھنا زندگی میں تم بھی کبھی خوش نہیں رہوگے۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا تھا، اور اسے لگا تھا کہ اس آدمی نے کوئی دھمکی نہ دے کر صرف بد دعا ہی دی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کے سائنٹفک دور میں کتنے ہیں جو کسی کی بد دعا سے ڈرتے ہیں۔ اور پھر بد دعا دے کر جانے والا لڑکی کا بھائی اسے اس حد تک خطرناک بھی نہیں لگا تھا کہ اسے خط لکھ کر جان کی دھمکی دے گا، ویسے بھی اسے خط کے مسودے سے لڑکی کے بھائی کا تعلق نہیں لگ رہا تھا، اور اس دادا والی بات کو بھی ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ پھر یہ خط کس کی طرف سے آیا ہے؟ کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ویسے اسے خود بھی یہ یاد نہ تھا کہ اس نے اب تک کتنی جھوٹی گواہیاں دے کر کتنے لوگوں کو جیل کی ہوا کھلائی ہے۔

تو یہ خط کس کا ہو سکتا ہے؟ اس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی بے حد کوشش کی کہ یہ خط صرف اسے ڈرانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ لیکن خط کی تحریر بار بار پڑھ کر اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔

کافی سوچنے اور ذہن کے میدان پر قیاس کے گھوڑے دوڑانے کے بعد اس نے ایک پولیس انسپکٹر سے جس سے اس کی واقفیت تھی، مشورہ لیا اور ساتھ ہی وہ چیلنج نما خط بھی اسے دکھایا کہ شاید وہ کوئی حل ڈھونڈ نکالے یا خط لکھنے والے کا پتہ چلا لے۔ خط پڑھنے کے بعد انسپکٹر نے یہی کہا تھا کہ — "ہاں خون کرنے کی دھمکی تو ہے اور یہ خط لکھنے والا کوئی انتہائی خطرناک قسم کا آدمی ہے۔ یا یہ کوئی منظم گروہ ہے، کیونکہ اس نے لکھا ہے کہ ہم جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں، ایسا کرو ایک مفصل عرضداشت لکھ کر ایک ایک کاپی سٹی مجسٹریٹ اور ایس پی کو دے دو۔" اس نے سوچا کہ پولیس انسپکٹر نے ایک معمولی اور سطحی درجے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ تو جھوٹی گواہیاں دیتے دیتے قانون کی بیشتر دفعات سے واقف ہو گیا تھا اس سے کیا ہوگا؟ اس نے سوچا مارنے والا جب قانون کے آہنی ہاتھوں سے نہیں ڈرتا تو وہ قانون کے محافظ کی فکر کیوں کرنے لگا؟ وہ یہ بھی سوچنے لگا کہ رپورٹ لکھ کر دے ہی دے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اس کی رپورٹ کے پیش نظر محکمۂ سراغرسانی کے لوگ اس کی محافظت سائے کی طرح کریں گے اور اس آدمی کو گرفتار کر لیں گے، لیکن اس نے پھر سوچا کہ ایس پی رپورٹ کے بعد وہ دھمکی والا خط بھی دیکھے گا اور مجھ سے پوچھے گا کہ "تم نے کس کے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی۔؟" وہ کیا جواب دے گا؟ ایسی حالت میں خود اس کی پوزیشن مشکوک ہو جانے کا خدشہ بھی ہے، بھلا وہ دیدہ و دانستہ چوہے دان میں کیوں پھنسے؟ ایک جھوٹے گواہ کی یہ کتنی بڑی مجبوری اور کس مپرسی تھی، لیکن یہ خوف اس کے جسم کے رونگٹے رونگٹے میں سرایت کر گیا تھا کہ اس کی زندگی صرف اگست تک ہے اور اگست میں اس کی موت یقینی ہے۔ اس کی نظروں میں ہر لمحہ موت رقص کر رہی تھی اور بعض وقت تو یہ احساس شدید طور پر اس کے ذہن میں — ابھرتا کہ موت جونک بن کر اس کے جسم سے چپک کر رہ گئی ہے اور اس کی راحتوں اور اس کے پُرسکون لمحوں کا خون پیے جا رہی ہے۔

خون — وحشت — کرب — الجھن — انتشار —

کچھ دنوں تک تو ایسا لگا کہ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کی صورت سے گزر رہا ہے۔ اور اچانک — ایک دن پھر اس کے پاس ایک خط آیا۔ ویسا ہی سبز لفافہ اور لفافہ کے اوپر ویسا ہی ٹائپ شدہ اس کا پتہ۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ خط نکال کر پڑھنے لگا۔

"کمینے! تجھے یاد ہے نا کہ تو بس مشکل سے اگست تک ہی زندہ رہے گا۔"

بے پناہ خوف سے اس کا دل لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ دسمبر کی جان لیوا سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا، مہروں کو غور سے پڑھنے کی کوشش کی لیکن کسی بھی مہر کی تحریر صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔

ابھی اس دوسرے خط سے اس کے خوف کا زخم مزید گہرا ہی ہوا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد پھر ویسا ہی ایک اور لفافہ آیا اور اس میں

دوسرے خط کا وہی مختصر مضمون تھا۔ "کمینے تجھے یاد ہے نا کہ تو بس مشکل سے اگست تک ہی زندہ رہے گا۔" وہی مضمون، وہی لفافہ اور وہی ٹائپ کا پتہ۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔

اور پھر پابندی سے ہر ہفتے کے تیسرے روز لفافہ آتا وہی مختصر دھمکی والی تحریر ہوتی۔ ہر بار خط پڑھ کر شدت سے دل دھڑکتا۔ وہ بالوں کو نوچتا یا پھر سر پر دونوں ہاتھوں کو رکھ کر اکڑوں بیٹھ جاتا۔

اور اب تو یقینی طور پر اسے احساس ہونے لگا کہ موت کچھوے کی رفتار سے ہی سہی دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے اس کے قریب آتی جارہی ہے۔ ہر تیسرے روز خط کا آنا اور ہر خط کے ساتھ اپنے اندر رینگتے ہوئے موت کے کچھوے کو قریب سے قریب اپنے پاس آتے ہوئے دیکھنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ہر ساعت موت کے کرب سے دوچار تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ سکرات کے عالم میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ گزشتہ چند ہفتوں سے اپنے آپ میں بے حد کمزوری اور نقاہت محسوس کررہا تھا۔ اس کی تمام خوشیوں پر زنگ لگ چکا تھا اور وہ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا اور یہ کہ اس کی گویائی کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ اسے چپ سی لگ کر رہ گئی تھی۔ اس کی مجبوری، اس کا درد اور کچھ ایسی جان لیوا کیفیات خود اسی کی پیدا کردہ تھیں۔ جن کا ذکر وہ کسی سے کبھی نہیں سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے کتنی بڑی ٹریجڈی، کتنا زبردست حادثہ تھا کہ وہ ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے بھی مفلوج اور زبان رکھتے ہوئے بھی گونگا بن کر رہ گیا تھا۔

ایک روز تو وہ اپنی بے بسی کی انتہا پر رو بھی دیا کہ کیوں میں نے ایسا ذلیل پیشہ اختیار کیا؟ کیوں میں نے اتنی جھوٹی گواہیاں دیں؟ کیوں میں نے روپے کے لالچ میں بے گناہوں کے خلاف زہر اگلا اور انھیں اذیت پہنچائی۔ کیوں... کیوں... کیوں... ؟ اور ایسے کسی بھی کیوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے یہ پیشہ شوق سے نہیں اپنایا تھا۔ کئی برس تک اس کی یہی کوشش رہی کہ اسے کوئی ڈھنگ کی ملازمت مل جائے تاکہ اس کا مستقبل روشن ہو، لیکن ملازمت کی تلاش میں دربدر بھٹکتا ہوا اپنوں سے بہت دور ہو گیا۔ بھلا ایک بے کار آدمی سے اپنے بھی کب تک رشتہ باندھے رکھتے۔ بیگانگی اور اپنائیت دو متضاد اور بے ربط باتیں ہیں۔

تب اس نے سوچا وقت نہیں بدلا ہے صرف نعروں میں تبدیلی آئی ہے۔ آدمی آج بھی پہلے ہی کی طرح ظلم و بربریت کا نشانہ بنا ہوا ہے ہم سب زرخرید غلام ہیں جب چاہے اور جو چاہے ہمیں خرید لیتا ہے یہ اور بات ہے کہ خرید و فروخت کی صورت بدل گئی ہے مگر ڈھانچہ وہی ہے۔ اس نے سوچا کہ جہاں آدمی بک سکتا ہے وہاں ہر چیز بک سکتی ہے۔ ایمان اور شرافت کے نعرے محض الفاظ کے پیراہن ہیں جسے ہر کوئی پہن کر ایماندار اور شریف بن جاتا ہے، ورنہ آدمی ننگا ہوا ہے۔

ادھر پابندی وقت سے ہرے لفافوں کا آنا جاری تھا، اور اب تو اس نے ان لفافوں کو چاک کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ ڈاکیہ آتا لفافہ دے جاتا اور وہ تمام لفافوں کو جمع کرتا اور تصور کرتا کہ کسی بھی لمحہ موت کی چھری اس کے گلے پر چلنے والی ہے۔ وہ خود کو نیم بسمل کی طرح تڑپتا اور مرتا ہوا محسوس کرتا۔

ایک ہی بار مرنا معمول بات ہوتی ہے لیکن ہر پل اذیت ناک لمحوں کے جنگل میں سسک سسک کر مرنا، یہ وہی جان سکتا ہے جو اس عالم سے دوچار ہو چکا ہے۔ ہر ایک لمحہ موت کا خوف۔ اوہ.... موت .... موت!

اس نے اپنے دل سے اس خوف کو نکالنے کی تھوڑی بہت کوشش کی۔ سوچنے لگا کہ یہ اس کی بزدلی ہے۔ کیوں وہ شخص مجھے محض ڈرا دھمکا رہا ہے؟ وہ میرے سامنے کیوں نہیں آتا ہے؟ دو دو ہاتھ کر کے فتح و شکست کا فیصلہ ہو جاتا دونوں میں کوئی ایک فاتح یا مغلوب ہوتا۔ وہ مرتا یا میں مرتا۔ بہادری کی موت اسے پیاری تھی۔ گھٹ گھٹ کر مرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ یہ کوئی موت ہے؟ وہ کتنے ہفتوں سے گھل گھل کر جی رہا ہے اور مر نہیں رہا ہے۔ آدمی جیسی عظیم شخصیت کے اندر ایک بونا سا موت کا گھن ہے جو رینگ رہا ہے اور ایک انجانا بھیانک احساس دلا رہا ہے۔

ہرے رنگ کے لفافوں نے اس قدر سہما دیا تھا کہ ہرے رنگ کی ہر چیز اسے موت کا احساس دلاتی۔ یہاں تک کہ اسے پیڑ پودے دیکھ کر بھی موت یاد آجاتی اور نتیجے میں وہ گھر کی چہار دیواری تک مقید و محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ایک بار خیال آیا کہ وہ تمام لفافوں اور خطوں کو پھاڑ کر نذر آتش کر دے لیکن پھر اس نے سوچا اس سے

کیا فرق پڑتا ہے۔ خطوں کے پرخچے اڑا دینے سے موت ٹل نہیں سکتی۔ معمول کے مطابق ہر تیسرے روز لفافہ آنا بھی بند نہیں ہو سکتا۔

اور پھر اسے شدت سے احساس ہونے لگتا کہ اس کے اندر کے گھن نے اپنا رینگنا تیز کر دیا ہے' اور موت کا چہرہ نزدیک سے نزدیک آتا جا رہا ہے اس کی صورت نمایاں نظر آ رہی ہے ادھر موت اس کے قریب آ رہی ہے ادھر وہ خود موت کے قریب جا رہا ہے' دونوں کے فاصلے سمٹ رہے ہیں۔ انتہائی غور و فکر کے بعد پھر کہیں جا کر اس نے لفافوں کو مستعدی کے ساتھ ترتیب وار رکھنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے موت سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ یا پھر موت کو گلے لگانا منظور کر لیا ہو۔

کرب کی انھیں کیفیات کے ایام میں اچانک ایک دن اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو لگا کہ یہ تو وہ نہیں ہے' کوئی اور ہے' اس کی خوبصورت آنکھوں میں گڈھے سے پڑ گئے تھے۔ بھرے ہوئے رخسار پچک کر رہ گئے تھے۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا بھرا ہوا جسم موم کی طرح پگھل رہا تھا' تب اس نے سوچا' آدمی کی حیثیت موم سے زیادہ نہیں ہے' جس طرح آگ موم کو پگھلا دیتی ہے ٹھیک اسی طرح موت کا خوف آدمی کی ساری خوبصورتی اور قوت کو زائل کر کے اسے بے وقعت کر کے رکھ دیتا ہے۔

اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اسے ایسی موت منظور نہیں' اگر مرنا ہی ہے تو ایسے نہیں' موت کو آنا ہی ہے تو خود آئے' کوئی دوسرا لے کر کیوں آئے؟ موت تو ضروری ہے لیکن ایسی موت! ہر وقت ہر لمحہ موت کا کھٹکا۔ وہ ایسے نہیں مرے گا۔ نہیں... نہیں... وہ اس گھن کو اپنے جسم میں مزید رینگنے نہیں دے گا' اور ایک جھٹکے میں اس گھن کا خاتمہ کر دے گا' جو دھیرے دھیرے اس کے جسم میں رینگتا ہوا اسے ختم کرنے پر آمادہ اور بر سر پیکار ہے۔ اور ــــ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خودکشی کر لے گا۔ جس طرح زندہ رہنے کی راہ اس نے اپنی خواہش سے چن لی تھی' موت بھی اپنی عین خواہش کے موافق پسند کرے گا کسی کی دھمکی کی موت سے وہ نہیں مرے گا۔

سارے لفافوں کا اس نے بنڈل بنا کر ایک دھاگے سے باندھ دیا اور ان کے اوپر نمایاں طور پر ایک کاغذ لٹکا دیا۔ جس پر اس نے لکھا:

"اے دھمکی بھرے اتنے سارے خطوط لکھنے والے! میں تمھیں شکست دے کر جا رہا ہوں' اور یہ کہ میں تمھیں تمھارے منصوبے میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ تمھارے قول کے مطابق اگست تک میری زندگی ہے' لیکن سن لو' اس اگست کو میں تمھارے لیے نہیں آنے دوں گا۔ میں نے خود اسے دعوت دی ہے" دہی ـ جھوٹا گواہ۔

اس نے پوری توجہ سے اپنے خط کا ایک ایک لفظ پڑھا' اسے اپنے خط کا مضمون بڑا ہی پیارا لگا۔ اسے لگا جیسے اس نے دھمکی والے کے کل خطوط کا کرارا سا جواب دے کر اپنے فرض سے سبکدوشی ہی حاصل نہیں کر لی بلکہ وہ اسے مغلوب اور خود کو فاتح تصور کر رہا تھا۔

گھر سے نکل کر وہ ایک پل پر آ کر رک گیا' اس نے گھڑی دیکھی' اس کے بعد پل کے نیچے جھانکا' لوہے کی پٹریاں اسے بلا رہی تھیں۔ وہ مسکرا اٹھا' بس تھوڑی دیر اور... ایک ٹرین گزرے گی اور

....

ٹرین آ رہی تھی وہ چاق و چوبند ہو گیا۔ وہ خود کو ایک جھٹکے کے ساتھ پٹریوں پر پھینکنے کے لیے بے چین تھا ــــــ اس ایک چھلانگ کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ موت کو شاید اب اس نے صحیح معنوں میں سمجھ لیا تھا۔

(ہندی کہانی)

تبصرے

کتاب کا نام : اسکول سے روزگار تک۔
معنّف : رفیع الدین فاروقی۔
ناشر : معنّف، 676-2-23 شاہ علی بندہ روڈ، حیدرآباد۔
سائز : $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$۔ صفحات ۲۲۴، قیمت دس روپے ۵ پیسے۔

اگر کسی کتاب کے ہاتھ میں لیتے ہی غلیب پر یہ پڑھنے کو ملے :

اگر آپ

۱۔ بے روزگار ہیں اور موزوں روزگار کے متلاشی ہیں۔
۲۔ عنقریب تعلیم سے فارغ ہوکر تلاشِ روزگار کی مہم شروع کرنے والے ہیں۔
۳۔ روزگار سے لگے ہوئے ہیں لیکن اس سے بہتر روزگار کے خواہش مند ہیں۔

تو اس کتاب کا مطالعہ آپ کے لیے مفید ہو گا۔

تب بھلا کون ہو گا جو کتاب کو پڑھنا نہ چاہے گا۔ کیونکہ آج کے دور میں مندرجہ بالا تین حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہر فرد کے ذہن میں ضرور ہوگی۔ بلاشبہ کتاب اپنے موضوع پر بیحد معلوماتی اور کارآمد ہے۔ اس میں وہ قیمتی مشورے ہیں جو زندگی کے تجربوں کا نچوڑ ہیں اُن سے ہر طرح کا فرد اپنے حالات کے مطابق فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ فاروقی صاحب کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے : "کوئی فرد نکمّا یا ناکارہ نہیں ہے۔ جو لوگ ہم کو ایسے نظر آتے ہیں وہ محض ایسے بدنصیب ہیں جن کو موزوں روزگار نہیں ملا ہے" کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ آپ اور آپ کا اسکول : اس حصے میں تعلیمی زندگی کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ کہ کم سے کم کتنی تعلیم ضروری ہے، تعلیم سے جی چرانے کا کیا انجام ہوتا ہے، مضامین کا انتخاب کس طرح کرنا چاہیے کالج کی تعلیم کس لیے ہوتی ہے وغیرہ۔

۲۔ روزگار کا انتخاب کیوں اور کس لیے ؟ روزگار کا مقصد، لوگ کام کس لیے کرتے ہیں۔ آپ زندگی سے کیا چاہتے ہیں وغیرہ۔

۳۔ روزگار کے انتخاب کے لیے ضروری معلومات۔

کتاب کا یہ اہم ترین حصہ ہے۔ کیونکہ اس میں مختلف قسم کے لوگوں کے لیے مختلف قسم کے کاموں کی نشان دہی کی گئی ہے اور حروفِ تہجی کے لحاظ سے تقریباً پانچ سو پیشوں کی فہرست دی گئی ہے۔ کم پڑھے لکھے لوگوں سے لے کر زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کے روزگاری مسائل سے بھی بحث ہے اور عورتوں کے روزگار کے مسائل پر بھی گفتگو ہے۔ (SELF EMPLOYMENT) بھی زیرِ بحث آیا ہے۔ غرض فطری استعداد ہو یا خاندانی حالات، کام کی نوعیت ہو کہ پیشوں کے بدلتے ہوئے رجحانات، کام کا معاوضہ ہو یا جزوقتی کام، فاروقی صاحب نے روزگار سے متعلق ہر موضوع کو چھیڑا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث کر کے قابلِ قدر نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی فن میں مہارت حاصل کر لی جائے تو آج کے زمانے میں روزگار کے مواقع زیادہ میسر ہو سکتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ کلرکی کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کی جائے۔

۴۔ روزگار کا انتخاب : اس حصے میں بھی روزگار کے صحیح انتخاب کے بارے میں چند ضروری باتیں بتائی گئی ہیں۔ کیونکہ آدمی میں کمانے کی قابلیت انہی کاموں میں زیادہ ہوتی ہے جو اس کی صلاحیتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنے متعلق اور کاموں کے متعلق جتنی زیادہ معلومات ہوں گی، اسی قدر آسانی اور موزونی سے روزگار کا انتخاب کر سکے گا۔

یہ حصہ روزگار ڈھونڈنے کے لیے رہ نمائی کرتا ہے اور انٹرویو
کے دور سے گزرنے کے لیے بھی مشورے دیتا ہے۔ جہاں قابل اور
باصلاحیت افراد بھی نروس ہو کر قیمتی مواقع گنوا دیتے ہیں۔
روزگار ملنے کے بعد عموماً آدمی بے فکر ہو جاتا ہے اور ایک مشین کی
طرح بندھی ٹکی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں فاروقی
صاحب کے مشورے ایک کارکن کو ایک ذمہ دار اور بہتر کارکن بنانے
میں بڑے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش
جاری رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں تعلیم یافتہ
لوگوں کی بے روزگاری دور کرنے کے لیے چند تجاویز دی گئی ہیں۔ اس
کے ساتھ ہی اس اہم موضوع پر مفید اور کارآمد کتابوں کے نام بھی
دیے گئے ہیں۔ جن کا مطالعہ پیشے کے انتخاب اور تلاشِ روزگار
میں کام آسکتا ہے۔

'اسکول سے روزگار تک' کی اہمیت میں سمجھتا ہوں، اس لیے
بھی ہے کہ اُردو میں ایسے اہم ترین موضوع پر کتابیں نہیں ملتیں۔ نفیع الدین
فاروقی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر کتاب
تصنیف کرکے روزی اور روٹی کے مسئلے میں نوجوانوں اور ضرورت
مندوں کی رہ نمائی کی طرف قدم اُٹھایا ہے۔ ایسی کتابوں کی ہمیشہ
پذیرائی کی جانی چاہیے۔ 'اسکول سے روزگار تک' اپنے موضوع، مواد
اور پیش کش ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور اس کے مطالعے کی پُرزور
سفارش کی جاتی ہے۔

کتاب مصنف کے علاوہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی اور اسٹوڈنٹس
بک ہاؤس حیدرآباد سے بھی مل سکتی ہے۔

——— انور کمال حسینی

سازِ رگِ جاں

شاعر: کرشن مُراری - ناشر: پی۔ کے۔ پبلیکیشنز، ۳۰۰۷، ۲
پرتاپ اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ -
قیمت: دس روپے -

کرشن مُراری کا نام اُردو رسائل کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔
پچھلے چند برس میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے جو مختلف رسالوں میں
شائع ہوتا رہا ہے: "سازِ رگِ جاں" ان کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ان کا
منتخب کلام شامل ہے۔

کتاب کا آغاز ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے "حرفے چند" سے
ہوا ہے۔ وہ کرشن مراری کی شاعرانہ شخصیت پر اپنی رائے دیتے
ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ (کرشن مراری) زندگی اور فن دونوں میں سنجیدگی
اور متانت کے قائل ہیں۔ ان کا اخلاقی ارادہ اور عملی کردار ان کے
فنی کردار پر چھایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی زندگی کی طرح ان کے فن
میں بھی لطیف توازن اور تناسب موجود ہے۔ جس طرح اپنی زندگی میں
وہ شرافت کو برتتے ہیں، اسی طرح اپنے فن میں بھی وہ شرافت اور
سنجیدگی کی حدود کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ چاہے وہ حُسن کی رعنائیوں
سے مسحور ہوں یا جنونِ عشق کی ہنگامہ آرائیوں سے متاثر ہوں،
ان کا ذاتی رکھ رکھاؤ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔"

کرشن مراری کی آواز کو اُردو شاعری کی نئی آواز قرار دیتے
ہوئے رام کرشن مضطر رقمطراز ہیں:

"جناب کرشن مُراری کی شاعری ... اس کی معنویت، اس کا
رس، اس کی دلکشی اور اس کا زیر و بم کبھی کبھی خلاؤں میں لے جاتا ہے
اور کبھی موتیوں کی کھوج میں سمندر کی گہرائیوں میں اُتارتا ہے۔ زندگی کے
نشاط و غم، تلخی و شیرینی، امرت اور زہر، روشنی و تیرگی، صبح و
شام، روز و شب، انقلاباتِ زمانہ، تغیراتِ حیات، جستجوئے سکوں
تلاشِ حق، خود شناسی، معرفتِ ذات اور عرفان و آگہی کی کتنی ہی
حالتوں، راہوں اور منزلوں کا پتہ اس آواز سے چلتا ہے۔"

کرشن موہن کہتے ہیں:

"اپنے لسانیاتی اشعار میں شاعر نے ان کیفیات کی بھی عکاسی کی
ہے جنھیں شاید اس کا شرمیلا پن اور رکھ رکھاؤ روزمرّہ کی بات چیت
میں بیان نہ کرنے دیتا۔ یہاں شاعری نے واقعی اس کی گھٹن دور کی
ہے۔ لیکن اس کی شاعری بدن کا درپن ہی نہیں من کا درپن بھی
ہے۔ بدن اور من کی ترجمانی اپنے اپنے ڈھب سے پر لطف دے جاتی ہے۔"

ڈاکٹر یوسف حسین خاں شاعر کی خود ضبطی پر زور دینا چاہتے
ہیں، یعنی شاعر ہیجانی کیفیات سے گزرتے ہوئے بھی ان کے بے محابا
اظہار سے خود کو باز رکھتا ہے۔ رام کرشن مضطر کرشن مُراری کے

فکری تنوع کا ذکر کرتے ہیں اور کرشن موہن شاعری کو ان کی فطری
ضرورت قرار دیتے ہوئے کرشن مراری کے کلام میں داخلیت اور
خارجیت کے متناسب امتزاج کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ
کیا جاسکتا ہے کہ کرشن مراری کا کلام بہت سے قابلِ ذکر اوصاف
سے متصف ہے۔

راقم السطور کو کرشن مراری کے کلام کی جس خوبی نے زیادہ متاثر
کیا وہ ان کا غیر رسمی لہجہ ہے جو عام بات چیت سے بہت قریب ہے۔
ان کے ہاں ہلکے پھلکے مضامین بھی ملتے ہیں لیکن ادق اور گہرے مفاہیم
کو بھی وہ بڑے سیدھے سادے انداز سے ادا کر جاتے ہیں اور ایسا
تبھی ممکن ہوا کرتا ہے جب شاعر لفظ و معنی دونوں کا ادا شناس ہو۔

"سازِ رگِ جاں" میں کرشن مراری کی غزلیں، نظمیں،
قطعات اور دوپدے شامل ہیں اور ان سبھی اصنافِ سخن پر
انھوں نے اپنی دسترس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے ———
لیکن تبصرہ نگار کے نزدیک ان کی فنی صلاحیتوں کا بھرپور
اظہار ان کے دوپدوں میں ہوا ہے۔ دوپدا دوہے کا اُردو مترادف
ہے۔ دوہے کے لیے چونکہ ہندی چھند کی رو سے ایک خاص وزن
مقرر ہے اور کرشن مراری نے اس وزن کی پوری پابندی نہیں
کی ہے اس لیے انھوں نے اپنے دوہوں کو دوپدوں کا نام دے دیا
ہے تاکہ عروضی اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے لیکن ان کے دوپدوں
کا آہنگ اور مزاج وہی ہے جو ہندی دوہوں سے مخصوص سمجھا جاتا
ہے۔ ہاں انھوں نے ہندی کے مشکل الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں
اور اپنے دوپدوں میں ایک ایسا مثبت لسانی تجربہ انجام دیا ہے
جو اُردو اور ہندی زبانوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب لا سکتا
ہے۔ میں یہاں اُن کے چند دوپدے نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتا:

موتی جیسا تن گوری کا ہیرے جیسے نین
جھم جھم کرتا روپ انوپم دکھلائے دن رین

———

ندی کنارے بیٹھی گوری جل میں پاؤں ڈبوئے
من میں پیا کی جوت جلی ہے [illegible]
جلتا دیپ ہے تو گنگا کا، جھمک جل میں آگ
[illegible] چنچل دیکھ راگ

نکھرا نکھرا تن گوری کا انگ انگ پر روپ
شیت کال میں چمکے جیسے بند کلی پر دھوپ

———

چپ چپ کیوں بیٹھی ہے گوری من کا بھید چھپائے
سندر کومل کمل میں جیسے بھنورا بند ہو جائے

———

ان دوہوں میں احساسِ جمال کی جو فراوانی، تشبیہات کا جو
حسن اور زبان و بیان کی جو نرمی اور کوملتا ہے وہ انھیں شاعری
کے اعلیٰ نمونوں میں شامل کیے جانے کی پرزور سفارش کرتی ہے۔
کتاب بہت سلیقے سے چھاپی گئی ہے اور تیمیر سرمست کا بنایا
ہوا سرورق کا ڈیزائن پُرمعنی بھی ہے۔ اور خوبصورت بھی۔

——— ذکاء ارشد

نگاہِ شوق

شاعر: دھرم سروپ۔ ناشر: پی۔ کے۔ پبلیکیشنز، ۴۳/۲،
پرتاپ اسٹریٹ، دریا گنج۔ نئی دلی ۱۱۰۰۰۲۔
قیمت: دس روپے۔

دھرم سروپ، جیسا کہ ان کے تعارف میں لکھا گیا ہے گورنمنٹ
کالج لاہور کے پرانے طالب علم ہیں، جہاں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور
فیض احمد فیض ان کے شناساؤں میں تھے۔ شعر گوئی کا شوق انھیں
اسی زمانے سے ہے لیکن سرکاری ملازمت کی مصروفیت نے انھیں
ایسے مواقع سے کچھ دور دور رکھا جہاں وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں
کو پوری طرح بروئے کار لا سکتے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ
لاوا جو اندر ہی اندر پک رہا تھا، بہہ نکلا اور اس وقت تک چونکہ
شاعر کے خیالات میں پختگی اور جذبات میں ٹھہراؤ آچکا تھا اس
لیے اس بہاؤ کو مناسب سمت و رفتار دینے میں انھیں کوئی دشواری
پیش نہیں آئی۔

نگاہِ شوق سے پہلے دھرم سروپ صاحب کی دو تصانیف
بھی چھپ چکی ہیں۔ "نعرۂ حق" اور "ستائش" [illegible]
[illegible]
[illegible]

ہیں۔ ان کتابوں کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ دھرم سروپ صاحب کے طبعی میلان یعنی ویدانت اور تصوّف سے ان کے افکار کا اندازہ ہو جائے۔ ان کے افکار و خیالات پر عام صوفیانہ تصوّرات اور فلسفۂ ویدانت دونوں ہی کا گہرا اثر ہے اور ان اثرات کے امتزاج سے جو چیز ان کے یہاں نمایاں ہوئی ہے اسے شاید ہم انسان دوستی کی اصطلاح سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ دھرم سروپ انسان کی فطرتِ صحیح پر پورا اعتماد رکھتے ہیں اور اس کی مناسب نشو و نما ہی میں انھیں انسان اور انسانیت دونوں کی نجات نظر آتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے روحانی ارتقا کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی بقا کو مشیتِ ایزدی یا منشائے خداوندی کے سپرد کر دے اور اس اجتماعی انبساط میں گم ہو جائے جو لازوال ہے۔

دھرم سروپ صاحب کی غزلیں ہوں، نظمیں ہوں یا بھجن سب میں ان کا یہی اندازِ فکر کارفرما نظر آئے گا جو انھیں ہمہ وقت معرفتِ حق کے نشے سے سرشار رکھتا ہے۔ ان کا پورا کلام اسی سرشاری میں ڈوبا ہوا ہے اور اس پر کسی منفی تصوّر کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے۔

دھرم سروپ صاحب کے کلام میں کہیں کہیں عروض کی اور زبان و بیان کی لغزشیں نظر آتی ہیں لیکن ان کے کلام میں جو داخلی کیفیت ہے اس سے لطف اندوز ہونے میں یہ مانع نہیں اس لیے انھیں نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔

کتاب اچھے سفید کاغذ پر روشن سیاہی میں چھپی ہے۔ سرورق سادہ مگر خوشنما ہے۔

——— رزاق ارشد

پروازِ غبار

غبار بھٹی کے کلام میں وہ ساری روایتیں اور قدریں موجود ہیں جن پر قدامت کا اثر ہے۔ لیکن یہ روایتیں اور قدریں سنجیدہ فکر سے لبریز ہیں۔ یہی سبب ہے کہ 'پروازِ غبار' کی بیشتر تخلیقات قاری کے ذہن کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہیں۔

غبار صاحب کی نظموں کے موضوعات وہی ہیں جو اقبال کے شعرا کا موضوع رہے ہیں لیکن ان کا اندازِ بیان اگر اچھا نہیں تو یکسر تقلیدی بھی نہیں ہے۔ اس لیے ان کی نظموں میں جاذبیت اور کشش پیدا ہو گئی ہے اور انھیں پڑھتے وقت محض سرسری نگاہ ڈال لینے کے بجائے ذہنی غور و فکر سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی بعض نظموں میں فکری گہرائی بھی ملتی ہے مثلاً "گرد آلود کتبوں کو دیکھ کر" جس میں روایتوں کی بازگشت کو سننے اور "گرد آلود نقوشِ زرّیں" کو تلاش کرنے کی جستجو بار بار ابھرتی ہے۔ بعض نظمیں اس کرب کی عکاس ہیں جس نے آزادی کے فوراً بعد حسّاس ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

روایت کا احترام غبار صاحب کی غزلوں میں بھی رنگ دکھاتا ہے لیکن بیان میں جدّت پیدا کرنے کا رجحان یہاں بھی کارفرما ہے۔ قدم قدم پر ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا تاثر دیرپا ہے:

یہ آئینے تو فریبِ نگاہِ عالم ہیں
خدا کے واسطے آئینہ گر تلاش کرو

زنداں سے تو وحشی نکلے ہیں پر سوچ رہے ہیں جائیں کدھر
وہ عہدِ جنوں کے ویرانے کچھ یاد رہے کچھ بھول گئے

مانعِ ذوقِ سفر ہو نہ سکے پست و فراز
ایک ہی جذبۂ رفتار سے ہم گزرے ہیں

پرانے راستوں کے چلنے والے تھک کے بیٹھے ہیں
نئے رہرو کی ہمّت کو بڑھاتی ہیں نئی راہیں

غبار صاحب کا تعلق ایسے مکتبِ شاعری سے رہا ہے جس میں فنِ عروض اور "قواعدِ شاعری" کی پابندیوں کو لازمی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ 'پروازِ غبار' میں ایسے مقام بھی نظر آتے ہیں جہاں بعض عروضی اور فنی پابندیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مندرجۂ ذیل مصرعوں کے کچھ حصّے بھی محلِّ نظر ہیں:

ایثارِ وطن کے دیوانے، کچھ یاد رہے کچھ بھول گئے

[illegible] سے ہم گزرے ہیں

خود اس کو ہیں اپنے دیوانے کچھ یاد رہے کچھ بھول گئے

بزمِ احباب

ستمبر ۷۶ء کے "تحریک" میں فرید احمد برکاتی صاحب کے جواب الجواب کے بارے میں) میں پوری کوشش کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کی اشاعت کا مقصد کیا ہے! کیونکہ ان کا یہ مراسلہ جتنا طویل ہے اتنا ہی بے معنی ہے۔ فرید صاحب کو نہ مستند حوالے قابلِ قبول ہیں اور نہ معقول دلائل۔ میرے بعض واضح بیانات ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ میرے حوالوں سے نہ تو کوئی نئی چیز ثابت ہوتی ہے اور نہ بحث میں کوئی نیا گوشہ سامنے آتا ہے بلکہ انھیں کے اعتراضات کی تائید ہوتی ہے۔ میں ان کی عبارت تو نقل کرتا ہوں لیکن صرف مفیدِ مطلب جملوں کو لے لیتا ہوں۔ اب اسے کیا کہیے کہ وہ میرے نقل کردہ حوالوں اور مثالوں کے سلسلے میں خواہ مخواہ شبہات پیدا کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی دانست میں کسی حوالے سے کوئی پہلو خارجِ قیاس کرکے اس پر اپنی تاویلات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ میرے سیدھے سادے طرزِ استدلال پر برافروختگی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ان سب باتوں پر مستزاد عربی مرغے کی ایک ٹانگ عربی قواعد کا بے جا اطلاق، جس پر اب خیر سے فارسی قواعد کا بھی خفیف سا اضافہ کیا گیا ہے۔ کچھ وقتی ان کو اس قطع و برید سے بھی مل جاتا ہے جو ادارہ میری تحریر میں کسی مصلحت کی وجہ سے روا رکھتا ہے[٭] عجلت پسند معترضین اور بنی بات کی پچ کرنے والوں کے ان حربوں سے اہلِ نظر خوب واقف ہیں۔

لیکن وقتی طور پر کچھ غلط فہمیاں تو پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔

(۱) بدل ما یتحمل کے باب میں فرید صاحب نے اب یہ گنجائش قیاس کی ہے کہ لغت نگاروں نے ما یتحمل کے علیحدہ معنی نہیں لکھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "بدل ما یتحمل ایک طبی اصطلاح ہے اس لیے بدل کو ما یتحمل سے علیحدہ نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔۔۔ اس فک اصطلاح کی غلطی کو دو طرح ثابت کیا تھا۔۔۔ شمیم صاحب کو لغت نگاروں کے یہاں صرف ما یتحمل کے معنی نظر آئے یا خود انھیں نے بدل کو علیحدہ رکھ کر معانی سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ لغت نگاروں نے [illegible] صاحب اور رشید صاحب کی طرح بدل کو ما یتحمل سے الگ کرنے کی غلطی نہیں کی ہے اور اس سے میرے ہی دعوے کی تائید ہوتی ہے۔"

سوال یہ ہے کہ فرید صاحب اس قسم کی بے سر و پا قیاس آرائی کے بجائے مستند لغات سے رجوع کیوں نہیں کرتے۔ ایک نہیں کئی لغات میں ما یتحمل اور بدل ما یتحمل کے معانی الگ الگ دیے گئے ہیں۔ وہ میری درج کی ہوئی طبی تعریفوں سے تو متفق ہیں لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ غذا یا خوراک سے دونوں کا تعلق بالواسطہ کیوں ہے۔ چونکہ میری عبارت بالکل واضح ہے اس لیے میں یہی گزارش کروں گا کہ وہ اسے دوبارہ ملاحظہ فرمائیں یا پھر کسی استادِ فن سے رجوع کریں جو انھیں یہ بتا سکے کہ ما یتحمل بھی طبی اصطلاح ہے اور [illegible]

٭ آپ کے خطوط سے صرف وہی جملے حذف کیے گئے جن کا زیرِ بحث باتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا اور ان میں معترض پر طنز و تشنیع کا پہلو تھا۔ اس طرح کے [illegible] برکاتی صاحب کے جوابی مراسلوں میں [illegible] تو وہ بھی حذف کر دیے گئے۔ اب یہ بحث لاحاصل ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لیے اس [illegible] کی اشاعت کا سلسلہ بند کیا جاتا ہے [illegible] (ادارہ)

ماتحلل کی طرح اس کا بالواسطہ تعلق بھی خوراک سے ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب کے اندراجات میں غذا اور خوراک کے الفاظ دیکھتے ہوئے فرید صاحب کا یہ جملہ نہایت مضحکہ خیز ہے کہ "بدن میں ایندھن کے طور پر کوئلہ یا لکڑی نہیں جھونکی جاتی بلکہ غذا داخل کی جاتی ہے اور یہی غذا تحلیل شدہ اجزا کا بدل بنتی ہے۔" موصوف کو غور کرنا چاہیے کہ تحلیل شدہ اجزا کہاں سے آتے ہیں اور ان کی اصل کیا ہوتی ہے۔

(۲) مضمون میں فرید صاحب کو انکار تھا کہ نہیب کے معنی "ڈراؤنی آواز اور نعرہ" کے نہیں ہیں۔ اس کے بعد میرے پہلے مراسلے کے جواب میں انھوں نے یہ پہلو اختیار کیا کہ خوف و دہشت کے معنی کہیں نہیں ملیں گے۔ میرے سند پیش کرنے پر اب انھیں دونوں معانی تسلیم کرنے پڑے ہیں۔ اس سلسلے میں خود ان کا عرفی کے شعر سے مثال (نہیب دادن) پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں لیکن وہ اس کا منطقی نتیجہ (یعنی یہ لفظ انھیں دو معانی میں مستعمل ہے) قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ اب یہ کہتے ہیں کہ "غارت کردن کا مفہوم زیادہ صحیح، انسب اور راجح ہے۔"

صاحبِ نور اللغات نے خوف و دہشت کے معنی میں اوج کا جو شعر درج کیا ہے، اس کے متعلق فرید صاحب رقم طراز ہیں کہ "نہیب جاہ و جلال اگر ترکیب ہے اور نہیب کے بعد واو عطف نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے معنی جاہ و جلال کا خوف، ڈر، دہشت ہوں گے اور کوئی اچھا معنی خیز مفہوم برآمد نہیں ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر جاہ و جلال کو استعارۃً نہیب (بفتحِ اول) مان کر غارت کر دیا جائے تو شعر میں معنویت اور شعریت بہت بڑھ جائے گی۔" گویا ہر ترکیب کی صحت کے بارے میں بلا وجہ شبہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور معنویت اور شعریت بڑھانے کے لیے اس کے معنی اور محلِ استعمال کو مسخ کیا جا سکتا ہے:

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

[illegible] اور اردو میں جن معنوں میں نہیب کا لفظ استعمال ہوا ہے اگر وہ "عربی کی مستند اور عام مطوّل و مختصر فرہنگوں" میں نہیں ملتے تو اس سے ہمیں کچھ غرض نہیں کیونکہ اردو کلام زیرِ بحث ہے اور اس کی مطابقت فارسی استعمال سے کی جاتی ہے۔ عربی اور فارسی کے پچیسوں الفاظ اردو میں مختلف تلفظ اور معانی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور ہماری معیاری زبان کا حصہ ہیں۔ نقش کالحجر کی ترکیب غلط ہے تو ہوا کرے، اردو میں اسی طرح رائج ہے۔

(۳) پہلے تو فرید صاحب یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ حسود حاسد کی جمع بھی ہے۔ میں نے غیاث اللغات، فرہنگ آنند راج اور نور اللغات سے سند پیش کی تو اب انھوں نے کثیر الاستعمال جمعوں کی بات کی ہے۔ ان کے لیے یہ بھی مشکل نہ تھا کہ عربی قواعد کا سبق سنا کر وہ ان لغت نگاروں کو بیک جنبشِ قلم رد کر دیتے۔ معانی لکھنے میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھنے کا یہ مطلب کیوں کر ہو سکتا ہے کہ کسی مؤلف سے کہیں بھی کوئی سہو یا فروگذاشت نہیں ہو سکتی یا اس پر منصفانہ انداز میں تنقید نہیں کی جا سکتی۔ جمع اور واحد کی "بحث برائے بحث" سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس سے فرید صاحب کی غیر علمی ادعائیت اور قطعیت بے نقاب ہو گئی ہے۔ وہ مؤلف کو تو کسی قسم کی چھوٹ دینے کو تیار نہیں ہیں لیکن فلزات کے واحد فلز پر اعتراض کرنے میں ان سے جو فاش غلطی ہوئی تھی اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھیں فِلذہ کی بنا پر "مغالطہ" ہوا تھا۔ کہاں فلزات اور کہاں فِلذہ۔ کم از کم معترض کو تو کچھ سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ تعجب ہے کہ انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے باوجود اس بے جا اعتراض کے لیے معذرت نہیں کی۔

(۴) موکب اجلال کی ترکیب کے بارے میں فرید صاحب نے یہ تو سمجھ لیا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ "جلو میں خدام بھی ہوں گے گویا شاہی سواری کا انداز ہوگا۔" موکب یعنی سپاہ و لشکر کے لیے اگر وہ کچھ اور لغات ملاحظہ فرمالیں تو بڑا کرم ہوگا۔ رہ گیا ان کا یہ کہنا کہ موکب اجلال کو میں نے ترکیب اضافت قرار دیا ہے جبکہ [illegible]

اُن کے ؟" فارسی قواعد کی رو سے اس قسم کی ترکیب کو اضافت مجازی کہا جاتا ہے۔" تو اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ تمثیلی، تخصیصی، توضیحی، تشبیہی، مجازی اور ظرفی وغیرہ اضافت ہی کی قسمیں ہیں۔ عربی لفظ غضوا کے سلسلے میں فریدصاحب نے غالباً اپنا اعتراض کی بے حقیقتی محسوس کرلی ہے کیونکہ انھوں نے نہ تو میری رائے سے اختلاف کیا ہے اور نہ مجھ سے کوئی لغوی حوالہ طلب کیا ہے۔

——— مختار شمیم، اندور

بقیہ : عرب اتحاد میں

انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ مارکسزم کے بارے میں اگرچہ ان کے خیالات تبدیل نہیں ہوئے لیکن "اب ہمارے سامنے ایک تیسرا نظریہ ہے جو باقی نظریوں پر بھاری ہے۔ نئی بات صرف یہ ہوئی ہے کہ مجھے محسوس ہوگیا ہے کہ سوویٹ یونین عربوں کا اور لیبیا کا دوست ہے۔"

سوویٹ روس عرب ممالک کا دوست ہو یا نہ ہو لیکن لیبیا کی وہ سرگرم پشت پناہی ضرور کر رہا ہے اور ظاہر ہے کہ سوویٹ یونین اس قسم کے کام بےغرضی سے نہیں کرتا۔ کوسی گن کے دورے کے وقت لیبیا اور سوویٹ یونین میں ثقافتی اور ٹیکنکی تعاون کے معاہدے ہوئے جن میں اٹیمک انرجی کا پروٹوکول بھی شامل ہے۔ اس معاہدے کا اعلان ماسکو ریڈیو نے ۳۰ مئی ۷۵ء کو کیا۔ لیبیا کے وزیر اعظم عبدالسلام جالوت جب ماسکو گئے تو ایک بیان کے مطابق ہتھیاروں کی سپلائی کا معاہدہ بھی ہوا۔ مصری اخبار الاہرام نے ۱۳ مئی ۱۹۷۵ کے شمارے میں یہ اطلاع شائع کی تھی کہ لیبیا میں کوسی گن کی موجودگی کے وقت دونوں ملکوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق سوویٹ یونین لیبیا کو [illegible] فوجی ساز و سامان دینے کا وعدہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ٹینکوں اور میزائلوں کے استعمال کی تربیت دینے کے لیے روسی ماہرین کے بھیجنے کا وعدہ بھی کیا۔ صدر سادات نے ۲۸ مئی کے "لاس اینجلز" کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ روس اور لیبیا میں ہتھیاروں کے لین دین کا جو معاہدہ ہوا ہے، اس کی نظیر مشرق وسطیٰ کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ روس لیبیا کو ۱۲ ہزار ملین ڈالر کے ہتھیار دے گا جن میں پیچیدہ قسم کے ہتھیار بھی شامل ہیں۔ روس لیبیا کو ایسے ٹینک اور ہوائی جہاز مہیا کرے گا جو اس نے نہ تو مصر کو دیے ہیں اور نہ شام کو۔ روس اور لیبیا کے معاہدے کے نتیجے میں آئندہ پچاس برس تک بحر روم کے جنوبی ساحل پر سوویٹ یونین کی موجودگی یقینی ہوگئی ہے اور بیس پچیس برس تک روسی ماہرین بھی لیبیا میں رہیں گے۔

قذافی کا دعویٰ ہے کہ لیبیا میں اب ہزاروں ٹینک، سینکڑوں ہوائی جہاز اور لاکھوں ٹن وزنی فوجی ساز و سامان موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فوجی ساز و سامان آخر کس مقصد کے لیے اکٹھا کیا جارہا ہے؟ سابقہ واقعات کافی تشویش پیدا کرتے ہیں۔ الجیریا کو چھوڑ کر لیبیا کے سبھی پڑوسی عرب ممالک کو بیرونی اور داخلی حملوں کا تجربہ ہوا ہے اور ان کے بارے میں کہا یہی جاتا رہا ہے کہ ان کی پشت پر لیبیا تھا۔ تیونس نے لیبیا پر الزام لگایا ہے کہ وہ اس کے ممتاز سیاسی راہ نماؤں پر قاتلانہ حملے کرنے کے لیے دستے بھیج رہا ہے۔ مصر نے اغوا اور قتل دونوں کے الزام لگائے ہیں۔ سوڈان کا کہنا ہے کہ جولائی ۷۶ء میں صدر نمیری کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے جو حملہ ہوا تھا اس کی پشت پر لیبیا تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو تربیت بھی دی اور روپیہ اور ہتھیار بھی۔ سوڈان کا بیان ہے کہ لیبیا کی قیادت کی مجنونانہ آرزوئیں سوویٹ مقاصد سے ہم آہنگ ہوگئی ہیں جو اس خطے میں پھر سے اپنا عمل دخل چاہتا ہے۔ یہ بیان صدر نمیری نے سوڈان نیوز ایجنسی کو ۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء کو دیا تھا۔

دو بچے
پیٹ بھر کھائیں

چار ہوں
بھوکے رہ جائیں

بہتر زندگی کے لئے
اپنے کنبے کو
چھوٹا رکھئے

دو سانحے

پچھلے دنوں اُردو کے دو بزرگ شاعر انتقال کر گئے ——

جانشین بیخود استاد رسا دہلوی، دلّی کی قدیم ٹکسالی زبان کے آخری شاعر تھے اور اپنی وضع قطع سے بھی دلّی کے پُرانے کلچر کا نمونہ تھے۔ ۸ر اکتوبر کو ان کا بعارضۂ سرطان انتقال ہوا۔ بعد مغرب ان کا جنازہ اُٹھا اور جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے نیچے مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ استاد نے وصیت کی تھی کہ ان کا جنازہ جامع مسجد میں نہ لے جایا جائے اور انتقال سے تین دن پہلے وہ خود مولانا یوسف سے نماز پڑھانے کو کہہ آئے تھے۔ ان کی تدفین دلّی دروازے کے باہر جدید قبرستان میں عمل میں آئی۔

استاد رسا اپنے ایامِ جوانی میں فٹ بال کے بھی اچھے اور مشہور کھلاڑی رہے تھے۔ بیخود صاحب کے انتقال کے بعد اپنے مرحوم استاد کی یاد میں انھوں نے ایک سالانہ مشاعرے کی طرح ڈالی اور کئی سال تک باقاعدگی سے یہ مشاعرہ منعقد کرتے رہے۔ جامع مسجد کے دو تین چائے خانے استاد کی مستقل نشست گاہ تھے، شام ہوتے ہی وہ ان میں سے کسی چائے خانے میں آ بیٹھتے اور ان کے گرد ایک محفل سی جم جاتی جو رات گئے تک جمی رہتی۔

۱۱ر اکتوبر کو بمبئی میں جناب صوفی بانکوٹی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۵۵ برس تھی۔

صوفی صاحب کوکن کے محترم شاعروں میں تھے۔ انھیں [illegible] احسنی صاحب سے نسبتِ تلمذ حاصل تھی اور وہ رسالہ "احسن" [illegible] مجلسِ ادارت میں بھی شریک رہے تھے۔

صوفی صاحب ان دنوں اپنے وطنِ مالوف بانکوٹ ہی میں مقیم تھے، وہیں ان پر دل کا دورہ پڑا اور علاج کے لیے انھیں بمبئی لے جایا گیا۔ اسپتال میں انھیں آکسیجن دی جا رہی تھی اور سینے میں پیس میکر بھی لگا دیا گیا تھا مگر مرض کا حملہ شدید تھا اور اس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ ہم صوفی صاحب کے صاحبزادے اُردو کے مشہور نوجوان شاعر بدیع الزماں خاور صاحب اور دوسرے پس ماندگان کے غم میں شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔ (ادارہ)

بقیہ: تبصرے

کہاں وہ درد و تڑپ نالۂ ہزار میں ہے

ان کے سر [illegible] ہے دُنیا گزر گئی

حوادثات کے جھٹکوں کا اک تسلسل ہے

پھوارِ غبار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی کتابت خود [illegible] سے عقیل صاحب نے کی ہے۔ ٹائٹل [illegible] [illegible] سکندر علی وجد [illegible] صورت میں پیش کیا ہے۔ بہر حال اس طرح کتاب کی خوب صورتی میں اضافہ ہوا ہے۔ ۲۵۶ صفحات کے اس مجموعے کی قیمت دس رُوپے ہے۔ [illegible] سرورق [illegible] نے بنایا ہے جو جاذبِ نظر ہے۔

بحرِ ہند کو خطۂ امن بنانے کا مسئلہ

کو جوڑتے وقت ان کی پڑتال کرنے کے لیے الیکٹرانک سازو سامان" پر مشتمل تھا۔ آخر میں یہ صحافی اسی نتیجے پر پہنچا کہ :

"اس پورے دورے میں . . . کلیدی مسئلہ یہی رہا کہ ان جرنلسٹوں کو اس میں سے کچھ بھی نہیں دکھایا گیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔"

جرنلسٹوں کی اس ٹولی کا اندازہ ہے کہ بار برا میں لگ بھگ ایک ہزار روسی موجود ہیں۔

سوویٹ یونین کے بلند بانگ دعووں اور اصل کارگزاری کے اس تضاد کی وجہ سے اس نام نہاد بین الاقوامی کانفرنس کا اہتمام کرنے والے بڑی دشواریوں سے دوچار ہوں گے۔ اپنی نیک نیتی اور صدق دل کا یقین وہ اپنے آپ کو چھوڑ کر کسی اور کو مشکل سے ہی دلا سکیں گے۔

Regd No. D (D) 118 Phone : 271649 November 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK

THE
TAHREEK

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

شمارہ : ۹ جلد : ۲۴

دسمبر ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر :

گوپال متل — مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر

گوپال متل

مطبع : [illegible] دہلی -

مقام اشاعت ۹ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات :

ہندوستانی سوشلزم اور سوویٹ کمیونزم

گوپال متل

کمیونسٹ، کانگریسی لیڈروں سے اس بنا پر کافی برہم ہیں کہ وہ ہندوستانی سوشلزم اور سائنٹفک سوشلزم کے درمیان جو سوویٹ کمیونزم کا دوسرا نام ہے، واضح خطِ امتیاز کھینچنے لگے ہیں "نیو ایج" سنجے گاندھی سے تو خاص طور پر برہم ہے کیونکہ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہہ دیا تھا کہ "سوشلسٹ ملکوں میں عدم مساوات زیادہ نمایاں ہے۔ تنخواہوں کا فرق ایک سے بیس تک ہے اور پارٹی کے لیڈر اپنی آمدنیوں کا انکشاف نہیں کرتے"

"نیو ایج" سوویٹ روس کے معاملات کو سوویٹ روس کی مہیا کردہ عینک ہی سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اگر وہ یہ عینک اُتار کر وہاں کے حقائق پر نظر ڈالنے کی کوشش کرے تو اُسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسٹر سنجے گاندھی نے مبالغے سے کام لینا تو کجا حقیقت کو پوری طرح بیان بھی نہیں کیا۔ کریملن کے قریب ہی دو سلسلہ ہائے عمارات کو چھوڑ کر گرانووسکی اسٹریٹ ہے یہاں ایک عمارت پر لکھا ہوا ہے "پاسوں کا بیورو" یہاں کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ستاف اور ان کے اہل و عیال کو ہی پاس ملتے ہیں اور جب وہ بیورو سے باہر نکلتے ہیں تو ان کے پاس بڑے بڑے لفافے اور پیکٹ ہوتے ہیں جنہیں لے کر وہ شاندار گاڑیوں میں، جن کو ڈرائیور چلاتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس عمارت کے آگے یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہاں کسی کو گاڑی کھڑی کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن شوفر وہاں بڑے اطمینان سے گاڑیاں کھڑی کیے مالکوں کے منتظر ہوتے ہیں۔ ملک میں کتنی ہی قلت ہو لیکن کیمونسٹ اشرافیہ کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اس عمارت میں جس پر پہرہ دار پولیس کے لیے صرف پاسوں کا بیورو لکھا ہوا ہے، ہر چیز دستیاب ہو جاتی ہے۔ بعض اسٹور سوویٹ اشرافیہ کو غیر ملکی اشیا بھی مہیا کرتے ہیں۔ مثلاً اسکاچ وسکی، امریکی سگریٹ، برآمد شدہ چاکلیٹ، اٹلی کی ٹائیاں، برطانیہ کے اونی کپڑے، فرانس کے عطر اور جاپان کے ٹیپ ریکارڈر۔ اشرافیہ کو پکے پکائے گرم کھانے بھی بند ڈبوں میں مہیا کیے جاتے ہیں۔ یہ کھانے اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ عام لوگ ایک مخصوص طعام گھر میں صرف اس لیے پہنچ جاتے ہیں کہ وہاں اشرافیہ کو مہیا کردہ خوراک کی جھوٹن مل جاتی ہے۔

کیمونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کے لیڈروں، پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے ممبروں، کیبنٹ منسٹروں اور سپریم سوویٹ کو چلانے والے ایگزیکٹیو گروپ کو کریملن راشن ملتا ہے۔ کریملن راشن سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں اور ان کے پورے خاندان کو مہینہ بھر کے لیے خوب شاہانہ خوراک ملتی ہے۔ حالانکہ ایک عام شہری خاندان کو، جو چار افراد پر مشتمل ہو، اپنی خوراک پر ۱۸۰ روبل سے ۲۰۰ روبل تک خرچ کرنے پڑتے ہیں، جو اس خاندان کی نصف آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔

مرکزی کمیٹی کے ایک سابق افسر نے برطانوی تحریرے "سروے" میں لکھا تھا کہ پارٹی کے اعلیٰ لیڈروں کے لیے دو قسم کے راشن کارڈ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی قیمت ۳۲ روبل ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن کی قیمت ۱۶ روبل۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ اس سے ان کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ انھیں کرنسی کی قیمت کے مطابق نہیں بلکہ اس کے متراعف سونے کی قیمت کے مطابق جتنا کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی قیمت پندرہ سے بیس گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں کو ۴۰۰ ڈالر سے ۸۰۰ ڈالر تک کی اشیا ہر ماہ مفت مل جاتی ہیں۔

سوویٹ یونین میں کسی کی مقررہ تنخواہ سے اس کی حقیقی آمدنی یا اس کی مالی حیثیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ بریژنیف کی تنخواہ صرف ۹۰۰ روبل ماہانہ بتائی جاتی ہے لیکن اس کے علاوہ درپردہ طور پر جو سہولتیں اُسے ملتی ہیں ان کا اندازہ لگانا ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہی بات باقی کمیونسٹ اشرافیا کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ انھیں کچھ ایسی سہولتیں ملتی ہیں جنھیں سوویٹ روس میں پیسے سے کھلے بازار میں خریدا نہیں جا سکتا بلکہ بڑے بڑے افسروں کو ان کی تنخواہوں کے علاوہ ایسی تنخواہیں بھی دی جاتی ہیں جن کا انکشاف نہیں کیا جاتا۔

عام ضروریات کی چیزیں بھی چھوٹے بڑوں کو یکساں طور پر دستیاب نہیں۔ ایک روسی لڑکی نے جب اپنی ماں سے پوچھا کہ امیر اور غریب میں کیا فرق ہے تو اس نے جواب دیا "امیر آدمی سال بھر ٹماٹر کھا سکتے ہیں، ہمیں صرف گرمیوں میں ملتا ہے"۔

ایک عام مزدور غیر معمولی کارنامہ انجام دے کر بھی اپنی معمولی سے معمولی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کے "پراودا" کے مطابق آئیون کوزچ کو ایک موٹر سائیکل کی سخت ضرورت تھی۔ وہ بریچول کے ایک دور افتادہ گاؤں میں رہتا تھا جہاں اس قسم کی چیزیں دستیاب نہیں۔ خواہ اس پر کوئی اپنی نصف سال کی تنخواہ صرف کرنے پر آمادہ ہو۔ یکایک اس نے ایک مقامی اخبار میں پڑھا کہ جو شخص بھی ریاست کو اپنی گائے کا ۲۰۰۰ کلوگرام دودھ فروخت کرے گا اسے سال بھر کے بعد یہ سرٹیفیکیٹ مل جائے گا کہ وہ کار یا موٹر سائیکل خرید سکتا ہے۔ آئیون نے معاہدے پر دستخط کر دیے کہ وہ مقامی سوویٹ کو ۲۴۰۰ کلوگرام دودھ مہیا کرے گا اور سال کے خاتمے پر تو اس نے اور اس کی گائے نے کمال کر دیا۔ یعنی اس نے مقامی سوویٹ کو ۲۶۷۰ کلوگرام دودھ مہیا کیا تھا جو اس علاقے کے زمانے میں واقعی کارنامہ تھا۔ لیکن جب وہ موٹر سائیکل کی خریداری کا سرٹیفیکیٹ لینے گیا تو ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبروں نے اس کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا اور کندھے سکوڑ لیے۔ برافروختہ آئیون نے اپیل کی لیکن اسے جواب ملا کہ مقامی کمیٹی نے جو فیصلہ کیا تھا اُسے صوبائی ایگزیکیٹو کمیٹی نے رد کر دیا تھا۔ اس طرح سال بھر کی محنتِ شاقہ کے باوجود آئیون ابھی تک موٹر سائیکل سے محروم ہے۔

پیداوار بڑھانے میں بھی سائنٹیفک سوشلسٹ منصوبہ بندی ناکام رہی ہے۔ سوویٹ وزرا کی کونسل کی مہیا کردہ اطلاعات کے مطابق ۱۹۷۶ء کے پہلے نو مہینوں میں جس طرح ریاستی صنعتی منصوبے کی تکمیل ہوئی ہے اس سے گزشتہ ماہ کی ناقص فصل کے نتیجے سوویٹ عوام بڑی ہی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ گوشت کی بہم رسانی میں اکیس فیصدی کمی ہوئی ہے اور مکھن کی بہم رسانی میں دس فیصدی۔ یہ اطلاع ۴ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کے "پراودا" میں شایع ہوئی ہے۔

اب اگر ہندوستانی رہنما سوویٹ کمیونزم کو ہدایت کا سرچشمہ ماننے سے انکار کر دیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ اس پر "نیو ایج" کو تو بری ہو گی لیکن عام ہندوستانی خوش ہوں گے کہ ہندوستانی رہنما تجربے سے سیکھ رہے ہیں اور کسی ناقابلِ عمل اقتصادی نظریے کو اپنانے پر بضد نہیں۔

ادب میں تعصب — حقیقت یا واہمہ

گوپال متل

نومبر ۱۹۸۷ء کے "آج کل" میں عرش ملسیانی کا مضمون "باقیاتِ جوش ملسیانی" شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون مجموعی طور پر بھی معلومات افروز ہے لیکن اس کے درجِ ذیل پارے کی طرف ہم قارئین "تحریک" کو بہ طور خاص متوجہ کرنا چاہتے ہیں:

"میرے تمام استاد بھائی میرے ساتھ ہمیشہ مخلصانہ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ تنگ دلی کا برتاؤ کسی نے کبھی میرے ساتھ نہیں کیا۔ ابھیندن گرنتھ میں بھی اس کے بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ میں وقعت دیتا ہوں تو مشاہیر کے اظہار رائے کو ـــــــ جن میں استاد بھائیوں کے علاوہ دوسرے نکتہ شناس اساتذہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً دل شاہ جہانپوری۔ کیفی دہلوی، اثر لکھنوی، سالک بٹالوی، حفیظ جالندھری، مولانا غلام رسول مہر، سکندر علی وجد وغیرہ استاد بھائیوں کی رائے بھی ابھینندن گرنتھ میں مل سکتی ہے۔ مثلاً نوح ناروی، ناطق گلاؤٹھی، نواب سائل، بیخود دہلوی وغیرہ ان سب اصحاب کا ہم صحبت بھی بارہا رہا ہوں۔

مجھے میتنہ تنگ دلی کی شکایت کبھی نہیں ہوئی۔ بعض مسلمان اہل قلم نے اس کی یہ وجہ بھی بتائی ہے کہ جب کلام فن اور زبان کے معیار پر پورا اترے تو تنگ دلی بلاشبہ قابلِ ملامت ہے مگر یہ وصف نہ ہو اور پھر بھی تنگ دلی کی شکایت کی جائے تو یہ ادبی عصبیت [illegible] خود تنگ دلی ہے۔ اتنا تجربہ تو مجھے ذاتی طور پر بھی ہے کہ بعض اصحاب زباں [illegible] اور پختہ گوئی کے معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود تنگ دلی کے شاکی پائے جاتے ہیں ان کی باتیں سنتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں۔"

جوش ملسیانی صاحب کی یہ تحریر ان ہندو شاعروں اور ادیبوں کے منہ پر ایک چپت ہے جو اپنی کم سوادی کی پردہ پوشی کے لیے اپنے ہمعصروں کے تعصب کی دہائی دیتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی دہائی دینے والوں میں ایسے ہندو ادیب بھی شامل ہیں جنہیں اردو کی بدولت اتنا کچھ ملا ہے، جتنا کسی اور زبان میں نہ ملتا۔

کرشن موہن

غزل

دُوئی کا نقش فنا ہو تو لطف آجائے — انا میں رنگِ غنا ہو تو لطف آجائے

ہمارے جذبِ دروں کے لیے دلِ دوراں — تمام مدح و ثنا ہو تو لطف آجائے

اُمنگ سنگ رہے، زندگی میں رنگ رہے — زمانہ دوست بنا ہو تو لطف آجائے

شبِ وصال بہ رعبِ جمال، کافر کا — انا میں سینہ تنا ہو تو لطف آجائے

ملن کی شام، بدن جام کام وِش ہو تمام — وہ روٹھ کر جو مَنا ہو تو لطف آجائے

غرورِ حُسن مرے شوخِ فتنہ ساماں کا — فنا نہ ہو، جو فنا ہو تو لطف آجائے

کڑا سفر ہے، کڑی دھوپ ہے، اُمنگوں کی — کہیں جو سایہ گھنا ہو تو لطف آجائے

کسی بھی دیش میں دھرتی نے رنج و غم سہہ کر — جو کوئی ویر جنا ہو تو لطف آجائے

خرد کا گھور اندھیرا ہے، مَن کی چلمن میں — جنوں کا نُور چھنا ہو تو لطف آجائے

جنوں طراز کوئی شعر کرشن موہن کا
فسونِ راز بنا ہو تو لطف آجائے

غزلیں

محمد علوی

سایا سایا راہ میں بکھرا ہوا
ایک چہرا جا بجا بنتا ہوا
دور تک ہے کارسی اک دوپہر
اک پرندہ بے سبب اُڑتا ہوا
سوچتے ہیں رک ہی جائے گا کہیں
آخری لمحہ، قریب آتا ہوا
دھڑکنوں سے کچھ پتہ چلتا نہیں
کون ہے دل میں سفر کرتا ہوا
رات پھر میں اپنے بستر میں نہ تھا
تھا اندھیروں میں کہیں گرتا ہوا
آگے کیا ہوگا ہمیں معلوم ہے
دیکھتے ہیں خواب پھر دیکھا ہوا
پھر طبیعت میں روانی آ گئی
مل گیا علوی غزل کہتا ہوا

آگ پانی سے ڈرتا ہوا میں ہی تھا
چاند کی سیر کرتا ہوا میں ہی تھا
سر اٹھائے کھڑا تھا پہاڑوں پہ میں
پتی پتی بکھرتا ہوا میں ہی تھا
میں ہی تھا اس طرف زخم کھایا ہوا
اس طرف وار کرتا ہوا میں ہی تھا
صبح جاگ اٹھا تھا موت کی نیند سے
رات آئی تو مرتا ہوا میں ہی تھا
میں ہی تھا منزلوں پہ پڑا ہانپتا
راستوں میں ٹھہرتا ہوا میں ہی تھا
مجھ سے پوچھے کوئی ڈوبنے کا مزا
پانیوں میں اترتا ہوا میں ہی تھا
میں ہی تھا علوی کمرے میں سویا ہوا
اور گلی سے گزرتا ہوا میں ہی تھا

بانی

شفق شجر موسموں کے زیور نئے نئے سے
دعاؤں کی اوس چنتے منظر نئے نئے سے

نمک نشیلی گداز فصلیں نئی نئی سی
افق پرندے گلاب بستر نئے نئے سے

خلا خلا بازوؤں کو بھرتی نئی ہوائیں
سفر محمل بادباں سمندر نئے نئے سے

یہ دن ڈھلے اُس کا منتظر میں نیا نیا سا
یہ پھیلتے خواب میرے اندر نئے نئے سے

خنک ہوا شام کی کہانی نئی نئی سی
پرانے غم پھر محبتوں بھر نئے نئے سے

۱۳۔ پارس باغ، کوچہ بیب۔ احمد آباد ● ۲/۴۸ راجندر نگر، نئی دہلی

غزلیں

مصور سبزواری

(مشکور آپا کے نام)

کھنڈر کی طرح سے وہ دھیرے دھیرے ڈھہتا تھا
یہ حادثہ تو ضروری ہے دل نہ کہتا تھا
سمیٹ لو کوئی کرچی پڑی جو مل جائے
وہ عکس ٹوٹے ہوئے آئنوں میں رہتا تھا
میں اُس گلی کا مسافر تھا پر خبر نہ ہوئی
کہ کھڑکی کھڑکی کوئی سرخ چاند گہتا تھا
یہ کیسی کھوکھلی چاہت کی دھول اُڑنے لگی
تری رگوں سے تو میرا ہی خون بہتا تھا
جو گرتا جسم سنبھالے رہا تھا ہم سب کو
وہ شیشہ تھا جو چٹانوں کا بوجھ سہتا تھا
میں تیری قبر کی مٹی بھی نم نہ کر پایا
تو اپنے ہونٹوں سے میرا ہی درد کہتا تھا
تمام شہر مصور تھا خواب کی بستی
مرے ہی کانوں میں چیخوں کا سیسہ بہتا تھا

ممتاز راشد

شکستہ لمحوں کا تو زیست کو حساب نہ دے
ہوا کے ہاتھ میں بکھری ہوئی کتاب نہ دے
گزر نہ دل کے بیاباں سے ابر کی صورت
سکوتِ دشت کو موجوں کا اضطراب نہ دے
میں زندگی کی صدا، آگہی ہوں شبنم بھی
مرے دکھوں کو سمجھ یوں مجھے جواب نہ دے
مری حیات کا حاصل ہیں زرد زرد پتے
خزاں کا نقش ہوں تو مجھ کو آب و تاب نہ دے
ترے وجود سے باہر بھی ایک دنیا ہے
یوں اپنے آپ کو تنہائی کا عذاب نہ دے
نہ چھپ سکیں گی صداقت کی تلخیاں راشد
برہنہ شکل کو الفاظ کی نقاب نہ دے

قمر اقبال

اب کسی سے بھی کسی کا نہیں رشتہ شاید
چند لمحوں کی ہے مہمان یہ دنیا شاید
لاؤں ماضی کو گواہی کے لیے اب کیسے
آئینہ بھول گیا ہے مرا چہرہ شاید
یہ بھنور ہے کہ دہن کھول رہا ہے دریا
صرف میں ہی نہیں پانی بھی ہے پیاسا شاید
شہر اب شہرِ خموشاں کی طرح لگتا ہے
چہرہ چہرہ ہے یہاں جسم کا کتبہ شاید
چاند ہر رات ابھرتا ہے اسی جانب سے
راستہ دیکھ رہا ہے وہ دریچہ شاید
تیز جلتی ہوئی کرنوں کے قمر آتے ہیں
اب بہت پاس ہے [illegible] شاید

نظمیں

عظیم اختر

نظم

دردو یاس میں ڈوبی ہوئی
شدّتِ احساس سے لرزتی ہوئی
کیا تم میری آواز سن رہی ہو شانو ـ ؟
صبح کی تازہ ہوا
شام کے ڈھلتے سائے
سرمئی دھوپ کی
میٹھی میٹھی سی تپش
پھول، شبنم، شفق، آبجو، چاندنی
یہ سب تمہارے بارے میں
مجھ سے سوال کرتے ہیں
کبھی تم ملو تو تم سے پوچھوں
کہ مجھے کیا جواب دینا ہے
ان سے یہ کیسے کہہ دوں
وہ ــ جو ہردم اس کے قریب رہتی تھی
آج اپنے اختر کو بھول بیٹھی ہے !

خلیل تنویر

تین نظمیں

(۱)

یوں اب ــــ
زردہ سینے پر
سر رکھ کر
رونے سے کیا حاصل ہے؟
مٹی سے ــــ
سانسوں کا
رشتہ ٹوٹ گیا ہے

(۲)

ایک لمبے اِتہاس کی یاترا
اسی طرح ختم ہو گئی
عقیدے ــــ !
سنگ مرمر میں قید کر دیے گئے !
کہاں ہیں وہ درخت ... ؟
جن کے بارے میں سوچا گیا مگر
خواہشوں کے سلسلے کبھی ختم نہیں ہوتے !!

(۳)

جانے یہ کون سی خواہش ہے
سفر کیسا ہے ؟
عمر بھر جسم کے صحرا میں جلا ہو پھر بھی
آگ کیوں چاہی گئی ؟
ختم سفر ہونے پر
خاک تو خاک میں مل جاتی ہے

گورنمنٹ میوزیم، ڈونگرپور، ۳۱۴۰۰۱ ● رنگ محل خورد، پھاٹک حبش خاں، دہلی

ایک سوال نامہ

ذیل میں چند سوال کیے جارہے ہیں۔ ہم 'تحریک' کے کرم فرما ادیبوں، شاعروں اور تنقید نگاروں سے اِس امید کے ساتھ، ان پر اظہار خیال کی درخواست کرتے ہیں کہ ان سوالوں کو وہ اپنی توجہ کا مستحق سمجھیں گے اور پڑھنے والوں کو اپنے خیالات سے استفادے کا موقع دیں گے۔ جوابات 'تحریک' کی اگلی اشاعتوں میں ماہ بماہ درج کیے جائیں گے۔ بحث میں عام قارئین کی شرکت کا بھی ہم خیر مقدم کریں گے۔ اور ان کے خطوط کو 'بزمِ احباب' میں جگہ دیں گے۔

۱/۲/۵

۱۔ جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی بحالی؟

۲۔ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے؟

۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے۔ کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط تو نہیں کرتے؟ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۵۔ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب کرنے کے بعد، ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے لگے ہیں۔ اس میں کسی نئے عرفان کو دخل ہے یا یہ پسپائی کا اعتراف ہے؟

۶۔ کیا ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ جواب اثبات میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے؟

۷۔ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے یہ بھی کی ہے کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُر امن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ادب کو بھی سماجی فریضے کا حامل ماننا پڑے گا جسے بالعموم مریضانہ ادب کہا جاتا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

کلنکنی

کنور سین

ماحول اب بکھرنے اور پگھلنے سا لگا۔ سب کچھ فریب سا دکھائی دینے لگا۔ ہمدردی شک میں بدلنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں لاوارث مگر معنی خیز جملے اچھلنے لگے۔ اب ہر کسی کو بھوتوں کی حویلی کی بابت اپنی رائے نیا وہم معلوم ہونے لگی۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ حویلی زندہ آدمی کی مانند سانس لیتی ہے، آنکھیں جھپکاتی ہے، بانہیں پھیلائے کسی کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اُس کے آنے پر مچلتی ہے، لہکتی ہے، مسکراتی ہے، چہکتی ہے! اسے بے جان اور بے روح ماننا بھاری بھول ہے۔ خشک اور بے رس زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسے بے سہارا مان کر اداس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اس میں رہنے والی واحد جان کا بھید کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

کچھ ہی دنوں میں حالت یہ ہوگئی کہ محلے کے سب لوگ حویلی کی دیواروں کو ہونٹ ہلاتے ہوئے دیکھنے کے لیے بیقرار نظر آنے لگے۔ اینٹوں کی دوسری جانب ہونے والی کھسر پھسر سننے کے لیے ان سے کان لگائے رات رات بھر کھڑے رہنے لگے۔ حویلی کے دیو قد کواڑوں میں بنی چھوٹی کھڑکی کو چپکے سے کھلتے اور بند ہوتے ہوئے دیکھنے کی انتھک کوشش کرنے لگے۔ کئی ایک تو حویلی کے چاروں طرف چکر لگا کر اس خفیہ سرنگ کا پتہ لگانے میں خون پسینہ ایک کرنے لگے جس کا ایک سرا حویلی کے صحن میں نکلتا تھا۔ انھیں یقین تھا ایک نہ ایک دن اندر ہونے والی حرکات کے بارے میں کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جائے گا۔ آخر میں کمروں کا مکان اپنی کایا کے سونے پن کو دور کرنے کے لیے کیا نہیں کرتا ہوگا۔ انھی خیالوں میں اُلجھے ہوئے سب حیران رہ گئے جب اُنھوں نے دیکھا کہ حویلی پر چھایا رہنے والا مہیب سناٹا یکایک پگھلنے لگا ہے۔ اس اچانک حادثہ پر عورتیں اپنے مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر آن کھڑی ہوئیں مرد چبوتروں پر آنکلے۔ بچے بھی نیند سے چھٹکارا پانے کے لیے آنکھیں ملنے لگے۔ تھوڑی دیر میں درجنوں آنکھیں حویلی کے دالان میں بنی کھڑکی میں بیٹھی ہیرا دئی کو بانہیں پھیلا پھیلا کر چیختے چنگھاڑتے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں اور اسے پوری طرح دیکھنے کے لیے بے چین ہو اٹھیں۔ ٹیلی ویژن کے یگ میں ریڈیو شن کر تسلی نہیں ہوتی۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ چہرے کا لحہ لحہ بدلتا ہوا منظر بھی تو دکھائی دے۔

ہیرا دئی دم لینے کو رکی تو لگا دنیا ایک نقطے پر پہنچ کر تھم گئی ہے۔ بے چینی اور بیقراری کا دم گھٹنے لگا تو کسی نے پوچھا "بات کیا ہے"

ہیرا دئی نے پوچھنے والے کی طرف دھیان دیے کر پھر دہاڑنا شروع کر دیا۔ وہ اول فول گالیاں بک رہی تھی۔

"رام رام۔ ہیرا دئی یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اتنی گندی زبان، اری تو تو اونچے گھرانے کی ——— پنڈت دینا ناتھ نے داتن منہ سے نکال اور بلغم کا بڑا سا لوتھڑا گلی کے بیچ بیچ میں پھینک دیا۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہوں، پنڈت جی۔ مولا چی گھر والی کو تو سنبھال لے۔ پتہ نہیں کس کس نے پیشاب کیا ہے۔ کتوں تک نے سونگھا ہے"

ہیرا دئی کا پارہ کئی ڈگری اور چڑھ گیا۔

"اری کچھ تو ہوش کر۔ تیرے جیسی کُلین خاندان کی بہو بھی کیا اس طرح ——— پنڈت دینا ناتھ نے بیچ کا ساتھ دینے کا ارادہ کیا۔ "تم

چُپ رہو جی۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ کس وقت کس کو کیا کہنا ہے اور وں کو چھوڑو، وکیل کی بات تو کسی سے نہیں چھپی۔ منشیانی اُس کے آگے لہنگا نہ اُٹھاتی تو یہ راج محل کبھی کھڑا نہ ہوتا۔ وکیل بیچارے کے مکان کی جو اینٹ ایک بار گر گئی سو گر گئی۔ اُس غریب کے گھر میں ہینڈ پمپ تک نہیں لگ سکا۔ اِدھر آنگن میں فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ اس کمینے کو حرام خوب راس آیا ہے۔" ہیرا دئی نے اپنے مکان کے پاس سر جھکائے کھڑے منشی بھگت رام کی طرف اشارہ کر کے طعنہ دیا تو اُس کی بیوی بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی چھوڑ کر اندر چلی گئی مگر پنڈت پھر بھڑک اُٹھا۔

"منشی جی کو گالیاں دے رہی ہے کمبخت۔ جانتی نہیں۔"

"واہ رے پنڈت۔ تو نے بھگتو منشی کو منشی جی کب سے کہنا شروع کر دیا۔ کل تک اس کی آنکھوں سے گید نہیں چھوٹتی تھی۔ آج حرام کی کمائی براہمن کے ہاتھوں عزت پانے لگی۔ اِس کا باپ مرا تھا تب آدھے چھت والی کوٹھری میں پڑی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر پھٹی پرانی دری کے سوا گھر میں کوئی دوسرا بچھونا نہیں تھا۔ ہر روز صبح شام سر پہ گاگر تھامے کُتّے کی طرح بھونکتا ہوا گلی محلّے دودھ بیچتا پھرتا تھا۔ کوئی اِسے ڈیوڑھی تک پار کرنے نہیں دیتا تھا۔ یہ پاجی، منشی جی کیسے بن گیا۔" ہیرا دئی نے دل میں بھرا زہر اُگل دیا اور پنڈت کو جواب دینے کے لیے تیار ہوتے دیکھ کر آگے کہنے لگی۔

"موہنی اس کے گھر نہ آتی تو یہ مُنہ جلا میرے مُنہ لگنے کی ہمت کرتا۔ وکیلن کے جسم پر چاندی تک کا چھلّا نہیں اِدھر منشیانی سر سے لے کر پاؤں تک پیلی ہوئی بیٹھی ہے۔ کسی دوسرے منشی کی آمدنی اپنے وکیل کی آمدنی سے زیادہ ہوتی دیکھی ہے تم نے" ہیرا دئی نے نفرت بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا تو سب سنّاٹے میں آئے ہوئے تھے۔ پنڈت نے غصّہ تیاگ کر سمجھانا شروع کیا۔

"ہیرا دئی دوسروں کا دھن دیکھ کر جلنا اچھی بات نہیں۔ ایشور کی دین کو کلنکت کرنے سے پاپ لگتا ہے۔"

"حرام کی کمائی کو ایشور کی دین نہیں کہتے، پنڈت۔ میں جو ٹھیک سمجھوں گی کہوں گی۔ مجھے منشی کے گھر منہ دا لینے جانا ہے نہ شرادھ کھانے۔" ہیرا دئی کو پھر اپنی جانب رُخ کرتے دیکھ کر پنڈت نے داتن دوبارہ مُنہ میں ڈال لی۔ لیکن منشی کے ساتھ والے مکان کے کشوری سے نہ رہا گیا۔ بھینس کی ناند میں چارہ ڈالتا

بند کر کے کرخت آواز میں بولا ———

"پنڈت جی، رانڈ کے سر پر چڑھا بھوت اُتارنے کا گُر مجھے آتا ہے۔ آپ کی نرم باتوں کو یہ کُتّی کہاں سمجھے گی میں ابھی ———"

"کانے مُرغے تو بھی بانگ دینے لگا۔ میرے مُنہ پہ تالا لگائے گا۔ کل ہی تو مہترانی تجھے ذلیل کر رہی تھی۔ تہبند اُٹھا کر کیا دکھا رہا تھا اپنی ماں کو۔ کیوں مہترانی ٹھیک کہتی ہوں نہ میں" ہیرا دئی نے گلی میں پڑا کوڑا اُٹھانا چھوڑ کر تماشا دیکھنے کے لیے کھڑی ہوئی مہترانی کی طرف دیکھ کر بائیں آنکھ دبا دی۔ کشوری نے مہترانی کو بتیسی نکالتے ہوئے دیکھا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ سکڑا سمٹا سا ڈیوڑھی کی جانب سرکنے لگا۔ تھوڑی دیر تک کوئی نہیں بولا۔ جس کے بھید کو کھولنے کا سہرا ہر کوئی اپنے سر لینا چاہتا تھا اُسے اس شدّت سے حلاّ آور ہوتے دیکھ کر سب اس سگھڑ اکھڑ رانڈ کی بدھوا کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگے۔ کشوری کو پوری طرح کچل دینے کا سوچ کر ہیرا دئی پھر بھبک اُٹھی۔ "ارے ایک بھینس مر گئی تو کیا ہوا۔ منشی کی حرام کی کمائی ختم تھوڑی ہو گئی ہے۔ ہاں اُسے بچانے کے لیے ———"

"ہیرا کچھ دوسروں کا ہی خیال کر۔ آخر ہم لوگ بہو بیٹیوں والے ہیں۔ اتنی اوچھی زبان ———" اجونتی نے ہمّت بٹوری اور سر سے ڈھلکتے ہوئے پلّو کو سنبھالتے ہوئے مُنہ کھولا تو ہیرا دئی نئے جوش کے ساتھ جھپٹی ———

"واہ ری نُنّی، مجھے سیکھ دینے آئی ہے۔ تیری بہو بیٹیاں مجھ سے چھُپی ہوئی نہیں۔ نارنگیاں بیچنے جوٹتی ہیں آنکھیں پہلے مٹکانے لگتی ہیں۔ تیرے کنکھ وہ کی گھروالی جیٹھ کے ساتھ جو کچھ کرتی ہے اُسے کون نہیں جانتا۔ سب کہتے ہیں تری پوتی کی شکل اُس ٹھنگنے سے ملتی ہے۔ بھلا تو اپنے بوڑھے بالوں میں رنگ کس کے لیے پوتتی ہے پتلو کو میرے تو ساون بیت گئے ———"

"چپ رہ ڈائن، رنا کوئی چھوڑا نہیں اب ہمارے بھرے پُرے گھروں پر اپنی کالی نظر ڈالنے لگی ہے۔ ساس، سسر، پتی، دیور سب کو کھا گئی۔ اپنے بچوں تک کو چٹ کر گئی سانپنی۔ بجائے شرم کرنے کے ——— لاجونتی کو ہارتے دیکھ کر اس کی سہیلی منگو آگے بڑھی ———

"مجھ پر تو کرنی نے قہر ڈھایا ہے۔" اتنا کہہ کر ہیرا دئی ٹھٹکی۔

اُس نے اپنے زرد ہوتے گلے کو اندر ہی اندر صاف کیا اور پورے وجود میں یکایک اُٹھتے ہوئے غم کے گھنے بادل کو چیرنے لگی ——— "ارے تو تو اپنے آدمی کے ہوتے دیور کے ساتھ سوتی رہی ہے" گاؤں کہیں کا شانہ بدل ہے اسی ڈور کے تحت وہ بولتی گئی" اس نے چارپائی کے نیچے پڑی شلوار اُٹھا کر محلے بھر کو دکھائی تھی۔ لوگ تو تیرے ساتھ ماڑو چار تک کا نام جوڑتے ہیں؟"

مجنگو کو بوکھلائی نظروں سے اِدھر اُدھر جھانکتے دیکھ کر سب کھسیانے سے ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ تبھی محلے کی سب سے سیانی اور بزرگ عورت بھاگو نے ہیرا دئی کی کھڑکی کے نیچے جاکر دھیمے اور سلجھے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا' ہیرے اب بس بھی کر۔ میں سب سمجھ گئی ہوں کہ یہ سارا بکھیڑا کس لیے ہے۔ تیری حویلی کی بائیں ہاتھ والی دیوار میں پڑی دراڑ کی جانب اشارہ کرکے منشی بھگتو نے ہماری بھوتوں کی ہے۔ کئی دنوں سے پڑے بیس کمروں والے مکان میں رہنے والے بھوتوں کے حقیقی ہونے پر شک کرنے کا جو اپرادھ ہم سے ہو رہا ہے اُس کے لیے تو ہمیں چھما کر دے میں وشواش دلاتی ہوں کہ آج سے ہم میں سے کوئی بھی تیری حویلی پر چھائی رہنے والی خاموشی کو وہم سمجھنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ آخر تجھے بھی تو زندگی کاٹنی ہے ———"

بھاگو کی بات سُن کر ہیرا دئی پہلے تو مسکرائی پھر گمبھیر ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد اُس کے چہرے پر چھایا ہوا جوش مدھم پڑنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی جانب دیکھتے ہوئے لوگوں پر بے بس اور اُداس نظریں ڈال کر کھڑکی کے پٹ بند کرنے لگی۔

جدید شہر

مومن مشتاق صدیقی

مدتوں مردہ رہنے کے بعد ایک طویل اذیت ناک عرصہ اور تب کہیں جاکر وہ شہر دوبارہ زندہ ہوا تھا بہت پہلے اس شہر کا حشر بھی موہنجو دارو اور ہڑپا کی طرح ہوا تھا ——— لیکن نہیں ——— وقت اور زمانے کے نشیب و فراز کی وجہ سے موہنجو دارو اور ہڑپا کے شہر تو زمین کے نیچے دفن ہو گئے تھے اور ان میں کوئی بھی متنفس نہ بچا تھا لیکن وہ شہر تو زمین کے نیچے دبا ہوا بھی تھا اور لوگ زندہ بھی تھے عجیب بات!

واقعہ یہ ہے کہ اس شہر پہ ایک عرصے سے بمبار طیارے منڈلایا کرتے تھے اندھا ملک الموت نیپام بم ——— مشین گن کا ہولناک نغمہ ——— موت کا راگ ——— جراثیم اور زہریلی گیس ——— اور آہستہ آہستہ جب سناٹا خاموشی بن کر بولنے لگا اور موت سستی ہو گئی تو ایسا ہوا، جیسا کہ آپ جانتے ہیں اکثر ہوتا ہی رہتا ہے تو پھر ایک سمے ایسا بھی آیا جب پورا شہر زیر زمین چلا گیا ——— صاف، کھلا اور روشن آسمان ——— سورج کا تھال ——— چاند کے سینے کا کنول، گنگناتی ہوئی ندیاں، مچلتا ہوا پانی، ہریالی اور خوشگوار زندگی ——— سب کے سب اس شہر کے اوپر رہ گئے اور شہر زمین کے اندر چلا گیا۔

لوگوں نے زمین کے سینے میں خندق بنا کر، چھوٹے موٹے گھر بنا لیے ——— جینے کے سامان کر لیے اور ایک بھیانک اندھیرے میں زندگی کا سفر شروع کیا انسان زندہ رہنے کے لیے کیسے کیسے جتن کرتا ہے کیسے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

اب اس اندھیرے میں شہر کے لوگ دیکھتے نہیں صرف سنتے تھے، اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر اور جانور کی طرح سونگھ سونگھ کر چیزوں کی شناخت کیا کرتے تھے شروع میں انھیں تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں اندھیرے میں دور تک دیکھنے کی عادی ہو گئیں ——— اپنا گردپ، اپنا رنگ، اپنی زمین سب کچھ بھول کر وہ ایک ہی رنگ میں رنگ گئے ——— سیاہ رنگ ——— جیسے ایک طرح سے انھوں نے طے کر لیا تھا ——— ہمیں یہیں زندہ رہنا ہے یہیں مر جانا ہے۔

وہاں زمین کے نیچے اس شہر میں افزائش نسل کا سلسلہ کبھی نہیں رکا ——— نوزائیدہ بچے جب ہوش سنبھالتے تو اپنے بڑوں سے اوپر والے شہر کی کہانیاں سنتے جس طرح ہم اپنے بڑوں سے اگلے اچھے وقتوں کی کہانیاں سنتے ہیں ——— اور صرف ایک خوش آئند تصور کر کے چپ ہو جاتے ——— کیسا ہوگا اوپر والا وہ زندہ شہر؟ دل کی طرح دھڑکتا ہوا ایک سوال ابھرتا اور بس۔

وقت مہمان بن کر آتا اور چوروں کی طرح بھاگتا رہا۔ زمین کے نیچے رہنے والوں نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ اب آسمان پر صرف سورج، چاند اور ستارے ہی رہ گئے ہیں زمین پر گھورے کھنڈر ہنا شاید ختم ہو گئے تھے ——— کافی عرصے سے دھماکوں کی آوازیں بھی سنائی نہ دی تھیں۔ تو ایسے میں کچھ منچلوں نے زمین کی کوکھ سے سر باہر نکال کر

اپنے ایک وقت کے جہانِ رنگ و بو کو دیکھا جیسے بیچ سے اکھوا نکلتا ہے اور مست و بیخود ہو کر کچھ ہی دنوں میں زمین کو چومنے لگتا ہے ـــــ ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں انھیں نظر تو کچھ بھی نہ آیا بس کہیں دور لہروں کا آرکسٹرا سنائی دیا ـــــ کہیں درختوں کے پتوں نے تالیاں بجائیں اور ان گنت پرندوں کی آوازیں جن کی منقاروں سے مختلف سُر نکل رہے تھے ـــــ زمین کے سینے سے ہنسی کا ایک فوارہ بلند ہوا اور پل بھر میں پرسکون ماحول کی یہ خوش خبری شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی۔

اور اس طرح مدتوں مردہ رہنے کے بعد وہ شہر دوبارہ زندہ ہونا شروع ہوا اور راتوں رات اس شہر کے باسی قطار در قطار زمین کے نیچے سے اوپر آنے لگے ـــــ یہ خبر زمین کے اوپر رہنے والوں تک بھی پہنچی اور مختلف جگہوں سے مختلف لوگ اپنے اپنے بینڈ اور گروپ کے ہمراہ آن موجود ہوئے تاکہ اپنی اپنی نسل کے لوگوں کا استقبال کر سکیں اور انھیں اپنے گروپ میں لے جائیں ـــــ انسان انسان سے کتنی محبت کرتا ہے ؟

چند ہی برسوں میں زمین کے نیچے رہنے والوں میں کئی تبدیلیاں آ گئیں تھیں، ان کا رنگ و روپ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مٹی میں رہتے رہتے وہ بھی مٹی کے ہو گئے تھے، کالی کالی مٹی ان کے بالوں پر تھی اور ان کی پلکوں پر تھی اور ان کے ہاتھ مٹی میں سنے ہوئے تھے اور ان کے بدن سے بھی مٹی ہی کی طرح بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی اور ایسے میں استقبال کرنے والوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ ان کی شناخت کر سکیں بار بار وہ اپنی اپنی کتابیں اور اپنی اپنی جھنڈیاں دکھا دکھا کر انھیں لے جاتے، ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں اپنی طرف بلاتے جیسے روٹھے ہوئے بچوں کو کھلونوں سے بہلایا جاتا ہے مگر بے سود، نیچے والوں پر کوئی اثر نہ ہوتا ان کے چہرے احساس سے عاری اور جذبات سے خالی تھے۔ وہ صرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے اوپر والوں کی حرکتیں دیکھتے اور بس ـــــ لگتا تھا وہ سب کچھ بھول گئے ہیں ـــــ پھر صبح صادق کا نور بلند ہوا اور جیسے ہی سورج کی ملایم کرنیں زمین پر پڑیں ان لوگوں میں ایک عجیب سی تبدیلی آنے لگی ـــــ ان کی آنکھیں ویران ہو گئیں ہونٹ اور سیاہ ہو گئے بدن کی رگیں خیموں کے طنابوں کی طرح تن گئیں اور دور دور سے آئے ہوئے اوپر والوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سورج کی اولین کرنیں نیچے والوں کے قدموں کو چوم رہی تھیں اور وہ سب ڈر رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ صبح کی سنکی ہوئی ہوائیں مہربان ماں کی طرح ان کی پیشانی کو چوم رہی تھیں مگر ان کی آنکھیں یوں ابل رہی تھیں جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اور پانی سے وہ یوں بدک رہے تھے جیسے وہ پانی نہ ہو تیزاب ہو۔

پھول، شبنم، ہریالی۔ بہار سب ان کے لیے دہکتے ہوئے انگاروں کے سمان تھے ـــــ دونوں آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپے، روشنی اور تازہ ہوا سے بچنے کے لیے وہ سب اندھا دھند اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اپنا منہ چھپا رہے تھے ـــــ معصوم اور کمسن بچے تیر لگی فاختہ کی طرح تڑپ رہے تھے اور بے دم ہو کر زمین پر گر رہے تھے اور اوپر والوں کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، اور کیوں ہو رہا ہے۔ اور ابھی تک گروپ بندی کا معاملہ طے نہ ہوا تھا تو اوپر والے ان کی مدد کیسے کر سکتے تھے ؟

ذراسی دیر میں مردہ جسموں کا انبار لگ گیا جو باقی بچے وہ تیزی سے خندق کے در جانے سے واپس اپنے زیر زمین شہر میں چلے گئے اور اک ذراسی دیر میں وہ شہر پھر مردہ ہو گیا اور اب زمین کے اوپر دور دور سے آئے ہوئے لوگوں کا ہجوم تھا وہاں کتابیں خاموش تھیں اور رنگ برنگی جھنڈیوں کے لہرانے میں سانپوں کی پھنکار موجود تھی۔

بہت دیر تک زمین کے اوپر والے خاموش رہے۔ پھر انھوں نے آپس میں کچھ صلاح مشورہ کیا ۔۔۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ زمین کے نیچے کا حال معلوم کرے۔ بہر کیف طے یہ ہوا کہ پہلے ان لوگوں کو زمین سے باہر نکالا جائے اور اس کے بعد گرد پنگ کر کے انہیں آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔

اور کچھ دیر بعد دانشوروں کا ایک جتھہ زمین کے سینے میں اتر گیا ۔۔۔ اور ۔۔۔ وہاں انھوں نے ایک بڑا عجیب منظر دیکھا ۔۔۔ زمین کے سینے میں رہنے والے وہ سب جو باہر نہیں نکل سکے تھے اور وہ سب بھی جو باہر سے زندہ بچ کر اندر آ گئے تھے سب کے سب خلاف توقع بہت آرام سے تھے اور کچھ اس طرح جشن منا رہے تھے جیسے انھیں اپنی گم شدہ جنت واپس مل گئی ہو۔

"چلیے۔ آپ سب اوپر اپنے شہر میں چلیے ہم لوگ آپ سب کو لینے کے لیے آئے ہیں"

اس سے پہلے کہ اس قسم کا جملہ اوپر والوں میں سے کوئی کہتا ۔۔۔ نیچے والوں نے ان سب کو غیر اہم نظروں سے دیکھا اور سب ایک ساتھ یوں گویا ہوئے۔

ہم اپنی اس جنت میں بہت خوش ہیں، ہمیں اوپر نہیں آنا ہے۔ اس زمین کی کوکھ میں ہمیں بہت آرام ہے ۔۔۔

●●

نظمیں

اختر بستوی

پلیٹ فارم

کوئی گاڑی آئی، ابھرا شور و شر
رونقیں آنے لگیں ہر سو نظر
ہے کسی گاڑی کے جانے کی گھڑی
ہر پھر اک ہیبت سی، چل پڑی
زندگی بھی جیسے ہے اک پلیٹ فارم
کم نہیں ہوتا کبھی اس کا کبھی چارم

روشن محل، گاندھی نگر، بستی، یو پی۔ ●

میں اور میرا فن

کس کو اک سوکھے کنوئیں سے ہوگی سیرابی کی آس ؟
جس میں پانی ہی نہ ہو کیا بجھ سکے گی اس سے پیاس
میری ہستی بھی رہی ہے آج تک محروم آب
مجھ سے رنگینی کے چشموں نے کیا ہے اجتناب
پھر بھی لوگوں کو توقع ہے کہ میری شاعری
ان کے دل میں حسن کی رہنے نہ دے گی تشنگی
اور یہ سچ بھی ہے کہ میرا فن ہے ایسا کوہسار
جس سے پھوٹے ہیں سدا رعنائیوں کے آبشار

شاہد کلیم

یہ کائنات رکے

کہیں ایک نقطہ پہ
پھیلے ہوئے آسماں کے ٹھہر جائے سورج
کسی ایک گوشہ میں
تاریک غاروں کے روپوش ہو جائے
قاصد سیہ رات کا
چمن میں ہر اک سمت
کلیاں لبوں کو رکھیں وا
مگر کوئی شبنم کا قطرہ
نہ ان میں گرے
یہ ممکن ہوا ہے نہ اب تک مگر۔
زمیں اپنے محور پہ گردش لگاتی رہی ہے...

سنٹرل اکسائز آفس، گیا، بہار

نظمیں

بدیع الزماں خاور

والد کی یاد میں

سحر کے ساتھ وہ خاموش ہو چکا ہے مگر
شرابِ نور مسلسل پلا رہا ہے مجھے
مری نگاہوں سے روپوش ہو چکا ہے مگر
قدم قدم پہ وہ صورت دکھا رہا ہے مجھے

مکاں میں نظر آتا نہیں کہیں بھی مگر
میں اس کو ڈھونڈوں تو بے انتہا محبت سے
مجھے وہ دوڑ کر اپنے گلے لگاتا ہے
پلنگ اس کا ہے خالی، مگر اسی پر وہ
میں رو پڑوں تو مجھے پیار سے بٹھاتا ہے
میں غم کی دھوپ میں جلنے لگوں تو رہ رہ کر
مری جبیں پہ وہ شفقت سے ہاتھ رکھتا ہے
وہ میرے پاس، مرے ساتھ، ہر گھڑی ہے، مگر
جو لوگ قبر میں اس کو اتار آئے ہیں
میں سوگوار، دلاؤں انہیں یقیں کیونکر؟
مرا نہیں ہے، مرا باپ اب بھی زندہ ہے!!

مشکور جاوید

برف کے بھیڑیے

زندگی کے ہاتھوں میں میری گردن
بلوری کانچ کے چشمے میں پھنسی ہوئی تمہاری آنکھیں
جو میری جستجو میں بھٹکنے لگی ہیں
سنو تو ذرا
زہریلی شاموں کا جنگل تو جل گیا ہوگا
سورج کے ناخنوں سے لہو ٹپکنے لگا ہوگا
اور بوڑھی انگلیاں تھرکتی ہوئی
ٹیبل کے جسم پر سو گئی ہوں گی
چلو دیکھ لو
سچ کے بادل تمہارے مکانوں کی چھتوں پہ
جھوٹ کی دھوپ سے پسینے پسینے ہوئے ہیں
چند گزرے ہوئے دن سکڑ کر
ڈسٹ بن میں پڑے ہیں
سچ کہوں
برف کے بھیڑیے طوفان سے دوستی کر رہے ہیں
کہیں کچھ نہیں ہے
بس بلوری کانچ کے چشمے میں پھنسی ہوئی
تمہاری آنکھیں ——
جو مجھے دیکھتی ہیں
جو مجھے تکتی ہیں

ڈاکٹر [illegible]، محلہ [illegible]، [illegible]، ضلع رتناگیری (مہاراشٹر) ● [illegible] پور، راجستھان

نظمیں

شباب للت

آنچ

زندگی بھر کے غلط اعمال کی پاداش میں
دی گئی آخر اُسے نارِ جہنّم کی سزا
دو فرشتے اس کو چھوڑ آئے جہنم زار میں
چار سُو اک آگ کا طوفان تھا جس میں بپا
ناظمِ دوزخ نے اگلے روز جب دیکھا اُسے
مطمئن بیٹھا تھا وہ نارِ جہنّم کے قریب
دے رہا تھا وہ مزے سے تاؤ اپنی مونچھ کو
بے نیازِ آتشِ سوزاں تھا وہ مردِ عجیب
اُس کی آنکھوں میں نہ تھا کوئی نشانِ اضطراب
کوئی سایا کرب کا چہرے پہ لہراتا نہ تھا
جیسے برگد کے گھنے سائے میں بیٹھا ہو کوئی
ایسی حدت میں پسینا تک اُسے آتا نہ تھا
ناظمِ دوزخ نے حیرت میں کیا اُس سے سوال
بات کیا ہے کچھ اثر اِس آگ کا تجھ پر نہیں
دیکھ کر تیری گراں جانی بہت حیراں ہوں میں
تجھ کو شعلوں کی حرارت کا ذرا بھی ڈر نہیں
ہنس کے وہ بولا کہ صاحب! یہ بھی کوئی آگ ہے؟
میرے جسم و جاں کو اس کی آنچ کیا پگھلائے گی
زندگی بھر میں حسد کی آگ میں جلتا رہا
مجھ پہ اب نارِ جہنم کیا اثر دکھلائے گی

چندر بھان خیال

خواہشوں کے آس پاس

کھوکھلے سینوں میں بہتا ہے مسیحائی عذاب
خیر و شر کے مسئلے سب آج بھی ہم دوش ہیں
رقص، موسیقی، ادب، احساس اور فکر و بیاں
کرب میں ڈوبے ہوئے خاکستر خاموش ہیں
تشنگی منہ کھول کر لیٹی ہے جلتے فرش پر
آسماں روئے تو تر ہو آرزوؤں کا لباس
خواہشوں کی میٹھی میٹھی آنچ کی لذت میں گم
آدمی بس گھومتا ہے خواہشوں کے آس پاس
لوگ ننگے جسم، بے چہرہ درختوں کی طرح
ڈھونڈتے ہیں اپنے باطن میں ہوس کی تازگی
چند تیرہ ساعتوں کی جادوئی لَو کے طفیل
ہم وجودوں کی دراڑوں میں پھنسے ہیں آج بھی
ہاتھ میں خنجر، نگاہوں میں لیے کچھ مسئلے
ہر بشر پر خندہ زن یہ کوئی ڈائن ہے کہ رات
اپنے آنچل میں سمیٹے کُل جہاں کی ظلمتیں
محوِ غفلت بھیلنی کا تلخ جوبن ہے کہ رات
پتھروں پر جسم رگڑو، تو تمیں یک جا کرو
خود کو سُلگاؤ کہ ساری رات یہ مشعل جلے
آگ ہی تو شانِ لب ہے، آگ اُگلتے جاؤ تم
خواہ شہرِ دل جلے یا جسم کا جنگل جلے

فیلڈ پبلسٹی افسر، گورنمنٹ آف انڈیا، سول لائنز، دھرمسالہ، ہماچل۔ ● ۷۶ ہ بھائی پرمانند کالونی، دہلی ۱۱۰۰۰۹

غزلیں

طاہر تلہری

خوابوں کی چاندنی کا سراپا کہاں سے آئے
جب جسم ہی نہیں ہے تو سایا کہاں سے آئے
ہونٹوں کو سی لیا ہے تو نغموں کا ذکر کیا
پانی بندھا ہوا ہے تو دھارا کہاں سے آئے
سورج تو شش جہت سے دکھاتا ہے آئینہ
دیوار مل بھی جائے تو سایا کہاں سے آئے
یہ رات یہ تھکن یہ اُداسی یہ تیرگی
ایسے میں کوئی چاند کا ٹکڑا کہاں سے آئے
احساس تو مجھے بھی ہے سورج کی پیاس کا
جب خون ہی نہیں تو پسینا کہاں سے آئے
طاہر یہ رہزنوں کا لٹیروں کا شہر ہے
تم اس اندھیری رات میں تنہا کہاں سے آئے

رؤف خیر

نہ خاکِ خشک کے ٹھہرے نہ شاخِ تر کے رہے
ہم اپنے گھر سے اٹھے کیا کہ دربدر کے رہے
ہماری فکر بھی اک دائرے میں قید رہی
چراغ بھی جو ہوئے ہم تو اک بھنور کے رہے
وہ لوگ تھے جو کہانی کے مرکزی کردار
وہ حرف حرف جیسے خواب مر کے رہے
شکستگی تھی مقدر، بدن تھے شیشے کے
ذرا سی ٹھیس بہانہ ہوئی، بکھر کے رہے
لہو کی لہر اٹھی تھی کہ سر سے گزرے گی
چڑھے تھے کتنے سمندر مگر اتر کے رہے
ہوا کے ساتھ ہی ہو لیں، یہ تجربہ بھی سہی
سمٹ سمٹ کے رہے جس قدر بکھر کے رہے
چلو کہیں پہ پئیں، بیٹھیں، غزل سنائیں سنیں
یہ مسئلے تو مرے دوست عمر بھر کے رہے

رزاق ارشد

لوٹتے گرتے نگر میں سب ہوئے نا آشنا
بستی بستی ڈھونڈیے اب ایک چہرا آشنا
یاں تو سب کو اپنی ہی پہچان حد بھر ہو چلی
اندھے بہروں کے نگر میں کون کس کا آشنا
بے بصیرت ہم تھے مانا مخلصوں کی بھیڑ میں
تم نے پہچانا کسی کو، تم نے پایا آشنا
سرد مہری کی ردا اوڑھے ہوئے ہے ہر بشر
کیا کوئی اپنا شناسا، کیا کوئی نا آشنا
ہم کو سب معلوم ہے ہونے کو ہے کیا اسکے بعد
تم تماشا گر ہو صاحب، ہم تماشا آشنا
کوئی تو ایسا بھی ہو استفسر جسے میں کہہ سکوں
میری شخصیت کا پارکھ، میرے غم کا آشنا

غزلیں

ڈاکٹر نریش

پرسشِ غم کو نہ آ غم کا مداوا ہو جا
مجھ میں دل بن کے دھڑک میرا سراپا ہو جا
ٹوٹ ہی جائیں نہ دھرتی سے کہیں سب رشتے
اتنا اونچا ابھی نہ اڑ تھوڑا سا نیچا ہو جا
عقل کہتی ہے کہ مانگ اس سے وفاؤں کا صلہ
دل یہ کہتا ہے کہ محرومِ تمنا ہو جا
پاؤں رکھنے کو کبھی دھرتی نہ میسر ہو گی
بھیڑ سے اونچا نہ اٹھ بھیڑ کا حصہ ہو جا
رفعتیں چھو کے دکھا عشق و محبت کی نریشؔ
اس نے اک قطرہ جو مانگا ہے تو دریا ہو جا

راہی قریشی

لوگ ملنا چھوڑ دیں گے اور کیا
فاصلے بڑھتے رہیں گے اور کیا
چل رہی ہے چارہ سازی کی نسیم
پھول زخموں کے کھلیں گے اور کیا
روشنی ہی روشنی ہو گی یہاں!
دل جلے تھے، دل جلیں گے، اور کیا
گھر کے آئینے میں اپنے عکس سے
داستاں سنتے رہیں گے، اور کیا
میرے دروازے تک آخر آئے کون
صرف پتّے ہلتے رہیں گے، اور کیا
قافلے بڑھتے رہیں گے روز و شب
آبلے روتے رہیں گے، اور کیا
لوگ اس محفل میں راہیؔ میرے بعد
میرے افسانے کہیں گے، اور کیا

عبدالمتین نیاز

تجربوں کے موسم جب سازگار آئیں گے
فکر کے درختوں میں برگ و بار آئیں گے
جرأتیں اڑانوں کی ہار دے گئیں ہم کو
گھات میں رہے جنگل اب شکار آئیں گے
ٹکڑے ٹکڑے امیدیں جوڑ لوں گا میں جس دن
ہنستے گاتے موسم خود میرے دوار آئیں گے
ہم کو دیکھنا یہ ہے بوجھ تو نہیں جیون
مرحلے تو دکھ سکھ کے بار بار آئیں گے
پھول بنتے جائیں گے زخم زخم تلووں سے
میری راہ میں جتنے خار زار آئیں گے
ڈوب جا نیازؔ اب تو سطح کی چمک مت دیکھ
تجھ کو گہرے پانی ہی سازگار آئیں گے

پنجاب یونیورسٹی، ایوننگ کالج، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۴ ● راہی قریشی - ۸۱ - ملیر روڈ کالونی گلبرگہ (کرناٹک) ● ثروت منزل، موتیا پارک، بھوپال

انیس اشفاق

ایک بے حادثہ موت

بڑا بھیانک حادثہ تھا۔ ایک تیز رفتار ٹرک اس کا سر کچلتا ہوا گزر گیا اور سڑک پر ایک لاش کی بے چہرگی کے چاروں طرف گرم اور تازہ خون پھیل گیا۔ لاش کے گرد بھیڑ جمع ہو گئی اور خون سرد ہو گیا۔ پولس آئی، جائے حادثہ کی تصویر لی گئی، بیانات قلمبند ہوئے اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی۔ مرنے والے کی پتلون سے نکلنے والی ڈائری نے شاید اس کی شخصیت کی نشاندہی کر دی تھی۔ مجمع منتشر ہو گیا۔ منتشر ہونے والے اور افسوس کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ لاش کی بے چہرگی اس سے دیکھی نہیں گئی تھی اور خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

وہ گھر کی طرف لوٹ رہا تھا اور سوچ رہا تھا بڑا بھیانک حادثہ تھا۔ دن بھر کی تھکن، مہینے کے آخری دنوں کی المناکی اور پھر اس شام کا یہ بھیانک منظر۔ وہ گھر تک پہنچ چکا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک بار پھر اسے وہ خون میں لت پت منظر یاد آ گیا۔ بے چارہ .... اس نے صرف اتنا کہا اور دروازے میں پڑے ہوئے قفل میں چابی گھما دی۔ اب وہ اپنے کمرے میں تھا۔ خالی برتنوں اور ڈبوں کو گھورتے ہوئے اس نے کپڑے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ہر چیز خالی ہر طرف خالی پن جسم کے اندر بھی اور باہر بھی۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر خالی ڈبوں اور برتنوں کو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ مگر کیوں۔؟ اس لیے کہ وہ سب خالی ہیں۔ مگر وہ خود بھی تو خالی ہے۔ اس کے اندر بڑی گہرائیوں تک خالی پن ہے لیکن وہ خود کو باہر نہیں پھینک سکتا اور اگر وہ پھینک ہی دے تو۔؟ کھوکھلی چیزیں زمینوں پر گر کر پچک جاتی ہیں ٹوٹتی نہیں۔ اور پچکنے کے بعد بھدا پن بدصورتی۔ ایک بار پھر اسے اس لاش کی بے چہرگی یاد آ گئی اور وہ لرز گیا۔ دن بھر کی تھکن اور مہینے کے آخری دنوں کی المناکی دور کرنے کے لیے وہ K کے ہندسے میں کھو گیا اور اپنے نئے بجٹ کی شیڈول بنانے لگا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ گزشتہ چار مہینوں میں اسے چھ، دو اور پانچ کے ہندسے ملے ہیں لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکا اور اس سے قبل۔ اس کی ہتھیلیوں کی سسکیاں کسی کو بیدار نہیں کر سکی تھیں۔ وہ سوچتا رہا ان چار مہینوں اور ان سے قبل کے دنوں میں اسے جس کرب سے گذرنا پڑا ہے وہ اس کی ذات کے خالی پن تک ہی محدود ہے وہ اپنے قریب اور بہت ہی قریب کے سایوں پر بھی اپنا عکس نہیں ڈال سکا اور نہ ہی دوسرے سایوں کو جو اپنے ظرف کے محافظ نہیں ہیں، کچھ بتا سکا۔ اسے اپنے قریب کے سایوں پر اپنا عکس ڈالنے کی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ سب اس کے اندر کی سچائی کو بھی پہچانتے تھے مگر وہ سائے جو اپنے ظرف کے محافظ نہیں ہیں اور جو کبھی کبھی اس کے قریب آ جاتے ہیں اور اس کے خالی پن کا مضحکہ اڑاتے ہیں وہ انہیں کیا بتائے۔ یہی نا۔ کہ ان چار مہینوں میں ملنے والے چھ، دو اور پانچ کے

ہندسوں میں اس نے ایک سونے کی انگوٹھی بنوائی ہے۔ یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت لی ہے اور ان دنوں کا بھاری بوجھ ہلکا کیا ہے جب اس کی ہتھیلیوں سے ابھرنے والی سسکیوں سے کوئی بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچتا رہا........ لاش کی بے چہرگی کا خوف اب بھی اس کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ رات سسک سسک کر اپنے گزرنے کی خبر دے رہی تھی اور اس کی سوچوں کا سفر طویل ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے بہت پہلے یہ خبر سنی تھی جو اس کی روح کے اندر اتنی چلی گئی تھی کہ دسمبر کے آخری ہفتے میں اسے اس کرب سے گزرنا ہے جس کا بچاؤ وہ اپنے بچپن سے کرتا آیا تھا۔ آہ ..... بچپن کی سوچیں بھی کتنی حسین ہوتی ہیں۔ "سیبن" کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اکثر وہ سوچنے لگتا کہ "سیبن" جب کسی نئے منظر کے لیے سجائی جائے گی تو کتنی خوبصورت لگے گی۔ اور آج ــــ دسمبر کے اس آخری ہفتے میں "سیبن" نئے منظر کے لیے سجا دی گئی اور اسے اس بے پناہ کرب سے گزرنا ہی پڑا جس کا بچاؤ وہ اپنے بچپن سے کرتا آیا تھا۔ کبھی ــــ شاید بچپن میں اس نے سوچا تھا کہ وہ "سیبن" کے داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں ایک خوبصورت انگوٹھی پہنائے گا۔ اور آج بے پناہ کرب سے گزرتے ہوئے وہ انگوٹھی جس پر گزشتہ ساٹھ دنوں کی تھکن چمک رہی تھی اس کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اسے بے پناہ عقیدت اور خلوص سے دیکھ رہا ہے اس نے کئی بار اس انگوٹھی کو چوما، کروٹ لی اور خالی برتنوں اور ڈبوں پر نظر پڑتے ہی ایک بار پھر اسے لاش کی بے چہرگی یاد آ گئی۔ اور پھر وہی خالی پن کا شدید احساس۔

وہ سوچنے لگا..... ہتھیلیوں سے ابھرنے والی سسکیاں اب بھی جاری ہیں۔ اس نے ان سسکیوں کو ختم کرنے کے لیے نیوشنس بھی کیے مگر وہاں بھی اسے مجروح ہونا پڑا اندر اور باہر سے کئی بار گھٹنا پڑا۔ ہتھیلیوں سے ابھرنے والی سسکیوں سے وہ اب بھی کسی کو بیدار نہیں کر سکا ہے۔ وہ سائے جو اپنے ظرف کے محافظ نہیں اس کا مضحکہ اڑاتے رہتے ہیں۔ آنے والے دنوں میں اسے کئی زنجیریں اور پگھلانی ہیں۔ لیکن زنجیریں پگھلانے سے کوئی فائدہ نہیں ظالم و بے خوف پہریدار اسے پھر جکڑ لیں گے۔ اسے اپنا بھاری بوجھ ابھی اور ہلکا کرنا ہے لیکن بوجھ ہلکا نہیں ہو سکتا کہ سارے ہی راستوں نے پتھروں کو ڈھونے کا حکم جاری کر دیا ہے ــــ خالی برتنوں اور ڈبوں کو دیکھتے ہوئے اور اپنے خالی پن کا بے پناہ بوجھ محسوس کرتے ہوئے اس نے آخری بار سوچا کہ وہ خود کو اٹھا کر باہر پھینک دے اور بچک جائے۔

رات ختم ہو رہی تھی اس نے سوچا صبح ہونے سے پہلے اگلے دنوں میں ملنے والے ۱۷ کے ہندسوں کی شیڈول بنالی جائے۔ اور پھر اس نے شیڈول بنائی۔ بڑی دیر تک وہ ایک ضرورت پر دوسری ضرورت کو ترجیح دیتا رہا اور اس کی شیڈول کا چہرہ لکیروں سے چھلنی ہوتا رہا گزشتہ شام لاش کی بے چہرگی کا منظر دیکھنے سے پہلے ہی تو اس نے کسی سے سنا تھا کہ سیبن کو نئے منظر کے لیے سجائے جانے کی رسم میں پچاس ہزار خوبصورت اور اخراجات کے لیے تسلیم شدہ کاغذوں کو پھونکا گیا ہے اور اس وقت بڑی دیر تک سر کھپانے اور ایک ضرورت پر دوسری ضرورت کو ترجیح دینے کے بعد بھی وہ پچاس کاغذ اپنے نئے کپڑے بنوانے کے لیے اپنی شیڈول میں نہیں لکھ سکا تھا۔ جھنجلا کر اس نے شیڈول کے چہرے کو بری طرح زخمی کر دیا۔

رات ختم ہو گئی اور وہ رات بھر کھلی رہنے والی آنکھوں کے ساتھ بستر سے اٹھ گیا۔ دن پھیلتے ہی جب وہ نیچے اترا تو اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی۔ وہ سڑک پر آ چکا تھا اور اس کے چاروں طرف بے پناہ سناٹا تھا۔ ابھی وہ سناٹے کے سبب پر غور ہی کر رہا تھا کہ کئی چمکتے ہوئے نیزے اس کے چہرے اور جسم کے اندر اتر گئے اور وہ پھٹ گیا۔ رات بھر کی سوچوں کا گرم

(بقیہ ص ۴۸ پر)

احساس کی الرجی

فرحت قمر

"ہیلو بجّو!"

میں حیرانی سے دیکھنے لگا کہ اس پوش ریسٹوراں میں مجھ جیسے لمبے تڑنگے آدمی کو "بجّو" کون کہہ رہا ہے اور اس پر طرفہ یہ کہ آواز کا تعلق متوسط عمر کی ایک کافی خوبصورت اور کافی سے زیادہ فیشن ایبل عورت سے تھا۔ گول بھرا بھرا چہرہ، انار کی کلی سے ہونٹ، باب ہیئر اور چھلے کیلے کی طرح عریاں بانہیں!

کون ہے جو مجھے میرے گھر کے نام سے جانتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ میک اپ کے باوجود اس کی جلد کی راکھ جیسی رنگت بذات خود ایک کہانی تھی ــــــ ایک ایسی عورت کی کہانی جس نے جوانی کو ٹھیکرا سمجھ کر ٹکھڑوں میں لٹا یا ہو۔ میں اسے دیکھتا رہا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ عورت نہ ہو کر ولایتی میگزین میں چھپا ایک اشتہار ہو۔

"پہچانا نہیں؟" اس کی آواز کا جلترنگ پھر سے بج اٹھا۔

"تھوڑا تھوڑا" میں نے کہا مگر محض اس کا دل رکھنے کے لیے ورنہ میں اسے قطعاً نہیں پہچان پایا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کی بے باکی نے مجھ کو نروس سا کر دیا تھا اور میرا ذہن ٹھیک ڈھنگ سے کام نہیں کر رہا تھا۔

وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

"بیٹھیے" میں نے ذرا سنبھل کر کہا۔

اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور اس کے بال بڑے تربیت یافتہ انداز میں اس کے چہرے سے ہٹ گئے۔ اس حسین ادا سے بھی زیادہ جسم کی حسین لچک کے ساتھ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا پرس دھیرے سے میز پر رکھ دیا اور میری نظروں نے محسوس کیا کہ پرس بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ وزنی بھی ہے۔

"کیا دہلی میں کوئی کام کرنے لگے ہو؟" یہ تیسرا سوال بھی اسی کی طرف سے تھا۔

"نہیں تو"

"تب یہاں کیسے پائے جا رہے ہو" وہ بڑے بے تکلف انداز سے ہنسی لیکن ابھی میری مسکراہٹ منجمد تھی۔ میں نے سادگی کے ساتھ جواب دیا:۔

"یوں ہی دو چار دن کے لیے آیا ہوں"

"انبالہ میں سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے" میں نے کہا اور ساتھ ہی میرے تحت الشعور نے اس عورت کی فائل میرے شعور کو پیش کر دی میں نے تصور کی آنکھ سے اس کو ساری کی بجائے قمیض شلوار میں دیکھا۔ ارے یہ تو مسز کپور ہے۔ ہماری پڑوسن! وہی مسز کپور جس کے شوہر نے اپنی ساری بزنس اور ساری جائداد رمی میں تحلیل کر دی تھی اور مسز کپور ایک دن اچانک اپنی گود کی بچی کو لے کر انبالہ سے غائب ہو گئی تھی۔ لوگوں نے اندازے لگائے تھے مگر صحیح بات معلوم نہ ہو سکی تھی۔

"مگر آپ یہاں کیسے؟" اب میں قطعاً نروس نہیں تھا کیونکہ اس کے میرے درمیان سے اب وہ کرچیم پلیٹڈ شیشہ

ہٹ چکا تھا جس میں سے چند منٹ پہلے تک وہ تو مجھ کو صاف
صاف دیکھ سکتی تھی مگر مجھ کو قطعاً دکھائی نہیں دیتی تھی۔
اس کو انہار سے غائب ہوئے دس سال بیت گئے تھے
اس وقت میں لڑکا تھا مگر اب میری عمر شباب کی اس منزل میں
تھی کہ چار فیٹ دور بیٹھی مسز کپور کی قربت میرے تنفس کو
تیز کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے بڑی تھی اور میرے ماضی کی آنٹی
بھی مگر اس وقت تو یہ واضح تھا کہ وہ کناٹ پلیس کے بارے
میں سنی ہوئی پریوں کی کہانیوں کا ایک کردار تھی ـــــ ایک
سوسائٹی گرل! اس کے جسم پر لپٹی ہوئی ساڑی کی قوس قزح
اور اس کی بنا کا ابرانہ دعوت آمیز مسکراہٹ میرے فکر کا دھارا
پہلے ہی دوسری طرف موڑ چکی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ
اگر میں چند گھنٹے اس کے ساتھ گزار لوں تو مجھے اپنے پرس
سے دس دس کے پانچ سات نوٹ کم ہو جانے پر کوئی افسوس
نہیں ہوگا ـــــ اس کا انداز ہی کچھ ایسا تھا!
یکایک وہ کچھ سنجیدہ سی ہو گئی تھی اور مجھے عجیب
سی لگ رہی تھی اس کی یہ سنجیدگی، میں تو اس کو اسی بیباک
مسکراہٹ کے ساتھ وابستہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خاموشی
کو توڑنے کے لیے میں نے اپنا سوال دہرایا۔
"میں نے پوچھا تھا آپ یہاں کہاں"
"سچ تو یہ ہے مسٹر سنگھ!" اس نے اسی فلسفیانہ سنجیدگی
کے ساتھ کہا "مجھے خود پتہ نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ ہاں اگر کسی
کی شخصیت اور وجود کو اس کے مکان تک محدود کیا جا سکتا
ہے تو میں کیلاش میں رہتی ہوں"
"اسے آپ تو آزاد نظم سنانے لگیں" میں نے اس کا موڈ
بدلنے کی کوشش کی مگر وہ ایک سرد سانس کے ساتھ بولی۔
"ہاں مسٹر سنگھ اب میں خود ہی ایک آزاد نظم ہوں ـــ بالکل
آزاد ـــ مگر شعریت اور آہنگ سے خالی"
اس کے چہرے کے بھاری پن کو بدلنے کے لیے میں نے
اس کے لیے اپنے پرس سے دس دس کے پانچ سات نوٹ نکلنے
والی خواہش کے تحت جھوٹ بولا۔ "مجھے ابھی اسی وقت
کیلاش جانا تھا۔ کیا آپ ادھر ہی چل رہی ہیں؟"

"تم کہو تو چلی چلوں" اس نے سنبھل کر ذرا مسکراتے
ہوئے کہا۔

ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے جلد ہی اس کے اور
میرے جسم کا فاصلہ نارمل سے کم ہو گیا۔ کیونکہ قربت کی خواہش
دونوں کے دل میں تھی ـــ ایک شکاری اور ایک شکار!
"گھر پر کون ہوگا اس وقت؟" میں نے معنی خیز مسکراہٹ
کے ساتھ پوچھا۔
"کوئی بھی نہیں"
"کوئی ـــ بھی نہیں؟" میں نے لفظ "کوئی" پر
کافی زور دیا اور وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔
"ہاں کوئی بھی نہیں ـــ میں نے شادی نہیں کی ـــ
اب تو کوئی بھی کوئی بن سکتا ہے" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس
دی اور میں بھی ہنس دیا۔
"آپ کی لڑکی آپ کے ساتھ نہیں رہتی؟"
"رہتی ہے مگر اس وقت شام کو اس کے بھی گھر ہونے
کا سوال نہیں"
"اچھا مسز کپور یہ بتائیے" میں نے اس کے جواب سے
کوئی نتیجہ نکالے بغیر سوال کیا "کہ آپ اپنے گھر سے اچانک
کیوں چلی آئی تھیں؟"
وہ خاموش رہی اور مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے
یہ نازک ذاتی سوال غلط موقع پر پوچھ لیا ہے۔ اس لیے
میں نے وضاحت کی: "دراصل آپ کی روپوشی آج بھی
محلہ والوں کے لیے پراسرار بنی ہوئی ہے اور میرے تجسس
نے مجھ کو یہ ذاتی سوال پوچھنے پر مجبور کر دیا تھا ـــ اگر
آپ کو برا لگا ہو تو معاف کیجیے"
"نہیں جی یہ بات نہیں" وہ مجھ سے ہٹ کر سیدھی
بیٹھ گئی "مگر جب اس سؤر کا خیال آتا ہے ....." مگر وہ
جملہ پورا کرنے سے اپنے آپ کو روک گئی شاید اسے احساس
ہو گیا کہ وہ اس وقت ٹیکسی میں بیٹھی ہے اور شاید اسی احساس
کی وجہ سے اس نے اپنا پرس کھول کر چند لمحے بعد بند کر دیا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ اس کے پرس میں وہسکی کا ادھار رکھا تھا۔
باہر شام بہت حسین تھی۔

"کیا پیوگے ؟" اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے سب سے پہلا سوال کیا تھا۔

"وہسکی" میں بے باک ہو چکا تھا۔

شام کے خالی پیٹ میں وہسکی جلد اثر دکھا گئی لیکن مسز کپور کی اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے سوڈے کا تکلف چھوڑ کر دو پیگ نیٹ ہی، بغیر منہ بنائے گلے سے اتار لیے اور پھر شراب اس کے لاشعور کی ہلچل کو اس کے ذہن کی شعوری سطح تک لے آئی۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے مسز کپور نے جس جملہ کا گلا گھونٹ دیا تھا وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر آگیا۔

"مسٹر سنگھ — تم نے ایک ایسی بات پوچھی ہے جس کو نہ میں سننا چاہتی ہوں، نہ جواب دینا — لیکن — لیکن۔ کپور اب بھی تمہارا پڑوسی ہے اور تم اس کو اب بھی معزز سمجھتے ہوگے اس لیے میں تم کو بتانا چاہتی ہوں کہ وہ پکا سؤر ہے۔ حرامزادہ ہے، ذلیل ہے۔ اس نے مجھ سے میری گرہستی چھین کر طوائف بنا دیا ہے" اور پھر ذرا رک کر بولی "لیکن مجھے اپنی تباہی کا دکھ نہیں کیونکہ اب میں اسے تباہی نہیں سمجھتی"

شراب اس کی آنکھوں سے ابلنے لگی تھی۔

"اس کمینہ نے اپنی ساری جائیداد اڑا کر میرے جسم کو اپنی جائیداد سمجھا اور میرے جسم کو فروخت کر کے آمدنی حاصل کرنے لگا — میں اپنے داغدار جسم کو لے کر الگ ہو گئی یہ سوچ کر کہ اگر مجھے جسم بیچنا ہے تو خود ہی کیوں نہ بیچوں۔ دہلی جیسے شہر میں میرے لیے کوئی کمی نہیں — کل کوئی اور تو آج — آج تم !"

اس نے میرا ہاتھ کچھ اس طرح دبایا کہ میں کچھ نروس سا ہو گیا۔ شراب میرے اندر بھی پھیل چکی تھی مگر اس کے اس غیر متوقع بے باکانہ اقدام نے میرے جذبات کو بریک لگا دیا — مجھے لگا جیسے وہ بہت چھچھوری سی عورت ہے اور میں نے خود کو اور اس کو سنبھال کر پوچھا۔

"آپ کی لڑکی آپ کے ساتھ نہیں رہتی ؟"

"رہتی ہے" وہ بڑے زور سے ہنسی۔ لیکن اس وقت اپنے جسم کی گولائیاں بیچنے گئی ہوئی ہے — تم کہہ دینا کپور کے بچے سے جا کر کہ تمہاری بیٹی سے تمہارا انتقام لے رہی ہے، سرجیت کور — ہونہہ — اس کی اور اس کے خاندان کی اونچی ناک ! کٹ گئی ناک — وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی — طوائف سے بھی ذلیل عورت !

میرے جذبات کی ڈھلان پر پھسلتی ہوئی تیز رفتار گاڑی میں بریک سے لگ گئے — مجھے محسوس ہوا کہ میں بدبودار کیچڑ میں دھنسا ہوا ہوں۔ میں نے اس کیچڑ سے نکلنے کے لیے ایک جست لگائی — اور جست کامیاب رہی — میں نے کھڑے ہو کر گھڑی دیکھنے کی ایکٹنگ کی اور گھبرا کر بولا۔

"ارے میں تو بھول ہی گیا تھا — پہلے مجھے یہاں ایک ضروری کام کرنا چاہیے تھا۔ میں ابھی آدھے گھنٹہ میں آتا ہوں"

اور میں بغیر یہ سنے کہ مسز کپور نے کیا کہا باہر نکل آیا۔ واپس نہ آنے کے لیے !

باہر شام ایک پچاس سالہ عورت کے جسم کی طرح اجاڑ ہو چکی تھی۔

●●

محکمہ تعلقات عامّہ، ہریانہ

ھریانہ ــــ برق رفتار تعمیر و ترقی کے دس برس

یقیناً ایک دہاکہ لوحِ وقت پر ایک ادنیٰ نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ قلیل مدت کسی چھوٹے سے کام کے لیے بھی بہت تھوڑی ہے۔ لیکن

ھریانہ کی تو بات ھی کچھ اور ھے

یہاں وقت اور محنت کی بدولت دہاکوں کی ترقی کی جھلک ایک ہی دہاکے میں آسمو‌ئی ہے۔ اس دوران یہاں کچھ ہوا ہے۔ وہ کیا؟ ہندوستان کی اس تیز ترین ترقی کی حامل ریاست کو فی کس آمدنی کے لحاظ سے ملک میں دوسرا مقام حاصل ہے اور یہ بات اس کے روشن مستقبل کی غماز ہے۔

دھرتی کا سینہ دھڑکنے لگا ہم نے کمی سے بہتات کی جانب پیشقدمی کی ہے۔ دس برس پہلے زرعی پیداوار صرف 25.92 لاکھ ٹن تھی جو ہمارے خود کے لیے بھی ناکافی ہوتی تھی لیکن اب 49.05 لاکھ ٹن زرعی پیداوار حاصل ہے۔ 14 لاکھ ٹن اناج مرکزی ذخیرہ کو دیا جاتا ہے۔

تشنہ لب دھرتی کی پیاس بجھی مزید 4.06 لاکھ ہیکٹر اراضی کو زیرِ طریقِ کار سے زیرِ آبپاشی لایا گیا۔ (i) پانی کو 75 فٹ اونچا اٹھا کر۔ (ii) 638 کیوزکس پانی کو رسنے سے بچا کر۔ (iii) 1426 کیوزکس سیلاب کے پانی کو استعمال میں لا کر اور (iv) 1575 کیوزکس زیرِ زمین پانی کو بروئے کار لاکر۔ کل آبپاشی رقبہ 13 لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر 17 لاکھ ہیکٹر ہوگیا ہے۔ راوی اور بیاس دریاؤں سے ہریانہ کے حصّے کا پانی ملنے کے ساتھ ہی آبپاشی رقبہ 23 لاکھ ہیکٹر ہو جائے گا۔

زندگی کی راہیں منوّر ہوئیں سال 1970ء میں ریاست نے سو فیصد بجلی لگانے کا نشانہ حاصل کر کے ملک میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ فی کس بجلی کی کھپت 57 یونٹ سے بڑھ کر 139 یونٹ ہوگئی، اور کھپت کاروں کی تعداد 349، 372 سے بڑھ کر 393، 793، 7 ہوگئی ہے کل میسر بجلی کا 45 فیصد زرعی استعمال میں لایا جا رہا ہے اور یہ اوسط ملک میں سب سے زیادہ ہے۔

کمزور طبقہ جات کے لیے گھر ہریجنوں کو 2.15 لاکھ سے بھی زائد رہائشی پلاٹ دیے گئے اور اس کے علاوہ 3 لاکھ مزید پلاٹ بے گھر افراد میں تقسیم کیے گئے ہیں۔

خوشحالی کی مظہر صحت اور تندرستی ضرورت مندوں کو طبّی سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں۔ علاج اور صحت سے متعلق فی کس خرچ 4.60 روپے سے بڑھ کر 10.79 روپے ہوگیا ہے۔ اکیلے دوائیں بھی 99 پیسے فی کس کی در سے خرچ کیا جا رہا ہے جو ملک کی دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

منصوبہ بند کنبے قومی نشانہ 18 فیصد کے مقابلہ میں ہریانہ نے خاندانی منصوبہ بندی کا 37.2 فیصد نشانہ حاصل کر کے ایک امتیازی پوزیشن حاصل کی ہے۔ بڑھ رہی آبادی کی شرح کو صفر کے درجہ تک لائے جانے کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔

سیّاحوں کی جنّت سیر و سیاحت کے نقشہ پر ہریانہ نے اپنا خاص مقام بنا لیا ہے اور اب دیچک، گولڈن اوریل، ویلنگ ٹیل، پریل من برڈ، سیور، میگپال اور روزی پیلکن جیسے مقامات سیلانیوں کی دلکشی کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ہریانہ کی مختصر ترین سیر بھی آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

جاری کردہ: محکمہ تعلقات عامّہ، ہریانہ، چنڈی گڑھ۔

غزلیں

حامدی کاشمیری

زرد منجر پہنا ئے، سامنے کھائی نہ تھی
جس کا خدشہ ہم کو بھی تھا، وہ گھڑی آئی نہ تھی
پارہ پارہ جسم و جاں، لامنظری، گم گشتگی
تھی قبا آراستہ، شمشیر لہرائی نہ تھی
کاشکر دستِ دعا جیبوں میں لٹکے چل دیئے
دھوپ لائی تھی بنجر پہ گھٹا چھائی نہ تھی
رات بھر معبد میں رقصِ آتشیں ہوتا رہا
برف پلکوں سے ہٹانے کی توانائی نہ تھی
راہوار ابر پہ آئے تھے، جانے کیا ہوئے
ہم بھی چل کے آئے تھے پانی میں گہرائی نہ تھی
ساحلوں پہ سب امڈ آئے گھر دل کو چھوڑ کر
ہم سمجھتے تھے کسی سے بھی شناسائی نہ تھی

منظور ہاشمی

سلگتا دشت بہت جسکے انتظار میں تھا
وہ ابر الجھا ہوا بحرِ بے کنار میں تھا
ہر ایک سمت ہوا کے عظیم لشکر تھے
اور اک چراغ ہی میدانِ کارزار میں تھا
کھنچی ہوئی تھی مرے گرد واہموں کی فصیل
میں قید اپنے بنائے ہوئے حصار میں تھا
مرے شجر پہ مگر پھول پھل نہیں آئے
وہ یوں تو پھلتے درختوں ہی کی قطار میں تھا
کوئی کمیں تھا نہ مہمان آنے والا تھا
کواڑ جانے کھلا کس کے انتظار میں تھا
زمیں کی پیاس کا بادل کو تھا خیال بہت
مگر برسنا سمندر کے اختیار میں تھا
کھلی فضا تھی مگر پاؤں میں تھیں زنجیریں
عجیب کشمکشِ جبر و اختیار میں تھا

ابرار اعظمی

نگہ نگہ میں ادائیں، ادا ادا میں نگاہ
قفس کہ سنگِ تلاطم، قفس کی جائے پناہ
فریبِ شوخیٔ امکاں، نوائے شوق کی لے
شعورِ درد، تمنا، شعورِ ذات، گناہ
فضا میں لذتِ درماں، کرشمۂ حرماں
درونِ پردہ عزائم، فسونِ ماہِ سیاہ
خمارِ زیست، صدائیں، طلسمِ نیم شبی
خیالِ شاہدِ رعنا، گنہ کہ عذرِ گناہ
بلاکشانِ شبِ غم، امید وارِ سحر
طلوعِ جامِ فروغِ شعاعِ مہر کہ ماہ

۳۹۶-جواہر نگر، سری نگر، کشمیر ● ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ● لکچرر، شعبۂ تعلیمات، شری گاندھی ڈگری کالج، مالٹاری، اعظم گڑھ - ۲۷۶۱۳۸

نظمیں

خاطر حافظی

دوستو، آؤ آج آسمان کی گہری نیلاہٹوں پر
اپنی اُداسی کا جال پھینکیں
اور دیکھیں ——
یہ گول گول چاندستارے
جو نیلی شرٹ میں ٹنکے ہوئے بٹنوں کی طرح جگمگاتے ہیں
کیوں ہاتھ نہیں آتے ہیں؟
کس لیے دور خلا کی برف سی چادر
ادھ کھلی آنکھ کی طرح خوابیدہ ہے؟
کون ہے جو آسمان کے سبز گنبد میں بیٹھا ہوا
صداؤں کے سمندر، نیچے اور نیچے —
بہاتا جا رہا ہے؟
پاتال لوک کی بے خواب نگری میں بسے ہوئے لوگ
اپنی کھال کے اندر کے زخم کو مزے لے لے کر
اپنے تیز ناخنوں سے کھرچتے ہیں،
اور راحت کی سانس لیتے ہیں۔
پہچان کے سارے الفاظ صرف ہوا میں تیرتے ہیں
ہونٹوں سے نکلے ہوئے شبدوں کی کرچیاں —
صرف دکھاوا ماتر ہیں — کہیں کچھ بھی نہیں
نہ کوئی آتا ہے اور نہ کوئی جاتا ہے
صرف ایک وحشی سمندر ہے جو دن رات چیختا ہے
اُداس نسلوں کو اپنے انجام کے لیے کچھ بھی نہیں سوجھا ہے
دیکھنے اور سننے کا کام کرتے ہیں کمپیوٹرز
اس لیے ——
فکر کی کوئی بات نہیں۔
بوتل کو ہاتھ میں لے کر یونہی پیتے رہو ....!

محلہ شاہ معروف، گورکھپور، یو پی

خلش دہلوی

ایک صحرا آسمان سے وسیع
ایک سمندر
اِس وشال سمندر میں
ایک ہاتھ لرزتا ہوا، ریت کے چند ذرّوں کو
مٹھی میں دبائے
ایک چہرہ
زرد، پژمردہ، کُمھلایا ہوا
مسکتا رہا۔ روتا رہا
اُلجھا ہوا خوفناک ماضی کی یادوں میں
جال بُنتا رہا
ذہن میں
فاصلے دوڑتے رہے
سمٹتے رہے
پگھلتے رہے
اور اسی کشمکش میں
ایک سفینہ ڈوب گیا
اِس وشال سمندر میں

۴۴ – C جہانگیر باغ، نئی دلّی

غزلیں

گلشن بہار

نہ بہا پاؤں، جو آنسو کبھی بہانا چاہوں
اپنے ہی درد کی تصویر بنانا چاہوں
اجنبی بن کے مرے غم نے صدا دی ہے مجھے
یوں تو ہر شخص کا غم دل میں چھپانا چاہوں
کتنا بے رنگ ہے موسم کا یہ دھندلا چہرہ
اپنی یادوں کے چراغوں کو بجھانا چاہوں
دھوپ بن کر جو مری چھاؤں میں رہتا تھا کبھی
دل کے آئینے سے وہ عکس مٹانا چاہوں
دشتِ دل میں ہی کہیں دفن ہے امید کی لاش
اپنے اشعار میں یہ بھید چھپانا چاہوں
درمیاں سب کے جو پھیلی ہے وہ دوری ہو گلبہار
سب کی دوری کو گلے اپنے لگانا چاہوں

راج کھیتی

صلیبِ آگہی بن کر کھڑا تھا
کہ میرا قد مسیحا سے بڑا تھا
مرا چہرہ نہ پہچانا کسی نے
میں گمنامی کے جنگل میں کھڑا تھا
اٹھائے سے نہ اٹھا بوجھ دل سے
کوئی پتھر کلیجے میں گڑا تھا
وفا کے دشت میں آیا نہ کوئی
میں تیری راہ میں تنہا پڑا تھا
لہو سے پیاس کیا بجھتی ہماری
سمندر دور تک سوکھا پڑا تھا
پرندے خاک کیا آتے وہاں پر
شجر بے برگ تھا تنہا کھڑا تھا
نہ جانے راج کس ظالم کی خاطر
زمانے کی کشاکش سے لڑا تھا

علیم عالمی

یوں چمن کی تیرگی میں روشنی دیکھی گئی
آگ اپنے آشیاں کو ہی لگی دیکھی گئی
ہم وفا کی راہ میں چلتے رہے جلتے رہے
جب کہیں جا کر اندھیروں میں کمی دیکھی گئی
رو دیے ہم بھی کبھی تو سینکڑوں طوفاں اٹھے
یوں ہمارے آنسوؤں میں دلکشی دیکھی گئی
وہ قفس کی قید میں بھی کیا ستم کی شام تھی
زندگی بھر کی خوشی جب اجنبی دیکھی گئی
عشق میں بربادیوں کا سفر کیا تھا علیم
زندگی بے موت لاشوں میں دبی دیکھی گئی

نظمیں اور قطعات

شاہین بدر

ایک نظم

لوگ آئے ہیں آج
قتل کرنے مجھے
مجھ کو ہوتا ہے ایسا گماں
شاید اس شہر میں
ماسوا میرے کوئی کبھی سچا نہیں !!

شاہ ظہیر

ایک نظم

گزرے لمحے
ذہن میں محفوظ تھے
اور خیالات کے نقوش کاغذوں میں
ہر نقش پا خاموش تھا
میرے عہد کے لوگ
مریم کی عفت کے چراغ روشن کیے
سیتا کی پاکیزگی کی داستان سناتے رہے
نہ آج کسی نے زہر پیا —
نہ کوئی ٹیشو بنا
وقت اور آدمی
ایک دوسرے میں ضم ہو گئے
تو آؤ —،
اب تم اور ہم
خیالات کے نقش
کاغذوں سے دھو ڈالیں
اور اپنے سچ ہونے کا اعلان کر دیں

رئیس ٹونکی

قطعات

رفتہ رفتہ رات جب ڈھلنے لگی
تیرہ نظروں پہ اندھیرے چھا گئے
ذہن کے پردوں سے پھوٹی روشنی
مسکرا کر سامنے تم آ گئے

روح میں پیوست ہیں لیکن نظر آتے نہیں
کتنا تڑپاتے ہیں جان و دل کو وہ مبہم سے خواب
شکل واضح ہو خلش کی تو اسے کچھ نام دوں
کس قدر جاں سوز ہے بے نام سا یہ اضطراب

اک بار پھر پھڑ پھڑا کے ہی ریشم کے جال میں
پرواز کی شکست کا اقرار کر لیا
آزاد نغمہ، جس کی فضائیں بھی تھیں اسیر
نازک سی انگلیوں نے گرفتار کر لیا

پورب سرائے روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱ • محلہ بازار بجنور (یوپی) • [illegible] گورنمنٹ کالج، سیکر ۳۳۲۰۰۱

تبصرے

"سلگتا صندل" اور "پنکھڑیاں"

جنابِ سعید سہروردی کے شعری مجموعے ہیں: "سلگتا صندل" میں ان کی منتخب غزلیں، نظمیں اور گیت شامل ہیں اور "پنکھڑیاں" قطعات پر مشتمل ہے۔ دونوں کتابیں مرکز معاشی ترقی، ۴۰۰ اُجالا ہیں (؟) بھائی ٹمپل ہاؤس، نئی دلّی نے شائع کی ہیں۔ دونوں کی قیمت پانچ پانچ روپے ہے۔

سعید سہروردی صاحب کی بنیادی دلچسپی معاشیات سے ہے کچھ مدت پہلے ان کا ایک طویل مضمون "مسلمانوں کے اقتصادی مسائل اور ان کا حل" اخبارات میں شائع ہوا تھا پھر کتابی صورت میں بھی چھپا۔ اس طویل مضمون میں جو اپنے موضوع پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے ہندوستان کے موجودہ ماحول میں مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی مشکلات سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے ان کے اسباب و علل کی نشان دہی کی ہے اور ان مشکلات کے حل کے لیے مفید عملی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ زیرِ نظر کتابوں میں سے "سلگتا صندل" کے پیش لفظ میں جسے انھوں نے "عذرِ گناہ" کا عنوان دیا ہے وہ لکھتے ہیں: "یہ ایک ایسے فرد کا کلام ہے جس نے مشاعروں میں نہیں پڑھا، رسائل میں اپنی تخلیقات نہیں چھپوائیں . . . اگر معاشی ترقی کی تحریک کو آگے بڑھانے کی بات سامنے نہ ہوتی تو یہ سرمایۂ جاں بازار لانے کی نوبت نہ آتی" کتاب کے دوسرے صفحے پر یہ اعلان درج ہے:

"اس کتاب کی فروخت کی آمدنی اس تحریک کو آگے بڑھانے میں صرف ہوگی جس کا تعارف میری پہلی کتاب "مسلمانوں کے اقتصادی مسائل اور ان کا حل" میں کرایا جا چکا ہے"

سعید سہروردی صاحب کا کلام تازگی کے وصف کا حامل ہے۔ اور یہ تازگی اور نیاپن غالباً زندگی اور فن دونوں کی مروجہ اقدار سے کسی قدر شعوری انحراف کی دین ہے۔ ان کا یہ قطعہ دیکھیے:

میں ہوں اُس نسل کا شاعر جو الم خوردہ ہے
جس کا معبود نہ کعبے میں نہ بتخانوں میں
جس نے توڑے ہیں عقائد کے حسیں شیش محل
اور اب خاک بسر پھرتا ہے ویرانوں میں

اس قطعے میں جو کسک ہے وہ اور بھی کئی مقامات پر ظاہر ہوئی ہے لیکن سہروردی صاحب کی شاعری کا مجموعی تاثر امید پرستی اور حوصلہ مندی کا ہے۔ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ عقیدے سے محرومی ان کی مجبوری نہیں، انھوں نے ذہنی اختیارات سے کام لیتے ہوئے پرانے عقائد سے خود اپنا دامن چھڑایا ہے اور وہ حال کے بنجر میں ایک فکری خود اعتمادی کے ساتھ مستقبل کی بہتر زندگی کی آس لیے ہوئے ہیں:

جل بجھے آگ میں اپنی تو نظر پیدا کی
اب اس راکھ میں ملتی ہے تڑپ دُنیا کی
اے شبستانِ غمِ دل مرے زندانِ حیات
روزنِ فکر سے آتی ہے کرن فردا کی

سعید سہروردی صاحب کا خیال ہے کہ اُردو اور ہندی کی ادبی روایتوں کی اساس اور ان کا سماجی ماحول ایک ہے مگر ان کو جوڑنے والی کڑی مضبوط نہیں ہے۔ ان کا اشارہ غالباً اس طرف ہے کہ اُردو اور ہندی میں جو مشترک خصوصیات موجود ہیں، اُردو والوں نے یا ہندی والوں نے بھی انھیں نمایاں کرنے پر زور نہیں دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کے اس احساس نے ان کے گیتوں میں جگہ پائی ہے۔ ان کے گیتوں میں واقعی اُردو اور ہندی کے اسلوب باہم شیر و شکر ہیں لیکن جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے وہ تو ہمیشہ اسی ملی جلی زبان میں

لکھے گئے ہیں اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ گیت ایک ایسی صنف ہے، جو دونوں زبانوں میں مشترک ہے۔ اُردو شاعری کی دوسری اصناف میں اس اسلوب کی کامیابی کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا لیکن یہ لسانی تجربہ کامیاب ہوا تو اس کی افادیت ظاہر ہے۔

سہروردی صاحب کی دونوں کتابوں میں بعض عروضی مغالطے راہ پا گئے ہیں۔ ایک قطعہ جو دونوں کتابوں میں شامل ہے۔ اس کے دو آخری مصرعے یوں ہیں:

گھول دو امرت مری آواز میں آکر نئے انداز سے
جگمگائیں گیت میرے، عشق کا پیغام لے کر

قطعے کے پہلے دونوں مصرعے آخری مصرعے کے وزن میں ہیں۔ یعنی ان کی تقطیع چار بار فاعلاتن کی تکرار سے ہوتی ہے لیکن تیسرے مصرعے میں فاعلن کا رکن زیادہ ہے جس کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔

"سلگتا صندل" میں "ہم" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے تیسرے بند کے پہلے، دوسرے اور تیسرے مصرعے اور چوتھے بند کے پہلے مصرعے میں بھی یہی صورت پیش آئی ہے۔ چوتھے بند کے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں چوتھا رکن 'فاعلاتن' سے 'فاعلن' رہ گیا ہے۔ پانچویں بند کا پہلا مصرع کسی کی تقطیع میں نہیں آتا، دوسرے اور چوتھے مصرعے، چوتھے بند کے دوسرے اور چوتھے مصرعے کے مماثل ہیں اور آخری بند کے پہلے مصرعے میں 'فاعلاتن' کا ایک پورا رکن زیادہ ہو گیا ہے ——

سہروردی صاحب جیسے ردیف اور قافیے اور ان کا لحاظ رکھنے والے شاعر کے کلام میں یہ غلطیاں یا انھیں بدعتیں کہہ لیجیے، ذوق پر گراں گزرتی ہیں۔

—— مخمور سعیدی

کلام

سید فضل المتین اُردو کے جانے پہچانے قلمکار ہیں۔ وہ راجستھان کے ایک مذہبی اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، شاعری کے ساتھ ساتھ تصوف اور تحقیق اور تنقید کے شعبوں سے بھی انھیں دلچسپی ہے۔ ان کا کلام اور ان کے مضامین ملک کے مختلف علمی ادبی رسائل میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں —— "کلام" ان کی شاعری کا مجموعہ ہے جو راجستھان ساہتیہ اکاڈمی (سنگم) اودے پور کے

زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ قیمت چار روپے پچھتر پیسے ہے۔

"کلام" میں متین صاحب کی غزلیں، نظمیں اور کچھ منتخب اشعار شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں "چند باتیں" کے زیر عنوان متین صاحب رقمطراز ہیں:

"شاعری میرے لیے نہ شوق ہے، نہ مشغلہ اور نہ پیشہ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں جب کچھ کہنا چاہتا ہوں، یعنی کہنے پر مجبور ہوتا ہوں تو اظہار کر بیٹھتا ہوں اور اکثر میرا یہ اظہار ایک طویل عرصے کے جمود، سکوت، سکون اور ہیجان کے بعد ہوتا ہے۔"

گویا شعر گوئی متین صاحب کی ایک داخلی ضرورت ہے اور انھوں نے ہمیشہ کسی اندرونی تحریک کے زیر اثر ہی شعر کہے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہر حقیقی شاعر کا معاملہ شاعری کے ساتھ یہی رہا ہے لیکن شعر گوئی کے دوران، بالخصوص غزل گوئی کی صورت میں بعض رسمی اور روایتی مضامین کا غزل میں در آنا تعجب خیز نہیں، قافیے کا لالچ ہر غزل گو شاعر کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کشش سے بچ کر نکل جانا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔ متین صاحب کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں، جو ان کے اپنے تجربات کا اظہار ہیں لیکن روایتی انداز کے اشعار بھی ان کے ہاں مل جاتے ہیں۔ ان کے چند اشعار سے جو ان کی شخصیت کے غماز ہیں آپ بھی لطف اٹھائیے:

رہے ہیں وقت کے ہر دم مزاج داں بن کر
خیالِ گردشِ دوراں ہم اور کیا کرتے

جب کر ہی لیا ترکِ تعلق کا ارادہ
اچھا ہے کہ گزری ہوئی باتیں نہ دلا یاد

میری خاموشی کو سمجھے ہو شکستِ احساس
ایسے حالات تو طوفاں کا پتہ دیتے ہیں

جو ہر وقت ٹھہرتے ہیں زمانے کے حضور
دیدۂ فکر جو بھولے سے بھی وا کرتے ہیں

حرفِ دشنام زبان پہ دل میں کدورتیں
اپنا جواب آپ ہیں یاران نیک نام

ہر طرف ہے سکوتِ غم طاری
داستاں کیا سُنا رہی ہے رات
کتنے سنسان راستے ہیں متین
کتنی چپ چاپ جا رہی ہے رات

نظموں میں متین صاحب کے ہاں تین رنگ صاف نظر آتے ہیں۔ "تم کیونکر بھید چھپاؤ گی" اور اس انداز کی بعض اور نظمیں اختر شیرانی اور دوسرے رومانی شاعروں کی یاد دلاتی ہیں۔ "یہ دور باقی نہیں رہے گا" اور کچھ اور نظموں میں ترقی پسند اسلوب جھلکتا ہے اور "رات اور دن" جیسی چند نظمیں ایسی ہیں جن پر جدیدیت کا اثر ہے۔ ان تین رنگوں کی آمیزش سے متین صاحب کا اپنا رنگ نمایاں ہو سکتا ہے اور اس کی جھلکیاں ان کی متعدد نظموں میں نظر بھی آتی ہیں۔ "کلام" متین صاحب کا پہلا مجموعہ ہے اور اس میں غالباً اس خیال سے کہ قاری ان کے تخلیقی سفر کے تدریجی مراحل سے واقف ہو سکے، اپنے زمانہ مشق کی ابتدائی چیزیں بھی انھوں نے شامل کر دی ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کے اگلے مجموعے میں ان کا انفرادی رنگ اور نکھر کر سامنے آئے گا۔

——— مخمور سعیدی

شامِ دوستاں آباد

مصنف: ڈاکٹر وزیر آغا۔ ناشر: مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، لاہور۔
صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے۔

شامِ دوستاں آباد میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ایسی کچھ شخصیتوں تصویروں اور کتابوں سے وابستہ اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو انھیں بہت عزیز ہیں۔ ان کی ان تحریروں میں گلاب کے شگفتہ پھول کی سی تر و تازگی اور شبنم کی سی لطافت ہے۔

"میرے بچپن کا دوست" میں ایک بچے کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ "نانا جان" میں ایک ایسی شخصیت کا عکس ابھارا گیا ہے جو حالاتِ زمانہ سے دل برداشتہ ہے۔ لیکن عمر رسیدہ ہونے اور اپنا سب کچھ کھو دینے پر بھی اس کے بطن سے عشق کی چنگاری بجھنے نہیں پاتی۔ "ٹوٹا ہوا تارا" میں شمس آغا کی زندگی کے دو ادوار کا نقش ہے۔ ایک دور وہ ہے جب وہ ایک نقطے سے ابھر کر خود کو سارے جہاں پر محیط کرتا ہے اور دوسرا دور وہ آتا ہے جب شمس ٹوٹ چکا ہوتا ہے اور اس میں دہشت پسندی کے عناصر اُبھر آتے ہیں۔ "مولانا سے میری پہلی ملاقات" میں ایک بالکل نئے ادیب کی ذہنی کشمکش کا عکس ہے —

"مولانا سے میری آخری ملاقات" میں مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت کے نمایاں خدوخال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا بیک وقت اہم مضمون بھی لکھ رہے ہیں اور ساتھ ہی ٹیلیفون پر حکیم احمد شجاع کو جو سویرے سے اپنے اشعار سُنا رہے ہیں، داد بھی دیتے جا رہے ہیں۔ ایک اور حضرت ہیں جو انھیں نٹ پاتھ پر گھیر کر بلند آواز میں اشعار سنا رہے ہیں اور مولانا لطف لے کر اشعار بھی سُن رہے ہیں اور اشعار کا مطلب بھی۔ ایک اور صاحب ہیں جو تانگے میں گزرتے ہوئے مولانا سے ایک اٹھنی مانگتے ہیں اور اٹھنی ملتے ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ نہ سلام نہ دعا۔ مولانا نے ایک ساتھی کے استفسار پر بتایا کہ سعادت حسن منٹو تھا۔ "راجہ مہدی سے میری پہلی اور آخری ملاقات" میں راجہ صاحب کی لااُبالی طبیعت کا ذکر تو ہونا ہی تھا کچھ لطیف چٹکلے بھی آئے ہیں۔ مثلاً راجہ صاحب ایک گھنٹے سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں اور وہاں پان کی سُرخ پیکوں سے ایک اچھا خاصا جوہڑ وجود میں آگیا ہے اور چند سہمے ہوئے مسافر اسے غور سے تک رہے ہیں۔ گھر میں وہ راکنگ چیئر پر بیٹھے ہیں جو ان کے مختلف موڈز کا بیرومیٹر بھی ہے۔ اگر کسی کے آنے پر کرسی لرزہ بر اندام ہو جائے تو سمجھو راجہ صاحب کو ان کے آنے سے خوشی ہوئی اور اگر کسی کو دیکھتے ہی کرسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک جائے تو راجہ صاحب کا شی ناتھ اپنے باورچی کو اس کے سلسلۂ نسب سے آگاہ کرنے لگتے ہیں اور ملاقاتی طوفان کے آنے سے پہلے ہی ان کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔

دلی ریل کے ڈبے میں بلراج کومل اور کمار پاشی سے ملاقات اور اپنی بیگم کی بھبتی کا ذکر ہوا ہے اور بمبئی اور لاہور کا موازنہ ہے۔

"ہمارے ہاتھ میکانکی انداز میں حرکت کرتے رہے اور زبانیں بائیں اگلتی رہیں۔ درمیان میں جب کوئی زبان جائے کی چسکی کے لیے رکتی تھی تو دوسری بات کے دھاگے کو تھام لیتی تھی۔ ہم تو ان گھنٹے کے اس وقفے میں زیادہ سے زیادہ لاوا اگل دینا چاہتے تھے۔ ریل حرکت میں آگئی۔۔۔ یکایک میری بیوی نے جو اس ساری گفتگو کے دوران بالکل چپ چاپ بیٹھی تھی اپنی زبان کھولی اور ایک گرم سا

طنزیہ میرے کانوں سے آکر ٹکرا گیا۔ "عورتیں بیچاری تو مفت میں بدنام ہیں۔ توبہ!"

ڈاکٹر وزیر آغا نے ماضی کے جھروکے سے اپنے دل کے آنگن میں اُجالا کرنے کے لیے ایک جھلک اُبھاری ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی بہترین گھڑیاں اپنے ان دوستوں سے ہم کلام ہونے میں گزاری ہیں۔ یہ کتاب ایک انداز سے ذاتی روزنامچہ یا ڈائری سے گزر کر ایک عصری تاریخ بھی بن جاتی ہے۔

—— رام لال نابھوی

طرحِ نو۔ مصنف علیم صبا نویدی

ناشر: تامل ناڈ اُردو پبلی کیشنز، مدراس

قیمت: دس روپے

میرا ایک دوست کہا کرتا ہے کہ جو گویّا جتنا بے سُرا گاتا ہے اُس کا طنبورہ اتنا ہی خوشنما ہوا کرتا ہے مگر "طرحِ نو" کے نظر فریب گیٹ اپ کے اندر کروٹیں بدلتی شاعری میرے دوست کے قول کو غلط قرار دیتی ہے۔ علیم صبا نویدی نے اپنے عہد کے کرب کو جس طرح شعر کے قالب میں ڈھالا ہے اس سے اُردو کی جدید شاعری کی سچائی کا ایک اور ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

علیم صبا نویدی آج کے انسان کے کرب اس کی داخلی اُلجھن اور امید و بیم کی کشمکش کو علائم اور استعاروں میں ڈھالنے کے فن سے کتنے آشنا ہیں یہ مندرجۂ ذیل اشعار سے ظاہر ہوگا:

سانسوں میں آگ، لب پہ دھواں رُخ پہ دھند ہے
تم نے یہ کیسے شخص کی تصویر کھینچ لی

وہ ایک شخص جسے ڈھونڈھنا بھی مشکل تھا
بڑے خلوص سے رہنے لگا مرے اندر

تاریخ میری ذات سے آگے نہ بڑھ سکی
کچھ اس طرح سے صدیوں پہ بکھرا ہوا تھا میں
پگھل کے درد نے پائی ہے کائنات نئی
کہ سنگ سنگ یہاں بولتا سا لگتا ہے

ایسے بہت سارے اشعار اور ہیں جو "طرحِ نو" کو طلسم خانہ بناتے ہوئے ہمیں علیم صبا نویدی کی شاعری کے ابعاد سے واقف کراتے ہیں اور اس کی ذہنی بالیدگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے علیم زندگی کی پیچیدگیوں کو اشعار میں اُتارنے کے عمل میں سرگرم رہ کر ترقی کے زینے طے کرتے جائیں گے۔

—— کنور سین

شامِ میکدہ

مصنف: بال کرشن مضطر

ملنے کا پتہ: سنگم کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دلّی۔

قیمت: تین روپے۔

بال کرشن مضطر دشتِ شاعری کے پُرانے سیاح ہیں اُن کا کلام روایت کے پیڑ کی گھنی چھاؤں میں پروان چڑھا ہے۔ اُن کے اشعار میں نغمگی، شائستگی، برجستگی اور جذبات کی گرمی پورے رکھ رکھاؤ سے در آئی ہے۔ شاعری کی زبان سلیس اور شگفتہ ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

پیکرِ نور ہوں میں خاک کی تصویر نہیں
جس کو تخریب کا خدشہ ہو وہ تعمیر نہیں

اب کہیں میری دُعاؤں میں اثر پیدا ہوا
ذرّہ ذرّہ بھی نظر آتا ہے میرا دل مجھے

سجدۂ دیر و حرم میں بھلا رکھا ہے کیا
دل کے کعبہ خانہ میں کیا آپ کی تصویر نہیں

—— کنور سین

سُورج کے تماشائی

ترتیب: ابراہیم انجم (صدر بزمِ توفیق)

ملنے کا پتہ: بزمِ توفیق، محمود واڑی، بڑودہ

قیمت: دس روپے۔

"سورج کے تماشائی" بڑودہ کے چھ شاعروں ——

دردؔ بڑودوی، نسیم القادری، خلش بڑودوی، شرر القادری، عزیز قادری اور جمال مہدوی کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ تمام شعرا نے اپنے اپنے رنگ میں اچھے شعر کہے ہیں۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ یہ چھ چہرے آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔ ان کی اپنی اپنی پہچان ہے جس کی وجہ ان کی انفرادی حسیت، تجربے اور مشاہدے کی رنگا رنگی ہے۔

اُلجھے اُلجھے ہیں ہر اک دانا و بینا کے قدم
سُلجھا سُلجھا سا مگر دامِ بلا آج بھی ہے
(دردؔ)

یہ جہد و عمل کی دُنیا ہے یاں شور مسلسل ہوتا ہے
خاموش رہے بھی دیوانے تو چیخ اُٹھیں گی زنجیریں
(نسیم القادری)

کوئی تبدیلی نہ آئی آندھیوں کے بعد بھی
کون جانے مجھ میں پتھر ہے کہ میں پتھر میں ہوں
(خلش بڑودوی)

خزاں جو آئے تو لُٹتی ہے کائناتِ چمن
بہار آئے تو سرسبز باغ جلتے ہیں
(شرر القادری)

اُٹھو یہاں سے یہ کیسا نگر ہے فنکارو
یہاں تو سر نہیں، جلاّد انگلیاں کاٹے
(عزیز قادری)

فرشِ گل باعثِ تسکینِ دل و جاں ہی سہی
کوئی مخصوص چمن آبلہ پا مانگے ہے
(جمال مہدوی)

کتاب اچھی چھپی ہے اور گیٹ اپ بھی خوشنما ہے۔

——— کنول سین

شمعِ فروزاں

شاعر: عروج زیدی
قیمت: پانچ روپے
ناشر: عروج زیدی، گھیر سیف الدین خاں۔ رام پور۔ یو پی۔

اُردو شاعری کی قدیم اصناف میں قطعہ بھی شامل ہے۔ لیکن قدیم اور جدید قطعہ میں مزاج اور ماحول کے اعتبار سے نمایاں فرق ہے۔ قدیم قطعہ میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی تھی، عام طور پر دو اشعار سے زیادہ ہی ہوا کرتے تھے۔ دو اشعار کا قطعہ غزل میں پیوست ہوتا تھا۔ جس طرح عربی قصیدہ کی "تشبیب" کو الگ کرنے سے غزل وجود میں آئی۔ اسی طرح غزل میں پیوست چار مصرعی قطعہ کی علیحدگی سے جدید قطعہ وجود میں آیا۔ اور اس کو آزاد اور کھُلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ جس کی وجہ سے قطعہ نے رباعی کی طرح ایک آزاد اور خود مکتفی ہیئت کا درجہ حاصل کر لیا۔ جدید قطعہ کی ہیئت کی تشکیل اور تکمیل میں جن شاعروں نے خصوصی توجہ کی۔ ان میں احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، نریش کمار شاد، اور عروج زیدی کا کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ "شمعِ فروزاں" میں عروج زیدی کے ایک سو سے زیادہ قطعات شامل ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو اور شعری مجموعے "جھلکیاں" اور "دلِ لخت لخت" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

عروج زیدی کا تعلق "فنِ اصلاحِ سخن" کے اُس دبستان سے ہے۔ جس نے ادبی زبان کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے عروض و بلاغت اور محاسن و معائب سخن کا نہ صرف عرفان حاصل کیا ہے بلکہ ان کو اپنی شاعری میں بڑی احتیاط اور سلیقے سے برتا بھی ہے۔ وہ لفظوں کے مزاج داں، ترکیبوں اور تشبیہوں کے ادا شناس نیز فنی اصولوں کے رمز سے آشنا ہیں۔ اس لیے عروج زیدی کے یہاں اس توانا روایت کا گہرا اثر ہے جو صدیوں کی مشاقی کے بعد صحتِ زبان و بیان کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ واضح کرتا چلوں کہ عروج زیدی روایت پرست نہیں ہیں بلکہ انھوں نے روایت کے صالح عناصر سے اپنے فن کی نقش گری کی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں فیشن اور فارمولے کے نام پر محض تجربے کرنے سے روکتی رہی ہے۔ انھوں نے اپنے افکار و جذبات کی نقش گری کے لیے اُس شاعرانہ زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا جو ایک صدی سے اُردو شاعری کی آبرو سمجھی جاتی رہی ہے۔ اور جس کو داغ اسکول اور امیر اسکول کے مستند شعرا نے پروان چڑھایا ہے۔

عروج زیدی کے قطعات مختلف موضوعات پر ہیں لیکن

بقیہ صفحہ

مانگے کا اُجالا

ڈی، ایچ، لارنس

شہرۂ آفاق ناول نویس، ادیب و شاعر، ڈرامہ نگار اور متعدد کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ ادب میں جنسی تجربات و مشاہدات کو بجنسہٖ کھلے الفاظ میں بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کے اعتبار سے بڑی شہرت رکھتا تھا، بعض کا خیال ہے کہ استلذاذ بالمثل کا بھی قائل تھا اور عملی طور پر اس کا عادی ہونے کے باعث اس طرح آسودگی حاصل کرنے کا پرچار بھی کرتا تھا۔ اس کے کئی ناول سرکاری طور پر ممنوع قرار دیے گئے اور ضبط کر کے جلا دیے گئے کیونکہ وہ فحش نگاری کے مرقع ہونے کے باعث مخرب اخلاق تسلیم کیے گئے تھے اور جب اس کا ایک ڈرامہ عملی لغزشوں کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیا گیا تو بے راہ روی اختیار کرنے والوں کے سوا انگلستان کا ہر شخص اس کے خلاف چیخ پڑا، اس پر مقدمہ چلایا گیا لیکن اس ذلت و بدنامی کے باوجود وہ اپنے موقف پر جما رہا۔ اس کا پورا نام ڈیوڈ ہربرٹ لارنس تھا لیکن ادب میں صرف ڈی، ایچ، لارنس کے نام سے مشہور تھا۔

وہ ۱۱ ستمبر ۱۸۸۵ء کو نوٹنگھم شائر، انگلستان کے علاقے ایسٹ وڈ میں پیدا ہوا جو کوئلے کی کانوں کی وجہ سے مشہور تھا، اس کا باپ جو معمولی پڑھا لکھا تھا ایک کان میں مزدوری کرتا اور عسرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی ماں شریف النفس، جفاکش عام طور سے ملنسار تھی لیکن جب ناراض ہوتی خصوصاً اپنے شوہر پر تو لہجے کی شیرینی سے زیادہ خطرناک ہو جاتی تھی۔

ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ والدین کی باہمی چپقلش کم سن لارنس پر مذموم اثر ڈالنے کے لیے کافی تھی، جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا، ماں والہانہ محبت کے ساتھ اسے چاہتی تھی اور جب عہدِ جوانی میں ایک بار وہ علیل ہوا تو ماں نے تیمارداری اتنی دلبستگی کے ساتھ کی کہ لوگ ان کی باہمی قربت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے اور مطعون کرنے لگے۔

وہ بہت ہی نازک اندام تھا، وہ مدرسہ میں ایسے کھیلوں میں حصہ نہیں لیتا تھا جن میں جسمانی قوت کا مظاہرہ ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کا جلیس رہتا اور انھیں کے انداز میں گفتگو کرتا تھا۔ بارہ سال کی عمر ہونے تک وہ مقامی مدرسے کا طالب علم رہا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے اپنی تعلیمی قابلیت کی بنا پر وظیفہ حاصل کر لیا تو شہر کے ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا جہاں پہونچنے کے لیے اسے روزانہ دونوں وقت ریل میں سفر کرنا پڑتا تھا اگر موسم زیادہ خراب ہوتا یا ریل کا وقت گزر جاتا تو ساتھ والی کسی لڑکی کے گھر قیام کر لیتا تھا۔ ماں بڑی بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کرتی اور جانتی تھی کہ یہ صورتِ حال اس کے بیٹے میں حسن پرستی اور جنسی کشش کی ترغیب پیدا کر دے گی، لیکن وہ کوئی دوسرا حل بھی پیش نہیں کر سکتی تھی، وہ برہم ہو کر خاوند پر غصہ اتارتی کہ تو نے ترقی کے لیے کوئی ایسا پیشہ کیوں نہیں اختیار کیا کہ اس کی وجہ سے خود ہمیں شہر جا کر رہنا ہوتا۔ لارنس کے ایک ناول "بیٹے اور عشاق" میں گھر کا یہ ماحول اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

گھر کے قریب رہنے والے ایک نوجوان خوبصورت لڑکے ایلن سے بھی اس کی دوستی ہو گئی۔ چھٹی کا سارا دن اور روزانہ کا فالتو وقت عموماً اسی کے گھر میں بسر ہوتا اور کبھی کبھی ساری رات وہاں گزار دیتا تھا ——— سیاہ بالوں اور گہری آنکھوں والی ایلن کی بہن جیسی اس سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ لارنس کی ماں

کو یہ تحریت بہت اکھرتی تھی لیکن بیٹے کو روکنے سے قاصر رہتی تھی کیونکہ وہ گھر سے بالکل چلے جانے کی دھمکی دیتا تھا، وہ ماں کی نافرمانی کرتے ہوئے جیسی سے شادی کر لینا چاہتا تھا، ماں کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا کہ دونوں میں جنسی تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ حالانکہ لارنس کی عمر اس وقت سترہ سال تھی لیکن اپنے ساتھ اس کے برتاؤ کی بنا پر ماں کا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا تھا، ماں کا یہ خوف بھی بے بنیاد نہیں تھا کہ اس کی بے راہ روی کے باعث کہیں وہ مرض بیٹے کو لاحق نہ ہو جائے جو باپ سے ورثہ میں مل سکتا تھا۔

لارنس ۱۹۰۳ء سے دو سال تک اس مرکز سے وابستہ رہا جہاں استادوں کو تربیت دی جاتی تھی، لیکن وہاں تعلیم سے زیادہ جنسی مشاغل باعثِ کشش تھے۔ اس وقت جو تجربات حاصل ہوئے انھیں لارنس نے کچھ عرصے بعد اپنی کتاب "تیر کمان" میں قلم بند کر دیا۔ اشاعت کے فوراً ہی بعد یہ کتاب ممنوع قرار پائی اور لارنس کا نام خطرناک ادب پیش کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں بھی جہاں شاہی وظیفہ مل جانے کے باعث اس کا داخلہ ممکن ہوا تھا، اس کی دلچسپیاں حسب معمول رہیں اور جب کھانسی کے بعد پہلی بار اسے خون آیا تب بھی کوئی ایسی فکر لاحق نہیں ہوئی جو اسے غلط روش سے ہٹا دیتی، ماں کی محبت بھی کوئی دوسرا لائحہ عمل پیش نہیں کر سکتی تھی۔ اس زمانہ میں اس نے ایک ناول "سفید طاؤس" لکھنا شروع کیا جو چار سال بعد مکمل ہو سکا۔

۱۹۰۸ء میں وہ کرڈیڈن کے ایک مدرسے میں پڑھانے لگا جہاں تنخواہ کم اور دوسری دلچسپیاں زیادہ تھیں، یہاں کے مشاغل ساڑھے تین سال تک جاری رہے۔ خرابیِ صحت کے باعث اسے ۱۹۱۱ء کے آخر میں ملازمت ترک کر دینی پڑی۔ یہاں ایک لڑکی ہیگنیز اور ایک استانی ہیلن سے اس کی دوستی زیادہ مہنگی پڑی۔ کیونکہ اس کی صحت زیادہ گر گئی۔ ملازمت سے الگ ہو کر اس نے ناول نویسی کے ساتھ ساتھ شاعری بھی شروع کر دی، کیونکہ کچھ تو روپیہ کمانا ضروری تھا۔ اسی زمانہ میں ایک یہ صدمہ بھی پہنچا کہ اس کی ماں دق کے باعث فوت ہو گئی۔ وہ اپنی زندگی ہی سے نہیں سارے زمانے سے بیزار رہنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ انگلستان سے باہر کسی اور ملک میں جا کر رہے گا۔ جہاں اس کی صحت بحال ہو سکے۔

اس نے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ویکلے سے فون پر مدد کی درخواست کی، کیونکہ پروفیسر کی بیوی ایک جرمن عورت تھی۔ پروفیسر نے اسے گھر پر آنے اور مفصل گفتگو کرنے کی دعوت دی۔ وہ فوراً وہاں پہونچ گیا، پروفیسر کی بیوی فرائیڈا سے تعارف کرایا گیا، وہ تین بچوں کی ماں اور بیحد خوبصورت عورت تھی، شوہر سے بارہ سال کم عمر ہونے کے باعث جوان بھی معلوم ہوتی تھی، پہلی ہی ملاقات میں بے تکلفی شروع ہوئی اور پھر تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ وہ نہایت چنچل، شوخ اور نئے طرزِ زندگی کی دلدادہ تھی، اس کی طبیعت کے برعکس پروفیسر خاموش طبع انسان تھا اور مطالعہ کے سوا کوئی دوسرا شغل نہیں تھا اس لیے اکثر میاں بیوی میں ناچاقی رہتی تھی۔ لارنس سے ملاقات کے بعد فرائیڈا کے لیے نئے ایوانِ عشرت کے دروازے کھل گئے۔ چونکہ لارنس کا دلی منشا ملک سے باہر جانا تھا اور وہ بھی اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے وطن جانا چاہتی تھی، اس لیے دونوں نے سفرِ جرمنی کا پروگرام بنا لیا، پروفیسر کو اعتراض تھا لیکن اس کی زیادہ چلی نہیں، فرائیڈا نے تمام اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ لارنس اپنے عزیز و اقارب، دوست، احباب اور چاہنے والوں تک کو چھوڑ کر جرمنی جانے کے لیے تیار ہو گیا، بظاہر اس کا دورہ عارضی تھا لیکن مستقبل کا علم کسے تھا۔ فرائیڈا ایک متمول خاندان کی عورت تھی، اس کے باپ کا رؤسا میں شمار ہوتا تھا، ماں باپ کو یہ مغالطہ دیا گیا کہ لارنس ہی فرائیڈا کا شوہر ہے کیونکہ اس نے انگلستان میں رہتے ہوئے پروفیسر ویکلے سے شادی کی تھی اور کسی نے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ یوں بھی لارنس فرائیڈا کے ساتھ شوہر ہی کی حیثیت سے رہنے لگا تھا، دونوں کی باہمی محبت والہانہ انداز کی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ وہ خواہشاتِ نفس کی آلودگیوں سے پاک نہیں تھی، لارنس کا برتاؤ اسی انداز کا تھا جو فرائیڈا چاہتی تھی، زندگی کی دلچسپیوں سے ہمکنار ہونے کے سلسلہ میں اس کی مراد بر آئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو حتیٰ کہ بچوں تک کو بھول گئی۔ اس دوران پروفیسر نے اسے کئی بار آنے کی تاکید کی مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی بلکہ اکثر

خطوط کا جواب بھی نہیں دیا۔ وہ طلاق چاہتی تھی، قانون کی بندشوں کے باعث صاف الفاظ میں لکھ نہیں سکتی تھی، دن، ہفتے، مہینے گزرتے چلے گئے یہاں تک کہ اسے انگلستان آئے دو سال ہو گئے۔

اس دوران میں لارنس کا قلم برابر چلتا رہا، کہانیاں، ناول اور نظمیں لکھتا رہا، انگلستان کے شائقین ادب میں اس کی نگارشات کی مانگ تھی، وہ ناشرین کی فرمائشیں پوری کرتا اور روپیہ کماتا رہا فرائیڈا نے اس کے کئی ناولوں کے ترجمے جرمن زبانوں میں کیے تاکہ وہ اس ملک میں بھی مقبول ہو جائے۔

لارنس نے اپنی نظموں میں فرائیڈا کو اپنے خیالات کا مرکز بنا کر جذبات کا اظہار کیا تھا اس لیے وہ بہت خوش تھی لیکن لارنس کو وہ مسرت نہیں دے سکتی تھی جو عمدہ صحت ہی کی بدولت ممکن ہو سکتی تھی۔

پرانے مرض میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے جنسی بے قاعدگی کے ساتھ ساتھ شراب نوشی میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا، اس کے بغیر وہ نہ فرائیڈا کو خوش رکھ سکتا تھا اور نہ قلم کا جادو جگا سکتا تھا۔ اس وقت کی زندگی کے پیش نظر لارنس نے ایک ناول "بے قاعدہ دخل انداز" لکھا۔ یہ بھی معاشرے کے تقدس کے خلاف تھا اس لیے سرکاری طور پر معتوب رہا لیکن اشاعت پر قدغن نہ ہونے کے باعث خوب بکتا رہا۔

اب فرائیڈا کی صرف ایک ہی آرزو تھی، وہ یہ کہ اسے طلاق مل جائے اور وہ لارنس سے باقاعدہ شادی کر لے، اس طرح بچے نہ ہونے کے لیے جو تدابیر اختیار کی جاتی رہی تھیں ان کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ وہ اپنے تین بچوں کا نعم البدل جائز صورت میں چاہتی تھی۔ اگست ۱۹۱۲ء میں جب لارنس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو آب و ہوا تبدیل کرنے کے خیال سے دونوں اٹلی چلے گئے تاکہ وہاں کی صحت بخش ہوا سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ وہاں رہتے ہوئے لارنس نے ایک نیا ڈرامہ اٹلی میں نمودِ شفق" لکھ ڈالا جو بہت مقبول ہوا لیکن اسے اصل حالت میں اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکا۔ اس پر احتساب کا اندیشہ تھا ———

جولائی ۱۹۱۳ء میں وہ دونوں اٹلی سے یورپ چلے گئے، وہ صحت کی تلاش میں زمین کا کونہ کونہ چھان ڈالنا چاہتا تھا لیکن صحت جغرافیائی حدود سے قطع نظر طبی اصولوں کے تحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دریا میں کوئی چھلانگ لگائے اور دامن تر نہ ہو۔

اسی سال ماہ جون میں وہ دونوں لندن پہنچے جہاں ان کی ملاقات کیتھرین مینسفیلڈ سے ہوئی یہ مصنفہ بھی لارنس کی غائبانہ عاشق تھی۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ فرائیڈا ان کے مابین حائل ہونا نہیں چاہتی تھی، اوّل تو اس کے لاشعور میں یہ حقیقت جاگزیں تھی کہ لارنس اس کا جائز شوہر نہیں ہے۔ دوسرے وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ صدمہ اس کی صحت کے لیے مزید تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ لارنس کی ملاقات لیڈی سنتھیا ایسکوئتھ سے بھی ہوئی جس کا تعلق لندن کے اونچے گھرانے سے تھا اور اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ لارنس پر اپنی رعنائیاں نچھاور کیے بغیر نہ رہ سکی۔

لارنس کا لندن میں مختلف انداز میں اتنا چرچا ہوا کہ زبانِ خلق نے بیک وقت کئی نقارے بجا دیے، ہر طنبورے سے ایک نیا سُر نکلا، کسی نے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور کسی نے ملامت و تضحیک کے تیر و نشتر بکھیر دیے، پروفیسر ویکلے ان تبصروں میں گھر کر بالکل ہی زچ ہو گیا اس نے غیر مشروط طور پر اپنی بیوی کو طلاق دے دی جو تین سال سے اس کی شریکِ حیات نہیں رہی تھی۔ فرائیڈا کے لیے یہ فیصلہ ناقابلِ یقین لیکن ہر لحاظ سے مسرت بخش تھا، اب وہ آزاد تھی، چنانچہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۴ء کو اس نے باقاعدہ لارنس سے شادی کر لی جس میں بہت سے ادیب اور شاعر شریک ہوئے۔ یہ مسرت یقیناً بے پایاں تھی خصوصاً اس لحاظ سے بھی کہ شریف النفس پروفیسر نے فرائیڈا کو اجازت دے دی کہ وہ جب چاہے اپنے بچوں سے مل لے، اس طرح اس کی ایک اور تمنا بھی پوری ہو گئی۔ اب لارنس کو چاہیے تھا کہ وہ فرائیڈا کا پُرخلوص رفیقِ زندگی ہو جاتا لیکن اس کی طبیعت بدل نہ سکی، لیڈی اسکوئتھ اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی، اس کے ساتھ تعلقات کی پینگیں بھی بڑھتی رہیں چنانچہ لیڈی چیٹرلی کے عنوان سے جو ناول لکھا اس میں اسی حسین ساحرہ سے ہم آغوشی کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ یہ ناول عرصہ دراز تک ممنوع رہا اور جب احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کو ڈرامے کے انداز میں اسٹیج پر پیش کیا گیا اور خلوت کی سب باتیں جلوت میں دکھا دی گئیں تو بداخلاقیوں کا ارتکاب کرنے والے لوگ بھی اس کے

خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ مقدمہ جیت گیا اور امتناعی پابندیاں اٹھالی گئیں۔

جب پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو دونوں میاں بیوی لندن سے ترک سکونت کر کے بکنگھم شائر چلے گئے، جو محاذِ جنگ سے ذرا دُور تھا۔ یہاں لارنس کا تعارف شہرۂ آفاق فلسفی برٹرنڈ رسل سے ہوا۔ شروع میں تو اسے لارنس کی کوئی بات بُری معلوم نہیں ہوئی لیکن بعد میں وہ اس سے نفرت کرنے لگا اور ایک روز خط کے ذریعہ لارنس سے تعلقات منقطع کر لیے، بے حس لارنس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اب اس نے اور فرائیڈا نے اپنا گھر ٹوکرے میں اٹھا لیا تھا، مارچ ۱۹۲۰ء میں وہ سسلی پہنچے، وہاں رہ کر اس نے "عصائے ہارون" لکھا۔ وہ کیپری بھی گئے، پھر سیلون گئے جہاں شراب کشید کرنے والے ایک کارخانے کے مالک سے دوستی ہو گئی اس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی لیکن لارنس کی جوانی غلط کاریوں کے باعث وقت سے پہلے ڈھل چکی تھی، بیماری نے بھی اس کا تعاقب تنگ کر رکھا تھا وہ وہاں سے آسٹریلیا چلے گئے۔ لارنس کو ایک ہسپتال میں داخل ہونا پڑا جہاں ایک نرس مولی اسکنر سے ایسی رقابت ہوئی کہ اگلا ناول "جھاڑی میں لڑکا" جب شائع ہوا تو "شریک مصنف" کی حیثیت سے اس کا نام بھی سر ورق پر شائع کیا گیا۔ جونز کے لیے بڑا اعزاز تھا لیکن اس اعزاز کی اسے قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔

۱۰ اگست ۱۹۲۴ء کو دونوں امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے، سفر کے دوران میں ان کی ملاقات مسز میبل ڈوج اسٹرن سے ہوئی جو لکھ پتی خاتون اور لارنس کی غائبانہ گرویدہ تھی، وہ دونوں کو میکسیکو میں اپنے گھر لے گئی، یہ حبشی النسل اور کردار کی بہت اچھی تھی۔ وہ لارنس کے صرف علاج معالجے میں کام آ سکی وہاں رہتے ہوئے اس نے چند امریکی ناشرین سے تعلقات قائم کیے اور امریکہ کے لیے اپنے چند ناولوں کے حقوقِ اشاعت فروخت کر دیے۔

امریکہ سے بہت جلد دل بھر گیا تو فرائیڈا کو اپنا وطن یاد آیا، وہ جرمنی جانے کے لیے تیار ہو گئی، وہ خاص طور سے وہاں جا کر خود یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ لڑائی کے دوران میں اس کے عزیز و اقارب پر کیا گذری؟ وہ جرمنی گئی تو لارنس نے اٹلی کا سفر کیا۔ وہاں بہت سے لوگوں نے لارنس کی حرکات و سکنات سے پتہ لگایا کہ اس پر پاگل پن کی کیفیات طاری ہونے لگی ہیں لیکن دراصل مرضِ دق کی شدت نے اسے کمزور و نحیف کر کے کسی قدر چڑچڑا کر دیا تھا۔

ماہ نومبر کے وسط میں لارنس انگلستان کے لیے روانہ ہو گیا، یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ فرائیڈا ابھی جرمنی سے واپس آ گئی اور اپنے بچوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں مقیم ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ اس کی شریکِ زندگی ایک شخص مُرے کی محبت میں گرفتار ہے لیکن وہ شخص لارنس کا دیرینہ دوست تھا اور اس لیے وہ محبت کا جواب محبت سے نہ دے سکا۔ اس نے دوست کی خاطر اپنا دامن الگ رکھا، لارنس کو اس انکشاف سے غیر شعوری طور پر صدمہ ہوا لیکن وہ اس کا اظہار فرائیڈا سے نہ کر سکا، اب اس کی حالت قابلِ رحم ہو چلی تھی، اس نے اپنے ایک ناول کا مسودہ نکالا جو اس وقت تک شائع نہ ہو سکا تھا۔ "پرواز اژدہا" بہت پسند کیا گیا کیونکہ خلافِ معمول اس میں لارنس کی فحش نگاری کی زیادہ گہری جھلک نہیں تھی۔

اب اسے ایک نیا شوق پیدا ہوا، اس نے مصوری شروع کر دی لیکن اس کی تحریر میں جو عریاں نگاری پائی جاتی تھی وہ تصاویر کے پردے میں بھی جھلک دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس لیے جب اس کی تصاویر کا مرقع شائع ہوا تو حکومت نے اس کی فروخت ممنوع کر دی۔ یہ صدمہ بھی عظیم تھا۔ اس نے اپنے فن کی بریت میں ایک طویل مقالہ لکھا کہ عریانی اور فحش نگاری میں کیا فرق ہے؟ اور جس چیز کو قانون داں فحش کہتے ہیں وہ حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے دلائل ناقابلِ قبول سمجھے گئے۔

۶ فروری ۱۹۳۰ء کو وہ ایک سینے ٹوریم میں داخل ہو گیا اسے یقین تھا کہ اب زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اس کی عیادت کو آنے والوں میں سر آغا خان، ایچ۔ جی۔ ویلز اور ایلڈس ہکسلے بھی شامل تھے، جب شفا خانے کے منتظمین نے اس کے مرض کو لاعلاج قرار دے دیا تو فرائیڈا مجبوراً اس کو قیام گاہ پر لے گئی۔ دوسرے دن ۲ مارچ کو وہ اس جہان سے کوچ کر گیا اور فحش نگاری کی ایک طویل داستان اپنے پیچھے چھوڑ گیا، اس کی وفات کے کچھ عرصہ بعد فرائیڈا نے لارنس کے ایک دوست سے شادی کر لی، وہ اس کا تیسرا شوہر تھا۔

فضلِ حق قریشی ——— رگِ سنگ، ماہنامہ

یہ کتابیں ہم سے طلب کیجیے

کتاب	مصنف	قیمت
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	محمد یٰسین	۱۲-۰۰
اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	عنوان چشتی	۱۴-۰۰
انتخابِ کلامِ میر	عبدالحق	۷-۰۰
انتخاب شرح دیوانِ مومن	حامد حسین قادری	۷-۰۰
اردو ہندی ڈکشنری	مرتبہ: انجمن	۳۰-۰۰
اطلاقی سماجیات	جعفر حسین	۵-۰۰
اسلامی فن تعمیر	مبارز الدین رفعت	۷-۰۰
اسلام کے علاوہ مذاہب میں اردو کا حصہ	محمد عزیز	۱۰-۰۰
الواحِ فلسفہ	ظفر حسین	۵-۵۰
اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	عبدالحق	۲-۰۰
تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	۷-۰۰
حالی کی ایک جھلک	صالحہ عابد حسین	۲-۰۰
حالی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	۵-۰۰
دہلی کے اردو مخطوطات	صلاح الدین	۱۲-۰۰
زبان زندگی اور تعلیم	غلام السیدین	۳-۵۰
سیاسیات کے اصول مکمل	ہارون خاں شروانی	۵-۰۰
سب رنگ	مخمور سعیدی	۵-۰۰
سب رس کا تنقیدی جائزہ	منظر اعظمی	۴-۰۰
شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۷-۰۰
شعرِ بہار	مجنوں گورکھپوری	۳-۰۰
صحیفۂ خوش نویساں	احترام الدین شاغل	۱۲-۰۰
صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات	عتیق صدیقی	۱۵-۰۰
غالب	خورشید الاسلام	۱۸-۰۰
فرانسیسی ادب	یوسف حسین خاں	۱۷-۰۰
فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	۱۰-۰۰
فائز دہلوی دیوانِ فائز	مسعود حسین رضوی	۷-۵۰
قواعدِ اردو	عبدالحق	۱۰-۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
قومی یکجہتی اور سیکولرزم	تارا چند	۳-۵۰
کلاسیکی مغربی تنقید	محمد یٰسین	۶-۰۰
کچھ ذرے کچھ تارے	آنند نرائن ملا	۳-۵۰
کلامِ سودا	خورشید الاسلام	۸-۰۰
کاروانِ معیشت	نجم الدین شکیب	۸-۵۰
کچھ زر کی بابت	ابو سالم	۴-۵۰
گل کرسٹ اور اس کا عہد	عتیق صدیقی	۱۰-۰۰
مسائلِ تصوف	میکش اکبرآبادی	۹-۰۰
مرقعِ افغان	ابرار حسین	۳-۲۵
مطالعہ حضرت غمگین	محمد یونس خالدی	۳-۰۰
مقالاتِ حالی اول	عبدالحق	۷-۰۰
دردِ کشش	منور لکھنوی	۳-۵۰
مرزا محمد رفیع سودا	خلیق انجم	۱۵-۵۰
مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	۱۷-۰۰
نسیمِ مغرب	اے، سی، بہار	۲-۵۰
نسلیات اور جنسی انتخاب	محشر عابدی	۴-۵۰
نوائے ظفر	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۰-۰۰
نفسیاتِ افواہ	ولی الرحمٰن	۱-۷۵
ہندوستانی اخبار نویسی	عتیق صدیقی	۱۶-۰۰
یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	۱۳-۰۰
یادگارِ نظر	جگر بریلوی	۶-۵۰
دھرتی کا لمس	زاہدہ زیدی	۱۲-۰۰
حافظ اور اقبال	یوسف حسین خاں	۲۵-۰۰
روحِ اقبال	یوسف حسین خاں	۲۵-۰۰
غالب اور آہنگِ غالب	یوسف حسین خاں	۱۶-۰۰
غالب اور انداز	ضیاء الدین احمد شکیب	۶-۰۰
تلمیحاتِ غالب	محمود نیازی	۶-۰۰
نقشِ غالب	اسلوب احمد انصاری	۱۴-۰۰

خواتینِ کربلا — کلامِ انیس کے آئینے میں	صالحہ عابد حسین	۱۴-۰۰
غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۰-۰۰
خوشبو کا خواب	پریم وار برٹنی	۱۵-۰۰
حرفِ راز	مہندر پرتاپ چاند	۸-۰۰
کرن کرن	کنتا دیوی شکلا	۴-۵۰
کنھیا لال کپور — حیات اور کارنامے	ایس، جے، صادق	۱۰-۰۰
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	۶-۰۰
گل و گلزار	خواجہ عبد الغفور	۶-۰۰
بہر حال	مجتبیٰ حسین	۷-۰۰
قصہ مختصر	مجتبیٰ حسین	۹-۰۰
قطع کلام	مجتبیٰ حسین	۳-۵۰
تم کون ہو	آمنہ ابو الحسن	۶-۰۰
افاداتِ مہدی	مہدی افادی	۱۲-۰۰
پہلے آسمان کا زوال	کمار پاشی	۵-۰۰
فانی کی نادر تحریریں	مغنی تبسم	۶-۰۰
سائیڈ سے چلیے	مسیح انجم	۲-۵۰
ادب میں ابہام اور اس کے مسائل	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	۱۲-۰۰
رشید احمد صدیقی — شخصیت اور فن	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	۱۲-۰۰
بیاضِ شام	شاذ تمکنت	۱۰-۰۰
آتش تر	خمار بارہ بنکوی	۴-۰۰
شب کا رزمیہ	ڈاکٹر وحید اختر	۱۰-۰۰
ٹیپو سلطان	محمود خاور	۵-۰۰
نیا جزیرہ	اسلم عمادی	۸-۰۰
صلصلۃ الجرس	عمیق حنفی	۵-۰۰
صلیب	عرش صہبائی	۵-۰۰
برگِ سبز	آزاد نوتی	۱۰-۰۰
ارمغانِ بہار	اے ڈی بہار	۱۰-۰۰
آئلان	شباب للت	۶-۰۰
نگاہِ شوق	دھرم سروپ	۱۰-۰۰

روبرو	کمار پاشی	۱۰-۰۰
حبابِ رنگ	بانی	۱۵-۰۰
کوئے ملامت	کرشن موہن	۱۰-۰۰
جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۵-۰۰
بے وفا	نریندر شرما	۶-۰۰
حماقت	گوہر لدھیانوی	۶-۰۰
آگ	جمنا داس اختر	۵-۰۰
بردہ فروش	جمنا داس اختر	۵-۰۰
کینسر وارڈ	الیگزنڈر سولزینسٹین	۱۸-۰۰
گلاگ مجمع الجزائر	الیگزنڈر سولزینسٹین	۳۰-۰۰
اردو تحقیق اور مالک رام	شاہد ماہلی	۱۲-۰۰
دین یار جنگ — زندگی اور کام	برق موسوی	۴-۰۰
امرائی	بدیع الزماں خاور	۱۰-۰۰
یہ قربتیں یہ دوریاں	خلش دہلوی	۱۰-۰۰
الجھن	شمس الدین احمد	۱۵-۰۰
گردشِ رنگ	مختار ہاشمی	۱۰-۰۰
دشتِ نارسا	میر تقی علی خان ثاقب	۱۵-۰۰
دستخط	صادق	۱۰-۰۰
سفینۂ زرگل	فضا ابن فیضی	۱۲-۰۰
سلگتے پھول ڈھلکتے آنسو	لیاکھنڈ راجے بریلوی	۱۰-۰۰
زخم اور ناخن	فاطمہ انیس	۶-۰۰
میٹھا درد	شرت چندر	۷-۵۰
سانجھ بھئی چودیس	ساحر لکھنوی	۵-۰۰
کالے حروف	ظفر اقبال	۶-۰۰
دفتر والی سڑک	ضیا حسنی	۶-۰۰
آتشِ خاموش	صالحہ عابد حسین	۷-۵۰
گرتے ہوئے درخت	ثروت کاردلا	۵-۰۰
تھپیڑے	رابندر ناتھ ٹیگور	۶-۵۰
چند تصویرِ بتاں	شمیم احمد	۴-۲۵

بزمِ احباب

● نومبر ۷۶ء کے 'تحریک' میں شرون کمار ورما کا افسانہ 'اسٹون ایج' شمارے کی جان ہے۔ شرون کمار ورما ہمارے اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو افسانے کی روایت میں نہایت خاموشی سے اور خود اشتہاری کے ہتھکنڈوں کو اپنائے بغیر قابلِ قدر توسیع کی ہے۔ اُن کے بیشتر افسانے اپنے اپنے طور پر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 'عورت ایک ٹیڑھی سی لکیر' 'منزل ہے کہاں تیری' 'دلدل' اور ان کے علاوہ بھی کئی اور کہانیاں ہیں جن کا تاثر کبھی محو نہیں ہوتا — 'دلدل' تو ایسی کہانی ہے کہ اس ڈھنگ کی کہانی اس موضوع پر شاید ہی کسی اور نے لکھی ہو۔

مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جب لوگ افسانہ نگاروں کی مردم شماری کرنے بیٹھتے ہیں تو شرون کمار ورما کا نام اکثر بھول جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی ایک شخص کسی صنف کے چند فنکاروں کی فہرست بنا دیتا ہے اور اس کے بعد کے سارے لوگ ان ہی چند ناموں کی گردان سے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔

لہٰذا اُردو افسانے میں بھی بار بار اُن ہی لوگوں کے اسمائے گرامی سُننے میں آتے ہیں جن کی شخصیتیں ترقی پسند تحریک کی دین ہیں، یا پھر وہ لوگ جو تجریدی افسانوں کی بے چہرگی کے جلو میں اُبھرے۔ ان دو انتہائی سروں کے بیچ کی کڑی پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ ترقی پسندوں اور تجریدی افسانہ نگاروں کے علاوہ غیاث احمد گدی، رتن سنگھ، اقبال مجید، شرون کمار ورما اور اقبال متین جیسے فنکار بھی ہیں جو دونوں قسم کی انتہا پسندی سے قطعی الگ اور الفاظ کی بازی گری CONTRIVED جملوں کے SUPERIMP-OSITION یا کسی ازم اور کلیشے سے بچا کر کہانی کو اس کی روح سمیت زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں کہانی کوئی میکانکی عمل نہیں ہے اور ان کی کہانیوں کے کردار ROBOT نہیں ہوتے۔ انھیں اُردو افسانے کا تھرڈ فورس کہنا چاہیے۔ جس پر آج روشنی کم کم پڑ رہی ہے مگر اُردو افسانے کا حسّاس قاری، انھیں کل یقینی پہچانے گا۔ جیسا کہ شاعری کے زُمرے میں آج لوگ اختر الایمان کو پہچان رہے ہیں۔

——— پرکاش فکری، رانچی

● نومبر ۷۶ء کا 'تحریک' ملا۔ گوپال متل صاحب کے دونوں مضامین خیال انگیز ہیں۔ دوسرے طاقتور ملکوں کی طرح روس بھی دُنیا کی بڑی طاقتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مفادات اکثر مقامات پر ترقی پذیر ملکوں کے مفادات سے ٹکراتے ہیں۔ اس ٹکراؤ پر روس اپنی ڈپلومیسی کے پردے ڈالتا رہا ہے۔ اور پروپیگنڈہ کرتا رہا ہے کہ صرف مغربی طاقتیں ہیں جو ترقی پذیر ممالک کے مفادات کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اب اگر ترقی پذیر ملکوں کے قائدین کو حقیقی صورتِ حال کا احساس ہو رہا ہے تو اس پر روس کی بوکھلاہٹ قدرتی ہے اور متل صاحب نے اپنے مضمون میں اس کا بہت اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ "عرب اتحاد میں نیا رخنہ" بھی اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ روس کے کچھ اپنے سیاسی مفادات ہیں جو اسے دوسری ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں اور ان کے حصول کی راہ میں وہ کسی اصول پسندی کا بھی چنداں قائل نہیں ہے۔ افسوسناک صورتِ حال وہ ہوتی ہے جب کوئی ایسا ملک جیسے وہ اپنی بے غرضانہ دوستی کا یقین دلانے میں مصروف ہو، اس کی چال کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے۔ مصر میں ایسا نہیں ہوا۔ لیبیا کے کرنل قذافی کا رویّہ ابھی مبہم سا ہے اور وہاں کی بساط پر کیا نقشہ جمتا ہے یہ دیکھنا باقی ہے۔

——— شجاعت نبی، کھٹمنڈو، نیپال

باقی صفحہ ۴۶ پر

خبرنامہ

اُردو سمپوزیم اور مشاعرہ

۳۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو راجستھان ساہتیہ اکاڈمی اور ادبی سبھا کوٹہ کی مشترکہ کوشش سے کوٹہ میں ایک اُردو سمپوزیم اور کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ راجستھان ساہتیہ اکاڈمی کے ذمہ داروں کے علاوہ جن میں اکاڈمی کے صدر جنابِ وشنودت شرما اور ڈائرکٹر ڈاکٹر راجندر شرما کے نام خصوصیت سے لیے جا سکتے ہیں، اس پروگرام کی کامیابی کا سہرا ادبی سبھا کے صدر جنابِ اونکار لال چوہان سابق وزیر حکومتِ راجستھان سبھا کے جنرل سکریٹری جنابِ کلدیپ شریواستو، سبھا کے کنوینر جناب عقیل شاداب اور ان کے دوسرے رفقائے کار کے سر رہا۔ سمپوزیم کا آغاز صبح دس بجے ہوا اور اس کا افتتاح راجستھان اسمبلی کے اسپیکر جنابِ رام کشور ویاس نے اپنی عالمانہ تقریر سے کیا۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے ارتقا کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے اس بے بنیاد پروپیگنڈے کی پُرزور تردید کی کہ اُردو کی اصل غیر ہندوستانی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس زبان نے تاریخی تقاضوں کے تحت اسی سرزمین پر جنم لیا اور یہیں کی آب و ہوا میں پلی بڑھی۔ وہ مشترک گنگا جمنی تہذیب جو آج بھی ہمارا آئیڈیل ہے، اس کی تشکیل میں اُردو کا اہم رول رہا ہے اور اس کا یہ رول اب بھی برقرار ہے۔ انھوں نے ان مشکلات کا بھی ذکر کیا جو آزادی کے بعد سے اُردو کی ترقی اور اس کے فروغ کی راہ میں حائل رہی ہیں اور امید ظاہر کی کہ جیسے جیسے تقسیم کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کی دھند چھٹتی جائے گی، اور یہ عمل شروع ہو چکا ہے کہ اس زبان کو اپنی بقا اور ترقی کی مزید افزوں سہولتیں حاصل ہوتی جائیں گی۔ سمپوزیم کا موضوع تھا: راجستھان میں اُردو زبان و ادب کے دس سال۔ جن حضرات نے مقالے پڑھے ان کے اسمائے گرامی ہیں: جنابِ خضر گوری (کوٹہ) جنابِ باقی (دہلی)، ڈاکٹر فضلِ امام (جے پور) جنابِ باقر مہدی (بمبئی) ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی (ٹونک)، جنابِ ش۔ک۔ نظام (جودھپور) جنابِ خلیل تنویر (اودے پور) جنابِ ممتاز شکیب (جے پور) اور پروفیسر پریم شنکر سریواستو (جودھپور)۔ سمپوزیم کی صدارت جنابِ وشنودت شرما نے فرمائی اور سمپوزیم انھی کی صدارتی تقریر پر ختم ہوا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اُردو اور ہندی کے مشترک رشتوں پر روشنی ڈالی۔ اور راجستھان ساہتیہ اکاڈمی نے اپنے طور پر اس صوبے میں اُردو کی فلاح و بہبود کے لیے جو اقدامات کیے ہیں ان کا ذکر کیا۔ انھوں نے حکومتِ راجستھان کی طرف سے اُردو اکاڈمی کے متوقع قیام کا خیرمقدم بھی کیا اور کہا کہ راجستھان ساہتیہ اکاڈمی، اُردو اکاڈمی کے ساتھ تعاون کے لیے جس کی چیرمین شپ کے لیے جنابِ رام کشور ویاس کا نام تجویز ہوا ہے، ہر طرح آمادہ رہے گی۔

جنابِ بدھ سنگھ باپنا، صدر مجلسِ استقبالیہ نے مہمان ادیبوں اور شاعروں کے لنچ کا اہتمام اپنی وسیع و عریض رہائش گاہ شیش محل میں کیا تھا جو قدیم راجستھانی طرزِ تعمیر کا دلکش نمونہ ہے۔

مشاعرہ رات نو بجے اسٹیڈیم کے میدان میں ہوا اور دو بجے تک جاری رہا۔ مشاعرے میں راجستھان اور بیرون راجستھان کے جن شاعروں نے شرکت کی وہ تھے: جنابِ شمس سعیدی، جنابِ خمار بارہ بنکوی، جنابِ باقر مہدی، جنابِ محمد علوی، جنابِ کرشن موہن، جنابِ مخمور سعیدی، جنابِ بشیر بدر، جنابِ باقی، جنابِ کمار پاشی، جنابِ زبیر رضوی، جنابِ ماہر فاضلی، جنابِ معصوم سبزواری، جنابِ ممتاز راشد، جنابِ رستم بریلوی،

جناب کیف بھوپالی، جناب انور مرزاپوری، جناب احتشام اختر، جناب عقیل شاداب، جناب خلیل تنویر، جناب شاہد عزیز، جناب ممتاز شکیب، جناب ش۔ک۔ نظام، جناب کنور سین حسرت، جناب ملاپ چند آتش، جناب راشد ٹونکی، جناب طارق بدایونی، جناب ناظر خیامی، جناب مقرب حسین مقرب، جناب ناظم انصاری اور محترمہ عابدہ سلطانہ رفعت ٹونکی، سامعین کی تعداد ہزاروں میں تھی اور عام تاثر یہ تھا کہ کوٹہ ہی نہیں راجستھان بھر کے کسی شاعرے میں آزادی کے بعد اتنے اہم شاعر کبھی یکجا نہیں ہوئے۔ لیکن ایسے شعرا کی موجودگی میں سامعین کی صفوں میں جو نظم و ضبط ہونا چاہیے تھا، اس کی کمی تھی اور اس کے نتیجے میں کئی اچھے شاعروں کو ڈھنگ سے نہ سنا جا سکا۔

ادبی سبھا کوٹہ نے اس موقع پر ایک خوبصورت اور ضخیم سووینیر بھی شائع کیا جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں چھپا ہے اور سمپوزیم اور مشاعرے کے شرکا کی تصویروں سے بھی مزین ہے۔ عقیل شاداب صاحب نے اسے مرتب کیا ہے۔

بقیہ: بزم احباب

● 'تحریک' نومبر ۷۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔ انیس سعیدی، بانی، عزیز قیسی زیدی، ساحل احمد اور عشرت دھولپوری کی غزلیں بہت اچھی ہیں منظومات میں محمد امین تاباں، تنہا تماپوری (ستاروں کی سرگوشیاں) اور سرشار بلند شہری (انتظار) اچھے رہے۔ کرشن موہن بہت اچھے شاعر ہیں لیکن جب سے انھوں نے "کھردری شاعری" کے تجربات شروع کیے ہیں مجھے پسند نہیں آتے۔ کہانیوں میں شرون کمار ورما کی "استھون ٹیپ" قابل تعریف ہے۔

خلیق الزماں سحر (سیونی)

بقیہ: ایک حادثہ موت

اور تازہ خون سڑک پر پھیل گیا۔ پھر خون سرد ہو گیا۔ نہ بھیڑ اس کے چاروں طرف جمع ہوئی۔ نہ پولیس آئی۔ نہ جانے حادثہ کی تصویر لی گئی۔ نہ بیانات قلمبند ہوئے اور نہ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی گئی اور نہ ہی موت کا سبب معلوم ہو سکا۔ اس کی جیب میں کوئی ڈائری بھی نہیں تھی۔ کتنا بھیانک حادثہ تھا۔

●●

بقیہ: تبصرے

ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے سستی جذباتیت، لذتیت اور فضول گوئی سے ہر جگہ دامن بچایا ہے۔ ان کی زبان کی طرح ان کے افکار اور خیالات میں بھی سادگی اور سچائی کا جوہر ملتا ہے۔ چند قطعات مجھے بہت پسند آئے آپ بھی سنیئے:

میں نے برتا ہے میں سمجھتا ہوں
تجربوں کا ہوں آئینہ خانہ
زندگی ہے مسرت و غم کا
مختصر اور طویل افسانہ

اپنے ہر عیب کو ہنر کہنا
جذبۂ خود نگر کا حاصل ہے
نکتہ چینی تو سہل ہے لیکن
اپنی اصلاح کار مشکل ہے

زندگی میں خوشی بھی ہے غم بھی
ہم بہر حال اس سے پیار کریں
قہقہوں کو تو گن نہیں سکتے
اپنے آنسو بھی کیوں شمار کریں

—— (ڈاکٹر) عنوان چشتی

Regd. No. D (D) 118 Phone : 271649 December 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/67

TAHREEK

کینسر وارڈ

لفظوں کے کینوس پر اشتراکی روس کے سماجی نظام اور وہاں کے موجودہ معاشرے کی ایک زندہ، متحرک اور مکمل تصویر جو بے شمار انفرادی کرداروں اور رویوں کو بھی سامنے لاتی ہے۔

انسان اور فطرت، زندگی اور موت کے وہ بنیادی مسائل بھی اس ناول کا موضوع ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوئے۔

ایک ایسا ناول جو ممتاز روسی ناول نگاروں کی حقیقت نگاری کی پُرشکوہ روایت کو اور آگے لے گیا ہے۔

یہ ناول پہلے دو الگ الگ حصوں میں چھپا تھا، اب دونوں حصے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

ڈیمائی سائز۔

۶۶۸ صفحات۔

مضبوط اور خوشنما جلد۔

—— : قیمت : ——

اٹھارہ روپے

گلاگ مجمع الجزائر

مصنف کا کہنا ہے کہ —— "اس کتاب کے سبھی کردار اور واقعات حقیقی ہیں۔ نہ کوئی فرضی نام دیا گیا ہے نہ کہیں تخیل کی رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔"

یہ کتاب ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس پر یہ کہاوت پوری طرح صادق آتی ہے کہ حقیقت کبھی کبھی افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوا کرتی ہے۔

یہ کتاب ماضی قریب کے اُن مخفی گوشوں کو سامنے لاتی ہے جو اب تک معرضِ تحریر میں نہیں آئے تھے، بالخصوص دوسری جنگِ عظیم کے اتحادیوں کے باہمی تضادات پر نئی روشنی ڈالتی ہے۔

یہ کتاب روس کے جبری مشقت کے کیمپوں کے نظام اور اس نظام کے شکار لاکھوں مردوں اور عورتوں کی سرگذشت جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہے —— یہ کتاب انسانی حوصلے اور برداشت کی خیال انگیز روداد بھی سناتی ہے۔

ڈیمائی سائز —— ۵۰۰ صفحات —— آفسیٹ کی طباعت —— مضبوط اور خوشنما جلد۔

قیمت: لائبریری ایڈیشن: بیس روپے —— عام ایڈیشن، غیر مجلد: ستائیس روپے

نیشنل اکادمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قارئینِ تحریک کو نیا سال مبارک

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

جلد: ۲۴

جنوری ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

مندرجات

سالانہ قیمت: پندرہ روپے — فی کاپی: ایک روپیہ پچیس پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ — فی کاپی: چھ شلنگ

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر:

گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس۔ دہلی

مقام اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شاعرِ مشرق اور اردو کے عظیم مفکّر
علاّمہ ڈاکٹر محمّد اقبال نے 74 برس پہلے
آبادی کے مسئلے کے بارے میں فرمایا تھا:

"ضبطِ تولید
شرعاً
قابلِ اعتراض نہیں"

"علم الاقتصاد" مطبوعہ 1903ء)

کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی

گوپال متل

تقسیم سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ ایک یساری خاتون آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ تحریکِ آزادی میں جو کچھ بھی کیا ہے وہ مٹھی بھر یساریوں نے کیا ہے۔ سردار پٹیل سے ضبط نہ ہو سکا۔ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ان خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ابھی ابھی میری بہن نے جو کچھ کہا ہے، اسے سن کر مجھے گجراتی کی ایک کہاوت یاد آگئی۔ دوپہر کے وقت دو بیل ایک چھکڑے کو کھینچ رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ اسی چھکڑے کے نیچے ایک کتا بھی چل رہا تھا اور اپنے دل میں سمجھتا تھا کہ چھکڑا اسی کی طاقت سے چل رہا ہے۔"

ایمرجنسی سے کچھ پہلے اور ایمرجنسی کے بعد سوویٹ نواز کمیونسٹ پارٹی بھی کچھ اسی قسم کے واہمے میں مبتلا تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ کچھ تو داخلی نفوذ کے ذریعے اور کچھ باہر سے متحدہ محاذ کے نام پر کانگریس پر قابض ہو جائے گی۔ جو ان کے نزدیک ایک فعال جماعت نہیں تھی۔ اس پارٹی کے خطرناک عزائم کا پتا اس قسم کی تجاویز سے چلتا ہے کہ بیس نکاتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ترقی پسند کانگریسیوں اور بیرونی دوستوں کی جن سے مراد بدیہی طور پر کمیونسٹ تھے، کمیٹیاں قائم کی جائیں اور ان کمیٹیوں کو قانونی اختیارات حاصل ہوں۔ یہ تجویز پلیٹ فارم سے بھی پیش کی گئی اور کمیونسٹ جریدوں بالخصوص "لنک" اور "مین اسٹریم" کی طرف سے بھی پیش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر اس تجویز کو مان لیا جاتا تو صرف پارلیمنٹ ہی نہیں بلکہ حکومت کے دفتری نظام کو بھی ضعف پہنچتا کیونکہ اس قسم کی کمیٹیاں ایک متوازی حکومت ہوتیں۔

اس قسم کی تجاویز پیش کرنے کی جرأت کمیونسٹوں کو اس لیے ہوئی کہ وہ بھی مذکورہ یساری خاتون کی طرح غلط فہمی کا شکار تھے۔ وہ بھی چھکڑے کے نیچے چلنے والے کتے کی طرح یہ سمجھ رہے تھے کہ کانگریس کی گاڑی انھی کے بل پر چل رہی ہے۔

کانگریس کے لیڈر کافی دن تک خاموش رہے اور انھوں نے کمیونسٹوں کی اس معصومانہ خوش فہمی کی تردید ضروری نہ سمجھی لیکن جب کمیونسٹوں کی زبان درازی بڑھتی گئی اور انھیں کانگریس کے اندر ایک کمبنی گٹ بندی کا وجود بھی نظر آنے لگا تو کانگریس کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ کمیونسٹوں کو ان کی حقیقی اوقات کا احساس دلائے۔ پہلے پانچ کانگریسی ممبرانِ پارلیمنٹ مسٹر شنکر دیال سنگھ، مسٹر عزیز امام، بیگم میمونہ سلطان، مسٹر ذوالفقار علی خاں اور مسٹر ہری سنگھ نے ایک بیان میں کمیونسٹوں کو مشورہ دیا کہ اس پارٹی کو جس کی طاقت پہلے بھی برائے نام ہے اپنی توتوں کو کانگریس میں مداخلت پر صرف نہیں کرنا چاہیے، اور یہ بھی کہا کہ یہ پارٹی کلیتاً کیشوں اور رجعت پسندوں کی گٹ بندی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد پارلیمنٹ کے کچھ اور کانگریسی ممبروں نے اپنے پارٹی کے رفیقوں کی تائید میں بیان دیا جن میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کے خزانچی اور پنجاب صوبہ کانگریس کے صدر مسٹر جہندر سنگھ گل اور پنجاب کانگریس کے جنرل سیکرٹری ستیہ پال متل بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ کمیونسٹ پارٹی ایک انتہائی چھوٹی اور غیر اہم سیاسی

پارٹی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے کانگرس کا دم چھلا بنی ہوئی ہے۔ اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کانگرس کو یہ بتائے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

کانگرس کے لیڈروں نے کھل کر بات اگرچہ اب کہی ہے لیکن اشاروں کنایوں میں کمیونسٹ پارٹی کو پہلے بھی یہ بتایا جاتا رہا ہے کہ اس کی اوقات کیا ہے۔ مسز گاندھی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ کمیونسٹ کانگرس پارٹی کی کسی معاہدے کے تحت مدد کر رہے ہیں، وہ ہمیشہ یہ کہتی رہی ہیں کہ اگر کوئی میرا ساتھ دے رہا ہے تو میں اسے اس سے منع کیوں کروں؟

بہر حال کمیونسٹ پارٹی نے اپنی عظمت اور اہمیت کا جو ہوائی قلعہ تعمیر کیا تھا وہ پارلیمنٹ کے کانگرسی ممبروں کے ان بیانات کے بعد یقیناً مسمار ہو جائے گا۔

خطرہ اگر کوئی ہے تو یہ کہ کمیونسٹ لیڈر اپنی آئیں بائیں شائیں سے کانگرسیوں کو اپنے بارے میں پھر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دیں۔ جن لیڈروں نے کمیونسٹوں کے دخل در معقولات کے خلاف بیان دیا تھا، انہی نے راجیشور راؤ کے ایک مبہم سے بیان کے بعد، جس کی انھوں نے تردید بھی کر دی ہے، یہ باور کر لیا کہ کمیونسٹ پارٹی کانگرس میں پھوٹ ڈالنے کی کوششوں سے دستبردار ہو گئی ہے۔

کانگرسی اگر اپنی پارٹی کی سالمیت کا واقعی تحفظ کرنا چاہتے ہیں تو انھیں کمیونسٹ پارٹی کی براہِ راست مخالفت سے کہیں زیادہ ان کی نفوذ کی حکمتِ عملی سے چوکنا رہنا ہوگا۔ اس حکمتِ عملی کی رو سے وہ لوگ جو کمیونسٹ پارٹی سے باہر رہ کر اس کی پالیسیوں کے لیے کام کریں، کمیونسٹ کاز کے لیے ان لوگوں سے زیادہ مفید ہیں جو کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر ہوں۔ یہ ظن اور قیاس کی بات نہیں، جارج ڈمیٹروف نے جو کسی زمانے میں کامنٹرن کے اعلیٰ سطح کے کارکن تھے، واضح طور پر کہا ہے:

"ہمیں یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ جو شخص ہماری طرف عمومی ہمدردانہ رویّہ رکھتا ہے اس کی قدر و قیمت ایک درجن جنگجو کمیونسٹوں سے زیادہ ہے۔ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر جو پارٹی کا ممبر بنے بغیر سوویٹ یونین کے مفادات کے لیے لڑتا ہے، وہ قدر و قیمت میں ایسے سو آدمیوں سے زیادہ ہے جو پارٹی کے باقاعدہ ممبر ہوں۔ ایک ادیب جو پارٹی کا ممبر بنے بغیر سوویٹ یونین کا دفاع کرتا ہے، ایک ٹریڈ یونین لیڈر جو ہماری صفوں سے باہر ہے لیکن اس کے باوجود سوویٹ یونین کی بین الاقوامی پالیسی کا دفاع کرتا ہے، قدر و قیمت میں پارٹی کے ہزار ممبروں سے بڑھ کر ہے۔"

کمیونسٹوں کے دامِ تزویر سے وہ لوگ بھی محفوظ نہیں جو اپنی دانست میں ان کے لیے غیر ہمدردانہ رویّہ رکھتے ہیں کیونکہ ولی منزنبرگ جسے کسی وقت کمیونسٹوں کی محاذی سرگرمیوں میں نمایاں حیثیت حاصل تھی انہیں یہ سبق پڑھا گیا ہے کہ:

"جو لوگ ہم سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتتے ہیں، ہمیں انھیں بھی نئے طریقوں اور نئے راستوں سے اپنی طرف راغب کرنا پڑے گا..."

کانگرس کے رہنماؤں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی اعلان شدہ پالیسیوں پر ہی نہیں بلکہ اس کی پیچ در پیچ درپردہ حکمتِ عملی پر بھی نظر رکھیں۔

▲▲

یہ اداریہ دہلی میں سینئر کانگرسیوں کے تربیتی مرکز میں مسز اندرا گاندھی کی تقریر سے پہلے لکھا گیا تھا۔

ستیہ پرکاش | خروشچیف سے بریژنیف تک

خروشچیف کے زمانے میں ۱۱ ستمبر ۱۹۵۷ء کو سوویٹ یونین میں ایک قانون پاس ہوا تھا جس میں زندہ لیڈروں کی یادگاریں قائم کرنے کی ممانعت کی گئی تھی لیکن بریژنیف کے دور میں ۱۴ مئی ۱۹۷۳ء کو ایک نیا قانون پاس کیا گیا کہ جن لیڈروں کو "ہیرو آف دی سوویٹ یونین" یا "ہیرو آف دی سوشلسٹ لیبر" کے تمغے دو بار مل چکے ہیں، ان کے مجسمے ان کے آبائی شہروں میں نصب کیے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اعزاز سب سے پہلے بریژنیف ہی کو ملا۔

۱۴ اکتوبر کو نیم مجسمے کا حقدار بنانے کے لیے اینڈری کریلینکو کو بھی "ہیرو آف دی سوشلسٹ لیبر" کا دوسرا سنہری تمغہ دیا گیا۔ اس تقریب کی جو کریملن میں منعقد ہوئی، روداد کافی دلچسپ ہے۔ تمغہ کریلینکو کو صدر پوڈگورنی نے پیش کیا لیکن کریلینکو نے شکریے کی جو تقریر کی اس میں پوڈگورنی کا ذکر برائے نام ہی ہے اور مدح و ثنا زیادہ تر بریژنیف کے لیے ہی وقف ہے۔ بریژنیف کو "ہم سب کے عزیز" کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کریلینکو نے کہا "سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس بات پر بے پناہ خوشی ہے کہ آپ اس خوشگوار اور ناقابلِ فراموش دن میں ہمارے ساتھ، اپنے عزیز دوستوں کے ساتھ موجود ہیں جو آپ کی دانشمندانہ قیادت میں دس برس سے زیادہ مدت سے کام کرتے رہے ہیں۔ اس عرصے میں آپ نے ہمارے ملک اور اس کے عوام کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔

آپ نے رفعِ کشیدگی اور دنیا میں ایک پائدار امن قائم کرنے کے لیے حالات کو جو رخ دیا ہے اس کے لیے آپ اس دھرتی کے کروڑہا عوام کی گہری محبت کے حقدار بن گئے ہیں۔

"پیارے لیونڈ ایلیچ! ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت ساری دنیا کی توجہ آپ کی انتھک کوششوں پر مرکوز رہی ہے۔ دنیا میں ہر شخص جانتا ہے کہ آپ نے ہمارے وطن اور پوری نوعِ بشر کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام کہتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں کہ لیونڈ ایلیچ کے الفاظ دنیا بھر میں مزید کامیابیوں، اعتماد اور پرامیدی سے معمور ہیں۔ آپ جو نئے اقدامات کر رہے ہیں وہ آپ کے خلوص کا مزید ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آپ نے جتنے اقدامات کیے ہیں اور آپ کے جتنے تصورات ہیں، ہماری پارٹی اور ہمارے عوام ان کی تائید بھی کرتے ہیں اور بے پایاں قدر بھی۔

"پارٹی اور عوام آپ کی انسان دوستی، آپ کے خلوص، آپ کی دانشمندی اور لینن ازم سے آپ کی بے پایاں وفاداری کی بنا پر آپ سے بےحد محبت کرتے ہیں۔ اپنی تمام زندگی میں ہم نے دیکھا ہے کہ آپ کی دانشمندی اور فراست نے آپ کو اس قابل بنایا ہے کہ آپ ان تمام صفات کا مجسمہ بن جائیں جو پارٹی اور ریاست کے لیڈر کے لیے ضروری ہیں۔ جو ہمارے دور کے صرف ایک انسان میں موجود ہیں جو پارٹی اور ہماری مادرِ وطن کے عوام کا VOZHD (لیڈر) ہے۔"

VOZHD روسی زبان میں فیورر کا مترادف ہے جو ہٹلر کا لقب تھا۔ بریژنیف کے لیے یہ لفظ پہلی بار استعمال ہوا ہے۔ اس سے پہلے یہ لقب لینن اور اسٹالن کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے لیکن خروشچیف نے محسوس کیا کہ اسٹالن ازم کی وجہ سے یہ لفظ بہت متبذل ہو گیا ہے اور اس نے اس سے اجتناب کیا۔ بریژنیف کو غالباً اس قسم کا کوئی پس و پیش نہیں۔ تو کیا سوویٹ یونین میں وہ چیز جسے مشترکہ قیادت کا نام دیا جا رہا تھا، ختم ہو رہی ہے؟ اس کے آثار ۱۹۷۵ء ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں تو بریژنیف نے ایک اسٹیٹ کونسل قائم کرنے کی بھی کوشش کی جس کی بدولت چیرمین کی حیثیت سے اسے حکومت پر پورا کنٹرول حاصل ہو جاتا اور کوسیجن کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔

شخصی قیادت ابھرنے کے علاوہ کچھ اور حقائق بھی ہیں جو ان لوگوں کی توجہ کے مستحق ہیں جو امن کونسل یا اس قسم کے دوسرے کمیونسٹ محاذی اداروں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ باور کرنے لگے ہیں کہ سوویٹ روس واقعی امن کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں روس کے فوجی اخراجات اٹھائیس ملین روبل تھے، ۱۹۷۵ء میں یہ اخراجات اکیاون ملین روبل تک پہنچ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوویٹ یونین اپنی مجموعی قومی آمدنی کا ۱۱ یا ۱۲ فیصدی صرف اسلحہ پر خرچ کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ امریکہ کے فوجی اخراجات اس کی آمدنی کا ۶٫۷ ہیں اور برطانیہ کے ۵٫۶ فیصد۔ سوویٹ یونین کے فوجی اخراجات اس رقم سے جو وہ صحت اور تعلیم پر خرچ کرتا ہے، ۲۰ فیصدی زیادہ ہیں۔

سوویٹ یونین کی مسلح افواج ہمہ گیر عالمی جنگ، جس میں نیوکلیر جنگ بھی شامل ہے، کے لیے اس حد تک تیار ہیں جو دفاعی ضروریات سے کہیں زیادہ ہے۔

سوویٹ فوجی اخراجات کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہاں شہری ضروریات کی اشیا کمیاب ہیں۔ ظاہر ہے کہ فوجی اخراجات بڑھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان ضروریات کو اور بھی پس پشت ڈال دیا جائے۔ فوجی بھرتی بھی اتنی زیادہ ہے کہ عام استعمال کی اشیا کے لیے جو صنعتیں ہیں ان کے لیے مناسب تعداد میں کارکن مہیا ہونے بھی مشکل ہوتے جا رہے ہیں۔

▲▲

ایک سوالنامے پر اظہار خیال (بقیہ صفحہ ۱۹)

۷۔ ادب کی یہ تعریف کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُر امن اخراج کا ایک ذریعہ ہے کافی حد تک قابل قبول ہے۔ ایسا ادب بھی بلا واسطہ So called سماجی فریضے کا حامل ہوتا ہے۔ مریضانہ ادب جیسے باڈلیر اور میراجی کی نظمیں یا افسانے نفسیاتی تسکین بہم پہنچاتی ہیں ایسا ادب عظیم نہ سہی لیکن اہم ضرور ہے۔ ناپسندیدہ جذبات کے اخراج کی عکاسی دل کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے۔ (لکھنے والے کا بھی اور ہم آہنگ قاری کا بھی) ایسے ہی جیسے تمنا بالیسد یا اختلاط کے بعد ذہنی اور قلبی ہیجان سے رستگاری حاصل ہو جاتی ہے اور جسم و جاں آسودگی محسوس کرتے ہیں۔

جو اندر کا میل نکالے
گالی ہے وہ گندی نالی

▲▲

تیسری آنکھ

کرشن موہن

(۱)

خواہش کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے سے کیا حاصل
عزمِ عمل ہے مشعلِ دِل
رحم نہ کیا انصاف ہی دُنیا میں بن جائے
اہلِ محبّت کی ہے دُعا
دُجے ہو کنول کے جوہر کی،
روحِ انسانی ہے امر
موت جنم ہے زیست کی سطحِ دیگر پہ
جنم جنم کا چکّر چلتا رہتا ہے
جیون دھارا تیز کبھی ہے، سُست کبھی
لیکن پیہم بہتا ہے

(۲)

انساں مخلوقِ اشرف ہے، یہ میرا ایمان نہیں
کتنی ہی دُنیائیں ہیں
جن کی مخلوقات ہیں انساں سے برتر
"دیوتا ہیں" آکاش پہ دیکھیں پہنچے ہوئے لاماؤں نے
اور اُن سے اِشراق لیا

. . . .

دھرتی کے اِنسانوں کو
دیوتا ایسے دیکھتے ہیں
جیسے انساں چڑیا گھر میں دیکھتے ہیں حیوانوں کو

. . . .

(۳)

دُنیا مایا جال ہے، جیون سپنا ہے
جاگتے لمحوں میں اہنکو کا پھن اُٹھتا ہے مستی میں
جھومتا، لہراتا ہے
آخر نیند کی بانہوں میں کھو جاتا ہے
جیسے بچّہ مکتب سے گھر آتا ہے

(۴)

مندر کی تصویروں میں
عریاں مرد و عورت کی ہم آغوشی
کرم اور گیان کا شوخ ملن، البیلا پن

(۵)

اونچے لامے بچپن میں
ماتھے میں کھُدواتے ہیں
گیان دھیان کا سرچشمہ
تیسری آنکھ ہے اندھی لیکن دیکھتی ہے
انتر دھیان کی شکتی سے

▲▲

غزلیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

جی میں ہے معنیِ بے لفظ کو کیونکر باندھوں
بس چلے میرا تو قطرے کو سمندر باندھوں

گھر کی ویرانی یہ کہتی ہے کہیں اور چلو
میں کہاں جاؤں، کہاں کے لیے بستر باندھوں

تشنگی اپنا مقدر ہے بجز اک قطرۂ اشک
پاس کچھ بھی نہیں کیا بادہ و ساغر باندھوں

ایسی زنجیر کی بس ایک تمنّا ہی رہی
کہ ہمیشہ کے لیے دستِ ستمگر باندھوں

میں نے کیا کیا نہ ثنا رخ کے ستاروں سے
دِل یہ کہتا ہے کہ اُس رات کا منظر باندھوں

سگِ دیوانہ سے بدتر یہ سگِ دنیا ہے
ورنہ سوچا تھا کہ دونوں کو برابر باندھوں

▲▲

کہاں کی مے، کہاں کے جام و مینا
کوئی بتلائے جینے کا قرینا

عجب اک شے ہے زہرِ آگہی بھی
جسے بھی راس آئے اس کا پینا

نہ جانے کون سا پھر سانحہ ہو
دھڑکتا ہے ابھی سے اپنا سینا

نہ دیکھا چشمِ تر نے کوئی موسم
وہی بس ایک ساون کا مہینا

نہیں اِک بوند بھی باقی لہو کی
شکستہ تھا یہ دِل کا آبگینا

مگر کچھ لوگ یوں بھی ڈوبتے ہیں
نہ تھا گرداب میں اُن کا سفینا

ہے اُس کا آخری منزل پہ مسکن
چلے آؤ یونہی زینا بہ زینا

وہی اک بات جس کا ہم سے ڈر تھا
وہی اک بات پھر ہم سے ہوئی نا!

▲▲

جگن ناتھ آزاد

اے تو کہ ہے جینے کے سلیقے پہ تجھے ناز
کچھ اس سے نہیں کم مری آشفتہ سری بھی

قربان میں اے وقت تری کم نظری کے
بیکار گئی آج مری دیدہ وری بھی

رحمت اگر انساں ہے تو کیوں کانپ رہے ہیں
کہسار بھی، میدان بھی، خشکی بھی تری بھی

میرا تو ہنر کوئی مرے کام نہ آیا
احباب کا اعزاز بنی بے ہنری بھی

کہتا ہوں سخن گوئی کا فن میں جسے آزاد
وہ سنگ تراشی بھی ہے آئینہ گری بھی

▲▲

○ اُردو باغ، سرسید نگر۔ علی گڑھ

○ ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز، پریذیڈنسی مدوڈ سری نگر

ایک سوالنامے پر اظہارِ خیال

'تحریک' کے گزشتہ شمارے میں ایک سوالنامہ شائع کیا گیا تھا اور اہلِ قلم حضرات سے اس پر اظہارِ خیال کی درخواست کی گئی تھی۔ بہت سے کرم فرماؤں کو خطوط بھی لکھے گئے تھے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری درخواست درخورِ اعتنا سمجھی گئی۔ سوالنامے میں شامل استفسارات اور ان کے جو جوابات ہمیں اب تک موصول ہوئے ہیں۔ وہ اس شمارے میں شائع کیے جا رہے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ اگلے کئی شماروں تک جاری رہے گا۔

——— ادارہ

۱۔ جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی بحالی؟

۲۔ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے؟

۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے۔ کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط تو نہیں کرتے؟ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۵۔ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب کرنے کے بعد، ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے لگے ہیں۔ اس میں کسی نئے عرفان کو دخل ہے یا یہ پسپائی کا اعتراف ہے؟

۶۔ کیا ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ جواب اثبات میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے؟

۷۔ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے یہ بھی کی ہے کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ادب کو بھی سماجی فریضے کا حامل ماننا پڑے گا جسے بالعموم مریضانہ ادب کہا جاتا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

۱۔ میرے خیال میں جدید اور قدیم کی تقسیم میکانکی نوعیت کی ہے۔ ہر زمانے کا ادب اپنے تہذیبی احوال کا ترجمان ہے اور چونکہ تہذیب میں تسلسل پایا جاتا ہے اس لیے ہر ادب جدید اور قدیم کا امتزاج ہوتا ہے۔ بغیر اس امتزاج و ترکیب کے وہ لازمی طور پر زندگی سے بے تعلق ہو جائے گا۔ ادب قدیم بنیادی قدروں میں زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے۔ یہ نیاپن انحراف نہیں ہوتا بلکہ ان تہذیبی اجزا کی توثیق ہوتی ہے جو بدلنے کے باوجود پوری طرح نہیں بدلتے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب سے زندگی نے نیا چولا بدلا ہے لیکن حقیقت میں نئی قدریں چاہے وہ سیاسی اور معاشرتی ہوں اور چاہے ادبی، پرانی قدروں سے ہم آمیز رہتی ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے انقلاب میں ہمیں اس حقیقت کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اگر مورخانہ اور معروضی (آبجکٹیو) واقعیت پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی۔

۲۔ ہر زمانے کے ادب کو اختیار ہے کہ بدلتے ہوئے احوال کے مدِنظر ہیئتی اور موضوعی تبدیلیاں پیدا کرے۔ کوئی ادب لکیر کا فقیر نہیں بن سکتا۔ لیکن اس کے لیے خاص سلیقہ اور دقتِ نظر درکار ہے۔ یوں ہی اناپ شناپ بے ڈھنگے پن سے تبدیلیاں کرنا لازمی طور پر قبولِ عام نہیں حاصل کر سکتا۔

۳۔ تنہائی کا احساس ہر زمانے کے ادب میں ملتا ہے۔ تخلیقی فنکار اپنے ہمعصروں سے۔ اس قدر بلند ہوتا ہے کہ وہ ان میں ہوتے ہوئے بھی ان سے اپنے کو علیحدہ تصوّر کرتا ہے۔ حافظ، غالب اور اقبال کے یہاں تنہائی کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے۔ غالب کا یہ شعر مثال کے لیے کافی ہے۔

کاوکاوِ سخت جانیہای تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جدید صنعتی تہذیب نے اس احساس کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

۴۔ ادب سے ترسیل کے علاوہ اگر تصورات کی تبلیغ کا کام لیا جائے تو اس کے لیے بھی بڑا سلیقہ درکار ہے۔ نعرہ بازی، نعرہ بازی ہے اور ادب، ادب ہے۔ ان دونوں میں فرق و امتیاز ضروری ہے۔ ڈانٹے، ملٹن اور اقبال نے اپنے تصورات کو آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا اس لیے ان کا تبلیغی ادب بھی ادب کے دائرے سے خارج نہیں ہوا۔ ان کی مقصدیت اور ادب اس خوبی سے ہم آمیز ہیں کہ باید و شاید۔ میرے خیال میں ادب اپنا آپ مقصد بھی ہے جیسا کہ حافظ اور غالب کے یہاں ہے اور معاشرتی اصلاح کا وسیلہ بھی جیسا کہ اقبال کے یہاں ہے۔

۵۔ جدید ادب کا نیا عرفان کیا ہے؟ میں اس کے متعلق اب تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔

۶۔ نعرہ بازی کے بغیر بھی ادب مقصدیت کا حامل ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی ادبیت برقرار رہے۔ ادبیت تخلیقی ہیئت کے بغیر ممکن نہیں جو بجائے خود حسین و جمیل ہے۔ ہر شے کی عملی افادیت بھی اس کی ہیئت پر مبنی ہے۔ فن کار کا عمل، ہیئت (فارم) کے حصول کی خاطر ہوتا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہے تو باوجود مقصدیت کے وہ اعلیٰ درجے کا فن کار شمار ہوگا۔ اگر کوئی فن کار ہیئت کی تخلیق میں ناکام ہے تو چاہے اس کے یہاں مقصدیت ہو یا نہ ہو، اس کا فن اپنے اتھلے پن کی چغلی کھائے گا۔

۷۔ میرے خیال میں مریضانہ ادب، ادب کے زمرے سے خارج ہے۔ ادب کے لیے صحت مند ہونا ضروری

ہے۔ ادب میں صحت مند وہ کہا جائے گا جس میں تخلیقی
توانائی ہے۔ اس کے بغیر فن کار اس باطنی آزادی سے
محروم رہے گا جو تخلیقِ حسن کا سرچشمہ ہے۔ جس طرح جسمانی
طور پر وہ شخص جس میں خون کی کمی ہے زندگی کی گرمی
اور حرارت کے لطف سے بیگانہ ہوگا، اسی طرح وہ
فن کار جس کا تخیّل وجدانی تخلیقی توانائی سے نابلد ہے
کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ نہیں انجام دے سکتا۔ عام طور
پر معاشرتی لحاظ سے جن باتوں کو ناپسندیدہ خیال کیا
جاتا ہے، ادب میں لطف و انبساط کا سرچشمہ بن جاتی
ہیں۔ حسن و عشق کی داستان کو بعض اوقات معاشرت
ناپسندیدہ خیال کرتی ہے لیکن جمالیاتی اور ادبی تجربے
میں وہ خود اپنی صداقت بن جاتی ہے جسے تخیّل کا کرشمہ
کہنا چاہیئے۔ اگر کسی ادب پارہ پر تخیل کے علاوہ جذبہ و
وجدان کی مہر ثبت ہو جائے تو وہ کبھی کبھی ناپسندیدہ
نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہاں بھی کھرے اور کھوٹے میں فرق و
امتیاز ضروری ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

۱۔ جدید ادب کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ ادب
کی ادبی اقدار کی بحالی کے لیے کوشاں ہے۔ حالی کے
زمانے میں سرسید تحریک کے اثر سے جو انحراف اصلاح
پسندی کی صورت میں رونما ہوا تھا، اس میں پھر بھی
ادبی اقدار کی اہمیت تھی۔ قومی، وطنی اور سماجی
تحریکوں کے عروج کے زمانے میں ادب کے اصلاحی،
سماجی اور تعمیری پہلوؤں پر زور دیا جانا ناگزیر ہے
لیکن اس صدی کی چوتھی دہائی میں ایک گروہ
نے مقصدیت اور افادیت کی اشتراکی اصطلاحات
کے پس پردہ ادب کو سیاسی تبلیغ کا آلۂ کار بنانے
کی جو کوشش کی جدید اُردو ادب دراصل اسی
کوشش کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آیا۔ اس ادب
کا ایک کارنامہ تو یہی ہے کہ فنکار کا تخلیقی عمل خارج
کے احکام کا تابع نہیں بلکہ ادب ذاتی اور سماجی
سچائی کا موضوعی اظہار ہے۔ اس لیے ادب میں
بنیادی اہمیت ادبی اقدار کی ہے۔ اس لحاظ
سے دیکھا جائے تو نئے ادب نے اپنا نسب نامہ
قدیم ادب سے جوڑا ہے، اور اب اس جامع ادبی
جمالیات پر اصرار کیا جانے لگا ہے جس کے بغیر ادب
کی سچی پرکھ ممکن ہی نہیں۔

۲۔ ہیئتی تبدیلیاں موضوعاتی تبدیلیوں سے الگ کوئی
وجود نہیں رکھتیں۔ فکر و احساس کی تبدیلی یا حقیقت
کو ایک نئی نظر سے دیکھنے کی کوشش نئی ہیئتی تبدیلیوں
کو لامحالہ راہ دیتی ہے۔ اُردو میں چونکہ مقلدیت کا غلبہ
زور رہا ہے اس لیے ہیئتی تبدیلیاں آسانی سے قبول
نہیں ہوتیں، نیز ہیئت پر نظر چونکہ سب سے پہلے
پڑتی ہے، اس لیے سب سے زیادہ ہدفِ ملامت
اسی کو بنایا جاتا رہا ہے؛ اور اس جرم کا ارتکاب
اکثر وہی لوگ کرتے رہے ہیں جو موضوع اور ہیئت
کے وجدانی رشتے کو نہیں سمجھتے یا خارجی اثرات کی وجہ
سے محض موضوع یا مواد کو ادب سمجھنے کی غلطی کرتے
ہیں۔

۳۔ تنہائی کے تصور کو اُردو میں عموماً غلط طور پر پیش
کیا گیا ہے۔ اس غلط تصور کو پیش کرنے والوں
میں وہ لوگ بھی ہیں جو بزعم خود تنہائی کا شکار ہیں
اور وہ بھی جو اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ تنہائی یقیناً
تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جو زمانۂ قدیم سے
لے کر اب تک کسی نہ کسی صورت میں اعلیٰ فن کار کا
مقدر رہا ہے۔

۴۔ تبلیغ کا ابلاغ سے جو معنوی ربط ہے ظاہر ہے لیکن
اصطلاحاً یہ لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے،
یعنی مذہبی تبلیغ یا سیاسی تبلیغ، ان کا ادب سے
دور کا بھی واسطہ نہیں۔ تبلیغ اور ادبیت میں بھی

فرق ہے جو تبلیغ اور عرفان میں ہے۔ مجھے تو لفظ ترسیل کے ادبی استعمال میں بھی شبہ ہے۔ ترسیل اخبار کی خبر یا احوال کی ہوتی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ادب کو ترسیل کی کسوٹی ہی پر پرکھا جائے۔ عالمی ادب کے کئی حصے ایسے بھی ہیں جن میں کسی خیال کی ترسیل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اگر ترسیل ہوتی بھی ہے تو صرف جمالیاتی کیفیت کی یا تاثر کی۔

۵۔ جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع وہی شخص قرار دے سکتا ہے جس نے ادبی بددیانتی میں رتبۂ کمال حاصل کرلیا ہو۔ اگر بعض نقاد ایسا اپنی ناسمجھی اور نااہلی کی وجہ سے کرتے ہیں تو وہ انتہائی معصوم ہیں اور ان کی سادہ لوحی پر ترس کھانا چاہیے۔ اور اگر وہ عمداً ایسا کرتے ہیں تو پرلے درجے کے بے ایمان اور بد طینت انسان ہیں۔ ان لوگوں کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ترقی پسند اور جدید ادب کی حدِ فاصل ایک مخصوص سیاسی نظریے سے وابستگی کے بالمقابل موضوعی نظر اور شخصی بصیرت پر اصرار ہے۔ ہمارے عہد کا سب سے بڑا ادبی تجربہ یہ ہے کہ یہی لوگ جو جدید ادب پر لعن طعن کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور اسے مریضانہ گمراہی پھیلانے والا غلاظت کا ڈھیر کہتے ہیں، وہی لوگ اسے ترقی پسندی کی توسیع بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ جو گالیاں انھوں نے دوسروں کے لیے وضع کی ہیں وہ خود ان پر بھی صادق آتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی عقل و دانش پر اگر انھیں عقل و دانش ودیعت ہوئی ہے تو جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

۶۔ ادب کی دنیا فکر و احساس کی دنیا ہے عمل کی دنیا نہیں۔ ادیب کا کام صفیں آراستہ کرنا یا علم اٹھانا نہیں، ویسے اگر وہ علم اٹھانا چاہے تو اس پر کوئی بندش بھی نہیں۔ دراصل ادیب کا بنیادی کام اعلیٰ ادب کی تخلیق ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہے تو سمجھیے اس نے بالواسطہ سماجی خدمت کا بھی حق ادا کردیا۔ کیونکہ کوئی بھی اعلیٰ ادب انسان دوستی اور روشن خیالی کی نفی نہیں کرتا، اس سے ادب کے ذریعے باطنی تبدیلیوں کی راہ ہموار ہوتی ہے یا جسے آپ نے نفسیاتی ماحول تیار کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

۷۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ ادب محض ناپسندیدہ جذبات کے اخراج کا ذریعہ بھی نہیں۔ اگر ان ناپسندیدہ جذبات کا تعلق کسی بھی عہد کی سماجی گھٹن یا تہذیبی یا نفسیاتی تناؤ یا تعینات سے ہے تو یقیناً ادب میں ان کا اظہار ہوگا، اور چونکہ ادبی اظہار ایک سماجی فریضہ بھی ہے، اس لیے ناپسندیدہ جذبات کا اظہار بھی اسی سماجی فریضے کا حصہ تصور کیا جائے گا، ورنہ اگر محض دوسرے ملکوں کی تقلید یا دوسروں کے ادب کی نقالی میں ایسے جذبات کا اظہار کیا جائے جن کا ہماری اپنی سماجی سچائی سے کوئی تعلق نہیں تو یہ محض ایک گھٹیا بات ہوگی۔ عالمی انسان کے مسائل، ذات کا درد و کرب اور صنعتی پھیلاؤ کے زیر اثر شخصیت کی سالمیت پر دباؤ سے ابھرنے والے سوالات تو پیدا ہوں گے ہی، لیکن خود ہمارے معاشرے کے جو چیلنج ہیں اور ہماری زندگی ہر لمحہ جن مسائل سے برسرِپیکار رہتی ہے ان کی ترجمانی کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ جدید ادب کا رشتہ سماجی صداقت سے اپنے سے فوراً پہلے کے ادب سے کہیں زیادہ کھرا اور سچا ہے، لیکن اس عرفان کو ابھی اور عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اِس انتہا یا اس انتہا پر رہیں۔ اہمیت انتہاؤں میں بھٹکنے کی نہیں، بلکہ اپنے آپ کو پالینے، اپنے محور کی تلاش اور اپنی ادبی شخصیت کے توازن یعنی شخصی اور سماجی سچائی، اپنی قومی شناخت، اپنے اعتماد، اپنی ادبی روایت کے تسلسل، اپنی جمالیات اور اپنی

ادبی اقدار کے عرفان کی ہے۔ جدید اردو ادب میں اس طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

بلراج کومل

۱۔ جدید ادب میں وہ ادب بھی شامل ہے جو حالتِ موجودہ کی تصدیق کرتا ہے اور وہ ادب بھی جو حالتِ موجودہ کی تخریب کاری۔ اعلیٰ پایہ کا ادب تصدیق اور تخریب دونوں حالتوں میں بنیادی ادبی اقدار کا احترام کرتا ہے لیکن احترام کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے کچھ غلط، اور کھوکھلی اقدار کی تخریب کاری لازمی ہے۔

۲۔ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیاں موضوعاتی تبدیلیوں ہی کی آئینہ دار ہیں۔ خالص ہیئتی تجربات بھی دنیا کی سب زبانوں میں ہوئے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ان کو دیرپا شرف قبولیت تبھی حاصل ہوا جب ان کے ساتھ فکری عناصر بھی منسلک ہو گئے۔ حق تو یہ ہے کہ ہر بڑی تخلیق کا محرک ہمیشہ فکر و احساس کی سطح پر ہوتا ہے۔ یہ محرک اظہار کا راستہ خود تلاش کرتا ہے اور اپنے لیے مناسب اشکال خود وضع کرتا ہے۔

۳۔ بنیادی طور پر تنہائی کا احساس تخلیقی ذہن کا بنیادی وصف ہے۔ صنعتی پھیلاؤ نے اس احساس کو زیادہ کرب آمیز اور شدید بنا دیا ہے۔ تخلیقی ذہن اجتماعی تحریکوں کا ہم سفر اور ہم نوا ہوتے ہوئے بھی اپنے ہی خون میں سرگرم سفر ہوتا ہے۔

۴۔ ادب اگر کسی چیز کی تبلیغ کرتا ہے تو جذبہ و احساس کی پاکیزگی کی تبلیغ اور جذبہ و احساس کی پاکیزگی کوئی کلیہ یا فارمولا نہیں ہوتی۔ اگر یہ نقطۂ نظر قابل قبول ہو تو ادب تبلیغ ہے۔ جہاں تک ترسیل کا تعلق ہے اس کی ضرورت سب سے زیادہ اصلاحی تبلیغ کو پڑتی ہے۔ جذبہ و احساس کی پاکیزگی کی تبلیغ و ترسیل بہ یک وقت عمل میں آتی ہیں اور اپنے جلو میں زندگی کا حسن، زندگی کی صداقت لے کر آتی ہیں۔

۵۔ صرف چند ناقد ہی جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع سمجھتے ہیں۔ یہ ناقد بھی وہ ہیں جو جدید ادب کے بارے میں ایک طے شدہ جزوی نقطۂ نظر کے غلام ہیں۔ اصطلاحات بے کار ہیں۔ جدید ادب میں صالح اقدار پیش کرنے والی تخلیقات کی کمی نہیں ہے۔ توسیع و تردید سے قطع نظر جدید ادب کے بارے میں بنیادی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس کے صالح عناصر کے محرکات زندگی کے صالح عناصر ہیں کوئی فرد، ادارہ، کلیہ اور فارمولا نہیں ہیں جبکہ ترقی پسند تحریک تنظیمی طور پر طے شدہ نتائج کی ترویج و اشاعت کی تحریک تھی۔

۶۔ ادیب جذبہ و احساس کی فضا ہی پیدا کرتے ہیں کوئی پروگرام پیش نہیں کرتے ہیں۔ جدید ادب کے بہترین عناصر وہی ہیں جو نعروں کے تسلط سے آزاد ہیں۔ ملک و قوم کی تعمیر کے لیے واقعی نعروں کی بجائے صالح نفسیاتی ماحول کی ضرورت ہے۔

۷۔ ادب کے محرکات میں پسندیدہ جذبات بھی شامل ہیں اور ناپسندیدہ جذبات بھی۔ جب استحکام درکار ہو تو ہم پسندیدہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور جب تخریب کاری مقصود ہو تو ہم ناپسندیدہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں بعض اوقات ہم دوسروں کے پسندیدہ جذبات یا ناپسندیدہ جذبات کی تصدیق یا تخریب کے لیے بھی تخلیقی اظہار کرتے ہیں "مریضانہ ادب" ناپسندیدہ جذبات کے اظہارات صرف اس حد تک متعلق ہے کہ یہ ادب کے کچھ ایسے عناصر اور زندگی کے پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے جو مخصوص مشتہر عادات اور رویوں سے میل نہیں کھاتے۔ ورنہ ناپسندیدہ جذبات

کا اظہار کلی طور پر مریضانہ ادب کے ذیل میں نہیں آتا بلکہ تخریب کاری جب غلاظت، عامیانہ پن، اور ذہنی اور روحانی افلاس کا انہدام کرتی ہے تو اس کی نوعیت مریضانہ نہیں ہوتی بلکہ خالص صحت مندانہ۔ اگر یہ سماجی فریضہ ہے تو ناپسندیدہ جذبات کا اظہار یہ سماجی فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ خالص نفسیاتی پس منظر میں مریضانہ ادب کا مفہوم بالکل الگ ہے اور اس کا کسی سماجی فریضے سے کوئی تعلق نہیں۔ خالص نفسیاتی اور جنسیاتی PARLANCE میں لفظ مریضانہ صرف ایسی عادتوں اور رویوں سے متعلق ہے جو حیاتیاتی طور پر نارمل صحت مند انسانوں میں نہیں پائے جاتے۔ ادب کے سلسلے میں لفظ 'مریضانہ' کا استعمال کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

۱۔ پہلے میں قدیم ادب اور جدید ادب سے متعلق اپنے زاویۂ نگاہ کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں ادب کے سلسلے میں قضیۂ قدیم و جدید کم نظری کی دلیل ہے۔ کوئی تخلیق یا تو ادب ہوتی ہے یا پھر غیر ادب ہوتی ہے۔ وہ تخلیق جو وقت کے جھونکوں سے مرجھا کر قدیم ہو جائے، غیر ادب ہوتی ہے چنانچہ اصل ادب ہمیشہ جدید رہتا ہے خواہ اُس کا خالق ولی دکنی ہی کیوں نہ ہو ——

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

میرے لیے ادب ہے اس لیے آج بھی جدید ہے۔ اسی طرح از ابتدا تا حال اُردو ادب کے ارتقا کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ میر اور غالب جیسے پرانے فنکاروں کے ہاں جدید ادب ملتا ہے اور اکثر مشہور ہمعصر جدید شاعروں کے ہاں قدیم ادب کے نمونے نظر آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر شاعر خواہ وہ کسی عہد سے تعلق رکھتا ہو، ادب کے ساتھ ساتھ غیر ادب بھی تخلیق کرتا ہے البتہ تناسب میں فرق ہوتا ہے۔ ادب تر و تازہ رہتا ہے غیر ادب فنکار کے حوالے سے کچھ عرصے تک ادب کا فریب دیتا رہتا ہے اور بالآخر قدیم قرار پا کر دفن کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق و جگر کی اپنے عہد میں بے پناہ مقبولیت کے باوجود غالب اور یگانہ جیسے نسبتاً کم مقبول فنکاروں کی ادبی عمر کافی بڑی ہے۔

اس وضاحت کے بعد میں اصل سوال پر آتا ہوں اور افہام و تفہیم کی غرض سے سوالنامے کی اصطلاحات میں ہی گفتگو کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف نہیں ہے بلکہ ادب کی اُن بنیادی اقدار کی بحالی ہے جو دبستانِ لکھنؤ کی غیر ادبی خارجیت، سرسید تحریک کی بڑھتی ہوئی اصلاح پسندی اور ترقی پسندوں کی نظریاتی حصار بندی کی وجہ سے پس پشت جا پڑی تھیں۔ بظاہر نیا فنکار قدیم ادب سے باغی نظر آتا ہے لیکن سچی بغاوت کے لیے لازم آتا ہے کہ جس روایت سے بغاوت کی جا رہی ہو اُس کے حسن و قبح پر باغی کی گہری نگاہ ہو چنانچہ وہی نئے لکھنے والے صحیح معنو میں ادب تخلیق کر سکے ہیں جو اپنے کلاسیکی سرمائے کا سچا شعور رکھتے ہیں، ظاہر ہے ایسے لوگوں کی تعداد فطری طور پر کم ہوگی لیکن یہ اپنے ادب کی بنیادی اقدار کا پاس کرتے ہوئے نئے تخلیقی ابعاد کی تلاش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھیں قدیم ادب سے سراسر منحرف تصور کر لینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

۲۔ بیشک ہر دو تبدیلیوں میں تناسب ہونا چاہیے جہاں تک موضوعاتی تبدیلیوں کا تعلق ہے میں کروچے کے اس نظریے سے اتفاق کرتا ہوں جس کے

تحت ہر موضوع شعر و ادب کا موضوع بن سکتا ہے، بات موضوع کے برتاؤ اور تخلیق کار کے طریق پیشکش سے ادبی یا غیر ادبی بنتی ہے۔ نیا ادب مخصوص موضوعات کا پابند نہیں ہے۔ رہ گئیں ہیئتی تبدیلیاں، سو اس سمت میں بھی نمایاں تجربات ہوئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آزاد نظم، جسے ترقی پسند تحریک کی حمایت کے باوجود، استحکام حاصل نہ ہوا تھا، نئے ادب میں اپنی جڑوں کو گہرائی تک پیوست کر کے اعتبار کا درجہ حاصل کر سکی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی ایک بات بہ اعتبار تناسب موضوعاتی تبدیلیوں کے مساوی ہے۔ پھر نثری نظم کے سلسلے میں تجربات ہو رہے ہیں، ہر چند کہ میں اُردو زبان میں اس آہنگ کی کمی پاتا ہوں جو نثری نظموں کے لیے لازمی شے ہے، پھر بھی کہا نہیں جا سکتا کہ یہ تجربات کامیاب نہ ہوں گے۔ ہندی کی مثال ہمارے سامنے ہے جس کا لسانیاتی ڈھانچہ اُردو سے ملتا جلتا ہے اور وہاں نثری نظم بہر حال ESTABLISH ہو چکی ہے۔ البتہ آزاد غزل یا نثری غزل کی کاوشیں اُردو میں سعیِ نامشکور ہی قرار پائیں گی کیونکہ غزل اپنی ہیئت سے اُسی طرح جُڑی ہوئی ہے جس طرح اُردو زبان اپنے رسم الخط سے۔ بحیثیتِ مجموعی جدید ادب کی ہیئتی اور موضوعاتی تبدیلیوں میں مناسب توازن پایا جاتا ہے۔

۳۔ حضور، صنعتی پھیلاؤ کے ردِ عمل کے طور پر تنہائی کا احساس تو ہر محسوس کرنے والے انسان کو ہو گا فنکار شدتِ احساس کا حامل ہوتا ہے اُس کے ہاں عام لوگوں کے مقابلے میں یہ احساس زیادہ آئے گا لیکن یہ ویسی ہی بات ہوئی جیسے گرانی کا احساس، جو معاشرے کے ہر فرد کو ہو گا، فنکار کو بھی ہو گا۔ ادب میں ہمیں تنہائی کے جس احساس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ تخلیق کار کی حیثیت ہے۔ تخلیق کار اُس وقت بھی معاشرے میں خود کو تنہا محسوس کرتا تھا جب صنعتی پھیلاؤ نے وہ صورت اختیار نہ کی تھی جو آج ہے۔ میر کا انسان فلک کے برسوں پھرنے پر خاک کے پردے سے نکلتا تھا اور میر خود کو ان پراگندہ طبعوں میں گردانتے تھے جو کمیاب تھے۔ غالب خلوت کو انجمن سمجھتے تھے، اقبال کا دیدہ ور نرگس کے ہزاروں سال رونے پر پیدا ہوتا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔ ان سارے پردہ ہائے زنگاری میں تخلیقی افراد کی تنہائی سائیں سائیں کر رہی ہے۔

۴۔ ادب کو تبلیغ سمجھنے والے کسی ادبی یا تنقیدی بصیرت کے حامل نہیں ہو سکتے ورنہ ہر اچھا مقرر ادبی حیثیت کا حامل قرار پاتا، میر، غالب اور اسی پائے کے دوسرے فنکار تو کسی شمار میں نہ ہوتے۔ ادب کو تبلیغ قرار دینے والے اسے ترسیل سے نہیں، غیر ادب سے خلط ملط کرتے ہیں، سیاست سے خلط ملط کرتے ہیں۔ ترسیل کا تو میں بھی قائل ہوں۔ فن پارے میں ابہام جو پرتیں اور پہلوداری پیدا کرتا ہے اس سے ترسیل کا دائرۂ کار انتہائی وسیع ہو جاتا ہے۔ ایسی ترسیل کو تبلیغ قرار دینا بھی ویسی ہی غلطی ہے جیسی کہ ادب کو تبلیغ سمجھنا۔

۵۔ سبھی ترقی پسند نقاد تو جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع نہیں قرار دیتے۔ آج بھی سردار جعفری صاحب کی نگاہِ عتاب نئے ادب کے روشن گوشوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتی اور نئے فنکاروں کی جن تخلیقات کو وہ کبھی کبھار "گفتگو" میں جگہ دے دیتے ہیں اُنھیں ترقی پسند ادب کے زمرے میں ہی رکھتے ہیں، بہر حال یہ ایک کھلا ہوا طریق کار ہے جس کا احترام کرنا چاہیے البتہ علی گڑھ کے ایک بزعمِ خود جدید اور اصلاً مارکسی نقاد نے نیز دہلی کے دو ایک نقاد نما سیاستدانوں نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے کا جو ڈھونگ رچایا ہے وہ بہر طور اُن کی پسپائی کا اعتراف ہے۔ یہ حضرات

دونوں ہاتھوں میں لڈّو رکھنا چاہتے ہیں اور ادب
میں غاصبانہ طریقوں سے حاصل کردہ کرسیوں سے
چپکے رہنے کی غرض سے بوقتِ ضرورت "نئے عرفان"
ایجاد کر لیتے ہیں۔

۶۔ ادب نے ہر ملک ہر قوم اور ہر دور میں ہمیشہ تعمیری
کردار ادا کیا ہے۔ دراصل معاشرہ، ملک یا قوم،
افراد کا مجموعہ ہیں۔ ادب کسی واضح تبلیغی کاوش کے
بغیر فرد کے جذبات کی تطہیر کا فریضہ انجام دیتا ہے،
اُس کے لیے روحانی غذا فراہم کرتا ہے اور غالب
کے الفاظ میں آدمی کو انسان بناتا ہے۔ اس طرح
فرد اپنے طور پر خود اخلاقی اقدار کا احترام کرنا سیکھتا
ہے اور اُس کے اعمال و افعال تعمیری رُخ اختیار
کرتے ہیں مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینے
والے تو خیر ادیب و شاعر ہو ہی نہیں سکتے لیکن میں اس
کے حق میں بھی نہیں ہوں کہ فنکار شعوری طور پر کوئی خاص
نفسیاتی ماحول تیار کرنے کی کوشش کرے۔ اُسے تو
پورے خلوص کے ساتھ سچا ادب تخلیق کرنے کی اپنی
سی کوشش کرتے رہنا چاہیے، اگر واقعی ادب تخلیق
کرے گا تو اس میں لازماً وہ اوصاف موجود ہوں گے
جن کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

۷۔ میں اس مقولے میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہوں گا۔
دراصل ادب "ناپسندیدہ" نہیں "ناآسودہ جذبات"
کے پُرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ ادب کو
مریض قرار دینے والوں کی ذہنی صحت پر مجھے
شبہ ہے۔ میرا جواب آپ کو پہلے مل چکا ہے اگر
ادب ہے تو خواہ اُس پر مریضانہ کا لیبل چپکا دیں،
قدیم قرار دیں، یا جدید، وہ معاشرے کے لیے
بہرحال مفید ہوگا۔

شہریار

آپ کا خط اور سوالنامہ موصول ہوا۔ میں ادب پر
اس قسم کے مباحث کا کچھ زیادہ قائل نہیں۔ ادب
جن مسائل کو جنم دیتا ہے، ان کا حل تلاش کرنا ایک
طرح کی سادگی ہے کہ ادب (میری مراد زندہ ادب سے
ہے) مسائل سے پیدا ہوتا اور مسائل کو پیدا کرتا
ہے۔ پھر بھی میں اس بحث میں شریک ہو رہا
ہوں کہ شاید اسی طرح میرے ذہن میں بعض باتیں
صاف ہو سکیں۔

۱۔ جدید ادب یقیناً ماضی قریب کے مقبول قدیم
ادب سے انحراف ہے۔

۲۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ ہیئت اور
موضوع کی دوئی کا میں قائل نہیں۔ جس فن پارے
کا موضوع اس کی ہیئت سے الگ کیا جا سکتا ہے
اس کے ادب ہونے میں مجھے شبہ ہے۔

۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل نہیں
ہے۔ ہر زمانے اور ہر سماج میں تخلیقی ذہن رکھنے
والے تنہائی کے احساس کے شکار رہے ہیں۔
لیکن تنہائی کو سماج اور گرد و پیش سے بے تعلقی
کا مترادف سمجھنا درست نہ ہوگا بلکہ میرا تو خیال
ہے کہ تنہائی سماج اور گرد و پیش سے شدید تعلق
کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۴۔ مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ ادب کسی نہ کسی شکل
میں ایک تبلیغی پہلو رکھتا ہے۔ لیکن یہ تبلیغ اقدار کی
زیادہ ہوتی ہے افکار کی کم۔ ترسیل کا مسئلہ فروعی ہے۔
میں جس چیز کو ناپسند کرتا ہوں یا اس کے سلسلے میں کوئی
تحفظ یا تعصب رکھتا ہوں، دنیا کی کوئی طاقت مجھ تک
اس کی ترسیل نہیں کر سکتی۔ ترسیل سے عام طور سے
یہ مراد لی جاتی ہے کہ ادب پارہ خالص منطقی تجزیے میں ڈھل
جائے تو یہ خصوصیت صرف ادنیٰ درجے کے ادب پارے
میں ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے اُس میں کچھ
نہیں ہوتا۔

۵۔ میں اس مسئلہ پر اظہارِ خیال ضروری نہیں سمجھتا۔

۶۔ ادب ملک و قوم کی تعمیر میں اپنے طور پر ایک رول ہمیشہ ادا کرتا رہا ہے اور آج بھی کر سکتا ہے یہ رول ادب سے زیادہ ادیب کرتا ہے کہ وہ ہر زمانے میں ہر معاشرے میں اعلیٰ انسانی اقدار کے تحفظ کے لیے فضا سازگار کرتا رہے اور اس کے لیے اسے ہر طرح کے ESTABLISHMENT سے چوکنا رہنا چاہیے۔

۷۔ یہ سوال مجھے کچھ مبہم معلوم ہوتا ہے۔ جذبات کے ناپسندہ ہونے کا معیار کیا ہوگا۔ اچھا ادب کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ جن ادبی تحریکوں، رجحانات یا ادیبوں کو اس لقب سے یاد کیا گیا ہے ایک دو کو چھوڑ کر ان کی تخلیقات کو آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

آخر میں ایک بات میں اور کہنا چاہوں گا جن کی طرف آپ کے سوالنامے میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں ادب میں جو تبدیلیاں آئیں ہیں وہ اتنی انوکھی یا نئی نہیں ہیں جتنی سمجھی جا رہی ہیں۔ دراصل یہ سب تبدیلیاں تنقید میں ہوتی ہیں۔ اور یوں بھی ادب میں کوئی بالکل نئی چیز ایک دم وجود میں نہیں آتی اس کا کوئی نہ کوئی تعلق روایات سے ہوتا ہے۔ تنقید اس کو نہ دیکھ سکے تو قصور کس کا ہے۔

کرشن موہن

۱۔ جدید ادب قدیم ادب سے کافی حد تک انحراف ہے۔ مگر اس انحراف میں بھی بہت سی بنیادی اقدار کی جھلک نظر آجاتی ہے کیونکہ کچھ بنیادی اقدار کبھی نہیں بدلتیں۔

۲۔ نئے موضوعات کے لیے نئی ہیئتیں ہی مناسب ہوتی ہیں۔ آج کل کسی نئے موضوع پر پابند ہیئت [illegible] خیز سی نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر جدید آدمی کے ذہنی کرب یا اُس کی معاشی کشمکش کے اظہار کے لیے نظم آزاد ہی موزوں رہے گی نہ کہ مسدس یا مخمس۔ بہ الفاظ دیگر ایسی کیفیات کی عکاسی کے لیے جوش ملیح آبادی کا نہیں بلکہ ن م راشد کا قلم درکار ہے۔ کسی کیفیت کا سیدھا بیان بے کیف اور سپاٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا طرزِ تحریر کلیشے (CLICHE) اوڑھ کر عمومی ردِ عمل (Stock Responses) انگیز کرتا ہے۔ ابہام یا یوں کہیے ترسیل کی ناکامی کا احساس بھی جدید ادب کی ایک پہچان ہے۔

۳۔ احساسِ تنہائی صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے لیکن اصل میں یہ تخلیقی ذہن کا ایک لازمی وصف ہے جسے انگریزی میں Intellectual Melancholy یا weltherism یعنی ذہنی اُداسی کہتے ہیں۔ (ورتھرازم مشہورِ عالم مصنف گیٹے کے ناول Sorrows of Werther سے ماخوذ ہے) احساسِ تنہائی کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے۔

۴۔ یہ کہنا کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے یکسر غلط ہے۔ ایسا کہنے والے واقعی تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط کرتے ہیں۔ تبلیغ اور ترسیل میں وہی فرق ہے جو صحافت اور ادب میں ہے۔

۵۔ جدید ادب ہرگز ترقی پسندی کی توسیع نہیں ہے، ایسا کہنا محض پسپائی کا اعتراف ہے۔

۶۔ ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب اہم اور صالح کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے۔ چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا کرنا ترقی پسندی کی کھوکھلی تبلیغ کے مترادف ہوگا۔

(باقی [illegible] پر)

ایک نظم

ساجدہ زیدی

بنتے، مٹتے ابھرتے ہوئے
نیلگوں دائرے

رقصِ آوارہ،
مائل بہ پرواز بادل،
فضا شبنم افشاں
سحر گل بداماں
خنک بادِ صحرا کی مدھم خرامی،
سبک برف کی روشنی میں نہائے ہوئے
کوہساروں کی ساکت قطاریں
گھنے سبز پیڑوں کی شاخوں سے چھنتے ہوئے
نرم سائے

دشت در دشت پہنائیِ بیکراں،
حسنِ تخلیق کی ندیاں ———
اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپائے

یہ رنگ اور نکہت میں لپٹی ہوئی
کائناتِ حسیں،
یہ دُنیائے وحدت
یہ آوازِ "کن" کی امیں

جو تیرے لیے داشتہ ہے
جسے تو نے
برتا ہے، جانا نہیں۔

یہ میرے لیے نورِ عرفاں کا گہوارہ ہے
اور
تخیل کی نیلی سبک چاندنی میں
نہائے ہوئے
جسمِ محبوب کا آتشیں لمس ہے
صبحِ آغاز کے
رقصِ بے چین کا استعارہ ہے
روزِ ازل کا
مسلسل کرشمہ ہے
راہِ ابد کا
تواتر ہے

اور......
حرفِ آسودگی
...... بیکراں تشنگی کی علامت ہے
...... یہ میری ہمراز ہے
اس کی صبحوں کے سنگیت میں
میری آواز کا ساز ہے

ڈپارٹمنٹ آف انگلش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

غزلیں

فضا ابن فیضی

اسی زمیں کا ہوں حصّہ یہ بات دھیان پہ رکھ
اٹھا کے خاک سے مجھ کو نہ آسمان پہ رکھ

یہ برفِ رمز پسندی نہ ایسے پگھلے گی
مرے شعور کو جلتی ہوئی چٹان پہ رکھ

بدل دیا ہے مسائل کی تلخیوں نے مزاج
نہ شہد اپنی غزل کا مری زبان پہ رکھ

انہیں بہار کا سایہ نہ راس آئے گا
خزاں کی دھوپ گلابوں کے سائبان پہ رکھ

ہوں میں بھی ترکشِ ایام کا سنہرا تیر
جو ہو سکے تو مجھے وقت کی کمان پہ رکھ

کچھ اس قدر بھی نہیں رائگاں یہ جنسِ قلم
ذرا مجھے کسی چلتی ہوئی دکان پہ رکھ

فضاؔ کا کام ہے خوشبو کی جستجو کرنا
اسے ہمیشہ صبا کی طرح اڑان پہ رکھ

عروج زیدی

ترجمانِ حالِ دل پانی کا قطرا بن گیا
اک لرزتا اشک شکووں کا خلاصا بن گیا

غیر جانبدار رہنا یہ مرے حالات پر
وقت بھی منجملۂ اہلِ تماشا بن گیا

آدمی انسان بنتا، دردِ انساں جانتا
زہد سے تو یہ بزعمِ خود فرشتا بن گیا

اُس کی جرأت پہ نچھاور راحتِ کون و مکاں
جو ترے دردِ محبّت کا شناسا بن گیا

میری عرضِ شوق کی تفسیر ہائے رنگ رنگ
مُدّعا لفظ و بیاں سے اک معمّا بن گیا

حُسن کی فطرت میں نرمی ہی نہیں گرمی بھی ہے
گاہ شبنم ہو گیا، یہ گاہ شعلا بن گیا

جیتے جی تو حرفِ ناگفتہ تھا میں لیکن عروجؔ!
موت نے جادو جگایا تو صحیفا بن گیا

نوبہار صابر

آئی ہے تو کیا یہیں آ کر بسر جائے گی رات؟
راہ چلتی اِک مسافر ہے گزر جائے گی رات
اِک ذرا ہے بارشِ سنگِ سحر ہونے کی دیر
دیکھتے ہی دیکھتے یارو! بکھر جائے گی رات
زندگی میں جھوٹ سچ کا میل ممکن ہی نہیں
صبح کی آغوش میں جاتے ہی مر جائے گی رات
آئینۂ زردِ صبح کا تو رنگ فق ہونا ہی تھا
ہم سیہ بختوں کو دیکھے گی تو ڈر جائے گی رات
پے بہ پے یہ وحشتِ تنہائی میں سناٹوں کے ڈنک
زہرِ غم بن کر مرے دل میں اُتر جائے گی رات
تھک تھکا کر ڈال دے گا شام تک سورج سپر
مثلِ خنجر دن کے سینے میں اُتر جائے گی رات
چاند کا جھومر سجائے آئی ہے خندہ بہ لب
سر برہنہ صبح کو باچشمِ تر جائے گی رات
ہم اُجالوں کے محافظ لے کے قندیلِ حیات
پیچھے پیچھے جائیں گے صابرؔ جدھر جائے گی رات

○ مئو ناتھ بھنجن، یوپی ○ گھیر سیف الدین خاں رامپور، یوپی ○ مڑیا آشرم، رگھو ماجرہ، پٹیالہ

غــــزلیں

مدحت الاختر

لبوں سے ایک اِک گالی دُعا بن کر نکلتی ہے
تماشا دیکھنے کو رُوح پیراہن بدلتی ہے

فصیلوں سے لٹکتی ہیں چڑیلوں کی گھنی زلفیں
فضائیں منتظر ہیں اور سونی رات ڈھلتی ہے

چلو وہ سر پھری لڑکی کہاں جاتی ہے دیکھیں گے
جو سورج ڈوبتے ہی اپنے گھر سے آ نکلتی ہے

"یہاں سے دُور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی"
لہو اس کا ہماری زندگی چہرے پہ ملتی ہے

پڑی ہیں زندگی کے پاؤں میں کچھ بیڑیاں ایسی
ہزاروں سال دم لیتی ہے جب دو گام چلتی ہے

مقامِ سخت ہے، لفظ و صدا کا مرحلہ مدحت
بڑی مشکل سے دل کی بات خاموشی میں ڈھلتی ہے

▲▲

والی آسی

یہیں پہ زرد زدہ سائے دکھائی پڑتے تھے
جو اس نشیب میں جا کر کہیں بچھڑتے تھے

نہ جانے کون تھے وہ ؟ آرزو کے باغوں میں
سحر سے شام تلک تتلیاں پکڑتے تھے

اِدھر تو ہم نے کوئی خواب بھی نہیں دیکھا
وہ دن بھی کیا تھے کہ سوتے میں چونک پڑتے تھے

یہ آنے وال کتابوں میں لکھا جائے گا
ہم آدمی تھے ! مگر رات دن جھگڑتے تھے

نتیجہ یہ کہ پھر اک شعر بھی نہ کہہ پائے
ہم اپنی قوّتِ گویائی پر اکڑتے تھے

بزرگ اپنے بڑے سادہ لوح تھے والی
غزل میں حرف نگینوں کی طرح جڑتے تھے

▲▲

عابد مناوری

یہ شبِ تار یہ گھنا جنگل
راستے سب نگل گیا جنگل

دشت در دشت، دوڑتی سڑکیں
شہر در شہر پھیلتا جنگل

کتنی صدیوں میں لہلہایا تھا
ایک دن میں اُجڑ گیا جنگل

جب کوئی صاحبِ جنوں ہی نہیں
راہ پھر کس کی دیکھتا جنگل

سُن رہا تھا مری دُہائی مگر
کیسا گُم سُم پڑا رہا جنگل

دھوپ کے شہر ہی میں لوگ رہے
پاس ہی تھا ہرا بھرا جنگل

مجھ کو بھٹکا رہا ہے اے عابد
اِس غزل کی ردیف کا جنگل

▲▲

○ نیا گودام، کامٹی، مہاراشٹر ○ مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک لکھنؤ ○ ۸/ ۱۸۱ گاندھی نگر، جموں (توی)

پیچھے

جوگندر پال

میں اور وہ (وہ کون ہے ؟) سیدھے یہیں چلے آئے ہیں۔

کتنا چوڑا دریا ہے ! اِن لوگوں نے ہمیں بتایا ہے کہ پچھلے تین چار سو سال سے یہ دریا ہر سال دونوں کناروں پر ایک ایک انچ بڑھتا جا رہا ہے۔ کبھی اتنا چھوٹا ہوگا کہ اِدھر سے کسی کو اُدھر کچھ کہنا ہوتا تو یہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سی آواز دے دیتا —— سُن رہے ہو ؟ بابر ہندوستان پر چڑھ آیا ہے —— چڑھ آیا ہے تو کیا ہوا ؟ اپنے آپ اُتر بھی جائے گا —— اور نہ اُترا تو ؟ —— تو بھی کیا ؟ تو اُسے رہنا پڑ جائے گا —— اور رہ گیا تو ؟ —— رہ گیا تو اچھا ہی ہے، رحمت بن کر رہے گا ! —— ہاں، اِس دریا میں کتنے سیلاب آئے ہوں گے، اور جو سیلاب نہیں اترے ہوں گے اُن سے دریا اور چوڑا ہوتا گیا ہوگا تاکہ سیلابی حالت نہ بنی رہے۔ پانی کو اگر بہتات میں بہتے چلے جانا ہے تو تنگ کناروں کا ڈھے ڈھے کے پیچھے سرکتے جانا فطری ہے، اور کنارے پیچھے ہٹتے جائیں تو اِس دُنیا اور اُس دُنیا میں فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ پہلے تو لوگ کود کر یہاں سے وہاں جا پہنچتے تھے۔ یہ ذرا سا تو فاصلہ تھا۔ لیجئے، جگت پتا، آ گیا ہوں ! —— اور جگت پتا کا کام انجام دے کر اُسی طرح کود کے واپس آ گئے، اِدھر گیا اور اُدھر گیا ؟ کسی کو تعجب نہ ہوتا تھا کہ یہ شخص تو مر چکا تھا، اب جوں کانوں جی کیسے پڑا ؟ —— لیکن اب تو دوسرا کنارہ اتنا دُور ہو گیا ہے کہ کنارے کے آگے پہاڑوں کا سلسلہ پانی سے ہی اُبھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تا حدِ نظر پانی ہی پانی ہے اور پانی کی ننگی اور گاڑھی لہریں تیز تیز سانس لیتے ہوئے بے سدھ بھاگی جا رہی ہیں —— ازل سے ابد تک، اور انہیں درمیان سے چیر کر ہمیں دوسرے کنارے پر پہنچنا ہے۔

اور دل کے ساتھ میں اور وہ (وہ کون ہے ؟) کشتی میں آ بیٹھے ہیں اور کشتی کے آگے اور پیچھے دونوں طرف آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ملاحوں نے ایک دوسرے کو بڑی گہری مُسکراہٹ سے دیکھا ہے جیسے روانگی سے پہلے اپنے دوسرے سارے رشتے توڑ کر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہوں اور پیوست ہو کر چاروں کے چاروں یک روح ہوں اور یک روح ہو کر اُن میں اعتماد آ گیا ہو کہ اب ہمیں وہاں پہنچنے سے کون روک سکتا ہے —— اور کشتی حرکت میں آ گئی ہے اور اُس کے آگے لہریں کٹنے لگی ہیں اور کٹ کٹ کر اُس کے پیچھے اپنے آپ جڑتی جا رہی ہیں اور اپنی بھاگا بھاگ میں اُنہیں کٹنے کا احساس ہو رہا ہے نہ جڑ جانے کا —— اور چاروں ملاحوں نے بیک آواز گانا شروع کر دیا ہے :

لہرو، ہمیں روکو نہیں
لہرو، ہمیں جانے دو

فرینڈز کالونی، نئی دلی ۱۱۰۰۲۵،

لہرو، ہمیں روک لیا تو تمہیں ہمارے لیے روٹیاں پکانا پڑیں گی۔

اور جھونپڑے بنوانا پڑیں گے۔

اور کپڑے سلوانا پڑیں گے۔

لہرو، ہمیں روکو نہیں۔

لہرو، ہمیں دُور سے دیکھ لو اور جانے دو ——

ملاح اپنے سارے بدن سے گا رہے ہیں اور ہمارے ذہن دیکھ رہے ہیں کہ اُن کی آوازیں ہاتھوں میں ہاتھ باندھے ہنستے کھیلتے پانی پر چل چل کر وہاں اُس پار پہنچ رہی ہیں اور ہم منجدھار میں آ پہنچے ہیں۔ ہم وہاں سے چلے تھے جہاں بستی ہی بستی ہے اور وہاں جا رہے ہیں جہاں ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔ چلنے سے پہلے بستی کے چند پنڈتوں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ اِس موسم میں اُدھر مت جاؤ، اور جانا ہی ہے تو جیون کا انتم پاٹھ ہم سے یہیں بستی کے کنارے پڑھوا جاؤ —— اور اُن کی باتیں سُن کر ہماری ننھی منّی دھندلی سی مسکانیں ڈر کر ہمارے منھوں سے اڑ گئیں اور ہم نے کبوتروں کی طرح آنکھیں موند لیں لیکن ملاحوں کے مردانہ قہقہوں نے ہماری کایا کو بدلنے سے بچا لیا —— ڈرو نہیں بالو، آؤ —— اسی موسم میں تو مورتیوں کا پتھر پگھلتا ہے اور اُن کے سانسوں سے ویرانہ آباد ہوتا ہے —— ڈرو نہیں —— دوسرے موسموں میں دریا کا کامبی تان کر سویا ہوتا ہے تو لوگوں کی بھیڑ کی بھیڑ اُدھر جا پہنچتی ہے اور اُن کے وہاں پہنچتے ہی مورتیاں پھر پتھر کی پتھر ہو جاتی ہیں۔ بھگوان کی مہما دیکھنے کا سمے تو اسی وقت ہے۔ ہمت کر کے آؤ اور دیکھو آجکل ویرانے میں زندگی کی کیا بہار آئی ہوئی ہے۔ اِس طرف ہم بسے ہوتے ہیں اور اُس طرف سانس لیتی ہوئی مورتیوں کا ہجوم ہے —— رکو نہیں بالو، پانی سے کیا ڈر؟ ہر شخص کا تین چوتھائی تو اپنے بدن میں ہی پانی میں ڈوبا ہوتا ہے —— آؤ! —— اور میں اور وہ (وہ کون ہے؟) اور چند اور یاتری دلوں تک ڈوبے ہوئے یہاں کشتی میں آ بیٹھے ——

ہماری کشتی کنارے کے قریب آ گئی ہے تو میں نے پراچین کال کے کسی نوجوان راجکمار کی ڈوبی ڈوبی مورت کو ایک اپسرا کے گلے میں باہیں ڈال کر نہاتے ہوئے دیکھا ہے اور چونک پڑا ہوں —— اور ایک ملاح میری حیرت سے خوش ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کسی لہر کی طرح اُچھل کر گویا ہوا ہے، ہم نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا بالو، کہ اکیلے میں مورتیاں جی اُٹھتی ہیں —— اور میری آنکھیں ابھی تک اُس مورتی کی طرف مُڑی ہوئی ہیں کہ ایک اور ملاح کی آواز میرے کانوں سے جھول کر دریا میں کود گئی ہے: مورتیوں کا سلسلہ دریا کے منجدھار سے ہی شروع ہو جاتا ہے —— ایک اور ملاح نے وضاحت کی ہے۔ جہاں اب منجدھار ہے پہلے زمانے میں وہاں سے دریا کا کا کنارہ شروع ہو جاتا تھا —— تو کیا پانی کے نیچے ڈوبی ہوئی مورتیوں کا دم نہیں گھٹتا؟ —— جس کا مقدر ہی ڈوب ڈوب کر جینا ہو وہ خشکی پر لوٹنے پوٹنے لگتا ہے! ——

سارے یاتری کشتی سے اُتر گئے ہیں تو میں اور وہ بھی (وہ کون ہے؟) وہاں سے کنارے پر آ کھڑے ہوئے ہیں اور ہم نے دریا کی طرف پیٹھ پھیر لی ہے اور ہماری نظریں دھرتی کے بھیتر دوڑ گئی ہیں۔

دریا کے اِس پار چاروں طرف ہمیں لمبی لمبی خاموشی کا احساس ہو رہا ہے، جیسے مورتیوں کی یہ بستی دُور دُور تک پھیلی ہو۔ ہمارے عین سامنے ایک پتھریلا پہاڑ ہے جس سے شو اتر رہے ہیں تجسوی کی جٹاؤں میں سانپوں کی پھنکار ہے اور نیلے چہرے میں آکاش کا سکون، اور بدن پر مٹی کی چمک دمک اور ہاتھوں میں چمٹے کی جھنکار —— اور خاردار ڈھلان پر بے پروائی سے آگے پیچھے رکھتے ہوئے ننگے پیر —— شو گھاٹ کی طرف نیچے آ رہے ہیں اور دریا کا باقی کناروں کو توڑ پھوڑ کر

اوپر اُن کے پیروں کی طرف چڑھ جانا چاہ رہا ہے ——— ——— اور وہ ——— ہماری بائیں جانب کے راستے سے ایک ہاتھی جھوم جھوم کر نکل رہا ہے، شاید نہانے کے لیے ادھر آرہا ہے اور پانی کو دیکھتے ہی خیال ہی خیال میں یہیں سے پانی میں اترا ہوا ہے اور دریا کی تہہ پر قدم اٹھانے کے انداز میں چل رہا ہے، کانوں کو پھڑ پھڑاتے، سونڈ سے پانی کی پچکاریاں چھوڑتے، دُم ہلاتے، ——— ہاتھی سے بچتے ہوئے ہم اسی طرف مڑ گئے ہیں اور اس کے عقب میں ایک پھٹے حال ادھیڑ عمر شخص کی دیوانی سی بارِیش مورت کو اپنی طرف گھورتے ہوئے پاکر ٹھہر گئے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے اُسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ہے، مورتی کار نے کالا پتھر دل و جان سے کاٹ کاٹ کر کالا گوشت بنا دیا ہے ——— ہم سب نے دیوانے بابا کے کالے گوشت پر نگاہ جمالی ہے ——— ارے! یہ تو سانس بھی لے رہا ہے! کھڑے کھڑے بال دیکھئے، ایسے بال پتھر کو تراش کر بنائے جا سکتے ہیں؟ ——— نہیں، چھو کر بے چارے کو ڈسٹرب مت کرو! ——— مختصر سے ہنسنے کی آواز سن کر ہمارے کان ایک دم کھڑے ہو گئے ہیں اور ہم تعجب سے دیوانے کا منہ دیکھنے لگے ہیں ——— نہیں، یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ——— لیکن نہیں، اب کے ہم نے دیوانے کو اپنی آنکھوں سے اتنا ہی ذرا سا ہنستے ہوئے دیکھ لیا ہے، جتنا وہ ابھی ابھی ہنسا تھا ——— دیوانہ بابا واقعی گویا ہے، یہی تو دُکھ کی بات ہے دوستو، کہ ہم مورتیاں نہیں ——— تم نہ ہمیں ——— ہم سب اپنی حماقت پر ہنسنے لگے ہیں لیکن دیوانے بابا نے ہلکے سے توقف کے بعد نہایت سنجیدگی سے منہ کھولا ہے تو ہماری ہنسی اس سرنگ کے پٹ کھلتے ہی اس میں داخل ہو کر غائب ہو گئی ہے۔

کیا مجھے کھانے کو کچھ مل سکتا ہے دوستو؟

ہاں، یہ لو بابا، یہ کیلے کھا لو۔

لاؤ، تمہیں دیکھ کر میں اس لیے ہنس پڑا دوستو، کہ چلو بھوک مٹنے کا حیلہ تو پیدا ہو گیا۔

دیوانے بابا نے کیلے کو چھیل سمیت منہ میں ڈال لیا ہے۔

اور روئے کیوں؟

رونا اس لیے آگیا دوستو، کہ تم آتو گئے ہو لیکن کب اور کہاں آئے ہو؟ ——— کسی کا ہونا اور آنا تو اس وقت ہوتا ہے دوستو، جب کوئی نہایت پرانے ماضی سے اچانک باہر آجائے اور اُس کی آمد پر پتھر کے پہاڑ میں اندر ہی اندر خلا ہو جائے اور وہ غار کا غار اُس کی دھڑکنوں سے جی پڑے ——— آؤ دوستو، وہ ——— وہاں اُس ستون کے پاؤں میں ایک گڑھا ہے اور اُس گڑھے میں ایک سوراخ ——— میں نے بھی اتفاق سے آج ہی صبح اس سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا ——— آؤ دوستو ——— آؤ! ——— یہ سوراخ ہے! ——— باری باری دیکھو ——— باؤلی باتیں اُسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب ہم باتوں کے جسم بھی دیکھ لیں ——— دیکھو!

میں نے سوراخ پر سر جھکا لیا ہے۔ غار میں باہر کی روشنی کی ایک ہی کرن اپنے آپ سے کھیل رہی ہے اور اُس کی نم آلود مدھم روشنی سے میں اپنے چہرے پر ٹھنڈک محسوس کرنے لگا ہوں اور آنکھیں جھپکائے بغیر لگاتار دیکھے جا رہا ہوں اور میری نظر میں یہ منظر بسا ہوا ہے کہ شیام سندر بال کرشن غار میں کھڑا ہے اور اُس کے پُر نشاط سانس سے بانسری کے سُر پھوٹ رہے ہیں اور اُس کے ارد گرد مکھن کے پیڑوں جیسی سندر اور ملائم گوپیاں لسی میں تھئی تھئی اچھل اچھل کے بے سدھ ناچی جا رہی ہیں اور ناچ ناچ کر اُن کی ملائمت گاڑھی ہو رہی ہے اور نقش تیکھے نکلنے آرہے ہیں ——— تھئی ——— تھئی تھئی! ——— پتھروں سے زندگی کا دودھ نچڑ رہا ہے! ———

کسی نے ہلکے سے میرا شانہ دبا کر مجھے سوراخ سے اٹھنے کو کہا ہے اور میں نے اپنا سر اوپر نہیں اٹھایا ہے بلکہ وہ سارا غار ہی اوپر اٹھ آیا ہے، اور میں سیدھا کھڑا ہو گیا ہوں تو میں اور وہ (وہ کون ہے؟) ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر ایک دوسرے کے سر میں وہی غار کا منظر دیکھے جا رہے ہیں ——

دیوانے بابا کے قہقہے کی آواز سے ہم سب یاتری اپنے انہماک سے چونک پڑے ہیں۔

آتا تو یہی ہے دوستو، جو صدیوں پہلے آیا ہو اور اگر جیون کی کسی نہ کسی جھلک میں رہ گیا ہو! ——

لاؤ، دو اور کیلے دے جاؤ دوستو۔

دو کیا؟ لو چار اور کھاؤ بابا۔

لاؤ۔ بابا نے کیلوں کو منہ سے کھانے سے پہلے اپنی بھوکی نظروں کو دعوت دی ہے —— لو بابا کی آنکھو، تم بھی کھاؤ!

ٹریل کم ٹو دا کیوز!

ہم نے ایک اجنبی آواز سن کر پیچھے مڑ کے دیکھا ہے۔

اِن غاروں کی سرکاری دیکھ بھال میرے ہی ذمے ہے۔

یہ مورتیاں بنائی کس نے تھیں؟

سرکاری ریکارڈ کے مطابق ——

اوشٹ اپ! —— بابا نے اُسے سختی سے ٹوک دیا ہے —— اِسے کیا پتہ، اِن مورتیوں کو بنانے والے کون تھے؟

ہمارے بابا کسی زمانے میں اُس پار کی بستی میں ہسٹری کے پروفیسر تھے —— سرکاری آدمی نے مسکرا مسکرا کر ہمیں بتایا ہے —— ہمارے غاروں میں گھوم گھوم کر بے چارے پاگل ہو گئے ہیں —— نہیں گھبرائیے نہیں، بڑے بے ضرر پاگل ہیں اور چوبیسوں گھنٹے یہیں گزارتے ہیں —— غار دیکھنے کے لیے آپ کو سرکاری گائیڈ کی ضرورت ہو تو میں اُسے اپنے دفتر سے بھجوا دوں گا —— صرف دو روپے فی کس!

ارے جاؤ نا، گائیڈ کے بچے، جاتے کیوں نہیں؟

وہ چلا گیا ہے تو پروفیسر بابا ہم سے مخاطب ہوا ہے۔

میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ گئیں دوستو، تو تم بھی پاگل ہو جاؤ گے —— اِن غاروں سے جو مجھ پر بیتی ہے وہ صرف مجھ پر ہی بیتی ہے۔ اپنی آپ بیتی صرف میں ہی تمہیں بتا سکتا ہوں، کوئی اور نہیں۔

پہلے یہ بتاؤ بابا، یہ مورتیاں کس نے بنائیں؟

ابھی تک تمہاری سمجھ میں میری پہلی بات ہی نہیں آئی ہے دوستو، تو باقی کے سوال کیوں اٹھا رہے ہو؟ جو کچھ بھی ہونا ہے ماضی میں ہی ہوتا ہے، کیونکہ حال میں ہمیں صرف کیلے کھانا ہوتا ہے —— میں واقعی پاگل ہو چکا ہوں دوستو، لیکن سچ کہتا ہوں کہ اگر میرا جینا کیلے کھانے کے بندھنوں کو توڑ چکا ہوتا تو اب تک اپنے ماضی سے پھوٹ کر میں بھی یہیں کسی پہاڑ کے ماتھے پر کھُد گیا ہوتا —— لیکن اس میں بھی کوئی ہرج نہیں، کیونکہ صبر کی کوئی میٹھی شکل سینکڑوں ہزاروں برسوں میں ہی بنتی ہے جب صبر کرنے والے کی ہڈیاں مٹی ہو ہو کر پتھر بن چکی ہوتی ہیں —— جب ہم بند پتھر میں لہلہاتے ہوئے پودے کا ذکر کرتے ہیں دوستو، تو وہ ساری گھُٹنا یہی ہے۔

ہم میں سے کسی نے بابا کو ٹوکنا چاہا ہے ——

نہیں، مجھے ٹوکو نہیں، اپنی باتوں سے مجھے تمہاری تسلّی نہیں کرنا ہے، مجھے صرف اپنی ڈھارس بندھانا ہے، صرف اپنے آپ سے کہنا ہے، آؤ، آؤ، تم بھی ایک خوبصورت روایت ہو —— آؤ، اپنے ماضی میں گھُل مل جاؤ، ماضی میں گھُل مل جاؤ گے تو ہر انسان تمہیں اپنا ہی ماضی سمجھ کر گلے لگا لے گا، اپنی ہی روایت سمجھ کر تم میں اپنا آپ پا لے گا ——

لیکن بابا، تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ یہ مورتیاں کِس نے بنائیں۔

ابھی تک نہیں سمجھے دوستو، تو کیا سمجھو گے؟ اِن مورتیوں کو بنانے والا کوئی نہیں۔ جن مورتیوں میں جان ہوتی ہے وہ آپ ہی آپ بن جاتی ہیں —— جاؤ اب! تمہارے کیلوں سے میرا پیٹ بھر گیا ہے —— جاؤ!

—— لیکن تم آئے ہی کب تھے کہ چلے جاؤ گے؟

—— نہیں، اب مجھے کچھ اور سننا ہے نہ کہنا ہے

—— جاؤ اب! ——

ہم پاگل پروفیسر بابا کو چھوڑ کر اُسی راستے پر آگے ہو لیے ہیں اور ابھی چند ہی قدم چلے ہیں کہ راہگزر کے دائیں کنارے پر ہمیں ایک جیوتشی کی سی صورت دکھائی دی ہے وہ گھٹنے ٹیکے، سوکھا سا ایک ہاتھ میں کھلی پُستک لیے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پر شاید ستاروں کا حساب لگا رہا ہے۔ پہلے تو مجھے خیال گزرا ہے کہ شاید وہ کوئی مورتی ہی ہے لیکن پروفیسر بابا کے واقعہ کا خیال کر کے میں مسکرانے لگا ہوں اور آگے بڑھ کر جیوتشی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا ہے۔ اُس نے سر اوپر نہیں اُٹھایا ہے تو میں نے شرمندہ ہو کر جھکتے ہوئے اُس کے کندھے کو چھوا ہے کہ وہ میری طرف دیکھے اور —— مجھے پتھر چھونے کا احساس ہوا ہے اور میں نے سوچا ہے کہ شاید وہ صدیوں سے یوں ہی ستاروں کے حساب کتاب میں اُلجھ کر بیٹھا ہے اور اپنے انہماک میں پتھر ہو گیا ہے —— اور میں نے اُسے دوبارہ چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی ہے کہ پروفیسر بابا کی آواز ٹھاٹھیں مارتی ہوئی مجھے بہا لے گئی ہے —— جس مورتی کو بھی چھوؤ گے دوستو، وہ پتھر ہو کر رہ جائے گی —— اور میں اور وہ (وہ کون ہے؟) گھبرا کر سیدھے کھڑے ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہم دونوں کو گمان ہوا ہے کہ ہم پروفیسر بابا کو چھو لیتے تو وہ پتھر ہو جاتا —— اور —— اور —— عجیب بات ہے —— جب وہ (وہ کون ہے؟) اور دونوں میں شامل ہونے کے لیے میرے ساتھ اُدھر مڑنے لگا ہے تو میں نے اُسے اسی نیت سے چھو لیا ہے کہ وہ ٹھہر جائے اور پتھر ہو کر مجھے صاف دکھائی دینے لگے، لیکن کیا یہ بھی عجیب نہیں کہ اُسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور وہ ویسے ہی پرچھائیں کی پرچھائیں —— وہ میرے آگے آگے جا رہا ہے!

اِس نئے راستے میں داخل ہوتے ہی ہم ایک بڑے کشادہ غار کے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں اور اُس کے اندر پہاڑ کے باطن میں پہنچ کر اپنے آپ کو بدھ کی ایک بہت بڑی مورتی کے سامنے پایا ہے۔ بدھ کے سر کا جوڑا چھت تک پہنچا ہوا ہے اور اُس کے جھکے جھکے شانت نین غار کے دروازے پر ٹکے ہوئے ہر آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں —— جو بھی پہنچ جائے مجھے اُسی کا انتظار تھا، مجھے کسی خاص ایک کا انتظار نہیں، تم آ گئے ہو تو مجھے تمہارا ہی انتظار تھا —— بدھ کی نظر گہرے پانی کی طرح ٹھہری ہوئی ہے اور گھمبیرتا سے مسکرائے جا رہی ہے —— کچھ اِس طرح کہ گھمبیرتا ہو تو گہری نہ ہو، اور مسکرا رہی ہو تو اُس میں روشنی کا سبک پن نہ ہو —— اور اتنی قریبی ہے کہ ہمارے چہروں کی بجائے دلوں پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک کو معلوم ہو رہا ہے کہ بدھ صرف اُسی کی طرف تک رہا ہے۔ میں نے اُس کی طرف یہاں اِس کونے سے دیکھا ہے اور اُس کی ٹٹولتی ہوئی پُر چین نظر سے بے چین ہو کر یہاں چلا آیا ہوں اور یہاں سے بھی میری آنکھیں بے اختیار بدھ کی جادوئی آنکھوں کی طرف اُٹھ گئی ہیں جو وہیں ٹھہرے ویسے ہی یہاں بھی مجھے دیکھے جا رہی ہیں اور میں تعجب سے وہاں ہو لیا ہوں —— اُس آخری کونے میں، اور —— اور یہاں بھی اُس کی نظر کی ساکن مسکراہٹ مجھے ویسے ہی بڑی قریبی دلچسپی سے ٹٹول رہی ہے —— میرے سارے ساتھی بھی جگہیں بدل بدل کے چھپی چھپی آنکھیں بدھ کے چہرے کی طرف اُٹھا رہے ہیں اور بدھ اپنی گردن کو

عین اُسی ایک جگہ پر لٹکائے ہماری ہر نئی جگہ پر ایک ایک کو اُسی بے جھجک ہمدردی سے دیکھے جا رہا ہے۔ اُس کے لیے ہماری محبت مشترک ہے لیکن ہم سب کے لیے اُس کی محبت ہماری الگ الگ ذات سے ہے ——

مگر بیٹے، بدھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے میں نے اچانک محسوس کیا ہے کہ اُس کی آنکھوں کی دونوں ساکن پتلیوں میں وہ (وہ کون ہے؟) میری طرف منہ کیے ہوئے ہے، اور بدھ کی نظر مجھ پر جمی ہوئی ہے لیکن وہ مجھے دیکھ نہیں رہا ہے —— میں گم ہو گیا ہوں، شاید میرے دوسرے ساتھی بھی گم ہو گئے ہیں اور ہم سبھی غار کے باہر آ گئے ہیں اور اِسی بے خبری کے عالم میں ذرا آگے جا کے ایک نئی راہ میں مڑ گئے ہیں اور —— ہائیں یہ کیا؟! —— ہم نے پہلے تو تحیّر سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ہے اور پھر اپنے سامنے —— یہاں مورتیوں کا ایک پورا نگر آباد ہے! —— سڑک پر ادھر اُدھر کئی لوگ آ جا رہے ہیں۔ دکانیں سجی ہوئی ہیں اور دکاندار خریداروں سے بھاؤ ٹھہرا رہے ہیں یا اُن کی خریدی ہوئی چیزیں اُنہیں سونپ رہے ہیں یا اگر دکان پر کوئی گاہک نہیں تو سڑک پر خالی خالی نظریں لٹکائے ہوئے ہیں —— آیئے، ذرا تیز تیز آیئے! —— وہ رتھ بڑی رفتار سے ادھر ہی آ رہا ہے اور یہ آدمی سڑک کی دوسری طرف جانے سے پہلے سوچ رہا ہے کہ ذرا تھم جائے، یا رتھ کے یہاں پہنچنے سے پہلے جلدی جلدی سڑک کو پار کر لے —— اس گائے کو یہ بوڑھا نہ معلوم کیا کھلا رہا ہے اور گائے پونچھ ہلا ہلا کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اُس کے چہرے کو بھی دیکھ رہی ہے اور اُس کے چہرے کے پیچھے سبزی بھاجی کی دکان پر بھی اُس کی نظر ہے —— یہ پھول والی! —— آیئے، اِس سے پھول لیتے ہیں —— مگر —— مگر پھول والی نے ہماری طرف دھیان ہی نہیں دیا ہے، شاید بہری ہے —— ہاں، شاید اندھی بھی —— نہیں، اندھی تو نہیں ہے —— پھولوں کا ٹوکرا اُس کی پیٹھ پر لٹکا ہوا ہے۔ میں نے اسے چھونا، ذرا سا جھٹکنا چاہا ہے —— جس مورتی کو بھی چھو دو گے دوستو، وہ پتھر ہو کر رہ جائے گی بس —— میں رُک گیا ہوں! پھول والی! پھول —! —— اُس نے جواب میں ہمیں دیکھا بھی نہیں ہے اور ہم شرمندہ سے ہو کر رہ گئے ہیں —— وہ —— وہاں چند لوگ ایک ارتھی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ارتھی کے پہلو میں وہ نوجوان شاید مرنے والے کا بیٹا ہے —— سر منڈوائے، صرف دھوتی پہنے، ننگی چھاتی پر جنیو کا ایک سوتی تار ایک ہاتھ میں لیے اور دوسرے ہاتھ سے پانی کا لوٹا اٹھائے ننگے پاؤں باپ کی ارتھی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور دل ہی دل میں اگلے چند دنوں کے سارے سنسکار پورے کرنے کا خاکہ تیار کر رہا ہے —— یہ راستہ شاید شمشان گھاٹ کو جاتا ہے —— ارے بھائی ٹھہرو! یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟ —— میں نے ایک راہگیر سے پوچھا ہے لیکن پھول والی کی طرح اُس نے بھی ہماری طرف سر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا ہے —— تو —— تو کیا —— کیا ——؟ —— ہاں، ہو سکتا ہے ہم یہاں موجود نہ ہوں —— ہو سکتا ہے ہم سرے سے ہوں ہی نہ —— ہم نے چاروں طرف حیرت سے نگاہیں دوڑائی ہیں اور ہمیں یقین ہونے لگا ہے کہ یہاں بھی لوگ ہماری موجودگی سے بے خبر ہیں، ہم اُنہیں قطعاً دکھائی نہیں دے رہے ہیں، محسوس نہیں ہو رہے ہیں! —— یہاں وہ ہی وہ ہیں یا ہم ہی ہم —— لیکن یہ بستی اُن ہی کی تو ہے۔ اُنہی کا کام کاج، اُنہی کا رونا دھونا، جینا مرنا، ہنسنا کھیلنا تو سارے آس پاس میں بسا ہوا ہے —— وہ تو سارے ہیں ہی، ہم ہی نہ ہوں گے ——

ہم بوکھلا گئے ہیں اور تیزی سے سڑک کے باہر نکل آئے ہیں اور پھر دریا کے کنارے آ پہنچے ہیں اور دستور

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

لینن کے ایک ہمعصر اور رفیق کا سوویٹ کمیونسٹ پارٹی سے استعفیٰ

گیبریل رونائے

روس کی مجلس علمی کے رکن آرنوشٹ کولمان نے جو روسی کمیونسٹوں کی پرانی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور انقلابِ اکتوبر میں لینن کا شریک کار تھا، ۵۸ برس تک سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر رہنے کے بعد، اپنا پارٹی کارڈ برزنیف کو واپس کر دیا ہے اور سویڈن سے سیاسی پناہ طلب کی ہے۔

آرنوشٹ کولمان ۸۴ سال پہلے پریگ میں پیدا ہوا تھا۔ سوویٹ اقتدار کے قیام کے لیے وہ بندوق سے بھی لڑا اور قلم سے بھی اور اس کی ساری زندگی کمیونزم کے فروغ کے لیے وقف رہی۔ کولمان کے کارناموں کی روداد پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کی حقیقی تاریخ پڑھ رہا ہے۔ ایک ایسی تاریخ جو احتساب کی زد سے محفوظ رہی۔ وہ صفائی کی تمام مہموں سے بچ نکلا۔ کئی بار قید ہوا پھر بحال کر دیا گیا۔ لیکن اس سلسلے میں اس کی تشویش بڑھتی گئی کہ پارٹی کی ہیئت کو مسخ کیا جا رہا ہے، اسٹالنی دہشت بدستور قائم ہے اور بیرونِ ملک سوویٹ روس علاقائی تسخیر کی راہ پر گامزن ہے۔

روس جس رفتار سے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر رہا تھا اس نے کولمان کو چھٹے دہے کے ابتدائی برسوں ہی میں یہ یقین دلا دیا تھا کہ کریملن کے حکمران جارحانہ جنگوں کی تیاریاں کر رہے ہیں اور ۱۹۶۸ء میں جب روس نے چیکوسلواکیہ پر حملہ کیا تب تو اسے اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ سوویٹ روس سامراجی توسیع کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔

اب کولمان کو پختہ یقین ہے کہ سوویٹ روس یوگوسلاویہ اور رومانیہ پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

کولمان ایک ممتاز مارکسی فلاسفر ہے۔ اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور سینکڑوں مضامین جو ہر موضوع پر ہیں۔ وہ برقی مشینوں کی سوویٹ اسٹیٹ کمیٹی کا رکن ہے اور چیکوسلواکیہ کی سائنس اکاڈمی کا بھی رکن ہے اور ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی کا ریٹائرڈ پروفیسر ہے۔ چار سال پہلے اس نے اپنی بیٹی سے جو چیکوسلواکیہ کے نکلیر سائنسداں فرانٹسیک جانوچ کی بیوی ہے، اور اپنے بچوں کے ساتھ ان دنوں سویڈن میں مقیم ہے، ملنے کے لیے پاسپورٹ کی درخواست دی۔ مغرب کے بعض ممتاز کمیونسٹوں کے دباؤ ڈالنے پر اس کی ستردیں درخواست منظور کر لی گئی اور ان دنوں کولمان سویڈن میں ہے۔

سوویٹ کمیونسٹ پارٹی سے استعفیٰ دیتے وقت کولمان نے سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری مسٹر برزنیف کے نام جو کھلا خط لکھا ہے اس کا اختصار شدہ متن حسب ذیل ہے:

"میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میں سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کو چھوڑ رہا ہوں۔ میری عمر ۸۴ برس ہے اور میں ۵۸ برس تک پارٹی کا ممبر رہا ہوں۔ میں نے پارٹی میں شرکت سماجی انصاف کے لیے جہاد کرنے اور نوعِ بشر کے لیے ایک روشن تر مستقبل کے حصول کے لیے کی تھی۔ اب طویل اور تکلیف دہ غور و خوض کے

بعد میں پارٹی سے قطع تعلق کے اس مشکل فیصلے پر پہنچا ہوں۔

"میں پریگ میں پیدا ہوا تھا اور پہلی جنگ کے دوران ایک جنگی قیدی کے طور پر روس لے جایا گیا تھا کرنسکی کے دور حکومت میں مجھے جنگ دشمن پروپیگنڈہ کرنے کے جرم میں ۶ ماہ کی قید تنہائی کی سزا دی گئی۔ انقلاب اکتوبر کے بعد مجھے آزادی ملی سرخ فوج کے سپاہی کی حیثیت سے میں سوویٹ اقتدار کے قیام کے لیے چار محاذوں پر لڑا۔

"اس صدی کے دوسرے دہے میں میں جرمنی میں خفیہ طور پر کام کرتا رہا اور جرمن کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن تھا۔ مجھے پانچ سال کی قید بامشقت کی سزا ملی لیکن ایک سال کی قید کے بعد سوویٹ یونین کے ساتھ قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں مجھے آزادی مل گئی۔

"اس کے بعد کامنٹرن، مرکزی کمیٹی، ماسکو پارٹی کمیٹی اور سوویٹ اکاڈمی آف سائنسز میں میں کئی ذمہ دارانہ نظریاتی عہدوں پر رہا۔ مجھے ماسکو پارٹی کے کنٹرول کمیشن اور ڈسٹرکٹ کمیشن کا ممبر منتخب کیا گیا۔ میں لینن کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور لینن کی بیوی کروپسکایا، خروشچیف اور دوسرے ممتاز کمیونسٹوں کے ساتھ بھی میں نے کام کیا ہے۔

"دوسری جنگ عظیم میں میں سوویٹ فوج کی سیاسی کمان میں شامل تھا۔ میں ان یونٹوں کا انچارج تھا جن کا کام دشمن کی فوجی صفوں میں بے اطمینانی پھیلانا تھا۔ اسی زمانے میں میری بہن کو ہٹلر کے کیمپوں میں گیس کی انگیٹھی میں زندہ جلا دیا گیا اور میرے بھائی کو جو چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ یوتھ لیگ کے بانیوں میں تھا، اسٹالن نے قتل کرا دیا۔

"۱۹۴۵ء میں مجھے پریگ میں چیکوسلواک کمیونسٹ پارٹی کے پروپیگنڈہ ڈپارٹمنٹ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا لیکن تین سال بعد مجھے گرفتار کر کے واپس ماسکو بھیج دیا گیا جہاں میں ساڑھے تین برس تک لوبیانسکا جیل میں رہا۔ ان میں سے تین برس میں نے قید تنہائی میں بسر کیے۔ اس دوران میں مجھ پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔

"اسی دور میں میری بیوی اور میری چھوٹی لڑکی کو پلیانوسک میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں کا ماحول ناقابل برداشت تھا۔ اپنی بحالی کے بعد میں پھر پریگ کی فلسفے کی انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر مقرر ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں ریٹائر ہونے کے بعد سے میں ماسکو میں ایک پنشن یافتہ کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

"خروشچیف کی طرف سے اسٹالن کے خونی جرائم کے انکشاف کے بعد جنھیں شخصیت پرستی سے منسوب کیا گیا تھا، میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ سوویٹ کمیونسٹ پارٹی اور سوویٹ حکومت کا حلیہ بری طرح مسخ ہو چکا ہے اور پارٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے اس کے لیے میں خود بھی ذمہ دار ہوں۔

"لیکن حقیقی موڑ ۱۹۶۸ء میں آیا جب میں نے اس چیز کا مشاہدہ کیا جسے پریگ کا موسم بہار کہا جاتا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چیکوسلواکیہ کے عوام پورے جوش سے متحد ہو کر پارٹی کی ان امنگوں کا ساتھ دے رہے ہیں کہ سوشلسٹ آدرشوں کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ وہ ایک ایسے سوشلزم کے لیے لڑ رہے تھے جس کے خط و خال انسانی ہوں جب تمہارے ٹینکوں اور تمہاری فوجوں نے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کیا، اسے اپنا سیاسی غلام بنایا اور اس کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ شروع کی۔ مختصر لفظوں میں یہ کہ اسے اپنی نوآبادی بنایا تو تمہاری حکومت کے بارے میں مجھے جتنے بھی واہمے تھے وہ ختم ہو گئے۔

"میرا خیال ہے کہ ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کافی مدت سے ختم ہو چکی ہے اب یہ امداد باہمی کا ایک ادارہ بن گئی ہے جس کا

مقصد پانچ سالہ منصوبے کی تکمیل ہے جو خالصتہً ایک دنیوی مقصد ہے۔

"پارٹی کے ممبروں، کانگرسوں، حتیٰ کہ مرکزی کمیٹی کو بھی پارٹی کی پالیسیوں کے تعیّن میں کوئی دخل نہیں۔ ان سب پالیسیوں کو تم اوپر سے طے کرتے ہو۔

"آخر وہ کونسا سوشلزم ہے جو سوویٹ یونین میں مروّج ہے؟ جہاں سابق سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقوں کی جگہ پارٹی کے محدود اشرافیہ اور ریاستی بیوروکریسی نے لے لی ہے۔ وہ گلے گلے تک دولت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عوام سے برتر اور علیحدگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عام آدمیوں کے لیے ان کے دل میں صرف حقارت ہے۔ وہ ان کی ضرورتوں اور مصیبتوں کو سمجھنے کا نہ ارادہ رکھتے ہیں نہ اس کے اہل ہیں۔

"آخر سوشلزم کہاں باقی رہ جاتا ہے جب تم ملک کے اندر اسٹالن کی کمیت کیشانہ ڈکٹیٹرشپ کو جاری رکھے ہوئے ہو اور بیرونِ ملک ایک بڑی طاقت کی پالیسی پر عمل پیرا ہو۔

"سوویٹ یونین میں معمولی سے معمولی جمہوری حقوق بھی مفقود ہیں۔ آزادانہ انتخابات کی بجائے لوگوں کو صرف انہی امیدواروں کے حق میں ووٹ ڈالنا پڑتے ہیں جو اُن پر اوپر سے مسلط کیے جاتے ہیں۔ وہاں کوئی پبلک لائف نہیں ہے۔ ہڑتالوں کی ممانعت ہے۔ اور ٹریڈ یونینیں ریاستی مفادات کی غلام ہیں۔ وہاں سیاسی بحث وتمحیص کا کوئی وجود نہیں اور سنسر ہمہ گیر ہے۔ اطلاعات کا مقصد گمراہ کن پروپگنڈہ ہے۔

"بنیادی انسانی حقوق سوویٹ یونین میں کھلے بندوں اور انتہائی بھونڈے پن سے پامال کیے جا رہے ہیں۔ غیر مقلدوں پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ لاکھوں لوگ جیلوں میں، نظر بندی کے کیمپوں میں اور نفسیاتی علاج کے اسپتالوں میں جو جیلوں ہی کا ایک نام ہے، سڑ رہے ہیں۔ بعض کو صرف ان کے مذہبی عقائد کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ سوویٹ اقتدار کے ساٹھ برس کے بعد بھی بنیادی ذہنی آزادیاں مفقود ہیں اور تخلیقی آرٹسٹوں کو آزادانہ تخلیق کی اجازت نہیں۔

"جہاں تک قومیتوں کی پالیسی کا تعلق ہے، سوویٹ یونین کی تاریخ صرف علاقائی تسخیر، جبری ادغام اور خود سوویٹ روس کی اقلیتوں کے خلاف امتیاز برتنے اور انھیں غلام بنانے کی تاریخ ہے۔ ان اقلیتوں میں جرمن تاتار بھی ہیں، وولگا کے جرمن بھی ہیں، یہودی بھی ہیں، بالٹک کی قومیں بھی ہیں اور وسط ایشیا اور کاکیشیا کے عوام بھی۔ سوویٹ یونین اسی طرح قوموں کا قید گھر ہے۔ جس طرح زار کا روس تھا۔

"عدم کشیدگی اور پُرامن ہم وجودیت کا پرچارک ہونے کے باوجود سوویٹ یونین نکلیر ہتھیاروں اور راکٹوں میں بڑی تیزی سے اضافہ کر رہا ہے۔ وہ بڑے وسیع پیمانے پر تباہ کن ہتھیار تیار کر رہا ہے اور جارحانہ جنگوں کی تیاری میں مصروف ہے۔

"سوویٹ سرحدوں کے باہر بھی سوویٹ فوجیں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ سوویٹ یونین یورپ، ایشیا اور افریقہ میں فوجی اڈّے بنا رہا ہے اور یوگوسلاویہ اور رومانیہ پر قبضے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ قومی نجات کی تحریکوں اور ترقی پذیر ممالک کی بے غرضانہ مدد کے پردے میں سوویٹ یونین ان کی صفوں میں نفوذ کی غیر مختتم کوششیں کر رہا ہے اور اس طرح دنیا کے مختلف حصّوں میں اپنی فوجی اور سیاسی بالادستی قائم کرنے میں مصروف ہے۔ وہ انتہائی رجعت پسند حکومتوں اور بین الاقوامی دہشت پسندوں کی فوجی مدد کر رہا ہے اور انھیں ہتھیار دے رہا ہے۔

"ملک کا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ انتہائی جامد

اور بے حِس و حرکت ہے۔ سوویٹ یونین دنیا کی انتہائی قدامت پسند حکومت ہے جس کے لیڈر بوڑھے لوگ ہیں۔

"یہ بالکل قدرتی ہے کہ ہتھیاروں پر بے تحاشہ خرچ کے نتیجے کے طور پر اور خفیہ پولیس اور پارٹی کے وسیع ڈھانچے کو برقرار رکھنے پر بے اندازہ خرچ کے طفیل میں ملک کی اقتصادی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جائے حکومت لاکھ انکار کرتی رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ افراطِ زر اور قیمتوں میں اضافہ روز افزوں ہے۔

"صنعت میں پیداوار بہت گھٹ گئی ہے اور جو سامان پیدا ہوتا ہے وہ بہت گھٹیا ہوتا ہے ٹیکنیکی اعتبار سے یہ مغرب میں تیار ہونے والے اسی قسم کے سامان کے مقابلے میں بہت گھٹیا ہے۔ اور کیا یہ المیہ نہیں کہ انقلاب کے [illegible] اٹھ سال کے بعد بھی اس ملک کی زراعت جو کسی ز[illegible] میں یورپ بھر کو خوراک مہیا کرنے کی اہل تھی اب خود اپنی آبادی کے لیے بھی ضروری مقدار میں اناج، گوشت حتیٰ کہ آلو تک پیدا کرنے کی اہل نہیں۔ کیا آدمی ان تمام حقائق کو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر نظر انداز کر سکتا ہے؟

"ایک انسان کو یہ حق ہونا چاہیے کہ جو کچھ وہ سوچتا ہے، اسے بلند آواز میں کہہ سکے، جو کچھ سوچتا ہے وہ لکھ سکے، جو چاہتا ہے وہ پڑھ سکے۔ جہاں چاہتا ہے وہاں جا سکے اور رہائش اختیار کر سکے۔ لیکن اب بھی ہم اتنے ہی خوفزدہ ہیں جتنے اسٹالن کے دور میں تھے۔ ہم اپنے مسودوں کو چھپا کر رکھتے ہیں، ایک دوسرے پر بھروسا نہیں کرتے سنسر کے خوف سے بے معنی قسم کے خط لکھتے ہیں اور دوستوں کے ساتھ قطع تعلق کر لیتے ہیں۔

"کیا یہ فعل غیر انسانی نہیں کہ بچوں کو ان کے والدین سے چھین لیا جائے؟ خاندان کے مختلف افراد کو آپس میں ملنے نہ دیا جائے؟ لوگوں کو اپنے افراد خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے؟ اور سیاسی قیدیوں کو نہ صرف اپنے متعلقین سے ملنے ہی نہ دیا جائے بلکہ خط کتابت کے حق سے بھی محروم کر دیا جائے؟ کیا آدمی اس ماحول میں رہ سکتا ہے؟ کوئی اس ماحول میں کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ کم از کم میں اس ماحول میں رہنے کو تیار نہیں۔

"کمیونسٹ پارٹی سے علیحدگی کا مطلب یہ نہیں کہ میں سوشلزم کے آدرشوں سے، جن سے میں ۱۹۱۰ء میں آگاہ ہوا تھا اور جو اب تک میری زندگی کا سہارا بنے رہے ہیں، دستکش ہو رہا ہوں۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں اس پختہ نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کی صفوں میں شامل رہنا اب سماجی انصاف، انسان دوستی اور بہتر معاشرے کے قیام کے آدرشوں سے، جن کے لیے میں جدوجہد کرتا رہا ہوں، غداری کے مترادف ہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان آدرشوں کے لیے میں اپنے آخری سانس تک کوشاں رہوں گا۔"

نظم اور دوہڑے

کرشن مراری

جوگن رُوپ بنائے گوری پنگھٹ پنگھٹ گائے رے
گہری گہری سوچ کی ندیا نینن میں بھر لائے رے

جیسے دھنک انگڑائی لے ہے ۔ جیسے کوئل گائے رے
تیرے چنچل رُوپ کا گوری سونا پگھلا جائے رے

گونجے دَرد کے لمحے کتنے ۔ غم صدیوں مُسکائے رے
اِک البیلا پیت کا ناتا جنم جنم تک جائے رے

نین جُھکا کر ۔ بدن چُرا کر ۔ گوری جب مُسکائے رے
چھلکا جائے رُوپ کا ساگر ۔ انگ انگ لہرائے رے

کیسا تھا وہ مِلن پیاسا ۔ گوری دَرد چھپائے رے
چنچل سی اِک بدلی جیسے بِن برسے اُڑ جائے رے

سادھو سنیاسی بیراگی ۔ کتنے رُوپ بنائے رے
جھوٹے سپنے من جوگی کے جیون راس نہ آئے رے

لپٹے جائیں ناگ البیلے ۔ انگ انگ بل کھائے رے
ساجن کی چنچل نظروں سے گوری بدن چرائے رے

▲▲

انوار رضوی

بہار کا گیت

بھنور میں رقصاں گلابی پودے
فلک کو دیکھو
انار دانوں کا ذائقہ لو
بدن کے اندر کئی خدا ہیں
کمالِ شب کی زبان سمجھو
خزاں کی دھرتی میں بیج پھوٹے
ہوا کی سمتوں میں گُل کھلاؤ

بھنور میں رقصاں گلابی پودے

▲▲

نظمیں

شاہد عزیز

میرے اندر کا سورج جل کے یوں ہی راکھ ہو جائے
تمہاری سرد آنکھوں میں کوئی وحشی نظر آئے
تمہارے ذہن سے ٹکرا کے ہر احساس مر جائے
چمکتا شہر اندھے راستوں کی گرد بن جائے
کہیں چلتا ہوا سایہ نہ پھر کوئی نظر آئے
زمیں سے آسماں تک صرف سناٹوں کا جنگل ہو
ہمیں یوں جینے مرنے کی سزا اک ساتھ مل جائے
ہوا میں زہر ہو بس، اور ہمارے زرد چہرے ہوں

▲▲

شاہد میر

(۱)

بہت ممکن ہے
پھر کوئی نیا موسم، ہماری راہ تکتا ہر
پہاڑوں سے کریں یہ التجا آؤ
کہ اب تو راستہ دے دو
ہمیں اس پار جانا ہے!

(۲)

نئے شہر کی یہ پرانی فصیلیں
(کہ جن پر جمی ہے پھپھوند اور کائی)
گرا دیں چلو اب
کہ بوجھ اپنا ان سے سنبھلتا نہیں ہے
قبیلہ کوئی ان کے سائے میں پلتا نہیں
اس سے پہلے کہ سیلاب آ جائے کوئی
کہ پاگل ہواؤں کے طوفان میں
آپ ہی گر پڑیں یہ
ہمیں ان کو ڈھا دیں
نئے شہر کی یہ پرانی فصیلیں
گرا دیں چلو...

▲▲

○ ڈیپارٹمنٹ آف بوٹنی گورنمنٹ کالج۔ بانسواڑہ (راجستھان)

غـــزلیں

نور تقی نور

نظم، غزل، افسانوں سے
عشق ہوا بے جانوں سے

ہوئی سحر تو نکل پڑے
لوگ اپنے زندانوں سے

موڑ کلائی پانی کی
خوف نہ کھا طوفانوں سے

گاؤں میں آیا ہے کوئی
مہک آتی کھلیانوں سے

اشکوں میں پلکیں نہ چبھو!
چھیڑ نہ کر مہمانوں سے

بادِ صبا بائیس گرام!
ایسا مذاق انسانوں سے

نورؔ توقع مرہم کی!
اندھے تیر کمانوں سے

▲▲

جمیل کلیمی

شوخیاں دکھلا نہ چلتے چلتے یوں آنکھیں ہی میچ
قتل ہو جائیں گے ورنہ لوگ بازاروں کے بیچ

سانس رک جائے گی پل میں دم نکل جائے کہاں
دیکھ اے پاگل ہوا پھولوں کو تو ایسے نہ بھینچ

مجھکو یہ منظور ہے تو رہ یہاں آرام سے
لمحہ لمحہ پی لہو، لیکن مری شہ رگ نہ کھینچ

زخم کے پودے اگر دل میں لگائے ہیں تو پھر
اپنی رگ رگ کے لہو سے رات دن تو ان کو سینچ

کام لے ہمت سے اے دل بڑھ کے دے تو بھی جواب
نرمیاں دکھلا نہ اُن کے سامنے ایسے پسیج

یہ تو سب شیخ و برہمن کی لگائی آگ ہے
ورنہ تیری ذات اونچی ہے نہ میری ذات نیچ

▲▲

رشی پٹیالوی

وہی طویل سی راہیں سفر وہی تنہا
بڑا ہجوم ہے پھر بھی ہے زندگی تنہا

ترے بغیر اُجالے بھی تیرہ ساماں ہیں
بھٹک رہی ہے نگاہوں کی روشنی تنہا

جہاں جہاں بھی گئی غم بھی آس پاس رہے
کسی مقام پہ دیکھی نہیں خوشی تنہا

خود اپنے شہر میں بھی اب تو ہم کچھ ایسے ہیں
دیارِ غیر میں جیسے اِک اجنبی تنہا

حواس و ہوش ہوئے ہمکنارِ بے خودی
نگاہِ شوق بہر گام رہ گئی تنہا

خود اپنے آپ سے بیگانگی کا عالم ہے
شریکِ بزمِ نگاراں بھی ہیں رشیؔ تنہا

▲▲

○ اسعد بھون صابن گران میرٹھ ۲ ○ کلیم بکڈپو، خاص بازار، احمد آباد ○

غزلیں

شاہد رسا

صبح کی شمع ہوں چاہو تو بجھا دو مجھکو
گزرے لمحات کی مانند بھلا دو مجھکو

ایسا ساحل ہوں جو طوفاں کا پتہ دیتا ہے
ریت کا نقش نہیں ہوں جو مٹا دو مجھکو

تم کو میرے ہی سجائے ہوئے خوابوں کی قسم
انھیں خوابوں کے جزیرے میں بسا دو مجھکو

شاخِ اُمید کا اک زرد سا پتّا ہوں مگر
خشک اتنا بھی نہیں ہوں کہ جلا دو مجھکو

میں نے صدیوں میں سنوارا ہے حیات اے شاہد
ایسا نقطہ میں نہیں ہوں کہ مٹا دو مجھکو

▲▲

اِعجاز اعظمی

کٹتے ہوئے ساحل پہ ہزاروں کا ہے میلا
کیا ہو ابھی آ جائے جو طوفان کا ریلا

ان ٹوٹتے تاروں کی صلیبوں کو سجائے
بیٹھا ہوں تری راہ میں، مَیں سانجھ کی بیلا

بن باس ملا جذبۂ تقدیسِ وفا کو
ہر شاخِ ثمر ور پہ گرا وقت کا ڈھیلا

اِعجازؔ کوئی ڈھونڈھ رہا ہے مجھے گھر میں
میں درد کے صحرا میں بھٹکتا ہوں اکیلا

▲▲

انور حسین

جَل اُٹھے آج شبِ غم میں ہواؤں کے چراغ
دیکھتا ہی رہا خاموش نواؤں کے چراغ

ڈوب جاتا ہے دل احساس کی تاریکی میں
یاد آتے ہیں سرِ شام وفاؤں کے چراغ

آتشِ دل میں ہو یہ معجزۂ آب رواں
تیرے اشکوں سے سنور جائیں دعاؤں کے چراغ

فاصلے بڑھ گئے ہر گام پہ لیکن انورؔ
روزنِ دل میں رہے اس کی صداؤں کے چراغ

▲▲

قاسم یوسفی

اِنتظار کا کرب

میں کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں۔ کوئی سایہ نظر نہیں آتا تو...... ابھی تک وہ نہیں آیا۔ میں کھڑکی بند کر دیتا ہوں۔ کیونکہ کھڑکی سے باہر مسلسل جھانکنے کی قوت مجھ میں نہیں۔ کمرہ تاریک ہے لیکن میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔ اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر ٹٹولتے پھرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں سیدھا اپنے بستر پر جا بیٹھتا ہوں۔ چارپائی کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اور ایک میں دیمک نے اپنی جگہ بنالی ہے اور میرے بستر میں صدیوں کی بوسیدہ غلاظت ہے۔ کمبل جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ باہر گرمی کی شدت ہے اور اندر کمرہ بھی تپ کے انگارہ ہو جاتا ہے اور میرے پاس صرف یہ کمبل ہے۔ میں ننگا سو نہیں سکتا۔ بچپن سے میری عادت ہے کہ بغیر اوڑھے میں سو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے جب سر کا بوجھ بڑھنے لگتا ہے اور نیند نزدیک ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور رہتی ہے تو میں کمبل اوڑھ لیتا ہوں۔ گرمی کی شدت سے تپ جاتا ہوں، جھلس جاتا ہوں۔ پر کیا کروں۔ مجھے نیند کی سخت ضرورت ہے۔ اور شاید نیند کے بغیر میں مر بھی نہیں سکتا۔

میں اس کا کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ اتنی صدیوں میں وہ صرف مجھے ایک بار ملا تھا۔ وہ بھی ایک لمحہ کے لیے۔ اب سوچتا ہوں تو وہی ایک لمحہ ایک صدی ہے۔ راستہ پہ یوں ہی بیٹھا میں پتھر پہ ہاتھ مار رہا تھا۔ نہ پتھر سے کوئی آواز نکل رہی تھی اور نہ ہاتھ سے۔ کیونکہ دونوں سخت تھے۔ زندگی بہت کٹھن تھی اور رات بہت تاریک تو وہ میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مشعل تھی۔ اس نے اسے نور کہا اور اس نور کو میرے حوالے کر کے چلا گیا۔ میں اس مشعل کو ہاتھ میں لے کر چلتا رہا۔ آج وہی مشعل میرے ایک نئے کرب کا باعث بن گئی ہے۔ اور اب مجھے اسی کا انتظار ہے کیونکہ اس مشعل کا راز صرف وہی جانتا تھا۔ لیکن —— مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے کہا تھا "میں پھر نہیں آؤں گا۔ اب تمہیں خود اس مشعل کو سنبھالنا ہوگا"۔ جاڑے کا موسم آیا اور پتے ٹپ ٹپ جھڑنے لگے۔

نہیں ...... نہیں ...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور آئے گا۔ مجھے نجات دلائے گا۔ لیکن کب؟ —— یہ تو میں کہہ نہیں سکتا مگر مجھے امید ہے وہ ضرور آئے گا۔ میں اسی امید کے سہارے جی رہا ہوں۔ اکثر امید نپسلین سے زیادہ کام کرتی ہے۔ اور ہاں۔ مجھے بہت سے قصے اسے سنانے ہیں۔ میری محبت کے، میری بغاوت کے قصے اور اس بوسیدہ کمبل کے۔

رات بہت ہو چلی ہے۔ باہر چاند بھی نہیں نکلا۔ شاید آج اماوس ہے۔ کل بھی تو اماوس تھی اور پرسوں بھی ......؟ میں کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں۔ مرکری روشنی میری آنکھوں پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے اور میں اس اندھیرے میں اس کو ڈھونڈتا ہوں۔ مشعل میں تیل نہیں ہے اور اس کی روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔ مہنگائی —— اندھیرا —— نجات؟ میں اس کو ڈھونڈتا ہوں۔ اس کا کہیں پتہ نہیں۔ میں پھر کھڑکی بند کر دیتا ہوں تو باہر چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ٹک ٹک ٹک۔ یہ انسان کے قدموں کی آہٹ ہے۔ ٹپ

۹-5/6-19 پی-جی-آر- لائنز، چتور 517001 (آندھرا پردیش)

........ٹپ ...... ٹپ ...... ٹپ .... یہ گھوڑے کے دوڑنے کی آواز، چپ ...... چپ ...... نہیں نہیں ـــــ یہ انسانوں کی آہٹ نہیں ہے۔ میں اس حقیقت کو مان نہیں سکتا۔ میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں۔ میرے پیٹ پر کوئی لات مارتا ہے اور میری ساری انتڑیاں باہر نکل پڑتی ہیں میں گھبرا جاتا ہوں۔ اِدھر اُدھر غور سے دیکھتا ہوں کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ جب ہر طرف سے مطمئن ہو جاتا ہوں تو فوراً اپنی ساری انتڑیوں، بوٹیوں اور غلاظت کو اندر ڈال لیتا ہوں۔ اور پھر اپنا نیا سلا ہوا سوٹ ڈھک لیتا ہوں۔ پھر بھی میری انتڑیوں کا سڑا ہوا کچھ پانی نیچے پڑا رہ جاتا ہے جس سے ایک قسم کی بو نکلنے لگتی ہے۔ میں اس متلی تیز بو پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہی ہوں کہ بو ختم ہو جاتی ہے۔ پیچھے دیکھتا ہوں تو مکھیوں کا ایک جھرمٹ نکل کر میرے چہرے پر کلبلانے لگتا ہے۔ جب میں انھیں دور بھگانے کو ہاتھ پیر مارتا ہوں تو غفلت میرے منہ میں دو تین مکھیاں ڈال دیتی ہے۔ میں انجانے میں انھیں چبا ڈالتا ہوں اور مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔ میرے پیٹ کی سچائی میرے منہ میں کڑوی بن جاتی ہے۔ باہر سے کوئی چلاتا ہے "بابو خارش زدہ ہوں۔ تھوڑا کھانا دید و بابو" زندگی باپ کی کوکھ سے نکل کر جھوٹ میں پل کر آخر سچائی کی قبر میں دفن ہو جاتی ہے۔

وہ ابھی نہیں آیا۔ میں بیقرار سو جاتا ہوں۔ اس کا آنا ضروری ہے۔ میں پھر بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ تکیہ میں بہت سے پرانے کھٹمل جمع ہو گئے ہیں۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ مجھ سے لپٹنے کے لیے دوڑتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں میرے خون کے پیاسے۔ اور میں سوچتا ہوں آخر نارد کا کیا حشر ہوگا؟ مجھے اس لڑکی کا قصہ یاد آجاتا ہے جس کو میں نے دھوکا دیا تھا۔ پیار کا لالچ دیا تھا۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں آج وہ کیا ہوگی؟ ـــــ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ آج کسی اور کی کمبل بن کر گرمی کا باعث بن رہی ہوگی۔ کیا یہ میرا پاپ تھا؟ ـــــ تو پھر من متھ کو کیوں پیدا کیا گیا۔ نارد کو کیوں نہیں؟؟

میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو میرے بھوت میرے سامنے میرے لیے کھڑے ہوتے ہیں ایک نمرود ہے ایک دجال۔ قارون کا کہیں پتہ نہیں۔ شاید وہ اپنا خزانہ ڈھونڈنے چلا گیا ہے۔ دجال جھرمٹ سے ایک آدمی کو نکالتا ہے اور پھر وہ اس کے دونوں پیر پکڑ کر ایک جھٹکا دیتا ہے۔ آدمی دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگ منہ کھولے اس تماشے کو دیکھتے ہیں اور اس آدمی کے پیٹ سے نکلا ہوا پانی ان کے منہ میں گرتا ہے۔ پھر دجال اپنے دونوں ہاتھ ملاتا ہے اور اس آدمی کو پھر سے زندہ کر دیتا ہے۔ لوگ اس کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ شاید منہ میں گرے ہوئے پانی میں کوئی نشہ آور چیز ملی ہوئی تھی۔ ایک مذہبی انسان باہر نکلتا ہے۔ وہ وابستہ ہونے کی وجہ سے وہ پانی نہ پی سکا تھا۔ اور دجال سے اس معجزہ کی دوبارہ درخواست کرتا ہے۔ دجال اسے خون آلود نظروں سے دیکھتا ہے اور سر اوپر اٹھا کر خدا کو بھی ایک نظر دیکھتا ہے اور پھر میرے گال پر زوردار طمانچہ لگاتا ہے۔ میرے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلتی ہے اور میں ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ دروازہ دھڑام سے کھلتا ہے اور مجھے نیند آجاتی ہے۔

▲▲

سوویٹ روس کی غیر ملکی تجارت

رؤف ساجد

سالِ رواں کے پہلے چھ مہینوں میں مغرب کے ساتھ سوویٹ روس کی تجارت میں ۳۲ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کے ساتھ تجارت میں صرف ۷ فیصدی کا اضافہ اور تیسری دُنیا کے ملکوں کے ساتھ تجارت میں ۹ فیصدی کی کمی ہوگئی ہے۔

۲۵ اکتوبر کو سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے پورے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بریژنیف نے کہا کہ موجودہ پانچ سالہ منصوبے کے مطابق سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ تجارت میں ۴۱ فیصدی اضافہ ہوگا (پچیسویں کانگرس میں ۵۰ فیصدی اضافے کا اعلان کیا گیا تھا) اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے ساتھ ۳۱ فیصدی۔ تیسری دُنیا کے ساتھ تجارت کے بارے میں بریژنیف نے ایک بھی لفظ نہیں کہا۔ اوپر کے پیراگراف میں جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں ان کے مطابق مغرب کے ساتھ تجارت پہلے ہی مقررہ حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ سوویٹ روس کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں کہ وہ مغربی دُنیا کو اپنی برآمدات میں اضافہ کرے جہاں سے اسے ٹیکنالوجی کے علاوہ کافی مقدار میں غذا درآمد کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

سوویٹ یونین کی مشکل البتہ یہ ہے کہ کافی برسوں تک اس قسم کے دعاوی کرنے کے بعد کہ ہم مغرب کے ہم سطح ہوتے جا رہے ہیں اور عنقریب ہی اسے پیچھے چھوڑنے والے ہیں، سوویٹ صنعت ایسی کوالٹی کا سامان تیار کرنے سے قاصر ہے جسے بین الاقوامی منڈیوں میں کھلے مقابلے میں رکھا جا سکے۔ مغربی ممالک کو اس کی برآمدات ویسی ہوتی ہیں جو ایک غیر ترقی یافتہ ملک ترقی یافتہ ملکوں کو بھیج سکتا ہے۔ مثلاً سیال ایندھن اور خام مال۔ ۱۹۷۵ء میں مغرب کو جو برآمدات بھیجی گئیں ان میں تیل ۴۷ فیصدی تھا اور مغربی جرمنی کو کی جانے والی برآمدات میں تو تیل کا تناسب ۶۰ فیصدی تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے تیل کی برآمد بھی ممکن ہے اگر سوویٹ روس دوسرے کمیونسٹ ملکوں کے ساتھ تیل کی برآمد کے معاہدوں سے منحرف ہو جائے۔ مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کو اس کا اعتراف بھی ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ پچھلے کان لنل کے سامنے تقریر کرتے ہوئے چیکوسلواک کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جوزف کیمپنی نے انکشاف کیا کہ سوویٹ یونین چیکوسلواکیہ کو دیے جانے والے تیل میں نمایاں کمی کر رہا ہے حالانکہ تیل کی برآمد اس پانچ سالہ منصوبے کی مدّت میں شامل تھی جو دونوں ملکوں کے درمیان ہوا تھا۔ کیمپنی نے یہ بھی کہا کہ اس صورتِ حال کا چیکوسلواکیہ کی اقتصادی حالت پر ناگوار اثر پڑے گا اور اقتصادی ترقی کی رفتار جو پہلے بھی زیادہ تیز نہیں اور شسست ہو جائے گی۔

ترقی پذیر ملکوں کو، جہاں کی کمیونسٹ پارٹیاں یہ پروپیگنڈہ کرتی رہتی ہیں کہ وہ اپنے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے روس پر ہی بھروسا رکھیں، اس صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان ملکوں کو بھی انہی حالات کا سامنا کرنا پڑ جائے جن سے مشرقی یورپ کے ممالک دوچار ہیں۔

بوجھ

بلراج ورما

اُوپر، نیچے۔ اِدھر اُدھر روئی ہی روئی۔ نئی روئی اور پرانا لوگڑ۔ سفید شفاف روئی جیسے تازہ برف کے گالے۔ میلی مٹیالی روئی۔

—— کون کتسی اپنتا روں —— کون کاتے گا اتنی روئی، روئی کا اتنا بڑا انبار۔ اتنی ڈھیر سی روئی۔ ایک پہاڑ تھا جو زمین کی چھاتی سے اُبھر کر اُٹھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اوپر اور اوپر جیسے چھو ہی تو لے گا آسمان کو۔ روئی کا یہ ہمالہ اور چمکتا دمکتا سورج۔

مگر سوال جُوں کا توں بنا ہوا تھا۔ کون کاتے گا اتنی روئی دادی اماں پریشان ہو گئیں۔

بہت بڑا گھر تھا اُن کا۔ بہت بڑا آنگن۔ بہت بڑا پریوار۔ دادا جی۔ وہ خود۔ بیٹے بیٹیاں۔ بہوئیں داماد۔ پوتے پوتیاں۔ دھوتے دھوتیاں۔ دوسرے انیک سگے سنبندھی۔ سہیلیاں۔ سکھیاں۔ پتی بیٹوں اور داماودں کے متر۔ بچّوں کے دوست۔ بچّیوں کی ننھی منّی سہیلیاں۔ اتنا بڑا پریوار۔ اتنے کھانے کمانے والے۔ دادی اماں راج کرتی تھیں۔ یا پھر شوقیہ روئی کاتتیں۔ وہ روئی کاتتیں اور گاتیں۔ طرح طرح کے لوک گیت۔ چرخے کی آواز، جیسے کوئی ساز ہو۔ سوت کے کچّے دھاگوں میں گیتوں کی مالائیں بنتی رہتی تھیں دادی اماں۔ ان کچّے دھاگوں میں ان کا پریوار، اُن کے سارے ناتی ناتیوں کے بھاگیہ بھوشیہ بندھے تھے۔

سوت کاتنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا شغل ہی سہی مگر اتنی ساری روئی! کون کاتے گا اس ڈھیروں روئی کو۔ کہاں سے آ گئی اتنی روئی۔ یہ پرانی روئی ہی کون کم تھی، جو یہ نئی۔

نئی روئی کو آنا ہی چاہیے۔ پرانی روئی سے سرپیل کہاں کٹتی ہیں۔ نئے اور پرانے کا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مگر اتنی روئی۔ دادی اماں کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ اُنہیں رات بھر نیند نہیں آئی۔ دوسرے دن بھی چین نہ آیا۔

ایک رات تو ایسے کٹی ہی۔ دوسری اور تیسری بھی ایسے ہی گزریں۔ سوال جوں کا توں بنا ہوا تھا۔ کون کاتے گا۔ کون، کون وہ خود لو دس جنم بھی لگی رہیں تو نہ کات سکیں گی روئی کے اس انبار کو۔ ساری منڈی کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ واقعی اس اتنی بڑی منڈی میں بھی اتنی روئی پہلے کبھی نہ آئی تھی۔

جواب نہ ملا تو دادی اماں بیمار پڑ گئیں۔ اتنی بیمار کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔

"کون کتی اپنی روئی"، وہ بیماری میں اکثر بڑبڑایا کرتیں۔

"کون کاتے گا۔ کون۔ کون"۔

کوئی کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

دادا جی نے کہا۔ منڈی کی ساری روئی کوئی اپنی تھوڑی ہی ہے۔ نہ سہی اپنی۔ مگر یہ منڈی تو غیر کی نہیں۔ اپنوں ہی کی ہے۔

۸ - ۲۲۵ پنڈارہ روڈ نئی دہلی

ڈاکٹر تھک کر ہار گئے۔ شوہر بیٹے بیٹیاں دلاسے دے دے کر ہار گئیں۔ وہ ان کا آخری وقت آگیا ہے۔ دوسری کوئی بات نہیں۔"

مگر یہ ایک عورت کی موت نہیں ہوگی بھیا۔ یہ ماں کی موت ہوگی دادی ماں تو اس پریوار کی ماں جگدمبا ہے۔ نبض شناس نے دادی ماں کی تیز تیز چلتی نبض کو ہاتھ میں لیا اور پل بھر میں جان گیا ان کی بیماری کی نوعیت اور وجہ۔

نبض کو ہاتھ میں لیے لیے بولا "سنا آپ لوگوں نے۔ کل رات منڈی میں آگ لگ گئی۔"

واقعی !!!

"اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا اور حیرت ہے کہ آپ کو علم ہی نہیں۔ منڈی کی ساری پرانی اور نئی روئی جل کر راکھ ہو گئی۔"

دادی اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اور ہر بڑا کر پوچھا "کیا کہا بھیا"،

"روئی کی بات کر رہے تھے اماں۔ کل رات منڈی کی ساری روئی جل کر راکھ ہو گئی۔"

"کیا سچ مچ۔"

"جی ہاں اماں۔ اب آپ کیسی ہیں۔"

"اب ٹھیک ہوں بھیا۔"

"بھگوان کا شکر ہے۔"

دادی اماں واقعی ٹھیک ہو گئیں۔

چند ہی گھنٹوں میں تندرست و توانا ہو کر وہ اٹھ بیٹھیں۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا وہ حسب معمول بڑے آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے بڑے اطمینان سے سوت کات رہی تھیں اور گا رہی تھیں۔

پُور بیٹڑی دا
ترنجن دیاں کُڑیاں
سب نال ہوں کٹھیاں

▲▲

خواجہ حسن نظامی

گوپال متل

۱۱ر دسمبر ۷۶ء کو غالب اکاڈمی نئی دلی میں خواجہ حسن نظامی کے بائیسویں سالانہ عرس کے موقع پر ایک سیمینار ہوا جس میں ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم حضرات نے شرکت کی۔ راقم الحروف کو بھی اس سیمینار میں شریک ہونا تھا مگر بوجہ علالت اس سے معذور رہا۔

شمس العلما خواجہ حسن نظامی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ممتاز انشا پرداز بھی تھے، صحافی بھی اور مقرر بھی۔ خواجہ صاحب بڑے ہی عالی نسب تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ مولانا سید محمد حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے حقیقی نواسے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بھانجے داماد اور منہ بولے بیٹے تھے لیکن ورثے میں انھیں صرف عالی نسبی ملی تھی، فارغ البالی نہیں۔ خواجہ صاحب کی بزرگی یہ تھی کہ انھوں نے کبھی اس بات کو چھپایا نہیں کہ ان کا بچپن عسرت میں بسر ہوا۔ ملا واحدی صاحب کا بیان ہے کہ:

"ایک دفعہ خواجہ صاحب راجہ نوشاد علی خاں تعلقہ دار جہانگیر آباد (اودھ) کو درگاہ حضرت سلطان جی لے گئے۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی رہائش ترک کر رکھی تھی اور دلی میں میرے ہاں رہتے تھے۔ اس لیے میں بھی راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے ساتھ تھا۔ درگاہوں کے دروازوں پر جوتیوں کے رکھوالے بیٹھا کرتے ہیں ہم سب نے جوتیاں ان کے سپرد کیں۔ واپس آنے لگے تو خواجہ صاحب نے رکھوالوں کو انعام دینے کی غرض سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اتفاق سے ریزگاری کے بجائے روپیہ ہاتھ آگیا۔ خواجہ صاحب نے روپیہ رکھوالوں کو دے دیا اور ہمیں یہ قصہ سنایا کہ بچپن میں مجھے خود یہاں بیٹھنا پڑتا تھا اور میں پیسہ پیسہ انعام کا لیا کرتا تھا۔"

جن لوگوں کا بچپن عسرت میں بسر ہوا ہو ان کے مزاج میں ایک قسم کی خست پیدا ہو جاتی ہے جو فارغ البالی کی منزل پر پہنچ کر بھی ختم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، خواجہ صاحب کے مزاج میں یہ کجی پیدا نہیں ہوئی۔ انھوں نے فراوانی سے روپیہ کمایا بھی اور دریا دلی سے خرچ بھی کیا۔ میل جول میں بھی وہ اونچ نیچ کے قائل نہیں تھے۔ کھانا راجاؤں اور نوابوں کے ساتھ بھی کھا لیتے تھے اور دھوبیوں اور سقوں کے ساتھ بھی۔

اخبار نویسی میں کامیابی بھی خواجہ صاحب کو بڑی کٹھن منزلیں طے کرنے کے بعد حاصل ہوئی۔ آغاز پھیری میں اخبار بیچنے سے ہوا اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کی کئی بے خواب راتیں گزریں لیکن حوصلہ انھوں نے نہیں ہارا اور بڑا آدمی بننے کا خیال ان کے دل میں ہمیشہ رہا۔ تعلیم بھی ان کی دلی کے چوراہوں اور گلیوں ہی میں ہوئی۔ یہیں انھوں نے تعلیم بھی حاصل کی اور تجربہ بھی، اور شاید انہی تجربوں نے انھیں سخت کوش بھی بنا دیا۔

اندازِ نگارش خواجہ صاحب کا اچھوتا تھا جس کی داد بابائے اردو مولوی عبدالحق تک نے دی ہے ان کی یہ داد خواجہ صاحب کے سوا اور کتنوں کو نصیب ہوئی ہوگی:

"ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں اچھی اردو لکھنا چاہتا ہوں، کیا پڑھوں؟ میں نے کہا اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو اور دلی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا

چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ دلی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے "۔

یہ الفاظ بھی مولوی صاحب ہی کے ہیں :

" ان کا (خواجہ صاحب کا) رنگ سب سے نرالا ہے بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اڑایا ہے، یہ صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے ورنہ اصل میں اس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنع زیادہ ہے۔ خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن اسے اس خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن قربان ہو ہو جاتا ہے "۔

خواجہ صاحب جب کسی سے دوستی کرتے تھے تو ٹوٹ کر کرتے تھے اور اگر کسی سے بگڑ جاتی تو الحفیظ و الاماں۔ مثلاً 'ریاست'، کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتوں سے بگڑی تو مفتوں کے معنی فتنہ زدہ قرار پائے۔ ڈاکٹر اقبال البتہ ان کی زد سے صاف بچ نکلے۔ خواجہ صاحب کسی بات پر ان سے بگڑے تو ان کا رتبہ گھٹا کر انھیں شاعرِ مشرق کی بجائے شاعرِ پنجاب بنا دیا۔ اقبال پیغمبر خودی بھی تھے اور ممولے کو شہباز سے لڑانے کا فن بھی جانتے تھے لیکن خواجہ صاحب کے مقابلے میں انھوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ تمرّد کی بجائے تدبر سے کام لیا جائے۔ خواجہ صاحب دوائیں بھی بیچتے تھے جن میں ایک کا نام فاسفورس کا تیل تھا۔ اقبال نے خواجہ صاحب کو خط لکھا کہ ان کے گھٹنے میں بڑا درد تھا جو فاسفورس کے تیل کے استعمال سے جاتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اقبال کا یہ خط فاسفورس کے تیل کی فروخت بڑھانے میں مدد ہو سکتا تھا۔ فوراً ہی اس خط کا استعمال بطور سرٹیفکیٹ ہونے لگا۔ اور اقبال شاعرِ پنجاب سے پھر شاعرِ مشرق بنا دیے گئے۔

خواجہ صاحب سے ملاقات کا شرف مجھے تقسیم ملک کے بعد حاصل ہوا۔ از راہِ ذرہ نوازی انھوں نے مجھے اپنی ایک کتاب بھی دی اور میری ہیچ میرزی کے باوجود اس کے صفحۂ اول پر اپنے دستخط کے ساتھ لکھا تھا : بھائی گوپال متّل کی نذر۔ یہ کتاب میری عزیز ترین متاع ہے۔

۵۵

تبصرے

کوئے ملامت

مصنف : کرشن موہن
ناشر : نیشنل اکاڈمی . دریا گنج نئی دلی
قیمت : دس روپے ۔
ضخامت : ۱۶۰ صفحے ۔

کوئے ملامت کرشن موہن کا سولہواں شعری مجموعہ ہے جسے اس نے ملامتیوں کے نام انتساب کیا ہے ۔ غالب نے ایک بار کہا تھا ۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

کرشن موہن کا کہنا ہے :

شوق کی رفعت بھی ہے عشق کی عظمت بھی
آدمی کو شہر میں بدنام ہونا چاہیے

ایسا اس لیے ہے کہ کرشن موہن اپنی ذات کو زندگی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کر کے اس سے فرار حاصل کرنے کے لیے کھلے اور روشن آسمانوں کی سیر کا خواہاں ہے اور اس کی اسی خواہش نے اسے گیان مارگ کی نظمیں رچنے پر اکسایا اور اس سفر کے لیے اس نے جو راستہ اپنایا وہ "ایک طول طویل، کبھی نہ ختم ہونے والی سرنگ ہے اور اس اندھیری سرنگ میں روشنی کا حصول ہی ان کربناک سوالوں کا جواب ہے جو زہریلے سانپوں کی طرح پھن اٹھا اٹھا کر انسان کی تنہائیوں میں اپنا زہر گھولتے رہتے ہیں"۔

محمود سعدی نے کرشن موہن کے اس شعری سفر کو طلسماتی کہا ہے جس سے کرشن موہن ایک باہوش تماشائی کی طرح گزرا ۔ جو کچھ اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا اسے اظہار کی زبان دی جس کا باطنی مفہوم تزکیۂ نفس اور تطہیر فکر کا حامل ہے ۔

کمار پاشی نے اس جذباتی کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے ٹھیک ہی کہا ہے کہ گیان مارگ کی نظموں سے کوئے ملامت تک یعنی سرنگ کے اندر سے سرنگ کے باہر تک اس کا شعری سفر ایک ایسے گرم خون مسافر کی سرگزشت ہے جس نے انسانی زندگی کے اجاڑ اور بے رنگ اندھیروں میں ایک ایسا چراغ روشن کیا ہے جس کے نرم گرم اجالوں میں ایک پھولوں بھری سیج کی مہک کو صرف محسوس ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ دیکھا بھی جا سکتا ہے ۔ اس کے اندر کا شاعر بیک وقت اپنے محسوسات کا اسیر بھی ہے اور ان کا حاکم بھی ۔ کبھی وہ محسوسات کے پیچھے چلتا ہے اور کبھی محسوسات اس سے اپنی منزل کا پتہ دریافت کرتے ہیں ۔

کرشن موہن قدیم اور جدید ـــ دونوں طرح کی شاعری کو پسند کرتا ہے لیکن اظہار کے فرسودہ طریقوں کی نکتہ چینی سے بھی وہ نہیں چوکتا ۔ وہ خود اعتمادی کے ساتھ ہر وہ منظر دکھانا چاہتا ہے جو اس نے دیکھا اور ہر اس کیفیت سے قاری کو روشناس کرانا چاہتا ہے جو اس پر گزری ۔ اس کے انداز بیان میں ایک قسم کا لطیف طنز بھی شامل ہے :

ردیف و قوافی کے تن تانے بانے
مکاں کر کے تعمیر اس میں بہانے
سب اسباب رکھ دے

نہ کرے میں پردے نہ قالین کوئی
مقفل مقفل
تجھے اس کی بس وہی ہے قدرت خدا نے
(تانے بانے)

ہمیں حسن سے پیار ہے اور رہے گا
مگر ہم غلو سے نہیں کام لیں گے
ہمیں دل کی باتیں ہیں مرغوب، دل اپنی باتیں کرے گا
مگر یہ زباں کھردری ہی رہے گی
کہ ہے کھردرا یہ تمدن

نیرد اور اس کی موسیقی، ایک: درافتادہ ٹاپو میں غضب اور عجب، قلوپطرہ کی موت، شرط شادی، ننگا احتجاج، ننگا نگر، جاروا ک —— مادہ پرستی کا پیغام بر، جلا وطن مجرموں کو، ڈریکولا، نسخۂ درازی عمر، ریچھ، رکت دان وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو کرشن موہن کی جرارت اظہار اور اس کی فنی خود اعتمادی کا آئینہ ہیں۔ بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ خواب دیکھنے ضروری ہیں کیوں کہ ان میں آنے والے زمانے کا عکس ملتا ہے۔ مگر کرشن موہن اس نظریے کا قائل نہیں ہے، وہ ہمہ وقت بیدار اور چوکنا رہتا ہے۔

کرشن موہن اپنے طور پر زبان و بیان کی رعنائیاں پیدا کر کے شاعری کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔ وہ پرانے اسالیب کی تکرار کے بجائے نئے نئے اسالیب اظہار کا جویا ہے اور لفظ و معنی کے درمیان نئے رشتوں کی تلاش اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے:

لے کے پہلو میں دل حسرت اساس
گھومتا ہوں بستیوں کے آس پاس

ناچتا رہتا ہوں انگاروں پہ میں
شدت احساس کا پہنے لباس

کرشن موہن ہے یہ تیرا بھولپن
زہر میں بھی ڈھونڈتا ہے جو مٹھاس

آئینۂ طہارت دل ہے برہنہ تن
ہیں باعث سرور تری بے حجابیاں

ہوش و خرد سے جان چھٹے لوٹ آئیں کاش
وہ مستیاں شباب کی وہ نیم خوابیاں

اردو جسے لشکری زبان کا نام دیا گیا تھا کرشن موہن نے اسے اور زیادہ لشکری بنا دیا۔ اردو میں یوں تو ہر زبان کے الفاظ ابتدا سے شامل ہیں لیکن کرشن موہن نے بہت سے نئے الفاظ بھی شامل کیے جو شروع میں تو نامانوس لگے مگر اب اس کے ذخیرۂ الفاظ میں گھل مل گئے ہیں۔ ایسے الفاظ ہیں وِشو، شیتل، چنچلتا، بہرا، جَس، نین، واسنا، چندرماں، جیون، کامنا، مان (پندار) وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح اس نے عوامی بولی کو اپنی شاعری کے قالب میں ڈھال کر اردو کا دامن وسیع کیا۔ ویسے تو اردو اور ہندی دو سگی بہنیں ہیں مگر رسم الخط کے اختلاف سے دونوں کی اقدار، ادب، افکار الگ الگ دائروں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ دونوں کا اپنا اپنا رنگ اور حسن ہے لیکن اگر ان دونوں زبانوں کی اصطلاحات اور الفاظ خلط ملط ہو جائیں تو یہ گنگا جمنی دھارا ذہن و ادراک اور احساس و شعور میں ایک نیا تناظر پیدا کر سکتا ہے۔ کرشن موہن کی شاعری اس امکان کی طرف بڑے بلیغ اشارے کرتی ہے۔

سید اختر الاسلام

"نئی لہر" کا اردو صحافت نمبر

"نئی لہر" پنجاب کا ہر دلعزیز اردو اخبار ہے جو جناب اوم پرکاش سونی اور جناب رام سرن اشکی ادارت میں امرتسر سے شائع ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارہ اس کا خاص نمبر ہے جس میں اردو صحافت کی تاریخ، پرانے اردو اخبارات، قانون صحافت، [illegible]، صحافیانہ ضابطۂ اخلاق،

اخبار نویسوں کی ذمہ داریاں وغیرہ جیسے موضوعات پر بڑے قیمتی اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ بعض ممتاز صحافیوں کی خدمات کا خصوصیت سے جائزہ لیا گیا ہے اور پنجاب میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا پر بھی بطور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک مضمون بنگال میں اردو صحافت کے بارے میں بھی بڑی معلومات کا حامل ہے اور اس میں بنگال سے شائع ہونے والے ابتدائی اردو اخبارات سے لے کر موجودہ دور تک کے اخبارات اور ان سے۔ البتہ صحافیوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ گوپال متل صاحب کا مضمون ان کی ابتدائی صحافیانہ زندگی کی یادداشتوں پر مبنی ہے اور تقسیم سے پہلے پنجاب میں اردو صحافت کا جو ماحول تھا اسے آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ خود جناب ادم پرکاش سونی نے جوزف پلٹزر پر قلم اٹھایا ہے اور بڑے دل نشین انداز میں اس کی صحافتی اور سیاسی زندگی کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

"نئی لہر" کے اس قابلِ قدر نمبر میں دو ایک ہلکے مضمون بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً سوویٹ اخبارات کی آزادی پر جو مضمون ہے وہ خالصتہً پروپیگنڈائی انداز لیے ہوئے ہے۔

"نئی لہر" کی سالانہ قیمت دس روپے ہے اور ۱۲۰ صفحے کے اس نمبر کی قیمت پانچ روپے، لیکن سالانہ خریدار بننے والوں کو بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔ پتہ ہے: پندرہ روزہ نئی لہر، تحصیل پورہ، امرتسر ۱۴۳۰۰۱

خبر نامہ

● مشہور ادیب اور صحافی جناب حیات اللہ انصاری کے ترقی اردو بورڈ کا چیرمین مقرر ہونے پر غالب اکاڈمی کی جانب سے اکاڈمی کے ہال میں، ۲۷ نومبر کی شام کو ایک خیر مقدمی جلسے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مرکزی وزیر مواصلات ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے کی اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر قمر رئیس اور قاضی سجاد حسین نے حیات اللہ انصاری صاحب کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ترقی اردو بورڈ کا چیرمین مقرر ہونے پر جذبات مسرت کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج ملک کی جو فضا ہے وہ اردو کے لیے پہلے سے زیادہ سازگار ہے اور اردو والوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انھوں نے اس خیال کی سختی سے تردید کی کہ اگر اردو کا موجودہ رسم الخط ترک کرکے اسے دیوناگری لپی میں لکھا جانے لگے تو اس سے اردو کی بقا اور ترقی کی نئی راہیں سامنے آئیں گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو اس کے رسم الخط کے ساتھ زندہ رکھنا ضروری ہے اور ہمیں اس سمت میں ہی ضروری اقدامات کرنے ہوں گے۔

حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ سچ ہے کہ اردو کے لیے خطرات کا دور اب گزر چکا ہے۔ آج وسائل بھی ہیں اور ہمدردیاں بھی پہلے سے زیادہ ہیں، اگر کمی ہے تو اردو کے لیے لگن سے کام کرنے والوں کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں یہ بات ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ ہم انگریزی زبان کے ذریعے ترقی کر سکتے ہیں صحیح ذہنی نشوونما کے لیے مادری زبان کی تعلیم ضروری ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ اردو میں ہر موضوع پر کتابیں چھپنی چاہئیں اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب لوگ اردو کتابیں خریدنے کی عادت ڈالیں اور اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اس مد کے لیے وقف کریں۔ اگر ہمیں اپنی مادری زبان سے محبت ہے تو یہ معمولی سا ایثار ہمارے لیے مشکل نہیں ہونا چاہیے۔

غالب اکاڈمی کا خوشنما ہال دلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دوسرے معزز شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔

● ۲۵ نومبر ۷۶ء کی شام کو باقی کے دوسرے مجموعۂ کلام "حسابِ رنگ" (ناشر نیشنل اکاڈمی) کے اجرا کا جلسہ غالب اکاڈمی نئی دلی میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت جناب آنند نرائن ملا نے کی اور نظامت کے فرائض محمود ہاشمی نے ادا کیے۔ کتاب کا اجرا سول سپلائی کے محکمے کے مرکزی وزیر جناب سید میر قاسم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ گوپال متل، شمیم حنفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور صاحب صدر آنند نرائن ملا نے باقی کے فکر و فن پر اظہار خیال کیا۔ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے باقی کی شخصیت پر ایک دلچسپ خاکہ سنایا جس کا عنوان تھا: "باقی نو آدمیوں کا آدمی"۔

گوپال متل نے "حسابِ رنگ" میں شامل حمد کے حوالے سے کہا کہ باقی کے یہاں متعدد مقامات پر اس احساس کا اظہار ہوا ہے کہ ہم اپنے سب سے بڑے حوالے یعنی خدا کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور نیک و بد کا فیصلہ ہم نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ باقی نے اپنے مجموعۂ کلام کی ابتدا حمد سے کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ شاعری علوم عقلیہ سے مختلف چیز ہے۔

شاعر ایک معمولی سی بات کو بھی اس ڈھنگ سے کہہ سکتا ہے کہ وہ دل کو چھو جائے اور بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے باقیؔ کے اس شعر کا حوالہ دیا۔

اِک کتابِ صد ہنر تشریحِ زائل کا شکار
ایک مہمل بات جادو کا اثر کرتی ہوئی

شمیم حنفی نے اپنے مضمون میں باقیؔ کی فن کارانہ مشاقی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ باقیؔ کی شاعری لفظ اور آواز پر قابو پانے کی کوشش ہے اور یہ شاعری ہمیں احساس کراتی ہے کہ شاعری کے لیے صرف وہی اقدار و روایات کافی نہیں جو نیک اندیش افراد کو عزیز ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ باقیؔ نے اپنی شاعری میں شعورِ حقیقت سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام میں آگہی ... کے موجودہ منظر نامے نیز طبیعی سے مابعد الطبیعی کی طرف گریز نظر آتا ہے۔ آنند نرائن ملاؔ نے اپنی صدارتی تقریر میں باقیؔ کو ایک ایسا شاعر قرار دیا جس کے ہاں احساس اور بیان دونوں کی انفرادیت موجود ہے اور دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ باقیؔ کے کلام میں ایک نئی فضا ملتی ہے لیکن ان کا رشتہ ماضی سے منقطع نہیں ہے

● ۲۸ دسمبر کو ایوانِ غالب نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں موڈرن رائٹرز گروپ کے زیرِ اہتمام "شامِ غزل" کا انعقاد عمل میں آیا۔ تقریب کی غایت کمار پاشی کے نئے مجموعۂ کلام "رو برو" (ناشر: پی۔ کے۔ پبلیکیشنز) کی رسمِ اجرا کی ادائیگی تھی جو اُن کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ جلسے کے صدر تھے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور کتاب کا اجرا فرمایا مرکزی وزیر سول سپلائی جناب سید میر قاسم صاحب نے۔ موصوف نے کتاب کی پہلی جلد مصنف کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ میں کمار پاشی کے نام اور کلام سے اس وقت سے آشنا ہوں جب وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے کشمیر گئے تھے اور میرے مہمان بنے تھے۔ ان دنوں میں کشمیر کا وزیر اعلیٰ تھا۔ ان کے کلام میں جو تازگی اور لہجے میں جو انفرادیت ہے وہ ان کے ہر پڑھنے والے کو متاثر کرے گی شمیم احمد شمیم ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ کمار پاشی نظم کے شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی غزلوں میں بھی وہی نیاپن ملتا ہے جو ان کی نظموں کا وصف ہے۔ یہ نیاپن زندگی اور فن کی طرف ان کے شخصی رویے کی دین ہے مجتبیٰ حسین نے ایک خاکہ پڑھا جو مزاح کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ہونے کے ساتھ ساتھ کمار پاشی کی شخصیت کے کئی دلچسپ پہلوؤں کی بھی عکاسی کرتا تھا اور ان کی شاعری اور ان کے لکھے ہوئے افسانوں نیز ڈراموں کی فنی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالتا تھا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کمار پاشی کے ہاں کائنات سے ہم آہنگی کی خواہش نے شاعری کی صورت اختیار کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھتے ہوئے ایک طرح کی وسعت اور کشادگی کا احساس ذہن پر برابر چھایا رہتا ہے۔ انھوں نے اپنی بات کی تائید میں کمار پاشی کے بہت سے اشعار کا حوالہ دیا۔ آخر میں استاد حفیظ احمد خاں، محترمہ کنول سدھو اور محترمہ پوشپا پال نے کمار پاشی کی غزلیں اپنی مترنم آوازوں میں پیش کیں یہ پر کیف محفل موڈرن رائٹرز گروپ کے صدر مخمور سعیدی کی طرف سے پروگرام کے معاونین اور شرکائے محفل کے شکریے پر ختم ہوئی۔ ▲▲

پیچھے (بقیہ صفحہ ۲۸ سے آگے)

بوکھلاہٹ سے اپنے سر پلٹا کر دیکھا ہے —— سڑک کے باہر ایک نہایت بوڑھا آدمی —— اتنا بوڑھا کہ اُسے دیکھ کر اِس کے سوا اور کوئی شکل ذہن میں نہیں بنتی کہ وہ بے حد بوڑھا ہے —— اپنی ڈاڑھی پھیلائے اور بال بکھرائے دریا پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہے! —— میں آپ کو نہایت ایمانداری سے بتا رہا ہوں کہ اُس بوڑھے کی مورتی کو گھور گھور کر دیکھتے ہوئے ہم سبھی یہ مان لے آئے ہیں کہ اِس وقت یہاں صرف وہی وہ ہیں، سارے کے سارے وہ، اور یہ پہاڑ اور دریا کا یہ بہتا ہوا پانی —— ہم اپنی غیر موجودگی کے احساس سے ایک خالی ناؤ میں آ بیٹھے ہیں جسے ملاحوں نے کچھ کہے سنے بغیر بستی کی طرف لے جانے کے لیے کھول دیا ہے اور پانی کے تلاطم میں اِسے بڑی مہارت سے کھینے لگے ہیں اور پانی میں تھوڑی دور آ کے مجھے اچانک خیال آیا ہے کہ وہ تو (وہ کون ہے؟) پیچھے ہی رہ گیا ہے! ▲▲

کیا آپ نے بیمہ ایجنٹ سے
رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایل آئی سی کی نئی پیشکش
"تین وفادار" پالیسیوں کے سلسلہ میں
"پروگریسیو پروٹیکشن پالیسی"
ایک مقررہ مدت پر پالیسی کی رقم میں اضافہ ہوگا اور اس کے لیے نئے پروپوزل یا ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت نہیں
"کیش اینڈ کوور پالیسی"
ہر پانچ سال پر ادائیگیوں کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ اور کل رقم بیمہ پر بونس بھی ملے گا۔ ساتھ ہی زندگی بھر سلامتی بھی ملے گی۔
"منی بیک پالیسی"
دوسرے پلانوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد رقم کچھ کچھ وقفہ سے ملتی رہتی ہے۔ اور وہ بھی پالیسی کی مدت ختم ہونے سے پہلے۔ اور مدت ختم ہونے تک ساری رقم بیمہ کے لیے جو کم برقرار رہتا ہے۔
وقت بدل رہا ہے۔ ضرورتیں بدل رہی ہیں
لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا
daCunha/LIC.29 URD

Regd. No. D (D) 118 **Phone : 271649** January 1977

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK

۱۰ جنوری کو ایوانِ غالب، نئی دلّی میں منعقدہ تقریب میں فلم اسٹار دلیپ کمار پورن کمار ہوش کے مجموعۂ کلام "بانسری بدن کی" کی پہلی جلد شری ٹی۔ پی۔ جھن جھن والا کو پیش کر رہے ہیں۔ بائیں سے دائیں بیٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں: شری کے۔ کے ملہوترہ، شریمتی شیلا جھن جھن والا اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ (تفصیلی خبر اندر کے صفحات میں پڑھیے)

قارئینِ تحریک کو جشنِ جمہوریت مبارک

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

مندرجات :

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ ۱۱ — جلد ۲۴

فروری ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر:

گوپال مِتّل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال مِتّل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے — فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ — فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا :

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلّی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال مِتّل

مطبع : نعمانی پریس

مقامِ اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلّی ۱۱۰۰۰۲

ہریانہ میں بیس نکاتی پروگرام پر عمل آوری

عام تقسیم کا طریقہ: عوام کو اشیاء ضروریہ کی بہم رسانی کے لیے تقسیم کے طریق کار کو موثر بنایا گیا ہے۔ ۴۲۹۳ سستے نرخوں کی دوکانیں کھولی گئی ہیں۔ کنٹرول نرخ پر کپڑوں کی سپلائی کے لیے ۲۵۱۲ پرچون کی دوکانیں کھولی گئیں۔ قیمتیں مضبوط رہیں۔

تقسیم اراضی: تقریبًا ۱۱۰۰۰ افراد کو فالتو زمین کی الاٹمنٹ کی گئی۔

مکان کے لیے جگہ: ہریجنوں اور پسماندہ طبقہ جات کے قریب قریب تمام مستحق افراد کو مکان بنانے کی جگہ دی گئی۔ ان پلاٹوں کو رجسٹریشن فیس اور سٹامپ محصول سے مستثنےٰ قرار دیا گیا ہے۔ سال رواں کے دوران ۲۵۰۰۰ پلاٹوں پر مکانوں کی تعمیر کی جارہی ہے۔

امداد باہمی ڈھانچہ کی از سرِ نو تنظیم: چھوٹے کسانوں، کھیتی مزدوروں اور دیہی دستکاروں کو قرضہ جات فراہم کرنے کے لیے پورے امداد باہمی ڈھانچہ کو از سرِ نو منظم کیا گیا ہے۔ دیہی آبادی کی قرضے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چھ کسان سوسائٹیوں اور دو علاقائی بینکوں کا قیام ہوا ہے۔

کم سے کم اجرتیں: کاروباری اداروں کے کارکنان کی کم سے کم اجرتوں میں اضافہ لایا گیا اور انھیں صارفین کی قیمتوں کے عشاریہ سے جوڑا گیا۔

آبپاشی: سالِ رواں کے دوران چار لاکھ ایکڑ زمین کو آبپاشی مہیا کرانے کے لیے مزید توانائی کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

بجلی: برس ۱۹۷۵-۷۶ء میں ۱۹۷۰ ملین یونٹ بجلی میسر تھی جبکہ آج ۲۴۸۰ ملین یونٹ ہو گئی ہے۔

دستی کھڈی: دستی کھڈی اور دستکاریوں کو قرضہ، سامان اور مارکیٹنگ سہولیات جٹانے کے پیشِ نظر ایک کارپوریشن قایم کی گئی ہے۔ روایتی جولاہوں کی تربیت کے لیے پانچ فروخت ڈپو اور ۱۲ تربیتی سنٹر قایم کیے گئے ہیں۔ پانی پت میں ۱۰۰۰ کھڈیوں اور ایک رنگائی یونٹ پر مشتمل ایک جدید یونٹ قایم کیا گیا ہے۔ بھوانی میں ایک جدید ترین انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ پراجیکٹ کے قیام کے لیے دو ہزار پٹ لوم کھڈیوں کو فریم لوم اور کارڈ کھڈیوں کی صورت دی جارہی ہے۔ بنکروں کی ایک رہائشی بمعہ کاروباری بستی کا تعمیری کام ہو رہا ہے۔

کارکنان کی شراکت: ریاست میں ۳۴ صنعتی اداروں میں کارکنان کی شراکت کو یقینی بنایا گیا۔

روڈ ٹرانسپورٹ کے لیے نیشنل پرمٹ سکیم: مرکزی سرکار کی طرف سے الاٹ کیے گئے سبھی ۲۵۰ پرمٹ جاری کر دیے گئے۔

طلبا کی بہبود: ریاست کے تمام ۱۱۶ ہوسٹلوں میں طلبا کو سستے نرخوں پر اشیاء ضروریہ کی سپلائی کی جاتی ہے اور جلانے کی سپلائی کم دروں پر کی جاتی ہے۔ ہوسٹلوں میں بجلی کی شرح میں ۵۰ فیصد راحت دی گئی۔

کتاب بینک: ۵۹۹۳ سکولوں اور ۶۱ کالجوں میں بک بینک قایم کیے گئے ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی سطح کی نصابی کتب کی قیمتوں میں ۱۵ سے ۲۰ فیصد کمی کی گئی ہے جبکہ میٹرک سطح تک پڑھائی جانے والی کتابوں کی قیمت میں دس فیصد چھوٹ دی گئی ہے۔

آموز کاری سکیم: ریاست میں ۳۰۰۰ آموز کاروں کی بھرتی کا نشانہ رکھا گیا تھا جبکہ ۵۰۱۴ آموز کاروں کو بھرتی کیا گیا۔ ان میں سے ۲۰۲ ہریجن، ۴۴ ہریجن طبقہ اچھات اور ۴۶۵ آموز کار پسماندہ طبقہ جات سے تعلق رکھتے ہیں۔ وظیفہ کی شرح کو ۴۰ سے بڑھا کر ۵۰ فیصد کر دیا گیا ہے۔

قانونی امداد: مفت قانونی امداد کے تحت ضلع سطح پر ۱۳۷ اور ریاستی سطح پر بارہ وکلا کی رضاکارانہ خدمات حاصل کی گئی ہیں جو ۲۴۰۰ روپے تک سالانہ آمدنی والے لوگوں کو مفت قانونی امداد دیتے ہیں۔ اب تک ۴۷ افراد اس سکیم سے مستفید ہوئے ہیں۔

درخت اگاؤ: سال رواں کے اختتام تک ۱۴۱۰۰۰۰ درخت لگائے جانے کا نشانہ حاصل کر لیا جائے گا۔

منصوبہ بندی: نسبندی سے متعلق مقررہ نشانہ ۵۲۰۰۰ آپریشنوں کے برعکس دو لاکھ آپریشن عمل میں آئے اور اس طرح اس کام میں ۴۰۰ فیصد زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

تعلیم بالغاں: ریاست کے پانچ اضلاع میں باضابطہ طور پر تعلیم بالغان پروگرام منعقد کیا گیا ہے۔ اس غیر رسمی تعلیمی پروگرام سے ۶۰۰۰ افراد کو لابھ پہنچے گا۔ تعلیم بالغاں سکیم کے تحت ۱۸۰ تعلیمی مرکز کھولے گئے ہیں۔

جہیز کا قلع قمع: جہیز کے رواج کے خلاف قانون بنائے جانے کے علاوہ اس سکیم کی حوصلہ شکنی کے لیے کالج اور ہائر سیکنڈری سکولوں میں بڑے پیمانے پر جہیز کے خلاف مہم چلائی گئی۔ اس مہم نے اب اجتماعی شکل اختیار کر لی ہے۔

ذات پات کے بھید بھاؤ کو ختم کرنا: وزیر اعلےٰ کی زیرِ سرپرستی ایک ریاستی سطح کی کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔ کمیٹی چھوت چھات کے رجحان کی حوصلہ شکنی کے ساتھ اس بات پر کڑی نظر رکھتی ہے کہ ایسے واقعات درپیش نہ آئیں۔

تعلقاتِ عامہ، ہریانہ

کمیونسٹ پارٹی کی دو رخی چالیں

گوپال متّل

کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے کمیونسٹ پارٹی کو بجا طور پر ایک ہاتھی سے تشبیہ دی ہے اور اس کی "اتحاد و مبارزت" کی پالیسی کو ہاتھی کے دو طرح کے دانتوں سے مشابہ قرار دیا ہے جن میں سے ایک طرح کے دانت کھانے کے لیے ہوتے ہیں اور دوسری طرح کے صرف دکھانے کے لیے۔ اس سلسلے میں جو بات مزید سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی اتحاد اور مبارزت کی پالیسی خود اپنی طے کردہ نہیں بلکہ سوویٹ حکمت عملی کا ضمیمہ ہے جس پر سوویٹ روس تیسری دنیا بالخصوص جنوبی ایشیا میں عمل پیرا ہے۔ سوویٹ یونین کا یہ دعوی کہ ناوابستہ ممالک اور کمیونسٹ ممالک قدرتی ساتھی ہیں، ایک ایسا دعوی ہے جس کی تائید نہ تو ناوابستہ ممالک کے رہنما کر رہے ہیں اور نہ خود سوویٹ یونین ہی کو اب اس پر کوئی خاص بھروسا رہا ہے۔ جنوبی ایشیا کے ایسے کئی ممالک ہیں جن کے رہنما سوویٹ کیمپ کے ساتھ بہت زیادہ گہری وابستگی کی تردید کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود روسیوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جنوبی ایشیا میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں اور اس مقصد کے لیے وہ مقامی کمیونسٹ پارٹیوں پر خصوصی بھروسا کرنے کی بجائے خود حکومتوں کے ساتھ رابطے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی حکمت عملی کا مقصد وحید بھی یہی ہے کہ اس کے جو ارکان یا ہمسفر حکومتی اداروں میں نفوذ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ان کی پوزیشن کو محفوظ بنایا جائے۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے بریژنیف نے ناوابستگی کی تحریک کی مشروط طور پر حمایت کی تھی۔ کولمبو کانفرنس کے مباحثوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ ان سے عمومی طور پر اس کی تائید ہوتی ہے کہ "مجموعی طور پر ناوابستگی کی تحریک اب بھی ترقی پسندانہ کردار کی حامل ہے"۔ لیکن اس سے ایک ماہ قبل رسٹیلاو یولیانووسکی نے جو جنوبی ایشیا کے معاملات کا ماہر خصوصی ہے اور پارٹی کے بین الاقوامی شعبے کا نائب افسر اعلی ہے، اس تحریک کے "متضاد کردار" کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ بات اس نے بین الاقوامی امور کے سوویٹ جریدے "نیو ٹائمز" کے ستمبر ۷۶ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک مضمون میں کہی تھی۔ ایک ہندوستانی مبصر نے اس مضمون پر اظہار خیال کرتے ہوئے "ٹائمز آف انڈیا" کے ۲۰ اکتوبر ۷۶ء کے شمارے میں لکھا تھا کہ یولیانووسکی کا یہ مضمون اس بات کی تردید ہے کہ کمیونسٹ ریاستوں اور تیسری دنیا کے مفادات میں ہم آہنگی موجود ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے کچھ لیڈروں کا جو موقف ہے وہ سوویٹ یونین کی گہری دوستی کی توقعات کو پورا نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر سری لنکا کی وزیر اعظم بندرا نائکے نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ناوابستگی کی تحریک کسی آئڈیالوجی، سسٹم یا کیمپ کے پروپیگنڈے کا آلۂ کار بننے کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہوگی"۔ ہندوستانی لیڈروں، بالخصوص سنجے گاندھی کا موقف بھی یہی ہے۔

مقامی کمیونسٹ پارٹیوں کو اپنے ملک کی حکومتوں کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے اس سلسلے میں بھی پونیاتووسکی نے "اتحاد اور مبارزت" کا فارمولا ہی تجویز کیا تھا۔ اس فارمولے کے تحت کمیونسٹ پارٹیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی حکومتوں کی یساری پالیسیوں کی تائید کریں اور اگر یہ حکومتیں بورژوائی تذبذب کا ثبوت دیں اور بورژوا طبقے کے ساتھ مفاہمت کی راہ اختیار کریں تو ان پالیسیوں کی مخالفت کی جائے۔ جن لوگوں نے سی۔ پی۔ آئی کے لیڈروں کے بیانات کو بغور پڑھا ہے، ان کی نظر سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ سی۔ پی۔ آئی۔ کی پالیسی بعینہ یہی ہے اور یہ اوپر سے آئی ہوئی ہدایات کا نتیجہ ہے۔

کولمبو کانفرنس سے پہلے جنوبی ایشیا میں سوویٹ پالیسی کے بنیادی نعرے جن کا اظہار انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی قسم کی جماعتوں کی طرف سے ہوتا تھا یہ تھے کہ کمیونسٹ ریاستیں اور ناوابستہ ممالک قدرتی اتحادی ہیں اور ناوابستہ ممالک کا یہ فرض ہے کہ وہ سوویٹ یونین کے ساتھ مل کر مغرب کے ساتھ روابط کو بھی کمزور کریں اور چینی اثرات کو بھی۔ اس قسم کے تصورات کا اظہار نئی دلی سے شائع ہونے والے سوویٹ سفارت خانے کے جریدے "سوویٹ ریویو" کی جون ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں بھی ہوا۔ سوویٹ عناصر کوشاں تھے کہ ناوابستہ ممالک اس تصور کو مسترد کر دیں کہ بحر ہند کے تحفظ کو جس چیز سے خطرہ لاحق ہے وہ بڑی طاقتوں کی باہمی رقابت ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ خیال بھی پھیلا رہے تھے کہ کمیونسٹ ممالک سے ملنے والی مدد اور اس کی شرائط ترقی پذیر ریاستوں کی ضروریات کو ہر لحاظ سے پورا کرتی ہیں۔ سوویٹ یونین کو کولمبو کانفرنس سے اس قسم کی باتوں کی تائید کرانے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی اور ایشیائی لیڈر بدستور ان باتوں کی تائید کرنے سے انکاری ہیں۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۲۱، ۲۲ نومبر کو غیر ملکی امور کے سلسلے میں جو قرارداد پاس کی اس میں بحر ہند میں ہر غیر ملکی فوجی طاقت کی سرگرمیوں میں اضافے کی مخالفت کی گئی ہے۔

سوویٹ اقتصادی مدد فراخدلانہ ہرگز نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں مغرب کی شرائط نرم ہوتی جا رہی ہیں وہاں روس کی شرائط سخت سے سخت تر۔ ۱۹۷۴ء میں ہندوستان کے وزیر خارجہ نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ہندوستان کو اب سوویٹ یونین سے مل کم رہا ہے اور اسے دینا زیادہ پڑ رہا ہے۔ ہندوستان اس کوشش میں تھا کہ سوویٹ یونین کو نرم شرائط پر آمادہ کر سکے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہو سکی اور اب روبل کی شرح تبادلہ میں اضافے کا نتیجہ تو یہ نکلا ہے کہ ہندوستان کی مقروضیت میں پندرہ کروڑ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

اتحاد اور مبارزت کی پالیسی کے سلسلے میں ایک وقت ایسا ضرور تھا جب کمیونسٹ پارٹی کانگرس کے ساتھ مبارزت کے مقابلے میں اتحاد کو ترجیح دیتی تھی لیکن اب جیسا کہ اس کے کانگرس میں رجعت پسندانہ گٹ بندی کے نعروں سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اتحاد کے بجائے مبارزت پر زیادہ آمادہ نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے لیڈر اس سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی کا ایک الزام کانگرس کے خلاف یہ تھا کہ وہ پارلیمانی سسٹم کو خیرباد کہہ کے شخصی اقتدار پر مبنی حکومت یا صدارتی نظام حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ مسز گاندھی اس کی ہمیشہ تردید کرتی رہی ہیں، اب انتخابات کے اعلان نے یہ قطعی ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کا پروپیگنڈہ بے بنیاد تھا۔ بہر حال کمیونسٹوں کی "اتحاد اور مبارزت" کی پالیسی ایک ایسا دام تزویر ہے جس سے ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں، بالخصوص کانگرس کو ہمیشہ ہوشیار رہنا پڑے گا۔ مطلب برآری کے لیے کمیونسٹ جب چاہیں کوئی سوانگ بدل سکتے ہیں۔

غزل

کرشن موہن

سنبھلیں تو مچلتے رہتے ہیں مچلیں تو سنبھلتے رہتے ہیں
ہم لوگ کٹھن راہوں پر بھی ہنستے ہوئے چلتے رہتے ہیں
اِس کیف و رنگ کی دُنیا میں ارمان مچلتے رہتے ہیں
نِسدن اپنے من نینن میں کچھ سپنے پلتے رہتے ہیں
یہ ہستی ہے ہر روز نئی ہم آنکھیں ملتے رہتے ہیں
یہ سچ ہے اپنے ذہن و دِل مچلیں تو بہلتے رہتے ہیں
ہم شمع کی صورت ، راتوں کو بے خواب پگھلتے رہتے ہیں
سینے میں آشاؤں کے دیے ق ہر رنگ میں جلتے رہتے ہیں
جو ہر دم رنج و راحت کے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں
ہر رنگ ہمیں راس آتا ہے یوں پھولتے پھلتے رہتے ہیں
رنگوں کا لُطف اُٹھانے کو ہم رنگ بدلتے رہتے ہیں
پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کیوں فوّارے اُبلتے رہتے ہیں
حیراں ہوں، سرد احساس سے بھی کیوں شعلے نکلتے رہتے ہیں
میرے لیے شیتل بادل بھی اِک آگ اُگلتے رہتے ہیں
کیوں وقت کی لو سنولانے کو ہم لوگ مچلتے رہتے ہیں
ہم تو لمحوں کے پتنگوں کو دن رات مسلتے رہتے ہیں

ہم کرشنا موہن بستی میں
ہر آن مچلتے رہتے ہیں

B 124 پنڈارا روڈ نئی دہلی

نظمیں

بلراج کومل

چیخ

جب شام چراغاں
گزر جاتی ہے
تو ادھیڑ عمر عورتیں
اور ان کے گوشت خور مرد
غلیظ لحافوں کی
قبروں میں اتر جاتے ہیں
ازل سے ابد کو ملاتے ہوئے
بد رنگ کیلنڈروں کی
نذر ہو جاتے ہیں

پڑوس میں ایک حرامی پلّا
قبروں کا طواف کرتا ہے
آسماں کی گرفت سے آزاد
اوبڑ، کھابڑ زمینوں پہ
بھٹکتا ہوا،
ہر شب اپنی چیخ کے دھماکے سے
تیرگی کی کوکھ میں
ایک اُمٹ شگاف
بو دیتا ہے

▲▲

وہ اور میں

اجنبی نے میری اداسی کی
وجہ مجھ سے دریافت کی تھی
میں کوئی جواب نہ دے سکا
تو مجھ پر یکایک یہ انکشاف ہوا
کہ سوال پوچھنے والا
کوئی اجنبی نہیں تھا
مری رفیق حیات نے مجھ سے
یہ استفسار کیا تھا

یہ خوف مجھے مسلسل
خاموش رکھے ہوئے ہے
کہ جب افسردگی کی موجِ سیاہ
اس کو اپنے حلقۂ زنجیر میں گھیر لے گی
اور سب راہیں
مسدود ہو جائیں گی
تو میں کس منہ سے
کن تراشیدہ، متوازن لفظوں میں
اس سے وہی سوال پوچھوں گا
جس کا میں خود
کوئی جواب نہیں دے سکا

▲▲

E-139 کالکاجی نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

غزلیں

سید فضل المتین

یہ تیرا اختیار ہے جو دے سزا مجھے
مجرم مگر نہ مان یونہی بے خطا مجھے

میں اجنبی نہیں ہوں ترا ترجمان ہوں
خاموشیوں کے شہر کبھی دے صدا مجھے

اوروں پہ اعتماد نہ کر، چوٹ کھائے گا
ممکن ہو جس طرح سے بس اپنا بنا مجھے

کب تک سناتا جاؤں تجھے اپنے واقعات
کچھ اپنی داستاں بھی تو آخر سنا مجھے

میرا وجود بن گیا، صحرا کی تشنگی
تیرے بدن کی چاہیے اب تو گھٹا مجھے

اس کے حضور میں ہی خطا کار ہوں متین
میری وفا کا اچھا صلہ یہ ملا مجھے

نازش انصاری

(مختار ہاشمی کی نذر)

تھی جو دُنیائے رنگ و بو تجھ سے
اب لگے ہے لہو لہو تجھ سے

تُو کہ اُٹھ کر کبھی کا جا بھی چکا
میں کہ ہوں محوِ گفتگو تجھ سے

میرے حرف و نوا ہیں تو زندہ
سیکھا اظہارِ آرزو تجھ سے

اب افق تک نظر نہیں جاتی
دل کو تھی تیری جستجو، تجھ سے

اے مرے، مجھ سے روٹھنے والے
اب نہ بولوں گا بے وضو تجھ سے

جمنا پرشاد راہی

تصویر کشِ صحرا گھر ہے
کیا سازشِ دیوار و در ہے

منظر منظر زہر اثر ہے
نیلاہٹ تا حدِّ نظر ہے

خورشیدِ سحر خیز ہوں لیکن!
ڈھلنا ہے سرِ شام خبر ہے

آندھی نے سنیاس لیا تھا
برگد کیوں بے برگ و ثمر ہے

ویرانی ہے صحرا صحرا
چشمِ آہو بے منظر ہے

نظمیں

عظیم اختر

ایک نظم

حال کے لمحوں میں
خوش رہنے کی خاطر
میں نے
وہ ساری تصویریں
جو ہر دم [illegible] رکھتی تھیں
وہ سارے خط
جن سے
کل کی یادیں تازہ تھیں
پھاڑ ڈالے ہیں
اور یہ سوچ کے خوش تھا
اب میں بھی تو [illegible] سکوں گا
لیکن شدت سے
اب یہ احساس ہوا ہے
ماضی کی تلخ و شیریں
یادوں سے کٹ کر
بے حس پتھر کی مانند
زندہ کیسے رہ سکتا ہوں
شاید زیست یہی
تلخ و شیریں یادیں ہیں
انہی سے ملتا ہے
زندگی کا آبِ حیات !!

○ رنگ محل خورد - پھاٹک حبش خاں - دلی ۱۱۰۰۰۶

شاھد کلیم

تعاقب

دہکتی ہوئی آگ
سورج سے لے کر
مرے جسم پر پھینکتی ہے
کبھی جسم پر میرے کرتی ہے یہ
برف باری
کھلا پھیلا میدان ہو
یا مقفل مکاں
تعاقب میں میرے ہے دن رات
سر در گریباں ہوا
ہر جگہ
مجھے قاف کے شہر میں
بھاگنا ہی
پڑے گا

○ سنٹرل ایکسائز آفس - گیا - بہار

ایک سوالنامے پر اظہارِ خیال

ڈاکٹر شمیم حنفی

۱۔ جدید ادب نہ تو قدیم سے منحرف ہے، نہ ہی اُس کی بنیادی اقدار کو بحال کرتا ہے۔ اصل میں اقدار کا مسئلہ اخلاقیات سے متعلق ہے چنانچہ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جدید ادب نے قدیم کی اقدار کو ازسرِنو دریافت کیا ہے یا ان کی بازآفرینی کی کوشش کی ہے۔ انسانی صورتِ حال میں تبدیلیوں کے سبب اقدار کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ تاہم یہ ضرور ہوا ہے کہ جدید ادب نے انیسویں صدی کے ربعِ آخر کی اصلاح پسندی اور امید پرستی نیز بیسویں صدی کی سوقیانہ مقصدیت اور نظریۂ زندگی کی فصیلوں کو عبور کر کے قدیم ادب کی وسعتِ فکر سے ایک نیا رشتہ قائم کرنے کی سعی کی ہے اور اس طرح روایت کے تسلسل کو ایک نئے معنی سے ہم کنار کیا ہے۔ جدید و قدیم میں یہ عنصر بلاشبہ ایک مشترکہ قدر کی حیثیت رکھتا ہے کہ دونوں سطحی تعقل اور یک رخے بیرونی مقاصد کے جبر سے آزاد ہیں، اس طرح انسان کے تخلیقی نصب العین کی آزادی کا اثبات کرتے ہیں اور انجمن اشاعت مفیدہ (عرفِ عام میں انجمن پنجاب) اور ترقی پسند تحریک دونوں کی ضابطہ بندی اور حدود کی نفی کرتے ہیں۔

۲۔ تجربوں کی نوعیت کے ساتھ ہیئت میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ جدید ادب موضوع اور ہیئت کی دوئی کے تصور کو غلط ٹھہراتا ہے۔ میں اسے ادب کی جمالیات کا اصل الاصول سمجھتا ہوں اس لیے میرے نزدیک، عدمِ توازن اور انتہا پسندی کے باوجود تجربے کی یہ رو مستحسن ہے۔ البتہ یہاں اصناف کے فرق سے پیدا شدہ مطالبات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعض جدید شعرا اس فرق سے بے نیازانہ گزر جاتے ہیں۔

۳۔ جدید ادب میں تنہائی کا احساس صنعتی تمدن کی نفسیات کا زائیدہ بھی ہے اور عام انسانی نفسیات کی ایک جہت سے بھی متعلق ہے۔

۴۔ اچھا ادب تبلیغ نہیں ہوتا۔ تبلیغ کے آداب، مقاصد، صیغۂ اظہار، سب کے سب متعین ہوتے ہیں اور ہمیشہ BETTER THAN THOU کے نقطے سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ رویّہ ادب کے منصب کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی ترکیب اور ہیئت کو بھی مسخ کرتا ہے۔ رہا ترسیل کا سوال تو اس کا ایک سرا قاری کی استعداد سے مربوط ہے اور اس پر بھی کچھ ذمے داریاں عاید کرتا ہے۔

۵۔ جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دینا کسی نئے عرفان کا نتیجہ نہیں۔ یہ دراصل پیروں کے نیچے سے کھسکتی ہوئی زمین پر قدم جمانے کی ایک کوشش ہے۔

۶۔ ہر اچھا ادب انسان دوست ہوتا ہے اور ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ مخصوص نعروں پر قناعت ادب میں، ادب کے اختیارات سے بے خبری اور احساسِ کمتری دونوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یا پھر اس کے مقاصد مادّی ہوتے ہیں۔

۷۔ ادب ہر اُس تجربے کا اظہار ہے جو ادیب کی تخلیقی حِس اور جذبے کو متحرک کر سکے، وہ عام سماجی معیاروں کے مطابق صحیح ہو یا غلط۔ خود سپردگی، مایوسی اور انفعال بھی ایک نوع کا احتجاج ہے۔ بلاواسطہ۔ بیانیہ "مریضانہ ادب"

کا سوال تو مجھے جرمن اثبات پسندوں کے مقابلے میں آن کے معاصر فرانسیسی انحطاط پسندز ؟) بہر نوع زیادہ عزیز ہیں کہ ادب کے اچھے یا برے ہونے کا آخری فیصلہ صرف ادبی معیاروں کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔

قمر احسن

۱- یہاں قدیم ادب سے اگر مراد ترقی پسند ادب ہے۔ تو جدید ادب یقیناً اس سے انحراف ہے توسیع یا بحالی اقدار نہیں۔ اور اگر قدیم ادب سے اقبال اور ان کے پہلے کے عظیم شعری ورثہ کی طرف اشارہ ہے تو بہت حد تک "بنیادی" اقدار کی بحالی ہے۔ لیکن بنیادی اقدار؟ میرے ذہن میں اس کا تصور انسانی جہاں بینی ہے۔

۲- جدید ادب میں یہ تبدیلیاں متوازن ہیں۔ نئے موضوعات کے لیے نئی ہیئت ضروری تھی۔ نئی ہیئت نے یک سطحی اور یک جہاتی موضوع سے ہمہ جہاتی کینوس دیا۔ فن یا ادب جامد اور اصولوں کا پابند فن یا سائنس نہیں ہے۔ تجربات کی ابتدا ہیئت کے تجربوں سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ جسے فنکار کی قوتِ مدرکہ عصری وژن دے دیتی ہے بعض جگہوں پر موضوع ہیئت کے ہی سہارے آگے بڑھتا ہے۔ یعنی موضوع جو اب تک بنیادی اور اہم ترین شئے تھی اب بعض حالات میں لفظ اور ہیئت کا پابند ہو جاتا ہے۔ اور یہ بہت کم ہوتا ہے کہ ہیئت موضوع کی پابند ہوئی ہو۔ ہیئت سے میری مراد تخلیقی عمل (PROCESS) سے گزرنے کے بعد ایک شکل میں موجود ہو جاتا ہے۔ اس تخلیقی عمل کو میں "تکنک" تک محدود رکھتا ہوں۔ تکنک سے گزرنے کے بعد ہیئت سامنے آتی ہے۔ کچھ ناقدین کے نزدیک یہ لازم و ملزوم ہیں یعنی خیال یا موضوع نیا تو تکنک نئی۔ تکنک نئی تو لازماً خیال نیا۔ میں اس سے قطعی متفق

نہیں ہوں۔ اور ہونا بھی نہ چاہیے۔

۳- تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل کیسے ہو سکتا ہے؟ غالب اور میر اور ان کے ہمعصر بادلیئر کے زمانہ میں نہ صنعت نے اتنی ترقی کی تھی نہ صنعتی پھیلاؤ ہوا تھا ان کے یہاں اتنی شدید تنہائی کیوں ــــ ؟ اور اوپر چلیے۔ خیام اور حافظ دو متضاد رویوں کے باوجود احساس تنہائی میں شریک تھے آخر کیوں ــــ ؟ یہ مفروضہ کہ تنہائی کا احساس، روابط کی شکست و ریخت وغیرہ وغیرہ یا صنعتی دور کی لازمی پیداوار ہے بچکانہ اور عامیانہ مفروضہ ہے۔ اور جناب یہ احساس تنہائی سماجی نظاموں سے صرف نسبتی تعلق ہونے کی وجہ سے بھی نہیں ہے (ہاں یہ ٹھیک ہے کہ یہ فنکار یا تخلیقی ذہن کا وصف ہے) اس لیے کہ سماجی نظام سے فنکار کا تعلق عموماً نسبتی ہوا کرتا ہے۔ لیکن ہر فنکار تنہائی کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک دور کے کچھ خاص "فنکاروں" نے اپنے طور پر یہ فرض کر لیا ہو کہ سماجی نظام سے ان کا بڑا شدید تعلق ہے اگر وہ نہ ہوتے تو یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور وہ منصوص من اللہ ہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ لہٰذا انھوں نے تنہائی کے ممنوعہ گیہوں سے اپنے کو خوب بچایا اور زور زور سے "میاں کی توڑی" گانے لگے یا "درباری" الاپنے لگے۔ جناب ہر سوچنے والا مفکر نہیں ہوتا ورنہ ملا نصیرالدین کی مرغی بھی مفکر ضرور کہلاتی۔ اور نہ ہر ذہن تنہائی کا ــــ دانستہ میں ــــ شکار ہوتا ہے۔ تنہائی کا احساس تلازمہ ہوتا ہے بہت سی دوسری اور کسی حد تک انفرادی باتوں کا۔ نہ صنعتی پھیلاؤ سے تنہائی آتی ہے اور نہ سماج و معاشرہ سے غیر نسبتی تعلق سے تنہائی پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ کوئی ایک وجہ تلاش کرنے پر تلے ہوئے ہیں (جو نا ممکن ہے) تو اسے یوں کہیں کہ اس کا ہر صورت سے ذمہ دار

خود فن کار ہوتا ہے۔ یعنی جہاں اس نے غوں غوں شروع
کی وہیں کان پہ قلم رکھ کر گھٹنے کو دل چاہنے لگا۔ اور
جہاں لوگوں نے اسے اس ہیئت میں دیکھا وہیں بعض
صرف لطف لینے بعض عقیدت میں اور بعض بہ طور
مشغلہ اسے ہاتھوں ہاتھ لینے لگے۔ یا گھر والوں نے ناکارہ
سمجھ کر دھتکارنا شروع کر دیا۔ بیوی میلی ساڑی سے
ہاتھ خشک کرتے ہوئے مایوس نظروں سے دیکھنے
لگی اور انھیں اچانک یہ محسوس ہوا کہ اب یہ "عام"
شخص نہیں رہ گئے ہیں بلکہ بفضلِ خدا شاعر ہیں اور
خیر سے ان تمام لوگوں سے منفرد ہیں۔ پس جہاں
ان کے دماغ میں یہ احساس آیا وہیں سے روکھی پھیکی
تنہائی شروع۔ یہ تو ہوئی ابتدائی تنہائی۔ دوسری
تنہائی وہاں جنم لیتی ہے جب کسی اخبار کے شام ایڈیشن
میں شہری فضا کے کالم میں یہ خبر آجائے کہ کچھ لوگوں
کے یہاں شاعری میں تنہائی کا احساس بھی ہوتا ہے۔
چنانچہ اسی وقت سے وہ تمام اخبار پڑھنے والے
فنکار گھبرا گھبرا کر اپنے اندر تنہائی کے بیج بونے لگتے
ہیں۔ اور صبح موٹا سا چشمہ لگا کر آسمان دیکھتے ہوئے
سڑک پار کرتے ہیں۔ تو جناب فنکاروں میں تنہائی
کا احساس پیدا کرنے کے ذمہ دار در اصل باہر والے
ہوتے ہیں۔ اس بیچارہ میں اتنی صلاحیت کہاں کہ
وہ اسے جھیل سکے۔ تنہائی کا صحیح احساس تو اتنا شدید
ہوتا ہے کہ اللہ میاں کو اتنی بڑی کائنات پیدا کرنی پڑی۔
پس طے یہ ہوا کہ تنہائی کا احساس صرف ایک غن
کا نام ہے۔ جہاں آپ اس غن میں آئے کہ آپ
اپنے آس پاس سے ذرا الگ، منفرد، شاعر یا ادیب
ہیں، تو وہیں تنہائی آپ کو آ دبوچے گی۔ میرا مشورہ
ہے کہ آدمی کو خواہ کچھ بھی ہو غن نہ ہونا چاہیے۔ اور
نہ یہ سوچنا چاہیے کہ اب آپ ماشاء اللہ "مفکر
شاعر اور ادیب" ہیں۔

۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے

نہیں صاحب یہ غلط ہے۔ لیکن یہ آپ نے جو خیال
ظاہر کیا ہے کہ کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو ملا تو
نہیں رہے ہیں؟ اگر ملا رہے ہوں تو بھی یہ غلط ہے۔
اس لیے کہ ہر ادب ترسیل بھی نہیں ہوتا۔ دیکھیے مرغی
نا انسان، مرغی اور غلاظت والی بات۔ صاحب جب
تک آپ "ہر ادب" والی بات نہ ہٹائیں گے تب تک
بات نبھنے گی۔ مان لیجیے میں یہ کہوں کہ۔ نہ تبلیغ۔ نہ ترسیل
بلکہ ہر ادب اظہار ہوتا ہے ـــ تو ـــ؟ لیکن ہر اظہار
ادب نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر تبلیغ۔ ہر ترسیل
ادب نہیں ہے۔ لہٰذا بات ہر ادب پہ اٹکتی ہے۔
اگر کلی طور سے "ہر ادب" کی بات ہے تب تو میں
بھی کہوں گا کہ "ہر ادب اظہار ہوتا ہے"۔ ہر اظہار
ادب ہو یا نہ ہو۔ ورنہ یوں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ
اظہار تبلیغ ہوتا ہے (کچھ ادب تبلیغ ہوتا ہے۔ یہ بھی
کہنے کو دل نہیں چاہتا ـــ نہ جانے کیوں۔ شاید
اس لیے کہ میں تبلیغ کو ادب نہ مانتا ہوں یا پھر اور
کوئی وجہ ہو واللہ اعلم) اور کچھ اظہارات کی ترسیل
بآسانی ہو جاتی ہے اور کچھ اظہارات کی ترسیل میں
کامیابی نہیں ہوتی لہٰذا ابلاغ کا سلسلہ پیدا ہوتا
ہے۔ یوں کلیوں میں بات اور نتیجہ ـــ دونوں نامکمل
ہو جاتے ہیں ـــ رہی بات تبلیغ اور ترسیل کو خلط
ملط کرنے کی۔ اس سے کچھ بگڑتا ہی نہیں کیا کریں
خلط ملط ـــ لیکن آپ ایسا نہ کیجیے گا۔

۵۔ جب ایک مدت تک ترقی پسند تحریک سے متعلق
ناقدین جدید ادب پر عتاب نازل فرما رہے تھے ـــ
اس وقت در اصل ان کی قوتِ فیصلہ کام نہیں کر رہی
تھی۔ اس لیے کہ ادب کی شناخت اور تعریف
کے لیے انھوں نے جو منشور تیار کیا تھا بس اسی کو
ادب سمجھتے تھے۔ اس جدید ادب نے ان کے تقریباً ہر نظریے
اور ادب کی ہر تعریف کو رد کر دیا۔ اس لیے کہ ان کی
تعریفات کی بنیاد ہی ہنگامی ادب پر تھی۔ بعد میں جب

انھیں احساس ہوا کہ وہ کمزور ثابت ہو رہے ہیں تو بھی انھوں نے صرف ضد میں اسے قبول نہ کیا۔ ترقی پسند ناقدین میں کچھ ایسے باوفا بھی تھے اور ہیں جو آخر تک اپنی بات پر قایم تھے اور ہیں۔ نہ انھوں نے اسے قبول کیا ہے نہ پسپا ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے اسے توسیع قرار دیا میں انھیں ان باوفا ناقدین سے بھی کم تر سمجھتا ہوں اس لیے کہ یہ توسیع کہنے والے ان کٹر ناقدین کے مقابلہ میں زیادہ موقع پرست ثابت ہوئے ہیں۔ نہ انھیں عرفان ملا ہے نہ ہی پسپا ہوئے ہیں بلکہ صرف موقع پرست ہیں اور ان باوفا ناقدین سے کمتر جو آج بھی جدید ادب کو نہ قبول کر سکے ہیں۔

۶۔ دیکھیے صاحب سب سے خطرناک سوال یہی ہے۔ یعنی بس تلوار کی دھار پر چلنے کا عمل۔ اگر اس پر سنبھل کر اظہارِ خیال کیا جائے تو بھی جواب بہت طویل ہو جائے گا۔ ملک و قوم کی تعمیر میں ادیب کا کردار صرف مرکزی خیال اور زریں رد کی طرح ہوتا ہے جس طرح سے سیاست داں۔ ماہرِ معاشیات سائنس داں اور سول سروس والے اپنا کردار نباہتے ہیں، اس طرح ادیب ہرگز نہیں نباہ سکتا۔ وہ انھیں ان کے معاشی۔ تہذیبی۔ معاشرتی اور قومی مسائل سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یعنی ادیب حرکتِ قلب کی رفتار بتانے والا یا درجۂ حرارت بتانے والا آلہ ہوتا ہے کیپسول یا ٹانک نہیں۔ اس طرح اسے شعوری طور سے کسی بھی سمت یا تحریک کے لیے نفسیاتی ماحول تیار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ باشعور فنکار کی تخلیقات خود ہی اس دور کی عکاس ہوتی ہیں اور نفسیاتی ماحول ORIGINAL فنکار کی تخلیقات سے خود ہی تیار ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح اسے نعروں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ نعرہ بازی "توانا فنکاروں" کا کام ہے جو کم ذہین اور کم باشعور ہوتے ہیں۔

۷۔ اور سب سے زیادہ پریشان کن سوال یہ ہے۔ یقیناً یہ تعریف اہم ہے اور ادب احتجاج کا ایک پرامن ذریعہ ہوتا ہے۔ یا بہ قول آپ کے ناپسندیدہ جذبات کے پرامن اخراج کا ذریعہ ہے۔ فنکار اگر ان خیالات کا اظہار نہیں کرتا جو اس کے ذہن میں کوندرہے ہیں۔ یا اس گھٹن کو ظاہر نہیں کرتا جو ریاست۔ معاشرہ۔ اور ماحول کی وجہ سے اس کے ذہن و دل پر چھائی ہے تو وہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے یا گونگا بن جاتا ہے۔ لہٰذا ان جذبات کا اظہار خود اس کے لیے اور اس کے اردگرد کے لیے لازمی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ صرف یہی ادب نہیں ہے ادب اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے اور بہت کچھ کا طالب ہوتا ہے۔ مثلاً میں یہ کہوں تو ہے؟ کہ "پسندیدہ جذبات کے پرہیجان اخراج کا ذریعہ ہے" ظاہر ہے کہ اس طرح سے بات کسی نتیجہ پر نہیں پہونچے گی۔ اور یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے۔ یہ ضرور مناسب نہیں ہے کہ کلیات کے ذریعہ ہم نتائج اخذ کریں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آخر آپ ادب کو سماجی فریضہ کا حامل بنانے ہی پر کیوں تلے ہیں۔ اگر ہے۔ اگر نہیں ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ادب ادب ہے یا نہیں۔ ؟ پسندیدہ جذبات کا اخراج ہوا ہے یا ناپسندیدہ جذبات کا اخراج ہوا ہے۔ سماجی فریضہ کا حامل ہے یا حامل نہیں ہے اس سے کیا — اول تو مریضانہ ادب کیا ہے۔ میں ترقی پسند تحریک والے ادب کو مریضانہ کہتا ہوں۔ اس لیے کہ وہاں کراہ۔ کھانسی۔ ضیق النفس۔ اور قولنج کے سارے آثار ملتے ہیں۔ وہ لوگ یا کوئی اور نئے ادب کو مریضانہ ادب کہتے ہیں اور اس کے لیے دلائل استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں اسی معاملہ پر مختلف ہو گئے۔ لہٰذا اب مریضانہ ادب کی

شناخت کیجیے۔

اچھا خیر چھوڑیے ان باتوں کو چلیے اس کلیہ کو مان لیں کہ ادب ناپسندیدہ جذبات کے پرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ لہٰذا یہ بھی سماجی فریضہ کا حامل ہے اور اسے بعض لوگ مریضانہ ادب کہتے ہیں۔ جو غلط ہے۔ تو بھی کیا بات بنی ــــ صاحب ــ آخر ہم سائنس کی طرح ادب میں نتیجہ کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ جلدی سے گوہر میں سے جگنو نکل ہی آئے والا عمل ادب میں قطعی ناممکن ہے ــ میرا اس سوال کے بارے میں یہی خیال ہے کہ "ادب ہر طرح کے جذبات کا فنی اظہار ہے یا فنی اخراج ہے" سماجی فریضہ کا حامل ہو ــــ مریض ہو یا غیر سماجی اور صحت مند ہو۔ اس سے بعد میں غرض ہوتی ہے۔ اگر مریضانہ ادب سماجی فریضہ کا حامل بن بھی جائے تو ــ ؟ اور نہ بنے تو ــــ ؟؟

پرکاش فکری

۱۔ جدید ادب، قدیم ادب سے محض انحرافِ ناتمام ہے۔ لہٰذا ادب کی بنیادی اقدار میں کوئی ایسی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہو سکی جسے واقعی تبدیلی قرار دیا جا سکے۔ مختلف کروٹوں کے باوجود ادب انہیں اقدار کے حصار میں خود کو گرفتار پاتا ہے جن اقدار کی تشکیل انسان کی ذہنی پہنچ کی محتاجِ عنایت رہی ہے اور یہ ذہنی پہنچ باوجود اونچی اڑانوں کے لامحدودیت کا درجہ حاصل نہیں کر پاتی۔

۲۔ انسان اور انسان کے بنیادی مسائل اگر یکسر یا بڑی حد تک بدل گئے ہوتے تو جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت پر غور کرنے کی صورت پیدا ہوتی۔ ہیئتی تبدیلیاں تو اختراعی ذہن بڑی آسانی سے پیدا کر لیتا ہے مگر موضوع تو بہر حال انسان اور اس کے مسائل کی حدوں سے زیادہ دور نہیں جاتا اور اس طرح ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کے درمیان کوئی تال میل مشکل ہی سے رہتا ہے۔ لہٰذا جدید ادب کو اس تناسب کی اہمیت سے آگاہ ہونا چاہیے کیونکہ جدید ادب میں یہ تناسب برقرار نہیں رہ سکا ہے۔

۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کی دین نہیں ہے۔ تنہائی تخلیقی ذہن کا وصفِ خاص ہے۔ تخلیقی ذہن عام ذہنی سطح سے الگ ہو کر بلکہ اوپر اٹھ کر (مگر اس الگاؤ یا اوپر اٹھنے میں وہ معاشرے سے قطعی طور پر لاتعلق نہیں ہو جاتا) اپنے اندر اور باہر کی دنیاؤں، اپنے پیش و عواقب کے سیلِ لمحات سے اتنا INVOLVEMENT محسوس کرتا ہے کہ لامحالہ وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے یا تنہا ہو جاتا ہے۔

۴۔ ہر ادب تبلیغ نہیں ہوتا۔ اور تبلیغ کے نام پر جو ادب تخلیق ہوتا ہے وہ بھلے ہی وقتی طور پر ادب قرار پا جائے مگر اس کی قلعی جلد ہی اتر جاتی ہے۔
تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ادب کو تبلیغ کا آلۂ کار بناتے ہیں ورنہ تبلیغ اور ترسیل کا کیا رشتہ؟ ترسیل ایک علیحدہ مسئلہ ہے جو اقبال جیسے پیامی شاعر کے کلام کے مطالعہ کے دوران بھی سامنے ابھرتا ہوتا ہے۔

۵۔ ترقی پسند ناقد اتفاق سے یہ سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند ادب نے ادب کو نئی جہتیں دی ہیں لہٰذا ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ اگر ادیبوں کا کوئی اور گروپ کسی نئے پن کی بات کرے تو یہ ترقی پسند روایت کی توسیع ہوئی۔ اس دعوے میں نیا عرفان تو کچھ بھی نہیں ــــ ان کا یہ دعویٰ تو اعترافِ پسپائی ہے کیوں کہ نئے ادب کو مردود و مسترد کرنے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد ہی وہ اسے اپنی روایت کی توسیع قرار دینے پر مجبور ہوئے ہیں۔

۶۔ ملک و قوم کی تعمیر جدید میں اگر ادب کوئی موثر کردار ادا کرنا چاہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ملک و قوم کا بڑا حصہ ادب کی زبان سمجھنے لگے۔ نعرے یہ کام نہیں کر سکتے۔ لہٰذا آپ کے سوال میں دیے ہوئے اشارے کے مطابق ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیئے۔ مگر زمانہ بہت تیز رفتاری اختیار کر چکا ہے اور یہ عمل بہت وقت طلب اور دقت طلب ہے اس لیے اب ملک و قوم کے سلسلے میں ادب کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکتا۔

۷۔ یہ شاید میری شدید کم علمی ہو کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ادب کو ناپسندیدہ جذبات کا پرامن اخراج قرار دینے والوں کی رائے کبھی بھی قابلِ اعتنا قرار نہیں پائی اور جہاں تک مریضانہ ادب کا سوال ہے تو ادب کی مریضانہ یا صحت مند کیفیت پر کوئی بھی فیصلہ کبھی بھی آخری فیصلے کا درجہ اختیار نہیں کرتا۔ اس قسم کا ہر فیصلہ ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے اس لیے وہ ادب بھی سماجی فریضے کا حامل ہے جسے بعض لوگ مریضانہ قرار دے کر خود کو مطمئن کر لیتے ہیں۔

احتشام اختر

۱۔ جدید ادب قدیم ادب سے انحراف نہیں بلکہ قدیم ادبی اقدار کی تجدید و توسیع ہے۔

۲۔ یہ کہنا کسی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ موضوع اپنے ساتھ ہیئت بھی لاتا ہے۔ چنانچہ موجودہ مشینی سماج اور کھردری شخصیت سے پیدا شدہ موضوعات نے ادبی ہیئت کو بھی بدلا ہے۔ نثری نظم اور پلاٹ لیس افسانہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔

۳۔ فنکار کی تنہائی کا احساس موجودہ معاشرہ کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا بنیادی تخلیقی وصف ہے چنانچہ میرو

غالب کے ہاں بھی یہ احساس ملتا ہے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ معاشرہ نے اس احساس کو زیادہ شدید کر دیا ہے۔

۴۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے لیکن یہ تبلیغ بالواسطہ طور پر ہوتی ہے اسی لیے تخلیقی اظہار ہمیشہ تہہ دار علامتی اور استعاراتی ہوتا ہے یہ سمجھنا کہ ہمارا پیغام ادب کے ذریعہ ہر مزدور تک پہنچایا جا سکتا ہے ادب کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔

۵۔ ترقی پسندی سے مراد اگر وہ تحریک ہے جو کمیونزم کی پروردہ ہے تو جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع نہیں بلکہ اس تحریک کی موت کا اعلان ہے۔

۶۔ ادب ملک و قوم کی تعمیر اس طرح نہیں کرتا جس طرح مصلحین اور سماجیات کے ماہرین اور سیاست داں کرتے ہیں۔ اسی لیے ادب نہ تو مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دیتا ہے اور نہ ہی بھگتی تحریک کی طرح کوئی نفسیاتی ماحول تیار کرتا ہے۔

۷۔ ادب ہر طرح کے جذبات کا تخلیقی اظہار ہے چنانچہ مریضانہ ادب اور صحت مند ادب جیسی اصطلاحیں فارمولا بند شاعری کرنے والوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ایسی اصطلاحیں وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو ادب کو اپنی تحریک اور مسلک کی نشر و اشاعت کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

ابرار اعظمی

۱۔ جدید ادب، ادب کی بنیادی اقدار کی بحالی کے ساتھ ساتھ نئی قدروں کی تلاش بھی ہے۔

۲۔ ہیئتی تبدیلیوں کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

۳۔ تنہائی کے حقیقی احساس کو صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردعمل کہنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ تخلیقی ذہن کا ایک لازمی وصف

بھی ہے جس کے مظاہر سماجی اور سیاسی نظاموں میں بقدرِ ذوق و ظرف مختلف انداز اختیار کرتے ہیں۔

۴۔ یقیناً خلط ملط کرتے ہیں اور دانستہ کرتے ہیں کہ یہ ذی علم حضرات یقیناً ابلاغ، تبلیغ، ترسیل جیسے الفاظ کے مختلف معنی و مفہوم سے واقف ہوں گے۔

۵۔ اکثر ذہنی پسپائی کا احساس بھی نئے عرفان کو جنم دیتا ہے۔ ضرورت اور ایجاد کے باہمی رشتے کو یاد کریں اور غالب کے اس مشہور مصرعہ کو بھی ع

وا ماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

۶۔ جی ہاں، کر سکتا ہے۔ مثبت طریقہ سے اور جواب ۱ کی روشنی میں۔

لیکن محض چند نعروں کو نگارشات میں جگہ دینے سے جو چیز وجود میں آتی ہے، کیا اسے ادب کہا جا سکتا ہے؟ اعلیٰ ادب کی تخلیق ایک نفسیاتی ماحول ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کارِ خیر خالص سیاسی انداز کی تنظیمیں بنا کر انجام دیا جائے یا ادبی انداز سے؟ اوّل الذکر شکل میں صرف 'کارِ خیر' ہی انجام پائے گا، ادب، اعلیٰ ادب کی تخلیق امرِ محال ہو جائے گی۔

۷۔ ادب کی یہ جزوی تعریف ہے۔ اور مریضانہ، پسندیدہ، ناپسندیدہ، برامن اور اخراج جیسے الفاظ قطعی طور پر اضافی ہیں جن کا استعمال لوگ اپنی پسند، ناپسند کے اعتبار سے کرتے رہتے ہیں۔ آخر قطرہ کو قلزم پر محیط کیوں کیا جائے؟ علاوہ ازیں، اگر تم کو قے آ رہی ہے تو بیچ سڑک پر کیوں بیٹھتے ہو، ادھر سے بچتے گزریں گے کسی گوشہ میں کیوں نہیں چلے جاتے۔

ابوالکلام قاسمی

۱۔ آپ کے سوالنامے میں "جدید ادب" اور "قدیم ادب" کی محتاط اور غیر واضح اصطلاحات اس موضوع پر کھل کر کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتیں، پھر بھی ان حدود میں رہ کر جو کچھ کہا جا سکتا ہے کہنے کی کوشش کی جائے گی۔

جدید ادب، قدیم ادب کی ایک ارتقائی شکل ہے۔ زندگی کی طرح ہر نمو پذیر چیز کے معرضِ وجود میں آنے اور ارتقاء سے گزرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ ادب چونکہ زندگی سے کسبِ نور کرتا ہے اس لیے اس کی نمو پذیری بھی زندگی کے شانہ بہ شانہ چلتی ہے۔ جدید ادب اگر قدیم ادب پر خطِ تنسیخ کھینچ کر ادبی اقدار کا کوئی نیا تصور پیش کرتا تو آپ اسے مطلق انحراف کہہ سکتے تھے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر کوئی نیا میلان ماضی کے میلانات سے مطلق انحراف نہیں کرتا تو وہ اس کی بنیادی اقدار کی بحالی ہی کرے۔ 'قدیم ادب' کا لفظ بہت مبہم ہے۔ اس کے کچھ حدود متعین ہوتے تو آسانی سے اس کی بنیادی اقدار پر بھی گفتگو ہو سکتی تھی۔

جدید ادب ہر نئے میلان کی طرح اپنے ماضی کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آیا، اس لیے اس نے بنیادی اقدار کی بحالی کے بجائے جزوی طور پر انحراف کا ہی رویہ اپنایا۔

(جدید ادب کے نام پر کلاسیکی ادب سے ناواقف اور ناتربیت یافتہ اکثریت نے جس طوفانِ بدتمیزی کا سلسلہ جاری رکھا وہ میرے جواب کے حدود سے باہر ہے)

افسوسناک بات یہ ہے کہ قدیم ادب سے انحراف کی کوشش صرف انحراف تک محدود رہی۔ جدید ادب اقدار کا وہ تصور اب تک نہ پیش کر سکا جس کو مستقبل میں ادبی روایت کی حیثیت حاصل ہو سکے۔

۲۔ اگر ہیئت کی تبدیلیاں محض ہیئت کے تجربے کے طور پر وجود میں آتی ہیں تو وہ ادب میں اضافے کے بجائے ادب کو غلط راہ پر ڈالتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تجربے کی ندرت اور موضوعاتی تبدیلیوں کی ناگزیریت اپنے لیے خود بخود نئی ہیئت تخلیق کر لیتی ہے۔ نئے موضوعات کے بطن سے پیدا ہونے والی نئی ہیئت ہی دیرپا ادب

کا حصہ بن سکتی ہے ہیئت کا تجربہ، اگر برائے تجربہ
ہے تو میں اسے ادبی فیشن سے تعبیر کرتا ہوں، اور
ادب میں فیشن کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔
جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں کا تناسب موضوعاتی
تبدیلیوں سے بہت زیادہ رہا ہے جو کوئی اچھی چیز
نہیں۔ جہاں نئے تجربات اور موضوعات کا اظہار
پرانی ہیئتوں میں ممکن ہے۔ وہاں ہیئتی تبدیلی کی
چنداں ضرورت نہیں۔ بہ صورت دیگر موضوع کا
نیاپن اظہار کے لیے اپنے آپ کوئی نئی ہیئت تخلیق
کر لیتا ہے۔ ہیئت کی تخلیق کا یہ عمل، تخلیقی عمل کا
وہ پراسرار حصہ ہوتا ہے جس کے لیے تخلیق کار کو
شعوری کوشش بھی نہیں کرنا پڑتی۔ یہ بات دوبارہ
کہنے کی ضرورت نہیں کہ نئے موضوعات نئی زندگی سے
پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ جدید ادب میں تنہائی کے احساس کا اظہار کسی صنعتی
پھیلاؤ کا رد عمل نہیں۔ تخلیقی ذہن، ہر دور میں
تنہائی کے احساس سے دوچار رہا ہے۔ ادیب اگر
سچا فن کار ہے تو اسے کم و بیش ہمیشہ "عندلیب گلشن
ناآفریدہ" ہونے کا احساس رہتا ہے اور یہی احساس
تنہائی کو جنم دیتا ہے۔

۴۔ کوئی بھی صحت مند ادب تبلیغ نہیں ہو سکتا۔ البتہ
تبلیغ کو ادب بنایا جا سکتا ہے مگر اس کے لیے یہ
ضروری ہے کہ تبلیغ کے عنصر کو تخلیقی شخصیت کی بھٹی
میں تپا کر اور اس کی شکل بدل کر سامنے لایا جائے۔
اقبال کی شاعری اس طرح کے ادب کی سب سے
بڑی مثال ہے ــــــ آپ کی یہ بات درست
ہے کہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط کرتے
ہیں۔ آج تک مقصدی ادب کی کسی تحریک نے
بھی اپنے ادب کو تبلیغ نہیں کہا، اس لیے تبلیغ
کی بات سرے سے ہی خلاف واقعہ ہے۔ نثری
ادب میں ترسیل کی ناکامی کا کوئی جواز نہیں۔ فکشن
میں آپ کو ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی کہ
ایسے ان گنت ناول اور افسانے عظیم ادب کا شاہکار
ہیں جب کہ انہیں کسی خاص مقصد کی ترسیل کے لیے
لکھا گیا ہے (جیسے آپ تبلیغ کہہ رہے ہیں)۔

۵۔ رد عمل بھی ایک طرح کی توسیع ہوتا ہے۔ ترقی پسند
ناقد اگر جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دیتے
ہیں تو یہ ان کی فراخ دلی ہے اور اس بات کا ثبوت
بھی کہ وہ تازہ ہوا کے جھونکے کے لیے اپنی کھڑکیاں کھلی
رکھنے کے حق میں ہیں۔

۶۔ ملک و قوم کی تعمیر میں جدید ادب بہت اہم کردار ادا
کر سکتا ہے۔ مگر چونکہ نعروں کو نگارشات میں جگہ
دینا ادب کے بنیادی منصب کے خلاف ہے اس
لیے ایک طرح کا نفسیاتی ماحول تیار کیے بغیر کوئی چارہ
نہیں، جو ماحول اتفاق سے خود بہ خود تیار ہو رہا ہے۔

۷۔ "ادب ناپسندیدہ جذبات کے پرامن اخراج کا ذریعہ
بھی ہے" کہنا زیادہ صحیح ہے۔ "بھی" کے لفظ کے اضافے
سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ادب میں پسندیدہ جذبات
کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ فرائڈ اور اس کے اسکول کے
نقادوں کی باتیں جزوی طور پر درست ہیں، کلیتاً
نہیں۔ تاہم ایسا ادب بھی سماجی فریضے کا حامل کہلائے
گا جسے آپ مریضانہ ادب کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ادیب
اپنا اظہار، حجابانہ کرتا ہے۔ اگر اس سے یہ وسیلہ
اظہار بھی چھین لیا جائے تو اس کی مریضانہ ذہنیت اظہار
کے ایسے وسائل تلاش کر لے گی جو سماج کے لیے مہلک
اور نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔ مریضانہ ذہنیت کی بات
صرف ان تخلیق کاروں کے لیے کہی گئی ہے جن سے
آپ کو مریضانہ ادب پیدا کرنے کا خطرہ لاحق ہے۔

ڈاکٹر فضل امام

۱۔ جدید ادب کو قدیم ادب سے منحرف، قطعی طور پر نہیں کہا
جا سکتا۔ بغیر ماضی کی تابناکیوں کے جدید ادب میں استحکام

نہیں پیدا ہو سکتا۔ حیاتِ انسانی کی بنیادی اقدار، ہر دور کے ادب میں مشترک رہی ہیں ـــــ اور جدید ادب کو بنیادی اقدار کی بحالی کے طور پر تسلیم کرنے میں کسی بھی باشعور کو تامل نہیں۔

۲۔ زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضے، ادبی ہئیتوں اور موضوعات سے بھی تغیر و تبدل کا مطالبہ کرتے ہیں، کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اور ان ضروریات کے پیشِ نظر وجود میں آنے والی ہئیتی اور موضوعاتی تبدیلیوں کا کوئی بھی منکر نہیں ہوگا۔

۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل قطعی نہیں ہے۔ اس میں تخلیقی ذہن کے بنیادی اوصاف کی کارفرمائیاں بھی شامل ہیں ـــــ

۴۔ ادب تبلیغ نہیں اور نہ ادیب اور شاعر مبلغ۔ بلکہ وہ ابلاغ کا واسطہ ہے۔ وہ دور ختم ہوا جب ادب اور شاعری پیغمبری کہلاتی تھی۔ یہ سب تعریفیں محض جذباتی اور تاثراتی تھیں۔ ادب میں ترسیل و ابلاغ کا اتصال اہمیت رکھتا ہے۔ ترسیل اور تبلیغ کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرنا قطعی درست نہیں ہوگا۔

۵۔ اگر جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دیا جارہا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ـــ لیکن ادب کو بنیادی طور پر ادب ہی ہونا چاہیے اور کچھ نہیں۔ اس لیے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رجحانات اور میلانات قدیم اور جدید ہوتے ہیں ادب نہ قدیم ہوتا ہے اور نہ جدید۔ ادب بہر حال ادب ہوتا ہے۔

۶۔ قوم و ملک کی تعمیر میں ادیب اہم کردار ادا کرتا رہا ہے لیکن ایسا کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں بلکہ فطری طور پر ہونا چاہیے۔ ادب کو کسی بھی نعرے بازی سے ملوث نہیں کرنا چاہیے ـــــ خواہ وہ مخصوص ہو یا محدود۔ کسی بھی ادب کو سماج، ملک، عہدِ زندگی اور قوم سے علاحدہ کر کے نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

۷۔ ادب کی جتنی بھی تعریفیں کی گئی ہیں اور مستقبل قریب اور بعید میں جتنی بھی تعریفیں کی جائیں گی وہ بنیادی طور پر ادب کی تعریف و تشریح نہ رہی ہیں اور نہ ہوں گی۔ یہ سب کی سب ادھوری اور ناقص ہیں۔ دراصل مختلف نقطہ ہائے نظر سے زندگی کو پرکھنے، سمجھنے اور افہام و تفہیم کی یہ مختلف کاوشیں ہیں "ادب ناپسندیدہ جذبات کے پُر امن اخراج کا ایک ذریعہ ہے"۔ یہ ادب کی کوئی قطعی تعریف نہیں ہے وضاحت اور تشریح کا ایک انداز ہے۔ زندگی کا صحت مند، اور توانا ہونا لازمی ہے اور ادب کا بھی زندگی کی صحت مندی سے اثر پذیر ہونا ناگزیر ہے۔

خبرنامہ (بقیہ ۴۹)

(بقیہ ۴۹)

کا مجموعہ ہے جسے آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے شائع کیا ہے۔

ہندی شاعری میں ایک ہزار روپے کا انعام جودھپور کی ڈاکٹر ساوتری ڈاگا کو ان کی کتاب "سندر بھوں سے کٹے ہوئے" پر دیا گیا ہے۔ افسانہ ناول وغیرہ اور سنسکرت زبان و ادب میں اکیڈیمی انعامات اس سال کسی کو نہیں دیے گئے۔

مائیں تندرست ہوں تو بچے بھی توانا ہونگے

ماں اور بچے کی تندرستی کیلئے
ہیلتھ سینٹر میں آیئے

تبدیلی

م۔ق۔خاں

ہم ایک سبک خرام مچھلی نما کشتی پر سفر کر رہے تھے۔ کسی قسم کی پریشانی کا احساس تک نہیں تھا۔ پُر سکون سطح آب پر کشتی بغیر کسی نقل و حرکت کے کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی ایک دلفریب سرسراہٹ، جیسی کہ نسیم سحری کے لمس سے محسوس ہوتی ہے ضرور ہمیں محظوظ کر جاتی تھی۔ دُور دُور تک نہ کہیں کناروں کا نشان تھا نہ کسی دوسری کشتی کا۔ خاموشی کے اس طلسم کو چاقو کے پھل جیسی سفید مچھلیاں اُچھل کر توڑ دیتی تھیں۔

ہم محوِ سفر تھے کہ یک بہ یک ایک لکۂ ابر اس کشتی کے قریب جُھکا اور دوسرے ہی لمحہ یہ مچھلی نما کشتی ہوا میں معلق تیرنے لگی۔ چاروں طرف سحور کن کہرا سا فضا میں لٹک رہا تھا۔ چاند کا چہرہ فق تھا اور چاندنی باسی پھول کی طرح کملائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ لیکن ہر شئے کے خدوخال صاف نظر آرہے تھے ——— فرق صرف اس قدر تھا جیسے آئینے پر بخارات کی ایک ہلکی سی تہہ جم گئی ہو۔ اس جھاگ کی فضا پر سوار میں تھا اور دوسرے ہم سفر، ہم نشیں میرے دوست تھے جو قدرتی مناظر میں منہمک تھے۔

منظر بھی عجیب تھا! سبز پتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بکھرا پڑا تھا۔ تاحدِ نظر ہریالی ہی ہریالی تھی ——— لیکن یہ پتّے بے جان تھے ——— وہ بے حس و حرکت سحر زدہ جیسے نیرنگیٔ آسمان کی جانب اپنی پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے عریض و بسیط جنگل میں کسی متنفس کا پتا تک نہ تھا۔ میں نے ساری زندگی میں ایسے ویران جنگل نہیں دیکھے تھے بلکہ میں نے ایسے منظر کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میرے قریب بیٹھے میرے ہم سفر جن کے چہرے پر ہمیشہ مردانہ رعب و جلال سا رہا کرتا تھا خاموش بیٹھے عجیب تفکر آمیز نظروں سے کبھی میری جانب دیکھتے اور کبھی اُس بیکراں ویرانی کی جانب جس کی سبزی نقشے پر رنگے سمندر کی طرح تھی۔

معاً میری نظر ایک اونگھتے شیر پر پڑی۔ دوسرے ہی لمحہ ایک ہرنی چوکڑی بھرتی ہوئی آئی اور اس شیر کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی جانب غور سے دیکھنے لگی۔

شیر نے شکار کی بو سونگھتے ہی اس پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ اس کے پورے جسم میں اینٹھن ہونے لگی۔ اس کی دم عجیب پیچ و خم کھا رہی تھی۔ اس کے آس پاس آندھی کا سا سماں تھا۔ خون آشام آنکھیں دہکتے انگاروں کی مانند چمکنے لگیں اس نے غصے سے اپنے اگلے پنجوں کو زمین پر پٹک کر گرجنے کی کوشش کی لیکن اس کا حلق آواز پیدا کرنے سے معذور تھا۔ بغیر دانت کے کھوکھلے جبڑے اس کی بیچارگی کا اعلان کر رہے تھے۔

غیر ارادی طور پر اچٹتی ہوئی میری نظر ہم سفر کے چہرے پر گئی ——— مایوسی کی تصویر بول اُٹھی ”میاں بھائی! عجیب سانحہ ہے! حکما، ڈاکٹر، وید سب کی کوشش رائیگاں گئی!“

دوسرے ہی لمحہ میں نے ایک زلزلہ سا محسوس کیا اور ہماری سواری قلابازی کھاتی ہوئی زمین پر گرنے کو تھی کہ میری نیند ٹوٹ گئی۔ میں دیر تک سکتہ کے عالم میں لیٹا

معروف گنج ——— گیا ——— بہار

خلاء میں دیکھتا رہا۔
یادوں کے اُفق پر ایک اور تصویر اُبھرنے لگی۔ اس کی بیوی کے الفاظ کی بازگشت کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے بھری کچہری میں صاف صاف کہا تھا "ان میں سے ایک بھی ان کا بچہ نہیں ہے۔ آپ خود ان سے پوچھ سکتے ہیں" اور اس کے حلق میں اس کا تھوک سوئی کے سوراخ میں اونٹ ہوکر رہ گیا تھا۔

ایک خواب اور ایک یادگار واقعہ کا ذکر میں نے من وعن کر دیا۔ اور اب سنیئے حالِ دل ....!

اسی وقت میرے پاس سوئی میری بیوی نے اپنے بازو میری گردن میں حائل کر دیئے۔ میرے من کی کشتی کے بادبان میں ہوا بھرنے لگی۔ جی میں آیا کہ اُسے میں اپنے حلقۂ بازو میں سمیٹ لوں ...... ! میرے ہم سفر ایک جانب اور دوسری جانب وہی تصویر آکھڑی ہوئی —— دونوں نے میرے بازو پکڑ لیے۔ ان لوگوں نے سرگوشی میں کہا"...... "میں کچھ سُن نہ سکا۔ ادھر میری بیوی کی گرفت سخت ہوتی جارہی تھی —— اور ادھر میرے دل کے اندر ایک عجیب خوف کی لہر دوڑ رہی تھی۔ وہ اپنی ویران نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے تنبیہہ کے سوتے اُبل پڑے تھے۔

میں نے ان کی نظروں کو نظرانداز کر دیا۔ اپنی ساری طاقت یکجا کی، احساسِ خفتہ کو تازیانے لگائے —— لیکن —— خواہشوں کے جنگل میں دنداں شکستہ شیر اونگھتا رہا —— اس کے جذبات پر سنگساری ہو چکی تھی —— وہ اپاہج اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے معذور تھا —— یہ کیوں ہوا ؟ کیا سے کیا ہو گیا؟ کہنا مشکل ہے۔

یہ حادثہ میرے خواب کی تعبیر ہے یا یادداشت کی پیش گوئی ؟

خواب کی تعبیر اکثر اُلٹی ہوتی ہے نا —— ؟ جب ہم دوسروں کو مبتلا دیکھتے ہیں تو خود بھگتتے ہیں۔

▲▲

زندہ جسم، مُردہ جسم

شمیم عالم مُصحفی

کبھی کبھی ایک لمحہ، ایک صدی کا احاطہ کرلیتا ہے۔ اور صدی کبھی کبھی لمحہ بھی بن جاتی ہے۔ لمحے اور صدی کے بیچ میرا وجود محصور ہو کر رہ گیا ہے۔

رات صدیوں کا لباس پہن کر مجھ سے ملتی رہتی تھی لیکن ایک رات میرے لیے لمحہ بن کر رہ گئی ——— کیونکہ جو سانپ اپنے اپنے پھن کاڑھے گز بھر لمبی زبانیں نکالے مجھے ایک مدت سے ڈس رہے تھے، میں نے ان کے پھن کچل ڈالے اور ان کی گز بھر لمبی زبانوں کو کاٹ کر فضا میں اُچھال دیا تھا ——— زبانیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خلاؤں میں گم ہو گئیں۔

اگلے دن صبح کے آثار ابھی اچھی طرح نمایاں بھی نہیں ہوئے تھے کہ میں نے اپنے کمرے کی دیواروں سے چند سانپوں کو اپنے اپنے سر نکالے پھن کاڑھے اپنی جانب زہر اُگلتے دیکھا۔ مگر ان کی زبانیں گز بھر لمبی نہیں تھیں زندہ سانپوں کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ عدم سے وجود کی جانب سفر کا ایک طویل متوقع وقفہ کتنا مختصر ہو گیا تھا۔ لیکن میری ساری حیرانی اس وقت کچھ دور ہو گئی جب میں نے غور سے دیکھا اور ان سانپوں کو ان سانپوں سے مختلف پایا جن کے پھن میں نے کچل دیے تھے۔ کیونکہ ان کی زبانیں کافی چھوٹی چھوٹی تھیں ——— سانپوں نے مجھے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گئے۔ اور اپنے اپنے پھن سمیٹ کر بلوں میں لوٹ گئے۔

صدیوں کا بوجھ ختم کر دینے والی دوسری رات بھی میں سکون کی نیند سویا۔ مگر پھر ——— ہر رات میرے لیے صدیوں کا بوجھ لے کر آتی رہی، خواب آور گولیوں کا استعمال بھی لا حاصل رہا! ——— بستر کی بے خواب شکنیں ہوتیں اور نہ بل ہوتا، ——— اس رات کے بعد پھر چھوٹی چھوٹی زبانوں والے سانپ ایک ایک کر کے دیواروں سے سر نکالتے رہے۔ اور دن بدن ان کی زبانیں لمبی ہوتی گئیں۔ اور ایک دن وہ آیا جب ان سب کی زبانوں کی لمبائی پہلے والے سانپوں کی زبانوں کی لمبائی سے جا ملی ——— لیکن یک لخت مجھے پھر احساس ہوا کہ یہ سب اُن سانپوں سے بالکل مختلف ہیں، جن کے پھن اس رات کچل ڈالے گئے تھے۔ اور ان کی زبانیں کاٹ کر فضا میں اُچھال دی گئی تھیں۔

پھر ایک دن جب سورج لال پیلی قے کرنے کے لیے اپنے چہرے کے تیور بدل رہا تھا، ——— یک بیک میری نیند ٹوٹ گئی، ——— میں کب سویا تھا خود مجھے پتہ نہ تھا، ——— اور سورج کی تیز روشنی میں میری آنکھوں نے دیکھا، ان سب سانپوں کی زبانیں گز بھر سے بھی زائد لمبی ہوتی جا رہی ہیں، ایک گز، دو گز، تین گز۔ اور یہ سانپ جن کی عمر تین دہائیوں کے اندر ہے۔ اپنی لمبی زبانوں کا دائرہ بنا کر مجھے اور اس کمرے کے دوسرے مکینوں کو محصور کر چکے ہیں ——— اپنا زہر ان کے جسموں میں داخل کرنے لگے ہیں ——— زخمی وجود درد و کرب سے چیخ رہے ہیں، لیکن آوازیں سننے والے کان بہرے ہو چکے ہیں، بولنے والی زبانیں گویائی سے محروم، اور دیکھنے والی آنکھیں بصارت سے عاری ہیں۔ شاید ان تک تریاق، تریاق، تریاق کی مسلسل گونج پہنچ نہیں پا رہی ہے، ——— ایسا لگتا ہے جیسے ہر زندہ جسم، مردہ جسم ہو چکا ہے۔ روحیں اپنی توانائی کھو بیٹھی ہیں، مردہ جسم سے زندہ جسم میں خون کا انتقال مسلسل جاری ہے ——— اور ہر جسم اب مردہ ہوتا جا رہا ہے۔!!

کیا آپ نے بیمہ ایجنٹ سے
رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایل آئی سی کی نئی پرکشش
تین وفادار پالیسیوں کے سلسلہ میں
منی بیک پالیسی
دوسرے پلانوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد رقم کچھ کچھ وقفہ سے ملتی رہتی ہے۔ اور وہ بھی پالیسی کی مدت ختم ہونے سے پہلے۔ اور مدت ختم ہونے پر بھی ساری رقم بیمہ کے لیے جوکھم برقرار رہتا ہے۔
ویلتھ اینڈ کوور پالیسی
ہر پانچ سال پر ادائیگیوں کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ اور کل رقم بیمہ پر بونس بھی ملے گا۔ ساتھ ہی زندگی بھر سلامتی بھی ملے گی۔
پروگریسیو پروٹیکشن پالیسی
ایک مقررہ مدت پر پالیسی کی رقم میں اضافہ ہوگا اور اس کے لیے نئے پروپوزل یا ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت نہیں
وقت بدل رہا ہے۔ ضرورتیں بدل رہی ہیں
لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

نظمیں

شاہین بدر

حادثہ

چاند سا چہرہ کھلا تیرہ شبی کے دشت میں
اور ستاروں کی طرح
ہو گئیں یادوں کی کلیاں بے قرار
وقت کی سولی پہ ہے لٹکی ہوئی زندہ دلی
اپنے اندر ٹوٹتا جاتا ہوں میں
آئینہ خانے میں ماضی کے، کئی تصویریں ہیں
ایک میں ملتی ہے رشتے کی جھلک
دوسرے میں ربطِ باہم کی مہک
ہے وہی موسم، وہی ارض و سما
ہوں مگر میں اجنبیت کا شکار
میز کے نیچے پڑا ہے اک کھلونا کانچ کا ٹوٹا ہوا!

ۂۂ

مجیب اے غضنفر

ڈگریاں

کانوکیشن گراؤنڈ میں کل
اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ڈگریاں
ان کے چہروں پہ کتنی تھیں شادابیاں
اور آنکھوں میں کیسی چمک تھی مگر
آج چہروں کی پونجی لٹائے ہوئے
اور آنکھوں میں ویرانیوں کا سمندر لیے
دوڑتے پھر رہے ہیں اِدھر سے اُدھر
راستے میں
کبھی یہ تمنا کہ رکشے کی ہینڈل پکڑ لیں
کبھی سر پہ چھینکا اٹھانے کی خواہش
کبھی آرزو
شو برش بوٹ، پالش لیے بیٹھ جائیں
مگر کیسے آ کر یں
ہاتھ میں ڈگریں

ۂۂ

اب بھی

میرے نام نہیں ہوگا کچھ
مجھ کو یہ معلوم ہے پھر بھی
خاکی تھیلا دیکھ کے اب بھی
دِل میں آس سی بندھ جاتی ہے

ۂۂ

○ پورب سرائے روڈ۔ مونگیر ۸۱۱۲۰۱
○ ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

نظمیں

سلمیٰ فردوس نقاش

فرار

اژدھے کی مانند
تاریکی کے غار منہ کھولے کھڑے ہیں
بے دھڑک چلے آؤ
یادوں کے لوبان بجھ چکے ہیں
لیکن ——— اب بھی
اٹھ رہا ہے درد کا دھواں
زندگی کراہ رہی ہے
تمہارے پاؤں میں جو زنجیریں ہیں
توڑ دو ان کو ، اور پھر
آؤ ——— اپنی ہستی مٹا کے
اس تاریکی میں ہو جاؤ تحلیل !!

▲▲

فاصلہ

آسیب زدہ راتوں میں
زرد زرد سا چاند ہے سہمے سہمے تارے ہیں
کائنات پہ
سکوتِ مرگ طاری ہو گیا
کوئی آواز ہی نہیں
فقط دل کے دھڑکنے کی صدا آرہی ہے
وہاں دوارے پہ موت کھڑی ہے
یہاں بند کمرے میں
زندگی کی چند اُکھڑی اُکھڑی سانسیں ہیں
حیات و موت کا فاصلہ
جو طویل بھی ہے اور مختصر بھی
کون جانے ——— ؟
کون جانے کس گھڑی کس پل میں یہ فاصلہ مٹ جائے !!

▲▲

غزلیں

ایاز جھانسوی

اُبھرتے ڈوبتے سورج، یہ فاصلہ کیوں ہے
وہ میرا سایہ ہے مجھ سے مگر بڑا کیوں ہے

ہر ایک شخص یہی بات سوچتا کیوں ہے
وہ جس مقام پہ ہے، کوئی دوسرا کیوں ہے

نہ صاف دل نہ کھلے ذہن ہیں تو پھر یارو
یہ ساتھ بیٹھنے اُٹھنے کا سلسلہ کیوں ہے

ہمارا حال ہمارا مزاج برسوں سے
وہ جانتا ہے مگر سب سے پوچھتا کیوں ہے

نہ اپنی فکر نہ اپنا خیال ہے اُس کو
وہ اِس قدر مرے بارے میں سوچتا کیوں ہے

ہم اپنے گھر میں جب آئے تو یہ ہوا احساس
تمام شہر میں گرد و غبار سا کیوں ہے

عجب نہیں کہ ہو دونوں کا ایک حال ایاز
ہماری طرح کوئی راہ میں کھڑا کیوں ہے

▲▲

محسن جلگانوی

جاگتے زخموں کا انعام ملا ہے مجھ کو
ہر نفس زیست کا الہام ہوا ہے مجھ کو

دعوتِ کام و دہن مجھ کو نہ دیں اہلِ طرب
نشۂ تلخیِ ایام سِوا ہے مجھ کو

اپنے بن باس کا قصہ میں سناتا کس کو
شہر میں جو بھی ملا رام لگا ہے مجھ کو

اس نے چاہا تھا وہ اپنے میں چھپالے خود کو
چہرہ چہرہ وہ بہر گام ملا ہے مجھ کو

میں ہوں پیغمبرِ تہذیب مرے پاس آؤ
بخش دوں تم کو جو پیغام ملا ہے مجھ کو

مجھ سے واقف تھا بہت شہر نگاراں محسن
اور پھر اُس نے بھی بدنام کیا ہے مجھ کو

▲▲

نصیر پرواز

خود اپنی راہ سے ہو کر کبھی گزر جاؤں
روایتوں کے دلوں میں غبار بھر جاؤں

ہر اک قدم ہے مرا عمر بے اماں کا عذاب
ٹھہر سکوں تو کسی موڑ پر ٹھہر جاؤں

کسی سے رشتۂ اُمید بھی نہ باندھ سکوں
میں سر جھکائے ہر اک راہ سے گزر جاؤں

مرا وجود کہ گرتی ہوئی کوئی دیوار
کہیں وہ ہاتھ لگا دے تو میں بکھر جاؤں

ہوں اجنبی تو کسے اپنا آشنا جانوں
جو خود سے توڑ لوں رشتہ تو پھر کدھر جاؤں

کہیں وہ میری بصیرت نہ چھین لے پرواز
لیے ہوئے ہیں جسے ساتھ در بدر جاؤں

▲▲

غزلیں

شان بھارتی

پڑی وہ زد کہ نگاہوں کا حوصلہ ٹوٹا
تمہارے عکس کی جھلمل سے آئینہ ٹوٹا

زمین شق ہوئی آنکھوں میں بھر گیا سورج
ہمارے سر پہ اچانک وہ حادثہ ٹوٹا

گجر کا شور، اذاں کی پکار کیا کہیے
خدا سے میرے تکلم کا سلسلہ ٹوٹا

قریب و دور سنائی دیا نہ شور کوئی
بساطِ دل پہ وہ خاموش حادثہ ٹوٹا

ہماری فکر حدِ آسماں سے آگے تھی
مگر کبھی نہ روایت سے واسطہ ٹوٹا

تغیرات کی رو کب رکی ہے رکنے سے
ہر ایک دور میں لمحوں کا زاویہ ٹوٹا

زمانہ شان مخالف جو ہے تو ہو لیکن
شراب و شعر سے کب اپنا واسطہ ٹوٹا

اسلام پرویز

اس امتحاں میں بھی پورا اتر گیا ہر شخص
خود اپنے خوں میں نہا کر نکھر گیا ہر شخص

نہ جانے کون سی آہٹ پہ ڈر گیا ہر شخص
یہ کیا ہوا کہ اچانک بکھر گیا ہر شخص

فسردہ شام میں یوں رینگتے ہیں سناٹے
کہ جیسے موت سے پہلے ہی مر گیا ہر شخص

اندھیری رات میں انجان سسکیوں کی صدا
جو آئی کانوں میں یک لخت ڈر گیا ہر شخص

دکھائی دیتا نہیں دور دور تک کوئی
میں کس سے پوچھوں کہ آخر کدھر گیا ہر شخص

مرے خیال میں پرویز یہ بھی ٹھیک ہوا
خود اپنی ذات کی تہہ میں اتر گیا ہر شخص

صفدر

یہاں سڑک کا قرار زخمی
اٹھے سب شہ سوار زخمی

ہوا پہ ہیبت ہے قہقہے کی
گلی میں چلتی قطار زخمی

ہماری آنکھیں لہو لہو ہیں
ہرا بھرا سبزہ زار زخمی

نہتا ہی تھا پہ کر گیا وار
کہ ہو گیا وہ فرار زخمی

مرے گلے پر چمکتی شہ رگ
تو اس کے خنجر کی دھار زخمی

ادھر وہ موجوں کی مار پہ تھے
ادھر میں دریا کے پار زخمی

○ پوسٹ، بھجوا دھنباد - بہار
○ ڈاکخانہ مہسول - سیتامڑھی (بہار)
○ اردو ہائی سکول، دارود، ضلع امراوتی (ایم۔ پی)

تبصرہ و تعارف

زبان اور قواعد

رشید حسن خاں ہمارے ان اہلِ قلم میں ہیں جن کا علم بھی وسیع ہے اور مطالعہ بھی ۔ انھوں نے جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس کا حق ادا کر دیا ہے اور موضوعات بھی ایسے چنے ہیں جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں ۔ کچھ مدت پہلے "اردو املا" کے نام سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو املا اور اس کے متعلقہ مسائل کا پورا احاطہ کرتی ہے اور صحتِ املا کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس ضمن میں عملی تجاویز بھی پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد زیرِ نظر کتاب "زبان اور قواعد" ان کی دوسری اہم علمی تصنیف ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور اسے اس اعتبار سے اوّل الذکر کا تتمہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر اُس میں صحتِ املا کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے تو اس میں صحتِ الفاظ کا مسئلہ بطورِ خاص زیرِ بحث آیا ہے ۔

"زبان اور قواعد" بظاہر خانصاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے لیکن یہ سبھی مضامین چونکہ ایک باہمی رشتے میں منسلک ہیں اس لیے اسے ایک خاص موضوع پر مستقل تصنیف ہی سمجھنا چاہیے کتاب کا پہلا مضمون ہے "صحتِ الفاظ" اس کے آغاز میں خان صاحب رقمطراز ہیں " فارسی اور عربی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی، یا اُن کی صورت بدل گئی ہے ۔ یا قیاس کے واسطے سے کچھ نئی صورتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں، تو یہ ساری تبدیلیاں، اردو کے مزاج اور ہندوستانی لہجے کے اقتضا سے، خود بخود عمل میں آئی ہیں ۔ یہ عمل زبان کی حقیقی صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا ثبوت کہ وہ زبان زندہ ہے اور متحرک ہے جس زبان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی، وہ ترقی کے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے " یہ وہی موقف ہے جو سید انشا سے لے کر مولوی عبدالحق اور پنڈت دتاتریہ کیفی تک ان تمام اہلِ علم نے اختیار کیا ہے جو اردو کو کسی دوسری زبان کا ذیلی اسلوب نہیں، ایک مستقل زبان سمجھتے ہیں ۔ خان صاحب نے ان تمام حضرات کے دلائل کو سامنے رکھا ہے ان کے حوالے بھی دیے ہیں اور اردو کی لسانی خصوصیات، اس کے جذب و اخذ کے رجحان اور اس کی صلاحیت تصرّف سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس خیال کو غلط ٹھہرایا ہے کہ عربی اور فارسی کے وہ لفظ جو اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں شامل ہو گئے ہیں، ان کے تلفظ اور معنی کی صحت یا عدمِ صحت کی سند عربی یا فارسی لغات سے لی جائے ۔ خان صاحب نے ایسے بہت سے الفاظ کی نشاندہی بھی کی ہے جو اب اپنی اصل حرکات یا اصل معنی کے ساتھ اردو میں بولے جائیں تو نامانوس تو معلوم ہوں گے ہی لیکن بعض صورتوں میں متکلم کے مافی الضمیر کے اظہار میں بھی ناکام رہیں گے ۔ مثلاً عربی کے الفاظ سیّد، میّت وغیرہ کہ عربی میں ان کی یائے مشدد پر کسرہ ہے مگر اردو میں بہ فتح یائے مشدد بولے جاتے ہیں یا فارسی کے الفاظ فرشتہ، بہشت وغیرہ کہ فارسی میں بہ کسرِ حرفِ اوّل ہیں مگر اردو بول چال میں بہ فتح حرفِ اول ۔ اسی طرح مثال کے طور پر اردو میں ایک لفظ "متلاشی" بطور اسم فاعل

تلاش کرنے والا کے معنی میں مستعمل ہے جو اصل کے لحاظ سے
غلط ہے۔ لیکن اِسے ترک کرکے اگر اس کی جگہ 'تلاشی' کا
لفظ استعمال کیا جائے جو ازروئے اصل صحیح ہوگا تو مفہوم ہی
بدل جائے گا کیونکہ اردو میں 'تلاشی' ایک دوسرے مفہوم
میں استعمال ہوتا ہے۔ ایسے سینکڑوں لفظ ہیں، ان میں سے
بہت سے کثیر الاستعمال الفاظ کی نشاندہی خانصاحب
نے کی ہے۔ اور ان کی صحت وعدم صحت سے بحث کی ہے
ذیل میں ایسے دو لفظوں پر ان کی بحث نقل کی جاتی ہے۔
اس سے کچھ اندازہ ہوسکے گا کہ خان صاحب نے ہر لفظ کے
بارے میں کتنی تحقیق کی ہے اور حوالوں اور سندوں کی
تلاش میں کتنا وقت صرف کیا ہے:

"مشکور: جس طرح 'عادت گیرندہ' کے معنی میں
'عادی' کو غیر صحیح کہا گیا تھا، اور اس کی جگہ 'معتاد'
بولنے کی فرمایش کی گئی تھی، اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ 'مشکور'
بہ معنی ممنون صحیح لفظ نہیں، اس کے بجائے 'متشکر' یا 'شاکر'
کہنا چاہیے۔ مولفین قاموس [قاموس الاغلاط، شائع
شدہ ۱۹۳۶ء] نے لکھا ہے کہ مشکور بہ معنی ممنون صحیح نہیں
اور اس پر اظہار تعجب کیا ہے کہ 'ایک واقف کار شخص
بھی لکھ گیا ہے'، واقف کار شخص سے مراد غالباً مولانا شبلی
ہیں، ان کا شعر ہے:

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں

مولفین آصفیہ [فرہنگ آصفیہ] و نور [نور اللغات]
بھی اس لفظ سے کچھ خوش نہیں:

'اگر ممنون و مشکور کی بجائے ممنون و شاکر کہیں تو
بجا ہے' (آصفیہ)

'اہل علم اس معنی میں استعمال نہیں کرتے۔ مشکور،
صفت اس شخص کی ہوگی جس نے احسان کیا ہے،
نہ اس شخص کی جس پر احسان کیا گیا ہے' (نور)

عربی قواعد کے لحاظ سے لغت نویسوں کا فیصلہ
بالکل صحیح ہے، لیکن ایک دوسری زبان ان قواعد کی پابند
کیوں ہو۔ 'مشکور' بہ معنی شکر گزار، آج بھی برابر
استعمال ہوتا ہے اور پہلے بھی بے تکلف استعمال کیا
گیا ہے۔ مولف نور نے لکھا ہے کہ اہل علم اس معنی
میں استعمال نہیں کرتے۔ 'اہل علم' ہی میں سے ایک
ممتاز فرد کا یہ قول ہے:

'عربی میں 'مشکور' اس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ
ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے ہیں
جو کسی کا شکریہ ادا کرے۔ اسی لیے بعض عربی کی قابلیت
جتانے والے، اس کو غلط سمجھ کر، صحیح لفظ 'شاکر' یا 'متشکر'
بولنا چاہتے ہیں مگر ان کی یہ اصلاح شکریے کے ساتھ
واپس کرنا چاہیے'

مولانا سید سلیمان ندوی (نقوش سلیمانی، ص ۹۴)

پنڈت دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے:

'جب 'عادی' اور 'مشکور' مدتوں سے 'عادت
گیرندہ' اور 'احسان مند' کے معنی میں استعمال ہورہے
ہیں اور متکلم اور سامع دونوں کا ذہن انھی معنی کی
طرف جاتا ہے تو اب قاموس اور صراح سے فتوے
کر، ان الفاظ کو اردو سے خارج کرنے میں کیا مصلحت
ہے؟' (منشورات، ص ۱۶۴)

اتمام حجت کے طور پر دو چار مثالیں بھی پیش کی
جاتی ہیں:

رنگ رنگ اطعمہ ہیں بذل، پھر اس درجہ وفور
کیا خداوندی ہے اللہ، خدائی مشکور

میر (کلیات، مرثیۂ آسی، ص ۷۳۷)

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں

شبلی (کلیات نظم اردو ص ۱۲۰)

جو کچھ ہوسکے وہ لکھا کر داور ممنون و مشکور کیا کرد

امیر مینائی (مکاتیب امیر مینائی، مرتبہ
احسان اللہ خاں ثاقب، طبع دوم، ص ۱۷۰)

ان کے سبب سے میں آپ کا نہایت ممنون و مشکور

ہوں۔

سرسید (مکاتیبِ سرسید، مرتبہ مشتاق حسین ص ۲۷۴)

آپ کا خط پہنچا، میں ممنون و مشکور ہوا

سید حسن بلگرامی (تاریخِ نثر اردو ص ۵۹۸)

خادم آپ کی عنایتِ بے غایت کا حد درجہ ممنون و مشکور ہوا۔

ابوالکلام آزاد (مرقعِ ادب، ص ۴۵)

رشک [شاگردِ ناسخ] نے ایک جگہ 'شکور' اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

شکر خدا کہ عشقِ بتاں میں شکور ہوں
راحت ملی، جو رنج مجھے یار سے ملا

(مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۶۹)

'شکور' نام کے طور پر مستعمل ہے مگر اس معنی میں اس نے رواج نہیں پایا۔

معتوب: مدمّغ، مفلوک، معتوب، مرغن جیسے بہت سے لفظ، عربی الفاظ کے قیاس پر بن گئے ہیں اور قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔ قواعد کی عینک لگا کر دیکھیے تو یہ سب لفظ غلط نظر آئیں گے۔ مولفینِ قاموس نے ایسے سبھی لفظوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے اس ضمن میں لفظ 'معتوب' پر سب سے زیادہ عتاب کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی بجائے صحیح لفظ 'معاتَب' استعمال کرنا چاہیے ... ذیل میں دو فقرے نقل کیے جاتے، ان میں 'معتوب' کو 'معاتب' سے بدل کر دیکھیے:

ملا صاحب دربارِ اکبری سے معتوب ہوئے

مولانا شبلی (شعر العجم، سوم، ص ۴۷)

وہ جرمِ بغاوت میں خود معتوب تھا

محمد حسین آزاد (دربارِ اکبری، اشاعت لکھنؤ ص ۳۱۳)

مجموعۂ نظمِ حالی (اشاعت مطبع العلوم علی گڑھ، ۱۸۹۶ء) میں مولانا حالی کا ایک شعر یوں ہے:

دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب وہاں
اور سماے آمال ہوتے ہیں مصلوب وہاں

اس شعر میں لفظ 'معتوب' پر مولانا حالی نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

صحیح لفظ 'معاتب' ہے مگر اردو میں بجائے 'معاتب' کے 'معتوب' بولا جاتا ہے، جیسے بجائے 'معفو' کے 'معاف'۔ پس اردو میں یہی صحیح اور یہی فصیح ہے۔

اس ضمن میں مولفِ لغت نامۂ دہخدا کا یہ قول ہمارے سامنے رہنا چاہیے:

مابوزنِ صیغِ عربی از لغاتِ فارسی چیزہا ساختہ و بکار بردہ ایم و گاہ عرب قدیم و معاصر را نیز باستعمال آن واداشتہ ایم، مثل نزاکت از نازکی و فلاکت و مفلوک و مفالیک از کلمۂ فلک زدہ

(لغت نامۂ دہخدا، جلد ۴، ص ۳۰۴)

مولفِ لغت نامہ نے جس تصرف کا ذکر کیا ہے اس کا اطلاق اردو پر بھی ہوتا ہے۔ فارسی کی طرح اردو میں بھی اس طرح کے بہت سے لفظ مستعمل ہیں۔ ان میں سے کچھ لفظ فارسی سے ہم کو بنے بنائے ملے ہیں (جیسے مفلوک، نزاکت، فلاکت وغیرہ) اور کچھ اردو کی صلاحیتِ تراش خراش کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ایسے سب لفظ اردو کے سرمایے کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔ ان سے اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا ہے اور اداے مفہوم کے لیے نئے نئے وسیلے ہاتھ آئے ہیں۔

'معتوب' آصفیہ میں موجود نہیں۔ اس میں صرف 'معاتب' ملتا ہے۔ اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولفِ آصفیہ کی رائے میں بھی معتوب قابلِ قبول نہیں۔ البتہ نور میں یہ لفظ موجود ہے مگر اس میں کوئی سند نہیں پیش کی گئی ہے۔ رشک نے ایک غزل میں جس کے قوافی تب اور لب ہیں، معاتب بھی نظم کیا ہے وہ شعر مع مطلع یہ ہے:

سادگی سے سبزۂ رخسار انسب ہو گیا
کیا مزلعت ہوتے ہی چہرہ مرتب ہو گیا

جب نہ تب نکلا کیا مجھ پر زمانے کا بخار
جس کو غصہ جس پہ آیا میں معاتب ہو گیا
(مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۴۳)

قواعد کی رو سے لفظ صحیح ہے مگر کس قدر اجنبی بلکہ غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔"

یہ دو لفظ بہ طور مثال نقل ہوئے، خانصاحب نے ہر لفظ کے بارے میں اتنی ہی مفصّل اور نتیجہ خیز گفتگو کی ہے۔

غور کیا جائے تو اس طرح کے الفاظ میں ایک معمولی فرق نظر آئے گا، مثلاً جو لفظ عربی کے کسی اسم فاعل یا اسم مفعول کے انداز پر بنے ہیں اور یہی فائدہ دیتے ہیں ان کے بارے میں بہت سے لوگوں کو تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ان لفظوں نے کب اور کس طرح جنم لیا اور زبانوں پر رواں ہو گئے لیکن ایسے لفظ جو مثلاً بنے تو ہیں اسم مفعول کے قیاس پر لیکن معنی اسم فاعل کے دیتے ہیں یا عربی کا اسمِ مفعول ہیں اور اردو میں برعکس معنی میں استعمال ہونے لگے ہیں، شعوری طور پر انھیں قبول کرنے میں زیادہ تامل ہوتا ہے۔ لفظ "مشکور" اسی ذیل میں آتا ہے۔ بہرحال اب ضرورت اس کی ہے کہ ایسے تمام لفظوں کو اردو کے الفاظ کی حیثیت سے اردو لغات میں جگہ دی جائے اور ان کے ردّ و قبول کی پرانی بحثوں کو ختم کیا جائے۔

کتاب کا دوسرا مضمون "مشترک الفاظ" ایسے لفظوں سے بحث کرتا ہے جن میں تذکیر و تانیث کا جھگڑا پایا جاتا ہے ان میں سے بیشتر الفاظ اس ضمن میں دلی اور لکھنؤ کے اختلافات کو ظاہر کرتے ہیں بعض لفظ ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں غلط طور پر یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ دونوں طرح مستعمل رہے ہیں۔ خانصاحب نے ایسے بہت سے الفاظ کی فہرست دیتے ہوئے ایسے شواہد جمع کر دیے ہیں جن سے ان لفظوں کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے۔

"مختاراتِ امیر مینائی" بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی ابتدا میں خان صاحب نے دلی اور لکھنؤ کے اختلافِ مزاج کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ کڑی فنی پابندیوں، ادبی اور غیر ادبی زبان کے فرق اور بعض الفاظ کے شعری زبان سے اخراج پر زور ابتداءً لکھنؤ والوں نے دیا اور سقوطِ حروفِ علت، اخفا و اعلانِ نون وغیرہ جیسے مسائل بھی وہیں پیدا ہوئے، اساتذۂ دہلی ان معاملات میں زیادہ سخت گیر نہیں تھے، آخر زمانے میں داغ نے ان چیزوں پر زور دیا اور اپنے شاگردوں کے لیے متروکات کی ایک فہرست بھی بنا گئے۔ خان صاحب کا خیال ہے کہ داغ اس طرف دربارِ رامپور سے توسّل اور قیام رامپور کے اثر سے متوجہ ہوئے جہاں شعرائے لکھنؤ کا غلبہ تھا۔ امیر مینائی لکھنؤ اسکول کے شاعر تھے اس لیے انھیں ان تمام مباحث سے گہری دلچسپی رہی۔ اپنے مضمون میں خان صاحب نے ان کے ایسے ہی بیانات کا جائزہ لیا ہے جو ان مباحث سے متعلق ہیں۔ خان صاحب کا خیال یہ ہے کہ ان معاملوں میں زیادہ سخت گیری مناسب نہیں اور جن قاعدوں کی پابندی پر اساتذۂ لکھنؤ بہت شدّت سے زور دیتے ہیں، ان پر وہ خود بھی پوری طرح کاربند نہیں رہ سکے ہیں۔ ترکیبِ مہنّد، سقوطِ حروفِ علت اور اعلانِ نون کے عنوانات سے جو مضامین شاملِ کتاب ہیں، ان میں بھی خان صاحب نے اپنے اسی نقطۂ نظر کی وضاحت عصری صورتِ حال اور اس کے تقاضوں کی روشنی میں زیادہ شرح و بسط کے ساتھ کی ہے۔

کتاب کے دیگر مضامین ہیں "لغت اور استعمالِ عام"، "ملائی اور بالائی" اور "بحر البیان" اول الذکر مضمون کی تمہید خصوصیت سے توجہ طلب ہے جس میں خان صاحب نے اس مسئلے سے بحث کی ہے کہ استعمالِ عام کی وہ کونسی سطح ہے جہاں پہنچ کر کسی لفظ کے تلفظ یا معنی میں واقع ہونے والی تبدیلی کو قبول کیا جا سکے اور لغت میں اس کا

اندراج ضروری ہو جائے ۔ خان صاحب لکھتے ہیں:
" بہت سے لفظوں میں مختلف سطحوں پر طرح طرح کے تغیرات سے دو چار ہونا پڑتا ہے مگر وہ سب لازماً قابلِ قبول نہیں ہو سکتے ... جس طرح عربی و فارسی لغات کی آنکھیں بند کر کے تقلید نہیں کی جا سکتی، اسی طرح استعمالِ عام کے نام پر ہر خوب و ناخوب کو قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں الفاظ کی فہرست مرتب کرنا ہوگی اور نہایت احتیاط کے ساتھ اس پر غور کر کے ہر لفظ کے متعلق الگ الگ فیصلہ کرنا ہوگا"

یہ کام آسان نہیں ۔ اصل سے مطابقت کو نظر انداز کر کے استعمالِ عام کی اس سطح کا تعین بھی خاصا مشکل ہے جسے کسی لفظ کی صحت کا معیار قرار دیا جا سکے ۔ علاقائی اثرات سے لفظوں کے تلفظ میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے ۔

"بحر البیان" بحر لکھنوی، شاگردِ ناسخ کے ایک رسالے کا تعارف ہے جو قواعد اور لغت کے موضوعات سے تعلق رکھتا ہے، اور " ملائی اور بالائی" میں ان دو لفظوں کی تحقیق کی گئی ہے اور دونوں کو صحیح ٹھہرایا گیا ہے ۔

کتاب ترقی اردو بورڈ (ویسٹ بلاک ۸، آر ۔ کے ۔ پورم، نئی دلی) نے شائع کی ہے قیمت سترہ روپے ہے جو واجبی ہے ۔

محمود سعیدی

مانگے کا اُجالا (بقیہ ص۲۶ سے آگے)

سر منڈایا ۔ شہاب کے دو خطِ دنبالے سے زاویہ بناتے ہوئے اُوپر نیچے کھنچے کہ آنکھ مچھلی بن گئی ۔ کاجل سے بھوئیں بنائیں، کنپٹیوں پر گوند لگا جڑاؤ یا کار چوبی ترے بند چپکائے ۔ بانچھ پہ بالائی لب سے ہٹا ہوا مخملی تل ۔ کتھا چونا ملا کر لاکھا پایا! اور سلائی سے ہونٹوں پر باریک خط لاکھے کا کھینچا ۔ اس پر مِسّی کی تحریر سلائی سے دی ۔ جاندار خانے والی نے جوڑوں کے دست بچے حاضر کیے ۔ موسم اور رُت کے اعتبار سے کھلتا ہوا رنگ پسند کیا ۔ پیش خدمتوں نے اُوٹ کر کے پوشاک بدلی مشاطہ نے مدد دی ۔ مشاطہ کا کام مغلانیاں ہی میرے زمانہ میں کرنے لگی تھیں ۔ چاندی کی ہشت پہل انگیٹھی میں سونے کی سلائی گرم کی اور اس پر لٹوں کو لپٹا حلقے بنا چھوڑ دیئے ۔ زلفیں بنائیں کالا دانہ آثار آگ میں ڈالا کہ دیکھنے والیوں کی نظر نہ لگے اور بناؤ میں کھنڈت نہ ہو ۔ چٹ چٹ سر سے پیر تک کی بلائیں لے خدمت کی سرفرازی کا آداب بجا لا آ کے قدموں ڈھائیں دیتی مشاطہ رخصت ہوئی ۔

آغا حیدر حسن دہلوی (سب رس حیدرآباد)

رفتید و لے نہ از دلِ ما (بقیہ ص۵)

ہوئی نظر آتی ہیں، علی گڑھ اور اس کی روایات کے ساتھ ان کی اسی وابستگی اور شیفتگی کی کہانی بیان کرتی ہے ۔

ہم انشاء اللہ جلد ہی صدیقی صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی ادبی خدمات پر تفصیلی مضامین شائع کریں گے ۔

ان سطروں کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ علی گڑھ سے مختار ہاشمی صاحب کے انتقال کی خبر ملی ۔ وہ ایک خوش فکر شاعر اور اردو زبان و ادب کے خاموش خدمتگزار تھے ۔ بہت سے نو واردانِ بساطِ ادب نے ان سے فیض اٹھایا تھا اور فیض رسانی کا یہ سلسلہ ملک کے دور دراز گوشوں تک پھیلا ہوا تھا ۔ پچھلے سال ہی "گردشِ رنگ" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا تھا اور اس پر اتر پردیش اردو اکادمی نے انھیں ایک ہزار کا انعام بھی دیا تھا ۔ وہ دل کے مریض تھے اور موت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہوئی ۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے ۔

21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اس کی ممانعت کرتا ہے۔
davp 76/678

بزمِ احباب

○ آپ کا مکتوب اور سوالنامہ ملا۔
آپ کے بعض سوالات بجائے خود کچھ مفروضات پر مبنی ہیں جن کو معقول دلیلوں کے بغیر تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے پھر یہ کہ سوالات میں جو الفاظ آپ نے استعمال کیے ہیں ان میں سے کچھ تشریح طلب ہیں کچھ بحث طلب۔ پہلے سوال کو ہی لیجیے اس میں جدید ادب۔ قدیم ادب ——— انحراف ——— بنیادی اقدار ——— بحالی ——— یہ سب وضاحت اور قطعیت سے تقریباً مبرا ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سوال صرف اُردو شعر و ادب کی تاریخ سے متعلق ہے تو دیکھنا ہوگا کہ جدید ادب سے آپ کی مراد کیا ہے۔؟ اگر فرض کرلیں کہ جدید ادب سے آپ کی مراد عصر حاضر کا ادب ہے تو سوال ہوگا کہ قدیم ادب کا مفہوم آپ کے ذہن میں کیا رہا ہے میر و سودا سے غالب تک کا ادب یا حالی سے اقبال تک یا پھر ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ۱۹۶۰ء یا اس کے آس پاس کا ادب۔ اگر آپ کے نزدیک یہ سارا ادب جدید یا عصری ادب کے مقابلے میں قدیم ہے تو پھر آپ کے مفروضہ کے مطابق اس کی کچھ "بنیادی اقدار" بھی رہی ہیں جو یقیناً مشترک اور قایم بالذات ہیں جن سے بقول آپ کے عصر حاضر کے جدید ادب میں یا تو انحراف ہوا ہے یا پھر ان کی بحالی عمل میں آئی ہے اگر آپ حالی اور ان کے معاصرین یا ترقی پسند ادیبوں کے سنہ ۶۰ء کے قبل کے ادب کو قدیم تسلیم نہیں کرتے تو اسے جدید ماننا ہوگا۔ لازماً جدید ادب کا انحراف جدید ادب سے نہیں بلکہ میر و غالب کے عہد کے ادب سے ہی ہوگا۔ (اگر انحراف کی بات مانی جائے) یہ سوال بھی بنیادی اہمیت کا ہے کہ آپ عصر حاضر یا گزشتہ پندرہ بیس سال کے ادب کو ہی "جدید ادب" کہنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک جدید اور قدیم کی کسوٹی کیا ہے۔ یقیناً بعد زمانی تو نہیں ہوگی۔ پھر وہ کون سے اوصاف اور عناصر ہیں جو کسی ادب کو جدید بناتے ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ کسوٹی واضح ہے [illegible] اس کی اساس پر ہی آپ نے عصر حاضر کے جدید ادب کو قدیم ادب سے متمایز کیا ہے تو منطقی طور پر یہ بات بھی واضح ہے کہ وہ آپ کے مفروضہ قدیم ادب سے انحراف ہے یا کم از کم اس سے مختلف ہے اس لیے کہ اس کی شناخت کا معیار و کردار دوسرا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اسے قدیم یا پیش رو ادب کی توسیع یا اس کی بازگشت ہونا چاہیے۔ یہاں کچھ کلیدی الفاظ مثلاً "بنیادی اقدار" بھی بحث طلب ہیں ایسا لگتا ہے کہ آپ اُردو ادب میں کچھ بنیادی اقدار کو قایم و دائم سمجھتے ہیں جو کسی درمیانی وقفہ میں اردو ادب سے مفقود ہوگئی تھیں۔ اور اب ان کی بحالی عمل میں آئی ہے۔ یا آسکتی ہے۔ میں آپ سے سوال کروں گا کہ اگر ان بنیادی اقدار کا تعلق بالتخصیص اردو زبان کے ادب سے ہے تو فطری طور پر یہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے مختلف ہوں گی۔ یعنی بنگلہ تامل اطالوی فرانسیسی جاپانی یا روسی ادب کی "بنیادی اقدار"

اردو ادب کی بنیادی اقدار سے علیحدہ پہچانی جائیں گی۔ اگر ایسا ہے تو میں آپ سے ادب سے پوچھوں گا کہ اس اختلاف کے اسباب کیا ہیں محض لسانیاتی اختلاف تو ادبی اقدار کے اختلاف کا سبب نہیں ہو سکتا۔ تو کیا آپ یہ مانتے ہیں یا ماننے لگے ہیں کہ جغرافیائی حالات تہذیبی و سماجی ارتقا کے مدارج یا پھر اقتصادی اور سیاسی نظام کسی زبان کی ادبی اقدار کے تعین میں نتیجہ خیز رول ادا کرتا ہے گویا دوسرے لفظوں میں آپ یہ تسلیم کریں گے کہ ادبی اقدار دائمی نہیں اضافی یا تغیر پذیر ہوتی ہیں اگر یہ صحیح ہے تو سماجی عوامل یا حالات کے بدلنے سے ادبی اقدار کی تبدیلی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال میں عصرِ حاضر کے جدید ادب میں اگر قدیم ادب کی اقدار کی بحالی عمل میں آتی ہے۔ تو وہ جدید نہیں رہتا بلکہ قدیم ہو جاتا ہے میرے نزدیک یہ دعویٰ وہی حضرات کریں گے جو یہ تسلیم کرتے ہوں کہ عصرِ حاضر کی زندگی کا قافلہ مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف بڑھ رہا ہے کم از کم میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

معاف کیجیے گا کہ آپ کے سوالات میں اتنے مفروضے ہیں اور کچھ الفاظ اتنے غیر واضح ہیں کہ ان کا جواب صرف جرح اور بحث کی صورت میں ممکن ہے جسے شاید آپ پسند کریں اور میری مصروفیات بھی مانع ہیں صرف رسید کے طور پر یہ چند سطریں قلم برداشتہ لکھ دی ہیں مناسب یہ ہوتا کہ آپ ایک دو واضح سوالات کرتے اور ان کا سیر حاصل جواب مانگتے۔

بہر حال میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے "تحریک" کے مباحث میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

——— ڈاکٹر قمر رئیس، جنرل سیکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین، دہلی یونیورسٹی دہلی

○ سوالنامہ کے جوابات میں نے بھی رقم کیے ہیں لیکن کچھ ڈھنگ کے نہیں دکھائی دیتے اس لیے صرف دو جواب بھیجنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔

۱ — جدید ادب کے پرستار اس بھرم میں نہ رہیں کہ جدید ادب، قدیم ادب . . . [illegible]

بحالی میں مددگار ثابت ہوگا۔ کیونکہ جدید ادب اور قدیم ادب دونوں کا اسٹائل یکسر مختلف ہے قدیم ادب میں جب بھی کوئی بات کہی گئی تو اسے ایسے پیرائے میں ادا کیا گیا ہے کہ مکمل کر پوری پوری قاری کے سامنے آجاتی ہے اور پڑھنے کے بعد (اس کے زیرِ اثر) وہ محسوس کرتا ہے کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا" اس کے برعکس جدید ادب میں صرف موضوع کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔ نظم ہو یا نثر ہر جگہ "شارٹ کٹ" کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر قدیم شاعر نے خزاں کا ذکر کیا ہے تو اندازِ بیان ایسا ہے کہ خزاں کا نقشہ قاری کی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور خواص ہوں کہ عوام سب پر یکساں اثر ہوتا ہے جبکہ جدید شاعر خزاں کا ذکر کرتا ہے تو سپاٹ لہجے میں چمن میں جھاڑو پھیر کر چلتا بنتا ہے۔ بات کچھ لوگوں کے پلّے پڑتی ہے اور باقی اپنی کم علمی اور بے بضاعتی پر سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔

۵۔ اگر ترقی پسند ناقدین جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دیتے ہیں تو اس میں کچھ ایک نئے عرفان کو دخل ہے۔ جس زمانے میں ترقی پسند ناقدین جدید ادب کو معتوب کرتے تھے وہ زمانہ جدید ادب کے "گھٹنوں کے بل" چلنے کا زمانہ تھا اس وقت جدید ادب میں انگریزی ادب سے استفادہ حاصل کر کے، نئے نئے تجربے کیے جا رہے تھے اور کسی بھی دور کے تجرباتی ادب کو ادب میں جگہ نہیں . . . [illegible]

. . .اتی ادب میں (خالص) ادب
. . .ھائی دیتی ہیں واضح شکل نہیں۔
. . .وں نے اس اندازِ سخن کو
. . .ساتی نالوں کی طرح تھا کہ جس
طرف ذرا سی جگہ ملی، بہہ چلے، لیکن چونکہ اس
والے اس سے قبل قدامت پسند تھے

اور جو یقیناً ان کی گھٹی میں پڑ چکی تھی اور جیسے وہ اپنے طور پر ترک بھی کر چکے تھے لیکن واقعتاً وہ اسے کلی طور پر چھوڑ نہیں پائے تھے۔ اور پھر دھیرے دھیرے جدید ادب کے پرستار قدیم ادب کی نرم ٹہنیوں سے جانے انجانے میں آبیاری کرتے رہے اور جب یہ ادب نکھر کر سامنے آیا تو ترقی پسند ناقدین نے اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دیا۔

—— خلیق الزماں نصرت، دلسا کر وارڈ، سیونی

○ سوالنامے کے جوابات لف ہیں:

۱۔ انحراف ہے۔

۲۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ لیکن موضوعاتی تبدیلیاں شدید قسم کی ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان کوئی بھی تناسب قائم نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ صنعتی سماج کے علاوہ اور کسی سماج میں اور ایسا کوئی ادب دکھائی نہیں دیتا ہے جس میں کہ فرد کو احساسِ تنہائی ہو۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کے ردِ عمل کا ایک پہلو ہے۔ جس میں کہ فرد سماج کا ایک بے بس حصہ اپنے کو سمجھنے لگتا ہے۔ اس ردِ عمل کا دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرد خود کو سماج میں ایک فیصلہ کن قوت کی صورت میں دیکھے۔

۴۔ جن لوگوں کا یہ کہنا ہے جواب تو یہی ہو سکتے ہیں تبلیغ اور ترسیل میں بنیادی فرق ہے۔ تبلیغ کا مقصد سامع اور ناظر کو اپنا ہم خیال بنانا ہوتا ہے اور ترسیل کا مقصد سامع اور ناظر پر اپنے جذبات کا اظہار محض ہوتا ہے۔

۵۔ یہ سوال بھی ترقی پسندوں سے ہی ہونا چاہیے۔ انگریزی روزنامہ ٹریبیون چنڈی گڑھ کے ۱۹ اپریل ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں سرستی شرن کیف کا ترقی پسند ادبا سے ایک انٹرویو شائع ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیب جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع مانتے ہی نہیں۔

(۶) ملک وقوم کی تعمیر میں ادب نے کبھی براہِ راست کوئی کردار ادا نہیں کیا ہے۔ ہاں ایک طویل عرصے کے بعد ہر ایک ادبی تحریک ایک سماجی ماحول تیار کر دیتی ہے۔ جہاں تک نعروں کا سوال ہے ہر ایک فلسفے کے اندر واضح نکات ہوتے ہیں۔ چاہے آپ انہیں نعرہ سمجھ لیں چاہے ادب کی تشریح کے ذرائع۔ تصوف اور بھگتی مارگ دونوں میں واضح نکات موجود ہیں۔ کوئی بھی ادب کسی بھی فلسفے سے متفق یا منکر ہو سکتا ہے۔

۷۔ دل سے نکلی ہوئی کوئی بھی بات ادب میں شامل ہوتی ہے وہ مریضانہ ہے یا صحتمند۔ اس کی ادبی نظریے سے کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ادیب جو کچھ بھی کہے وہ اپنے دل سے کہے اور جو کچھ محض اصول کی موافقت یا مخالفت میں کہا جائے گا وہ محض تصنع ہوگا ادب نہیں۔ اس تصنع کو نہ مریضانہ کہا جا سکتا ہے نہ صحتمند۔

—— رام لال نابھوی، ۱۹-C/2558 چنڈی گڑھ

○ ۱۔ جدید ادب پہلے ادب کی منزل میں آ لے تب کسی موازنے کا سوال پیدا ہوگا۔ ابھی تو وہ ڈکے آدمی کے پیر شدی" کا مصداق ہے۔

۲۔ نہ اس میں کوئی موضوع ہے نہ ہیئت۔ اس لیے آگے کیا کہا جائے۔

۳۔ تنہائی کا احساس ہمیشہ کسی نہ کسی طور پر ادیبوں اور شاعروں کو ہوتا آیا ہے۔ اور شعرا نے اسے نظم بھی کیا ہے۔ انیس نے کہا تھا ؎

یہ بے سبب نہیں خالی گھروں کے سناٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

تخلیقی ذہن کو تنہائی کا احساس مختلف انداز سے اور مختلف حالات میں ہوتا آیا ہے۔ اس میں نہ صرف صنعتی پھیلاؤ کو دخل ہے نہ سماجی نظاموں

سے نسبتی تعلق کو یہ سب جدیدیوں کی ذہنی اپج ہے اور کچھ نہیں۔ اور غالب نے تو جدیدیوں کے اس فلسفہ کو محض ایک شعر سے رد کر دیا ہے

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

۴۔ تبلیغ و ترسیل میں فرق ہی کیا۔ نہ تبلیغ کے بغیر ترسیل ممکن۔ نہ ترسیل کے بغیر تبلیغ۔ ادب ہمیشہ اپنے طور پر تبلیغ و ترسیل کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ مگر اس انداز سے کہ فہم انسانی اسے قبول کر لے۔ نہ اس طرح کہ ؎

کوا اندھیری رات میں دن بھر اُڑا کیا

۵۔ جو ترقی پسند ادیب اور ناقد اب جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع ماننے لگے ہیں۔ وہ بھی شاید جدیدیے ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کسی مصلحت سے۔

۶۔ اچھا ادب ہمیشہ ملک و قوم کی تعمیر کرتا آیا ہے۔ جدید ادب بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ قابلِ فہم الفاظ و تراکیب کا استعمال کرے۔ اور بے معنی نعرہ بازی کو ترک کر کے صالح اقدارِ حیات کی تبلیغ کرے۔ اور ادیب اور شاعر کو سماج سے الگ نہ سمجھے۔

۷۔ ادب پسندیدہ و ناپسندیدہ دونوں قسم کے جذبات کے بیان کا نام ہے (اخراج کا نہیں) ان الفاظ سے ذہنِ لطیف کو تکلیف ہوتی ہے۔
اگر ادب کا کام سماجی زندگی میں پاکیزگی اور حسن لانا ہے تو پھر وہی ادب صحیح معنوں میں سماجی فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ جو صالح روایات اور پاکیزہ خیالات و جذبات کا حامل ہو۔

——— سیّد نجم الدین نقوی، ۱۲۔ اے، فورٹ، رامپور

○ گوپال متل عرف مخمور سعیدی!
سوال نامہ پڑھا ——— اور ادب کے نام پر جو ——— آپ لوگوں نے پورے ہندوستان میں پھیلا رکھا ہے اس پر افسوس آیا۔

بھائی میرے! یہ شریفوں (ترقی پسندوں) کے خلاف اتنا جو الامکھی سا آپ لوگوں کا رویہ کیوں ہے؟۔
اب سوال کے سلسلے میں:

۱۔ جدید ادب ایک ایسا دھوکا ہے کہ اسے آپ دھواں ہی کہہ لیں ——— انحراف یا بنیادی اقدار کی بحالی، یہ ساری باتیں محض افیون ہیں ——— آپ لوگوں نے خواہ مخواہ یہ حدِ فاصل قائم کر لیا ہے ——— کوئی بھی شے زندہ نہیں رہ سکتی اگر اس کے اندر اپنی پرانی بُو نہ ہو ——— ہر نئی بُو، پرانی بساند کی ترقی یافتہ شکل ہے ——— جدید ادب بالکل جدید ہے ——— جیسے کل کا ڈوبا ہوا سورج ——— صبح کو جدید ہوتا ہے۔

۲۔ تنہائی ایک اضافی شے ہے ——— تم لوگ لاہور اور راجستھان چھوڑ کر تنہا ہونا؟ آج کوئی تنہا نہیں۔

۳۔ ناقدوں کی اصطلاح پر جینے والے لوگ گدھے ہوتے ہیں ——— اگر میں کسی کو ماں کی گالی دوں تو یہی تبدیلی ہوگی ——— بشرطیکہ وہ آدمی میرے لہجے کو سمجھے ——— ہیئت اور موضوع ——— ہر بات کہنے کا ایک انداز ہوتا ہے ——— آج بھی کنبھ کرن ——— کنبھ کا میلہ زندہ ہے آج اس پر اگر کوئی نظم یا شعر کہا جائے تو موضوع کے ساتھ ہیئت میں آپ کیا تبدیلی کریں گے؟ ———

۴۔ ہر ادب تبلیغ ہے ———
انیس کے مراثی، اقبال کی نظمیں (مسجد قرطبہ) فیض کی تمام نظمیں، ن م راشد کی تمام باتیں، میراجی کے گیت، فرشتوں کے گیت۔ غزلیں حنفی کی جرس، کمار پاشی کی دلاسہ، عادل کی نظمیں عنقریب ———
ترقی پسندوں نے انسانیت کی تبلیغ کی ہے ——— آپ اپنے پھوہڑپن کی تبلیغ کر رہے ہیں اور اس کو جانیے کہ آئندہ دس پندرہ سال کے اندر اندر

عمیق، ایک طرف —— اور کمار پاشی ایک طرف ہو جائیں گے (یہی جدید ادب کا مذہبی رویہ ہے —— داڑھی اور چٹیا) کیوں کہ آپ لوگ یہی کر رہے ہیں —— حاشیہ برداری —— مولوی اور پنڈت ادب ——

۵۔ جدید ادب —— ترقی پسند ادب

آپ اِس کے سلسلے میں اس قدر پریشان کیوں ہیں —؟ ہر ترقی یافتہ شے جدید ہوتی ہے — اگر ترقی پسندوں نے آپ کی گرہ کشائی نہ کی ہوتی تو آپ ہوتے کہاں؟ —— شکر کریں اب کا کہ منہ میں زبان ترقی پسندوں نے دی —— جدید ادب پسپائی ہے —— نام گنوا دوں پسپا لوگوں کا —— اپنے شہر میں بھی ایک ہے ——

۔ بھگتی اور صوفی تحریک — آخر جہاں کی مٹّی ہوتی ہے وہیں لگتی ہے —— پھر وہی — مذہب — اِس سیکولر اسٹیٹ میں بھی؟ —— بھئی! آدمی کہاں ہے؟ — کرشن یا محمد — کے کردار میں یا —— ایک سچے ہمدرد مرد کے سینے میں؟ —

شاعری کو کرشن اور محمّد —— اصحاب یا اصحاب صوفہ سے کیا تعلق؟ —— خسرو شاعر تھے، اقبال بھی تھے —— غالب کون تھے؟ —— صوفی بھگتی کال والے —— یا ترقی پسند جدید؟ ——

۔ ادب ہمیشہ صحت مند رہا ہے ——

جیسے آپ نے پوری صحت لفظی و ذہنی کے ساتھ یہ سوالنامہ شائع کیا ہے سب سے بڑی صحتمند بات یہ ہے کہ کسی بھی ادیب کو بالکل بے باک ہونا چاہیے —— یعنی یہ کہ میں نے اس سوالنامے کو پڑھنے کے بعد جو محسوس کیا لکھ دیا —— آپ، ظاہر ہے برگشتہ خاطر ہو جائیں گے —— ادب، ادب نواز، اور ادب پسند ہمیشہ ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے ——

ادب، انسانیت ہے، مذہبی انسانیت نہیں، مارکسی بھی نہیں —— ایک آدمی (آدمی) انسانیت ——

یقینی طور پر یہ جوابات آپکے (گوپال مخمور کے لیے) وجہ پریشانی ہوں گے —— مگر ذرا ہمت کر کے شائع کر دیں —— جلد بازی میں املہ وہجے پر غور کرنا جہالت کا ثبوت دیتا ہے ——

—— وہاب دانش رانچی

جنوری ۷۷ء کا تحریک پیش نظر ہے۔ جوگندر پال کا افسانہ، کرشن مراری کے دوہے، خلیل الرحمٰن اعظمی، نو بہار صابر اور عابد مناوری کی غزلیں پسند آئیں۔

جیتے جی تو حرفِ ناگفتہ تھا میں لیکن عروج
موت نے جادو جگایا تو صحیفا بن گیا

عروج زیدی کی غزل کا یہ مقطع پڑھ کر مجھے عابد مناوری کی ایک پرانی غزل یاد آگئی جس میں ایک شعر مندرجۂ ذیل بھی تھا۔

حرفِ ناگفتہ تھا جب زندہ تھا
اب مگر ایک صحیفا ہوں میں

عابد مناوری کی غزل تحریک مئی ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں آپ نے "شیرازہ" کے لیے بھی اسی غزل کا انتخاب کیا تھا۔ ہو سکتا ہے عروج زیدی کی نظر سے یہ غزل نہ گزری ہو اور یہ توارد محض اتفاق ہو مگر خود عروج زیدی کا کلام بھی "شیرازہ" اور تحریک کے مندرجۂ بالا شمارے میں شامل ہے۔ ادبی سوالنامے پر ڈاکٹر مظفر حنفی نے بڑی بالغ نظری سے اظہار خیال فرمایا ہے۔

—— شام بخشی، ماڈل ٹاؤن، کٹھوعہ

مانگے کا اُجالا

عربی کا اثر دوسری زبانوں پر

"دنیا کی اکثر زبانیں خواہ وہ تورانی کی شاخیں ہوں یا آریائی کی کچھ نہ کچھ سامی زبانوں سے متاثر ضرور ہوئی ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی پر ایک سرسری نظر ڈال جائے۔ سامی تمام زبانوں میں الفاظ کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ کیونکہ اسلام پھیلنے کے بعد جزیرۃ العرب میں بولی جانے والی دوسری زبانیں اس میں جذب ہوگئیں علاوہ بریں اس کا دامن علمی خزانوں سے مالامال ہے۔

علماء لغت کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ سامی زبانوں میں کون کس کی شاخ ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ سامی کی بڑی بڑی اصلیں عبرانی، سریانی اور عربی اب تک زندہ ہیں جن میں سے کوئی ایک دوسری کی شاخ نہیں ہے۔ لیکن یہ تینوں ایک اصل کی شاخیں ضرور ہیں جس کو دوآبہ میں بسنے والے سامی بولتے تھے مگر امتدادِ زمانہ سے فنا ہوگئی۔ جن لوگوں نے طوفان کے بعد دوآبہ کی درمیانی سرزمین کو آباد کیا توریت ان کو ارضِ شنعار کے بسنے والے سے تعبیر کرتی ہے۔ اقتضاءِ زمانہ سے اس قوم کے فرقے منتشر ہونا شروع ہوگئے اور ایشیا کی مختلف سمتوں میں پھیلتے چلے گئے جن کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق زبانوں میں ارتقا ہوتا رہا۔ ان مہاجرین میں سے بعض لوگ شام کے ساحلی مقامات پر آباد ہوگئے۔ ان کی زبان جو عبرانی کی ایک شاخ ہے فینقی کے نام سے موسوم ہوئی۔ بعض لوگ عراق عرب میں جا بسے ان کی زبان آشوری کہلاتی تھی جس کی شاخیں سریانی اور کلدانی ہیں۔ کچھ لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب کی سکونت اختیار کی، ان کی زبان ترقی کرکے عربی کہلائی جس کی شاخیں حبشی، حمیری، عدنانی اور قریشی تھیں۔ مؤخر الذکر وہ زبان ہے جس میں کلامِ پاک نازل ہوا اور جس کو ابھی تک عربی بولنے والی قومیں بطور تحریری زبان کے استعمال کرتی ہیں۔

مذکورۂ بالا سامی زبانیں ایک ہی مرتبہ میں نہیں پیدا ہوئیں بلکہ ضرورتوں کے مطابق بتدریج ارتقاء طبعی کے مدارج طے کرتی رہیں۔ ان زبانوں کو سامی سے علیحدہ ہوئے جس وقت تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا، اس وقت آپس میں ایک دوسری سے بہت مشابہ تھیں۔ وہ تمام عربی قبائل جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب، مصر، شام، عراق اور بلادِ مغرب میں آباد ہیں، عربی بولتے ہیں لیکن ایک گروہ دوسرے گروہوں سے جتنا دور ہے اسی تناسب سے اس کی زبان اور دوسروں کی زبان میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن شریف ان سب کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کلامِ پاک نہ ہوتا تو ہر شاخ اپنی جگہ ایک مستقل زبان ہو جاتی اور جس کو دوسری شاخیں بولنے والے سمجھ بھی نہ سکتے جیسا لاطینی زبان کی فرعوں (فرانسیسی، اسپینی، پرتگالی وغیرہ) میں ہوا لیکن عربی بولنے والے قبائل اپنی اپنی زبانوں کی حفاظت کلامِ پاک کے نمونے پر کرتے ہیں اور تحریری زبان میں اس کا اتباع کرتے ہیں جو سب کو ایک اصل پر جمع کیے ہوئے ہے (تھوڑا بہت اختلاف بازاری اور عامیانہ زبانوں میں پایا جاتا ہے۔)

زمانہ قدیم میں جب سام کی نسل منتشر ہوئی اس وقت ان کے پاس کوئی لغت مدون نہ تھی اور نہ کوئی ایسا مرکز تھا جو سب فرعوں کو جمع کیے رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتضاءِ زمانہ نے طبعی طور پر اپنا اثر دکھایا اور ان کی زبانیں شاخ در شاخ

ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ کچھ صدیاں گزرنے پر ہر فرع ایک مستقل زبان بن گئی اور دوسری شاخوں سے مختلف ہو گئی۔ تاہم اگر کوئی شخص چاہے تو اصول و قواعد کی یکسانی جیسے وسائل اس کو مل جائیں گے جن سے وہ اصل تک پہنچ سکتا ہے۔ عربی اور سریانی کی گردانوں اور الفاظ و معانی میں اتنی زبردست مشابہت ہے کہ ان کی اصل ایک ہونے میں شک ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر عہدِ قدیم کے سفرنامے پڑھے جائیں تو یہی معلوم ہوگا کہ پرانے زمانے میں یہ سب زبانیں ایک جیسی تھیں حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا زمانہ آ گیا اور وہ چالیس سال تک دشت سینا اور جزیرہ نمائے عرب میں رہے۔ باوجودیکہ ان کی زبان عبرانی تھی مگر جب عربوں سے ملتے تھے تو ایک دوسرے کی زبان بلا امداد ترجمان سمجھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً اسی واقعہ کو لیجیے کہ ملکۂ سبا، جو عرب کے ایک حصہ کی فرمانروا تھیں (بلقیس) حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام شاہ بنی اسرائیل کی ملاقات کے لیے سنہ ... میں گئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملیں تو دونوں نے بغیر مترجموں کے گفتگو کی۔ ایسے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت تک سامی زبان کی شاخیں ایک دوسری سے مشابہ تھیں۔ غالباً ان کی اصل سے علاحدگی اور استقلال کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔

خلافتِ عباسیہ ترکوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی تھی وہ جس خلیفہ کو چاہتے معزول یا قتل کر دیتے اور جس کو چاہتے خلیفہ منتخب کر لیتے۔ باوجود اس سیاسی اقتدار کے جو انھیں خلافت پر خاص دارالسلام بغداد میں حاصل تھا، اپنی زبان کو عربی اثرات سے نہ بچا سکے۔ ترکی زبان عربی سے خوب متاثر ہوئی اکثر و بیشتر ترکی الفاظ متروک ہو گئے اور ان کی جگہ عربی الفاظ نے لے لی۔ ترکوں نے عربی رسم الخط اختیار کر لیا تھا جو مصطفےٰ کمال مرحوم کے ابتدائی دور تک رائج رہا۔ لیکن مرحوم نے سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو ترک کر کے لاطینی رسم الخط کو رواج دیا۔

ہندوستان میں خلجیوں کے عہدِ حکومت تک عربی کو بڑا عروج حاصل تھا حتیٰ کہ تعلیم یافتہ طبقہ کسی دوسری زبان میں خط و کتابت کرنا بھی معیوب سمجھتا تھا اور فارسی عامیانہ بازاری زبان سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ اس عہد کے بعد عربی کی جگہ فارسی نے لے لی تاہم مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے اس کا وقار قائم رہا۔ اب اردو جو ارتقائی حالت میں تھی، فارسی کے مقابلے پر عامیانہ زبان تسلیم کی گئی۔ باوجودیکہ اردو کی پیدائش اور نشوونما ہندوستان میں ہی ہوئی پھر بھی آریائی زبان سے اتنی متاثر نہیں، معلوم ہوتی جس قدر سامی سے ہے۔

دوسری متاثر ہونے والی زبانوں (جیسے ترکی فارسی وغیرہ) نے صرف الفاظ کی تبدیلی تک عربی کا اثر قبول کیا۔ ترکیبوں کا اس اثر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اردو زبان کے الفاظ اور ترکیبیں دونوں عربی سے اچھی طرح متاثر ہوئے۔ الفاظ کچھ تو اپنی اصلی حالت پر باقی رہے اور کچھ میں تلفظ کا ہلکا سا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اول الذکر کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ جیسے "ہوا"، "آدمی"، "لباس"، "توجہ"، "جاہل"، "صحبت"، "حاکم"، "صورت"، "سلام"، "منصب" وغیرہ۔ مؤخر الذکر کی کچھ مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں۔

عربی (دراز) دہلی (دریے) روہیلکھنڈ (لمبے) ——
عربی (قفل)، لکھنؤ (قلف)، حیدرآباد مدراس (ققل)، عامیانہ (کلف) —— عربی (وقت) دہلی و لکھنؤ (وقت)، پنجاب (وکت) حیدرآباد (وخت)، عامیانہ (وکھت)

ترکیبوں پر عربی اثرات کے چند نمونے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) الف و لام کا استعمال، صرف سامی زبانوں کے لیے مخصوص ہے لیکن اردو میں ہم کو ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں الف لام فارسی اور ہندی الفاظ پر داخل ہوا جیسے قریب المرگ، جوان العمر، فوق البھڑک وغیرہ۔ اس میں مرگ خالص فارسی اور بھڑک ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہیں۔

(۲) "و۔ن" اور "ی۔ن" بڑھا کر جمع بنانا عربی کی خصوصیات میں سے ہے مگر اردو میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، جیسے کمال کی جمع "کمالوں"۔ کمالین۔ سڑک کی جمع "سڑکوں۔ سڑکیں"۔ میز کی جمع "میزوں۔ میزیں"۔

بوتل کی جمع بوتلوں، بوتلیں وغیرہ۔ (عربی میں "ن" کھلی ہوئی آواز دیتا ہے، اردو میں غنہ ہو جاتا ہے اور حروف علت "دری" مجہول ہو جاتے ہیں۔)

(۳) "ات" آخر میں لگا کر عربی کی جمع مؤنث سالم جیسی جمع بنائی جاتی ہے مثلاً۔ بیگمات۔ کھنڈرات۔ باغات وغیرہ۔

(۴) الف یا ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ میں حروف جار عربی کی طرح اپنا اثر کرتے ہیں جیسے "لوٹا۔ یا آملہ" ان پر جب حرف جار داخل ہوگا تو "ا" یا "ہ" یائے مجہول سے بدل جائیں گے اور طویل کسرہ کی صورت پیدا ہوگی۔ لوٹے پر لوٹے میں۔ لوٹے سے۔ لوٹے تک۔ آملے سے آملے پر آملے میں۔ آملے تک یہی صورت حالت اضافت میں بھی عربی کی طرح برقرار رہے گی۔ لوٹے کی ٹونٹی۔ آملے کا مربہ۔

(۵) تنوین کا استعمال بھی عربی ہی سے ماخوذ ہے جیسے۔ اندازاً۔ نمونتاً وغیرہ۔

(۶) آریائی زبانوں کی گردانوں میں تذکیر و تانیث کے لیے الگ الگ صیغے نہیں پائے جاتے "دراو آمد" مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں مستعمل ہے۔ بعض شاخوں میں صرف واحد مذکر غائب، واحد مؤنث غائب تفریق کرنے کے لیے مذکر اور مؤنث کی ضمیریں، بشرطیکہ موجود ہوں، لگادی جاتی ہیں جیسے "HE CAME" اور "SHE CAME" لیکن اردو میں عربی اثرات کے ماتحت مذکر اور مؤنث کے صیغے الگ الگ موجود ہیں۔ جیسے۔ وہ لایا، وہ لائی۔ صیغوں میں تذکیر و تانیث کا فرق سامی زبانوں کے لیے مخصوص ہے۔

فتح ایران کے بعد مشرقی آریائی زبانوں میں فارسی جس حد تک عربی سے متاثر ہوئی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے یہاں تک کہ ایرانیوں نے بھی ترکوں کی طرح عربی رسم الخط اختیار کر لیا۔ موجودہ فارسی لغت میں تقریباً نصف الفاظ عربی کے ہیں جن میں سے کچھ الفاظ فارسی میں کھپ گئے جیسے طلبیدن اور فہمیدن وغیرہ، اور کچھ اپنی اصلی حالت پر قائم رہے جن کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جیسے خطا۔ صواب۔ جنت ساقی۔ انس عشق۔ حسن۔ سجادہ۔ خال۔ اسیر وغیرہ۔

پچھلے دور کی فارسی شاعری میں عربی بھی برابر کی شریک تھی۔ بسا اوقات ایک مصرعہ فارسی میں اور دوسرا عربی میں ہوتا تھا مثلاً حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا
حضوری گر ہمیں خواہی ازو غائب مشو حافظ
متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند
اشہی لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارٰی
شربت نار از کف محبوبہ ام آمد بدست
قلتہا اذا قیل قالت اشرب قد کفاک

یا قرۃ العین طاہرہ کے اشعار ہیں:

اگر آں صنم زرہِ ستم پئے کشتنِ منِ بیگنہ
لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضی
سحر نگار ستمگرم قدمے نہاد ببسترم
فاذا رأیت جمالہ طلع الصباح کانّما
چو شنید نالۂ مرگ من پئے سازِ من شد و برگ من
فشکیٰ علیہ مجد لا و بکی علیہ مجلجلا

مغربی آریائی یا یورپی زبانیں تقریباً سب کی سب سامی لغات سے کم و بیش متاثر ہیں فرانسیسی اور اطالوی زبانوں نے مفتوح ہونے کی وجہ سے عربی کے اثرات قبول کر لیے (مسلمانوں نے فتح اسپین کے بعد فرانس پر حملہ کر کے تقریباً نصف حصہ ملک پر قبضہ کر لیا تھا جو بعد میں ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ صقلیہ (سسلی) کی وجہ سے اٹلی کی زبان عربی سے متاثر ہوئی) انگلستان کے محل وقوع کے لحاظ سے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ انگریزی کسی سامی زبان سے متاثر ہو سکے گی لیکن واقعات نے یہ بتادیا کہ وہ بھی سامی زبان کے عالمگیر اثرات سے نہ بچ سکی۔ عربی الفاظ اسپین سے فرانس میں ہو کر یا اٹلی سے جرمنی میں ہوتے ہوئے انگریزی زبان میں داخل ہو گئے یا حروب صلیبیہ کے دوران میں براہ راست

انگریزی نے اخذ کیے ۔ معرکہ ہائے صلیبی کے دوران میں
ایک مشترک زبان بن گئی تھی جس کو دونوں فریق اظہار
مافی الضمیر کے لیے استعمال کرتے تھے) یورپ کی کل
آبادی بجز چند بت پرست جرمن قبائل کے مذہب عیسوی
کی پیرو تھی۔ اسی بنا پر ان کی مذہبی اصطلاحیں اور گذشتہ
پیغمبروں کے نام عبرانی سے لیے گئے، جن کے تلفظ
میں آلاتِ نطق کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر فرق
ہوگیا۔ (واضح رہے کہ عربی اور عبرانی تلفظ میں کہیں کہیں
برائے نام فرق پایا جاتا ہے) مثلاً : ابراہیمؑ ABRAHAM،
آمین AMEN، عزرائیل AZRAEL، آدمؑ ADAM، بیت اللحم
BETHLEHEM، جمل CAMEL، الیاسؑ ELIJAH
حواؑ EVE، سارہؑ SARAH، شیطان SATAN،
سبط SEPT، سباء SHEBA، سلیمانؑ SOLOMON،
زکریاؑ ZECHARIAH، یروشلم JERUSALEM

نویں صدی عیسوی کی ابتدا میں یورپ میں جہالت
پورے شباب پر تھی۔ مذہبی خانقاہوں سے جو پادریوں
اور اسقفوں کے ہاتھ میں تھیں، درس گاہوں کا کام بھی لیا
جاتا تھا۔ ایسے مدارس یورپ کے بڑے بڑے ممالک
میں پائے جاتے تھے۔ فلسفہ و حکمت کی تعلیم بالکل ممنوع
تھی۔ فلسفہ کی کتابوں پر راہبوں نے قبضہ کر کے جا بجا مذہبی
کتب خانوں میں مقفل کر دی تھیں کسی کو ان کے مطالعہ کرنے
یا نقل کی اجازت نہ تھی۔ (اگر کہیں ان علوم کا کوئی ماہر
نظر آتا تو یا وہ اندلس کے اسلامی مدارس کا تعلیم یافتہ ہوتا یا
جنوبی اٹلی کے مدرسے کا جو مسلمانان سسلی کی کوشش سے قائم
ہوا تھا) سبھی مدارس میں صرف لاطینی اور یونانی زبانیں سکھائی جاتیں
جن کی صرف و نحو میں طلبہ کی عمر کا بیش قیمت حصہ برباد کر دیا
جاتا تھا۔ جب وہ ان زبانوں میں کسی قدر ترقی کر لیتے تو
دینیات کی طرف متوجہ کر دیے جاتے جس کی تعلیم کا اصول زبور، توریت اور انجیلیں تھیں منتہی
طلبہ کو چند دیگر کتب روایات اور غیر مقبول اور مشتبہ
انجیلیں بھی پڑھائی جاتیں جو اپاکریفہ کے نام سے مشہور
تھیں۔ علاوہ ازیں کلیسا کی بہادر تاریخیں، گذشتہ ولیوں
کی سوانح عمریاں، مذہبی کونسلوں کی مفصل اور مشرح رپورٹیں
بھی نصاب میں داخل تھیں۔ یہی علوم تھے جن کو لاطینی
اور یونانی زبانوں میں ان کی پیچیدہ صرف و نحو کے ساتھ طلبہ
پڑھا کرتے تھے۔ اس نصاب نے مدرسوں کی یہ حالت بنا
رکھی تھی کہ نیچے درجوں کے طلبہ لاطینی اور یونانی کی [illegible]
چلا چلا کے ازبر کرتے اور اوپر کے منتہی طلبہ آپس میں الٰہیات
پر مباحثہ کرتے جو کبھی کبھی مکابرہ بلکہ مجادلہ اور مقاتلہ کی صورت
میں تبدیل ہو جاتا۔ ان کو ممانعت تھی کہ سوا ان مباحث کے
کسی عقلی بحث کی طرف توجہ نہ کریں۔

یہ تھا یورپ کی جہالت کا پورا نقشہ۔ اگرچہ بعد میں
مسلمانوں کی بدولت یورپ نے علوم میں خاصی ترقی کر لی،
یورپی قومیں عربوں کی حسب ذیل علوم میں شاگرد ہیں علم الادویہ،
علم ریاضی، ہیئت، طبیعیات، فلسفہ اور طب وغیرہ۔ یہ علوم سپین
سے وسط یورپ ہو کر تمام یورپی ممالک میں پھیلے یورپ کی
زبانوں میں ابھی تک مذکورہ علوم کی اصطلاحیں عربی
ہی کی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے لیے انگریزی کو لیجیے جو
بہ نسبت دیگر یورپی زبانوں کے عربی سے بہت دور
واقع ہوئی ہے۔

الکیمیا ALCHEMY، الکحول ALCOHOL،
الانبیق ALEMBICA، علم الجبر ALGEBRA،
زرنیخ ARSENIC، اصطرلاب ASTORLABE
قیراط CARAT، صفر SYPHER، کعب CUBE
درجہ DEGREE، درہم۔ درہام DRAM، مغناطیس
MAGNET، اہلیلجی OVAL، فلسفہ PHILOSOPHY
دمّل TUMOUR،

عرب تاجروں کے قافلے اکثر سرزمین مغرب میں سامان
تجارت لے جایا کرتے تھے جس میں زیادہ تر مشرقی مصنوعات
اور پیداواریں ہوتی تھیں جیسے حلب کے بنے ہوئے مشہور
آئینے، کشمیری زعفران اور مصری چاول ۔ اس قسم کی تمام چیزوں
کے نام انگریزی میں عربی سے ماخوذ ہیں اگرچہ بعض الفاظ
میں کسی قدر تغیر ہو گیا ہے (کیونکہ وہ فرانسیسی یا اطالوی کی

وساطت سے انگریزی تک پہنچے۔ لیکن تلفظ کی رعایت کر
کے ان کی اصلیت معلوم کی جاسکتی ہے۔ مثلاً عنبر AMBER
انیسون ANISE، عرق ARRACK، بلسان BALSAM
کافور CAMPHIR، قہوہ COFFEE، کمون CUMMIN
فردہ FUR، یشب۔ یصب JASPER، مصطکا
MASTIE، معدن MINE مرآۃ MIRROR
مسک MUSK، نیلوفر۔ نینوفر NENOPHAR،
عطر "OTTO" ODOROUS، فلفل OTTO، فستق،
PISTACHIO، ارز۔ رز RICE، زعفران،
SAFFRAN، سمسم SESAME، شربت SHERBAT
صابون SOAP، شراب SYRUP، تمرہندی TAMARIND
طرخون TARRAGON۔

یورپ سے خوش اعتقاد زائرین بیت المقدس آیا کرتے
تھے اور جن نئی چیزوں سے ان کو واسطہ پڑتا ان کے نام انھیں
یاد ہوجاتے اور سفرنامہ بیان کرتے وقت وہی عربی الفاظ اپنے
تلفظ میں ادا کرتے جو رفتہ رفتہ ان کی زبانوں کے جزو بن گئے۔
مثلاً عرب ARABIA، بدوی BADOUIN، قاضی
CADI، اقلیم CLAIME، قبّہ COPE، جنّی GENN
غول GHOUL، خان KHAN، قریہ KARKAL
منارہ MINARET، مسجد MOSQUE، طریق TRACK

محمد کامل (کتاب نما، نئی دہلی)

مسجد

مسجد صرف عبادت کی جگہ ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی
ہے۔ یہ زندگی گزارنے کا طریقہ پیش کرتی ہے، یہاں
دن میں پانچ دفعہ آس پاس کے لوگ جمع ہوتے ہیں اس
سے ان میں ایک خاص قسم کی یگانگت پیدا ہوتی ہے۔
مسجد میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں امیر غریب،
چھوٹا بڑا، گورا کالا، بادشاہ اور فقیر صفوں میں کندھے
سے کندھا ملاکر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس مساوات کا
تصور بہت مشکل ہے۔

مسجد میں خطبہ ہوتا تھا، یہاں ملکی معاملات پر بحث
اور مشورہ ہوتا تھا، مقدمے فیصل ہوتے اور آپس کے جھگڑے
طے پاتے تھے۔ یہاں تعلیم بھی ہوتی تھی غرض کہ مذہبی، سیاسی
اور معاشرتی لحاظ سے مسجد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔
یہ عبادت خانہ بھی ہے، دارالشوریٰ بھی، عدالت بھی
ہے اور مدرسہ بھی اور بعض وقت مسافر کے لیے ٹھہرنے
کا ٹھکانہ بھی بن جاتی ہے۔

اس کی ابتدا مسجد نبوی سے ہوئی، ہجرت کے بعد
مسلمانوں کا سب سے پہلا کام ایک خانۂ خدا کی تعمیر
تھا جس میں سرکار دوعالم خود شریک تھے۔ صحابہ پتھر اٹھا
اٹھا کر لاتے تھے اور رجز پڑھتے جاتے تھے یہ مسجد ہر قسم
کے تکلفات سے بری تھی اور اسلام کی سادگی کی سچی تصویر
تھی یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، چھوارے کے پتوں کا
چھپر اور کھجور کے تنے کے ستون تھے۔ فرش کچا تھا بارش
میں کیچڑ ہوجاتی تھی۔ یہ تھی مسجد نبوی کی شان جس میں حضرت
بلال کو اذان کا حکم ہوا اور تکبیر کی آواز سے شہر مدینہ کیا سارا
جزیرہ نما عرب گونج اٹھا۔ ظہور اسلام کے بعد جو مسجدیں مفتوحہ
ملکوں میں تعمیر ہوئیں، وہ مذہبی اور دینی فلاح کا مرکز رہیں۔

ابتدا میں مسجد کی تعمیر بالکل سادہ تھی، اس کا نقشہ اس
مکان سے لیا گیا، جس میں آنحضرت مدینہ میں قیام پذیر تھے
یعنی دالان، اس کے آگے چبوترہ پھر صحن، یہ مستطیل دیوار
سے گھرا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں عرب شرفا کے مکان اسی وضع
کے ہوتے تھے۔ صحن میں ناریل کے ستون پر ناریل کے پتوں
کی چھت تھی جس پر گارا کر دیا جاتا تھا۔

بنی امیہ کے دور میں خلیفہ ولید نے مسجدوں میں نمایاں
تبدیلی کی، مدینہ کی مسجد کے ایوان میں بہتر مسالا استعمال کیا
گیا اور صحن کے گرد دالان تعمیر کیے گئے جو آگے چل کر مسجد
کی خصوصیت بن گئے۔ انھی دنوں مستطیل صحن کے بیچ میں
ایک حوض اور اس پر فوارہ لگایا گیا، ساتھ ہی اذان کے
لیے مینار تعمیر کیا گیا، مینار صحن کے ایک کونے میں ہوتا
تھا، بعض جگہ صحن کے باہر چند گز کے فاصلے پر تعمیر ہوتا

تھا، اس کے بعد مسجدوں میں میناروں کا رواج عام
ہو گیا۔

مسجدوں کو شاندار بنانے کے لیے چھتوں پر گنبد
تعمیر ہونے لگے، شروع میں ایک گنبد ہوتا تھا بعد کو
تین بننے لگے، مینار بھی ایک کی جگہ دو بننے لگے، ان سے
مسجدوں میں شان پیدا ہو گئی۔ اس کے علاوہ مینار کا
ایک مقصد عمارت کا استحکام بھی تھا، یہ دو مینار
دالان کے سروں پر بنائے جاتے تھے محراب کے اوپر
وزن ہوتا ہے، جس کے دباؤ سے اس میں کھلنے کا رجحان
ہوتا ہے یہ مینار اس جھوک کو روکنے میں مدد دیتے ہیں۔

مسجدوں کے معاملہ میں ہندوستان کسی مسلمان ملک
سے پیچھے نہیں، یہاں کے شہروں میں بڑی خوبصورت مسجدیں
موجود ہیں، یہاں اسلامی عمارتوں میں قدیم ہندو طرز تعمیر
نمایاں ہے چنانچہ مسجدوں میں بھی یہ اثر سرایت کر گیا ہے
یہاں مسجدوں کی تعمیر میں مندروں کی بعض خصوصیات
نظر آتی ہیں۔ حیدر آباد میں مکہ مسجد اس کی بہت اچھی
مثال ہے، اس کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھر استعمال ہوئے ہیں
جو ہمارے ہاں کی طرز تعمیر کا نتیجہ ہے۔ یہاں کے ستون ایک ڈال
کے پتھر کے ہیں جو دکن کے مندروں میں ہر جگہ نظر آتے ہیں،
اتنے وزنی پتھر دنیا کی کسی مسجد میں شاید ہی استعمال ہوئے
ہوں۔

گولکنڈہ کے قریب قطب شاہی قبرستان میں حیات
بخشی بیگم کی ایک پاکیزہ مسجد ہے، یہاں کی دیواروں کی چنائی
میں پتھر کی پٹیاں باہر کو نکلی ہوئی ہیں جو اچھی معلوم ہوتی ہیں۔
یہ متوازی پٹیاں دور تک چلی گئی ہیں۔ اس قسم کی پٹیاں دکن
کے مندروں میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں، اس مسجد میں یہ
طرز تعمیر مندروں سے لیا گیا ہے۔

ہندوستان خوبصورت مسجدوں سے مالا مال ہے۔
ان میں سب سے خوبصورت دلی کی جامع مسجد ہے جس میں
مسجد کے فن تعمیر کے تمام ارتقائی مدارج موجود ہیں۔ یہ
مسجد ملک میں سب سے بڑی ہے لیکن نفاست اور
نزاکت میں لال قلعہ کی موتی مسجد کا جواب نہیں، سر سے
پاؤں تک اعلیٰ قسم کے سنگ مرمر سے بنی ہے اس کی
منبت کاری دیکھنے کے قابل ہے۔

غلام ربانی (جامعہ، نئی دلی)

دلی کی بیگمات

دلی میں بیگموں کے تین بڑے طبقے تھے اول شہزادیاں
ان میں دو درجے تھے، ایک بادشاہ وقت کی بیگمات
اور بیٹیاں بھتیجیاں۔ دوسرے سلاطین زادیاں کہ جن کے
اسلاف صاحب تخت و تاج رہے تھے۔ یہ بادشاہ کے
بھائی بند بھی کہلاتے تھے ان میں دو درجے تھے ایک تو
وہ جن کا سلسلہ حضرت عالمگیر تک جا پہنچتا اور یہ تو محلے
میں رہتے، ان کی بیگمات تو محلے والیاں کہلاتیں اور
جن کا سلسلہ حضرت بابر بادشاہ تک پہنچتا ہوتا وہ "بڑی بنیاد"
والے کہلاتے اور ان کی بیگمات بڑی بنیاد والیاں اور
جن کا سلسلہ حضرت تیمور صاحب قران سے جا ملتا وہ چھوٹی
بنیاد والے کہلاتے اور ان کی بیگمات چھوٹی بنیاد والیاں
دوسرا طبقہ نواب زادیوں کا تھا۔ ان میں بھی دو درجے تھے ایک
تو وہ جو پشتوں کی امیر زادیاں تھیں وہ اپنے کو شہزادیوں
سے کم نہ سمجھتیں اور دوسری وہ جن کے مرد ولایت سے
آتے یہاں خدمات بجا لاتے۔ بادشاہ تک رسائی ہوتی۔
مناصب پاتے۔ جنگ، دولائی، ملکی کے خطابات سے
سرفراز ہوتے۔ یہ نو دولتے کہلاتے اور تین چار پشت تک
حسد اور رشک کی نظروں سے قدیم امیروں میں دیکھے
جاتے تیسرا طبقہ شریفوں کا تھا ان میں اول خوش باش جن
کے پاس گاؤں باغ مکان دکانیں ہوتیں اور اس کی آمدنی
سے بسر کرتے۔ دوسرے نوکر پیشہ کہ یہ شاہی نوکریاں کرتے
لیکن خطاب اور جاگیر سے محروم رہتے تیسرے مولوی۔
چوتھے حکیم، شریفوں میں ان چار ذیلی طبقوں کی بیویاں بیگمیں
کہلاتیں۔ اسی طبقہ میں ایک اور ذیلی طبقہ کہلاتا تھا۔ شاہان مغلیہ
میں اکبر بادشاہ سے بیری کی بنیاد پڑی اور اکثر مقرب بارگاہ

ارادت مند، عقیدت کیش اور مریدِ خاص کہلاتے اور
یہ رنگ آخر بہادر شاہ غازی تک رہا۔
(بیگمات بادشاہ اچھے لباس اور بناؤ سنگار کی شوقین ہوتیں)
شاہ عالم کے زمانہ میں ایک نئی قسم کا پاجامہ ایجاد ہوا جو قلفی دار
کہلاتا یا ٹخنے میں اوپر کندے ہوتے اور گھٹنے سے نیچے کندے
کی نوک سے ایک ایک کلی کی نوک ملا کر پائنچہ سی لیا جاتا
جو کولھے پر گھٹنے تک پھنسا رہتا اور گھٹنے کے نیچے سے ٹخنوں تک
بتدریج ڈھیلا ہو جاتا۔ موریوں پر پٹھا چڑھا ہوتا یا مغزی
لگی رہتی اکثر سنجاف بھی لگاتیں۔ یہ پائجامہ پہن کر بیگمیں یا موز
مرغیاں یا کبوتریاں معلوم ہوتیں ...... اڈی کی کرتی پیچھے
گدی کے نیچے پانچ انگل چوڑی ہوتی ہوئی پسلیوں سے لپٹی
ہوئی نیفے سے دو انگل اوپر تک رہتی اور سامنے کوڑی
سے ناف تک آتی اور بنڈے پر چسپت رہتی۔ دونوں ہاتھوں
میں سیدھے ہاتھ کی طرف ہوتا اور بائیں ہاتھ کی طرف کاج
ہوتے جو پہن کر لگائے جاتے۔ محرم کنٹھی کے پٹھے کی ہوتی جس
کی وجہ سے دگدگی کے نیچے تک کا حصہ کھلا رہتا۔ چڑیا میں دونوں
طرف چار چار ٹکیوں کی کٹوریاں جو مونڈھوں سے سامنے کی طرف
سلی ہوتیں اور پیچھے مونڈھوں میں پچھوے جڑے ہوتے۔
کبھی تین رنگ کے جوڑے ہوتے۔ دوپٹے کا رنگ
الگ محرم کرتی ایک رنگ کا تہ پوش اور رنگ کا لیکن تین
رنگ کے جوڑے پہننا بہت مشکل تھا۔ اس میں بہت سلیقہ
اور بہت خوش مذاقی درکار تھی تین رنگ اس طرح ملائے
جاتے کہ وہ آنکھوں کو لبھائیں مثلاً اودی تہ پوش، سبز محرم
کرتی اور نارنجی دوپٹہ ہوتا۔ اگر ان تین رنگوں میں سے ایک
رنگ نکال کر کوئی اور رنگ شامل کر دیا جائے تو اس پر
پھبتیاں ہوتیں، تین ترنگا دیوالی کا بھجڑا۔ ترنگی بلی یا دیوالی
کی کاکھیا یہی حال دو رنگوں کا تھا ان کا ملانا بھی سہل نہ تھا۔
کاسنی اور شربتی، فیروزی اور بادامی، انگوری اور پیازی۔
کافوری اور سوسنی، شنگرفی اور پستئی، تربوزی اور کاہی، شفتی
اور تاؤسی، سردئی اور نارنجی، گل ناری اور سبز بسنتی اور
آسمانی، زعفرانی اور بینجنی، ماشی اور جوزی۔ دھانی اور فالسائی،
آتشی اور زبرجدی، زعفرانی اور زمردی، سرخ اور سبز لیکن
اس پر کبھی مرچوں کے کھیت اور کچے پکے بیروں کی
پھبتی ہو جاتی .....
مہندی میں رنگ آنے کے لیے کتھا اور چڑیا کی بیٹ
ملاتے اور اگر سیاہی مائل سرخ رنگ پسند ہے تو اس میں ذرا
سا نیلا تھوتھا ملا دیں دلہنوں کے حمامی مہندی لگائی جاتی، کوئی
چھلا چور مہندی لگاتی کسی ہتھیلیوں پر مچھلیاں بناتی کوئی چاند،
کوئی سورج، کوئی ٹکیا بعض قندیلی مہندی لگاتیں کوئی جالی
کی مہندی لگاتی، مہندی لگانے کے بعد ارنڈ کے پتے ہاتھوں میں لپیٹ کر
حنا بند جو سرخ قند یا سرخ گلتے کے ہوتے اور جن میں سبز مغزی لگی
اور گوٹا لگا ہوتا باندھ دیئے جاتے پاؤں میں مہندی ہاتھوں
ہی کی وضع کی لگائی جاتی اکثر رات کو لگا کر سوتیں اور صبح کو حنا بند
کھول ارنڈ کے پتے الگ کر مہندی چھڑا چنبیلی کا تیل مل تھوڑی
دیر میں ہاتھ پاؤں دھوتیں اور مہندی ایسی رچتی جیسے سرخ سرخ
باقر خانیاں! بیر بہوٹیاں .....
"رنگھار مشاطائیں کراتیں) مشاطہ نے پہلے صندل
کا چھاپہ گلے اور مانگ پر ہلکا سا دیا پیچھے گھٹنوں پر بیٹھ کر
بیگم صاحبہ کے تیل گیری بیٹھ پر ڈال کپی میں سے تیل کی کٹوری
میں تیل نکال بالوں میں تیل لگایا۔ شانہ پیچ سے کنگھی نکال۔
موٹے دندانوں سے بال سلجھائے باریک دندانوں سے سونتے
مانگ نکالی چاند بیریوں کا یا محمد شاہی ٹیلیوں کا سر گوندھا کنواری
لڑکیوں میں سیپ کے سر گوندھے جاتے تاکہ مانگ پھٹ
کر چوڑی نہ ہو جائے اور کوڑے کے مباف ڈالے جاتے کہ
بالوں کی لوکیں پھٹیں نہیں محفوظ رہیں اور بال بڑھیں بچاری
لڑکیاں بیچ میں یاد آ گیا ہاں بیگم صاحب کا بناؤ سنیے۔ کھجوری چوٹی
گوندھ مباف دانی میں سے جوڑے کے رنگ سے ملنے والے
رنگ کا مباف نکال ڈالا۔ مانگ بھری۔ افشاں چنی بیگم صاحب
نے سیپ کے سفوف کی پوٹلی سے منہ پر سفوف مل کر باریک
ململ سے برابر کیا پھر روئی سے شہاب لیکر رخساروں پر
غازہ لگایا سپوٹوں پر اور حدقہ چشم پر ہلکا ہلکا اقیم زعفران
اور رسوت کا لیپ کر کے آنکھوں میں حلقے بنائے۔ دو تبالی دار

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

خبر نامہ

● ۳۱ دسمبر ۷۶ء کو شام پانچ بجے 'تحریک' کے دفتر
یں ہماچل پردیش کے وزیر زراعت جناب
لال چند پرارتھی چاند کلوی کے اعزاز میں، جو ایک
خوش فکر اور خوشگو شاعر بھی ہیں، ادارۂ 'تحریک'
کی طرف سے ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ مخمور سعیدی
نے پرارتھی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہماچل
ایک ایسی ریاست ہے جہاں اردو کو ثانوی سرکاری زبان
کا درجہ حاصل ہے اور اس کے لیے ہم اردو والے ہماچل
کی موجودہ حکومت کے لیے، جس کے ایک اہم رکن ہمارے
آج کے مہمانِ خصوصی پرارتھی صاحب بھی ہیں، اپنے دلوں
میں پُرجوش جذباتِ تشکر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو
کے فروغ اور اس کی ترقی میں پرارتھی صاحب کی ذاتی
دلچسپی کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ہماچل میں اردو کے سلسلے میں
جو سرگرمی آتی ہے اس میں ان کی اس دلچسپی کو بھی بڑا دخل
ہے۔ پرارتھی صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں ان اقدامات
کا تفصیل سے ذکر کیا جو حکومت نے اردو کے فروغ
کے لیے کیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماچل کے وزیر اعلیٰ
ڈاکٹر پرمار اپنی سیاسی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ ادبی
اور ثقافتی امور سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرتے رہتے ہیں
اور ان کی قیادت میں ہمیں امید ہے کہ ہم آئندہ بھی ادب و
ثقافت کی ترقی کے لیے بہت کچھ کر سکیں گے۔ آخر میں
پرارتھی صاحب نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا
جناب کرشن کمار طور نے بھی اپنا کلام سنایا جو پرارتھی صاحب
کے ساتھ ہی تشریف لائے تھے۔ میزبان شاعروں کی
نمائندگی کرتے ہوئے کرشن موہن صاحب نے اپنی
ایک تازہ غزل سنائی۔ جلسے میں دلی کے منتخب ادیب،
شاعر اور صحافی شریک تھے۔

● ۱۰ جنوری کی شام کو اردو کے جواں مرگ شاعر
پورن کمار ہوش کی یاد میں ہوش میموریل کمیٹی نئی دہلی
کی طرف سے ایوانِ غالب میں ایک ثقافتی تقریب منعقد
ہوئی جس میں ہوش کے مجموعۂ کلام "بانسری بدن کی"
کا اجرا عمل میں آیا اور فلم اور ریڈیو کے مشہور آرٹسٹوں
نے ہوش کی غزلیں اور نظمیں ساز، سنگیت اور رقص
کے ساتھ پیش کیں۔ کتاب کا اجرا مقبول فلمی اداکار
دلیپ کمار نے کیا۔ انھوں نے ہوش کی شاعری کے
متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ہوش کی کئی
تخلیقات سامعین کے سامنے پیش کیں مسٹر بی۔ پی
جھن جھن والا اور شریمتی شیلا جھن جھن والا نے بھی ہوش کی
شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات کا
اظہار کیا۔ جلسے کے منتظمین میں شریمتی شیلا جھنجھن والا
شری کے۔ کے۔ ملہوترہ (ہوش کے بڑے بھائی) اور
شری راجن کمار کے نام شامل تھے۔
یاد رہے کہ پورن کمار ہوش کا انتقال ایک
سڑک حادثے میں، پچھلے سال جنوری کے مہینے ہی میں
ہوا تھا۔ وہ دلی کے ایک مشاعرے میں شرکت کر کے
اپنے گھر بہادر گڑھ واپس جا رہے تھے کہ راستے میں
حادثہ پیش آیا۔ ان کی بیاض بھی جو ان کے ساتھ
تھی اس حادثے کی نذر ہو گئی۔ "بانسری بدن کی"
میں ان کا وہ کلام شامل ہے جو ان کے بہادر بزرگ

شہرین کے ۔کے ۔ ملہوترہ کی کوششوں سے ان کے قریبی دوستوں اور مداحوں سے دستیاب ہوا۔ ہوش کی زندگی میں ان کا ایک مجموعہ "آوازیں" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ان کا دوسرا مجموعہ ہے اور اسے دیوناگری لپی میں شائع کیا گیا ہے۔

● ۱۴ر جنوری کو شام ۴½ بجے دہلی یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں اردو کے ممتاز محقق اور ناقد جناب رشید حسن خاں کو ان کی علمی اور ادبی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ تقریب کی صدارت ترقی اردو بورڈ حکومتِ ہند کے چیئرمین جناب حیات اللہ انصاری نے کی۔ اولاً جلسے کے کنوینر ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے رشید حسن خاں صاحب کی ان خاموش لیکن ٹھوس علمی خدمات پر مختصراً روشنی ڈالی جو گزشتہ ربع صدی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد مخمور سعیدی نے خاں صاحب کو مندرجۂ ذیل منظوم خراجِ تحسین پیش کیا :

مصدرِ علم و فضل ذات تری
تجھ سے مشتق ہیں سب صفات تری
درسِ فن تجھ سے گفتگو کرنا
ادب آموز بات بات تری
ہیں طلوعِ شعور، دن تیرے
آگہی کی نمود، رات تری
مفتخر وہ ہر ایک شعبۂ علم
ہو جدھر چشمِ التفات تری
کتنا ممتاز ہمسروں میں تو
مختلف سب سے کائنات تری

مخمور سعیدی کے بعد جنابِ گوپال متل، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر خلیق احمد نقوی اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے استاد شری پتی شرما صاحب نے رشید حسن خاں کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی ۔

گوپال متل صاحب نے کہا کہ خاں صاحب نے اپنی تحریروں کے ذریعہ حق گوئی اور بے باکی کی روایت کی جو توسیع کی ہے اور اسے جو تقویت بخشی ہے ، اس کے لیے وہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ رشید حسن خاں صاحب نے جس سنجیدگی اور انہماک سے لغت، قواعد، تلفظ اور املا کے مسائل پر سوچا اور اظہارِ خیال کیا ہے، اس کا اعتراف ہی نہیں تقلید کی جانی چاہیے۔ پروفیسر امیر حسن عابدی نے کہا کہ اردو کے اس دورِ انحطاط میں جبکہ دوسرے بہت سے باصلاحیت لوگ اپنی صلاحیتیں غیر سنجیدہ کاموں پر صرف کر رہے ہیں، رشید حسن خاں صاحب کو ان کے کام کے سلسلے میں اگر کچھ سہولتیں فراہم کی جاسکیں تو ان سے اور بہتر کارناموں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نقوی نے خاں صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ اعتراف بھی کیا کہ ہم خاں صاحب کے لیے اتنا کچھ بھی نہ کر سکے جو آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں صدرِ جلسہ جنابِ حیات اللہ انصاری نے کہا کہ "میں خود ایک عرصے سے ان مسائل پر سوچ رہا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ رشید حسن خاں کی کتابیں پڑھ کر مجھے ایک نئی روشنی ملی اور میری بیشتر الجھنوں کا حل مجھے مل گیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہے کہ ترقی اردو بورڈ کی طرف سے ان کتابوں کی اشاعت سے ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ خود بورڈ کی نیک نامی اور عزت افزائی ہوئی ہے ۔"

● ۱۴ر جنوری ہی کی شام کو ۵½ بجے غالب اکاڈمی نئی دہلی میں موڈرن رائٹرز گروپ کی طرف سے ایک سمپوزیم ہوا۔ موضوعِ بحث تھا : "موجودہ دور میں ادیب کا رول"۔ جلسے کی صدارت جوگندر پال صاحب نے کی اور افتتاح ہندی کے مشہور شاعر شری کانت ورما صاحب نے کیا۔ ابتدا میں موڈرن رائٹرز گروپ کے صدر مخمور سعیدی نے گروپ کے مقاصد اور موضوعِ زیرِ بحث کی اہمیت

پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ترقی پسند ناقدوں کی اس
روش پر احتجاج کیا کہ وہ اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر
جدید ادیبوں اور شاعروں پر سماج دشمنی کا الزام لگاتے
رہتے ہیں۔ شری کانت ورما صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر
میں کہا کہ سچا ادب تعصب اور تنگ نظری کے مقابلے میں
فراخ دلی اور روشن خیالی کو جنم دیتا ہے اور اس عمل کی سماجی
اہمیت مسلم ہے۔ ادیب پر باہر سے کوئی ضابطہ نافذ
کرنا اور اسے ہدایت دینا کہ وہ یہ لکھے، یہ نہ لکھے، درست
نہیں۔ ادب کے اپنے کچھ ضابطے ہیں اور اس پر صرف انہی
کا احترام لازم ہے۔ ادیب کا رول آج بھی وہی ہے جو کل
تھا اور وہ ہے اچھے ادب کی تخلیق۔

عتیق اللہ اور کمار پاشی نے مضامین پڑھے اور
موضوع کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔
دونوں مضامین میں ادیب کی تخلیقی آزادی کی اہمیت پر
زور دیا گیا تھا اور اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے
کہ جب ہم ادب کی سماجی مقصدیت کے مسئلے پر غور
کریں تو ہمیں اس اصطلاح کو اس کے وسیع تر معنی
میں قبول کرنا چاہیے، بتایا گیا تھا کہ ہدایت ناموں کا
پابند ادب کچھ ہی وقت گزر جانے پر کس طرح اپنی معنویت
کھو دیتا ہے۔ مضامین کے بعد بالترتیب ڈاکٹر مظفر حنفی،
بلراج کومل، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور گوپال متل صاحب
نے مضمونوں میں پیش کیے گئے بعض نکات سے بحث
کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان حضرات کا خیال
تھا کہ تیز رفتار سائنسی پیش رفت نے انسان کی مادی اور
روحانی ترقی کے درمیان جو عدم توازن پیدا کر دیا ہے،
ادب اس کا ازالہ کر سکتا ہے۔ وہ اس پر متفق تھے کہ اعلیٰ
ادبی تخلیق بجائے خود سماجی افادیت کی حامل ہوا کرتی
ہے اور شعوری طور پر افادی ادب کی تیاری ایک غیر ادبی
نقطۂ نظر کی غماز ہے۔ گوپال متل صاحب نے کہا کہ غالب
کوئی سماجی معلم نہیں تھے لیکن ان کی شاعری کی بدولت
آج ہمارا سر دوسروں کے سامنے بلند ہے۔ جو چیز ہمارے
لیے قومی فخر کا سرمایہ بن سکتی ہو کیا ہم اس کی عظمت اور
اہمیت سے انکار کرنا چاہیں گے؟ گوپال متل صاحب
نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ یہ ضروری
نہیں کہ کسی شاعر کی شاعری اس کی پوری زندگی کی عکاسی
کرتی ہو۔ مولانا حسرت موہانی کی ساری زندگی جہادِ حریت
میں گزری لیکن ان کی شاعری عام غزل کی شاعری ہے۔ ڈاکٹر
اقبال بلاشبہ بلند پایہ شاعر تھے لیکن زندگی کے مسائل
میں ان سے رہنمائی حاصل کرنا آسان نہیں کیونکہ کوئی شخص
خواہ فلسفی اور مفکر ہی کیوں نہ ہو جب شاعری کی طرف
راغب ہوتا ہے تو تضاد سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔
مثال کے طور پر اقبال کے کلام میں اورنگ زیب کی
بھی تعریف موجود ہے اور سرمد کی بھی۔ لیکن اس سے
ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے ان پر کوئی حرف نہیں
آتا۔ ادب کی سماجی افادیت کو سب سے زیادہ نقصان
ان کے نزدیک ترقی پسندوں نے پہنچایا جنھیں کمیونسٹ
پارٹی کے ایما پر ہر لحظہ اپنا انداز نظر بدلنا پڑتا تھا۔ انھوں
نے کہا کہ ترقی پسند شاعروں کی بدنصیبی کا اس سے بڑا
ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ جب اسٹالن کو بعد از مرگ
روس میں ہدفِ ملامت بنایا گیا تو انھیں اپنی وہ تمام
نظمیں مسترد کرنی پڑ گئیں جن میں انھوں نے اسٹالن
کی مدح سرائی کی تھی اور اسے افضل ترین مخلوق ٹھہرایا
تھا۔

● راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کی گورننگ بورڈ
کی ایک نشست میں جو ۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو اودے پور
میں ہوئی، اکیڈیمی کے صدر پنڈت وشنو دت شرما
نے ۷۷-۱۹۷۶ء کے لیے اکیڈیمی انعامات کا اعلان
کیا۔ اعلان کے مطابق اردو کا انعام جناب محمد عثمان عارف
بیکانیری کو ان کی کتاب "نذرِ وطن" پر دیا گیا ہے۔
انعام کی رقم ایک ہزار ہے۔

"نذرِ وطن" عارف صاحب کی قومی اور وطنی نظموں

(باقی صـ ۱۹ پر)

رفتید و لے نہ از دلِ ما

سال نو اردو والوں کے لیے اس لحاظ سے کچھ زیادہ مبارک ثابت نہیں ہوا کہ اس کے آغاز ہی میں اردو دُنیا اپنی دو اہم شخصیتوں سے محروم ہو گئی۔ ۶ جنوری کی صبح کو سوا چار بجے مولانا عبدالماجد دریا بادی ایک طویل علالت کے بعد وفات پا گئے اور ۱۵ جنوری کی سہ پہر کو پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ولادت ۱۸۹۲ء میں دریاباد ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد وہ کننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ فلسفے میں پوسٹ گریجویشن کے لیے انھوں نے ایم۔ اے۔ او. کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور پھر سینٹ اسٹیفن کالج میں آ گئے۔ کچھ عرصے تک وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں اسسٹنٹ رہے پھر حیدرآباد گئے اور دارالترجمہ سے منسلک ہو گئے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کی مشہور کتاب "فلسفۂ جذبات" ۱۹۱۳ء میں شائع ہو گئی تھی۔ انگریزی میں ان کی ہنگامہ خیز تصنیف "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" ۱۹۱۵ء میں لندن سے چھپی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اردو کے مشہور اخبار "سچ" کے بانی ایڈیٹر تھے۔ بعد میں یہی اخبار "صدق جدید" کے نام سے ان کے زیرِ ادارت نکلنا شروع ہوا اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وہ اسے باقاعدگی سے نکالتے رہے۔

مولانا ئے مرحوم نہ صرف اردو کے ایک صاحبِ طرز ادیب اور انشاپرداز تھے بلکہ ایک عالمِ دین اور مفسرِ قرآن کی حیثیت سے بھی ملک اور بیرونِ ملک شہرت رکھتے تھے ان سے بعض امور میں اختلاف رکھنے والے لوگ بھی ان کے علمی تبحر، ان کے مومنانہ کردار اور ان کی نیک نیتی کے نہ صرف قائل بلکہ قدرداں تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم ضلع جونپور کے رہنے والے تھے، تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کا طالب علمی کا لگ بھگ پورا زمانہ علی گڑھ میں گزرا، تعلیم سے فراغت کے بعد وہ وہیں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے اور آخر میں اس شعبے کے صدر کے عہدے سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

رشید احمد صدیقی جیسی ذی علم اور ذی شعور شخصیتیں اردو دنیا میں کم ہی نظر آئیں گی۔ اپنے دور کے ادیبوں اور نقادوں میں ان کا قد بہت اونچا تھا۔ ایک طرف ایک ذمہ دار استاد کی حیثیت سے انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی تو دوسری طرف شگفتگی اور شائستگی میں ڈوبی ہوئی اپنی تحریروں کے ذریعے اس ادبی اور تہذیبی شعور کو عام کیا جو ہم سب کی متاعِ عزیز ہے۔ انھیں دو چیزوں سے والہانہ عشق تھا: اردو غزل اور علی گڑھ اور وہ اپنی نگارشات میں دونوں کے عشق کا حق ادا کر گئے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف "آشفتہ بیانی میری" جس میں ان کی انشاپردازی کی خوبیں درجۂ کمال کو پہنچی

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

دیدہ وَر کی موت

۱۱ فروری ۱۹۷۷ء کی صبح کو جمہوریۂ ہند کے پانچویں صدر جناب فخرالدین علی احمد صاحب پر اچانک دل کا دورہ پڑا اور ۸ بج کر ۵۲ منٹ پر وہ پوری قوم کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ اس حادثے سے ایک روز قبل ہی وہ اپنا غیر ملکی دورہ مختصر کرکے دلّی واپس تشریف لائے تھے اور ہوائی اڈے پر جب جہاز سے اترے ہیں تو پوری طرح ہشاش بشاش تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ اس قدر جلد ہم سے رخصت ہونے والے ہیں۔

ریڈیو سے جیسے ہی یہ اندوہناک خبر نشر ہوئی پورے ملک پر ایک ماتمی فضا چھا گئی۔ دلّی میں سرکاری دفاتر کے ساتھ ہی تمام غیر سرکاری دفاتر، کاروباری ادارے اور دکانیں لوگوں نے بند کردیں اور گروہ در گروہ راشٹرپتی بھون کا رُخ کیا۔ ہر شخص دوسرے کو یہ خبر جیسے تصدیق طلب انداز میں سناتا اور پھر سر جھکا کر باقی سوگواروں کا ہمقدم ہو جاتا۔

آخری دیدار کے لیے صدر مرحوم کا جنازہ راشٹرپتی بھون کے دربار ہال میں رکھ دیا گیا تھا جہاں تین دن تک ہزاروں سوگوار اظہارِ عقیدت کے لیے پہنچتے رہے۔ اتوار کی سہ پہر کو جنازہ پورے سرکاری اعزازات کے ساتھ دربار ہال سے باہر لایا گیا۔ جنازے کے جلوس میں ہزاروں افراد شریک تھے اور ہزاروں ہی افراد نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ تدفین نئی دلّی کی پرانی جامع مسجد کے احاطے میں عمل میں آئی۔ مرحوم جمعے کی نماز اکثر اسی مسجد میں ادا کیا کرتے تھے۔ یہ مسجد پارلیمنٹ ہاؤس کے بالکل قریب واقع ہے۔

جناب فخرالدین علی احمد صاحب ۱۳ مئی ۱۹۰۵ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اتر پردیش میں پائی۔ پنجاب یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کے بعد وہ دلّی کے سینٹ سٹیفنس کالج میں داخل ہوئے لیکن پھر جلد ہی انگلینڈ چلے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ قانون کا نصاب پاس کر لینے کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے اور ۱۹۳۱ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے رکن بنے جو گاندھی جی کی قیادت میں ملک کو آزادی کی منزل کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس راہ میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن ان کی ثابت قدمی میں فرق نہ آیا۔ آزادی کے بعد انھوں نے یکے بعد دیگرے قومی زندگی کی کئی اہم ذمہ داریاں سنبھالیں اور انھیں بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔

اگست ۱۹۷۴ء میں فخرالدین علی احمد صاحب جمہوریۂ ہند کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنے مختصر عہدِ صدارت کے دوران میں انھوں نے اپنے رویّے سے ملک کے اس سب سے بڑے عہدے کے وقار پر ایک اور مہرِ تصدیق ثبت کی اور اپنی دانش مندی، حلم اور خوش اخلاقی کی بدولت بلا امتیازِ مذہب و ملّت پوری قوم کی محبت اور احترام حاصل کیا۔ انسانی ہمدردی، مذہبی نیز نظریاتی رواداری، اعلیٰ تہذیبی روایات کی پاسداری اور برتر جمہوری اقدار کے فروغ میں حقیقی دلچسپی، یہ مرحوم کے ایسے اوصاف تھے جن کا اعتراف ان سبھی تعزیتی پیغامات میں کیا گیا جو ملک اور بیرونِ ملک سے سربراہوں، سماجی اور سیاسی شخصیتوں کی طرف سے حکومتِ ہند اور مرحوم کے سوگوار خاندان کو موصول ہوئے۔

ہم مرحوم کی مغفرت کے لیے دست بہ دعا ہیں۔ خداوندِ کریم ان کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق اور ہم سب کو ان کے آدرشوں کو پورا کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔

—— ادارہ

پیداوار کا نیا ریکارڈ

یکم جولائی ۱۹۷۵ء سے اقتصادی پروگرام کا اعلان کیے جانے کے بعد قوم نے مصمم ارادے سے آگے قدم بڑھایا ہے، اس کے نتیجے ہیں :

- اناج کی ۱۱ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن کی ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے اور ملک میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن اناج کا اسٹاک موجود ہے۔
- ۷۷-۱۹۷۶ء کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی پیداوار میں ۱۲ فیصد اضافہ ہوا ہے، جبکہ پچھلے سال اسی مدت میں تین فیصدی اضافہ ہوا تھا۔
- ۱۹۷۶ء کے پہلے سات مہینوں میں برآمدات میں ۳۳٫۹ فیصدی اضافہ ہوا۔ جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔

DAVP 76/887

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک نئی دہلی

شمارہ ۱۲ جلد ۲۴

مارچ ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس

مقام اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات:

مسلم حقوق کی پاسبانی اور کمیونسٹ پارٹی

گوپال متل

کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو میں اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کی پاسبانی کا بھی ذکر ہے۔ لیکن راجیشور راؤ نے مینی فیسٹو جاری کرتے ہوئے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ "کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کا ایک دستہ ہے"۔ اندریں حالات یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ کمیونسٹ پارٹی کا یہ دعویٰ کردہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا فریضہ انجام دے گی، کس حد تک مخلصانہ ہے، اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہوگا کہ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے مرکز سوویٹ روس میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔

سوویٹ سفارت گھر کے کارکنوں اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہندوستانیوں کا دعویٰ یہی ہے کہ سوویٹ روس اقلیتوں کی جنت ہے۔ مثال کے طور پر مدراس میں سوویٹ یونین کے قیام کی ۵۴ویں سالگرہ کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی چندادری بیریٹ شاخ کے نائب صدر ایم۔ امبالاوان نے کہا کہ سوویٹ یونین کا وجود اس کا زندہ ثبوت ہے کہ مختلف قومیتیں اور نسلی گروہ ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اور اقتصادی اور تہذیبی ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ سوویٹ یونین کی تشکیل نے تمام شہریوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ مساوی حقوق حاصل کریں اور حقیقی بھائی چارے کی زندگی بسر کریں۔

مسٹر ایم۔ کارلوڈ نے بھی جو مدراس میں سوویٹ قونصل خانے کے سیکریٹری ہیں، اسی قسم کی باتیں کہیں۔ مثلاً یہ کہ ۵۴ برس میں سوویٹ یونین کی قومیتیں سیاسی اقتصادی اور تہذیبی ترقی کی راہ پر گامزن رہی ہیں اور یہ کہ سوویٹ یونین کی ہر ری پبلک سوویٹ یونین کی خود مختار اور مساوی ممبر ہے اور ان کی اقتصادی زندگی کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو چکا ہے۔

یہ سب دعوے کافی خوش نما ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ حقیقت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ انقلاب کے شروع میں سوویٹ یونین کے مسلم خطوں نے کمیونسٹ پارٹی کے ان دعاوی پر بھروسہ ضرور کر لیا تھا کہ انھیں خود مختاری کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں خوقند کے مقام پر چوتھی علاقائی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ "ترکستانی عوام کو حقِ خود اختیاری دیا جائے جو عظیم سوویٹ انقلاب کے اصولوں کے عین مطابق ہے"۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ "وفاقی جمہوریۂ روس کی یونینوں میں ترکستانی علاقہ خود مختار ہے اور آئین خود مختاری کی وضاحت کا کام ترکستان قانون ساز اسمبلی کے سپرد ہے جس کا اجلاس جتنی جلد ممکن ہو سکے بلایا جائے"۔ لیکن سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کا ردِ عمل یہ تھا کہ فروری ۱۹۱۸ء کے وسط میں سرخ فوج نے خوقند شہر کو گھیر لیا اور اس پر قبضہ کر کے پورے شہر کو تاخت و تاراج کر دیا۔ قتلِ عام بڑے پیمانے پر ہوا جس میں کمیونسٹوں کے اپنے بیان کے مطابق پانچ ہزار مسلمان ہلاک ہوئے مقامی تخمینوں کے مطابق ہلاکین کی تعداد اس سے دگنی سے بھی زیادہ تھی۔ خوقند حکومت کی تباہی کے لیے روسیوں نے نظریاتی تفریق کو غیر ضروری سمجھا اور تمام اسلام دشمن روسیوں کو سرخ پرچم کے نیچے جمع کر لیا اس حقیقت کو سفاروف نے بھی تسلیم کیا ہے جو لینن کا قریبی ساتھی تھا۔ اپنی ایک کتاب میں جو ۱۹۲۱ء میں چھپی، وہ لکھتا ہے:

"جب ترکستان سوویٹ کی طاقت ایک غیر مقامی اور جارح قوت کی حیثیت سے مسلمانوں کی مخالفت کر رہی تھی تو اسے ایسے ایسے حلیف ملے جن کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ حلیف اسے یورپی قومیتوں میں ملے۔ ان میں آرمینیائی بورژوا تھے، سمیر کی کے مالدار روسی کسان تھے، زارشاہی کے افسر تھے اور روسی پادری تھے۔ ایک استحصال پسند معاشرے کی یہ تمام شاخیں ترکستان میں زارشاہی نوآبادیت کے نمائندوں کی حیثیت سے اشتراکیت کے پرچم تلے اکٹھی ہو گئیں اور یہ قدرتی بھی تھا۔ بائیں بازو کی اشتراکیت ایک بڑے پیمانے پر مقامی آبادی کے غارتگرانہ استحصال کی صورت میں نمودار ہوئی جس میں سرخ محافظوں اور افسروں سبھی نے حصہ لیا۔"

یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات پرانی ہے، اب حالات بدل گئے ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام کے خلاف روسی کمیونسٹوں کی جنگ بدستور جاری ہے۔ روسی جریدے "زاریا وسٹوکا" کی ۵ جولائی ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں درج ہے:

"گورزہومی اور کورٹوخی کے دیہات میں کولخوزوں کے صدروں ابل الماٹزے اور کوبال کانزے کو مذہبی رسموں کی ادائیگی کی پاداش میں کمیونسٹ پارٹی کی ممبری سے خارج کرنا پڑا۔ پارٹی کے پانچ دوسرے ممبروں کے خلاف، جن کے خاندانوں میں بچوں کو مذہبی رسوم سکھائی جا رہی تھیں، سخت انتظامی کارروائی کرنا پڑی۔ باقی ضلعوں اور شہروں کی پارٹی تنظیموں کی حالت بھی یہی ہے۔ مثال کے طور پر کوبیولٹی کی پارٹی کمیٹی نے ایس کال کاٹزے کو، جو کولخوز کا چیف ماہرِ زراعت تھا، مذہبی رسوم کی ادائیگی کی پاداش میں اپنی صفوں سے خارج کیا۔ اسی بنا پر گاتو کے ایک ٹیچر کو بھی کڑی سزا دینی پڑی۔ کھیلیل چر کی ضلع کمیٹی کو صرف پارٹی بیورو کے سیکرٹیری ہی کو نہیں بلکہ ملحدانہ پروپیگنڈے کے انچارج کو بھی اس الزام میں برطرف کرنا پڑا کہ وہ مذہب دشمن سرگرمیوں میں خلل ڈال رہے تھے۔

آج کل اہم ترین کام یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر روز ایسا زبردست ملحدانہ پروپیگنڈہ کیا جائے جو لوگوں کو قائل کر سکے۔ یہ کام صرف مخصوص تربیت یافتہ پروپیگنڈسٹوں ہی کو نہیں بلکہ ہر مصنف، ہر آرٹسٹ، ہر استاد، ہر ڈاکٹر، ہر انجینئر اور ہر لائبریرین کو اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ تبھی یہ ممکن ہوگا کہ پرانے توہمات کی کوئی نشانی باقی نہ رہے اور ہر سماج دشمن رویّے کے خلاف ضروری کارروائی کی جا سکے۔"

ہندوستان میں مسلمانوں کے کافی ووٹ ہیں اس لیے یہ قدرتی ہے کہ انتخاب کے موقع پر سبھی سیاسی پارٹیاں ان کی دلجوئی کی باتیں کریں۔ کمیونسٹ پارٹی بھی ان کے حقوق کی حفاظت کی باتیں ووٹوں کے لیے ہی کر رہی ہے لیکن کمیونزم کے ملحدانہ نظریے کو خیرباد کہے بغیر، جو اقتداری ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے نظریے کو برداشت نہیں کرتا، وہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہرگز نہیں کر سکے گی اور کمیونزم کے نظریے کو خیرباد کہنا ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے لیے اس لیے ناممکن ہے کہ بقول راجیشور راؤ "کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کا ایک دستہ ہے۔" ▲▲

تناظر بقیہ صفحہ ۲۹

پلکیں اُٹھا کر آواز کی روشنی میں دیکھا۔ میرے مقابل ایک عورت کا ہیولا آکڑوں ہو کر بچی کو اپنے بازوؤں میں لیے رہا تھا۔ تاریکی میں اُس کی پیشانی سے کہکشاں پھوٹ رہی تھی۔ "تم اس کی ماں ہو؟" "یہ میری بچی ہے۔"

جواب میں ممتا کی حلاوت اور دعوے تھا۔ اس نے بچی کو اُٹھا لیا۔ سیدھی کھڑی ہو گئی اور مجھے بھی ساتھ آنے کے لیے کہہ کر آگے آگے چل دی۔

میں نے دیکھا کہ اُس کی پیشانی سے پھوٹنے والی کہکشاں سر پر سے ہو کر اپنے پیچھے ایک دمکتا ہوا راستہ بنا رہی تھی۔

میرے ذہن نے آواز دی —— کیا یہ وہی کہکشانی راہ نہیں جس کی مجھے جستجو ہے؟ دل نے قدموں کو گامزن کیا تو اس نے کہا یہ عشق کا ایک اور روپ ہے ...... ! ▲▲

نظم اور غزل

کرشن موہن

اب کہ جب آگئی ہے شامِ شباب
ابروؤں کی تراش سے حاصل

دِل میں جب پہلا سا وہ پیار نہیں
اب گلابوں پہ وہ نکھار نہیں
کھو چکے اپنا تیکھا پن بادام
سنبھلی سنبھلی ہیں آج کل مادام
چُپ ہوا خواہشوں کا آوازہ
بُوئے تازہ سے ہے تہی غازہ
اور کاجل میں وہ خمار نہیں
بانکپن اب مزہ نہیں دیتا
حُسن بھی ہو چلا اُداس اُداس
اب نہیں ہے لباس میں بھی پیاس
پیری ہونے لگی ہے اب وارِد
ہو گئیں آپ دفعتاً بارِد

کتنے ہی دِن ملن نہیں ہوتا
پیار کا یہ چلن نہیں ہوتا

▲▲

سدا پیار سے دل کو آباد رکھے
اگر آدمی موت کو یاد رکھے

اُسے مانتی ہے یہ دُنیا جو خود کو
تمنّائے دُنیا سے آزاد رکھے

اُٹھے اُس پہ کیوں تفرقے کی عمارت
محبّت کی جب کوئی بنیاد رکھے

کبھی تو مچل جائے گا، اپنے دل کو
کوئی تا بکے محوِ فریاد رکھے

سُکھی کیسے ہو اُس کا من کرشن موہن
ہوس جس کو ہر وقت ناشاد رکھے

▲▲

B 124 پنڈارا روڈ نئی دہلی

غزلیں

نازش پرتاپگڑھی

ساتھ جو کارواں کے چلے ہیں
راہبر سے وہ رہزن بھلے ہیں

ظلمتوں میں جو تارے ڈھلے ہیں
راستے کے دیئے ہو چلے ہیں

ڈوب جائیں نہ ساحل پہ جاکر
بچ کے طوفان سے جو چلے ہیں

دل کے زخموں کی سوگند اے دوست
عشق میں ہم بھی پھولے پھلے ہیں

میں نے چاہا ہے جب مسکرانا
میری آنکھوں سے آنسو ڈھلے ہیں

بن پڑا کچھ نہ اشکوں سے لیکن
راستے میں دیے تو جلے ہیں

کم نگاہی کی بات اور نازش
ورنہ ذروں میں سورج پلے ہیں

●●

زندگی گو ہے بارِ گراں
پھر بھی مرنے کی فرصت کہاں

عمر گزری سفر میں مگر
رہ گئے ہم جہاں کے تہاں

رہبروں کا بھرم رکھ لیا
ورنہ منزل کہاں، ہم کہاں

آؤ ہم بھی لڑائیں نظر
آج بھی ہے یہ دنیا جواں

ہم اٹھیں تو ملے راہبر
ہم چلیں تو بنے کارواں

مٹ نہیں سکتی نازش غزل
اس میں ہیں اتنی رعنائیاں

●●

مظہر امام

وہی دشتِ بلا ہے اور میں ہوں
زمانے کی ہوا ہے اور میں ہوں

سکوتِ کوہ ہے اور سایۂ در
صدائے نا سزا ہے اور میں ہوں

مگر شاخوں سے پتے گر رہے ہیں
وہی آب و ہوا ہے اور میں ہوں

یہ ساری برف دل تک آ رہے گی
نمی حد سے سوا ہے اور میں ہوں

کئی دن سے نشیمن خاکِ دل کا
سرِ شاخِ ہوا ہے اور میں ہوں

پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہے
زمیں محوِ دعا ہے اور میں ہوں

تجھے اے ہم سفر! کیسے سنبھالوں
بھٹکتا راستہ ہے اور میں ہوں

●●

○ بیگم واڑہ، پرتاپ گڑھ، یو۔پی۔

○ ٹی۔ وی۔ سنٹر۔ سرینگر

اقتصادی آزادی کی منزل کی طرف

ہم دلّی میں ہر سال آگے بڑھ رہے ہیں

ترقّیاتی اسکیموں کے مصارف کی رفتار

30 کروڑ 43 لاکھ روپے ——— 72-1971ء ——— میں
50 کروڑ 61 لاکھ روپے ——— 76-1975ء ——— میں
74 کروڑ 80 لاکھ روپے ——— 77-1976ء ——— میں اور
90 کروڑ 10 لاکھ روپے (مجوزہ) ——— 78-1977ء ——— میں

- دلّی میں کل منصوبہ جاتی مصارف کا 40 فیصد حصّہ سماج کے کمزور طبقوں کے لیے بہبودی اسکیموں پر خرچ کیا جا رہا ہے۔
- ان وسائل کا 33 فیصد حصّہ دلّی کے شہریوں کی شاندار بچت کوششوں کے نتیجے میں ہی حاصل ہوا ہے۔

آئیے! ہم سب بچت کی اس تیز رفتار کو قائم رکھیں۔ روپیہ جمع کر کے فائدہ اٹھانے کے لیے اور بہت سی اسکیمیں موجود ہیں۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ قائم کیجیے

ریجنل ڈائرکٹر نیشنل سیونگز، پوسٹ بکس نمبر 1412 کشمیری گیٹ دہلی۔ فون نمبر 224725

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت دلّی انتظامیہ دلّی۔

سوالنامے پر اظہارِ خیال

۱۔ جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی بحالی ؟
۲۔ جدید ادب میں ہئیتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟
۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِعمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے ؟
۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے۔ کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط تو نہیں کرتے ؟ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟
۵۔ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب کرنے کے بعد ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے لگے ہیں۔ اس میں کسی نئے عرفان کو دخل ہے یا یہ پسپائی کا اعتراف ہے ؟
۶۔ کیا ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے ؟ جواب اثبات میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے ؟
۷۔ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے یہ بھی کی ہے کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ادب کو بھی سماجی فریضے کا حامل ماننا پڑے گا جسے بالعموم مریضانہ ادب کہا جاتا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

ڈاکٹر گیان چند

صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

۱۔ جدید ادب قدیم ادب سے انحراف ہے۔
۲۔ جدید ادب میں ہئیت اور موضوع دونوں کی تبدیلیاں ہیں لیکن ان میں موضوع کی تبدیلیاں بدرجہا اہم تر ہیں۔
۳۔ جدید ادب میں تنہائی کا احساس صنعتی پھیلاؤ کا ردِعمل ہے
۴۔ میری رائے میں ہر ادب لازماً تبلیغ نہیں ہوتا۔
۵۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ترقی پسند ادیب نئے ادب کو ترقی پسندی کی توسیع کہتے ہیں کہ نہیں۔ اگر کہتے ہیں تو یہ نئے عرفان کی وجہ سے نہیں بلکہ نئے ادب کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پسپائی ہی سمجھیے۔
۶۔ ملک و قوم کی تعمیر میں ادب کسی حد تک کوئی کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مخصوص نعرے بالکل بیکار ہیں۔ ادیب کو چاہیے کہ ذہنوں کو چند پسندیدہ اقدار کی طرف مائل کرے۔
۷۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں کہ ادب ناپسندیدہ جذبات کے پُرامن اخراج کا ذریعہ ہے۔ اگر ادب میں بیان کردہ جذبات ناپسندیدہ ہیں تو ان کا اظہار بھی ناپسندیدہ ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی

استاذ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی

۱۔ جدید ادب کا قدیم ادب سے وہی رشتہ ہے جو حال کا ماضی سے ہے جس طرح حال میں ماضی کی روح جلوہ گر ہوتی ہے اسی طرح جدید ادب میں قدیم ادب کا جوہر پنہاں ہوتا ہے۔ یہ سوال بنیادی طور پر روایت اور جدت کی نوعیت کا سوال ہے۔ جس طرح ہر بچّہ میں اس کے اجداد کی سیرت کی خصوصیات اور صورت کے نقوش جھلکتے ہیں اسی طرح جدید میں قدیم ادب کی زندہ روایات اور بنیادی اقدار کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ زندگی،

اور ادب کے اس داخلی اور ناگزیر سیّال اور متحرک تعلق کو
نظر انداز کرنے سے قدیم و جدید کا ایک میکانکی تصوّر پیدا
ہوگا جس کے نتائج اور مضمرات حقیقت سے دُور ہوں گے۔
اور وہ ادب کی تفہیم میں غلط نتائج تک پہنچائیں گے۔ اس
لیے میری نگاہ میں جدید ادب قدیم ادب سے میکانکی انداز
میں "انحراف" نہیں ہے۔ جدید ادب میں انحراف کی جو
صورتیں ہیں انھیں ادب کی بنیادی اقدار روایات اور
اِن کے تسلسل کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ جو نئی زندگی
اور اس کے جذباتی تقاضوں کی روشنی میں نمودار ہوئی ہیں۔
اس اصول کی روشنی میں ہر وہ نام نہاد "انحراف" جو فیشن کا مولے
یا کسی غرض کے تحت نظر آتا ہے غیر ادبی ہتھکنڈا ہے۔ اب
رہا "ادب کی بنیادی اقدار کی بحالی" کا سوال تو اگر کہیں
ادب کی بنیادی اقدار (جمالیاتی کیفیت اور اسلوب)
نہیں ہیں تو وہ سرے سے ادب ہی نہیں ہے۔ جدید
ادب کے نام پر جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے ۔ وہ
سب کا سب تخلیقی ادب کے تمام تقاضوں کو پورا
نہیں کرتا اس کے بعض حصّے اعلیٰ ادب کے ذخیرے میں
شامل ہوں گے اور بعض حصّے قدیم اور ترقی پسند ادب
کے کمزور حصوں کی طرح غیر ادبی ہونے کی وجہ سے اپنی
کشش کھو دیں گے۔ اس لیے میری نگاہ میں قدیم و جدید
ادب کی بحث بیکار ہے۔ بحث اس پر ہونی چاہیے کہ
کون سا ادب اعلیٰ ادب ہے اور کون سا جعلی اور بناوٹی۔

۲۔ عام خیال یہ ہے کہ قدیم ادب ہیئت کے تجربوں اور
تبدیلیوں سے عاری تھا۔ چونکہ ادب زندگی اور اس
کی تبدیلیوں سے وابستہ ہے۔ اس لیے وہ زندگی کے
نئے تجربوں اور تبدیلیوں سے یکسر بے نیاز نہیں رہ سکتا۔
البتہ قدیم ادب قدیم زندگی کی طرح تجربوں کی حد تک
سست رفتار تھا۔ جدید ادب جدید زندگی کا مظہر
ہے اس لیے اس کے تجربوں کی رفتار جدید زندگی کی
طرح ہیئت اور موضوع دونوں سطحوں پر تیز ہے۔ اگرچہ
اعلیٰ تخلیقی ادب میں مواد و ہیئت اور لفظ و معنی کی دوئی
باقی نہیں رہتی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دُنیا کے
ہر ادب میں موضوعاتی تبدیلیاں زیادہ اور ہیئت
کے تجربے نسبتاً کم ہوئے ہیں چونکہ موضوعات بہت
اور اظہار کے سانچے (ہیئتیں) کم ہیں۔ اس لیے ایسا
ہونا فطری امر ہے۔ اردو میں بھی موضوعات اور ہیئت
کے تجربوں میں یہی تناسب ہے۔ جن ادیبوں نے
تخلیقی عمل اور فن کی داخلی MECHANISM سے
بے نیاز ہو کر ہیئت کے تجربے کیے ہیں ان کی اپنی اہمیت
ہے مگر محدود اور کمتر ——— دراصل ہیئت کا تجربہ
شاعر کے تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت سے وابستہ ہوتا
ہے۔ گویا ہر تجربے اور تبدیلی کی جڑ یا صلاحیت شعری
تجربے کے "جین" ہی میں ہوتی ہے۔ تخلیقی عمل کے
وقت وہی خصوصیت زبان اور اظہار کی تمام سطحوں
پر تجربے اور تبدیلی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔
بعض لوگوں کے شعری تجربے میں کوئی ندرت تازگی
اور طرفگی نہیں ہوتی تو ان کے یہاں زبان، تکنیک،
اسلوب یا ہیئت کی تبدیلی کہاں سے پیدا ہوگی۔
چونکہ ہیئت کے تجربوں کا تعلق خارجی طور پر شعری
جمالیات سے ہے اور جمالیاتی معیار، نظریے اور سانچے
طویل شخصی اور اجتماعی تجربات کی تصدیق کے بعد
بنتے سنورتے اور وجود میں آتے ہیں اس لیے ان میں
تبدیلی بھی دیر میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے
ہر ادب میں ہیئت کے تجربوں کی رفتار موضوع اور
مواد کے تجربوں کی رفتار سے کم رہی ہے۔ اُردو
کا بھی یہی حال ہے۔

۳۔ تنہائی کا احساس دنیا کے بیشتر مفکروں، دانش وروں
اور ادیبوں کو رہا ہے۔ مگر بعض لوگوں کو جذباتی
تنہائی اور بعض کو ذہنی تنہائی کا احساس شدید رہا ہے۔
فنکار چونکہ بنیادی طور پر جذباتی انسان ہوتے ہیں اس لیے انھیں جذباتی تنہائی کا احساس
شدید ہوتا ہے بعض ممتاز اور ذہین ادیبوں کو ذہنی
احساسِ تنہائی بھی لاحق ہوتا ہے۔ ادیبوں کی ایک

زندگی تو عام زندگی ہوتی ہے اور دوسری زندگی خاص ہوتی ہے۔ یہ خاص زندگی ان کی ذہنی تخیئلی اور جذباتی زندگی ہوتی ہے۔ یعنی دنیا کے بیشتر ادیب ذہنی اور تخیئلی زندگی جیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی اور تخیئلی زندگی کی ہر سطح پر عام انسان، جو ان کے گرد و پیش پھیلے ہوتے ہیں، اشتراک نہیں کر سکتے یا کر پاتے۔ اس لیے انھیں شدید ذہنی اور جذباتی ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ ان کے ادب و فن کا کبھی محرک ہوتا ہے اور کبھی مظہر۔ اس کے علاوہ ادیبوں کی افتادِ مزاج، معمولاتِ عملی زندگی سے دوری اور بیزاری، ناقدر شناسی، اور ناآسودہ خواہشات بھی اس احساس کو تیز کرتی ہیں، کبھی کبھی صحیح مخاطب مہیا نہ ہوتے اور اپنی کوشش کی داد نہ پانے یا اپنی بات کی صحیح پذیرائی نہ ہونے پر بھی اس احساس کو اشتعال ملتی ہے۔ اسے کسی نہ کسی حد تک تخلیقی ذہن کا وصف بھی کہا جا سکتا ہے اور جدید زندگی کی پیچیدگیوں کا ایک حد تک ردِّ عمل بھی۔ ادیبوں کے ذہنی اور جذباتی احساسِ تنہائی کو تیز کرنے میں جدید زندگی اور اس کی پیچیدگیاں شامل ہیں۔ جن میں صنعتی پھیلاؤ بھی ایک عنصر ہے۔ احساسِ تنہائی اپنے ردِّ عمل کے اسلوب اور اس کے اظہار و اثرات سے پہچانا جاتا ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ وہ مضر ہے یا مفید: اصلی ہے یا نقلی لیکن بعض جدید ادیبوں کے یہاں یہ احساس "جنیوئن" نہیں۔ محض مانگے کا اجالا ہے۔ اس کی پہچان کے لیے وقت اور تجزیے کی ضرورت ہے۔ جو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

۴۔ تبلیغ، ترسیل اور اظہار الگ الگ اصطلاحیں ہیں۔ میرے نزدیک تبلیغ صحافت اور خطابت سے، ترسیل نثر سے اور اظہار شاعری سے متعلق ہے۔ اظہار میں بات اور ابہام ہوتا ہے۔ جمالیاتی قدر ہوتی ہے، معنویت کی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ وحدت ہوتی ہے اور زبان کے تمام امکانات عروج پر ہوتے ہیں۔ ترسیل میں خیال کو ادا کرنے، قاری یا سامع کے ذہن نشین کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ اس میں ابہام کی جگہ وضاحت، معنویت کی کئی تہوں کی جگہ تعیّنِ معانی کی صفت ہوتی ہے۔ دوسرے اوصاف بھی ہو سکتے ہیں۔ تبلیغ میں مقصدیت، تکرار اور تاکید ہوتی ہے۔ ایک بات کو مختلف انداز سے کہا جاتا ہے۔ اسی پر اصرار ہوتا ہے۔ گویا تبلیغ میں اسلوب اور اظہار سے زیادہ مقصد اور خیال کی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ ادیب جو ادب میں جمالیاتی، فنی اور ادبی اقدار پر مقصدیت کو فوقیت دیتے ہیں ادب کو تبلیغ خیال کرتے ہیں۔ ارسطو سے آج تک یہی صورتِ حال رہی ہے۔ اس خیال کے بعض ادیبوں کی نگاہ میں اخلاقی، بعض کی نگاہ میں مذہبی اور بعض کی نگاہ میں مادی مقاصد رہے ہیں۔ ان کے حصول کے لیے ادب کو آلۂ نشر و اشاعت بنایا گیا ہے۔ میرے خیال میں ادب بامقصد بھی ہو سکتا ہے اور نیم مقصدی نیز غیر مقصدی بھی۔ مگر اس کا تینوں حالتوں میں جمالیاتی فنی اور ادبی اقدار کا حامل ہونا ضروری ہے۔ تخلیق، مقصدی ہے مگر غیر جمالیاتی ہے تو اعلا ادب نہیں اگر مقصدی ہے اور جمالیاتی بھی تو وہ مثالی تخلیق ہے۔ در اصل تبلیغ، ترسیل اور اظہار کا تعلق ادیب کے مافی الضمیر اور مقصد سے ہے۔ اگر تبلیغ، ترسیل اور اظہار جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں تو ٹھیک ورنہ بیکار ——

۵۔ ترقی پسند نقادوں نے جدید شاعری اور ادب پر اسی طرح متضاد اور مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے جس طرح جدید، غیر ترقی پسند اور کلاسیکی نقادوں نے۔ چونکہ جدید ادب تشکیلی دور سے گزر رہا تھا، اس کے خد و خال پوری طرح نمایاں نہ تھے۔ اس لیے جدید نقادوں اور غیر جدید نقادوں نے اس کی تنقید و تعبیر میں عجیب و غریب باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے بعض صحیح اور بعض غلط ہیں معروضی تجزیے کے لیے ابھی فضا سازگار نہیں ہے۔ ترقی پسند نقادوں میں سردار جعفری نے جدید ادب کے بعض افکار اور رجحانات کو اپنے نقطۂ نظر کی روشنی میں فرد اور سماج کے لیے مضر ٹھہرایا تو [illegible] محمد حسن

نے جدید ادیبوں کی حالت بے اطمینانی اور بے چینی کو "نئی ترقی پسندی" کا نام دیا۔ جدید ادب کو "نئی ترقی پسندی" قرار دینا ترقی پسند نقادوں کا نیا عرفان ہے نہ ان کی پسپائی، بلکہ حقیقتِ حال کو سمجھنے کی ایک تنقیدی کوشش ہے۔ اگر کوئی نقاد جدید ادب کے داخلی اور بنیادی شواہد کی روشنی میں جدید ادب کو "نئی ترقی پسندی" کا نام دیتا ہے تو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اگر محض رسمًا یا "شواہد" کے بغیر بات کہی گئی ہے تو قابلِ اعتراض ہے۔

۶۔ ہر ادیب ایک شہری ہے، اس لیے اس کے تمام حقوق و فرائض وہی ہیں جو کسی ذمہ دار شہری کے ہیں۔ وہ ملک و قوم کی تعمیر دو طرح کر سکتا ہے۔ (۱) ادب کے دائرے میں (۲) ادب کے دائرے سے باہر یعنی عملی زندگی کے میدان میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ادیب کو محض ادب کی تخلیق سے سروکار رکھنا چاہیے اور اس کے سوا کچھ نہ کرنا چاہیے، بعض لوگ ادیب کے ہاتھ سے قلم لے کر تلوار دینا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں انتہا پسندانہ نظریے ہیں۔ میرے خیال میں ادیب اپنے ہاتھ میں قلم کے ساتھ تلوار اور تلوار کے ساتھ قلم بھی رکھ سکتا ہے۔ ان دونوں میں کوئی بیر نہیں وہ ایک اعلیٰ درجے کا عملی تہذیبی اور سماجی انسان ہوتے ہوئے ایک اعلیٰ درجہ کا ادیب بھی بن سکتا ہے یعنی ملک و قوم کی خدمت اور تخلیقِ ادب میں کوئی تضاد نہیں ہے یہ دو الگ الگ کام ہیں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کا حریف نہیں سمجھنا چاہیے۔

۷۔ نقادوں نے ادب کو نفسیاتی زاویوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں فرائڈ اور ینگ کے نظریوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا۔ فرائڈ نے "لاشعور" کو انسانی جبلتوں، ناآسودہ خواہشوں اور جنسی قوتوں کا گہوارہ کہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "لاشعوری مواد" نئے تجربوں کے ساتھ مل کر تحت الشعور سے ہو کر جب شعور تک آتا ہے تو اس کی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے یعنی لاشعور کا سارا غیر اخلاقی مواد شعور تک آتے آتے مہذب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس نے ادب کو انسانی جبلتوں کی رقص گاہ قرار دیا ہے۔ ادب کو ناپسندیدہ جذبات کا پُرامن اخراج قرار دینا ادب کو فرائڈ اور ینگ کے نظریے سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ یہ ایک مخصوص اندازِ نظر ہے۔ ادب کے نفسیاتی تجزیے، تخلیقی عمل، ادب اور ادیب کے تعلق، ادب کے محرکات اور ادیب کی شخصیت کو سمجھنے میں خاص طور پر معاون ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نتی ادبی اور جمالیاتی معیاروں کے تعین کے لیے بیکار ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ ادب میں جذباتی عنصر کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ مگر ادب میں خالص جذباتی عنصر یا مجرد جذباتی قدر تخیلی عنصر یا فکری قدر کے بغیر بیکار ہے تخییل کی رنگ آمیزی سے جذباتی عنصر یا قدر میں زبردست معنویت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی معنویت قابلِ فہم صورت میں ظاہر ہوتی ہے چونکہ اظہار، ذاتی اور انفرادی معاملہ ہوتے ہوئے بھی ایک خاص قسم کی سماجی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے ہر غیر مہذب جذبہ، ناپسندیدہ خیال اظہار کی سطح تک آکر بڑی حد تک مہذب ہو جاتا ہے۔ اور مجرد جذبات کی ناپسندیدگی کا عنصر بھی کم ہو جاتا ہے۔ — "سماجی فرائض کی ادائیگی" کا انحصار فن کے اثرات کی نوعیت پر ہے۔ اگر اظہارِ جذبات سے تخلیق کار اور قاری یا سامع کو جمالیاتی انبساط ملتا ہے اور اس کی تہذیبِ نفس ہوتی ہے تو وہ یقینًا سماجی فریضہ کو بھی پورا کرتا ہے۔ اگر اس سے یہ تقاضا پورا نہیں ہوتا یا اس کے برعکس منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں تو ایسا ادب سماجی فریضہ کو پورا نہیں کرتا۔ مریضانہ ادب کی اصطلاح عام طور پر ان تحریروں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو جنسی کج روی اور ان کے منفی مضمرات

اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔ اور جو ذہن انسانی پر
ناخوشگوار اور منفی اثر مرتب کرتی ہیں اور جو انسان کو
سستی لذتیت میں مبتلا کرکے اس سے اعلا اقدار
اور جینے کی امنگ چھین لیتی ہیں۔ اگر واقعی کسی ادیب
کی تخلیق یا تخلیقات میں ایسی خصوصیات ہیں تو انھیں
سماجی نقطۂ نظر سے غیر مفید ہی قرار دیا جائے گا۔ اگر ایسی
تخلیقات جمالیاتی اقدار کی حامل ہوں تو انھیں ادب
کے دائرے میں رکھنا پڑے گا۔ چونکہ کسی تخلیق ادب کے
ادب ہونے کا فیصلہ صرف ادبی، جمالیاتی اور فنی
اقدار ہی کرتی ہیں۔ اس لیے مریضانہ نوعیت کی
تخلیقات کو ادب کے دائرے سے خارج نہیں کیا
جا سکتا۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

استاذ شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

۱۔ جدید ادب قدیم ادب سے انحراف بھی ہے۔ اور
اس کی بنیادی اقدار کی بحالی پر بھی زور دیتا ہے۔ بظاہر
ایک متضاد رائے ہے۔ اور قدرے توضیح طلب ہے۔
جدید ادب قدیم ادب سے یقیناً مختلف ہے۔ بنیادی
طور پر یہ ادبی رویّے کے گہرے اختلاف سے اپنی
انفرادیت کا احساس دلاتا ہے۔ قدیم دور میں فنکار کا ذہن
اور تخیل رسخت کوشی کے باوجود زندگی معاشرہ یا کائنات
کے بارے میں انفرادی نتائج فکر کی تلاش کرنے کے بجائے
مروجہ اجتماعی فلسفیانہ مفروضوں کا پابند رہا، نتیجتاً وہ عام
طور پر سماجی سطح پر بھی قابلِ فہم مسائل کو پیش کرتا رہا۔ اور
ماورائی حقیقت کی پر اسراریت سے پہلو بچاتا رہا، اور
ثنویت کی شکست و ریخت سے محفوظ رہا۔ میر، درد
اور دلی کی تباہی کے مرثیے لکھتے رہے۔ غالب متشکک
ذہن رکھنے کے باوجود "خدایے کہ داشتی داری" کہتے رہے،
اقبال مشینی تہذیب کی پیش رفت سے روحانی اقدار
کی تباہی سے متردّد رہے فیض سیاسی جبریت کے
شاکی رہے، فکشن میں پریم چند، کرشن چندر اور
بیدی طبقاتی مسائل پر لکھتے رہے، اور اپنے دلوں کا
بوجھ ہلکا کرتے رہے۔

جدید ادب میں اس کے برعکس مفروضوں، نظریوں
اور عقیدوں کے جال سے نکل کر حقیقت کی بیکرانی
سے متصادم ہونے کا رویّہ نمایاں ہے۔ مثال کے طور
پر وجودی رویّے کے تحت فنکار متخالف کائنات
میں اپنے بے مایہ وجود کی آگہی کا کرب جھیل رہا ہے۔
کائنات، خلا اور تباہی کے مسائل کی پر اسراریت
اسے ورطۂ حیرت میں ڈالے ہوئے ہے، یہ حیرت،
گمشدگی اور کرب جدید ادبی رویّے کی تشکیل کرتا ہے،
ہاں، یہ ادب ان معنوں میں قدیم ادب کی بنیادی
اقدار کی بحالی پر زور دیتا ہے کہ یہ معلومات و خیالات
کے نظمانے کو نہیں، بلکہ ان کی تخلیقی بازیافت کو اہمیت
دیتا ہے۔ شیکسپیر یا غالب کی ادبی عظمت کا راز اس
بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے فن کے تخلیقی کردار
کی شناخت کی۔ اور اس کا تحفظ کیا، انھوں نے
اپنے تخلیقی لاشعور کے سمندر کی غواصی کر کے عالمگیر
تجربات کے لعل و گہر دریافت کیے۔ نیا ادیب ہر حال
میں شعر یا فن کے تخلیقی کردار کے استحکام پر زور دیتا
ہے۔

۲۔ جدید ادب میں موضوعاتی تبدیلیاں تو متعدد واقع
ہوئی ہیں، لیکن شعری ہیئت اسی رفتار اور مقدار
کے ساتھ تبدیلیاں قبول نہیں کر چکی ہے۔ یہ صحیح ہے
کہ نظم آزاد اور معرّیٰ کے بعد حالیہ برسوں میں نثری
نظمیں بھی لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ شعر کی داخلی
ہیئت سے منطقی ربط کا اخراج ہو گیا ہے، شعر و
ادب کے کئی نمونوں کا اطلاق چشمۂ شعور کی رو کی
تکنیک پر ہوتا ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ یہ تبدیلیاں
ان "انقلابی" تبدیلیوں سے مطابقت نہیں رکھتیں

جو موضوع میں واقع ہوئی ہیں۔ نئے شعری ادب میں کرب آگہی، رفتار وقت، نارسائی فکر، تباہی، حیرت، تنہائی، جنسی بحران، خوف، کرب تخلیق جیسے موضوعات حد درجہ پیچیدہ، داخلی اور گریز پا ہیں، اور یقیناً نئے ہیئتی تجربوں کے متقاضی ہیں، تبدیلی کی آہستگی کا ثبوت غزل (بعض داخلی تبدیلیوں کے باوصف) کی عملداری بھی فراہم کرتی ہے

۳۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل ہے، البتہ یہ حقیقت ہے کہ صنعتی پھیلاؤ نے تنہائی کے احساس کو شدید تر کیا ہے، میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ یہ احساس تخلیقی ذہن کا ایک ایسا وصف ہے، جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے، فنکار واقعتاً ہر دور میں تنہا رہا ہے۔

۴۔ بعض لوگ اس خیال کے حامی ہیں کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ عہد قدیم کا اکثر و بیشتر ادب تبلیغی (DIDACTIC) رہا ہے، موجودہ عہد میں اقبال (تخلیقی ذہن کے باوجود) ادب کے تبلیغی کردار کے قائل ہیں، ترقی پسند ادب بھی مجموعی طور پر تبلیغی نوعیت کا رہا ہے میں نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط کرتے ہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ ادب کے تبلیغی کردار کے موئیدین اس کی تخلیقی ماہیت کو ثانوی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اسے بعض معین مقاصد کا ذریعہ بناتے ہیں، رہا ترسیل کا مسئلہ، تو وہ تخلیقی ادب ہو یا تبلیغی، دونوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟

۵۔ ترقی پسندوں کا جدید ادب کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دینا پسپائی کا ہی اعتراف ہے، اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینا ہی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی نئے عرفان کو دخل نہیں، اس لیے کہ نیا ادب اگر ترقی پسندی کی توسیع ہوتا، تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا، اصل بات تو یہ ہے کہ جدید ادب، توسیع نہیں بلکہ انحراف ہے، اور یہ انحراف ترقی پسند ادب سے ہی نہیں بلکہ اُس تمام ادب سے ہے، جو تخلیقی جوہر سے محروم ہے، نیا ادب بنیادی طور پر اپنے تخلیقی وجود کی اہمیت پر زور دیتا ہے، یہ ترقی پسندی کی توسیع نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ترقی پسند ادب تخلیق سے زیادہ تبلیغ پر انحصار کرتا رہا۔ لہٰذا اپنے تبلیغ کی توسیع قرار دینا عرفان کو نہیں بلکہ عدم عرفان کو ظاہر کرتا ہے۔

۶۔ ادب براہ راست ملک و قوم کی تعمیر جدید میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ادب کی کوئی افادیت نہیں، اس کی افادیت اس کی بصیرت افروزی میں مضمر ہے، ملک یا معاشرے کی تعمیر نو کا کام کوئی یک سطحی عمل نہیں، اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں، وہ ملک کے سچے بہی خواہ نہیں، ملک یا معاشرے کی تعمیر نو کے کام کا ایک پہلو یہ ہے کہ اُن گمبھیر مسائل و مشکلات کا ادراک حاصل کیا جائے۔ جو قومی زندگی کا روگ بن گئے ہیں، جب تک مرض کی صحیح تشخیص نہ ہو، اس کا علاج بیکار ثابت ہو سکتا ہے۔ بلراج کومل یا عمیق حنفی کی معاشرہ شناسی سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ ادب زندگی کی بصیرت کو عام کر کے اپنے افادی کردار کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

۷۔ یہ صحیح ہے کہ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے (سب سے پہلے ارسطو) نے بھی کی ہے، کہ ناپسندیدہ جذبات کے پر امن اخراج کا ایک ذریعہ ہے، اور یہ تعریف (میں سمجھتا ہوں) اپنی جگہ پر درست ہے۔ جدید نفسیات کے اصولوں کی مدد سے تخلیقی عمل کے رموز سربستہ سے واقفیت بڑھتی جا رہی ہے، اور اس سلسلے میں جتنا علم عام ہو جائے، اچھا ہے، لیکن مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ اگر ادب کتھارسس کا کام کرتا ہے تو یہ عمل مریضانہ ادب پر بھی صادق آئے گا۔ اس لیے کہ ادب کو صحت مند یا مریضانہ ادب کے خانوں

میں تقسیم کرنے کا کوئی جواز نہیں، ادب ادب ہے،
ادیب یا شاعر کے تخلیقی تجربات کا اظہار لامحالہ ایسا
ادب قابلِ قدر ہے، اور یہ مریضانہ نہیں ہو سکتا،
جس طرح اسے صحت مند قرار دینے کی ضرورت بھی
نہیں۔

ابوالفیض سحر

اسسٹنٹ ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ، آر۔ کے۔ پورم، نئی دلی

۱۔ ادب سے مراد اگر واقعی ادب ہو تو پھر وہ محض ادب
ہی ہوتا ہے "قدیم" یا "جدید" قائم بالذات کوئی وصف
نہیں۔ ہاں، موقتی طور پر یہ سابقے یا لاحقے لیبل کا کام
دے سکتے ہیں۔ نئے اور پرانے دور کے ادب کو ایک
دوسرے سے متمائز کرنے کے لیے۔ لیکن انہیں دو مختلف
یا متضاد خانوں میں تقسیم کرکے پھر ہر ایک کی ایک علیٰحدہ
عمارت تعمیر کرنے اور مختلف تاویلات پیش کرنے،
غیر ضروری مسائل اور مباحث میں الجھنے سے، فکر و فن
کے تجزیاتی مطالعے کے دوران آگہی کی بہ نسبت گمراہی کے
امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ مکتبی
اندازِ فکر کی تسکین ہو جائے۔ گزشتہ کل کا ادب "اپنے
عہد کا آج کا ادب" تھا ہمارے عہد کا آج کا ادب ہمیشہ
آج کا ادب، ادب نہیں رہے گا۔ یہ بھی کل کل
کا ادب ہو جائے گا۔ قدیم ادب بھی اپنے زمانے میں اتنا
ہی جدید تھا جتنا آج کا جدید ادب آج جدید ہے۔ جدیدیت
کی حد صرف آج پر ختم نہیں ہوتی۔ میرا یہ ایقان ہے کہ
ہر زمانے میں تخلیق ہونے والا ادب جدید ہوتا ہے
اور اس کی بنیاد کے پتھر قدیم ادب کے چونے اور گارے
میں پیوست ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادب کی بنیادی
اقدار کا تعلق ہے وہ کسی نہ کسی صورت میں اس وقت
تک اس میں ہوں گی جب تک کہ ادب ادب ہے
البتہ چونکہ دنیا کی ہر چیز ایک اعتباری قدر رکھتی ہے اس
لیے ہو سکتا ہے کہ یہ اعتبارات فرد کے لحاظ سے، سماج
سماج کے اعتبار سے عہد کے سیاق و سباق میں بدلتے
رہیں۔ کل کے ادب کو کل کے تناظر میں دیکھنا چاہیے آج
کے ادب کو آج کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔

۲۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا جدید ادب ہیئتی تبدیلیوں
کا بھی آئینہ دار ہے اور موضوعاتی تبدیلیوں کا بھی اور
یہ سانس لیتے ہوئے معاشرے کے زندہ ادب کی علامت
ہے۔ ہیئت، مواد اور موضوع ادب کے بنیادی اجزا ہیں۔
ان میں ہمیشہ یکسانیت نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر دور اور
ہر علاقے کے ادب میں اپنے سماج اور اپنی تہذیب کا
شعور و ادراک پایا جاتا ہے۔ اپنے عصر کی روح رچی بسی
ہوتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر احساس اور اظہار
کی سطحوں پر تنوع پیدا ہوتا ہے اور یہ تنوع ہی ہیئت،
مواد اور موضوع کی تبدیلیوں کا نقیب ہوتا ہے تنوع
کے اس تسلسل کے بغیر ہم ادب کے ارتقا کا تصور نہیں
کر سکتے۔ جہاں تک آج کے نئے ادب میں جیسے کچھ
لوگ جدید ادب کہہ کر اس کی ایک انفرادیت قائم
کرتے ہیں، ہیئتی اور موضوعاتی تبدیلیوں کی بات ہے
اس ضمن میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس میں ہیئتی تبدیلیاں
بھی ہوئی ہیں نظم اور نثر دونوں میں۔ اور یہ تبدیلیاں
فن پاروں کے صرف ڈھانچوں کی حد تک ہی محدود
نہ رہیں بلکہ اسلوب و آہنگ، الفاظ و تراکیب، علائم
و مفاہیم کی وسعتوں اور گہرائیوں کے نئے نشانات بھی
نمایاں ہوئے ہیں۔ موضوعات بھی بدلے ہیں۔ لیکن
بعض موضوعات کو گالی کے انداز میں بار بار دہرایا
بھی گیا ہے۔ تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں
ہے۔ بہر حال اب یہ تکرار جو ایک طرح ٹھہراؤ
کی صورت میں تبدیل ہو کے رہ گئی تھی، پچھلے برف
کے پانی کی طرح تنوع کا سفر پھر شروع کر رہی ہے۔

۳۔ تنہائی کا احساس، دراصل نہ تو محض صنعتی پھیلاؤ
کا رد عمل ہے اور نہ ہی کسی تخلیقی ذہن کا ایجاد

ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہو بلکہ
تنہائی کا احساس درحقیقت انسان کا ایک نفسیاتی احساس
ہے جو مخصوص حالات میں نمایاں ہوتا ہے ہاں یہ اور بات
ہے کہ حالیہ صنعتی پھیلاؤ کی وجہ سے دنیا نے خاص کر
مغربی معاشرے نے اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو پس پشت
ڈال کر مادی، موقتی اور فوری ضروریات ہی کو زندگی کے
لیے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اس لیے ادب میں بھی بہ حیثیت
مجموعی اس احساس کو صنعتی پھیلاؤ کے ہی ردعمل کی
صورت ملتی رہی۔ اور ایک خاص گروہ نے انفرادی
طور پر بھی اسے ذاتی احساس اور تخلیقی ذہن کے وصف
کے طور پر پیش کیا۔

۴۔ کسی کلیہ، نظریے، تحریک یا تصور کے بارے میں میں
نہ تو بعض ادبی لوگوں ہی کو سب کچھ سمجھتا ہوں اور نہ ہی ان
کے سمجھے یا سمجھائے گئے فارمولوں کو ہی من و عن درست
مانتا ہوں۔ مخصوص خیالات میں بعض باتیں درست
بھی ہو سکتی ہیں۔ ویسے ہر ایک کو رائے رکھنے اور
رائے دینے کا منفی یا مثبت حق حاصل ضرور ہے۔
ذرا دقت نظر سے کام لیتے ہوئے دیکھا جائے تو
ہر ادب، ایک صورت حال کا آئینہ دار ہوتا ہے
اس صورت حال کے تانے بانے ملائے جائیں تو
ایک خیال، ایک منظر ایک موضوع ایک پیغام کے
خد و خال نمایاں ہوتے ہیں خواہ اسے آپ کسی نام سے
یاد کریں۔ اظہار کی پرتیں الٹیں تو اس میں احساس تڑپتا
دکھائی دیتا ہے۔ اظہار کے ارتعاشات کو ادبی تنقید
میں ابلاغ کہا جاتا ہے اور اسی ابلاغ کی ڈور کو عام طور
پر ترسیل کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۵۔ ادب کے سلسلے میں آج کے مشہور ناقدین کے برعکس
میرا رویہ شروع سے ہی مختلف رہا ہے۔ ادب کو
جانچنے پرکھنے سے قبل میں اپنے اطراف "گروہی وفاداری
کا حصار" نہیں باندھتا۔ ہاں یہ ضرور کرتا ہوں کہ ادب
کو ادب کی حدود میں دیکھوں، سمجھوں۔ جدید ادب
کو میں کسی نئی ادبی تحریک کا اثاثہ نہیں مانتا۔ جدید ادب
بیشتر ایک رویے، ایک نقطۂ نظر ایک انداز فکر
کا انحراف اور گریز پر مبنی اظہار ہے، مگر بھرپور
اور کٹیلا۔ جہاں تک اس رویّے کی حقیقت پسندی اور
اظہار کے درست طریقے کا تعلق ہے یہ ترقی پسند
تحریک کی خصوصیات میں سے رہی ہیں۔ پیکر تراشی
اور استعارے اور علائم میں جدید ادب جتنا جدید ہے
اتنا ہی قدیم ادب سے قریب بھی ہے۔ بعض دفعہ تو
سحرالبیان، گلزار نسیم کی تشبیہات اور استعارات
کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ دراصل ادب چونکہ ارتقا
پذیر ہوتا ہے اس لیے ارتقا کا سفر ہمیشہ سابقہ
کوششوں کی توسیع اور اس سے پھوٹنے والے
اجتہاد کا غماز ہوتا ہے۔

۶۔ ملک اور قوم کی تعمیر جدید میں ادب یقیناً اہم کردار
ادا کر سکتا ہے اس سلسلے میں اس کی حیثیت ایک
غالب عنصر کی ہوتی ہے یا ذیلی یہ بات اور ہے۔ بہر
حال اس سلسلے میں، میں تو یہی کہوں گا کہ ادیبوں کو
محض بھگتی تحریک یا صوفی مت کے شاعروں کی طرح
ایک نفسیاتی ماحول ہی تیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ حسب
ضرورت، حسب موقع ملک اور قوم کی تعمیر کی ذمہ داریوں
سے بھی عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ اہم موضوعات پر قلم اٹھانا
چاہیے۔ نعروں کو بھی اگر نگارشات میں جگہ دینے کی
ضرورت ہو تو ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔ ملک اور
قوم کی تعمیر ایک اجتماعی اور ہمہ گیر عمل ہے جس میں فرد اور
جماعت دونوں کے دائروں میں ادیب کے ذات
کے اندرونی سفر اور بیرونی سفر بھی شامل ہوتے ہیں۔
اس لیے اس عمل میں بھی ادیبوں شاعروں اور فنکاروں
کو برابر کا شریک ہونا چاہیے۔

۷۔ ادب یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرح کا "ہائیڈ پارک" ہے جہاں
ہر کس و ناکس کو تحریر اور تقریر کی پوری آزادی حاصل
ہے ہر زمانے میں لوگوں نے اسے اپنی اپنی جگہوں سے

اپنی اپنی آنکھوں اور اپنی اپنی عینکوں سے دیکھا اور دکھایا ہے "ناپسندیدہ جذبات کے پُرامن اخراج کا ایک ذریعہ" ادب کی ایسی ہی توضیحات میں سے ایک ہے۔ کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے ہمیں مسئلہ کے تمام پہلوؤں اور اس کی تمام باریکیوں، نزاکتوں اور گہرائیوں سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے ورنہ جو بھی رائے قائم ہوگی وہ ناقص، ادھوری اور ناپختہ ہوگی جہاں تک سماجی فریضہ کا مسئلہ ہے انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ وہ تنہا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس کی زندگی میں سماج اور معاشرہ اور اس کا شعور ناگزیر ہے۔ انسانوں کو اپنی ذات کے تعلق سے ہر طرح کی آزادی حاصل ہے لیکن جہاں سے اس کی ذات کا دائرہ دوسری ذات کے دائرے سے ٹکراتا ہے وہاں سماجی فریضہ کے شعور کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادیب، ادب کو اپنی تنہا ذات کی حد تک محدود رکھے، نہ اس کا اظہار ہو نہ اس کی اشاعت ہو نہ کوئی دیکھے نہ سنے اس طرح گویا ادب کی جماعتی یا سماجی ضرورت ختم ہو تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں وہ جو چاہے کرے۔ مگر جب ماحول اور سماج کے دائرے شروع ہوں جماعتی زندگی اور سماجی تہذیب کی فصیلیں شروع ہوں تو اس میں سماجی شعور کے بغیر مہذب زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔

اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔

۲۔ موضوعاتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تدریجی ہیئتی تبدیلیوں کا آنا لازمی ہے۔ ایسی تبدیلیوں کو قبول کرنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ کچھ تو تبدیلیاں بے ڈھنگی ہوتی ہیں کچھ تقلید پرست انہیں مشکل سے قبول کرتے ہیں۔

۳۔ ہر بڑا ذہن اپنے گرد وپیش میں گھرا ہوا خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک اندرونی اور دائمی کیفیت ہے جس کا اظہار ادب میں ہوتا ہے صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل وقتی اور خارجی ہے۔

۴۔ میری ناچیز رائے میں ہر ادب تبلیغ نہیں ہوتا۔ ادب میں کسی خاص نظریے کی تبلیغ کچھ لوگوں کو کچھ وقت کے لیے اور کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لیے متاثر کرتی ہے لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لیے متاثر نہیں کرسکتی۔

۵۔ ترقی پسند ناقد مخصوص سیاسی نظریات کے حامل رہے ہیں۔ جدید ادب کو ان کے دائرۂ فکر میں محدود نہیں کیا جاسکتا لہٰذا اسے ترقی پسندی کی توسیع بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جدید ادب کی حدود پر سیاسی بندشیں نہیں ہیں۔

۶۔ ادب انسانی شعور کو بیدار کرکے خود بخود ایک نفسیاتی ماحول پیدا کرتا ہے ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں بھی اس کا اہم مقام ہے۔ لیکن چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینے سے ادب تخلیق نہیں ہوتا۔

۷۔ ادب پسندیدہ و ناپسندیدہ دونوں طرح کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ پسندیدہ و ناپسندیدہ اصطلاحیں واضح نہیں ہیں۔ جو جذبات کچھ لوگوں کے لیے پسندیدہ ہیں دوسروں کے لیے ناپسندیدہ ہوسکتے ہیں آج کے ناپسندیدہ جذبات کل کے پسندیدہ جذبات ہوسکتے ہیں۔ ناپسندیدہ جذبات کی محرک اگر سماجی سچائی ہے اور اگر ان کا اظہار ادب کی تخلیقی [illegible] اور ہیئتی حسن کے ساتھ ہوا ہے تو وہ جذبات ناپسندیدہ نہیں [illegible] گے لہٰذا ایسا ادب سماجی فریضے کا حامل ہو جائے گا۔

ستیہ نند جاوا

ڈائرکٹر اسکول آف فارن لنگویجز آر۔ کے۔ پورم، نئی دلی

۱۔ میری ناچیز رائے میں جدید ادب قدیم ادب سے انحراف نہیں ہے بلکہ دونوں ایک ہی مالا کے منکے ہیں جو آپس میں پیوست بھی ہیں ایک دوسرے سے الگ بھی۔ بنیادی طور پر دونوں اپنے دور کی

غزلیں

عروج زیدی

رنگینیِ حیات کا پھیلا ہوا ہے جال
میں پھنس کے رہ نہ جاؤں مجھے خود ہے احتمال

دُنیا سمجھ سکے مجھے دُنیا کی کیا مجال
میں ذہنِ کائنات میں چبھتا ہوا سوال

یہ آج کل تو شوخیِ دوراں کی زد میں ہیں
ذوقِ جمال و فرصتِ نظارۂ جمال

یہ طرزِ فکر واقعی توہینِ عزم ہے
آغازِ کار ہی میں ہے اندیشۂ مآل

وقت اور انقلاب کا باعث، غلط، غلط
دامانِ وقت میں ہے فقط گردِ ماہ و سال

میں نام کا عروج تھا دُنیائے شعر میں
تیرا کرم کہ مجھ کو ملا، منصبِ کمال

▲▲

شباب للت

تیرے کرم بن رازِ محبت میری سمجھ میں آئے کیا
میرے کچے ذہن کی ڈالی پیار کے پھول کھلائے کیا

آج ہوئیں خاموش یکایک شوخ بدن کی بانسریاں
ساز نہیں تو سوز اکیلا پیار کے نغمے گائے کیا؟

اب تو روٹھ کے جانے والا اگلے جنم تک روٹھے گا
تو میرا غم بانٹنے والے! میری دھیر بندھائے کیا؟

آنکھوں سے اوجھل رہ کر بھی کھیل رہا ہے سارے کھیل
وہ پردے میں رہنے والا رنگ منچ پر آئے کیا

پل دو پل کا ساتھ یہ تیرا اور مجھے سلگا دے ہے
چھینٹوں سے تو جنم جنم کی میری پیاس بجھائے کیا

میرا من بے داغ آئینہ، جیون میرا کھلی کتاب
الجھن میں ہے میرا حاسد مجھ پہ دوش لگائے کیا

میں جیسی ہوں میں مجرم ہوں میں پاپی ہوں مگر شباب
آن گراہوں چرنوں میں تو اب وہ مجھے ٹھکرائے کیا

▲▲

خلش بڑودوی

حالات کے سپرد ہوں یا سامنا کریں؟
اے زندگی بتا ہمیں کیا فیصلہ کریں

احباب کا تو کام یہی ہے جفا کریں
اتنی ذرا سی بات پہ کیا دل برا کریں

اب تو ہمیں کسی پہ بھروسہ نہیں رہا
لوٹے وہی ہمیں جسے ہم رہنما کریں

اِس میں بڑے بڑوں نے بھی کھائی ہیں ٹھوکریں
الفاظ کی زمیں پہ سنبھل کر چلا کریں

پتھراؤ کا ہمیں بھی بڑا شوق ہے مگر
ہم کانچ کے مکاں میں رہتے ہیں کیا کریں

باہر ہوں دشمنوں کے سپاہی تو اے خلش
غالب[2] کی طرح گھر میں نہ بیٹھیں تو کیا کریں

▲▲

○ گھیر سیف الدین خاں۔ رام پور ○ سول لائن، دھرمسالہ، ہماچل ○ یاقوت پورہ۔ بڑودہ-۶

[1] مرحوم دوست پورن کمار ہوش کے شعری مجموعے کا نام، [2] غدر میں مرزا غالب چار مہینے اور چار دن دروازے بند کر کے اپنے گھر میں بیٹھے رہے تھے

دو پیارے اور نظم

کرشن مراری

سکھین لِکھ لکھ پاتی ساجن اپنے پاس بُلائے رے
میں تو لِکھنا جانوں ناہیں کیسے ساجن آئے رے

انترگھٹ اِک پیاس لگی ہے آئے کون بجھائے رے
مِتوا من کا ناہیں آیا رُت آئے رُت جائے رے

ساجن کے سنگ ہولی کھیلے اپنے انگ بچائے رے
بھولی سجنی جانے ناہیں منوا "رنگیا" جائے رے

نگری نگری من کا جوگی رمتا رمتا جائے رے
بھٹکی بھٹکی اِک اُلجھن کا سُوجھت ناہیں اُپائے رے

سپنوں میں کھوئی البیلی شردھا اپنی بسرائے رے
آن مِلا پیتم سپنوں میں سپنوں کو گرمائے رے

شکتی آتما کی پائی اُجیارے اِترائے رے
اندھیارے اب اُجیاروں کی آہٹ سے گھبرائے رے

▲▲

احمد حسین شمس

تلاش وقت کی

سامنے اک فلک بوس دیوار تھی
دفعتاً پاؤں تفتیش کے رُک گئے
فکر کے دشت میں اک دھماکا ہوا
وقت کا دیوتا مسکرانے لگا
ہم ٹھٹک کر دہیں
آسماں پر لگے ڈھونڈھنے منبعِ صوت کو۔
ناگہاں ایک آواز
اس پارِ دیوار سے
آکے جنگل کے کانوں سے ٹکرا گئی
ہم یہاں ہیں
یہاں ہیں، یہاں ہیں، یہاں
اور تم ..... !
جس جگہ ہو
وہاں تم نہیں۔
فکر کے دشت میں اک دھماکا ہوا۔
وہ فلک بوس دیوار معدوم تھی
وقت کا دیوتا مشتعل ہو گیا
ایک شعلہ لپکنے لگا
اور پھر
چند لمحوں میں وہ دیوتا
راکھ کا ڈھیر تھا۔
اور ہم
راکھ میں مل کے
جانے کہاں اُڑ گئے

▲▲

○ ۴-سی- اِردن روڈ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
○ کشن گنج - پورنیہ - بہار

نظمیں

اقبال کرشن

سراب وصحرا

سماعتوں کے سراب وصحرا میں گھومتی ہے
ہماری آواز ڈھونڈتی ہے
کنواں کوئی التفات کا
چشمہ کوئی میلان کا
تجادب کا کوئی جھرنا
ہماری آواز ڈھونڈتی ہے
سماعتوں کے سراب وصحرا میں گھومتی ہے

▲▲

طرب میرٹھی

اذیت کا سمندر

اِک اذیّت کا سمندر ہے
کہ جس کی موجیں
مجھکو ڈس لینے پہ آمادہ ہیں
اس اذیّت کے سمندر میں مجھے پھینکا ہے
خود مری فکر و تنظر نے
مرے احساس کی بے باکی نے
میری تخیّل کی آزادی نے
میں اگر چاہوں
تو اس گہرے سمندر سے نکل سکتا ہوں
مجھکو منظور نہیں ہے لیکن
ان عقائد کا
روایات کا احساں لینا
کشتیاں جن کی بنا کر
میں کنارے پہ پہنچ سکتا ہوں

▲▲

عنبر شمیم

نئی سمت

اس جگہ جانا ہے ہمکو
جس جگہ سچّائی زندہ ہے ابھی تک
جس جگہ انسان اپنے ذہن کا مختار خود ہے
جس جگہ انسان کے احساس کو روندا نہیں جاتا ہے لیکن
قبل اس کے
سامنے ہے
دلدلی چکنی سی دھرتی
میں نے سُن رکھا تھا شاید
دلدلی، چکنی زمیں سے دُور ہٹ کر
راستہ کوئی نیا ہے
اور میں اندھی گپھاؤں کی طرف کو مڑ گیا ہوں
جو کسی تاریک جنگل کی طرف جاتی ہیں شاید!!

▲▲

○ اسحاقیہ سیکنڈری اسکول جودھپور راجستھان ○ ۲۲/۷ مدرتلا لین، ہوڑہ -۱ ○

سلمیٰ فردوس نقّاش

نظمیں

دھوئیں کی لکیر

دسمبر کی یخ بستہ بلیک نائٹ کا ٹمپریچر
نارمل درجے سے بھی نیچے گر گیا
کانگڑی کی دم توڑتی ہوئی سانسوں کو لیے
اوسوال کی بنی ہوئی لال کمبل میں
اپنے وجود کے بوجھ کو سکیڑے ہوئے تھا
بستر پر بکھری کتابوں میں قید
خلیل جبران کا فلسفہ، اختر کی رومانی غزلیں
اُن سے اُلجھا تھا وہ کچھ دیر
لیکن ذہن بھٹک گیا ماضی میں
کسی سے کیے ہوئے عہد و پیماں کے شراروں میں
گرجا گھر کے گھڑیال نے ابھی بارہ بجائے بھی نہ تھے
ابھی پہریدار کے "خبردار جاگتے رہو" کے الفاظ گونجے بھی نہ تھے
شمع پہ وقتِ نزع طاری ہو گیا
اک ہچکی لی، شعلہ بھڑکا اور بس ———
بے رنگ و بے نور آنکھیں
دھوئیں کی اُس لکیر پر مرکوز ہو گئیں
جو شراروں پر حاوی ہو گئی تھی !!

شیشے کا خواب

ٹوٹی ہوئی یادوں کو کیسے جوڑیں
لامتناہی سلسلہ بکھرا ہوا
کچھ اِس پتھر پر، کچھ اُس پتھر پر
لمحہ لمحہ ڈھلتی شام
قطرہ قطرہ پگھلتا سورج
بوند بوند ٹپکتی چاندنی
پیاسا پیاسا بہتا پانی
لمحے، قطرے، بوندیں، کدھر سے جوڑ دوں
یادیں شیشے کا خواب ہی تو ہیں
بھلا شیشے کا خواب کہیں جُڑ سکتا ہے !!

امر سنگھ

تناظر

دِن چڑھ آیا تھا ۔
(احساس ہوا)
آنکھ کھُلی ۔ سر کے پیچھے شدید درد ہو رہا تھا ۔ کراہ کر پہلو بدلا تو دیکھا کہ ذرا فاصلے پر میری بیوی خون میں نہائی پڑی تھی ۔ اُس کا خون ، میرا خون اور نہ جانے کِس کِس کا خون مِل جُل کر ایک ہو گیا تھا اور ایک گہری سُرخ پپڑی کی صورت میں زمین کی سطح پر جم گیا تھا ۔

رینگ کر ، گھسٹ کر اُس کے قریب ہوا ۔ ہاتھ لگا کے دیکھا تو اُس کا جسم سرد تھا ۔ اُس کی خوبصورت آبگوں آنکھیں منجمد ہو کر بے نُور کانچ بن گئی تھیں ۔

سر کو تھام ، سنبھل کر اُٹھا ۔ اِرد گرد دیکھا ۔ ساری بستی راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی ۔

کل رات اچانک اُنھوں نے ہلّہ بول دیا تھا ۔ جو ہماری رُوحوں کو نجات دلانے کا دعوے کرتے تھے ۔ جو بعد از مرگ زندگی کے نگہبان بنتے تھے اور موجودہ زندگی کو جنّت بنانے کے داعی تھے وہ ہماری بھیڑیں ہانک کر لے گئے تھے ۔ بستی کو لوٹ کر مکانوں کو آگ لگا دی تھی اور مکینوں کی روحوں کو آزاد کر کے چلتے بنے تھے ۔

مگر میری رُوح کچھ اِس قدر ڈھیٹ واقع ہوئی تھی کہ اِس زخموں سے چُور اور خون سے نہائے جِسم سے بھی آزاد ہونے پر رضامند نہ تھی ۔ وہ اِسے ریلتے دھکیلتے اِس نجاست گاہ سے نکل بھاگی ۔

اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ رُوح کو قید سے کِس قدر محبّت ہے ——— عشقِ صادق کی حد تک ۔ اور میرا ذہن ہنسا کہ عشق کے ساتھ صادق ہونے کی بھی عجیب شرط ہے ۔ عشق گویا صدق کے بغیر بھی عشق ہوتا ہے !

گھِسٹتے ہوئے جسم کو ٹھوکر لگی تو اس نے چِلّا کر کہا ———

ابے احمق گلہ بان !! او ، بے عقل بھیڑوں کے بیوقوف پروردگار ! تو الفاظ کے کس چکر میں پڑ گیا ؟ کوئی عافیت کی جگہ تلاش کر کہ عشق ، جِسم اور روح کے سلاسل کو برقرار رکھنے کی جہد و جستجو کا نام ہے ۔ اِس کی تمام شرائط و صفات محض حیلہ جوئیاں اور بہانہ سازیاں ہیں ۔

جِسم کی فہمائش نے میرے ہوش ٹھکانے لگا دیئے اور میں عافیت کے مقام کی تلاش میں نکل پڑا ۔

یہ جگہ مجھے مِل گئی ——— یہ ایک اُجڑی ہوئی خانقاہ کے کھنڈر تھے ایک ٹوٹے پھوٹے حوض میں بارش کا پانی جمع تھا ۔ اِرد گِرد بے شمار جھڑبیریاں تھیں ۔ خودرو ۔ کہ یہ اپنے کانٹوں اور بیروں سمیت خودرَو ہی ہوتی ہیں ۔

اس جوہڑ نُما حوض کا پانی پی کر ، جھڑبیریوں کے بیر کھا کر اور کھنڈروں کی چھاؤں میں استراحت کر کے میں نے جسم کی مرمت کی ۔

پھر ایک دِن تن نے میرے کان میں کہا : دیکھ میں اب دُرست ہو گیا ہوں مگر صحت یاب نہیں کیونکہ صحت کی بازیافت یہاں رہ کر نہیں ہو سکتی ۔ سفر کا عزم کر کہ صحت کا تر دد کسی بستی ، کسی شہر میں جا کر ہی ممکن ہو گا کہ جھڑبیریاں زندگی کو ٹھیل تو سکتی ہیں ۔ چلا نہیں سکتیں ۔

آفس انچارج پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا ۔ گوردوارہ سندر سنگھ روڈ ، رگھوناتھ چوک ۔ جموں (کشمیر)

پھر جلد ہی جب بیر ختم ہو جائیں گے اور صرف کانٹے باقی رہ جائیں گے تب تو کیا کرے گا؟

اور میں نے اُس بستی کا رُخ کیا جہاں جا کر ہم اپنی بھیڑوں کو منڈوایا کرتے تھے اور اُون اور مینڈھے بیچا کرتے تھے۔

بستی میں پہنچا تو اُس آڑھتی کی دُکان پر گیا جس کے ذریعے سے ہم اُون اور بھیڑوں کی فروخت کیا کرتے تھے کہ میری کچھ رقم سابقہ سودے میں اُس کے ذمے نکلتی تھی۔

اپنی روئداد میں نے آڑھتی کو سُنائی اور اپنی رقم طلب کی کہ یہی ایک پونجی باقی بچی تھی جو اِس مصیبت میں میرے آڑے آتی۔

یہ بات سُن کر آڑھتی نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

اُس نے کہا! میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔

ذہن پر واضح ہوا کہ رقم نہیں ملے گی۔ جسم کی صحتیابی کا سامان نہ ہوگا۔

ذہن نے جھٹکا کھایا تو سلاسل کا تناؤ بڑھ گیا۔ عشق نے خاموش جنون کی شکل اختیار کی اور میں پیادہ پا چل نکلا کہ کہیں جہد و جستجو کا میدان نظر آئے۔

اور پھر میں نے خود کو غلہ منڈی میں پایا۔ یہ وہ منڈی ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ بچپن میں میں اپنے باپ کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا اور بعد ازاں اکیلا ہی۔

کبھی یہ غلہ منڈی ہوتی ہوگی مگر اب تو ہر شے ہر جنس کی منڈی ہے ان ہی برسوں میں اِس کے کاروبار کا دائرہ پھیلتا اور متنوع ہوتا گیا ہے۔ مگر اس کی شکل و صورت اور اس کے اجناس و افراد کے بے ہنگم ہجوم میں خاص فرق رونما نہیں ہوا۔ اضافہ ضرور ہوا ہے کہ بیل گاڑیوں ٹھیلوں اور اونٹ گاڑیوں کے ساتھ ٹرک ٹمپو اور ٹریکٹر ٹریلر اُلجھتے دکھائی دینے لگے ہیں۔ گزرگاہ وہی اُکھڑی اُدھڑی اور اونچی نیچی ہے۔

تن بار بار کہہ رہا تھا کہ اس بے ہنگم ہجوم میں اپنے لیے جگہ تلاش کر اور میں اِس کے بیچوں بیچ چلنے کے سوا اور کچھ کر نہ پا رہا تھا کہ منڈی مجھ سے قطعی بیگانہ تھی۔

میں سب کو دیکھ رہا تھا مگر میری جانب دیکھنے کی کسی کو فرصت تھی نہ تاب کہ جنون کا جلال خاصا لرزہ خیز ہوتا ہے اور اجتناب اِس کا ردِ عمل۔

اچانک بازار کے پرلے سرے پر چوک میں سے ایک غلغلہ اُٹھا۔ رفتہ رفتہ یہ اسی طرف آنے لگا۔ نزدیک آیا تو دیکھا کچھ آدمی ایک رستے کا سرا تھامے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے پہچان کی یہ امن و قانون کے محافظ تھے۔ قریب سے کسی نے سرگوشی کی —— "کیا اجسام دار رواج سے بھی؟"

سرگوشی خاموش رہی —— شاید کہ گم ہو گئی تھی۔

رستہ بہت دراز تھا۔ اِس کے دونوں طرف میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس لوگ بھی قطاروں میں رستے کو تھامے ہوئے چل رہے تھے۔ وہ شور مچا رہے تھے۔ اور اپنے دوسرے ہاتھ ہوا میں لہرا رہے تھے۔

غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ رستے کو تھامے ہوئے نہ تھے بلکہ رستے نے اُن کے ایک ایک ہاتھ کو جکڑ رکھا تھا اور وہ اِس کے دورویہ اس طرح چل رہے تھے جیسے کسی جنگلی بیل کے ساتھ لٹکے پتے ہوا میں ہل رہے ہوں۔

اب جان پڑا کہ محافظ اُنھیں گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ پہچان ہوئی وہ اسی منڈی کے لوگ تھے۔ تولے، پلے دار، ٹوکری والے مزدور گاڑی بان وغیرہ وغیرہ۔

قریب سے گزرتے ایک محافظ سے پوچھا گیا۔

"ان کو کس لیے پکڑا گیا ہے؟"

نظر گھما کے دیکھا میرے پہلو میں ایک نوجوان کھڑا تھا۔ یہ سوال اُسی نے کیا تھا

"یہ جُوا کھیلتے تھے۔"

"تو کیا؟"

"تو کیا!" محافظ نے تنک کر کہا —"یہ جرم ہے۔"

"کھیل اور جُوا —— یہ جرم کیوں ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جو کھیل ہے وہ جرم کیوں ہے۔" پُرشباب

جوان خود سے پوچھ رہا تھا یا مجھ سے ـــــ یہ واضح ہو رہا تھا ـــ

واضح یہ ہوا کہ جُوا ـــــ ایک لفظ ہے جسے سُن کر ذہن سہم جاتا ہے اور زبان کو چُپ کرا دیتا ہے کہ قانون کا قاعدہ یہی ہے اور پکڑا جائے تو انسان بیل کا پٹہ بن جاتا ہے [بنا دیا جاتا ہے] جُوا اگر جُرم ہے تو اسے کھیل کیوں کہا جاتا ہے ۔ یہ بات میرے ذہن میں آتی ہے اور نکل جاتی ہے ۔ لرزتی سسکتی ۔ کانپتی ...... میں کبھی جوان کو دیکھتا ہوں اور کبھی بیل کو ....

" ابے او ہونّق ! منہ اُٹھائے کیا تک رہا ہے ؛ چل پیچھے ہٹ ۔"

محافظ نے میرے جسم کو دھکیل کر کہا

جسم پیچھے ہٹ گیا کہ محافظ نے ہٹا دیا تھا اور اس لیے کہ یہ صحتمند نہ تھا ۔

میں اُن ہونقوں کی طرف تکنے لگا جو اس بیل کے ساتھ وابستہ نہ تھے اور اپنے اپنے کام سے توجہ ہٹا کر اس "ما(ن) بیل کا تماشہ" دیکھ رہے تھے ۔

یک دم غُل مچا ۔ بھگدڑ مچ گئی ۔ لوگ رسّہ تُڑا کر بھاگنے لگے ۔

تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں اور کئی جسم زمین پر مجھے نظر آئے ۔

اِن لاشوں کو دیکھ کر میرے دماغ نے کروٹ لی اور میرے کان میں کہا : دیکھا ! کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جب جسم کو پابندِ سلاسل کر دیا جاتا ہے تو عشق ایک دیگر قسم کے جنون کی شکل اختیار کرتا ہے ۔ وہ سلاسل پرور کی بجائے سلاسل شِکن بن جاتا ہے کہ اوّلین سلاسل کسی دوسرے سلاسل کی ہمرکابی برداشت نہیں کر سکتا اور خود کو داؤ پر لگا کر خودکش بن جاتا ہے ، عشق خودکشی کے مساوی ہو جاتا ہے ۔

تڑاق تڑاق کی آوازیں پھر آئیں ۔ کچھ اور جسم جہد و جستجو سے نجات پا گئے تو عشق نے پھر رنگ بدلا ۔ لوگ یوں بھاگنے لگے جیسے بھیڑوں کے گلے نے باگھ کی آواز سُن لی ہو ۔

بھاگو ۔ دوڑو کی آوازیں آئیں ۔ بھاگنے والے مجھے دھکیل کر آگے بڑھنے لگے اور میں اُن کے ریلے میں ٹھیلتا چلا گیا ـــ

اِس طرح بے سُدھ بے بُدھ ٹھیلتا ٹھیلتا میں ایک بڑے دروازے کے سامنے آ نِکلا اور میری سُدھ لوٹ آئی ۔ میں نے دیکھا کہ میں شہر پناہ کے دروازے میں کھڑا ہوں ۔ مجھے یاد آیا کہ دروازے سے ایک راستہ ایک چھوٹی سی ندی کو جاتا ہے ۔ ندی کے پار ایک زیارت گاہ میں ایک محترم بزرگ رہا کرتے تھے ۔

میرے اوائل شباب کے زمانے میں جب کبھی ہمارا قیام اس شہر میں ہوتا تھا ۔ ہر ماہ کے پہلے روز اس زیارت گاہ میں ایک بڑی تقریب ہوا کرتی تھی ۔ شہر کے عقیدت مند لوگ ـــ مرد عورتیں بچے ۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے دل کی مرادیں لے کر اُن بزرگ کی زیارت کو جاتے تقریب کے اختتام پر وہ محترم بزرگ مقدس کتاب میں سے بشارت کے کلمات سناتے اور لوگ اپنے اپنے دل کی مراد کے مطابق من ہی من میں اُن کلمات کی تاویل کرتے واپس لوٹ آتے ۔

ایسے ہی ایک موقع پر میری ملاقات اُس شاخِ نیلوفر سے ہوئی تھی ۔ جو پہلی ہی ملاقات میں میرے دل میں گھر کر گئی تھی اور پھر کچھ عرصہ بعد میرے گھر کی روح رواں بن گئی تھی کہ جس کے بے جان جسم کو اُس "نجات گاہ" میں چھوڑ کر میں قدیم خانقاہ کے کھنڈر میں پناہ گزیں ہوا تھا ۔

محبّت اور عقیدت کی ایک موج بازگشت میرے سینے میں اُٹھی اور میں نے اُس زیارت گاہ کی زیارت کے قصد سے ندی کا رُخ کیا ۔

شہر پناہ کے باہر آ کر ہجوم چھدرا ہوتا جا رہا تھا ۔ اور جب میں ندی کی راہ پر گامزن تھا تو میں نے دیکھا کہ لوگوں میں کسی طرح کا ہراس نہ تھا ۔ جیسے بھیڑوں کا ریوڑ چراگاہ میں پہنچ کر بکھرتا جا رہا تھا ۔ ہر بھیڑ اپنی اپنی دھن میں چلی جا رہی

تھی۔ ہر دوسرے راہرو سے اجنبی اور لاتعلق۔

ندی کے پُل پر پہنچا تو میں تنہا تھا ـــــ ریوڑ کہیں پیچھے رہ گیا تھا یا کسی اور طرف مُڑ گیا تھا۔ چنانچہ ندی کا پُل میں نے تنہا ہی پار کیا۔

پرلے پار زندگی کے آثار تو تھے مگر ہنگامہ نہ تھا ـــــ

زیارت گاہ کے احاطے کا پھاٹک بانس کا تھا اور کُھلا تھا۔ میں جب دروازے میں سے اندر داخل ہوا تب بھی اکیلا ہی تھا کہ لوگوں کی وہ بھیڑ پیچھے ہی رہ گئی تھی جسے دیکھ کر مجھے گمان ہوا تھا کہ یہ مہینے کا پہلا روز ہے اور لوگ زیارت کے قصد سے کشاں کشاں آ رہے ہیں۔

مگر میں دروازے میں اکیلا کیوں تھا؟ شاید عجلت کی حالت میں وقت سے پہلے ہی آ پہنچا تھا۔

چند قدم آگے بڑھا تو دیکھا کہ کچھ لوگ مجمع لگائے کھڑے تھے تجسّس ہوا کہ یہ کیا دیکھ رہے تھے، کیا سُن رہے تھے، کس کو سُن رہے تھے۔

اسی تجسّس کے عالم میں اُچک کر جھانکا تو مجمع کے بیچوں بیچ ایک چِتا نظر آئی جو ابھی جلائی نہ گئی تھی۔ چِتا کے پہلو میں ایک ارتھی پڑی تھی۔ یہ لوگ نعش کو جلانے آئے تھے۔

گھبرا کر پیچھے ہٹا کہ میں بُھولے سے غلط مقام پر آ نکلا تھا کہ یہ مقام ہی غلط ہو گیا تھا؟

نظر دوڑائی تو اُس جگہ ملبے کا ڈھیر نظر آیا جہاں کبھی تقدس مآب بزرگ کی کُٹیا ہوا کرتی تھی۔ دل نے آواز دی۔ یہ مقام ہی غلط ہو گیا ہے۔ اب تیرا یہاں کیا کام؟ لے اب بھاگ کہ محبت اور تقدس کی موجِ بازگشت بھی سر پٹخ چکی کہ اِس کا کعبہ بھی ویران ہوا۔

دِل کا کہا مان، دروازے کا رُخ کیا تو دروازے میں سے ایک ہراس زدہ ہجوم طوفانی زور کے ساتھ در آیا اور اپنے ساتھ بہاتا ہوا مجھے بھی زیارتِ گاہ کے احاطے کے بیچوں بیچ لے آیا۔ معلوم نہیں کس چیز سے پناہ لینے کے لیے ہجوم کا یہ ریلا اُمڈتا آ رہا تھا کہ احاطے میں مزید افراد کے سمانے کی گنجائش باقی نہ رہی اور یہ ہجوم بانس کی عقبی دیوار کو لتاڑتا آگے نکل گیا۔

آگے ایک کُھلا چٹیل میدان تھا۔ میدان میں پہنچ کر ہجوم بکھرنے لگا۔ میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں بھی بے جانے بے بوجھے اُسی رُخ چلتا جاؤں جدھر کو یہ ہجوم جا رہا تھا۔

یہ ہجوم کس طرف جا رہا تھا۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا اور نہ ہی کوئی بتا رہا تھا کہ ہر ایک کو جلدی تھی۔ اِس قدر عجلت کہ بات کرنے، سوال کا جواب دینے کی بھی فرصت نہ تھی۔

لوگ پیچھے سے آتے اور میں جو رواں دواں چلا جا رہا تھا میرے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ جاتے۔

یہ ہر قسم کے لوگ تھے۔ ہر صنف اور ہر عمر کے لوگ ـــــ دُور دُور تک پھیلے، اِس چٹیل میدان میں جا بجا راکھ کی ڈھیریاں پڑی تھیں جیسے الاؤ جل کر خاموش ہو گئے ہوں۔ لوگ اگرچہ اندھا دھند چلے جا رہے تھے مگر راہ میں کوئی راکھ کی ڈھیری آ جاتی تو اُس سے پہلو بچا کر نکل جاتے۔ جس طرح وہ میرے قریب سے گزر رہے تھے۔

جانے مجھے کس کھوئی ہوئی بھیڑ کی تلاش تھی کہ میری نظریں اس بھیڑ میں ہر قریب سے گزرنے والے کا جائزہ لیتیں اور لوٹ آتیں کہ کہیں بھی کوئی ایسی چیز نہ پاتیں کہ جو دلچسپی کا باعث ہو۔

ناگہاں میرا دھیان دو ننھے مُنے پیروں پر گیا جو ٹھمک ٹھمک کر چل رہے تھے۔ اور میں نے دیکھا کہ یہ پیر ایک بچی کے تھے ـــــ

بچی نے ایک برقع پوش خاتون کا دامن تھام رکھا تھا۔ خاتون نے برقع کی نقاب اُلٹ رکھی تھی۔

وہ دونوں میرے دائیں پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گئیں، لوگ پیچھے سے آتے اور آگے نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے یا نگاہ کا مرکز نہ رہتے۔

جانے کیوں یہ ٹھمک ٹھمک کر چلتے پاؤں نگاہ کا مرکز بنے تو بنے ہی رہے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا

کہ اُن کے اور میرے درمیان فاصلہ چند قدموں کا ہی رہا۔

خاتون سارے ہجوم کی مانند عجلت میں تھی مگر بچی کے پاؤں اُس کی عجلت کا ساتھ دینے کی کوشش کے باوجود ٹھٹک رہے تھے کہ کوتاہ قامت اور چھوٹی ٹانگوں اور کم عمری کا تقاضہ یہی تھا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ اُن کی راہ میں، جو کہ میری بھی راہ تھی ایک راکھ کی ڈھیری آگئی۔ برقعہ پوش خاتون ایک دم کترا کر راکھ کی ڈھیری کی دائیں جانب سے آگے نکلی کہ اُس کا دامن بچی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دامن سمیٹ کر وہ ڈھیری کی اگلی طرف چلی گئی تو بچی گھبرا کر اُس کے پیچھے بھاگی اور سیدھی ڈھیری پر جا چڑھی۔

ایک دم وہ چیخنے لگی۔

دہشت سے میرا دل چلّا اُٹھا جب میں نے دیکھا کہ بچی کے زیر جامہ کے پائنچوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اُس کے پاؤں جل رہے تھے کہ یہ الاؤ جو غالباً کسی کی چتا تھی خاموش تو تھا مگر سرد نہ ہوا تھا۔ بچی بلبلا رہی تھی اور لڑکھڑا رہی تھی اور کسی بھی آن گر کر ڈھیر ہو سکتی تھی۔

لپک کر آگے بڑھا اور لفظوں میں ہانپ دے کر بچی کو اٹھا لیا اور خاتون کی طرف لپکا۔ بچی کے پاؤں بری طرح جُھلس گئے ننھے سلگتے پائنچوں کو ہاتھوں سے بجھاتے ہوئے میں نے خاتون سے کہا کہ وہ اپنی بچی کا خیال کرے اور دیکھے کہ اُس کی لاپرواہی سے بچی کا کیا حال ہو گیا ہے۔

خاتون نے ایک نظر بچی کی طرف دیکھا جو درد اور جلن کی شدت سے میرے بازوؤں میں بے ہوش پڑی تھی۔ اور کہا کہ یہ بچی اُس کی نہ تھی۔

میرے پوچھنے پر کہ یہ بچی کس کی تھی، اُس نے کہا، مجھے نہیں معلوم! اور منہ موڑ کر آگے چل دی۔

دوڑ دوڑ کر میں نے آوازیں لگائیں۔ ایک ایک کے پیچھے جا کر پوچھا مگر کسی نے اس بچی کا والی وارث ہونے کی حامی نہ بھری۔

تھک ہار کر اور پریشان ہو کے میں سوچنے لگا کہ اس بچی کا کیا کروں کہ میرا اپنا ہی کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ تھا میرے پاس محض ایک خالی پیٹ تھا اور جسم و روح کے سلاسل کی کھنک کو برقرار رکھنے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔

بچی اب آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔ میں اس کو سینے سے لگائے کھڑا تھا اور متلاشی نگاہوں سے ہجوم کو تک رہا تھا۔ مگر ہجوم تھا کہ بے پرواہی سے آگے نکلتا جا رہا تھا

جسم تھک کر نڈھال ہو گیا تھا۔ دم لینے کے لیے میں بچی کو گود میں لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ لوگ آتے ہماری طرف دیکھتے اور گزر جاتے۔ اور میری پریشانی بڑھتی جاتی۔

اچانک کسی نے ایک سکہ میرے سامنے پھینک دیا۔ اس سکے کی ضرب سے میرا دل بلبلا اُٹھا اور میں نے چیخ کر کہا:

اُٹھا لو اسے، میں بھک منگا نہیں ہوں!

بھیڑ میں سے کسی اور نے پلٹ کر سکہ اُٹھا لیا اور چلتا بنا — بھکاری نہیں تو تُو کون ہے؟

سکہ پھینکنے والے نے پوچھنا گوارہ کیا اور نہ اُٹھانے والے نے اور میں اس لاوارث بچی کو سینے سے لگائے بیٹھا رہا — بیٹھا رہا .....

..... اور جب دم لوٹا تو بینائی کارآمد نہ رہی کہ ہر طرف رات کی سیاہ فام تاریکی مسلط تھی۔ سمت و راہ کا تعین رہا تھا نہ اندازہ۔ اندھیرے میں صرف دو جگنو سسک رہے تھے — بچی کے آبلہ زدہ پاؤں — سسکیوں نے قلب کو مضطرب کر دیا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی کو کھنگالنے لگا کہ آخر آنکھیں بھی بے دم ہو گئیں۔ پلکیں تھکن سے نڈھال ہو کر گر پڑیں۔

"لاؤ، یہ بچی مجھے دے دو!"

تاریکی میں اچانک ایک روشن آواز آئی اور دو گداز ہاتھ انتہائی نرمی کے ساتھ میری گود اور بچی کے جسم کے درمیان نفوذ کر گئے۔

(باقی [illegible] بعد)

کیا یہ واقعی خودکشی تھی؟

ستیہ پرکاش

کچھ دن پہلے سماچار نے بنگلہ دیش ٹائمز کے حوالے سے یہ خبر نشر کی تھی کہ بنگلہ دیش میں ہنگری کی کمرشل سیکرٹری مسٹر جوزف بنجامن ہنگری کی سفارت گھر میں اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ ان کی عمر پچاس برس تھی اور ان کے سر میں گولی کے دو سوراخ تھے۔ موت اتوار کی رات کو واقع ہوئی اور اس رات مسٹر بنجامن ڈیوٹی پر تھے۔

بنگلہ دیش میں ایک اشتہار تقسیم کیا گیا ہے جس میں مسٹر بنجامن کی موت کو پراسرار بتایا گیا ہے۔ اشتہار میں درج ہے کہ جس طریقے سے ان کی موت واقع ہوئی اور موت کے بعد ہنگری کی سفارت گھر کے حکام نے جو رویہ اختیار کیا، اس سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا تسلی بخش جواب نہیں مل رہا۔

بنگلہ دیش کی پولیس کو اس کمرے میں داخل ہونے اور تحقیقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جس میں بنجامن کی موت ہوئی تھی۔ سفارت گھر کے حکام کا کہنا ہے کہ بنجامن نے خودکشی کی ہے لیکن انھوں نے وہ پستول پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا جس سے بنجامن نے خودکشی کی تھی اور اس لیے پولیس کو پستول کا معائنہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

ایسے کئی اسباب ہیں جن کی بنا پر ہنگری کی سفارت گھر کی یہ کہانی کہ مسٹر بنجامن نے خودکشی کی ہے، قابل قبول نہیں ٹھہرتی۔ سفارت گھر گلشن کے علاقے میں تھا اور مسٹر بنجامن کی قیام گاہ دھان منڈی میں۔ اگر مسٹر بنجامن کو خودکشی کرنا ہوتی تو وہ بڑی آسانی سے اپنی قیام گاہ پر کر سکتے تھے اس کے لیے انھیں سفارت گھر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سفارت گھر کے افسروں کا رویہ اور جس طریقے سے انھوں نے اس معاملے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، ظاہر کرتا ہے کہ بنجامن کی موت کے پس پردہ کچھ اور باتیں بھی ہوں گی۔

مسٹر بنجامن کے سر میں گولیوں کے دو سوراخ تھے جو خودکشی کی کہانی کی تردید کرتے ہیں کیونکہ خودکشی کرنے والا اپنے سر میں دو گولیاں نہیں مار سکتا۔ یہ دو سوراخ سفارت گھر کے افسروں کے دعوے کو مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔

اس واقعے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کافی دور تک نظر ڈالنی پڑے گی۔ ہنگری ۱۹۵۶ء میں سامراجی روس کا محکوم بنا۔ روسی فوج نے اس ملک پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔ سینکڑوں انقلابی وطن پرستوں اور سورماؤں نے روسی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جانیں گنوا دیں۔ بہت سے بے قصور شہریوں کی جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ اس کے بعد دہشت کا دور شروع ہوا اور ایک ایسی کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی گئی جو سامراجی روس کے اشاروں پر ناچتی رہی۔

ہنگری پر پوری طرح قبضہ جمانے کے بعد روس کی خفیہ پولیس کے۔جی۔بی نے بھی وہاں اپنی کارروائیاں شروع کر دیں۔ بہت سے ہنگریوں کو دوسرے ممالک میں کام کرنے کے لیے بھی بھرتی کیا گیا۔ یہ لوگ سوویٹ روس کے لیے کام کرتے تھے اور ہنگری کی حکومت کی دسترس سے باہر تھے۔ ان میں سے کچھ ایجنٹ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پوری وفاداری کے ساتھ احکام کی تعمیل نہیں کرتے اور بعض معاملات میں اختلاف کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اس

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

اطلاع نامہ بابت ماہنامہ تحریک

از روئے فارم نمبر ۴

وقفۂ اشاعت — ایک ماہ
ایڈیٹر اور مالک — گوپال متل
قومیت — ہندوستانی
پتہ : ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
پرنٹر پبلشر — گوپال متل
قومیت — ہندوستانی
پتہ : ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
میں گوپال متل تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم کے مطابق درست ہیں۔

گوپال متل، پرنٹر
(بقلم خود)
۲۸ فروری ۱۹۷۷ء

غزلیں

ساجد اثر

ہم کو بدنام کر گیا کوئی
اپنی حد سے گزر گیا کوئی

خود فریبی کے عکس کی صورت
آئینہ میں اُتر گیا کوئی

روشنی کی انا کو ٹھیس لگی
ظلمتوں میں سنور گیا کوئی

تھام کر انتشار کا دامن
حسبِ خواہش بکھر گیا کوئی

منتظر تھا حسین مستقبل
راستے میں ٹھہر گیا کوئی

سبز مفہوم کی چمک لے کر
زرد لفظوں کے گھر گیا کوئی

اے اثر! غم نواز لمحوں کا
سنکھ بجتے ہی مر گیا کوئی

▲▲

ندرت نواز

زندگی سے بہت خفا ہوں میں
پھر بھی جینے پہ مر رہا ہوں میں

جو کبھی میرا ہو نہیں سکتا
کس لیے اُس کا ہو رہا ہوں میں

انتہا کا پتہ نہیں کوئی
کس کہانی کی ابتدا ہوں میں

اب حقیقت سے خواب بہتر ہیں
یہ حقیقت بھی جانتا ہوں میں

خود کو پایا نہ تھا تو اپنا تھا
خود کو پایا تو کھو گیا ہوں میں

▲▲

سلیم شہزاد

خاموشیوں کے دشت کا اظہار میں بھی ہوں
سونے مکاں میں نقش بہ دیوار میں بھی ہوں

ظلمت میں میری نور کوئی ڈھونڈتا پھرے
جیسے خود اپنی ذات کا اک غار میں بھی ہوں

شاید مرا حریف ہی مجھ کو خرید لے
سودے میں اپنے یوں تو خریدار میں بھی ہوں

مجھ میں بھی حادثات کی تفصیل درج ہے
اپنے تغیرات کا اخبار میں بھی ہوں

خوابوں میں میں نے بارہا پکڑی ہیں تتلیاں
رنگوں کی آرزو کا گنہ گار میں بھی ہوں

تو کر رہا ہے خانۂ فرعون کا طواف
جادو کے سامری میں گرفتار میں بھی ہوں

کوئی تو میری چھاؤں میں پل بھر رُکے سلیم
چلتے نگر میں دھوپ کی، دیوار میں بھی ہوں

▲▲

غــزلیں

ڈاکٹر ابو المحامد حامد

دھوپ ہے، خنجر بکف پھر اٹھائے چھاؤں ہے
سرخ پھولوں سے ڈھکا ہر شہر ہے ہر گاؤں ہے

پھول پھل تو آئیں گے اوروں کے حصے میں مگر
زرد پتوں پر لکھا موسم نے میرا ناؤں ہے

چھپ کے بیٹھی ہیں کمیں گاہوں میں وحشی آندھیاں
کھوکھلے برگد کی یارو میرے سر پر چھاؤں ہے

قتل کی سازش میں سورج کے، نگر شامل رہا
لے کے نیزے چاند پر جھپٹا ہمارا گاؤں ہے

کچھ پتا چلتا نہیں حامد اس اندھی بھیڑ میں
کون جیتا اپنی بازی کون ہارا داؤں ہے

▲▲

وقار طاہری

کیوں آج ساتھ ساتھ بہت دور تک گیا
وہ شخص کل جو دستِ تمنا جھٹک گیا

بے حس پہاڑ سن نہ سکے آہنی صدائیں
آخر کسی کا تیشۂ آواز تھک گیا

خوشبو وہی تھی آج بھی اُس پیڑ کے تلے
شاید پھر آج کوئی مری راہ تک گیا

وہ جنتِ نشاط کے باہر نہ آسکا
میں بڑھ کے خارزارِ تمنا تلک گیا

میں بھی تھا ایک نقشِ مسرت کبھی وقار
بے رحم وقت گردِ صعوبت سے ڈھک گیا

▲▲

امین تابش

ہم فکر کے الاؤ میں جلتے ہیں آج بھی
سورج کو سر پہ رکھ کے نکلتے ہیں آج بھی

اِس کی نہیں تلاش کہ سایہ کہیں ملے
کتنی ہی تیز دھوپ ہو چلتے ہیں آج بھی

آب و ہوا عجیب ہے شہرِ وجود کی
ہم برف ہیں نہ موم پگھلتے ہیں آج بھی

ہم مختلف مزاج کے افراد ایک ہیں
پھول اور کانٹے ساتھ نکلتے ہیں آج بھی

بالائے طاق رکھ کے تقاضوں کو وقت کے
کچھ لوگ ہیں کہ زہر اُگلتے ہیں آج بھی

▲▲

○ سکریٹری فروغ ادب اردو اسٹیشن روڈ پرانی بستی ۲۰۲/۲۷۲ ○ معرفت احمد اللہ ماسٹر صاحب قصبہ تلہر ضلع شاہجہانپور یوپی ○ ۱۷۸ جی۔پی، رد طی بمبئی ۵۰

نظمیں

پرویز باغی

اب سے
اُنتیس سال پہلے
تو نے جب جنما تھا مجھ کو
تجھ کو
کیا معلوم تھا
کیسے کیسے کرب سے گزروں گا میں
روشنی کی جستجو کرتے ہوئے
کس اندھیرے غار میں اُتروں گا میں
زندگی اک زہر ہو گی
جس کو مجبوراً مجھے پینا پڑے گا
تجھ کو یہ معلوم کب تھا، اس طرح
تیرے بیٹے کو یہاں جینا پڑے گا
اب سے
انتیس سال پہلے
تو نے جو دیکھے تھے خواب
ماں، وہ سارے خواب ہیں بکھرے ہوئے، ٹوٹے ہوئے
میری آنکھوں میں گھسی جاتی ہیں
جن کی کرچیاں
صرف انتیس سال ہی گزرے ہیں لیکن
میرے چہرے پر بڑھاپا آگیا ہے
تجھ کو
کیا معلوم تھا
اب سے انتیس سال پہلے

●●

ہارون الرشید

سنّاٹا

کبھی سوچا بھی نہ تھا !!
سفرِ زیست میں ایسا بھی مقام آئے گا
سانس کا لینا بھی ہو جائے گا دشوار مجھے
زندگی خاک بسر، درد سراپا ہو گی
آرزوؤں کا جنازہ لے کر
خارزاروں سے گزرنا ہو گا
سینۂ شوق بنے گا اک دن
مدفنِ حسرتِ پیغامِ نشاط
اور پھر درد کی یورش مجھے لے آئے گی
ایسی اک منزلِ ویراں پہ جہاں
ہر طرف موت کا سنّاٹا ہے

●●

فاصلے

عمر مجید

"کچھ دیجیے ——— ... دو دن سے بھوکی ہوں ... اللہ کے لیے ....." میں نے زیارت گاہ کو جانے والی سیڑھیوں پر قدم ہی رکھا تھا کہ میرے سامنے ایک ہاتھ پھیل گیا۔ اور دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی پر یخ پانی ڈال دیا گیا ہو ——— میرے سامنے ایک بھیانک ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ پھنسیوں اور پھوڑوں سے بھرا ہوا۔ پھوڑے پک چکے تھے اور اُن میں سے پیپ بہہ رہی تھی ———

میں جلدی سے آگے بڑھا۔

"بیٹا آہستہ چلو ——— میں اتنا تیز نہیں چل سکتی ـــ"

اپنی ماں کی آواز سن کر میری رفتار خود بخود دھیمی پڑ گئی۔ میری آنکھیں پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے مقبرے کی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زیارت گاہ کو جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے لاتعداد بھکاریوں اور بھکارنوں کی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہوں ——— دھنستی ہوئی بے نور آنکھیں ——— میری سانس پھولنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ میں گرم اونی موزے اور چمڑے کا جوتا پہن لوں ——— لیکن ایسا کرنے سے میری ماں کی مانی ہوئی منت ادھوری رہ جاتی ——— لیکن مجھ سے رہا بھی نہ گیا میں نے اپنی ماں سے کہا ———

"ماں ——— میں جوتے پہن لوں ——— مجھ سے اب یہ سردی برداشت نہیں ہو سکتی ....."

میری ماں نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں ——— میری ماں بھی ننگے پاؤں زیارت گاہ کو جانے والی سیڑھیاں طے کر رہی تھی ——— اُس کے گول مٹول چھوٹے چھوٹے پاؤں بغیر کسی لغزش کے اُٹھ رہے تھے۔ جیسے اُنھیں یخ زدہ پتھروں کا کوئی احساس نہ ہو۔

"ہائے یہ ممتا ———" میں نے ایک ڈھیلی سانس چھوڑ دی اور ماں کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں طے کرنے لگا ———

"بیمار ہوں ..... بھوکا ہوں ..... مجبور ہوں ..... خدا تمہارا بھلا کرے۔"

میں نے نظر اُٹھا کر زیارت گاہ کی پرشکوہ عمارت کو دیکھا جو دھند میں ڈوب رہی تھی ——— میری ماں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی ———

——— اُس کی نم آلود آنکھیں بھی زیارت گاہ کے گنبد پر مرکوز تھیں ——— اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تقدس کی لکیروں کو دیکھ کر میں ذرا بھی حیرت زدہ نہ ہوا۔ کیونکہ ہر بیٹے کو اپنی ماں کے چہرے پر اس قسم کی لکیریں صاف اور واضح نظر آتی ہیں ——— یہ لکیریں دیکھ کر نہ میرا دل بھر آیا اور نہ میں نے اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر رونا چاہا ——— میں جانتا تھا کہ وہ سب کچھ اپنی بے غرض ممتا کی وجہ سے کر رہی ہے ——— وہ یہ تکلیف آج ہی نہیں بلکہ پچھلے پچیس برس سے جھیلتی چلی آ رہی ہے۔ اُس وقت سے جب میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں ——— پچھلے پچیس برس سے وہ مجھے رمضان کے ہر جمعہ کو اس زیارت گاہ پر لے

سی۔ ایم۔ ایس بسکو سکول۔ شیخ باغ۔ امیرا کدل۔ سرینگر ۱۹۰۰۰۱

آتی ہے — مجھ سے پہلے اُس کے کئی بچّے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے اُس کی مامتا کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا تھا — کھیل ہی کھیل میں وہ بہت دُور نہ جانے کہاں چھُپ گئے تھے۔ تب میری پیدائش پر اُس نے منت مانی تھی کہ وہ مجھے رمضان کے مہینے میں ہر جمعہ کو اس زیارت گاہ پر لے آیا کرے گی۔

وقت بدلتا ہے — موسم بدلتے ہیں... انسان بدلتے ہیں..... لیکن ماں کی مامتا نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ ماں جو اپنی گرم کوکھ میں اُبھرتی ہوئی زندگی کی حفاظت کرتی ہے اور اپنی روح کی گرمی بخشتی ہے۔ اسی لیے ان سب باتوں کو ڈھکوسلا اور وہم پرستی سمجھنے کے باوجود میں رمضان کے ہر جمعہ کو اُس کے ساتھ اس زیارت گاہ پر آتا ہوں —!

زیارت گاہ ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اور اُس تک پہنچنے کے لیے ایک سو سے زیادہ سیڑھیاں ہیں — ترشے ہوئے چمکتے پتھر — جو گرمیوں میں اتنے گرم ہو جاتے ہیں کہ اُن پر پیر رکھنا مشکل ہوتا ہے اور سرما میں برف سے بھی زیادہ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں —

"پچیس برس — اور جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا...... اور میری ماں .. ..؟" اس سے آگے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔

"یہ دُنیا مٹ جانے والی چیز ہے — آخر اس کی یا اس میں رہنے والوں کی چاہ کب تک ....؟" ایک واعظ باآوازِ بلند ایک بوڑھے شخص کو کچھ سمجھا رہا تھا — ہمارے آگے آگے اور لوگ بھی سیڑھیاں طے کر رہے تھے — بچّے بوڑھے جوان — مرد عورتیں..... ہمارے قریب سولہ سترہ برس کی ایک نازک سی لڑکی سیڑھیاں طے کر رہی تھی — ننگے پاؤں .... اُس کے نازک پاؤں سردی کی وجہ سے سُن ہو چکے تھے — پنجے اور ایڑیاں سفید — اور ٹخنے سرخ — رنگوں کا یہ حسین امتزاج مجھے بے حد پسند آیا... میں سوچنے لگا اِس سردی میں اس کا یہاں کیا کام — یہ اتنی تکلیف کیوں برداشت کر رہی ہے ؟ ممکن ہے کہ کوئی مراد پانے کے لیے اس نے بھی میری ماں کی طرح کوئی منت مانی ہو — اپنے دل کے نہاں خانوں میں — جسے اُس کے سوا اور کوئی نہ جانتا ہو — محبت اور مامتا ایک ہی چیز کے دو نام تو ہیں۔

"بیٹا — درود شریف پڑھ رہے ہو نا...؟" یکایک میری ماں نے مجھ سے پوچھا —

"ہاں — ماں —" میں نے جواب دیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی غلط بیانی کا احساس ہوا۔ مجھے اس مقدس مقام کے نزدیک اتنا بڑا جھوٹ نہ بولنا چاہیے تھا — ممکن ہے کہ میرے اس جھوٹ سے میری ماں کے اعتقاد کو ٹھیس لگے اور اُس کی مانی ہوئی منت پوری نہ ہو — اور اگر یہ منت پوری نہ ہو سکی تو.....

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا — بھلا سائنس اور اس توہم پرستی میں کیا تعلق — اگر مجھے مرنا ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا..... ممکن ہے کہ میرے بہن بھائی کسی جسمانی نقص کی بنا پر مر گئے ہوں اور مجھ میں وہ نقص نہ ہو اور میں اپنی طبعی عمر پاؤں —!

پھر مجھے یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا ہے —!!

"میرے پروردگار — میں تمہاری ایک حقیر لڑکی ہوں — ایک گناہ گار بندی ہوں ..... مجھ پر رحم کرنا.....!"

ایک لمبی سانس لے کر میں آگے بڑھا — وہ لڑکی ہم سے آگے نکل گئی تھی — اب ہمارے آگے آگے ایک ضعیف شخص لاٹھی ٹیکتا ہوا سیڑھیاں طے کر رہا تھا —

"اللہ..... اللہ....."

"اللہ کے لیے کچھ دیجیے ..... میرا بچّہ دو دن سے بھوکا ہے ....."

"اس دُنیا میں رہنے والوں کی چاہ کب تک ــــ"
منزل نزدیک آرہی تھی ــــ قدم تیزی سے اُٹھ
رہے تھے ــــ دل میں آنسو تھے اور روح بھٹک
رہی تھی ــــ اور میں سوچ رہا تھا ــــ میں کون
ہوں ــــ کہاں جارہا ہوں ــــ میڈیکل کالج کا کوئی
لڑکا یا لڑکی مجھے اس حالت میں دیکھے تو کیا کہے گی ... آخر
یہ سب لوگ کہاں جارہے ہیں ــــ کیوں جا رہے
ہیں ....؟
واعظ بوڑھے شخص سے کہہ رہا تھا ــــ
"یہ اعتقاد ہے ــــ اعتقاد جو نہ جھوٹا ہوتا ہے اور
نہ سچا ــــ جو بادام کے شگوفوں سے بھی زیادہ ملائم .... اور
پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے ـ اعتقاد جو صرف
اعتقاد ہے ــــ جس طرح روح صرف روح ہے
اور کچھ بھی نہیں ــــ"
"بیٹے کیا سوچ رہے ہو ــــ" میری ماں نے
مجھ سے پوچھا ـ
"کچھ نہیں ماں ــــ یہ پتھر بہت سرد ہیں ــــ"
ہم زیارت گاہ کے قریب پہنچ گئے تھے ــــ کچھ لوگ
زیارت گاہ کے اندر جارہے تھے ــــ اور بعض زیارت
گاہ کا طواف کر رہے تھے ــــ
میری ماں مجھے لے کر زیارت گاہ کے اندر داخل
ہوئی ــــ میں اپنی ماں کے ساتھ دو زانو جھک گیا
ــــ اور دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ــــ لیکن مجھے
ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سینہ یکایک خالی ہو گیا ہو
ــــ عین اسی لمحے میں نے اپنی ماں کی سسکیاں سنیں
ــــ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ــــ
ایک آنسو اُس کے رخسار پر ڈھلک کر رہ گیا تھا ــــ
میں نے آنسو کے اس قطرے کو بڑے غور سے دیکھا
ــــ اُس میں سے مجھے بنفشئی کرنیں پھوٹتی ہوئی نظر
آئیں ــــ اور مجھے ایسا لگا جیسے آنسوؤں کے اس
پاکیزہ قطرے میں میری زندگی کی سانسیں مچل رہی
رہی ہوں ــــ دل کی ہر دھڑکن تھرا رہی ہے ــــ
میں ایک بار پھر پانچ سال کا بچہ بن گیا
تھا ــــ!

جمیل کلیمی کا انتقال

ادبی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ کلیم بکڈپو احمد آباد کے مالک اور اُردو کے خوش فکر شاعر جناب جمیل کلیمی کا پچھلے دنوں احمد آباد میں انتقال ہو گیا ـ مرحوم بڑے نیک دل اور مخلص انسان اور ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے ـ زیارتِ حرمین شریف کی سعادت بھی حاصل کر چکے تھے ـ شاعری انھیں اپنے والد جناب کلیم احمد آبادی سے ورثے میں ملی تھی ـ چند سال پہلے ان کے کلام کا مجموعہ "لفظوں کا سفر" کے نام سے شائع ہوا تھا جسے تمام ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تھا ـ "تحریک" کے پرانے قدر دانوں میں تھے اور ذاتی سطح پر بھی ان کے ساتھ ادارۂ "تحریک" کے ارکان کے بڑے قریبی تعلقات تھے ـ اس طرح ان کی موت کا غم ہمارا ذاتی غم بھی ہے ـ قارئین سے درخواست ہے کہ ان کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں ـ ان کے فرزند شاہد کلیمی صاحب اور دوسرے پسماندگان سے ہمیں دلی ہمدردی ہے ـ
(ادارہ)

کیا یہ واقعی خودکشی ہے (بقیہ صلا)

صورت میں کے ـ جی ـ بی کے کارکن موت کے فرشتے بن کر نازل ہوتے ہیں اور اس شخص کا خاتمہ کر دیتے ہیں ـ جوزف بنجامن کے سر پر گولیوں کے دو سوراخ اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ ان کی موت خودکشی کا نہیں قتل کا نتیجہ تھی ـ

تبصرے

خوشبو کا خواب

شاعر: پریم وار برٹنی
ناشر: پریم کتاب گھر۔ ۱۱۶۹ سیکٹر ۸ سی۔ چنڈی گڑھ۔
قیمت: پندرہ روپے۔

پریم وار برٹنی ان شاعروں میں ہیں جو تقسیمِ ملک کے فوراً بعد سامنے آئے اور شاعری کے باذوق قارئین کو جلد ہی اپنی طرف متوجّہ کرلیا۔ وہ محسوسات کے شاعر ہیں اور ان کے محسوسات میں وہ بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے جو گرد و پیش کی زندگی اور اس کے گوناگوں مظاہر سے قریبی شناسائی اور وابستگی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسی آزادہ رو مگر آہستہ خرام شخصیت کے ذہنی اور جذباتی سفر میں شریک ہیں جس کے راستے دشت و دریا سے ہوتے ہوئے کھلی قصباتی بستیوں اور گنجان شہری آبادیوں تک سے گزرتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ پریم وار برٹنی نے فطرت کی مہربان آغوش میں آنکھ کھولی، پھر پنجاب کی کشادہ دل فضاؤں میں عنفوانِ شباب کے کھیل کھیلتے رہے اور ان کھیلوں سے جی اُکتایا تو بمبئی جیسے مصروف کاروباری شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کے پیچ کا مُنہ نکل کھڑے ہوئے۔ وہ فطرت اور اس کے حُسن کے اب بھی دلدادہ ہیں، پنجاب اور اس کی رومان آفریں فضاؤں کی خوشبو کے تعاقب میں وہ اب بھی بے اختیارانہ لپک پڑتے ہیں لیکن بمبئی سے جن تجربوں کی سوغات وہ ساتھ لائے ہیں اس نے انھیں اس کرب سے بھی آشنا کر دیا ہے جو ہمارے دور کے تمام حساس انسانوں کا مقدر ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ کسی داخلی توانائی کے سہارے اس کرب کو انھوں نے نہ صرف اپنے لیے گوارا بنا لیا ہے بلکہ اس میں خوشگواری کی کیفیت بھی پیدا کردی ہے۔

کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں شاعر نے اپنا ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک کا کلام شامل کیا ہے اور دوسرے حصّے میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک کا کلام۔ دونوں حصّوں میں نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں اور غزلیں بھی۔ کتاب کی دو حصّوں میں تقسیم بلاوجہ نہیں ہے۔ پہلے حصّے میں پریم خالصتہً ایک رومانی شاعر نظر آتے ہیں جو اپنے خوابوں کے دھندلکوں میں اس طرح کھویا ہوا ہے کہ دھندلکوں کی اس خوشنما وادی سے باہر کی دُنیا تک اس کی نظر بمشکل ہی پہنچ پاتی ہے۔ دوسرے حصّے میں یہ دُھند چھٹتی ہوئی نظر آتی ہے اور شاعر کے لیے آس پاس کے مناظر زیادہ روشن اور واضح ہوگئے ہیں۔

پریم وار برٹنی اپنے اظہار میں بھی تازہ کار ہیں اگرچہ بعض مقامات پر سکّہ بند ترقی پسند اسلوب نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور وہ غیر ضروری تفصیل و تکرار کی رَو میں بھی بہہ گئے ہیں۔ ایسا زیادہ تر نظموں میں ہوا ہے، غزل میں ان کا لہجہ اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ پہچانا جاتا ہے جو فکر کی گونج کم کم لیکن شدّتِ احساس کا بھرپور آہنگ لیے ہوئے ہے۔

کتاب بہت خوشنما چھپی ہے اور قیمت مناسب ہے۔

——— مخمور سعیدی

اُڑان

شاعر: شباب للت
ناشر: پی۔ کے۔ پبلی کیشنز، ۲۷۲ پرتاپ اسٹریٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲
قیمت: چھ روپے۔

شباب للت نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل سے کیا تھا اور پھر اس میں اتنی مشق بہم پہنچالی تھی کہ ان کا شمار اس رنگ کے قابلِ ذکر شاعروں میں ہونے لگا تھا لیکن دھیرے دھیرے وہ روایت کی بیجا گرفت سے نکلتے گئے اور پچھلے تین چار سال میں انھوں نے جو غزلیں کہی ہیں وہ ان اوصاف کی حامل ہیں جو عصری حسیت کے وسیلے سے کسی شاعر کے کلام میں پیدا ہوتے ہیں۔ "اُڑان" ان کا تازہ ترین مجموعہ ہے اور اس میں ان کا جو کلام شامل ہے وہ ان کی شاعری کے نئے امکانات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

شباب للت چونکہ اپنی ادبی روایت سے پوری طرح باخبر ہیں اس لیے جدید شعری میلانات سے اثر پذیری کا مرحلہ انھوں نے ایک ہوشمند مسافر کی طرح طے کیا ہے اور جدید انداز کی اس کورانہ تقلید سے خود کو بچالے گئے ہیں جو فرسودہ روایت پرستی سے کسی طرح کم نقصان دہ نہیں۔ "اڑان" میں ان کا جو کلام شامل ہے اس کی بنیاد انھوں نے عصری زندگی کی طرف اپنے ذاتی رویّے پر رکھی ہے اور جب شاعر کا ذاتی رویّہ اور اس کا شخصی تجربہ اظہار کے لیے کچھ لفظوں کا انتخاب کرتا ہے تو ان میں ایک تازگی اور توانائی از خود پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ "اڑان" میں شباب للت کے لہجے میں جو تازگی اور توانائی ہے اس کا سرچشمہ ان کا یہی نیا فنی رجحان ہے ورنہ انھوں نے خود کو نہ تو اُن موضوعات تک محدود کیا ہے جو جدید موضوعات کے نام سے پہچانے جاتے ہیں نہ ایسے مخصوص الفاظ کو اپنے اظہار کے لیے کافی سمجھا ہے جو جدید شاعری میں اکثر دہرائے جاتے رہے ہیں۔

شباب للت نے اپنے تازہ کلام میں ایک لسانی تجربہ بھی انجام دیا ہے۔ انھوں نے ہندی کے ایسے بیسیوں لفظ جو اُردو کے لیے قابلِ قبول ہو سکتے ہیں، بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں۔ یہ لفظ ان کے ہاں بالکل اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور اس کی وجہ ان کا برمحل استعمال اور ان کی غزلوں کی وہ فضا ہے جو قدیم ہندوستانی دیومالائی تلمیحات کے حوالے سے قائم ہوئی ہے ان تلمیحات کا استعمال شباب للت نے بڑی شاعرانہ چابکدستی سے کیا ہے اور یہاں ان کی وہ مشق ان کے بہت کام آئی ہے جو انھوں نے اپنی شعر گوئی کے ابتدائی مرحلوں میں بہم پہنچائی ہے۔

کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔

——— مخمور سعیدی

انداز تو پہچانو

مصنف : وصی اقبال

ناشر : مکتبہ الحسنات، رام پور (یوپی)

قیمت : چار روپے بیس پیسے

وصی اقبال صاحب نے اپنے افسانوں کے مجموعے کو 'انداز تو پہچانو' کا نام دیا ہے۔ افسانے اصلاحی مقاصد کے حامل ہیں اور بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔ کہیں بھی اسلوب کی پیچیدگی کو راہ نہیں دی گئی تاکہ افسانہ نگار جو بات کہنا چاہتا ہے وہ قاری تک بنا کسی ہیر پھیر کے پہنچ جائے ہر کہانی میں ایک نصیحت ہے جو اصلاح کردار کی ترغیب دیتی ہے ——— 'ایک تنہا عطیہ' میں دکھایا گیا ہے کہ نام نہاد پڑھی لکھی مہذّب عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ کیا نازیبا سلوک کرتی ہیں۔ وہ اپنی اولاد کو ممتا کی چھاؤں تک میسّر کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ ادھر عطیہ جو کوئی ڈگری یا سند نہیں رکھتی، ایک باوفا اور سلیقہ مند بیوی ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک مثال ہے۔ اسی طرح تمام کہانیاں اپنے اندر ایک سبق لیے ہوئے ہیں۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔

——— کنور سین

سلوٹیں

مصنف : نظیر نذر

ملنے کا پتہ : شرف پبلی کیشنز، سنوار باغ، سری نگر۔

قیمت : پانچ روپے

'سلوٹیں' نظیر نذر کے افسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ نظیر نذر حسّاس دل رکھتے ہیں اور زندگی کی کڑواہٹ اور کسیلے پن کو افسانہ کی شکل میں ڈھالنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اُن کے جملوں میں طنز کی چبھن جگہ جگہ ملتی ہے۔ اپنے افسانوں میں بہت کچھ سمیٹ لینے کا فن اُنھیں آتا ہے۔ ذرا زبان کی صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے اور

کہانی کو آخری شکل دینے سے پہلے تھوڑا سا مزید غور و خوض اُن کی مدد کر سکتا ہے۔ بہر حال انھوں نے اچھے افسانے لکھے ہیں، گو کتابت اور طباعت کے لحاظ سے مجموعہ بالکل کمزور ہے اور اس کی قیمت بھی اکھرتی ہے۔

——— کنور سین

ریگِ سیاہ

مصنف : ذکاء الدین شایاں

ناشر : نصرت پبلشرز، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ ۳

قیمت : پانچ روپے

ذکاء الدین شایاں کی غزلوں کے مجموعے کا نام ریگِ سیاہ ہے۔ شایاں صاحب نے اپنے کردار کی متانت اور شائستگی کو غزل میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ انھوں نے شعر کو ایمائیت اور رمزیت سے دُور رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ تمام مجموعہ ابھرے، بے کیف اور سرسری فکر کے حامل اشعار سے بھرا پڑا ہے گو اُن کا کہیں کہیں رومانٹک ہونا آنا ری کے لیے تھوڑی بہت آسودگی مہیا کرتا ہے۔ شایاں صاحب زندگی کی حقیقتوں سے آشنا نظر آتے ہیں مگر اس کے زہراب کو شعری قالب میں سمونا اور شعر کی جادوگری سے اسے سہ آتشہ بنا کر پیش کرنا شاید ان کے بس میں نہیں۔ ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں سے چند قابلِ توجہ شعر حاضر ہیں :

دیکھنا یہ ہے ہمیں اب کون سمجھے گا یہاں
اُس کے ہونٹوں پر ادھوری بات ہو جائیں گے ہم

———

کوئی شاخِ بدن، اُبھے گھٹا سی ٹوٹتی جائے
خیالوں میں مرے، موجِ ہوا سی ٹوٹتی جائے

———

سب اپنی حد کے اندر صحرا بنے ہوئے ہیں
آئے جو اپنی زد پر سیلاب ہو گئے ہیں

———

ہر طرف قہقہوں کا رونا ہے
کوئی سنجیدہ بات کرتے چلیں

——— کنور سین

ارمغانِ بہار

شاعر : اے، سی، بہار

ناشر : نیشنل اکاڈمی، ۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

قیمت : دس روپے۔

یہ اے، سی، بہار کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے، اس سے پہلے ان کے کلام کے دو مجموعے "نسیمِ مغرب" اور "نسیمِ بہار" شائع ہو چکے ہیں۔ "نسیمِ مغرب" میں چھتیس انگریزی نظموں کے منظوم تراجم شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۳ء میں انجمن ترقی اُردو ہند نے چھاپا تھا۔ "نسیمِ بہار" ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ یہ رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے بعد ادبی حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ بہار کو صرف صنفِ نظم ہی سے دلچسپی ہے اور ان کی طبیعت کے جوہر نظم ہی میں کھلتے ہیں مگر ان کا زیرِ نظر مجموعہ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں نظم، قطعہ، رباعی، غزل وغیرہ مختلف اصنافِ سخن پر دسترس حاصل ہے۔ "ارمغانِ بہار" زندگی کی اعلیٰ قدروں کے پرستار شاعر کا مجموعۂ کلام ہے۔ شاعری میں انھوں نے اقبال، غالب اور میر سے بطورِ خاص فیض حاصل کیا ہے جس کا اعتراف ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ جوش ملسیانی نے صحیح کہا ہے کہ "نوجوانی میں پختہ کاری اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب سے وابستگی انھیں سوقیانہ راہوں پر جانے سے روکتی ہے"

اخلاق حُسین عارف کے یہ الفاظ بھی بہار صاحب کی شاعرانہ خصوصیتوں پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں :

"انھوں نے اپنے ماحول کا مشاہدہ اور مطالعہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے کلام میں دورِ حاضرہ کے وہ تمام عوامل پائے جاتے ہیں جو ہماری آپ کی روزمرہ زندگی میں موجود ہیں۔ انھوں نے ان تمام چیزوں کا بحیثیت ایک انسان اور ایک حساس شاعر جائزہ لیا ہے اور انھیں اپنے تاثرات کی شکل میں پیش کر دیا ہے"

نیشنل اکاڈمی نے کتاب کو بہت خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے۔ سرورق ماڈرن آرٹ سے مزین ہے اور آنکھوں کو فرحت بخشتا ہے۔

کتاب کی قیمت دس روپے ہے جو اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں۔

—— سید اختر الاسلام

سوامی رام تیرتھ

مصنف : اندرجیت لال
ملنے کا پتہ : لاجپت رائے اینڈ سنز، اردو بازار۔ دہلی - ۱۱۰۰۰۶
قیمت، پانچ روپے

—— ہندو دھرم نے زندگی کے چار مقاصد کو بہت اہمیت دی ہے۔ دھرم ارتھ (معاش) کام (جنس) اور موکش (نجات) لیکن مادہ پرستی کے اس یگ میں صرف دو ہی مقصد رہ گئے ہیں، ارتھ اور کام گویا دھرم اور موکش کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مادہ اور روح کا توازن بگڑ گیا ہے۔ اس توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ روح کی بالیدگی اور توانائی کی طرف بھی دھیان دیا جائے اور اس کے لیے بہترین ذریعہ ہے مہاپرشوں، یوگیوں اور صوفیوں کی زندگی کے حالات اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ۔

اندرجیت لال نے "سوامی رام تیرتھ" لکھ کر اس ضرورت کو پورا کیا ہے اگرچہ موصوف جدید سائنس کے متعلق سلیس اور آسان اردو میں معلوماتی کتابوں کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن ان کا موجودہ کام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سوامی رام تیرتھ سچے دیش بھگت ویدانتی اور صوفی شاعر تھے۔ مصنف نے اپنے مخصوص آسان طرزِ نگارش اور پرلطف اسلوب سے سوامی رام تیرتھ کے سوانح حیات اور ان کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے مشہور اقوال کو عام فہم اردو میں پیش کیا ہے۔

—— جاوید وششٹ

تذکرۂ روحی

مصنف : الہام الدین خاں
ضخامت : اسّی صفحات
قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔

کتاب کے مطالعے سے علم ہوا کہ الہام الدین خاں نے اپنے پیر طریقت حضرت مولانا محمد ابراہیم خاں روحی کے عرس کے موقع پر ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں روحی کی زندگی کے حالات، اخلاق و عادات، مشاغل و کرامات کا تفصیل سے جائزہ لینے کی سعیِ بلیغ کی گئی تھی زیرِ نظر کتاب "تذکرۂ روحی" اسی مقالے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسّی صفحات پر مشتمل اس مختصر سی کتاب کا سرورق قدیم مذہبی کتابوں کی مانند سادہ ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت کا معیار تقریباً یکساں ہے اور تینوں کو برا نہیں کہا جا سکتا۔ مقالہ نگار نے کتاب کے ایک ایک صفحہ کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ سرورق کے اندرونی صفحہ سے مولانا سید منظور الحسن برکاتی کا تعارفی مضمون سات صفحات کو محیط ہے جس میں برکاتی صاحب نے کتاب، صاحبِ کتاب اور حضرت روحی کے مختصر مگر جامع تعارف کے علاوہ کتاب کے افادی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ تعارفی مضمون کے خاتمہ کے ساتھ ہی کتاب کا آغاز ہوتا ہے پہلا حصہ تمہید ہے۔ دوسرے حصہ میں روحی کی شاعرانہ بصیرت اور درویشانہ عظمت کا بیان ہے۔ تیسرا حصہ خاندانی حالات پر مشتمل ہے اسی کے ذیل میں عقد اور بیعت کا سلسلہ ہے اس کے بعد صبر و تسلیم و رضا کے واقعات کا ذکر قلندری شان اور وفات کا بیان ہے چند کراماتی واقعات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت سونا بنانے کے فن سے بخوبی واقف تھے اور ایک دو اصحاب کو کیمیاگری کے ایسے نسخے بتائے جن میں وہ سو فیصد کامیاب ہو کر مالامال ہوئے یا ایک مریضہ کے دنبل کو بشکل تعویذ حکم نامہ بھیجا تو دنبل زیرِ ناف سے ٹخنہ کے نیچے پہنچ گیا۔ اسی قسم کے کچھ اور بھی واقعات ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ کراماتی واقعات کے بعد حضرت روحی کی تصانیف کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے بقیہ صفحات پر حضرت روحی کے بعض خلفا کے تاریخی حالات درج ہیں سب سے آخر کے دو صفحات پر فاضل مقالہ نگار نے اپنے معاونین و مخلصین سے اظہارِ تشکر کیا ہے۔

دورِ حاضر میں جبکہ اس قسم کی کتابوں کا رواج کم سے کم ہوتا جا رہا ہے الہام الدین خاں کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے اس کے بہت سے واقعات اپنے اندر کشش اور جاذبیت رکھتے ہیں مسلکِ طریقت سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بالخصوص دلچسپی کا باعث ہوگا۔

—— خالد محمود

بزمِ احباب

"تحریک" میں "ایک سوالنامے پر اظہارِ خیال" کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے وہ بہت ہی مفید اور معلومات افزا ہے۔ سبھی جوابات جو اب تک شائع ہوئے ہیں سنجیدہ غور و فکر کے حامل ہیں اور ان کے مطالعے سے میرے ذہن میں تو ایسی کئی باتیں صاف ہو گئیں جو اب تک غیر واضح تھیں۔ فروری کے شمارے میں بزمِ احباب کے کالموں میں آپ نے کچھ ایسے خطوط بھی شائع کیے ہیں جن میں سوالنامے کی اہمیت کم کرنے کی سعیِ نامشکور کی گئی ہے۔ ان میں سید نجم الدین نقوی اور وہاب دانش کے خطوں کے بارے میں کچھ کہنا تو تضیعِ اوقات ہے کہ نقوی صاحب پندار کی کسی ایسی گہری کھائی میں پڑے نظر آتے ہیں جہاں ان کے سوا کوئی دوسرا متنفس مشکل ہی سے سانس لے سکتا ہے اور وہاب دانش ایک ایسی ہذیانی حالت میں مبتلا ہیں جو شاید اس جھنجھلاہٹ کی پیدا کردہ ہے کہ برسوں قلم گھستے رہنے کے باوجود انھیں ادب کی بارگاہ میں داخلے کا پروانہ اب تک نہ مل سکا۔ ہاں ڈاکٹر قمر رئیس نے مہذب لہجے میں گفتگو کی ہے اگرچہ برہمی کی جھلک ان کے خط میں بھی موجود ہے۔ انھوں نے بعض سوالات کو مفروضوں پر مبنی کہا ہے لیکن یہ خود ایک مفروضہ ہے جو انھوں نے غالباً اس وجہ سے قائم کر لیا کہ سوالات ان کے لیے پریشان کن تھے اور وہ ان پر اظہارِ خیال سے بچنا چاہتے تھے۔ ورنہ کسی اور کو تو کسی سوال میں کوئی مفروضہ نظر نہ آیا نہ سوالنامے میں استعمال ہونے والے الفاظ ہی کسی کو وضاحت طلب معلوم ہوئے۔ ادب کی بنیادی اقدار کے حقیقی مفہوم تک ڈاکٹر صاحب کی نارسائی کا سبب وہ نظریاتی حصار ہے جس سے وہ باہر آنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اس نظریاتی حصار سے باہر آ کر غور کر سکیں تو وہ ادب کی بنیادی اقدار کو بھی سمجھ لیں گے، ان کا قائم و دائم ہونا بھی ان کی سمجھ میں آجائے گا اور اپنے قائم کردہ اس سوال کا جواب بھی انھیں خود ہی مل جائے گا کہ کیا کسی درمیانی وقفے میں یہ اقدار اُردو ادب سے مفقود ہو گئی تھیں؟ ان کا یہ کہنا کہ "اگر ان بنیادی اقدار کا تعلق بالتخصیص اردو زبان کے ادب سے ہے تو فطری طور پر یہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے مختلف ہوں گی.... کیا آپ یہ مانتے ہیں یا ماننے لگے ہیں کہ جغرافیائی حالات تہذیبی و سماجی ارتقا کے مدارج یا پھر اقتصادی اور سیاسی نظام کسی زبان کی ادبی اقدار کے تعین میں نتیجہ خیز رول ادا کرتا ہے، گویا دوسرے لفظوں میں آپ یہ تسلیم کر لیں گے کہ ادبی اقدار دائمی نہیں اضافی یا تغیر پذیر ہوتی ہیں"، واقعی ظاہر کرتا ہے کہ بنیادی ادبی اقدار سے وہ آشنا نہیں۔ میں ادب کے ساتھ ان سے عرض کرنا چاہوں گا کہ ادب کی ایک بنیادی قدر ہے زندگی اور اس کے مظاہر سے ادیب کا شخصی رابطہ اور ان کی طرف اس کا شخصی ردِعمل۔ اس ردِعمل کا اظہار بھی شخصی ہوگا۔ یہ قدر دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کی ایک مشترک قدر ہے لیکن ہر شخصی اظہار میں اس ملک، اس معاشرے اور ان حالات کی جھلک بھی موجود ہوتی ہے جن میں یہ فنی کارنامہ انجام پایا ہے۔ ہر ملک و قوم کے ادب کی جداگانہ خصوصیات یہیں سے پیدا ہوتی ہیں اور ان سے بنیادی قدروں کا اضافی ہونا لازم نہیں آتا۔

وہ دور جب اُردو ادب میں بنیادی ادبی اقدار کو پسِ پشت ڈالنے کی کوشش کی گئی ایسے ہی لوگوں کا دور تھا جو ان اقدار

سے نا آشنا اور لہجہ بہ لہجہ بدلتے ہوئے ناموں پر اپنے ادب
کی بنیاد رکھنے والے تھے۔ جدید ادیبوں نے ان اقدار کو دوبارہ
دریافت کیا ہے اور ان کی تخلیقات میں واقعی ان اقدار
کی بحالی عمل میں آئی ہے۔

رام لال نابھوی کا خط بھی آپ نے انہی کالموں میں
شائع کیا ہے، میرے خیال میں اسے جوابات کے کالم میں
آنا چاہیے تھا۔

—— اقتدار عالم خاں، بس اسٹنڈ، جاکسو

تحریک فروری ۷۷ء کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے
میں افسانے، غزلیں، نظمیں سبھی تخلیقات ہلکی پھلکی ہیں اور
قاری پر کوئی تاثر نہیں چھوڑتیں صرف بلراج کومل اور منصور
اچھے لگے۔ ہاں سوالنامے کے جوابات ضرور پسند آئے۔ بزم
احباب میں وہاب دانش کا خط پڑھ کر افسوس ہوا۔ آپ کو
اس طرح کے گرے ہوئے خطوط کی اشاعت سے گریز کرنا
چاہیے۔ کیا جدید شاعری کی مخالفت میں اور بھی خطوط نہیں
چھپے ہیں؟ لیکن اس طرح جذباتی انداز میں آگ بگولا ہو کر
اناپ شناپ بکنا —— اور پھر بڑی شان سے کہنا
—— جو محسوس کیا لکھ دیا —— اور ذرا ہمت کر کے
شائع کر دیں۔ اور آپ نے شائع بھی کر دیا آئندہ اس طرح کے
خطوط ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیں تو بہتر ہوگا۔ ویسے موصوف
کا خط پڑھ کر مجھے لگا کہ ان کا کلام "معذرت کے ساتھ" واپس
ہوتا رہتا ہے اور موقع ہاتھ آتے ہی سارا غصہ اگل دیا۔

—— خلیق الزماں نحر، دلسا کر وارڈ، سیونی

آپ نے تحریک میں "سوالنامہ" اور اس پر مختلف مفکرین
کے خیالات کی اشاعت شروع کر کے بہت گرانقدر اضافہ
کیا ہے جس کے لیے قارئین تحریک آپ کے بہت مشکور ہیں۔
سوالنامے کے تحت بعض لوگ کھل کر اپنے خیالات کا
اظہار کر رہے ہیں اور بعض لوگ دبی زبان میں جدید حقائق
کا اعتراف کر رہے ہیں بعض لوگوں کی آنکھوں پر تا ہنوز
گرد جمی ہوئی ہے۔

—— فدا المصطفےٰ فدوی، کرتی نکیتن، شملہ ہلز، بھوپال

جناب گوپال متل کے اداریے حرف بہ حرف قابلِ
مطالعہ ہوتے ہیں۔ ان کے اداریوں اور مضامین کی اہمیت
اس وقت معلوم ہوتی ہے جب حالات ان کی پیشگوئی کے
مطابق کروٹ لیتے ہیں۔ اس قدر بے باک، دوربین اور
سیاسی بصیرت بہت کم لوگوں کو میسر ہے۔ اگر کسی کے پاس
ہے بھی تو مصلحت نے زبان پر مہرِ سکوت لگا دی ہے۔

—— م۔ ق۔ خاں، معروف گنج، گیا

فروری کے تحریک میں شام بخشی صاحب نے ایک
بڑے دلچسپ توارد کی نشاندہی کی ہے۔ اسی شمارے میں
جب میں نے کرشن موہن کی غزل میں یہ شعر دیکھے:

پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کیوں؟
فوارے اُبلتے رہتے ہیں
حیراں ہوں، سردِ احساس سے بھی
کیوں شعلے نکلتے رہتے ہیں
میرے لیے شیتل بادل بھی
اک آگ اُگلتے رہتے ہیں
ہم تو لمحوں کے پتنگوں کو
دن رات مسلتے رہتے ہیں

تو میرے ذہن میں مخمور سعیدی کی ایک مقبولِ عام غزل
کے یہ شعر گونج گئے:

دلِ بے حس میں ہے طغیانیِ احساس عجب
ایک پتھر سے یہ فوارہ اُبلتا کیوں ہے
سبز پیڑوں کے گھنے جھنڈ برستا موسم
یہ سماں میرے لیے آگ اُگلتا کیوں ہے
نم ہواؤں میں ہے کس گرم بدن کی خوشبو
سرد جھونکوں سے یہ شعلہ سا نکلتا کیوں ہے
تتلیاں ہیں یہ ملاقات کی رنگیں گھڑیاں
رنگ اُڑ جائے گا پر ان کے مسلتا کیوں ہے

—— عبد المقتدر، سٹیشن روڈ، سوائی مادھو پور

خبرنامہ

● منگل ۱۱ جنوری کی شام کو مہاراشٹر کالج بمبئی کے وسیع و عریض ہال میں مراٹھی ادب پر اوّلین اردو کتاب پروفیسر یونس اگاسکر کی تالیف "مراٹھی ادب کا مطالعہ" کی تقریب رسم اجرا مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈیمی، مہاراشٹر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اور نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت اور رسم اجرا جناب اعجاز صدیقی (مدیر رسالہ "شاعر") نے انجام دی مقررین میں علی سردار جعفری۔ وِدّیا دھر گوکھلے (مدیر مراٹھی اخبار "لوک ستا") مراٹھی کے شاعر نارائن سُروے۔ یوسف ناظم اور عرفان فقیہ شامل تھے۔ اس جلسہ میں ادب نوازوں اور سماجی اکابرین نے شرکت کی۔ اردو۔ مراٹھی۔ انگریزی اور گجراتی کے نامہ نگار۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اناؤنسنگ کے فرائض پروفیسر نصیر الدین نے انجام دیے۔

تقریب کے کنوینر مہاراشٹر کالج کے پرنسپل عبدالقدیر منشی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ "مراٹھی اردو کا رشتہ بہت پرانا اور قدیم ہے ہم دیکھتے ہیں کہ مہاراشٹر میں اردو پر مراٹھی اور مراٹھی پر اردو کی گہری چھاپ ہے۔ یونس اگاسکر نے یہ کتاب تالیف کرکے مراٹھی اور اردو کو قریب تر لانے اور اس رشتے کو مستحکم بنانے کی جانب ایک بنیادی قدم اٹھایا ہے جس کے لیے وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں"۔ علی سردار جعفری نے اپنی تقریر میں کہا کہ "یونس اگاسکر محض ایک قاصد نہیں ہیں جو عاشق کا خط محبوب تک پہنچاتا ہے بلکہ وہ خود عاشق ہیں۔ ان کا یہ کام کسی طرح تخلیقی کام سے کم اہمیت کا نہیں۔ انھوں نے بڑا کرم کیا کہ مراٹھی ادب کو اردو سے روشناس کرانے کے لیے یہ کتاب "مراٹھی ادب کا مطالعہ" تالیف کی۔ اس سے ہندوستان کی زبانوں میں جذباتی ہم آہنگی پیدا ہونے میں مدد ملے گی"۔ وِدّیا دھر گوکھلے نے اپنی مراٹھی تقریر کے دوران کہا کہ "اردو قارئین کو مراٹھی ادب کی تاریخ سے متعارف کرانے والی یہ اوّلین کوشش علمی انداز لیے ہوئے ہے۔ اس کتاب میں قدیم و جدید شعری و نثری ادب اور اس کے اصناف سنت، پنڈت اور زمیدہ عشقیہ شاعری۔ بکھر۔ کہانی۔ ناول اور ڈراما کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ گیانیشور اور گیانیشوری نیز تکارام کے ابھنگوں کو بڑی وضاحت و خوبی کے ساتھ روشناس کرایا گیا ہے"۔ نارائن سُروے نے کہا "میں یونس اگاسکر صاحب کی اس تصنیف کے علاوہ ان کے دیگر ادبی کارناموں پر نظر رکھتا ہوں۔ اس سے قبل ان کی لکھی ہوئی کہانیاں اور مشہور اردو ادیبوں سے لیے گئے انٹرویو بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان انٹرویوز کو مراٹھی میں ترجمہ کرکے مراٹھی قارئین کو اردو کے ان ادیبوں اور ان کے کارناموں سے متعارف کرایا جائے"۔ انھوں نے مزید کہا کہ "اس کتاب میں جدید مراٹھی شاعری کا تعارف شامل نہیں ہے اس کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں"۔

یوسف ناظم نے یونس اگاسکر کا قلمی مزاحیہ خاکہ "ادبی نوشہ" پیش کیا۔ پروفیسر عرفان فقیہ (شعبۂ عربی۔ مہاراشٹر کالج) نے یونس اگاسکر کے متعلق اپنا تاثراتی مضمون پڑھا۔ جناب اعجاز صدیقی نے صدارتی تقریر کی اور یونس اگاسکر کی خدمات کو سراہا۔

آخر میں یونس اگاسکر نے مختصر سی تشکر آمیز تقریر کی اور

آئندہ مراٹھی کہانی۔ شاعری اور یک بابی ڈراموں کے علیحدہ علیحدہ انتخابات مرتب کرکے مع مقدمہ شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈیمی کے ایگزیکیٹو آفیسر جناب سردار عرفان کے شکریہ کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا۔

● ۲۹ جنوری ۷۷ء کو بعد دوپہر تین بجے انجمن ترقی اردو پنجاب کے زیرِ اہتمام مودی کالج پٹیالہ میں ساغر شفائی کے مجموعۂ کلام "افشاں" کی رسم اجرا انجام پائی۔ اس تقریب کی صدارت جناب برج لال گوئیل ایم۔ایل۔ اے نے فرمائی۔ وید پرکاش گپتا نے صدر اور سامعین کا خیر مقدم کیا اور جناب ساغر کے انسان دوستی اور وطن پرستی کے جذبات کی پُرزور الفاظ میں تعریف کی۔ جناب نوبہار صابر نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں ساغر صاحب کی ادبی اور سماجی بے لوث رضاکارانہ خدمات پر انھیں داد دیتا ہوں۔ ایسے بہت کم شاعر ہوں گے جو اپنی بے حد مصروفیات کے باوجود ادب کی خدمت کو مقدم سمجھتے ہوں۔ ساغر صاحب نے ہمیں "خواب" اور "زمین" جیسی جاندار نظمیں دی ہیں" کتاب ریلیز کرتے ہوئے بزرگ شاعر سردار اودے سنگھ شائق نے کہا "ساغر صاحب پنجاب کے شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پر خلوص شاعر میں ایک کشش ہے جو مجھے اس عمر میں اور اس کڑاکے کی سردی میں یہاں تک کھینچ لائی۔

اس تقریب کی آخری کڑی مشاعرہ تھا جس میں پنجاب کے متعدد مقامات سے اردو۔ ہندی اور پنجابی کے شعرا شرکت کے لیے آئے تھے۔ جناب اودے سنگھ شائق۔ نوبہار صابر۔ ساغر شفائی۔ مہر چند کوثر۔ راجندر سوز۔ جگر جالندھری۔ انوار اعظمی۔ خالد کفایت کی تخلیقات کو بے حد پسند کیا گیا۔

آخر میں ساغر صاحب نے اراکین انجمن۔ صدر تقریب، مقررین، اور شعرا حضرات اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

● ۶ر فروری ۱۹۷۷ء کو غالب اکیڈیمی بستی نظام الدین

نئی دہلی میں جشنِ سالگرہ جوش ملسیانی کمیٹی کے زیرِ اہتمام حضرت جوش ملسیانی کی ۹۴ ویں سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ صدارت ڈاکٹر مسعود حسین صاحب نے کی اور کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے اس جشن کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ جوش صاحب کے کلام میں زبان کی صحت بیان کا حسن، پختگی اور مضمون آفرینی ملتی ہے وہ آخری عمر تک جمن اردو کی آبیاری کرتے رہے۔ جسے ہم فراموش نہیں کرسکتے۔ خدا کرے کہ آنے والی نسلیں اس کے کلام سے فیضیاب ہوتی رہیں۔

ڈاکٹر محمد ذاکر۔ ڈاکٹر شارب ردولوی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جوش صاحب کی ادبی خدمات پر مقالے پڑھے کئی دیگر مقالے بھی آئے تھے مگر وقت کی کمی کے باعث وہ سب نہ پڑھے جاسکے۔ یہ جملہ مقالے ماہنامہ "کتاب نما" دہلی کے جوش ملسیانی نمبر میں شائع ہوگئے ہیں۔ اس نمبر کا اجرا بھی کرنل زیدی صاحب کے ہاتھوں سے ہوا۔ مقالات کے بعد منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اس کا آغاز جناب ساحر ہوشیارپوری نے کیا اور جوش صاحب کی ایک غزل سنا کر مرحوم کے لیے بھرپور داد حاصل کی۔

پروفیسر تخشی اختر امرتسری نے فارسی رباعیات پڑھ کر جوش صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جرخ چینوٹی صاحب نے جوش صاحب کی ایک مشہور رباعی کے چاروں مصرعوں پر تضمین پیش کی۔ شاگردانِ جوش جناب خزاں چند نسیم جناب کنول انبالوی۔ جناب برہما نند جلیس۔ جناب سرشار ہوشیارپوری اور جناب راز لائلپوری نے بھی تضمین پیش کیں۔ اجتماع میں دلّی کی سرکردہ ہستیاں شریک تھیں۔

جلسے کے آخر میں جناب ساحر ہوشیارپوری نے جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ کاروانِ جوش کے نام سے ایک انجمن قائم کی جائے گی جو ہر دوسرے ماہ ادبی محفلیں منعقد کرے گی۔ حاضرین کی چائے سے تواضع کی گئی اور "سیلِ ماتم" کی جلدیں سب حضرات کو پیش کی گئیں۔

ہماری شائع کردہ
سو کتابیں
ایک نظر میں

۱۔ احساسات (شاعری) ادم پرکاش لاغر 5/=
۲۔ ارمغانِ بہار (شاعری) اے، سی، بہار 10/=
۳۔ آج کا چین (سفرنامہ) ڈاکٹر ایس، چندر شیکھر 2/=
۴۔ آج کا مارکسزم رابرٹ کنکوئسٹ 1/=
۵۔ آگ (ناول) جمنا داس اختر 5/=
۶۔ آواز کا جسم (شاعری) مخمور سعیدی 10/=
۷۔ اُڑان (شاعری) شباب للت 6/=
۸۔ امرائی (شاعری) بدیع الزماں خاور 10/=
۹۔ انیس سو چوراسی (ناول) جارج آرویل 6/=
۱۰۔ ادیب اور کمیسار ہارڈتھ جارج پلوکزی 2/=
۱۱۔ اعراف (شاعری) عبدالرحیم نشتر 4/50
۱۲۔ انتظار کی رات (شاعری) کمار پاشی 8/=
۱۳۔ انسانی حقوق کیا ہیں؟ مورس کرانسٹن (مجلّد) 7/=
،، ،، ،، ،، (غیر مجلّد) 4/=
۱۴۔ اقتصادی سامراج الفرڈ زاہرمان 0/50
۱۵۔ اقتصادی تعاون بی جے پی وڈز 0/50
۱۶۔ اوراقِ زندگی (شاعری) بسمل سعیدی 15/=
۱۷۔ ایک روسی سائنسداں کے تجربات مائخل کلوچکو 2/=
۱۸۔ ایک ہزار مرد (افسانے) برج موہن طوفان 3/=
۱۹۔ بسمل سعیدی شخص اور شاعر (شخصیت اور شاعری کا تجزیہ) 18/=
۲۰۔ ببول کے پیڑ (آپ بیتی) 1/=
۲۱۔ بردہ فروش (ناول) جمنا داس اختر 5/=
۲۲۔ برگِ سبز (شاعری) آزاد نوحی 10/=
۲۳۔ بند کواڑ (افسانے) نریندر لوتھر 3/=
۲۴۔ بیاض (شاعری) بدیع الزماں خاور 4/=
۲۵۔ پُرامن حملہ ڈوگلس ہائڈ 2/=
۲۶۔ پتھر کے دیوتا (کچھ آپ بیتیاں) 2/=
۲۷۔ تجدیدِ جنوں (غیر ملکی نظموں کے منظوم تراجم) 5/=
۲۸۔ تعلیم کی کھوج (طلبا کی آپ بیتیاں) 1/=
۲۹۔ تنقید سے تحقیق تک ڈاکٹر عنوان چشتی 15/=
۳۰۔ تیشۂ نظر (مضامین) ابوالفیض سحر 8/=
۳۱۔ تین انقلاب فریڈرک جنیر 1/=
۳۲۔ ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول وکٹر فیدر 1/=
۳۳۔ ٹریڈ یونین ـــ جائز اور ناجائز استعمال آرتھر باٹملی 1/=
۳۴۔ جملوں کی بنیاد (ڈرامے) کمار پاشی 7/=
۳۵۔ جمہوری انقلاب برائن ماگی 1/=
۳۶۔ جمہوری سوشلزم گائلس ریڈس 1/=
۳۷۔ چین کا بدلتا سماج چو چائی۔ دن برگ چائی 2/=
۳۸۔ چین میں اسلام کا ماضی اور حال 1/=
۳۹۔ حسابِ رنگ (شاعری) باقی 15/=
۴۰۔ حروف (شاعری) بدیع الزماں خاور 4/50
۴۱۔ خرابہ (شاعری) من موہن تلخ 10/=
۴۲۔ خواب تماشا (شاعری) کمار پاشی 5/=
۴۳۔ خوشحالی کی تلاش (چین اور ہندوستان کا اقتصادی موازنہ) 1/=
۴۴۔ دار کی دعوت (شاعری) احمد علی خاں منصور 3/=

۴۵۔ دامانِ باغباں (شاعری) محمد عثمان عارف (مرتب) =/5
۴۶۔ دو انقلاب آر۔ ایچ۔ بروس لاک ہارٹ =/1
۴۷۔ دیپک راگ (شاعری) مظفر حنفی =/6
۴۸۔ روبرو (شاعری) کمار پاشی =/10
۴۹۔ راکھ (شاعری) احتشام اختر =/6
۵۰۔ راہگذر (شاعری) دل ایوبی 4/50
۵۱۔ روس کے انقلاب ڈیوڈ نٹ ہین =/1
۵۲۔ سخاروف نے کہا آندری۔ ڈی۔ سخاروف (مجلد) =/7
(غیر مجلد) =/4
۵۳۔ سوویٹ سفارت خانے میں الیکزنڈر کزناچیف =/3
۵۴۔ سلک گہر (شاعری) سالک عزیزی =/4
۵۵۔ سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ موریس کرانسٹن =/1
۵۶۔ سیہ بر سفید (شاعری) مخمور سعیدی =/6
۵۷۔ سازِ رگِ جاں (شاعری) کرشن مراری =/10
۵۸۔ شہپر (شاعری) حرمت الاکرام =/8
۵۹۔ شہرِ خوشبو (شاعری) نور تقی نور =/5
۶۰۔ شہرِ خیال (شاعری) جلیس نجیب آبادی 4/50
۶۱۔ شیرازہ (شاعری) مرتبین، مخمور سعیدی، پریم گوپال متل =/15
۶۲۔ شیرازۂ مژگاں (شاعری) کرشن موہن =/10
۶۳۔ صحرا میں اذان (شاعری) گوپال متل =/8
۶۴۔ صحرا کی پیاس (شاعری) شباب للت =/6
۶۵۔ صریر خامہ (شاعری) مظفر حنفی =/6
۶۶ عظیم بیداری اور جمہوریت کا چیلنج جان اسٹریچی =/2
۶۷۔ عالمی سیاست میں جمہوریت لیسٹر بی پیرسن =/1
۶۸۔ قوموں کے قاتل رابرٹ کنکوئسٹ =/3
۶۹۔ کلیاتِ اختر (شاعری) اختر شیرانی =/8
۷۰ کلیات شاد عارفی مرتب مظفر حنفی =/30
۷۱۔ کمیونزم اور نو آبادیت وکٹر کولرز =/1
۷۲۔ کوے ملامت (شاعری) کرشن موہن =/10
۷۳۔ کمیونزم اور زراعت لارڈ والسٹن =/1
۷۴۔ کمیونزم بحران میں =/1
۷۵۔ کینسر وارڈ (ناول) الیگزنڈر سولنسٹین =/18
۷۶۔ گفتنی (شاعری) مخمور سعیدی =/3
۷۷۔ گلاگ مجمع الجزائر (یادداشتیں) الیگزنڈر سولنسٹین (مجلد) =/20
(غیر مجلد) =/7
۷۸۔ گیان مارگ کی نظمیں کرشن موہن =/10
۷۹۔ لاہور کا جو ذکر کیا (یادداشتیں) گوپال متل =/10
۸۰۔ لفظوں کا پیرہن بدیع الزماں خاور =/7
۸۱۔ لبِ منصور (شاعری) دھرم سروپ =/9
۸۲۔ لینن (سوانح حیات) رابرٹ کنکوئسٹ =/2
۸۳۔ لینن اور مذہب بوہلن۔ آر۔ بوسرکیو -/50
۸۴۔ مانجھی دھیرے چل (شاعری) مصور سبزواری =/3
۸۵۔ سوویٹ وسط ایشیا کی مسلمان قومیں جیوفرے وھیلر (مجلد) =/5
(غیر مجلد) =/3
۸۶۔ منتخب شاعری ۱۹۶۸ء راج نرائن راز، کمار پاشی =/3
۸۷۔ منتخب شاعری ۱۹۶۹ء کمار پاشی، پریم گوپال متل =/3
۸۸۔ منتخب شاعری ۱۹۷۱ء کمار پاشی، پریم گوپال متل =/4
۸۹۔ منتخب افسانے ۱۹۶۸ء شہباز حسین، بدیع الزماں =/4
۹۰۔ موجودہ سماج میں طبقاتی نظام ٹی۔ بی۔ بوٹو مورہ =/50
۹۱۔ میرا وطن ہندوستاں (شاعری) بدیع الزماں خاور =/4
۹۲ میں گواہی دیتا ہوں (آپ بیتی) اناتولی مارچینکو =/4
۹۳۔ نام بہ نام (شاعری) رضا نقوی واہی =/6
۹۴۔ نذرِ رسالت (شاعری) دل ایوبی =/6
۹۵۔ نئے عہد نامے کی سوغات (افسانے) فیاض رفعت =/10
۹۶۔ نگاہِ شوق (شاعری) دھرم سروپ =/10
۹۷۔ نیا سامراج ہیوگ سٹین واٹسن =/1
۹۸۔ نیا طبقہ میلوون جلاس =/2
۹۹۔ ولاس یاترا (طویل نظم) کمار پاشی =/10
۱۰۰۔ ہمارے دور کا انقلاب ہیوگ سٹین واٹسن 0/50

اپنے قیمتی آرڈر بھجوا کر ممنون کیجیے

۳۰ اپریل ۷۷ء تک ملنے والے بیس روپے اور اس سے زیادہ مالیت کے آرڈروں پر ۲۰ فیصد کمیشن (عام خریداروں کو) پیش کیا جائیگا اور محصول ڈاک ہمارے ذمے ہوگا
ایجنٹ حضرات تفصیلات کے لیے لکھیں۔
منیجر نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Regd. No. D (D 118 Phone : 271649 MARCH 1977

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK